رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱- رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے -
۲- رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
۳- خط کتابت کیوقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کر دیئے جاتے ہیں
۴- جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے -
۵- مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہییں -
۶- سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے -

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے -

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مولانا نذیر احمد
- نبات النعش ۹؍
- مراۃ العروس ۱۰؍
- توبۃ النصوح ۱۲؍
- موعظہ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامی
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر ۱۲؍

مولانا شبلی
- سیرۃ النبی جلد اول
- ” دوم
- ” سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- ” دوم
- ” سوم
- ” چہارم
- ” پنجم
- موازنہ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغاز اسلام
- کلیات فارسی
- کلام شبلی اردو

امیر مینائی
- صنم خانۂ عشق
- مراۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین
- ضیائے سخن
- مکاتیب امیر مینائی

رتن ناتھ سرشار
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ طرز ناول
- کامنی
- سوانح عمرو عیار
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی سجاد حسین
- احمق الذی
- حاجی بغلول

جوالا پرشاد برق
- مرنالنی ۱۲؍
- مار آستین ۱۲؍
- بنگالی دلہن ۱۲؍
- معشوق فرنگ

نگار

فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۲۹ء

ملاحظات ــــــ ۲

حکومت برطانیہ کی وسعت کارانہ (سیاسی) عبد القیوم رسا۔ ۹

تصویر کی موت۔ (افسانہ) ــــ عبد السلیم۔ ۱۹

برہان پور۔ (تاریخی) ــــ سید احمد اللہ قادری۔ ۲۶

پرستار محبت۔ (افسانہ) ــــ محشر عابدی۔ ۳۳

تصوف اسلام پر ایک ناقدانہ نظر۔ عبد المالک آروی۔ ۴۹

شیطان کی آنت ــــ رشید احمد صدیقی۔ ۶۰

باب المراسلة والمناظرة ــــــ ۷۷

باب الاستفسار ــــــ ۸۴

وے بخیر گزشت۔ (افسانہ) ــــ ۸۹

مغنیۂ مصر (نظم)۔ روش صدیقی۔ ۹۳

غزل فرخ بنارسی و نظیر لودھیانوی ــــ ۹۴

غم روزگار۔ ــــ سید علی اختر۔ ۹۵

"آجا" ــــ طالب باغپتی۔ ۹۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۶ | جولائی سنہ ۱۹۲۹ء | شمارہ (۱)

ملاحظات

نگار کی اس اشاعت سے سولھویں جلد کا آغاز ہوتا ہے اور گزشتہ ۱۵ سال ۶ ماہ کا زمانہ غالباً "حق صحبت دیرینہ" قایم کرنے کے لئے ناکافی نہ سمجھا جائے گا جسکے مطالبہ میں اگر نگار اور ناظرین نگار دونوں اصرار وابرام سے کام لیں تو بیجا نہ ہوگا۔

سب سے پہلے مجھے اپنے ادائے فرض کے متعلق یہ کہنے میں معلق پس و پیش نہیں ہو سکتا کہ:-

ازنفس آنچہ داشتیم صرف ترانہ کردہ ایم

اب یہ اور بات ہے کہ نتیجہ کے لحاظ سے اور اثر و اعتبار کی حیثیت سے میں اک لفظ "اعتراف" کا بھی مستحق نہ قرار پاؤں

شعلہ چکد عنم گرا، گل شگفد مزد کو
شمع شبستانیم باد سحر گاہیم

یہ تو صورت ہوگئی اس حق کے فیصلہ کی جو ناظرین نگار کی طرف سے مجھ پر یا نگار پر عاید ہوتا ہے، اب رہا میرا یا نگار کا مطالبہ ملک و اہل ملک سے سو اس کے متعلق کیا عرض کروں، حقیقت یہ ہے کہ "نہ میں سمجھا" اور نہ آپ نے بے خبری سے کام لیا، تاہم انور دہلوی کا یہ مصرعہ ضرور زبان پر آجاتا ہے کہ:- "پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"

نگار اب اس حد سے گذر گیا ہے کہ اس کے مقاصد و اغراض کی تشریح کیجائے اور نہ اسکو اُس سطح سے نیچے آنے کی کوئی توقع کسی کو پیدا کرنا چاہئے جو اُسنے اپنے لئے بالکل جداگانہ قائم کرلی ہے، کیونکہ جو لٹریچر اس کے ذریعہ سے پیش ہورہا ہے، خواہ وہ ادب لطیف سے متعلق ہو یا اصلاح مذہب و معاشرت سے دنیا کی کوئی یسیر الحصول جنس نہیں ہے اور نہ وہ تاجرانہ "لب و لہجہ" سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز ہے، جس کا بطون اس کے ظاہر سے ممتنع ہوا کرتا ہے اور جس کو ہر وقت آسانی سے بدلنا ممکن ہے، میں جو کچھ کہتا ہوں حق سمجھ کر کہتا ہوں اور صداقت کے اعلان میں دنیا کی کسی قوت سے نہ ڈر کر جو مسرت میں محسوس کرتا ہوں اسکو مٹا دینا میرے اختیار کی بات نہیں،

برلب یا علی سرِ بادہ روانہ کردہ ایم مشرب حق گزیدہ ایم عیش شبانہ کردہ ایم

نگار نے جو عظیم الشان انقلاب، ہندوستان کے مذہبی عقول انسانی میں پیدا کردیا ہے وہ اتنا زبردست "معاوضہ" میری حقیر مساعی کا ہے کہ بعض اوقات میں متحیر ہو جاتا ہوں کہ

تا چہ فراہم شدست اجرت جانکاہ ایم

اور اس کے بعد میں ایک خاص قسم کا استغنار محسوس کرتا ہوں، لیکن جسوقت میں یہ دیکھتا ہوں کہ

از ہر چہ گفتن داشتم ایں جملہ حرفے بیش نیست

تو میری بےچینیاں بڑھ جاتی ہیں اور "وسعت بیان" کی تمنا کے ساتھ ساتھ یہ بھی دل چاہتا ہے کہ "گوش سخن شنو" اور "دیدۂ اعتبار" دونوں میں اضافہ ہو۔ اس لئے قبل اسکے کہ یہ جلد ختم ہو آپ کو ایک بار کبھی تنہائی میں بیٹھ کر غور کرلینا چاہئے کہ آپ نے اس "حق دیرینہ" کا کس حد تک اعتراف کیا پھر چونکہ فرض کے استمرار کے ساتھ وقت و زمان کی تعیین اٹھ جاتی ہے اس لئے آپ اب بھی اور ہر وقت اسکی تلافی کر سکتے ہیں۔

گذشتہ ماہ کی اشاعت میں مینے، اجمالی طور پر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ نگار اور اس کے کاروبار کو اب کسی خاص شخص کی ملکیت رکھنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اجتماعی حیثیت سے اس کو چلانا ہے، مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ اس تجویز کو بہت سے حضرات نے پسند کیا اور وہ عملاً اس میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ بہرحال میں ایک ماہ کی مہلت اور دیتا ہوں تاکہ اچھی طرح پبلک اس پر غور کرے اس کے بعد میں مفصل لائحہ عمل شایع کردوں گا جس سے سرمایہ کی مقدار، کاروبار کی عملی صورت اور متوقع نفع کا اندازہ ہوسکے گا، میں خود اس ارادہ کی تکمیل کے لئے اخیر جولائی میں حیدرآباد اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا سفر کروں گا، اور دیکھوں گا کہ کس حد اور کس وقت تک میری یہ خواہش پوری ہوسکتی ہے۔ جو حضرات اس باب میں خط و کتابت کرنا چاہیں، وہ براہ راست مجھ سے کرسکتے ہیں۔

امیر امان اللہ خان ساحل ہند کو خیر باد کہہ چکے اور اُس سر زمین مین پہونچ گئے جہان زندگی ہے، نشاط عمل ہے، ولولۂ اقدام و ترقی ہے۔ حکومت و سلطنت خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے جو کسی انسان کو عطا ہو سکتی ہے، لیکن ایک نعمت اس سے بھی زیادہ مہتم بالشان اور ہے، جس کا نام ضمیر کی آزادی، فکر کی حریت اور حس و خیال کی روشنی ہے۔ ایک مجبور و پابند بادشاہ سے پوچھئے کہ وہ ایک آزاد مزدور کی زندگی کو کیا سمجھتا ہے جو دن بھر کی محنت سے تھک کر دماغ کے پورے سکون کے ساتھ رات بھر صحت کی نیند سوتا ہے۔ کیا نپولین جس وقت جزیرۂ ہلنا مین محبوس و مقید تھا، وہ ایک معمولی سپاہی کی آزادی کے لئے نہین ترس رہا تھا، اور کیا جس وقت ملکہ میری جلاد کے تیغ کے نیچے گردن جھکائے ہوئی تھی، اس بات کی متمنی نہ رہی ہوگی کہ اُسے ایک ادنیٰ خادمہ ہی کی حیثیت سے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اگر امان اللہ خان بھی دوبارہ افغانستان کی حکومت حاصل کرنے کے بعد اتنے ہی مجبور ہوتے اور تمام اصلاحات کا دروازہ ان کو بند کرنا پڑتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس حالت مین اپنے آپ کو صحیح معنی مین وہان کا حکمران سمجھتے اور انھین اس ثروت و حکومت کے حصول پر حقیقی مسرت ہوتی۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کی بنا پر انھون نے کہا تھا کہ "مین افغانستان کو جاہل رکھ کر اس پر حکومت کرنے کے لئے طیار نہین"

زوال امان اللہ خان کے صحیح اسباب کی تاریخ تو کسی وقت زمانۂ مستقبل مین طیار ہوگی لیکن بحالت موجودہ اسقدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعض غلطیان امان اللہ خان سے ضرور ہوئین جنھون نے دشمنون کو بغاوت کا موقعہ دیا۔ پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ انھون نے تدریجی اصلاح کو مد نظر نہین رکھا اور چونکہ وہ فطرتاً بہت عجول اور بے چین دل و دماغ رکھتے ہین اس لئے وہ چاہتے تھے کہ افغانستان کو معجزانہ طور پر دفعتہً حیوان سے انسان بنا دین، حالانکہ ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ دوسری غلطی بالکل حضرت عثمان غنی کی طرح ان سے بھی یہ ہوئی کہ خاص ایک جماعت کو برسر اقتدار کر دیا اور دوسری اہم جماعتون کو جن کا ملک و قوم مین بڑا اثر تھا، بد دل ہو جانے کا موقعہ دیا۔ اس مین شک نہین کہ سردار محمود طرزی ایک روشن دل و دماغ کے انسان ہونے کی حیثیت سے ہر عزت و احترام کے مستحق تھے، لیکن اُن کا اور ان کے خاندان کا عروج بالکل برامکہ کا سا عروج تھا کہ تمام سلطنت پر حاوی ہو گئے اور آخر کار خلفاء عباسیہ کو ان کا استیصال کرنا پڑا۔ یہان یہ ہوا کہ خود ملک نے شاہ و وزیر دونون سے انتقام لیا۔ لیکن افسوسناک امر صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہوا وہ صرف اغراض ذاتی کے لئے ہوا اور انقلاب پیدا کرنے والون مین ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کے سامنے ملک کے فلاح و بہبود کا سوال ہو۔

بہر حال وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہوا لیکن امان اللہ خان کا نام اکابر عالم کی فہرست مین ضرور داخل ہو گیا اور افغانستان کی تاریخ کبھی اس شخص کے احسانات سے سبکدوش نہین ہو سکتی جس نے چند سال کی مدت مین ملک کو خاک سے پاک بنا دیا تھا۔ یون تو مستقبل کے واقعات پر حکم لگانا دشوار ہے، لیکن بظاہر حالات اب کوئی امید امان اللہ خان کی واپسی کی نہین ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس سلسلہ مین ان کے صاحبزادے حکمران ہو جائین، نادر خان کے نام قرعۂ حکومت پڑ جائے یا کوئی اور

تیسرا شخص منتخب ہو جائے، لیکن بعض مخصوص اسباب کی بناء پر امین اللہ خان کا پھر واپس آنا بہت متعذر ہے۔

افغانستان سے جو خبرین آجکل آرہی ہین، وہ بھی ناقابل اعتبار ہین تاہم یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ امان اللہ خان کے چلے آنے کے بعد سے "بچہ سقہ" کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے اور وہ خود بھی اس کو محسوس کرکے مضطرب ہو رہا ہے۔

اس وقت ہندوستان جس سیاسی منزل سے گزر رہا ہے، وہ حقیقتاً بہت نازک ہے اور جس جماعت نے اس کی نزاکت کو نہ سمجھکر موقعہ کو ہات سے جانے دیا اس کا مستقبل سخت تاریک ہے۔

حکومت نے اس امر کو پوری طرح محسوس کر لیا ہے کہ ہندوستان کا موجودہ نظام حکومت یقیناً بدلنا ہے اور آج نہین تو کل اُسے ضرور آزاد ہونا ہے، اس لئے ایسی حالت مین جو پالیسی حکومت کی ہونا چاہیے ظاہر ہے یعنی جس صورت مین کم سے کم قربانی اس کو کرنا پڑے گی، وہی وہ اختیار کریگی اور بہرائش وقت اس کے سامنے سوائے اپنے مفاد کے اور کوئی سوال نہ ہوگا۔

اس وقت انگلستان کے ایوان حکومت مین مزدور جماعت کے اقتدار نے ہندوستان کے مسئلہ کو بہت زیادہ اہم کر دیا ہے اور سائمن کمیشن کا نہرو رپورٹ کے اصول پر سفارش کرنا اور حکومت کا اُسے منظور کر لینا مستبعد نہین اس لئے بحالت موجودہ مسلمانون کی پوزیشن بہت زیادہ نازک ہے، کیونکہ ان کی بعض جماعتون نے نہرو رپورٹ سے مخالفت کرکے ایک ایسا محاذ قایم کیا ہے جس کے کامیاب ہونے کی مطلقاً کوئی توقع نہین ہو سکتی۔

مسلمانون کی طرف سے بڑی قوی دلیل (جو حقیقتاً نہایت ضعیف و کمزور ہے) مخالفت کی یہ پیش کیجاتی ہے کہ اس مین اقلیت کی کوئی رعایت ملحوظ نہین کی گئی اور حکومت برطانیہ اس کو حرب و دماغ کا بڑا ذریعہ سمجھکر اس سے کام لے رہی ہے، حالانکہ جس وقت نہرو رپورٹ کے اصول پر نظام حکومت قایم ہوا تو یہی حکومت برطانیہ جو اس وقت اقلیت کے عذر مین مسلمانون کے ہمنوا نظر آتی ہے، اسپر کاربند نہ ہوگی اور اقلیت کے تمام عذرات کو خود ہی ٹھکرادیگی۔

اسوقت تک کہ حکومت کسی فیصلہ کرنے پر مجبور نہین ہے وہ آخری لمحہ تک ہر عذر لنگ کو ایک برہان ساطع اور ہر رائی کو پہاڑ بنا کر دکھائے گی، لیکن جب اس کو کوئی فیصلہ نہرو رپورٹ کے موافقت مین کرنا پڑا تو پھر نہ اقلیت کی ہمدردی ہوگی اور نہ کمزور کی اعانت۔ یہ کم لوگون کو معلوم ہے کہ گھونسہ کھا کر اس کا اعتراف کر لینا "جان بُل" کی خصوصیات مین داخل ہے،

امسال انتخابات کے التوا سے حکومت ہند نے بہت کچھ اس تخریب کی رخنہ بندی کر لی ہے جو بصورت دیگر بالکل لاعلاج ہو جاتی، لیکن کیا دنیا اسقدر بیوقوف ہے کہ وہ ان کمزوریون کو محسوس نہین کر سکتی۔ اگر امسال انتخاب ملتوی نہ ہوتا تو شاید اقلیت و اکثریت کا مسئلہ بڑی حد تک سلجھ جاتا اور سال ختم ہونے کے بعد جب کلکتہ کانگریس کے فیصلہ کے مطابق پروگرام مقاطعہ کا آغاز ہوتا تو ہندو مسلمانون کے درمیان خلیج افتراق اسقدر وسیع نہ ہوتی۔

مسلمانون کی ایک جماعت جو نہرو رپورٹ کی مخالف ہے اور بعض اُن کی ہمت افزا اخبار کہتے ہین کہ ہمکو نہرو رپورٹ سے مخالفت اکثریت و اقلیت کی بنا پر نہین ہے بلکہ صرف اس لئے ہے کہ ہم نوآبادی کی سی حیثیت کو ہندوستان کی توہین سمجھتے ہین اور ہم مکمل غیر مشروط آزادی کے طالب ہین ۔ یقیناً یہ حجت نہایت بلند ہے اور ہر وہ شخص جو اس کو سنے گا، مسلمانون کی اس ہمت مردانہ کی داد دیگا ۔ لیکن سوائے الفاظ کے اس مین کوئی حقیقت نہین ہے اور یہ محض پردہ ڈالنا ہے اپنی بزدلی پر اصلیت تو یہ ہے کہ جی ڈر رہا ہے ہندوؤن کی اکثریت سے اور اس کی مخالفت کیجاتی ہے اس طرح تاکہ ان کی ساکھ نہ مٹنے پائے ۔

اوّل تو اقلیت کا صرف اس بنا پر خائف ہونا کہ وہ اقلیت ہے حد درجہ سفیہانہ اور بزدلانہ جذبہ ہے ۔ کیونکہ جس طرح سے اکثریت نام صرف زیادتی اعداد کا نہین ہے اسی طرح اقلیت کمی اعداد کو نہین کہتے ۔ اس کا سب سے روشن ثبوت مسلمانون کو خود اپنی تاریخ سے ملسکتا ہے کہ انھون نے اقلیت ہی سے اکثریت حاصل کی اور اکثر و بیشتر یہی ہوا کہ ان کی نہایت محدود جماعت نے بڑے بڑے لشکرون کے مُنہ موڑ دیے ۔ اکثریت نام صرف قوت روح و اخلاق کا ہے، عزم و پامردی کا ہے ۔ جنگل مین شیر تنہا ہوتا ہے اور لومڑیان ہزارون لیکن نہ آج تک کسی شیر کے دل مین لومڑیون کی طرف سے خدشہ پیدا ہوا اور نہ اس بنا پر اس نے جنگل چھوڑا ۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو تسلیم کرلین کہ نہرو اسکیم کے نفاذ کے بعد ہندوؤن کی کثرت مسلمانون کیلئے خطرناک ثابت ہوگی، تو اس کا کیا علاج ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان کی اکثریت تو کسی طرح کم ہو نہین سکتی یہانتک کہ وہ قوت بھی جس کے اعتماد پر ہم اپنی اقلیت کے توازن کو قایم کرنا چاہتے ہین اس کا کوئی مداوا اپنے پاس نہین رکھتی ۔ پھر صورت یہی رہجاتی ہے کہ اپنی کیفیت سے ان کی کمیت کو دور کیا جائے ۔ یا پھر انتظار کیا جائے اُس وقت کا جب اکثریت کے حقیقی خطرات رونما ہون اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس کی مخالفت کیجائے ۔ لیکن قبل از وقت خواہ مخواہ وہم و قیاس کی بنا پر رعشہ براندام رہنا اور اس طرح اپنے طرف سے بے اعتمادی پیدا کرادینا بالکل خلاف عقل و مصلحت ہے ۔

یہ بالکل درست ہے کہ نوآبادی کا سا مرتبہ ہندوستان کو ملجانا کوئی قابل فخر بات نہین، لیکن نہرو رپورٹ مین ہمکو کسی ایک جگہ بھی یہ نظر نہین آتا کہ وہ صرف اسی پر قناعت کرلین گے ۔ ترقی ہمیشہ تدریجی ہوا کرتی ہے اور زیادہ بلندی پر چڑھنے والے ایک ہی ایک زینہ طے کیا کرتے ہین ۔ وہ سمجھتے ہین کہ مکمل آزادی کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب اس کا مطالبہ زبان سے نہین بلکہ عمل سے کیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ نوآبادیون کی سی آزادی ملنے کے بعد ہم مکمل آزادی سے قریب تر ہوجائین گے اور پھر ہمارا مطالبہ ایک غلام ملک کا سا مطالبہ نہ ہوگا ۔ اس لئے مسلمانون کا یہ سمجھنا کہ نہرو رپورٹ کا انتہائی نقطۂ نظر مکمل آزادی نہین ہے، نادرست ہے، بیشک نہرو رپورٹ مین خامیان بھی ہین اور وہ کونسی انسانی کوشش ایسی ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہو ۔ لیکن وہ تمام خامیان عملی دنیا مین آکر جب قانون اساسی مرتب ہوگا دفع ہوجانے والی ہین ۔ البتہ صرف ایک خامی ایسی ہے جس کو اس سے پہلے ہی اصولاً دور ہوجانا چاہئے اور وہ یہ کہ صوبہ کی حکومتون کو بھی مرکزی حکومت

کی طرح آزاد ہونا چاہئے سوائے ان مسایل کے جن مین صرف مرکزی حکومت ہی کا فیصلہ کسی فتنۂ عام کو روک سکتا ہے۔ لیکن مسلمانون کو اس کا مطالبہ انتقام کے خیال سے نہ کرنا چاہئے بلکہ صرف اس لئے کہ اگر صوبہ کی حکومتین آزاد نہ ہونگی تو ملک کبھی ترقی نہین کر سکتا۔

بہرحال اس وقت لیبر پارٹی کے برسراقتدار ہونے سے اک ضعیف سی امید قایم ہوگئی ہے کہ ممکن ہے اختتام سال تک ہندوستان کو نوآبادیونکی سی حکومت ملجائے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو پھر غور طلب امر یہ ہوگا کہ کلکتہ کانگریس کا الٹی میٹم کیونکر کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ ہر چند وہ متفقہ قوت جو اس سے قبل ترک موالات کو کامیاب بنانے مین ظاہر کی گئی تھی اب مفقود ہے اور ایک زمانہ چاہئے کہ کانگریس پھر وہی اعتماد حاصل کر سکے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ سب سے زیادہ کارگر حربہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف ترک موالات اور سودیشی مال کا بائیکاٹ ہے اور اگر ہم لوگ واقعی اس کی اہمیت سے واقف ہو جائین تو تمام مشکلات ایک ہی سال کے اندر حل ہوئی جاتی ہین۔

اس ماہ کی اشاعت مین پہلا مضمون جناب عبدالقیوم صاحب رسا کا ہے۔ اس کی اہمیت کے متعلق مین اس کے ابتدا مین اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہون۔ اس مضمون کے آیندہ ابواب مین براہ راست انگلستان اور ہندوستان کے موجودہ تعلق اور ایسے مستقبل پر نہایت ہی مدبرانہ اور دلچسپ بحث کی گئی ہے "سیاسیات" مین ایسے ہی مضامین کی ضرورت ہے اور ہر باشندۂ ہند کا فرض ہے کہ وہ اس نوع کی پختہ کارانہ تنقیدون کو نظر غور سے پڑھے۔

"برہانپور" پر جناب مولوی سید احمد اللہ صاحب قادری کا مضمون بہت محققانہ ہے۔ صاحب موصوف نے حیدرآباد سے ایک رسالہ سہ ماہی تاریخ" کے نام سے جاری کیا ہے جس کے دو نمبر شایع ہو چکے ہین۔ آپ کا تعلق دکن کے آثار قدیمہ سے ہے اور آپ اپنی عمر کا بڑا حصہ "صناوید عجم" کی تحقیق مین بسر کر چکے ہین۔

"تصوف اسلام" پر مولوی عبدالمالک صاحب آروی کا مضمون قابل داد ہے۔ اس کے آیندہ حصہ مین "خواب" کے متعلق بہت کافی اور دلچسپ مواد صاحب موصوف نے پیش کیا ہے۔

"شیطان کی آنت" مسٹر رشید احمد صدیقی ام اے (علیگ) کا عطیہ ہے جس کا وعدہ انھون نے کیا تھا۔ ایک نہایت ہی مختصر سا فسانہ "دوے بخیر گزشت" مسرالکھا ہوا ہے جس کو اگر آپ نے حقیقت نہ سمجھ کر پڑھا تو بے لطفی کی ذمہ داری میرے سر نہ ہوگی "پرستار محبت" مین جناب محشر عابدی نے اپنے اور افسانون سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اور "تصویر کی موت" مین نقاشی کے حقیقی معیار کو ظاہر کیا گیا ہے۔

در حصۂ منظومات مین جناب مولوی سید علی اختر صاحب کی نظم اسقدر بلند پایہ اور الفاظ و معنی دونون لحاظ سے اسدرجہ پاکیزہ ذوق و معیار کی ہے کہ معمولی رسمی الفاظ سے اس کی داد نہین دیجا سکتی۔

روش صدیقی کی نظم "مغنیۂ مصر" اور جناب طالب باغپتی کی نظم "آجا" دونون اپنی اپنی جگہ خوب ہین اور حقیقت یہ ہے

کہ جس نظم مین صحیح جذبات سے کام لیا جاتا ہے، وہ فن کی لغزشون کے باوجود بھی اپنا اثر چھوڑے بغیر نہین رہتی۔
روش صدیقی کی نظمون مین جو ایک خاص مستانہ پن ہوتا ہے وہ اس مین بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے اور جناب طالب نے جا بجا "نقطون" سے جگہ پُر کرکے اپنی نظم کو بہت کچھ واقعیت سے وابستہ کردیا ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ اس کے لفظ لفظ سے ایک والہانہ انداز ظاہر ہو رہا ہے۔

نیاز

ایک ادبی و علمی دعوت

جنوری ۱۹۲۸ء کی اشاعت نگار کو مومن کے لئے مخصوص کرکے مین نے اپنے آپکو گویا پابند بنالیا ہے کہ ہر سال کسی نہ کسی ایسے شاعر کی یاد کو تازہ کیا جائے جس کے مٹانے مین زمانہ نے اپنی پوری قوت صرف کردی ہے۔
چنانچہ ارادہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۰ء کا نگار "ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کیلئے مخصوص کردیا جائے اور کم ازکم دو سو صفحات کو محیط ہو اس سلسلہ مین جو عنوانات قایم کئے گئے ہین، یہ ہین:۔
(۱) ظفر کی سیرت اور اس کے عہد کے تاریخی خصوصیات (۲) عہد ظفر کے سیاسیات (۳) ظفر کی شاعری اور اسکی خصوصیات (۴) عہد ظفر مین دہلی کی شاعری (۵) ظفر کی شاعری پر سیاسیات وقت کا اثر (۶) دربار ظفر اور عہد ظفر کے شعراء (۷) ظفر کے عہد مین دہلی کی علمی و ادبی فضا (۸) ظفر رنگون مین (۹) حالی و آزاد کی رائے ظفر کی شاعری کے متعلق اور اسپر محاکمہ (۱۰) انتخاب کلام ظفر۔

امید ہے کہ ملک کے ارباب علم و ادب

عنوانات بالا مین سے کسی عنوان پر یا ایک ہی مضمون کے سلسلہ مین ان تمام یا چند عنوانات پر اپنی تحقیقات و معلومات بھیجکر ممنون فرمائینگے۔ انتخاب کلام ظفر کی خدمت ادارۂ نگار نے اپنے ذمہ لی ہے اسلئے اسپر کسی کو وقت صرف کرنیکی ضرورت نہین۔
اسی سلسلہ مین غالباً یہ عرض کردینا بے محل نہ ہوگا کہ بہترین مضمون کے لئے نگار کی طرف سے ایک حقیر ہدیہ سو روپیہ کا پیش کیا جانا قرار پایا ہے۔ جو کامیاب مضمون نگار کی خدمت مین ٹھیک ۲۵ رجنوری ۱۹۳۰ء کو روانہ کردیا جائیگا۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۹ء تک مضامین کا دفتر نگار مین پہونچ جانا ضروری ہے۔

نیاز فتحپوری (ایڈیٹر نگار، لکھنؤ)

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

اور قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

"سرجان سیلی کی ایک مشہور کتاب (Expansion of England) ہے جس مین انگلستان کی توسیع پر بحث کرکے بہت سے سیاسی، تاریخی اور اقتصادی رموز کو آشکارا کیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ ہندوستان سے متعلق ہے جس مین خصوصیت کے ساتھ قبضۂ ہندوستان کی داستان بیان کی ہے اس دوسرے حصہ کا ترجمہ ہمارے فاضل دوست جناب عبدالقیوم صاحب رسا (گورکھپور) نے بغرض اشاعت "نگار" کو روانہ کیا ہے جو بالاقساط شایع ہوکر بعد کو کتابی صورت مین پیش کیا جائیگا۔

یہ سلسلۂ مضمون نہایت اہم و دلچسپ ہے اور ہر اس شخص کو جو ہندوستان کا باشندہ ہے اسکا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

ہم جناب رسا کے ممنون ہین کہ انھون نے یہ مفید سلسلۂ مضامین نگار کو مرحمت فرمایا۔ (اڈیٹر)

تاریخ اور سیاست بعض اوقات لوگ ایسے مورخین کا مذاق اُڑاتے ہین جو محض قیاسات کی بنا پر کہتے ہین کہ اگر فلان واقعہ تاریخ مین یون واقع ہوا ہوتا تو نتیجہ کے لحاظ سے اسکا یہ اثر ہوتا۔ لیکن جو لوگ ایسا کرتے ہین وہ غلطی پر ہین کیونکہ انھین معلوم نہین کہ مورخین کو ایسے قیاسات سے اصولی بحث کے لئے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔ میرے خیال مین انھین اور زیادہ آزادی سے اس قسم کی قیاس آرائیون مین حصہ لینا چاہئے۔ اہم واقعات عامہ کے متعلق یہ خیال کرنا کہ چونکہ وہ اعلیٰ پیمانہ پر ہین اسلئے اُنکے محرک اسباب روزمرہ کے معمولی واقعات کے محرکات سے غیر معمولی ہونگے صریح دھوکا ہے اور یہی غلط خیال فیصلہ کی تخریب کا باعث ہوتا ہے۔ جب تک تم کسی ملک کی جزوی حکمت عملیون پر غور کرنے سے قاصر رہوگے تم اسکی قومی حکمت عملی کے متعلق بھی صحیح راے قائم کرنے سے قاصر رہوگے۔ یہ ریمارک توسیع انگلستان جیسے پیچیدہ اور لبسیط مسئلہ پر بالکل ٹھیک منطبق ہوتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر انگلستان کے تعلقات دنیائے جدید سے نہ ہوے ہوتے تو ملکۂ الزبتھ کے عہد سے لیکر اسکی پوری تاریخ کس قدر مختلف ہوتی! ہسپانیہ کے جنگی بیڑہ کا وجود کیونکر ہوتا، ڈریک (Drake) اور ہوکنز (Hawkins)

ہندوستان کے باشندے جسمانی، دماغی اور اخلاقی تمام حالات مین ہم سے جداگانہ واقع ہوے ہین۔ دیکھو یہان پر سیاست تاریخ مین کس طرح جذب ہو جاتی ہے لیکن مین اس سے زیادہ، اسی مثال سے، تمھین یہ بتانے کے لیئے بیچین ہون کہ تاریخ سیاست مین کیونکر جذب ہو جاتی ہے اس سلطنت کے قیام کو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ اگر ہم ان نوآبادیات سے جنھین ہم کھو چکے ہین تعرض نہ کرین اور صرف انھین مقبوضات کو مدنظر رکھین جواب ہمارے پاس موجود ہین تو گویا ہمارے پیش نظر وہ ممالک ہین جو تقریبًا سارے کے سارے جارج ثانی اور جارج ثالث کے عہد حکومت مین فتح ہوے تھے۔ اسی عہد کو طلبہ عہد جدید سمجھکر چھوڑ دیتے ہین اور یہی وہ عہد ہے جسکو ادنی مورخین نظرانداز کر جاتے ہین۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس اس خاص حصّہ کو غیر اہم اور قابل تدبر واقعات سے معرا سمجھتے ہین یعنی اس دور مین تہذیب اور ملکی فلاح مین کوی نمایان ترقی نہین ہوی۔ ہمارے مورخین جب اس باب مین قدم رکھتے ہین تو انکا انداز نگارش ادیبانہ ہو جاتا ہے۔ واقعات تو بیان کرتے ہین لیکن بے معنی۔ جس سے خواہ مخواہ پڑھنے والون کے دماغ پر برا اثر پڑتا ہے۔ وہ سمجھتے ہین کہ تاریخ انگلستان ایک کہانی ہے جسکا کوئی نتیجہ نہین۔ اب تم سوچو اس مرض کا کیا علاج ہے۔ مین نے مستقبل کے عظیم الشان واقعات کی طرف تمھارے خیال کو منعطف کیا ہے مگر چونکہ انکا تعلق زمانہ آئندہ سے ہے، ہمین انکی نسبت پوری معلومات نہین ہین البتہ یہ کہہ سکتے ہین کہ وہ واقعات رونما ہو کر رہینگے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے غیر معمولی ہونگے۔ یہ واقعات انگلستان نوآبادیات اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کی آیندہ ترقی سے پیدا ہونگے۔ مین نے آیندہ کی قید اسواسطے لگائی ہے کہ موجودہ صورت بادی النظر مین یقینی اور ہمیشہ رہنے والی نہین معلوم ہوتی۔ مگر ہم یہ نہین بتا سکتے وہ ارتقا کس قسم کا ہوگا۔ آیا کوئی عظیم انقلاب ہوگا، آیا کناڈا اور آسٹریلیا آزاد ہو جائینگے آیا ہندوستان ہمین چھوڑنا پڑیگا۔ اور کوئی ملکی حکومت جو ابھی وہم وگمان مین بھی نہین ہے والسرائے اور انکی کونسل کی جگہ سنبھالیگی؟۔ یا بالکل اسکے برعکس کچھ اور ہوگا۔ آیا برطانیہ عظمٰی اس سے بھی اعلٰی نظام کے ماتحت آجائیگا آیا اہل انگلستان جو متعدد سمندرون کی وجہ سے منتشر ہین موجودہ ایجادات اور تجربات کی مدد سے اضلاع متحدہ امریکہ جیسا کوی باضابطہ نظام قائم کرینگے جس مین باوجود غیر محدود ملکی وسعت کے پوری آزادی اور اتحاد برقرار رہے۔ یا ہم اس سے بھی زیادہ مشکل عقدہ کے حل کرنے مین کامیاب ہونگے آیا ہندوستانی حکومت کے لیئے کا کوئی اطمینان بخش طریقہ ہمین معلوم ہو جائیگا جسکی مدد سے یہ دو مختلف العادات اقوام باہم متحد رہین، مین نہین جانتا کہ یہ سوالات کس طرح حل ہونگے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ کسی نہ کسی طرح حل ہونگے۔ اور یہی وہ منزل مقصود ہے جسکی طرف انگلستان گامزن ہے۔ جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے ہمین یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ انگلستان مین مزید ترقی و وسعت کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور ہماری موجودہ حالت فلاح وخوشحالی کی اعلٰی ترین منزل ہے۔ ہرگز نہین گو ہماری رفتار سابقہ اعلٰی پیمانہ پر ہونیکی وجہ سے محسوس نہ ہوتی ہو لیکن جسوقت انقلابات اور تنازعات ہونگے تو اعلٰی پیمانہ ہی پر ہونگے۔ اور جب وہ نازک موقع آجائیگا تو ہماری گذشتہ تاریخ صاف طور سے نمایان اور نتیجہ خیز نظر آئیگی

وہ تمام حیرت انگیز ترقی اور وسعت جو جارج ثانی کے عہد سے ہوتی آئی ہے اور جسکو پڑھکر ہم متحیر ہوتے ہین، اُسوقت بالکل
مختلف طور سے ہمارے دماغ کو متاثر کریگی۔ آج جب ہم کناڈا اور آسٹریلیا کے وسیع ممالک کو دیکھتے ہین تو ششدر رہجاتے
ہین لیکن اُنکے متعلق کوی قطعی راے نہین قائم کرسکتے۔ اسی طرح جب ہندوستان کی فتح کا حال پڑھتے ہین، کہ ایک
انگریزی تجارتی کمپنی نے ۲۰ کروڑ ایشیا والون کو مسخر کرلیا تو حیرت زدہ رہجاتے ہین۔ اور کمپنی کو آفرین کہتے ہین۔ مگر ہم
کوئی معقول راے نہین قائم کرتے۔ یہ تمام باتین اسقدر تعجب آمیز اور مناسبت سے بعید معلوم ہوتی ہین کہ [illegible] سے
گرجاتی ہین۔ لیکن وقت خود اس معمہ کو حل کریگا اور بتائیگا کہ اس کامیابی مین کیا اصلیت تھی اور کیا نہین! واقعہ
ہمکو دکھا دیگا کہ اٹھارھوین صدی مین دنیاے جدید پر قبضہ کرنیکی کوشش کیا تھی، آیا اسکا انجام کسی اُستوار سلطنت
کے قیام کی صورت مین ظاہر ہوا یا اسکی حقیقت محض غیر مستقل تجارتی سلطنت کی تھی جو اسپین کی طرح چند دنون مین
فنا ہوجانے کے لیئے پیدا ہوئی تھی! آیا ہندوستان مین مشرق ومغرب کے مابین مستحکم اتحاد کے خوشگوار نتیجے ظاہر ہوے
یا کلایو اور ہیسٹنگز نے ایسی عظیم الشان مہم اپنے سر لی جو ایک صدی کی ظاہری کامیابی کے بعد ناکامی مین ختم ہوجانیوالی تھی
زمانہ ہر شخص کو یہ سبق یکسان طور پر بتادیگا۔ لیکن، اگر یہ کوئی مفید شے ہے، تو تاریخ کو مستقبل کی باتین ضرور کسیقدر
اشارون مین بتادینا چاہیئے۔ واقعہ کے بعد بلاشبہہ ہم سب ہوشیار ہوجائینگے لیکن تاریخ کا مطالعہ صرف اسی واسطے
کیا جاتا ہے کہ وقوع سے قبل ہی ہم کسی واقعہ سے باخبر ہوجائین۔ کیون نہین ہم بھی نوآبادیات اور ہندوستان کی قسمت
کے متعلق کوی راے قائم کرلیتے؟ اسلیئے کہ یہ کوئی ایسا معمولی کام نہین جسکو بلا سوچے سمجھے کردیا جاے۔ اسکے لیئے فن
سیاست کے اصول سے واقفیت ضروری ہے۔ جب کوئی واقعہ پردہ غیب سے ظہور مین آئیگا تو بات روشن ہوجائیگی
اور ہر شخص کو کم یا زیادہ معلوم ہی ہوجائیگا کہ جو کچھ واقع ہوا ہے اُسکو ہونا ہی تھا۔ اگر ایسا ہے تو فن سیاست کے
پڑھنے والون کو صاف صاف نہین تو مجملاً وہ واقعات معلوم ہوجانا چاہیئے جو ابھی پردۂ غیب مین ہین۔
کیا یہ ملحوظات ایسے نہین ہین جو انگلستان کی جدید تاریخ کو بالکل نئی روشنی مین پیش کرین۔ مین تمھین بتا چکا
ہون کہ سولھوین صدی کے آخر مین انگلستان بالکل ایک نئے راستہ پر قدم رکھ رہا تھا۔ سترھوین صدی مین جو
جو ترقیان اس منزل مین ہوئین اور اٹھارھوین صدی مین جو کثیر نتائج رونما ہوے انکی تفصیلی تاریخ بیان کرچکا
ہون علاوہ ازین مین نے یہ بھی جتادیا ہے کہ ہماری موجودہ حالت غیر مستقل ہے، اس مین کوئی اہم تبدیلی عنقریب ہونیوالی ہے
خلاصہ یہ ہے کہ انگلستان کی تاریخ جدید ہمارے سامنے ایک مشکل سیاسی مسئلہ پیش کرتی ہے۔ دیکھو اس طرح تاریخ سیاست
مین جذب ہوتی ہے۔ مین جارج ثانی اور جارج ثالث کے زمانہ حکومت کو تمھارے سامنے اسواسطے نہین بیان کرتا کہ تم قدیم
روایات و رسوم کا حال پڑھکر اپنا دل بہلاؤ بلکہ اسواسطے کہ پیچیدہ سیاسی مسائل کے حل کرنے کے لیئے تم مواد اور ضروری
سامان فراہم کرو۔ اگر تم یہ دریافت کرنا چاہتے ہو کہ ہماری سلطنت کا حشر کیا ہونیوالا ہے تو اسکے مدد و معین اسباب وجود

اور ان اصول کا مطالعہ کرو جن پر اسکی زندگی کا انحصار ہے۔ اور اگر اسکی نوعیت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہو تو اسکی تاریخ پڑھو خصوصاً ابتدائی تاریخ۔

ایک عرصہ سے رنگینی پسند مصنفین کا خیال ہے کہ تاریخ کا طرز بیان ضرورت سے زیادہ رفیع اور شاندار ہے اور یہ کہ تاریخ مین ہر واقعہ جزئی تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان ہونا چاہئے، غیر مانوس واقعات سے احتراز کرنا چاہئے الغرض اُنکے خیال مین تاریخ اور ناول کا انداز تحریر ایک ہونا چاہئے۔ لیکن مین بھی، اس خیال کے متعلق جو اتنے عرصہ سے قائم ہے، اپنی رائے ظاہر کر دینا چاہتا ہون جس اعتراض پر اس خیال کی بنا ہے مجھے اس سے انکار نہین ہے۔ مجھے اس خیال سے پوری موافقت ہے کہ تاریخ کو "شاندار" اور "ادبی" نہین ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی ساتھ مین یہ تسلیم کرتا ہون کہ ایک زمانہ تک تاریخ "شاندار" اور "ادبی" رہی ہے۔ لیکن "شاندار" ہونا اور چیز ہے اور اہم ہونا اور چیز۔ وہ طبقہ جو اس خیال کی ہمنوائی کرتا ہے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ چونکہ تاریخ کا طرز تحریر اعلیٰ، نہین ہونا چاہئے لہذا اسکو سنجیدہ، بھی نہین ہونا چاہئے۔ اِسکو انکار ہے کہ تاریخ سے ٹھوس اور اہم اصول مترتب ہو سکتے ہین اسکا ادراک اس بات کے تصور سے عاجز ہے کہ تاریخ کی مدد سے بڑی بڑی معلومات بھی حاصل ہو سکتے ہین۔ یہ طبقہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تاریخ کا طرز نگارش دلفریب اور دلکش ہو، جسکو پڑھکر پرانی قومون کے قدیم عادات و طریق معاشرت کا نقشہ آنکھون مین پھر جائے اور اُنکے کارنامون کو پڑھکر وہ مبہوت اور حیرت زدہ رہ جائے۔ تھیکرے نے جو لکچر اسٹیلے پر دیا تھا اس مین تمہید ہی مین اُسنے اس طبقہ کے اصول کو بڑی صفائی سے بیان کیا ہے۔ اسکو ہر شخص نے پڑھا ہوگا اور میرے خیال مین بہت تلخ حقیقت متصور کیا ہوگا۔

وہ کہتا ہے تاریخ کے مطالعہ سے ہماری کیا غرض ہے؟ آیا سیاسی معاملات اور مشاہیر کے اطوار سے واقفیت حاصل کرنا یا محض زمانہ کی حقیقت اور حالات سے آگاہ ہونا۔ اگر ہمارا مدعا یہی ہے تو پھر دیانت اور سچائی کہان رہی، کسکو یقین ہے کہ تاریخ بالکل سچ کہتی ہے۔ اسکے بعد وہ کہتا ہے کہ تاریخ مین جس قدر طبقہ عام کے برگزیدہ اشخاص کے متعلق اعلیٰ خیالات ظاہر کئے گئے ہین وہ بالکل لغو ہین کیونکہ اگر اُنکے متعلق نظر تدقیق سے کام لیا جائے تو انمین کا کوئی بھی معیار صداقت پر کھرا نہین اتر سکتا۔ اور بطور استناد کے حوالہ مین سوفٹ کی "خصائل الاتز" اور کاکس کی "سوانح مار لبرو" کو پیش کرتا ہے۔ تاریخ کے متعلق یہ خیال صرف اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ لوگون نے قدیم طرز کی ان جیسی تصانیف کو مستند کتب تاریخ سمجھا۔ لیکن اب جبکہ تھیکرے کے قول کے مطابق سیاسی تاریخ بالکل لغو ٹھہری تو پھر اسکی جگہ اور کون سی تاریخ مانی جائے؟

تھیکرے کے اس مقولہ کا کیا مطلب ہے کہ تاریخ کی غایت، "زمانہ کی حقیقت اور حالات سے واقفیت حاصل کرنا ہے" آگے چلکر وہ خود اسکی تشریح ان الفاظ مین کرتا ہے "جب ہم ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کے دلچسپ مجلدات پڑھتے ہین تو زمانہ گذشتہ کا فوٹو اپنی تمام جزئیات کیساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور وہ انگلستان جو ہمارے آبا و اجداد کے وقت مین تھا

صاف صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ عبادتگذار دن سے گرجا بھرا پڑا ہے، قہوہ خانون مین شہر کے ہر گوشہ سے لوگ سمٹ سمٹا کر چلے آرہے ہین، عورتین کھلونون کی دوکانون کو ہر طرف سے گھیرے کھڑے ہین، شارع عام پر راہگیرونکی چیخ و پکار سے عجب چہل پہل معلوم ہوتی ہے،" غرضکہ اسی قسم کی معاشرت کا نقشہ کھینچتے ہوے مورخ مذکور کہتا ہے " ان حکایات مین ان تصانیف سے جنکو حقیقت پر مبنی ہونے کا دعوی ہے، زیادہ واقعیت اور صحت ہے۔ زمانہ کے حالات کا جتنا پتہ ان کتب افسانہ سے چلتا ہے اتنا سنجیدہ " تاریخ سے نہین۔ اور جو لطف ان افسانون کے پڑھنے مین آتا ہے کسی تاریخ کے مطالعہ سے آسکتا ہے ؟ "

اگر کوئی افسانہ نویس ایسا خیال ظاہر کرے تو عین مناسب ہے۔ جب بریڈ کے مشہور انجینر سے کسی نے سوال کیا کہ دریا کسلئے پیدا کئے گئے تو اُس نے برجستہ جواب دیا " تاکہ نہرون مین پانی پہونچائین " اور تھیکرے سے جب پوچھا گیا کہ " ملکہ این کی زندگی کا کیا مقصد تھا اور ڈیوک مارلبرے کے عہد حکومت مین اہل انگلستان نے فرانس سے کیون جنگ کی تو اُسنے بڑی صفائی سے کہا " تاکہ مین اپنا دلچسپ ناول، اسمنڈ لکھون،" درحقیقت اسکا اپنا یہی خیال تھا لیکن اس مسخرے کو یہ کہنے کی جسارت کیونکر ہوئی ؟ تم نے دیکھا وہ کس بیباکی سے ہمین شک وشبہ مین پھنسانا چاہتا ہے اسکو انکار نہین کہ تاریخ بشرطیکہ صحیح ہو از بس اہم ہوگی۔ اسکا قول ہے کہ تاریخ مین کبھی صداقت آ نہین سکتی۔ اور اسکو تاریخ کے ایک لفظ پر یقین نہین ہے۔

اس صورت مین ہمارے لئے کیا چارہ کار ہے۔ کیا ہم تھیکرے کی نصیحت پر عمل کرین۔ آیا تاریخ کو ایک مفید اور سنجیدہ قابل مطالعہ فن سمجھنے کی بجاے محض ایک تفریح طبع کا سامان سمجھین، آیا محاربات یوروپ سے بے اعتنا ہوکر پریوشان نازک خرام کی سیر کا تماشہ دیکھین یا اپنے قدما کے طرز حکومت کا مطالعہ کرنیکے عوض انکے اسباب معیشت کی بہتات اور رنگینی کو دیکھکر خوش ہون۔ اگر تم غور کروگے تو تمھین ایک نیا راستہ نظر آئیگا جو سراسر دوسری سمت کو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر تاریخ ناقابل اعتماد اور غلط ہے جیساکہ کسی زمانہ مین تھی تو تم اس مین ترمیم و تنیخ کرو اسکو صحیح اور اغلاط سے پاک کرنیکی کوشش کرو۔ کوئی وجہ نہین کہ یہ ناممکن ہو۔ تاریخ کا غالب حصہ تو ان ملوثات سے پاک ہے البتہ دور جدید کے چند ابواب باقی ہین۔ لوگون کو عام طور سے معلوم نہین کہ تاریخ مین کیا کیا اضافہ ہوا ہے۔ تاریخ پر جو بیجا اور مہمل اعتراضات آج اُسکے ناقابل اعتماد ہونے پر کئے جاتے ہین کسی زمانہ مین حق بجانب اور معقول تھے۔ لیکن آج اسکا غالب حصہ واقعیت پر مبنی اور صحیح ہے، اس سے سیاسی اصول بآسانی مستنبط ہو سکتے ہین۔ تاریخ جیسی اب شاندار ہے کبھی نہین تھی بلکہ شروع سے آخر تک حد درجہ سنجیدہ۔ اب یہان پر پھر تمھارے آگے دو کام ہین پہلا یہ کہ بجاے تھیکرے کے قول پر عمل کرنیکے تاریخ کو زیادہ اہم اور پُراز غوامض سمجھو دوسرا یہ کہ اسکو واقعیت اور صداقت سے معرا سمجھکر چھوڑ نہ دو بلکہ وقت نظر اور محنت سے اُسکی تحقیق و تفتیش کرو۔ —— اگر تاریخی صداقت قابل حصول فرض کر لی جائے، تو پھر اس کی رفعت اور اہمیت مین کسی کو کلام نہین ہو سکتا۔ تاریخ کے صفحات، مہتم بالشان واقعات عالم، سلطنتون کے اسباب عروج و زوال، جنگ اور امن کی داستانون اقوام انسانی کی خوشحالی اور آفات کے واقعات سے مملو ہین۔ یہی وہ باتین ہین جنکی رعایت سے

مین تاریخ کو سیاست مین جذب کرنیکی کوشش کر رہا ہون - مین تم سے کہتا ہون کہ انگلینڈ کی گذشتہ تاریخ کا مطالعہ اسکے مستقبل کا مطالعہ ہے جب تم اپنے ملک کی تاریخ پڑھتے ہو تو تمھارے پیش نظر ملک کی فلاح و بہبود، اور بحیثیت ایک شہری ہونے کے تمھاری تنہا غرض وہی ہوتی ہے - اس نکتہ کو واضح کرنے کے لئے مین تمھارے سامنے توسیع انگلستان، کا مضمون بیان کرونگا - کیونکہ مسئلہ ان تمام سیاسی مسائل سے جن پر تمھین اپنی زندگی مین غور و فکر کرنے کا موقع ملا ہوگا، زیادہ نازک اور اہم ہے اور اسی پر ہمارے مستقبل کا دار و مدار ہے - اسکی چھان بین اور تدقیق کیلئے تاریخ انگلستان جدید سے کمال واقفیت کی ضرورت ہے - کیونکہ، جیسا مین نے بیان کیا ہے، انگلینڈ گذشتہ تین صدیون سے برابر برطانیہ عظمی کی توسیع مین مصروف رہا ہے - لہذا اگر تم برطانیہ کے مستقبل کا اجمالی نقشہ دیکھنا چاہتے ہو تو انگلینڈ کی گذشتہ تین صدیون کی تاریخ پر عبور حاصل کرو - جون ہی تم نے تحقیقات کی غرض سے مسائل ہند اور نو آبادیات پر عقل سلیم سے غور کرنا شروع کیا، ایک سوال کے بعد دوسرا سوال، ایک سلسلہ کے بعد دوسرا سلسلہ تمھارے سامنے آتا جائیگا یہان تک کہ ان دو سوالات کے ساتھ تاریخ انگلستان کے دور جدید کی تمام کڑیان تمکو منسلک نظر آنے لگین گی - تاریخ انگلستان پر عبور حاصل کرنے کا یہی واحد اور بہترین طریقہ ہے - کیونکہ تاریخ مین حکایات کو اشکال و مسائل کا جامہ پہنانا ہی اصل چیز ہے جب تک تم فن تاریخ کو محض تاریخی حکایات نویسی تصور کروگے تم ادبی معنی آفرینی کی حد سے آگے نہین بڑھ سکتے - اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ حقائق پسند ہین انکی نظرون مین تاریخ بے وقعت اور بے اعتبار ہو جائیگی - واقعہ نگاری کے طلسم کو توڑو اور حکایات کو علمی سوال کی صورت مین اپنے سامنے رکھو، پھر دیکھو کہ تمھارے دماغ کا رجحان کسقدر انوکھا ہے - تمھاری حیثیت اسوقت ایک لائق محقق کی ہوگی نہ کہ لٹریری مورخ کی - اس مقام پر پہونچکر انگلینڈ کی تاریخ جدید دو حصون مین منقسم ہو جاتی ہے، پہلا حصہ نو آبادیات کا مسئلہ اور دوسرا ہندوستان کا -

علاوہ ازین وہ اسباب جنکی بنا پر متمدن ممالک مین مطالعہ تاریخ ناگزیر ہے، انگلستان مین ساری دنیا سے قوی تر ہین ہماری قوم کی عالمگیری نے انگریزی سیاست مین حیرتناک پیچیدگی اور مشکل پیدا کر دی ہے - میرے خیال مین دنیا کی کسی اور سلطنت مثلاً فرانس، جرمنی، امریکہ کو باستثنائے روس ایسے پر پیچ معاملات سے سابقہ نہین پڑا جیسے کہ انگلینڈ کو - انمین کی بعض سلطنتین گو متعدد اندرونی ریاستون سے مرکب ہونیکی وجہ سے وسیع ہین لیکن وہ سب بایکدگر پیوستہ ہین اور ان پر غنیم کا حملہ صرف مقامی ہو سکتا ہے - اس صورت مین انکی تمام فوج شہریون سے ہی مرتب ہوتی ہے - لیکن جس سلطنت کے زیر نگین دور دراز کے بھی ممالک ہون اسکی پیوستگی متزلزل ہو جاتی ہے اور قومی مصالح کی پیش بینی اور تحفظ نہایت مشکل ہو جاتا ہے - چونکہ ہماری نو آبادیات منتشر ہین - دشمن ہم پر نہایت آسانی سے حملہ کر سکتا ہے - اگر ہم امریکہ سے برسر پیکار ہون تو سمجھو کہ محاذ جنگ کناڈا ہوگا اور اگر روس سے تو افغانستان - لیکن یہ بیرونی خطرات، ان اندرونی مشکلات سے جنکے ایک منتشر الاجزا سلطنت مین ہر وقت رونما ہونیکا ڈر لگا رہتا ہے کم قابل اندیشہ ہین - ان تمام ممالک کو

جو نصف کرۂ ارضی پر پھیلے ہوئے ہون، اگرچہ انکے باشندون کی قومیت اور خون ایک ہی ہو، متحد الخیال کرنا کوئی آسان کام ہے!۔ مگر بدقسمتی سے انگلستان کی مصیبت کی انتہا یہی نہین ہے۔ نوآبادیات کے علاوہ ہندوستان بھی ہماری سلطنت کا ایک جزو ہے جہان کے باشندے نہ ہمارے ہم قوم نہ ہم مذہب۔ یہان تو سرے سے وہ بات ہی غائب ہے جس پر ترک وطن اور قیام نوآبادی کی بنا ہوتی۔ یہ مسئلہ نوآبادیات کے مسائل سے بھی زیادہ شکل، بسیط اور مایوس کن ہے۔ کیا کسی تنہا قوم کے لیئے بیک وقت دو ایسے گران بار کا سنبھالنا اسکی طاقت اور ہمت سے باہر نہین ہے!

تم خود سوچو ان دونون متضاد مسئلون کا اثر عوام کے دماغ پر کسقدر مختلف ہوتا ہے۔ نوآبادیات مین ہر چیز نئی اور تازہ ہے جو قومین وہان آباد ہین اُنکے لئے ترقی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ نہ انکا ماضی ہے نہ کوئی ناپید اکنار مستقبل، حکومت اور ملکی مجالس ہر چیز مین انگریزی رنگ ہے۔ آزادی، صنعت و حرفت، ایجادات اور انقلابات کے باوجود وہان امن و سکون ہے برطانیہ عظمی کا دائرہ اگر صرف نوآبادیات تک محدود ہوتا تو باوجود غیر متناہی وسعت سلطنت کے ہم اسکے امور سمجھ سکتے تھے کیونکہ اس صورت مین تمام ترکیبی ممالک قومیت و مذہب مین متجانس ہوتے۔ مگر اس برطانیہ عظمی کے علاوہ ایک دوسرا برطانیہ بھی ہے جو اس سے رقبہ مین تو چھوٹا ہے مگر آبادی کے لحاظ سے بڑا ہے۔ ہندوستان مستقبل سے معرا سرتاپا ماضی ہی ماضی ہے عقلمند سے عقلمند شخص بھی ہندوستان کے مستقبل پر غور کرنے سے ڈرتا ہے۔ لیکن جب اُسکے ماضی پر نظر ڈالتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اُسکے بیشمار سلسلے طلسم آمیز قدامت مین جاکر غائب ہوجاتے ہین۔ تمام قدیم مذاہب اور رسوم وعادات گڈمڈ ہو کر ایک خاصا معجون مرکب ہوگئے ہین۔ جن مدارج تمدن کو یوروپ اور دنیاے جدید طے کر چکے ہین، ہندوستان ابھی ان سے گذر رہا ہے۔ باطل اور اوہام پرستی، مکارانہ مذہبی پیشوائی آج تک جاری ہے۔ مسئلہ تقدیر پر ایمان اور مستبد مطلق العنانی جیسی قدیم زمانہ مین تھی آج بھی ہے۔ وسط ایشیا کے ریگستانون کے رہنے والے ترک و تاتاری شمالی سرحد کو اپنے حملون سے آئے دن دھمکیان دے رہے ہین۔ اسطرح سے ایک ہی قوم جو ایک طرف تو کرۂ ارضی کے مستقبل کی مالک بنتی ہے اور یوروپ اور دنیا، جدید کے مابین خط نصف النہار کی حیثیت رکھتی ہے، دوسری طرف بعید اور بے پایان ماضی کے سمندر مین قدم ڈالتی ہے اور شاہان مغلیہ کو تباہ و برباد کرکے فاتح ایشیا کے لقب سے ملقب ہوتی ہے!

ایک ہی قوم دو متضاد پالیسی پر بغیر حیرانی کیونکر عمل کر سکتی ہے۔ ایشیا مین مستبد اور آسٹریلیا مین جمہوری حکومت کیونکر ہو سکتی ہے۔ ایک ہی وقت مین مشرق مین تو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی طاقت اور ہزارون تبکدون کی جائداد کی محافظ ہو اور مغرب مین آزادی خیال اور روحانی مذہب کی زبردست حامی بھی ہو وسط ایشیا مین تو روس کے مقابلہ کے لیئے ایک بڑی فوجی امپیریلزم کی حیثیت سے کھڑی ہو اور دوسری طرف کوئنس لینڈ اور منی ٹوبا کو آزاد نوآبادون سے بھرتی ہو۔ آغاز آفرینش سے آج تک کسی قوم کو ایسی ذمہ داریون سے سابقہ نہین پڑا ہوگا۔ کبھی ایک قوم کے فیصلہ پر کرۂ ارضی کے تمام حصص کے اتنے متعدد اور وسیع مسائل کا انحصار نہ ہوا ہوگا اور وہ مسائل بھی ایسے جو خاص لیاقت اور تعلیم کے

متقاضی ہون - تاہم یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس قوم کو اس ذمہ داری کا احساس کم ہے - یہ نوآبادیات اور ہندوستان کے مسائل کا مطالعہ نہین کرتی، انکو قابل توجہ نہین سمجھتی تاوقتیکہ یہ سیاسی حیثیت نہ اختیار کرلین - جب کسی وزارت کی قسمت کا معاملہ درپیش ہوجاتا ہے تو یہ مسائل حد درجہ قابل توجہ ہو جاتے ہین لیکن عوام انکو اسوقت تک لائق توجہ نہین سمجھتے جب تک کہ ہندوستان کی تمام آبادی کی قسمت جو کرہ زمین کے ایک وسیع خطہ پر پھیلی ہوئی ہے اور خود انگلستان کا مستقبل معرض بحث مین نہ آجائین - ہندوستان کے متعلق میکولے لکھتا ہے "ہر انگریز سے جسے تاریخ کے کسی حصہ سے بھی دلچسپی ہے یہ توقع کرنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ اس بات کو دریافت کرنے کے لئے بیچین ہو کہ معدودے چند انگریزون نے بہت تھوڑے عرصہ مین دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت کو کیونکر فتح کرلیا، تاہم اگر ہم سخت غلطی پر نہین ہین تو یہ مضمون اکثر ناظرین کی نظرون مین صرف مہمل ہی نہین بلکہ قطعاً پھیکا اور بے لطف ہے"

تسخیر ہندوستان اس توسیع کا ایک جزو ہے جس نے گذشتہ دو صدیون مین ہماری حالت کو اس شدت سے بدل دیا ہے اسکی تشریح آیندہ لکچرون مین کیجائیگی -

باقی ——— باقی

عبدالقیوم رسا

بنگالی ناولون کے ترجمے

بنگالی دلھن ایک نئی دلھن کے پرحسرت ارمان شوہر سے جدائی کی تکلیف نیک نیتی سے استقلال اور وفاداری کی تصویرین اسکی سلامت زبان دانی عبارت وغیرہ قابل دید وداد ہے - - - - - - - - - - ۱۰/

پرتاب ایک تاریخی ناول غدر ۱۸۵۷ء کا سنسنی خیز واقعہ نہایت بیجدار طریقہ سے لکھا گیا ہے جسمین درد عشق کوٹ کوٹ کر بھرا ہے طرز بیان نیا ہے نرالا ہے عشق حقیقی ومجازی کے ایسے دلکش و روشن پہلو دکھائے ہین کہ دیکھکر دل پر ایک گہرا اثر پڑتا ہے - - - - - - - ۱۰/

مرزانی عورتون کی وفاداری پر بحث عبرت ونصیحت کا خزانہ ۸/

اردو مرثیہ کی کتابین

کلیات مراثی مرزا دبیر یعنی مرزا سلامت علیصاحب دبیر ہر دو جلد عا

کلیات مراثی میر انیس مضمون آفرینی زبان فصاحت بلاغت غرض کوئی بات ایسی نہین جو اس باکمال کے کلام بلاغت نظام مین نہین پائی جاتی کامل ہر چہار جلد - - - - - - - للعہ

کلیات مراثی میر ضمیر یعنی کلام بلاغت نظام میر مظفر حسین صاحب متخلص بہ ضمیر استاد جناب مرزا سلامت علیصاحب دبیر - - عہ

مجموعہ مراثی مرزا دلگیر مرزا صاحب موصوف نہایت پرگو اور مشہور مرثیہ گویون مین سے گزرے ہین کامل ہرسہ جلد - - - (عہ)

"منیجر نگار"

تصویر کی موت

مین نے ایک عرصہ تک فن مصوری کے قیمتی آثار کی تلاش مین سارے زمانہ کی خاک چھانی اور میرے پاس قدیم وجدید مصوری کے عجیب وغریب نادر الوجود نمونون کا انبار جمع ہو گیا - آخر الامر میرا گذر ہندوستان مین ہوا - اُس سرزمین مین جو کسی وقت حیرت واسرار کا مخزن اور فنونِ جمیلہ کا سرچشمہ تھی اور جو ابتک دنیا کی نظرون سے پوشیدہ گمنامی کی حالت مین پڑی ہوئی ہے پہلے پہل مجھے لوگون کی زبانی معلوم ہوا کہ یہان اس فن جمیل کے آثار کی تلاش بیسود ہے - اور مجھے چند ناقص بھدی رنگین تصویرون کے نمونے بتلا کر کہا گیا کہ یہان صرف اس قسم کی تصویرین دستیاب ہو سکتی ہین - لیکن ایک شوقین محقق آثار کی حیثیت سے مین نے اس ملک کا گوشہ گوشہ شمال سے جنوب اور شرق سے غرب تک چھان مارا اور مطمئن ہون کہ مین اپنے مقصد مین ایک حد تک ضرور کامیاب ہوا کیونکہ اب میرے پاس یہان کی رنگین تصاویر، سنگین- برنجی - اور ہاتھی دانت کی منقش اشیا کی ایک قابل قدر تعداد جمع ہو چکی تھی -

اس آوارہ گردی کے سلسلہ مین ایک مرتبہ میرا گذر سہارنپور کے قریب ایک گاؤن مین ہوا جو سواک کی پہاڑیون سے کچھ دور واقع تھا - یہان مجھے ایک فقیر کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ ان پہاڑیون کے درمیان ایک غار مین رہتا ہے جسکی قیام گاہ عجیب وغریب پُر اسرار طلسمی تصاویر سے بھری پڑی ہے اور جسکی وجہ سے لوگ اُسے دیوانہ سمجھتے ہین - دوپہر کو کھانے سے فارغ ہو کر مین نے ایک رہنما کو ساتھ لیا اور اُس فقیر کی قیام گاہ کو روانہ ہوا - پُر پیچ ناہموار راستون سے گذرتے ہوئے ہم لوگ ایک کھلے ہوئے مقام پر پہونچے جو چارون طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیون سے گھرا ہوا تھا - یہ تنہا مقام سڑک سے بہت دور واقع تھا اور یہین ایک پہاڑی مین وہ غار نظر آتا تھا جو فقیر کا مسکن تھا - اسکے دہانہ پر ایک زبردست دروازہ پتھرون کو تراش کر بنایا گیا تھا جس پر طرح طرح کے بیل بوٹے اور نقوش کندہ تھے ہمارے قریب پہنچنے پر وہ شخص جو دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کھڑا ہو گیا - یہ ایک بلند قامت ضعیف شخص تھا جسکی داڑھی سینہ پر پھیلی ہوئی تھی عضا نہایت متناسب - رنگ گورا اور آنکھین روشن تھین - جسم پر فقیرون کا سا گیروا لباس تھا - مین نے اُسے جا کر سلام کیا - جسکا جواب دیکر وہ پھر خاموشی سے ہماری طرف دیکھنے لگا - مین نے اُس سے مخاطب ہو کر اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو مین جو مین اپنے پنج سالہ قیام ہند مین سیکھ سکا تھا کہا "باباجی - ہم آپ کی عجیب وغریب تصویرون کی خبر سن کر آئے ہین کیا آپ ہمین دیکھنے کی اجازت دینگے ؟" - اُسکی آنکھین فخریہ انداز سے چمکنے لگین - اور اُسنے کہا کہ ہان صاحب - آیئے اور شوق سے ملاحظہ فرمایئے - اور یہ کہکر وہ مجھے غار کے اندر لیچلا - یہ ایک وسیع کمرہ تھا جس مین کئی طرف دروازہ تھے اور جابجا ستون نصب کئے گئے تھے - اندرونی چھت بہت بلند تھی - اور کمرہ مین

ہرطرف اُجالا تھا۔ ایک طرف چارپائی بچھی ہوئی تھی اور کونے مین پیتل کے چند برتن رکھے ہوئے تھے۔ چارپائی کے نیچے ایک ٹوکری تھی جس پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ دیوارون پر چارون طرف چھوٹی بڑی تصویرین آویزان تھین۔

"کیا آپ مصور ہین؟"

"جی ہان۔ میری خواہش ہے کہ مین مصور ہون لیکن ہمارا فن آپکے فن سے بالکل جدا ہے۔"

مین دیوار کی آویزان تصویرون کو نہایت دلچسپی سے دیکھنے لگا اور بہت جلد اُنین محو ہو گیا۔ کچھ رنگین تصویرین جو قدیم نقاشی کا بہترین نمونہ تھین اب تک اچھی حالت مین تھین۔ انکی دلاویز رنگت کی تازگی اور چمک دمک مین کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بعض بعض تصویرون کی حسن صنعت اور کمال تشابہ سے برش کی ہلکی رنگ آمیزی کی شان ہویدا تھی لیکن اکثر مین تناسبِ اعضا کی بجائے اظہار جذبات کی خوبیان صاف جھلک رہی تھین۔ جا بجا مہاتما بدھ کے مختلف عہد ہائے حیات۔ ہند و علم الاصنام۔ اور عہد مغلیہ کی تصویرین آویزان تھین۔ جو زبانِ حال سے اس سرزمین خواب کی روح معاشرت۔ تاریخ اور مذہب کی داستان سنا رہی تھین۔ اور اُس زمانہ کے علوم و فنون کا مظہر تھین جبکہ باقی دنیا مین جہالت کی تاریکی مسلط تھی۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ آخر اس سرزمین کے گم گشتہ خزانے کس قعر گمنامی مین پڑے ہونگے؟ افسوس اسکا علم نہ تو اُسکے فرزندون کو تھا اور نہ فاتحین کو۔ صرف حسن اتفاق میرے سوال کو صدائے بازگشت کی طرح دُہراتا تھا کہ "آخر کہان؟" بلاشبہ ان مین سے کچھ تو دنیا کی نظرون سے پوشیدہ اس فقیر کے نگارخانہ مین موجود تھے۔ لیکن باقی ماندہ؟ آہ انکا کچھ پتہ نہ تھا۔ یکایک میری نظر ایک بڑی سی تصویر پر پڑی جو دروازہ کے سامنے دیوار پر سب تصویرون کے اوپر کچھ بلندی پر ٹنگی ہوئی تھی اور جس پر ڈوبنے والے سورج کی شعاعین پوری طور پر پڑ رہی تھین۔ یہ ایک حسین عورت کی تصویر تھی جسکی آنکھین پتھرائی ہوئی تھین اور دلِ مردہ تھا۔ آنکھین نیم باز۔ پتلیان سفید۔ اور چہرہ زردی مائل جس پر مردنی چھائی تھی۔ قد زیبا سے طمانیت برستی تھی۔ اور عنابی ہونٹ بالکل پھیکے نظر آتے تھے سر کے لانبے لانبے لہراتے ہوئے نرم بال جن مین شاید مصور نے کمال صنعت و چابکدستی سے کام لے کر موئے قلم سے ایک ایک کر کے کھینچا تھا دونون شانون پر پڑے ہوئے تھے اور خدوخال سے عجیب حسن و رعنائی کی شان ہویدا تھی۔ لیکن افسوس یہ حُسن بے روح اور اُسکی رعنائیان بے کیف تھین۔ تصویر کا فریم چکنے ہاتھی دانت کا تھا جس پر طلائی میناکاری کی گئی تھی۔ مین حیرت سے حسن و جمال کے اس رنگین مرقع کی طرف دیکھنے لگا جس پر موت کی رنگ آمیزی کی گئی تھی اور جو غار کی تاریک دیوار پر نمایان طور پر نظر آ رہی تھی۔ اتنے مین کسی کا ہاتھ میرے شانہ پر پڑا۔ مین چونک پڑا مڑ کر دیکھا تو فقیر پاس ہی کھڑا نظر آیا۔ اُسنے مجھے متحیر دیکھ کر کہا "صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تصویر سے بہت دلچسپی لے رہے ہین۔ شاید آپکو یہ سن کر اور تعجب ہوگا کہ اسکے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ کی یاد وابستہ ہے اگر آپ سننا چاہین تو مین بخوشی سنا سکتا ہون۔"

مین ہمہ تن شوق و التجا ہو کر اُسکی طرف دیکھنے لگا۔ اب سورج کی افسردہ کرنون سے غار مین ہرطرف اندھیرا چھا چکا تھا

اور سفید فریم کی وجہ سے تصویر اور بھی بھیانک نظر آ رہی تھی۔ اسنے کہا۔ میرے کمزور ہاتھ ضعیفی سے کانپتے ہین۔ ذرا آپ بڑھ کر اپنے مضبوط و توانا ہاتھون سے اس تصویر کو اُتار لین تاکہ مین غار سے باہر اُسے مدھم روشنی مین دیکھ کر اس واقعہ کو اچھی طرح بیان کر سکون۔ "مین نے دیوار سے تصویر کو اُتارا اور پلٹ کر دیکھا تو اسکی پشت پر ہاتھی دانت کی لوح نظر آئی جسپر باریک حرفون مین کچھ عبارت کندہ تھی۔ فقیر دروازہ کے پاس ایک بیش قیمت ایرانی قالین بچھا کر بیٹھ گیا اور مجھے پاس ہی ایک اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُسنے میرے ہاتھ سے تصویر لیلی اور اس طرح اپنا قصہ شروع کیا۔

"میان۔ جب تمھاری طرح نوجوان تھا تو دربار دہلی مین نقاشی کی خدمت پر مامور تھا۔ مین تصویر کشی کے علاوہ فنونِ جمیلہ کے نوادرات جمع کرنے کا بھی از حد شایق تھا۔ چنانچہ اسی دھن مین مین نے اس ملک کی خوب سیاحت کی اور یہان کے گوشہ گوشہ سے تصاویر بہم پہنچائین۔ آخر الامر میرا گذر اس ملک مین ہوا جو وندھیاچل سے آگے واقع ہے۔ جہان مجھے عہد قدیم کی ایک خوشنما شاہی عمارت کی خبر ملی جو شکستگی کی حالت مین تھی اور جو کسی زمانہ مین اُس عالی نسب خاندان شاہی کے زیر نگین تھی جس کے چند نام لیوا دست بردِ زمانہ کے ہاتھون تباہ و برباد ہو کر نہایت غربت سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک روز شام کے وقت مین اُسے دیکھنے گیا۔ باوجود اس ویرانی و شکستہ حالی کے عمارت نہایت خوبصورت نظر آتی تھی۔ مین نے اُسکے کمرون اور برآمدون کی خوب سیر کی اور اسکے دروازون کی ہلالی ساخت۔ اُنکے دلکش نقش و نگار۔ اور بیل بوٹے مصفّیٰ ستونون کی گلکاریان۔ دریچون کی نفیس جالیان۔ قبون کی خوشنمائی۔ اور اندرونِ گنبد کی رنگ آرائی دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ گھومتے گھومتے مین ایک چھوٹے سے صحن مین پہنچا جسکے درمیان سنگ مرمر کا چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا جو حسنِ صنعت و کمالِ فن کا بہترین نمونہ تھا اور منہدم و شکستہ آثار کے درمیان بکمال حسن و رعنائی سے قایم تھا۔ مین اسکے اندر داخل ہوا اور دریچون اور محرابون کو دیکھنے لگا۔ ناگاہ میری نظر بلند طاق پر رکھی ہوئی ایک مربع شئے پر پڑی جو نکلی ہوئی کارنس کے نیچے صاف نظر نہ آتی تھی۔ میرے دل مین اُس شئے کو معلوم کرنے کے لئے سخت خلش پیدا ہوئی۔ چنانچہ مین چند بڑے بڑے پتھرون کو ایک دوسرے پر رکھ کر اوپر چڑھا اور اُسے نیچے اُتار لایا گرد و غبار کو صاف کیا اور اُسے پلٹ کر دیکھا کیونکہ غبار آلود حصہ کسی تصویر کے فریم کا پچھلا حصہ تھا۔ میرے جسم مین حیرت و استعجاب کی برقی لہر دوڑ گئی یہ ایک حسین عورت کی تصویر تھی جو میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس پیکر جمیل کا بیان کن الفاظ مین کیا جائے۔ اُف۔ وہ اُسکا حسن و جمال اور اشتیاق آگین نگاہین! جسم کی رنگت ایسی دلاویز کہ قدرتی ہونے کا گمان ہو۔ لانبے لانبے سیاہ بال جو تاریکی مین رات کا مقابلہ کرتے تھے ریشمی لچھون کی طرح دونون شانون پر بکھرے ہوئے چہرہ کے حسن اور رخسارون کی لطیف سرخی کو اور نمایان کر رہے تھے۔ لب ہائے لعلین سے تکلم کی شان پیدا تھی۔ غرضکہ ہر چیز اصل سے اسقدر مشابہ تھی کہ مین اس کاغذی پیکر کو زندگی سے معمور دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تصویر کی آنکھون سے رنج و حرمان کے آثار ناپید ہو گئے اور اُنکی جگہ امید نے لیلی! اور آنکھین

فرطِ مسرت سے چمکنے لگین! میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مین نہین کہہ سکتا کہ اُسوقت مجھپر کونسی کیفیت طاری تھی مسرت و شادمانی کی یا خوف و ہراس کی۔ بلاشک کسی زندہ عورت کی روح ان کنول جیسی خوبصورت آنکھون سے دیکھ رہی تھی! مین نہایت متاثر ہوا اور شام ہوتے ہوتے تصویر کو لیکر گھر پہنچا۔

مین تنہائی مین گھنٹون اُسکی طرف غور سے دیکھتا اور اُسکے متعلق طرح طرح کے نظریے قائم کرتا۔ رفتہ رفتہ وہ میری انیس خلوت بن گئی مین اُسکے چہرہ سے ٹپکنے والے محبت آگین جذبات کا نہایت شوق سے مطالعہ کرتا۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ تصویر سے بالکل انسانون کی طرح حرکات سرزد ہوتی تھین۔ کبھی اُسکی آنکھین یاس وغم سے دھندلی پڑجاتین۔ کبھی مسرت وامید سے چمکنے لگتین اور کبھی رنج وحرمان سے تاریک نظر آتین۔ رات کو مین اُسے اپنے پلنگ کے بازو میز پر ریشمی تکیہ سے ٹکا کر رکھ لیتا۔ اب مین خود اپنے اندر ایک نئی قوت محسوس کرنے لگا اور اُسوقت سے میری تصویرین پہلے کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت اور دلکش بننے لگین۔ لیکن مین بیچین تھا۔ اُسکی سحر کارانہ قوت کا راز مجھ پر نہ کھلا۔ یہانتک کہ عاجز ہوکر بارہا مین نے اُسے اپنے سے جدا کرنے کا ارادہ کرلیا لیکن ہر مرتبہ کسی نہ کسی وجہ سے اس ارادہ کو ملتوی کرنا پڑا۔ اس طرح چند ماہ اور گذرے۔ میرے کمال کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ ایک دن میری طلبی ایک راجہ کے دربار مین ہوئی۔ جب مین وہان پہنچا تو سنگ مرمر کے وسیع برآمدہ مین اسکے سامنے پیش کیا گیا۔ مین اپنی تصویرون کے ساتھ اُس تصویر کو بھی لیے آیا تھا۔ جب مین ایک ایک کرکے اپنی تمام تصویرین دکھلا چکا تو سب سے آخر مین اُس تصویر کو نکال کر راجہ کے حضور مین پیش کیا۔ جیسے دیکھتے ہی پہلے تو وہ حیرت سے میرے منہ کو تکنے لگا پھر تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگا "آخر اسکا کیا مطلب ہے؟ یہ شہزادی مایا کی شبیہ ہے۔ یہ تجھے کہان سے ملی۔ اسکا بنانے والا کون ہے؟"

مین نے جواب دیا "مہاراج مین نہین جانتا کہ یہ کس نقاش کی بنائی ہوئی ہے۔ البتہ مین نے اسے وندھیاچل کے پرے ایک شکستہ محل مین پایا تھا"

وہ کچھ دیر تک اُسکی طرف دیکھتا ہوا خاموش کھڑا رہا۔ بعد ازان اسکی آنکھین غصہ سے سرخ ہوگئین۔ اور اُسنے کہا "یہ میری رانی مایا کی شبیہ ہے۔ اور دوسرے کے پاس نہین رہ سکتی۔ اسکا اجنبی نگاہون کے سامنے رہنا نہایت نامناسب ہے۔ تم اس تصویر کو مجھے دے ڈالو"

مین نے آہستہ سے جواب دیا "نہین مہاراج مین اسے آپ کو نہین دے سکتا۔ وہ میری ہے۔ مین اُسے کسی حالت مین اپنے سے جدا نہین کرسکتا!"

مین نہین جانتا کہ مین نے ایسا کیون کہا۔ کیونکہ مین اس کے قبل بارہا اس طلسمی تصویر کو کسی جگہ ٹھکانے لگانے کا ارادہ کرچکا تھا۔ اُسنے پھر مجھ سے کچھ نہ کہا اور ایک خادم کو اشارہ کرکے درشت لہجہ مین بولا کہ "جاؤ۔ رانی مایا کو اسی وقت

یہان بلالاؤ" وہ شخص اندر چلا گیا لیکن راجہ اسی مقام پر تصویر پر نظرین گڑائے خاموش کھڑا رہا۔ اتنے مین کڑون اور پازیب کی شیرین جھنکار اور ریشمی کپڑون کی سرسراہٹ سنائی دی اور ایک بلند و بالا لیکن موزون قامت عورت بازو کے دروازہ سے داخل ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ نازک قدم بڑھاتے ہوئے راجہ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اُسکے جسم پر آسمانی رنگ کی زرین ساری تھی اور چہرہ پر ہلکے نیلے رنگ کا ریشمین نقاب پڑا ہوا تھا۔ راجہ نے اسکی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "نقاب اُٹھاؤ" اسنے نہایت ادب سے ارشاد شاہی کی تعمیل کی۔ نقاب کا اُٹھنا تھا کہ معلوم ہوا گویا چودھوین رات کا خوبصورت چاند بدلیون کے جھرمٹ سے باہر نکل آیا ہے۔ میری نگاہین اس کے حسین چہرہ مین جذب ہو کر رہ گئین۔ تصویر کا پیکر اصلی میری آنکھون کے روبرو تھا!۔

"مایا۔ کیا تو اس شخص کو جانتی ہے؟" راجہ نے کڑک کر پوچھا۔

ایک اُسکی آنکھین جو نیچے جھکی ہوئی تھین ایک لمحہ کے لئے مجھے دیکھنے کو اُٹھین، "نہین حضور۔ مین اسے نہین جانتی" اسنے نرم و شیرین آواز مین جواب دیا گویا بربط کے تارون سے لطیف نغمہ ابل رہا ہو۔ ساتھ ہی اس کے رخسارون پر فرطِ حیا سے سرخی دوڑ گئی کیونکہ دیگر ہندوستانی دوشیزہ لڑکیون کی طرح وہ بھی غیر لوگون سے نامانوس تھی۔ راجہ جو اسکی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا یہ سنتے ہی اسپر جھپٹا۔ وہ جوش رقابت سے دیوانہ ہو رہا تھا اسکی آنکھون سے محبت و نفرت کے متضاد شعلے نکل رہے تھے اُسنے اُسکے شانون کو زور سے جھنجھوڑ کر کہا "عورت تو جھوٹی ہے کمبخت سچ بتلا کہ یہ کون ہے؟"

اسنے حیرت و خوف سے ملی ہوئی نگاہون سے راجہ کو دیکھا اور اسکی حسین آنکھین آنسوؤن سے لبریز ہو گئین اور بڑے بڑے قطرے اسکے زرد رخسارون پر ڈھلکنے لگے۔ اُسنے کانپتی ہوئی آواز مین پھر جواب دیا "پران ناتھ مین بالکل سچ کہتی ہون کہ اس سے ذرا بھی واقف نہین" مگر راجہ کی پیش قبض ہوا مین چمکی اور آن کی آن مین مایا کے سینے مین تیر گئی۔ ایوانِ شاہی مین ایک ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور رانی کی نعش فرشِ مرمرین پر تڑپنے لگی۔ اسکے بعد وہ دیوانہ وار میری طرف جھپٹا اور نہایت تیزی سے میرے شانہ مین اپنا پیش قبض پیوست کر دیا۔ مین لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ یکایک میری نظر اُس تصویر پر پڑی جو گھبراہٹ کے سبب ہاتھ سے چھوٹ پڑی تھی راجہ نے دوبارہ وار کرنے کی غرض سے اپنا پیش قبض اُٹھایا ہی تھا کہ مین چلا اُٹھا "مہاراج! ٹھیریئے۔ ٹھیریئے۔ ذرا اس طرف تو دیکھئے!" مین نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ راجہ نے اسکی طرف دیکھا اور ہکا بکا ہو کر کھڑا رہ گیا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ اسوقت ایک عجیب واقعہ ظہور مین آیا۔ تصویر جو بالکل اصل سے مشابہ تھی جو کبھی امید و محبت سے معمور نظر آتی اور کبھی رنج و نومیدی سے لبریز اور جو تغیر جذبات کے سبب زندہ معلوم ہوتی تھی اب یک قلم تبدیل ہو چکی تھی!۔ آہستہ آہستہ گلابی رخسارون سے خون کی سرخی زائل ہو گئی۔ عالم نزع کی روح فرسا کیفیتین اسکی سیاہ آنکھون مین اپنے گھر

نشانات چھوڑ گئیں۔ اور پیکرِ جمیل پر تشنجی کیفیت طاری ہو کر رفتہ رفتہ اس حسین مرقع کی روح قفسِ کاغذی سے پرواز کر گئی! ہاں یہ کاغذی پیکر بیجان ہو گیا کیونکہ اب اسپر موت کی علامات طاری تھین۔ دھیرے دھیرے اسکا جسم سخت۔ آنکھین بے نور۔ اور لب ہائے لعلین سفید پڑ گئے۔ تاہم وہ اب بھی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ اب وہ حسین منجمد کا مرقع بیجان تھی اور اس طرح نظر آرہی تھی جیسی اسوقت آپ کے سامنے موجود ہے"۔

فقیر کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ بعد ازان اسنے پھر اس طرح اپنا قصہ کہنا شروع کیا۔ "راجہ نے جو مارے دہشت کے بدحواس ہو رہا تھا مجھ سے مخاطب ہو کر خوفزدہ انداز مین پوچھا" یہ کیا جادوگری ہے؟"

"مہاراج۔ مین بالکل نہین جانتا" مین نے جواب دیا" لیکن شاید یہ تصویر ہی خود اپنی داستان بیان کرے کیونکہ اسکی پشت پر کسی غیر زبان مین کچھ عبارت کندہ ہے۔ مہاراج چونکہ آپ پڑھے لکھے ہین بہت ممکن ہے کہ اسکا مطلب نکال سکین"۔

مین نے تصویر کو پلٹ کر اُسکے ہاتھ مین دیا۔ اسنے ایک سرسری نگاہ اسپر ڈالی اور تعجب سے کہا" یہ زبان اجنبی ضرور ہے لیکن وہ جس سے مین واقف ہون"۔ "تب تو مہاراج آپ اسے پڑھ کر مجھے ضرور سمجھائیے" مین نے اُس سے التجا کی۔ راجہ نے پہلے اُسے آہستہ آہستہ پڑھا۔ اُسکے چہرہ سے حیرت و خوف کے آثار مترشح تھے بعد ازان اُسنے مجھے اسکا اردو ترجمہ سنایا۔ تصویر کی پشت پر ہاتھی دانت کی لوح مین یہ عبارت کندہ تھی۔

"بہ چترپور کے شاہی خاندان کی شہزادی ایلا کی تصویر!"

"مین نے تیرے رخسارون کو اپنی زندگی کے تازہ خون سے رنگا ہے۔ اور تیری آنکھون کو اپنی عزیز ترین امیدون ناکامیون اور محبت کی شیم انگیزیون کا آشیانہ بنایا ہے۔ اور تیرے ابروؤن اور لب ہائے شیرین مین انھین کیفیات کی رنگ آرائی کی ہے۔ اے میرے اقلیم دل پر حکومت کرنے والی شہزادی ایلا! مین نے اپنے خیالات کو تیری زلفِ رسا کی تاریکیون مین پھنسا دیا ہے۔ جب میری روح کالبدِ عنصری سے پرواز کریگی تو اس کاغذی پیکر مین جسے مین نے خونِ حیات کی سرخی۔ محبت۔ امید اور ناکامی کی عجیب و غریب رنگ آمیزی سے تیار کیا ہے اُسوقت تک مقید رہیگی جبتک کہ تیرے ہی خاندان کا ایک فرد تیرے زندگی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرے"۔

میران نقاش"

اسکے بعد پھر گہری خاموشی مسلط ہو گئی کچھ دیر کے بعد راجہ نے آہِ سرد بھر کر کہا" افسوس۔ شہزادی مایا ہی چترپور کے شاہی خاندان کی شمع و چراغ تھی" اسکے ہاتھ سے تصویر گر گئی اور وہ فرطِ غم سے بیتاب ہو کر اپنی رانی کے تنِ بیجان کے پاس گر پڑا جسے اُسنے ابھی ابھی قتل کیا تھا۔ اس طرح ایک گھنٹہ اور گذرا۔ راجہ کی آہ و بکا کی آوازین دیر تک ایوانِ شاہی مین گونجتی رہین۔ آخر کار مین اُٹھا اور اپنی تصویرون کو جمع کر کے وہان سے نکل کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا

اپنے مکان پر پہنچا۔ کیونکہ میرے ہاتھ سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ صاحب یہ ہے قصہ اِس تصویر کا جو مین نے آپ سے بیان کیا۔"

مین حیرت و دلچسپی سے اس قصہ کو سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد مین نے اُس سے پوچھا۔

"باباجی! کیا خیالات و جذبات تصویر مین مقید ہو سکتے ہین؟"

"ہان میان۔ حقیقی مصور اپنے خیالات و جذبات کی تصویر مین اس خوبی سے بھر دیتا ہے کہ وہ اسکے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور جب اُسکا زندہ رہنا ممکن ہے تو کیا اسکی موت بعید از قیاس ہو سکتی ہے۔ اگر زندگی و موت مصور کے لیئے ضروری ہین تو تصویر کے لیئے بھی لازمی"۔ مین اب بھی خاموش رہا۔ کیونکہ یہ عجیب منطق میرے فہم سے بالاتر تھی۔

"لیکن صاحب" اسنے مجھسے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "فن نقاشی کا کمال اس سرزمین سے رخصت ہو گیا اور صنعت و کاریگری جو ہندوستان کی سب سے بیش بہا دولت تھی اب یہان سے ناپید ا ہو چکی ہے"

مجھے اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کی تاریکی رات سے گلے مل رہی تھی۔ مین اُٹھا اور اس سے وداعی سلام کرکے مرخص ہوا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر سوالک پہاڑیون کے ناہموار راستون سے گذرتا ہوا اپنی اقامت گاہ کو جا پہنچا۔

(ترجمہ)

عبد السلیم

کلیات و دواوین (اردو)

دیوان میر حسن دہلوی - نہایت درد انگیز کلام ہے...... ۶ر

دیوان مردان صفی تصوف کا رنگ کوٹ کوٹ بھر دیا گیا ہے ۵ر

کلیات مومن معہ تصادیر و مثنویات...... عہ

کلیات ظفر ہر چہار جلد کامل دو جلد........ عا ۱۲ر

دیوان ناسخ استعارات و تشبیہ مین انکا کلام اپنی آپ نظیر ہے عہ

کلیات میر تقی میر تعریف فضول ہے کل شعرائے ماضی و حال کے پیشوا مانے جاتے ہین........ عہ ۸ر

کلیات سودا - ہجو گوئی کے بادشاہ اور قصیدہ کے استاد... عہ ۸ر

کلیات نظیر اکبر آبادی - ہر رنگ مین فرد تھے...... عہ

مسٹر رینالڈز کے انگریزی ناولون کے ترجمے

فسانہ الہ دین و لیلےٰ : مشہور ناول اسٹار آف منگریلیا کا ترجمہ رنگین داستانون کے ضمن مین بہشت و دوزخ کی سیر کرائی ہے پڑھکر دل دھڑک جاتا ہے۔ مترجمہ منشی امیر حسین صاحب تحصیلدار کاکوردی........ عہ ۱۲ر

فریب حسن ناول فاسٹ کا اردو ترجمہ جس مین قصہ کے پیرایہ مین بدکرداریون کے زبون نتائج دکھائے گئے ہین........ عہ ۱۲ر

ناول اسرار نیکرومینسر کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ چھ باعصمت اور حسین زنانہ لیڈیونکے دلی جذبات کا خاکہ زمانہ کی حیرت انگیز نیرنگیون اور انقلاب کی حیرت انگیز تصویر........ عا

(مینیجر نگار)

برہان پور

برہان پور دریائے تاپتی کے کنارے ۲۱ درجہ ۱۸ دقیقہ عرض البلد شمالی اور ۷۶ درجہ ۱۷ دقیقہ طول البلد شرقی پر واقع ہے۔ اس کی بنیاد ۸۰۰ھ یا ۸۰۲ھ مین پڑی ہے اور خاندان فاروقیہ کا پہلا خود مختار بادشاہ نصیر خان (۸۰۱ھ - ۸۴۱ھ) اس کا بانی ہے۔ مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ جب نصیر خان نے خاندیس کے مشہور قلعہ آسیر کو فتح کیا تو اس خوشی مین حضرت شیخ زین الدین رح دولت آباد سے مبارک باد کے لئے نصیر خان کے یہان تشریف لائے، اور دریائے تاپتی کے کنارے اوس مقام پر جہان اب زین آباد، آباد ہے قیام فرمایا۔ نصیر خان نے آپ کی بڑی عزت کی۔ آپ کا یہان دو ہفتہ قیام رہا۔ اس عرصہ مین نصیر خان آپ کی خدمت مین کئی مرتبہ حاضر ہوتا تھا۔ جب آپ نے واپسی کا خیال کیا تو نصیر خان نے آپ کو چند نصبات دینے چاہے۔ لیکن آپ نے اس کو منظور نہین کیا اور فرمایا کہ درویشون کی ذات کے لئے اس قسم کے وظیفے اور عطیے بے محل ہین ہم کو ان چیزون سے کیا نسبت! جب شیخ سے نصیر خان نے ایسی باتین سنین تو اور اصرار کیا اس پر آپ نے فرمایا کہ جس مقام پر اسلامی لشکر خیمہ زن ہے۔ وہان ایک شہر کی بنیاد ڈال اور اس کا نام میرے پیر شیخ برہان الدین غریب رح کے نام پر رکھ اور اوسے اپنا دار الحکومت بنا اور اس جگہ جہان مین ہون ایک قصبہ اور مسجد تعمیر کر اور اس کو زین آباد کے نام سے موسوم کر، اوس کے بعد شیخ نے دعا کی اور فاتحہ پڑھی اور دولت آباد کو حضرت شیخ برہان الدین غریب رح کی خدمت مین واپس چلے گئے۔

شیخ کے دولت آباد تشریف لے جانے کے بعد نصیر خان نے آپ کے حسب ایما دریائے تاپتی کے اوس پار ایک حصار کی بنیاد ڈالی، اور قلعہ کو مستحکم کرکے برہان پور کے نام سے موسوم کیا۔ اور جو آپ کا قیام گاہ تھا وہان زین آباد کو آباد کیا۔

برہان پور کوئی ایسی قدیم بستی نہین ہے۔ اس کی بنیاد پڑے ہوئے تقریبًا پانچ سو سینتالیس (۵۴۷) برس ہوتے ہین۔ لیکن اس نے اس تھوڑی مدت مین زمانے کے بہت تاریخی انقلاب دیکھے ہین ۸۰۰ یا ۸۰۲ھ سے ۱۰۰۸ھ تک یہ سلاطین فاروقیہ کا دار الحکومت تھا۔ اس کے بعد ۲۵ رمضان ۱۰۰۹ھ مین یہ شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ ۱۵۵۶ء - ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء) کے قبضہ مین آیا اور شاہجہان (۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء - ۱۰۷۶ھ ۱۶۶۵ء شہزادہ خرم) کے زمانہ تک یہ خاندیس اور دکن کا صدر مقام تھا سلطنت مغلیہ کی کمزوری کے بعد اس پر ۱۱۳۲ھ مین نواب قمر الدین خان بہادر آصف جاہ اول (سنہ ۱۱۶۱ھ) قابض ہوئے۔ آپ کے زمانہ مین اسکی باضابطہ ترمیم ہوئی۔ ابتدا مین شہر کو کوئی حصار نہین تھا ۱۱۴۱ھ مین آپ کے حکم سے ایک زبردست حصار تعمیر کیا گیا ۱۲۰۳ھ کے اوائل مین اس پر مرہٹے قابض تھے۔ ان کی یہان مدتون حکومت رہی ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء مین اس پر انگریزون کا قبضہ ہوا

اور قریباً سوا سو سال سے یہ ان کے حدود مین شامل ہے۔

برہان پور تاریخی لحاظ سے دکن مین خاص اہمیت رکھتا ہے، اور اس کے آثار قدیمہ سے متعلق بہت سی عمارات اہم ہین ذیل مین ہم اس شہر کے بعض قدیم عمارات کا حال لکھتے ہین۔

قلعۂ ارک۔ برہان پور کا قلعہ مسمار ہو گیا ہے۔ اس کے آثار سے اب کہین کہین برجون کے نشانات پائے جاتے ہین۔ جن سے پتہ لگایا جاتا ہے کہ یہ ساری چیزین بارھوین صدی ہجری کے ابتدائی یا وسطی زمانہ کی منہدمہ ہین۔

قلعہ کے شمالی حصہ سے شاہی محلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مین بادشاہ اور بیگمات رہا کرتی تھین، لیکن اب اس حصہ کی بعض عمارات کا پتہ بھی نہین چلتا۔ اس حصہ کے جو آثار باقی ہین۔ ان مین نقاشی اور رنگ آمیزی کا نہایت بہترین کام ہے۔

اس کے سوا، قلعۂ کی عمارات مین ترکی حمام بھی قدامت اور تناسب کے لحاظ سے خاص چیز ہے۔ اس کی چھت خاص وضع اور ترکی اصول پر بنائی گئی ہے اس کا گنبد مثمن واقع ہوا ہے اور اس کا فرش سنگ مرمر کا ہے اس عمارت کی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۸۰ فیٹ ہوگی۔ اس کے اوپر سے بہت دور دور کا نظارہ ہوتا ہے خاص کر دریائے تاپتی کا منظر جو اس پر سے دکھائی دیتا ہے وہ بہت پُر لطف ہے۔

کارخانہ آب رسانی۔ قدیم زمانہ مین برہان پور مین نہرون کے ذریعہ شہر مین پانی آتا تھا۔ جس کے بعد اس کی صفائی ہوتی تھی۔ تاپتی کا پانی چونکہ کھارا ہے۔ اس لئے یہان پر اس کو قدیم اصول پر صاف کرنے کیلئے بعض اونچے اونچے حوض مینارے کی شکل مین بنائے گئے تھے۔ ان آثار کے شکستہ نقوش شہر کے گرد نواح مین ابھی تک کثرت سے پائے جاتے ہین۔ جن کی ساخت سے قدیم کاریگری اور اس زمانہ کے اصول تعمیر کا اندازہ ہوتا ہے۔

بی بی رقیہ کی مسجد۔ یہ مسجد شہر سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کو بی بی رقیہ مریم زمانی نے نوین صدی ہجری مین تعمیر کرایا تھا مسجد بہت وسیع اور بلند ہے۔ لیکن قدیم ہونے کی وجہ سے گرنے کے قریب ہو گئی ہے۔ اگر اس جانب توجہ کی جائے تو ممکن ہے کہ یہ اپنی پہلی حالت مین برقرار رہ سکے۔

۹۷۰ھ مین جب عادلشاہ بن مبارک خان فاروقی نے شہر مین جامع مسجد کا سنگ بنیاد رکھا تو اس وقت سے اس مین نماز ہونی موقوف ہو گئی تھی۔

جامع مسجد۔ اس مسجد کا بانی عادلشاہ فاروقی (۹۷۴ھ ۱۵۶۶ء - ۱۰۰۵ھ ۱۵۹۶ء) تھا۔ اس نے اس کو ۹۹۷ھ مین تعمیر کیا۔ اسکی عمارت نہایت خوشنما اور وسیع ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ طول مین ۱۴۸ فیٹ اور عرض مین ۱۵ فیٹ ۲ انچہ کے مماثل ہے۔

یہ مسجد ساری سنگ سیاہ سے تعمیر کی گئی ہے۔ اس مین تناسب اور طرز تعمیر کا اس قدر لحاظ ہے کہ اس نوعیت کی

مساجد شمالی دکن مین بھی نہین پائی جاتین۔

اس عالیشان مسجد کی چھت تقریباً چھیانوے (۹۶) ستونون پر ایستادہ ہے یہ ستون اس طریقہ سے نصب کئے گئے ہین کہ مسجد پانچ حصون مین تقسیم ہو گئی ہے، اس نوعیت کی مساجد سوائے گلبرگہ اور بیدر کے دکن کے کسی اور حصہ مین مشکل سے ہون گی۔

مسجد کا اندرونی حصہ زیادہ آرائشی اور کنگرے دار ہے۔ اس مسجد کے سارے ستون چوپہل ہین ان مین کے ہر ستون کا قطر تقریباً ۱ فیٹ ۴ اِنچ ہے۔ مسجد کی عمارت کے نقشے پر غور کرنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ عمارت مسلمانون کے چوتھے عہد سے تعلق رکھنے والی تعمیر ہے۔

مسجد کا صحن دو حصون پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ کا عرض ۵۷ فیٹ اور دوسرے حصہ کا عرض ۳۹ فیٹ ہے۔ اس کے صحن سے ملے ہوئے کئی قدیم حجرے ہین۔ جن کی تعمیر کا زمانہ سلطان عادل شاہ فاروقی کا وسطی عہد ہے اس لئے کہ اس مسجد کی تعمیر ۹۹۷ھ مین ختم ہوئی اور سلطان عادل شاہ فاروقی کا عہد ۱۰۰۵ھ تک تھا اور اس نے ۹۷۴ھ سے ۱۰۰۵ھ تک حکومت کی تھی۔

اس مسجد کے اندرونی محراب پر ایک کتبہ اس کی تاریخ تعمیر کا خط نسخ مین کندہ ہے۔ جس کو عہد فاروقیہ کے مشہور کتابہ نویس مصطفٰے خان نے ۹۷۰ھ مین لکھا تھا، (کتبہ)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم - وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احداً ہ الحمد للہ الموفق
للطاعات المعین بہ فضلہ علی العبادات والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الخلق محمد الذی
حرض العباد علی العبادۃ وعلی آلہ واصحابہ الذین قاموا بواجبہا و زیادۃ وبعد
فان اولی ما ینفق فیہ شرایف الاحوال القربات التی یعود نفعہا فی المال ومن اجل ذلک
الصدقات الجاریہ فان بوابہا ملی الازمان ساریہ وقد وردت السنۃ بان یصرف
الیہا الاعنہ ولانہ امر بنیان المساجد من شعائر الدین وقمع المتمردین لما ترتیب من
نبائہا مزید الثواب وان بانیہا ملہم للصواب حیث ورد عنہ صلی اللہ علیہ وسلم
انہ قال من بنی اللہ مسجد اولو مکفحص قطاۃ نبی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ فلذلک امر مولانا
السلطان الاعظم والخاقان المکرم الفائق بفضلہ علی سلاطین العرب والعجم عادل شاہ
بن مبارک شاہ الفاروقی خلد اللہ ملکہ ہذا المسجد الذی ہو بالوصف جدیر لانہ قل ان
یوجد لہ نظیر خالصاً لوجہ الکریم وطالباً لمرضاتہ الجسیم تقبل اللہ ذلک منہ بفضلہ
ومزید کرمہ وطولہ وکان ابتداءہ سنۃ سبع وتسعین وتسعمائۃ واتمامہ سنہ
خدم بہ کتابتہ اقل عبیدہ الداعی لدولتہ مصطفٰے بن نور محمد خطاط عفی اللہ عنہ۔

اس کتبے کے سوائے ایک اور کتبہ مسجد کے عقبی مینار پر تحریر ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ۵ ۔ رمضان ۱۰۰۹ھ مین اکبر نے برہان پور کو فتح کیا ۔ اس کتبہ کا کندہ کرنے والا مشہور شاعر میر محمد معصوم نامی ہے، جو اکبر کا درباری شاعر اور کتابہ نویس تھا ۔ اس کتبہ مین ۲۶ ۔ شوال ۱۰۰۹ھ کو اکبر کے لاہور جانے کا بھی ذکر ہے ۔ کتبہ ۔

تا تاریخ الٰہی عبارت ست از زمان جلوس حضرت شہنشاہ ظل آلہ اکبر بادشاہ غازی کہ ز تائید جوان بخت خویش قلعہ آسیر کشاد سہ

کشت آباد اسیر از ان نامی سنہ بخشش بہ گفت الہ آباد

تاریخ ۱۱ ۔ فروردین ماہ الٰہی ۴۵ موافق ۵ ۔ رمضان ۱۰۰۹ھ حضرت شہنشاہ ملک بارگاہ ظل آلہ برہان پور را مقر رایات ظفر آیات ساختند و بہادر خان آمدہ بہ پابوس مشرف شد داورا با اتباع جان بخشی کردند قلعہ آسیر فتح شد ۔

شہ غازی جلال دین اکبر آن بہ تائید بخت قلعہ کشا
کرد فتح اسیر از آن نامی گفت بگرفت قلعہ اعلا

قائلہ و کاتبہ محمد معصوم المتخلص بہ نامی بن سید صفائی الترمذی اصلاً و البکری مسکناً و مدفناً و المنتسب اما الی سید شیر قلندر ابن بابا حسین ابدال السبزواری مولداً و القندہاری موطناً و مرقداً بہ تاریخ روز ماہ دوازدہم آردی بہشت ۴۶ موافق ۲۶ شوال ۱۰۰۹ھ بندگان حضرت عازم لاہور شد ۔

فتح خاندیس و دکن چون کرد شاہ عازم ہندوستان انفور شد
یک عدد نامی فزود انگاہ گفت شاہ والا عازم لاہور شد

نور بخش کی مسجد ۔ ان مساجد کے علاوہ نور بخش کی مسجد بھی نہایت عالیشان مسجد ہے ۔ بہ قول مصنف مآثر الامراء کے اس کے بانی نواب عبد الرحیم خان تھے ۔ آپ کا حضرت نواب میر قمر الدین علی خان بہادر آصف جاہ اول سے چچا کا رشتہ تھا ۔ نواب غازی الدین بہادر فیروز جنگ ان کے علاتی بھائی تھے ۔ ایک عرصہ تک انھون نے برہان پور کی نظامت کی ۔ اور اسی جگہ انتقال فرمایا ۔ مسجد کے عقب مین چہل ستون کے متصل آپ کا مقبرہ ہے ۔

یہ مسجد بہ لحاظ فن کے شہر کی ساری عمارات مین خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ اور وسعت کے لحاظ سے برہان پور کی اور مساجد مین وسیع ہے ۔ اس کا زینہ بھی سطح زمین سے خاصا بلند ہے بقول اسلامی مورخین کے اس کے کلس بہت دور سے دکھائی دیتے ہین ۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھی چڑھائے گئے ہین ۔

خانخانان کی سرائے ۔ عبد الرحیم خانخانان جب برہان پور کے صوبہ دار مقرر کئے گئے تو انھون نے اپنی صوبہ داری کے زمانہ مین یہان ایک سرائے تعمیر کی جو بلحاظ وسعت خاصی وسیع اور خوشنما ہے ۔ اس مین ایک زمانہ سے بازار لگتا ہے ۔

اس عمارت کے طریقہ تعمیر کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض حصون کی دُرستی بعد مین کی گئی ہے۔ اس خانقاہ کے دروازے پر ایک کتبہ ۱۰۲۷ھ کا کندہ ہے، جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس عمارت کو خان خانان نے خلیل اللہ خان کے اہتمام مین جو بہادر خان کا بیٹا ہے ۱۰۲۷ھ مین جہانگیر کے عہد مین نبوایا تھا۔ (کتبہ)۔

"در عہد سلطنت ظل اللہ فی الارضین نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی خد اللہ ملکہٗ و عدلہٗ"

خان خانان سپہ سالار راخلد شوکتہ حسب الامرا جہان مطاع بہ اہتمام خلیل اللہ پسر بہادر خان در

سنہ ہزار و بیست و ہفت این سرائے بہ اتمام رسید۔

شاہان فاروقیہ کے گنبد۔

شہر کے انوارہ دروازے سے کوئی آدھ میل کے فاصلہ پر یہ گنبد واقع ہین۔ جن مین سب سے بڑا گنبد عادل شاہ فاروقی کا ہے۔ جو برہان پور کی جامع مسجد کا بانی تھا۔ اس گنبد پر کوئی کتبہ نہین ہے۔ اسی سلسلہ مین اور دو گنبد سلاطین فاروقیہ کے ہین۔ اس کے سوا، ان تمام مقابر مین کئی کئی قبرین ہین۔ قیاس ہوتا ہے کہ یہ قبور ان کے رشتہ دارون سے تعلق رکھتی ہین۔

شاہ سوزا کا مقبرہ۔ سلاطین فاروقیہ کے گنبد جس مقام پر واقع ہین۔ وہ ایک چار دیواری ہے۔ اسی حد مین ایک اور مقبرہ شاہ سوزا کے مقبرے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقبرہ ان تمام گنبدون مین غیر معمولی خوشنما اور خوبصورت ہے اس کی صناعی اور مُنبت کاری نہایت شاندار ہے۔ اس نوعیت کا نفیس مقبرہ سارے برہان پور مین نہین ہے۔

شاہجہان کا باغ "زین آباد جو حضرت شیخ زین الدین اولیا کے نام سے آباد ہے۔ یہان پر شاہ جہان اپنی شہزادگی کے زمانہ مین رہا کرتا تھا۔ اس نے اپنے اس قیام کے دوران مین یہان ایک خوشنما باغ تعمیر کیا تھا۔ جس مین نہایت بہترین درخت اور اُونچی اونچی عمارات تھین۔ اس باغ مین بہ قول مورخین کے ممتاز محل نے انتقال کیا۔ اور یہین سے ان کی لاش آگرہ بھیجی گئی"

اس باغ کی عمارت اور احاطہ کی دیوار کے نشانات ابھی تک باقی ہین، جن سے پتہ چلتا ہے کہ باغ اور عمارت کے حُدود نہایت وسیع تھے۔

شاہنواز خان کا مقبرہ۔ برہانپور کی عمارات مین یہ مقبرہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی صناعی اور کاریگری نہایت بہترین ہے۔ یہان پر جو عام روایات مشہور ہین اُون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقبرہ میرزا ایرج شاہنواز خان کا ہے۔ جو عبد الرحیم خانخانان کا بیٹا اور برہان پور کا صوبہ دار تھا۔

اس مقبرہ پر ہر سال ایک میلا بڑی دھوم سے لگتا ہے، جس مین شہر کے تمام لوگ جمع رہتے ہین اس مقبرہ کی خصوصیات مین ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی عمارت مین چینی کا نہایت بہترین کام کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اسکے

دیوار اور دروازون پر نہایت بہترین رنگ کاری ہے۔ جو برہانپور کی عمارات مین بہت کم بلکہ شاذ و نادر پائی جاتی ہے۔
ان مختصر آثار کے سوا، شہر اور اطراف مین کوئی اور قدیم عمارات نہین ہین جو قابل تذکرہ سمجھی جائے البتہ ان کے علاوہ شہر مین سینکڑون اولیا اللہ کے مزارات ہین۔

تصحیح:- ۱- مورخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ اکبر نے ۱۰۰۸ھ مین قلعہ آسیر کو فتح کیا۔ لیکن یہ بیان غور طلب ہے۔ جامع مسجد پر میر محمد معصوم نامی کے ہاتھ کا جو کتبہ کندہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۵۔ رمضان ۱۰۰۹ھ سے متعلق ہے۔ (تاریخ فرشتہ مقالہ ششم صفحہ ۲۹۱)۔

۲- اسی موقعہ پر فرشتہ سے راجہ علی خان کے بارے مین ایک نہایت اہم اور صریح غلطی ہوگئی ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ راجہ علیخان نے اپنے نام کے ساتھ شاہ کا لقب اختیار نہین کیا تھا لیکن جامع مسجد کے اندرونی کتبے کو دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ راجہ علیخان نے اپنے کو عادل شاہ فاروقی کے نام سے موسوم کیا تھا۔ تاریخ فرشتہ مقالہ ششم صفحہ ۲۷۸)۔

تعلیقات:- ۱- حضرت شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ محبوب الٰہی کے خلفائے عظام سے ہین آپ چار سو فقراء کے ساتھ دہلی سے دولت آباد تشریف لائے۔ اور اسی مقام پر ۱۱۔ صفر ۷۳۸ھ مین چہار شنبہ کے دن وصال فرمایا۔ آپ کا مقبرہ خلد آباد مین واقع ہے (روضۃ الاولیا صفحہ ۱۴)۔

۲- حضرت شیخ زین الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ، آپ حضرت شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کے باکمال خلفا سے ہین۔ سلطان محمد شاہ بہمنی (۷۶۱ھ تا ۷۷۶ھ) کے زمانہ مین گذرے۔ ۲۵ ربیع الاول ۷۷۱ھ مین آپ نے وفات فرمایا۔ خلد آباد مین اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ سے متصل آپکا مزار ہے۔ (روضۃ الاولیا از آزاد بلگرامی ص ۲۴)۔

۳- **عادلشاہ بن مبارک خان فاروقی**۔ اس بادشاہ کا نام راجہ علیخان ہے ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء مین اپنے بھائی میران شاہ کے انتقال کے بعد برہان پور کے تخت پر بیٹھا۔ ۱۷۔ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء مین ایک معرکہ مین وفات پایا۔ اسکی مدت حکومت اکیس سالہ (۲۱) ہے (تاریخ فرشتہ مقالہ ششم صفحہ ۲۷۸)۔

۴- **میر محمد معصوم نامی**۔ ان کے آبا و اجداد ترمذ کے باشندے تھے۔ یہ بھکر مین پیدا ہوئے۔ ان کے انتقال کی نسبت مورخین مین اختلاف ہے۔ بقول مصنف تتاریخ الافکار (ص ۴۲) اور ماثر الامرا (جلد ۳ صفحہ) کے انھون نے ۱۰۱۵ھ مین انتقال کیا۔ ان کے کتبے آگرہ۔ دہار۔ فتحپور۔ اوجین۔ سعد آل پور۔ مانڈو۔ برہانپور۔ بیانہ۔ مدہکر۔ ناگور۔ قندہار۔ وغیرہ مین نہایت کثرت سے ہین۔ ان کا تذکرہ اکبر کی سیاسی تاریخ مین خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کو شاعری سے خاص شوق تھا

تخلص نامی ہے۔ یہ کئی کتابون کے مصنف ہین جن مین سے بعض کے نام یہ ہین۔ تاریخ سندھ۔ طب نامی۔ مفردات معصومی۔ معدن الافکار۔ حسن و ناز۔ پری صورت۔ خمسہ متحیرہ۔ اکبر نامہ۔ (ان کے حالات ذیل کی کتابون مین ملاحظہ فرمائیے۔ طبقات اکبری صفحہ ۴۰۱۔ منتخب التواریخ صفحہ ۱۷۔ اکبر نامہ صفحہ ۳۹۶۔ ماثر الامراء صفحہ ۹۳۶۔ مفتاح التواریخ صفحہ ۱۵۵، الیٹ صفحہ ۱۱۱، روز روشن صفحہ ۶۷۹۔ ہفت آسمان صفحہ ۱۴۱)۔ حال مین میر معصوم نامی پر ایک مبسوط اور مفصل مضمون مولوی حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب ایڈیٹر تاریخ نے اپنے رسالہ تاریخ مین تحریر فرمایا ہے۔ جس مین تقریباً چالیس کتابون سے استفادہ کیا ہے۔ رسالہ تاریخ جلد ۱ نمبر ۱)۔

۵۔ شاہنواز خان۔ عبدالرحیم خانخانان کے بیٹے تھے۔ ان کا نام میرزا ایرج ہے۔ جہانگیر نے ان کو بعض کارہائے نمایان کے انجام دینے پر شاہنواز خان کے خطاب سے ممتاز فرمایا تھا۔ یہ جہانگیر کے جلوس کے تئیسوین (۲۳) سال برہانپور مین (مالوہ) آئے دیکھو ماثر الامراء صمصام الدولہ شاہنواز خان جلد اول صفحہ ۴۵۰۔ ۹۰۴۔ ۷۰۳۔ ۴۰۷۔ ۱۱۷۔ ۴۷۷)۔

۶۔ ممتاز محل۔ ارجمند بانو بیگم جو تاج محل کے نام سے مشہور ہے۔ شاہجہان کی چھٹی بیوی تھی۔ آصف خان جو نور جہان کا بھائی ہے وہ اس کا باپ تھا۔ سنہ ۱۰۰۱ھ ۱۵۹۲ء مین پیدا ہوئی۔ چالیس سال کی عمر مین ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۴۰ھ مین زین آباد مین انتقال کیا۔ ۱۷ جمادی الاول سنہ ۱۰۴۱ھ مین ان کی لاش آگرہ منتقل کی گئی۔ تاج محل جو دنیا کا مشہور مقبرہ ہے آسودہ ہے۔ مصنف قاموس المشاہیر نے اس موقعہ پر سنین مین بعض فاش غلطیان کی ہین دیکھو قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۲۶۷)۔

کتابیات:۔ برہانپور اور اس کے آثار قدیمہ کا حال ہم نے ذیل کی کتابون سے اخذ کیا ہے۔

(۱)	تاریخ فرشتہ	حکیم محمد قاسم فرشتہ	مطبوعہ	مطبع نولکشور
(۲)	منتخب اللباب	محمد ہاشم خافی خان	"	لیڈن
(۳)	تاریخ رشید الدین خانی	غلام امام الدین خان دہلوی	"	حیدر آباد
(۴)	ماثر الامراء	نواب صمصام الدولہ میرزا شاہ نواز خان	"	رائل ایشیاٹک سوسائٹی
(۵)	سوانح دکن	منعم خان ہمدانی	"	قلمی
(۶)	واقعات بیجاپور	مولوی بشیر احمد دہلوی	"	مفید عام آگرہ سنہ ۱۹۱۵ء
(۷)	تاریخ برہانپور	مولوی خلیل الرحمن برہانپوری	"	مطبع مجتبائی دہلی سنہ ۱۸۹۹ء
(۸)	کتبہ جات اسلامیہ	رسالہ الناظر جلد ششم نمبر ۳۲		
(۹)	امپیریل گزیٹر اف انڈیا			

سید احمد اللہ قادری۔ ایم۔ آر۔ آے۔ ایس (لندن)

پرستارِ محبت

(افسانہ)

(۱)

ستار ندی (دریائے گوداوری کی ایک شاخ) کے کنارے کچھ فاصلہ پر گھنے درختون مین ایک لکڑی اور پھوس کا جھوپڑا تھا۔ پریم اسی مین رہا کرتا تھا۔ یہان سے جگت پور بہت دور نہ تھا۔ دن بھر وہ گاؤن مین محنت مزدوری کرتا اور شام کو آکر اس مین سو رہتا۔ اس جھوپڑے کے سوا اُس جنگل مین اور کوئی مکان نہ تھا جب سے وہ یہان آکر رہا تھا اس کی زندگی مین بہت انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ رات کی بھیانک اور خوفناک تاریکی مین جب صرف خونخوار درندون اور جانورون کی ہیبتناک آوازین دل کو دہلاتین، یا ندی کی موجین پتھرون سے سر ٹکرا کر نالۂ وفغان کرتی ہوتین تو وہ پڑے پڑے آنسو بہایا کرتا۔ آنسو بہاتا۔ کروٹین بدلتا رہتا اور اپنے غم مین اس قدر محو ہو جاتا کہ اُسے درندون اور صحرائی جانورون کی چیخ پکار اور ندی کے شور وغل کا ذرا بھی احساس نہوتا۔ اُسے کسی بات سے ڈر نہ لگتا۔

کبھی کبھی وہ خیالات کی کثرت سے بیحد پریشان ہوجاتا۔ وہ دروازہ کھولدیتا اور باہر نکل جاتا بے خود اور بے پرواہ ندی کے بالکل کنارے پہنچ جاتا۔ خواہ کتنی ہی رات کیون نہ گذر گئی ہو، وہ وہان بیٹھ جاتا۔ اُس سے اپنی داستان الم کہنے لگتا۔ اس سے شانتی کی جدائی کا ذکر کرتا۔ اس سے التجا کرتا ”اے جل کے دیوتا۔ میری جوانی لے جا۔ میری جوانی۔ مگر شانتی کو، پیاری شانتی کو میری آنکھون سے اوجھل نہ ہونے دے۔“ ندی سے کوئی جواب نہ ملتا وہ وہان سے بھی شکستہ دل ہوکر بھاگتا چاندنی ہر طرف پھیلی رہتی۔ وہ چاند کو دیکھکر اُسے اپنی سرگزشت سُناتا۔ چاند سُنتا رہتا اور کوئی جواب نہ دیتا۔ وہ سب کو اپنے سے بیزار پاتا۔ وہ خود سب سے بیزار ہوکر اپنے جھوپڑے مین واپس آجاتا اور اشک باری اور نالۂ وفغان مین سحر کردیتا۔

(۲)

کشن پرشاد، جگت پور کے ایک نہایت امیر، ممتاز اور پابند مذہب برہمن تھے، خدا نے گھر مین سب کچھ دے رکھا تھا کسی بات کی کمی نہ تھی۔ خود کھاتے تھے اور دوسرون کو بھی کھلاتے تھے۔ تمام جگت پور مین مہاراج کے نام سے مشہور رہتے تمام لوگ مہاراج کو بہت قدر ووقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کشن پرشاد مہاراج کے گھر مین صرف تین آدمی تھے۔ ایک وہ خود، ان کی بیوی اور ان کی حسین لڑکی شانتی۔

پریم چند کے والد ٹھاکر رامچند، مہاراج کے ایک قدیم دوست تھے اور جب تک ٹھاکر صاحب زندہ رہے

دونون مین خوب نبھتی تھی۔ ٹھاکر صاحب زراعت وغیرہ کرتے تھے۔ لیکن فضول خرچ بھی بڑے تھے، بہت کچھ روپیہ ادھر اُدھر ناچ رنگ اور دوستون مین اُڑا دیتے تھے بیوی پہلے ہی مرچکی تھی اور اب اکیلے آپ تھے اور ایک لڑکا۔

جب ٹھاکر صاحب بہت ضعیف ہوگئے اور زندگی کی تمام کٹھن منزلین طے کرچکے تو انھون نے ایک دن مہاراج سے کہا۔ "مہاراج مین تو اب دنیا سے جارہا ہون۔ میرا ایک لڑکا ہے جسے مین آپکے سپرد کرتا ہون۔ مہاراج آپ اسکی پرورش کیجئے۔ اور جب بڑا ہو تو اُسے میرا گھر اور جائداد وغیرہ دیدیجئے گا" مہاراج نے قدیم دوستی کا خیال کرتے ہوئے ٹھاکر صاحب کی اس استدعا کو قبول کرلیا۔ اور ٹھاکر صاحب کی بہت تسکین و تسلی کی۔ چند روز کے بعد ٹھاکر صاحب دنیا سے کوچ کرگئے۔ مہاراج کو اپنے دوست کی جدائی سے بہت قلق ہوا۔ پریم کی عمر اس وقت صرف سات برس کی تھی اُسے باپ کی مفارقت کا صدمہ ضرور ہوا۔ لیکن مہاراج کے نیک برتاؤ، مہاراجن کی محبت اور شانتی کی ہم جلیسی نے وہ سب بھلا دیا۔ اور وہ نہایت آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔

شانتی عمر مین پریم سے چھوٹی تھی دونون ایک دوسرے کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو بہت پیار اور الفت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی محبت ایک دوسرے کے دلون مین زیادہ گہرا اثر کرنے لگی۔ شانتی کی ذراسی تکلیف پر پریم بیتاب ہوجاتا اور پریم کی افسردگی پر شانتی کو قرار نہ ملتا۔

پریم اور پیار کی ہلکی ہلکی موجین، جو شانتی اور پریم کے چھوٹے چھوٹے دلون مین آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھین اب عمر کی ترقی کے ساتھ بڑھنے لگین گھر کی چار دیواری مین، مان اور باپ کی نظرون سے پنہان ہوکر محبت کے دو چھوٹے چھوٹے پودے نشوونما پارہے تھے۔ دونون کے دلون مین ایک دوسرے کا احترام، عزت اور ایک دوسرے کی پسندیدگی کا راز زیادہ پر اسرار ہوتا گیا۔ اب پریم کی عمر پندرہ سال کی ہوگئی تھی اور وہ اپنے دل مین شانتی کی طرف ایک کشش سی محسوس کرتا تھا۔ لیکن یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کشش کی وجہ کیا ہے اور اس کشش کا جذبات انسانی پر کیا اثر ہوتا ہے اور یہ کشش انسان کی زندگی فنا کردینے پر کہان تک قادر ہے۔ وہ یہ کچھ نہ جانتا تھا۔ وہ ابھی کم عمر تھا وہ یہ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا۔

شانتی ایک بھولی بھالی، کمسن اور حسین لڑکی تھی۔ جو پریم سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ وہ بھی اپنے دل مین یہ بات ضرور پاتی تھی کہ پریم کے بغیر کسی کھیل کود مین اس کا دل نہین لگتا۔ پریم کے بغیر اُسے کھانے مین مزہ نہیں آتا اور جب پریم کو کوئی بےچینی ہوتی ہے تو اُسے بھی ایک اضطراب سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ اس کی چھوٹی عقل مین نہ آتی تھی۔ جذبات انسانی کو اس کے صحیح معنون مین سمجھ لینا ابھی اس جیسی لڑکی کا کام نہ تھا۔ ان دونون کی محبت معصوم تھی۔ گناہون سے معرا تھی۔ عیوب سے پاک تھی۔

جب شانتی اور بڑی ہوگئی اور پریم بھی سمجھدار ہوگیا تو مہاراجن نے دونون کی یکجائی کو مناسب نہ سمجھا۔

دونون کے برتاؤ - اور ارتباط کو دیکھکر ان کو گمان ہوا کہ شاید یہ ہم جلیسی آئندہ چلکر مفید نہ ثابت ہو اور اس لئے انھون نے مہاراج سے کہا کہ پریم کو الگ کردو - وہ سمجھدار ہو گیا ہے اور اپنا کاروبار خود کر سکتا ہے اتنے بڑے لڑکے کا گھر مین رہنا ٹھیک نہین - مہاراج نے سنا اور زیادہ توجہ نہ کی - جب مہاراجن کہتین - تو وہ یہ کہکر ٹال دیتے کہ ابھی کیا جلدی ہے - پڑا ابھی رہنے دو - اپنا کیا نقصان ہوتا ہے - اور اسی مین دو برس گذر گئے -

لیکن مہاراجن کو چین نہ آیا - وہ دل ہی دل مین مضطرب رہنے لگین - اس اثنا مین پریم اور شانتی ایک دوسرے کی محبت کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگے تھے - ان مین بے تکلفی پہلے ہی موجود تھی اور اب اس مین اضافہ ہونے لگا -

مہاراجن نے دونون کے غیر معمولی برتاؤ اور محبت سے تاڑ لیا کہ دال مین کالا ضرور ہے اور انھون نے کوشش کی کہ جلد ہی اس آنیوالی مصیبت کی جڑ کاٹ دین - آخر کار انھون نے مہاراج کو اچھی طرح سمجھایا بجھایا مہاراج نے بھی اب مناسب سمجھا اور نہایت نرم لہجہ مین پریم سے کہکر اس کو الگ کر دیا - اور اپنے ایک دوست کے پاس بہت معمولی تنخواہ پر نوکر رکھا دیا - ابھی اس کی عمر صرف اٹھارہ برس ہی کی تھی کہ اس کے نازک کاندھون پر ملازمت کا گران بار رکھدیا گیا -

ٹھاکر صاحب کے مرنے پر ان کی تمام زمین اور جائداد وغیرہ قرض مین چلی گئی - اس لئے بیچارے پریم کو محنت مزدوری پر زندگی گذارنی پڑی - اس علیحدگی سے اُسے جو صدمہ ہوا اُسی کا دل جانتا تھا - شانتی بھی کچھ کم غمگین نہ تھی - مگر مان کے ڈر سے کسی پر اپنی بیچینی کا اظہار نہ ہونے دیتی تھی - اور دل ہی دل مین اس آتش فرقت سے جل رہی تھی - مچل رہی تھی اور ضبط کر رہی تھی - آنسوؤن کو پی پی کر بھڑکی ہوئی چنگاریون کو بجھاتی تھی - کوئی ہم جلیس نہ تھا - کوئی مونس و غمخوار نہ تھا - کہتی تو کس سے کہتی اور کیا کہتی - غرض اس بیچاری کی ایسی ہی حالت تھی کہ جیسے کوئی کانٹون پر گھسیٹا جارہا ہو اور اُسے منہ سے اُف کرنے کی اجازت نہ ہو -

(۳)

پریم کو شانتی سے جدا ہو کر اب کامل دو سال ہو چکے تھے اس اثنا مین وہ اکثر شانتی کے گھر جایا کرتا تھا - ایک تو اس غرض سے کہ یہ اس کا فرض تھا کہ اپنے محسن کو فراموش نہ کرے دوسرے یہ کہ شاید شانتی کی کوئی جھلک نظر آجائے - جب وہ مہاراج کے یہان جاتا تو مہاراج اور مہاراجن دونون اس سے نہایت محبت آمیز برتاؤ کرتے تھے - وہ جب گھر مین جاتا تو ایک خود فراموشی کے عالم مین رہا کرتا تھا - وہ لوگون کی باتین سنتا تھا - مگر کچھ سمجھ مین نہ آتا تھا - وہ سب کچھ دیکھتا تھا مگر کوئی چیز اُسے صاف اور منور نظر نہ آتی تھی اور وہ نہایت خاموش اور مبہوت بیٹھا رہتا - مگر اس کی متجسّس نگاہین شانتی کے لئے گھر کا کونا کونا چھان ڈالتی تھین - شانتی کی ایک جھلک کے لئے وہ بہت بیچین رہا کرتا تھا - شانتی کو پریم کی موجودگی مین باہر آنیکی

اجازت نہ تھی۔ نہ وہ اس سے مل سکتی تھی۔ مگر پریم کے آنے کی خبر سنکر وہ بہت مسرور ہو جاتی، اور گو یہ مسرت عارضی ہوتی تاہم اُسے اس مین کافی لذت محسوس ہوتی تھی۔ صرف پریم کی آمد ہی اس کی بےچینی کو کسی حد تک کم کر دیتی تھی۔ اور جب تک وہ گھر مین رہتا اُسے ایک قسم کا سکون اور اطمینانِ قلب نصیب ہو جاتا تھا۔

پردہ کے اندر بند رہنے سے بعض اوقات وہ نہایت گھبرا جاتی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ کسی طرح پریم کو دیکھے۔ اس شوق مین وہ اکثر، جب دیکھتی کہ ماتاجی کسی اور طرف ہین اور پتاجی بھی باہر ہین، کھڑکیون اور دروازون سے جھانک لیتی۔ بعض اوقات پریم اور شانتی کی نگاہین ایک ہی وقت ایک دوسرے پر پڑتین۔ اور آنکھون ہی آنکھون مین ایک دوسرے سے اپنے دل کا حال کہدیتین۔ اور جب پھر پردہ حائل ہو جاتا تو شانتی کی آنکھون سے آنسو بہنے لگتے۔ اور پریم بھی جذبات کے سیلاب کو نہ روک سکتا۔ اُس کی پاس آگین آنکھین بھی پُرنم ہو جاتین۔ لیکن وہ فوراً پونچھ ڈالتا۔ اب زیادہ ٹھہرنے کی تاب اپنے مین نہ پاتا۔ اور اس ڈر سے کہ شاید آنسوؤن کا طوفان طاقتِ ضبط سے باہر ہو جائے وہ کسی بہانے فوراً گھر سے باہر چلا جاتا۔

(۴)

کچھ عرصہ گذر گیا اور اب شانتی کی شادی بیاہ کا تذکرہ گاؤن کے لوگون مین ہونے لگا لیکن ابھی یہ طے نہ پایا تھا کہ کس کے ساتھ شادی ہوگی؟ پریم نے بھی شادی کا حال سنا اور اپنا دل تھام کر رہگیا وہ بالکل بےبس تھا وہ اس معاملہ مین کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ شادی کے متعلق اپنی زبان سے کوئی لفظ نکالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ مہاراج اُس جیسے غریب کو اپنی بیٹی کیون دینے لگے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ گو مہاراج نے پریم سے ایک نہایت اچھا اور قابلِ ستائش سلوک کیا تھا۔ لیکن وہ یہ بات پسند نہ کرتے تھے کہ ایسے مفلس کو اپنی بیٹی دیکر اس کا جنم اکارت کرین۔ وہ برہمن تھے اور دوسری ذات کے ساتھ شادی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔

پریم اب بالکل مایوس ہو گیا۔ اس نے یقین کر لیا کہ اب شانتی کبھی اس سے نہ مل سکے گی۔ اور وہ آئندہ ہمیشہ کے لئے اس کی دید سے محروم کر دیا جائیگا۔ مگر وہ اپنے دل کو کیسے تسلی دیتا۔ وہ اپنی بیتابی کو کس طرح دفع کرتا۔ شانتی کی محبت پتھر کی لکیر تھی۔ اور اُسے لوحِ دل سے مٹا دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کی محبت کو بھول جانا اس کی طاقت سے بعید تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے سوچا کرتا کہ اب کیا ہوگا۔ وہ کس طرح شانتی کو بغیر دیکھے زندہ رہ سکیگا۔ اور زندہ بھی رہا تو اس کی زندگی مین لطف ہی کیا ہوگا۔ اس کی زندگی بالکل ایک مصنوعی انسان کی سی ہوگی۔ جس مین بظاہر حرکت ضرور ہوگی لیکن جسکا باطن بالکل بےجان اور بےحس ہوگا۔

شانتی اس معاملہ مین دم نہ مار سکتی تھی۔ وہ شکاری کے پرندہ کی مانند تھی۔ کہ جہان بند کر دی جائے وہان رہے اور جسے دیدی جائے اس کے ساتھ چلی جائے۔ اور لب پر آہ و فغان نہ لائے۔ خواہ اس کا مستقبل

تکلیف آمیز ہو یا مسرتناک، خواہ وہ کانٹون پر گھسیٹی جائے یا پھولون مین تُلے۔

چند دنون کے بعد جگت پور ہی کے ایک برہمن خاندان مین شانتی کی بات چیت لگ گئی۔ اور اب اعلیٰ پیمانہ پر شادی کی تیاریان شروع ہو گئین۔ جون جون شادی کے دن قریب آتے جاتے تھے۔ شانتی اور پریم کی بیتابیون اور بیقراریون مین اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پریم کو شادی کی تمام تیاریان اپنی موت کا سامان نظر آرہی تھین۔ وہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس آنیوالی مصیبت سے ٹکرا کر کہانتک جانبر ہو سکے گا۔ اور وہ اس اُٹھتے والی آندھی کے جھونکون سے آپنے آپکو کیونکر محفوظ رکھ سکے گا۔ اس کے دماغ مین کوئی تدبیر نہ آتی تھی۔

اس اثناء مین مہاراج کسی ضرورت سے کہین باہر چلے گئے اور اب صرف مہاراجن اور شانتی اکیلی رہگئی تھین یا دو ملازم۔ ایک بڑھیا جو گھر مین کھانا وغیرہ پکاتی تھی دوسرا ایک لڑکا جو باہر کا کام کاج کیا کرتا تھا۔ شادی کو تھوڑے ہی دن باقی رہگئے تھے کہ مہاراجن بیمار پڑ گئین۔ انھین بخار آنے لگا اب پریم کے لئے اچھا موقع تھا اس نے یہ حالت دیکھی تو دن بھر مہاراجن کے یہان رہنے لگا اور دوا علاج مین بہت مستعدی ظاہر کرنے لگا۔ وہ وید اور حکیمون کو بلا کر لاتا۔ مہاراجن کو دکھاتا۔ اور خود ہی جاکر بازار سے دوا لاتا۔ اور آپ ہی مہاراجن کو پلاتا۔ اس پریشانی اور تکلیف کے وقت مہاراجن نے پریم اور شانتی کے پردہ کا زیادہ خیال نہ کیا۔ اور کئی مرتبہ خود مہاراجن کے سامنے پریم اور شانتی کا آمنا سامنا ہو گیا۔ لیکن شانتی مان کے ڈر سے فوراً پردہ مین چلی جاتی تھی۔

شانتی کی اُٹھتی جوانی اور بھولی صورت دیکھ دیکھ کر پریم اب اور زیادہ بیتاب ہونے لگا۔ اور شادی کے خیال سے تو اسکے سینے پر سانپ ہی لوٹ جاتا تھا۔ اور وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا تھا بعض وقت جب مہاراجن شدتِ بخار سے غافل پڑی رہتین۔ یا سو جاتین اور پریم آجاتا تو شانتی سے خاموش نہ رہا جاتا۔ وہ فوراً دروازہ کھولدیتی، پردہ سرکا دیتی اور دونون ایک دوسرے کو دیکھنے مین گھنٹون محو رہا کرتے۔ مگر بات نہ کر سکتے تھے۔ انھین یہ خوف لگا رہتا کہ کہین مہاراجن غفلت سے چونک نہ پڑین۔ یا کوئی اور آکر دیکھ نہ لے۔ اکثر بار خود جذبات سے مغلوب ہو کر پریم شانتی کو دیکھتے دیکھتے اس کے قریب بھی پہنچ جاتا اور جوش محبت سے چاہتا کہ شانتی ایک ہی بار اپنے سینے سے لگالے۔ مگر فوراً ہی کسی خیال سے وہ رُک جاتا۔ اس کے تمام جسم مین لرزہ پیدا ہو جاتا اور وہ جون کا تون کھڑا رہجاتا۔ شانتی پریم کی اس دیوانگی کو دیکھکر آپے مین نہ رہجاتی۔ وہ اس کی بیخودی کو دیکھکر خود بدحواس ہو جاتی۔ اور اپنا ہاتھ پریم کی طرف بڑھا دیتی کہ وہ اُسے بوسہ دیکر اپنے بیتاب دل کی تسکین کرے۔

(۵)

پریم اور شانتی کے لئے یہ آخری اور نہایت خوشگوار لمحے تھے جنھین وہ نہایت قدر سے دیکھتے تھے۔ اور مسرور ہوتے تھے۔ شانتی نے اپنی شادی کی پُرشور اور طربناک گھڑیون کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دیا تھا۔ کیونکہ حقیقت مین وہ آنیوالی گھڑیان خود اس کے لئے مسرتناک نہ تھین۔ اور وہ انھین لمحون کو اپنی شادی کی فرحت افزا اور نشاط آگین گھڑیان سمجھنے

لگی تھی۔ جبکہ وہ پریم کو دیکھ سکتی تھی اور پریم اُسے۔

ایک روز مغرب کے بعد مہاراجن کا مزاج زیادہ ناساز ہو گیا جس سے شانتی کسی قدر گھبرا گئی اور وہ پردہ کا خیال کئے بغیر پریم کی موجودگی مین مان کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ پریم کی زندگی کا یہ سب سے زیادہ زرین موقع تھا۔ وہ اپنی محبوبہ دلنواز کے رُخ زیبا کی سُرور پاش تجلیون مین خود کو گم کئے دیر رہا تھا، وہ اُسکے چہرے کی رنگینیون مین اپنی تشنہ نگاہون کو پیوست کئے دیر رہا تھا۔ وہ اس کی ہلکی سی گھبراہٹ کی چمک مین اپنے آپ کو محو کئے دے رہا تھا۔ وہ ہمہ تن شانتی کے جلوہ مین محو ہو گیا۔ وہ چپ بیٹھا تھا اور اُسے خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونیوالا ہے۔ وہ بس شانتی کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے مہاراجن کی فکر نہ تھی کہ وہ کس حال مین ہین۔ شانتی اپنی مان کی غیر معمولی خاموشی سے ہراسان ہو رہی تھی۔ اور کبھی کبھی شرمگین انداز سے پریم کو مخاطب کر کے کہتی "ذرا دیکھو تو ماتا جی کیسی چپ ہوتی جا رہی ہین!" پریم اس مترنم اور محبت آگین آواز سے چونک پڑتا اور نرم لہجہ مین تسلی دیتے ہوئے کہتا "نہ گھبراؤ شانتی۔ ماتا جی اچھی ہو جائینگی"۔

رات، دیہات کی رات نہایت پُرسکون ہوتی ہے، مگر آج کی رات نہایت ہیبتناک معلوم ہو رہی تھی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت مان بستر پر غافل اور بیہوش پڑی تھی۔ شانتی ایک طرف بیٹھی مان کے چہرے کو حسرتناک انداز سے دیکھ رہی تھی۔ اور دوسری طرف پریم گم صُم بیٹھا شانتی کی بدحواسیون کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

دروازہ گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ کھُلا اور مہاراج کشن پرشاد اندر داخل ہوئے۔ جو منظر انھین نظر آیا اس سے وہ بہت غضبناک ہو گئے۔ پریم کو رات مین شانتی کے پاس بیٹھا دیکھکر ان کی آنکھون مین خون اُتر آیا۔ اور ممکن تھا کہ وہ اپنا سارا غصّہ پریم پر اُتار دیتے۔ لیکن فوراً ہی شانتی چلا اُٹھی، "پتا جی دیکھو ماتا جی کیسی چپ پڑی ہین شاید بیہوش ہو گئی ہین"۔ شانتی کی اس دردآمیز صدا نے ان کا غصّہ فرو کر دیا اور وہ فوراً ہی مہاراجن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

پریم مہاراج کی اس اچانک آمد سے کچھ کم خوفزدہ نہوا۔ وہ مہاراج کے تیور ہی دیکھکر سمجھ گیا تھا کہ اب کوئی مصیبت ضرور آنیوالی ہے۔ اور وہ اس ڈر سے کانپنے لگا تھا۔ مہاراج کی پیٹھ پلٹتے ہی وہ چپکے گھر سے باہر نکل گیا۔ شانتی کی تو جان ہی پر آبنی تھی۔ اگر اس وقت مہاراجن کی یہ بُری حالت نہوتی تو معلوم نہین اس بیچاری پر کیا قہر ٹوٹتا۔

(۶)

مہاراج نہایت سرگرمی اور جانفشانی سے تیمارداری مین منہمک ہو گئے اور مہاراجن کی حالت رو بصحت ہو چلی اب شادی کو صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا اس اثنا مین پریم روزانہ مہاراج کے پاس آتا ضرور تھا۔ لیکن گھر مین مہاراج کی اجازت کے بغیر نہ جاتا تھا۔

دو دن گذر گئے اور اب مہاراجن مین چلنے پھرنے کی سکت بھی آگئی تھی۔ مہاراج کے آنے کے بعد شانتی کو تو پریم سے ملنے کا موقع ملا نہ وہ اُسے دیکھ ہی سکی۔ انھین دنون مین کرشن کی پوجا کا دن بھی آنیوالا تھا۔ اور اس روز مہاراجن

اور شانتی وغیرہ، بڑے مندر مین جاکر، جو گاؤن سے تھوڑی ہی دور باہر تھا، پوجا پاٹ کرتی تھین - اس روز مندر مین بہت ہجوم ہوا کرتا تھا اور میلہ بھی لگتا تھا - اس پوجا کے دوسرے ہی دن شانتی کا بیاہ ہونیوالا تھا - اور برات آنے والی تھی -

شانتی کو اب شادی تک پریم سے ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی - لیکن پوجا کا دن یاد آگیا اور اس سے وہ کسی قدر مسرور ہوگئی - اس کو اطمینان ہوگیا کہ بس آخری ملاقات کا یہی موقع ہے - اور اب وہ اس فکر مین رہنے لگی کہ پریم کو اس پوجا کے روز مندر مین بلائے اور اس سے آخری مرتبہ اپنی محبت کا اظہار کردے - ایک روز جب مہاراج باہر گئے تھے اور مہاراجن ایک کوٹھری مین سو رہی تھین - پریم مہاراج کے گھر آیا - شانتی کو جب معلوم ہوا تو اس نے بڈھی سے کہل بھیجا کہ جاکر ان سے کہو تمھین ماتا جی بلا رہی ہین - اور وہ خود کوٹھے پر چڑھ گئی اور ایک کھڑکی سے پریم کی آمد کا انتظار کرنے لگی - بڈھی بیچاری ایک سیدھی سادھی عورت اُسے کیا خبر کہ کیا معاملہ ہے اس نے جاکر پریم سے کہدیا - وہ ڈرتا ڈرتا اندر آیا شانتی نے فوراً پان بھجوایا اور کہدیا کہ دیکھکر کھائین کہین چونا زیادہ نہو - اور خود کھڑکی مین سے جھانکنے لگی - پریم مہاراجن کی کوٹھری کی طرف گیا مگر انھین سوتا دیکھکر واپس جانے لگا - اس اثنا مین اُسکی نگاہ شانتی پر پڑ گئی وہ جھجک کر ٹھٹھرا - بڈھی نے پان لاکر دیا - اس نے جلدی سے لیا - اور مہاراج کے ڈر سے فوراً گھر سے نکلکر چلدیا - شانتی کے دل کی مراد بر آئی - اور وہ مسکرانے لگی پریم وہان سے نکلکر سیدھا اپنے گھر چلا آیا - اس سے قبل بھی اُسے پان کھانے کا موقع ملا تھا - مگر خود مہاراجن لگاکر دیا کرتی تھین - آج شانتی کے ہاتھ کا لگایا ہوا پان دیکھکر وہ خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا - اس نے اُس پان کو آنکھون سے لگایا - چوما - سر پر رکھا - پھر بوسہ دیا - پھر آنکھون سے لگاکر آہستہ آہستہ اپنی مرتعش اور لاغر انگلیون سے کھولا - اسکے اندر ایک کاغذ کا پرزہ تھا جس مین حسب ذیل تحریر تھی -

میرے پریم - میری شادی کو صرف دو دن اور رہ گئے ہین پرسون کرشن جی کی پوجا ہے مین اور ماتا جی ضرور پوجا کی غرض سے بڑے مندر جائینگی - تم وہان کہین مندر کے قریب ہم سب کی نظرون سے پوشیدہ ہوکر ٹھہرنا اور میرا انتظار کرنا - مین تم سے آخری بار ضرور ملنے آؤنگی - پریم وہان ضرور آنا اگر تم نہ آئے تو مجھے بیحد صدمہ ہوگا -

تمھاری شانتی

(۷)

آج کرشن کی پوجا کا دن تھا - تمام مندر چراغون اور پھولون سے روشن اور آراستہ تھا ہر طرف پجاریون کا اژدہام نظر آتا تھا - دُور دُور سے لوگ پوجا کی غرض سے آئے تھے - مندر کے چارون طرف روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی تھی - دوکانین بہت آراستہ تھین - شور و غل ہو رہا تھا اور لوگ ادھر سے اُدھر آجا رہے تھے - غرض جنگل مین منگل ہو رہا تھا اور اتنے بڑے مجمع مین کسی کو تلاش کرنا بڑا دشوار کام تھا -

شانتی بھی اپنی ماں اور نوکرون کے ہمراہ میلے مین وارد ہوئی - اُسے درحقیقت نہ میلے کی مسرتون سے دلچسپی تھی نہ پوجا کرنے کا شوق تھا - نہ وہ کچھ خریدنا چاہتی تھی اور نہ کسی کھیل تماشے سے اس کی دلبستگی تھی - اسکی

نگاہین صرف پریم کی متلاشی تھین - اور وہ سراپا پریم سے ملنے کے شوق مین ڈوبی ہوئی تھی - جب وہ لوگون کے اس ہجوم مین داخل ہوئی تو گھبرا گئی کہ ایسی بھیڑ مین پریم سے وہ کیونکر مل سکے گی - لیکن اس کے جذبۂ محبت اور شوقِ ملاقات کے آگے یہ ساری مشکلین ہیچ تھین - وہ مان کی نظر بچا کر گھونگٹ کھول کھولکر لوگون کی طرف دیکھنے لگی اور پریم کو تلاش کرنے لگی -

مان کے ساتھ رہکر پریم کو تلاش کرنا یا اس سے ملنا غیر ممکن تھا - اس لئے وہ مان سے الگ ہوجانا چاہتی تھی - ابھی وہ سب مندر کے قریب ہی پہنچے تھے کہ لوگون مین مندر کے اندر جانے کی کشمکش شروع ہوگئی - اور ایک مرتبہ ایسی زور کا ریلا آیا کہ شانتی مان سے الگ ہوگئی - اب وہ جلد جلد وہان سے قدم اُٹھانے لگی - اس نے اپنا گھونگٹ اُلٹ دیا - اور جدھر لوگون کی کثرت نہ تھی اُس طرف ہر شخص کو غور سے دیکھتی ہوئی بڑھنے لگی - چلتے چلتے وہ مندر کی پشت پر پہنچ گئی - پریم بھی ایک طرف ایک ٹیلے پر کھڑا ہوا ہر آنے جانیوالی عورت کو غور سے دیکھ رہا تھا - وہ اپنا سر اور چہرہ کپڑون سے اس طرح چھپائے ہوئے تھا کہ کوئی اُسے پہچان نہ سکتا تھا - شانتی پر اس کی دور بین نظر جا پہنچی - وہ ٹیلے پر سے اُتر آیا اور شانتی کی طرف بڑھا - وہ شانتی کے پاس پہنچ گیا - شانتی اُسے دیکھکر مسرور ہوگئی - اور اُس نے اپنا گھونگٹ آگے کرلیا - پریم کو اس وقت کسی کا خوف نہ تھا - وہ انجام پر غور کئے بغیر شانتی کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا - "آہ شانتی تم آگئین" - شانتی نے کسی قدر مبہوت اور گھبرائی ہوئی آواز مین کہا - "چپ رہو پریم - کوئی سُن نہ لے - چلو کہین دُور چلکر باتین کرین" - اس کے بعد پریم نے کچھ نہ کہا اور وہ آہستہ آہستہ ایک سمت مین چلنے لگا شانتی بھی اُسکے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی -

اس ہنگامۂ محشر نما اور مندر سے کچھ دُور پر ایک چھوٹی پہاڑی تھی - جدھر لوگون کی آمد و رفت بہت کم تھی - یہان تاریکی بھی تھی اور دوکانین بھی دو ایک سے زیادہ نہ تھین - پریم شانتی کو ساتھ لئے ہوئے اس پر چڑھ گیا - اور وہ دونون سب کی نظرون سے چھپ گئے - اب شانتی مین زیادہ چپ رہنے کی تاب نہ تھی - اس نے فوراً اپنا چہرہ پوری طرح عریان کردیا - اور پریم کو آرزومند اور حسرت آگین نگاہون سے دیکھنے لگی - پریم بھی کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا - پھر اُسنے شانتی کے دونون ہاتھ پکڑ کر زمین پر بٹھا دیا - اور بولا - "میرے دل کی شانتی اس پتھریلی زمین پر بیٹھنے مین کوئی تکلف نہ کرو یہ زمین آج ہمارے لئے بہت مقدس اور مبارک ہے -" شانتی نے جوابدیا - "پریم - میرے پریم اگر تم مجھے کانٹون پر بیٹھنے کو بھی کہدو تو مجھے انکار نہوگا یہ تو زمین ہی ہے" - پریم نے جوش مین آکر اُسے اپنی محبت نواز آغوش مین لے کر اپنے سینے سے لگا لیا - اور چند منٹ تک دونون خاموش رہے - پھر پریم نے دردانگیز لہجہ مین کہا - "شانتی کل تم بیاہ دی جاؤ گی اور مین ہمیشہ کیلئے تم سے چھوٹ جاونگا" - شانتی یہ الفاظ سنکر بیتاب ہوگئی مگر وہ پریم کو تسلی دیتے ہوئے بولی - "پریم مین تم سے جدا ہونے والی نہین ہون - یہ تو قسمت مین لکھا ہوا تھا کہ مین کسی اور سے بیاہ دی جاؤن - مگر پریم تمھاری محبت شادی کے بعد بھی مین تم سے ملتی رہونگی - پریم میرے پریم - شادی ہماری محبت مین کوئی فرق نہین پیدا کرسکتی" - پریم نے کہا - "ہان میری پیاری

شانتی۔ میری شانتی تم سچ کہہ رہی ہو۔ میری بھولی لڑکی، تمھارے من مین پریم کی محبت ضرور ہے لیکن تم اپنے من کی بات نہ کر سکو گی۔ تمھین اپنے سوامی کی اطاعت کرنی پڑیگی۔ جو کچھ وہ کہیگا وہی کرو گی،" شانتی نے جواب دیا۔

"پریم میرے ایک استری کا سب سے پہلا فرض یہی ہے کہ وہ اپنے سوامی کی دل و جان سے فرمانبرداری کرے۔ لیکن پریم میرے۔ مین کسی اور کی استری ہو جاؤن گی تو کیا ہوا۔ میرے جسم پر میرے شوہر کا قبضہ ضرور ہو گا۔ مگر میری روح کے تم اکیلے مالک ہو۔ اس پر کسی کا قبضہ نہین ہو سکتا،" پریم شانتی کے اس جواب سے بیحد متاثر ہو گیا اور وہ دیوانگی کے عالم مین چلا اُٹھا۔ "شانتی۔ شانتی۔ میری اچھی شانتی" اور یہ کہکر اس نے پھر ایک بار اُسے لپٹا لیا۔ اور دونون کی آنکھون سے آنسو بہنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد پریم نے شانتی سے جدا ہوتے ہوئے کہا۔ "شانتی تم میرے دل کی ملکہ ہو۔ دنیا مین، مین صرف تمھین چاہتا ہون۔ اور کسی سے مجھے محبت نہین ہے۔ مگر۔ مگر شانتی یہ جدائی یہ فرقت کی گھڑیان کیسے کٹین گی۔؟" شانتی نے حسرت بھرے لہجہ مین جواب دیا۔ "پریم۔ پرماتما کاٹنے والا ہے۔ تم زیادہ بےچین نہو۔ مین تم سے ضرور آکر ملا کرونگی،" پریم بیتابی کے انداز سے بولا۔ "شانتی پرماتما نے تمھاری محبت کیون دی تھی۔ مجھے۔ ہائے اگر جدا ہی کرنا تھا تو تمھاری محبت کا پرستار نہ بنایا ہوتا،" شانتی نے نہایت نرم اور تسکین دہ لہجہ مین کہا۔ "پیارے پریم تم سچ کہتے ہو۔ مگر ایشور کی مصلحتون مین کسی کو کیا دخل اس نے ہماری قسمتون ہی مین جدائی لکھدی تھی۔ پھر ہم کیا کر سکتے ہین،" پریم بولا۔ "تمھارے بغیر مجھے چین نہ آئیگا۔ شانتی مین دیوانہ ہو جاؤنگا۔" شانتی نے کہا۔ "ایسا نہ کہو پریم۔ تمھاری ان باتون سے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے تم صبر کرو جس نے ہمین یہ غم دیا وہی دور بھی کر دیگا۔ پریم پریم تم رو رہے ہو؟" پریم نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "شانتی۔ شانتی رو رہا ہون اپنی قسمت کو۔ اپنے پھوٹے بھاگون پر آنسو بہا رہا ہون،" شانتی بولی۔ "مگر اس وقت کو غنیمت سمجھو۔ اس کی قدر کرو۔ اور اُسے آہ و زاری مین ضائع نہ کرو۔" پریم نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "ہان سچ کہہ رہی ہو شانتی۔ میری پیاری ہان مجھے اچھی اچھی باتین کرو مین اب نہ رُوؤنگا۔ اور شانتی یہ تو بتاؤ تم یہان میرے ہان اکیلے کیسے آسکین؟" شانتی نے جواب دیا۔ "مین لوگون کی بھیڑ مین اتفاقاً ماتا جی سے الگ ہو گئی اور تم کو ڈھونڈتی ہوئی یہان تک آ پہنچی۔ پریم تمھاری کشش نے ساری مشکلین آسان کر دین۔" پریم بولا۔ "پھر تمھاری ماتا جی تمھین ڈھونڈتی ہون گی؟" شانتی نے جواب دیا "ہان ضرور۔ مگر مین اب یہان سے گھر چلی جاؤنگی۔ کیونکہ انھین اب مین اتنے بڑے مجمع مین کہان تلاش کرتی پھرونگی" پریم نے کہا۔ "اس سے کہین وہ کچھ اور نہ خیال کرین؟" شانتی نے اطمینان دیتے ہوئے کہا۔ "نہین پریم تم اس کا کچھ خوف نکرو۔ مجھپر کوئی آفت نہین آسکتی۔ پیارے پریم میری سمجھ مین خود ہی نہین آتا۔ کہ تمھارے بغیر میری زندگی کن مصیبتون کی آماجگاہ بنجائیگی۔" پریم نے مضطرب انداز سے جواب دیا۔ "شانتی بتاؤ پھر مین تمھارے لئے کیا کرون؟ مین تمھارے آرام کے لئے کیا کر سکتا ہون؟" شانتی نے اپنا سر اُٹھا کر پریم کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔ پریم بُت کی طرح ساکت آنکھون مین آنکھین ڈالے بیٹھا رہا۔ کسی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ پھر پریم نے مایوسانہ لہجہ مین کہا۔ "شانتی مین اب کبھی

تمھین نہ دیکھ سکونگا" شانتی نے جواب دیا "نہین اس قدر مایوس نہو۔ تم مجھے جب چاہو دیکھ لوگے۔ تم کیون بلا وجہ نا امید ہوئے جارہے ہو؟" پریم نے کہا "مگر۔ مگر مین ڈرتا ہون کہ شادی کے بعد شاید تم مجھے بھول جاؤ" شانتی نے رنجیدگی سے جواب دیا "مجھے ایسی باتون سے صدمہ ہوتا ہے۔ نہ کہو پریم۔ تم مجھے ایسی بے وفا ہستی نہ سمجھو۔ میری زندگی صرف تمھاری یاد سے وابستہ ہے۔ پریم۔ پریم شانتی تمھین تمام عمر نہین بھول سکتی" پریم فرطِ انبساط اور جوش محبت سے چلا اٹھا "تم کبھی نہ بھولوگی۔ میری شانتی تم مجھے کبھی نہ فراموش کروگی؟" شانتی نے سر اٹھا کر پریم کی طرف درد بھری نظرون سے دیکھا اور محبت آگین لہجہ مین کہا۔ "کبھی نہین" یہ جواب سنکر پریم نے اُسکا نازک اور سیمین ہاتھ اُٹھالیا اور اپنے تشنہ لبون کی طرف لیجانے لگا کہ اُسے بوسہ دے لیکن ابھی ہونٹون نے اس کے ہاتھ کو مس بھی نہ کیا تھا کہ پریم الدم ساکت ہوگیا۔ اور آنکھین پھاڑ کر ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے ہاتھون مین کالا ناگ پکڑے ہوئے ہے اُس نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔

پریم کی اس حرکت سے شانتی متحیر ہوگئی۔ اس نئی وحشت سے وہ زیادہ مضطرب ہوگئی اُس نے تعجب سے پوچھا "پریم۔ پریم یہ کیون؟" پریم نے متانت سے جواب دیا "اب یہ میرا حق نہین ہے۔ شانتی اب یہ کسی اور کی ملکیت ہے" شانتی نے بیخود ہو کر کہا "نہین پریم۔ مین اجازت دیتی ہون۔ ابھی تمھین حق حاصل ہے ابھی مین تمھاری ملکیت ہون۔ کل سے نہ رہونگی" پریم بولا "نہین شانتی اب میری جرأت نہین کہ تمھارے جسم کو ہاتھ لگا سکون۔ بس اور مین کچھ نہین چاہتا تم سے۔ شانتی مجھے اپنے دل سے نہ مٹانا" شانتی بیچین ہوکر بولی "پریم! آخر ابھی سے تم کیون مجھسے نفرت کرنے لگے۔ میرے ہاتھون کو کیا ہوگیا؟" پریم نے جواب دیا "کچھ نہین شانتی۔ کچھ نہین۔ مگر اب تم پر میرا کوئی حق نہین ہے۔ مجھے کرشن جی نے آکر منع کردیا۔ بس شانتی یہ ہماری آخری ملاقات ہے اور اب تم جاؤ۔ ایشور تم کو چین اور سکھ دکھائے"۔

کرشن کا نام سنکر شانتی کے معصوم اور منور آنکھون سے آنسوؤن کی جھڑیان لگ گئین اور وہ چپکے چپکے خوب روئی۔ پریم بے حس و حرکت بیٹھا دیکھتا رہا۔ اپنے آپ کو اس کے آنسوؤن مین غرق کرتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ شانتی نے ساری کے ایک کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "پریم تو مین اب جارہی ہون اور آخری مرتبہ تم سے کہتی ہون کہ میرے لئے تم اپنا دل نہ کڑھانا۔ مین تمھاری ہون اور ہمیشہ تمھاری ہوکر زندہ رہونگی۔ تم جب چاہو مجھے دیکھ سکتے ہو" پریم بولا۔ "شانتی۔ میری شانتی جدائی کی تاب کسے ہے۔ مگر کرشن جی کا حکم ہے اور اب تم اپنے گھر جاؤ۔ مجھپر جیسی گذرے گی پرماتما مالک ہے۔ چلو اُٹھو۔ کیا مین تمھین مندر تک پہنچادون؟" شانتی نے جواب دیا۔ "نہین پریم اب مین مندر اور میلے جاکر کیا کرونگی۔ تم مجھے گھر ہی تک پہنچادو تو اچھا ہے" پریم نے اُٹھتے ہوے کہا۔ "مین پہنچانے کے لیے تیار ہون۔ مگر شانتی مجھے خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہین کوئی ہمین دیکھ نہ لے" شانتی بولی "ہان یہ ڈر ضرور ہے لیکن تم مجھے گھر سے کچھ دور چھوڑ دینا وہان سے مین اکیلی چلی جاؤنگی۔ تم اپنا منہ کپڑے مین چھپا کر آگے آگے چلو" پریم نے جواب دیا "اچھا چلو" یہ کہکر پریم اور شانتی

ٹیلے پر سے اُتر آئے۔ اور گھر کی طرف جلد جلد قدم اُٹھانے لگے۔

(۸)

شادی کا روز تھا۔ اور مہاراج کشن پرشاد کا گھر مسرتون اور خوشیون کا گہوارہ بنا ہوا تھا ہر طرف زرق برق پوشاکین نظر آرہی تھین۔ اور ہر شخص متبسم اور مسرور دکھائی دیتا تھا۔ شانتی دولہن بنی ہوئی بیٹھی تھی۔ مگر اس کا سارا دل گذشتہ ملاقات اور پریم مین لگا ہوا تھا۔ اور گویا وہ آنیوالی گھڑیون سے بالکل انجان تھی۔

پریم جب شانتی کو اُسکے گھر پہنچا کر اپنے جھوپڑے مین آیا تو اُسے کچھ کچھ حرارت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ آتے ہی سو گیا۔ حرارت بتدریج بڑھتی رہی۔ اور جب صبح اس نے آنکھ کھولی تو بخار اچھا خاصا چڑھا تھا۔

مہاراج پریم کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب بہت عرصہ تک بھی وہ نہ آیا تو انھون نے ایک آدمی کو اُسے بلانے کے لئے بھیجا۔ اُس آدمی نے جا کر دیکھا تو پریم ایک چارپائی پر چادر مین لپٹا پڑا تھا۔ اُس نے چادر کھولکر اُسکے بازوُن کو پکڑا اور ہلایا۔ پریم کا سارا بدن آگ کی طرح جل رہا تھا اور وہ بالکل غافل پڑا تھا۔ اس آدمی نے زیادہ جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اُسے اُسی حالت مین چھوڑ کر وہ مہاراج کے پاس واپس گیا اور ان سے کیفیت کہدی۔ مہاراج شادی کے جھگڑون مین پڑے تھے انھون نے زیادہ توجہ بھی نہ کی۔

جب برات رخصت ہونیوالی تھی تو مہاراج نے پھر ایک بار پریم کے پاس آدمی بھیجا۔ لیکن پریم کی حالت بدستور تھی۔ بخار مین کوئی تنزل نہ تھا۔ اور اُسے بالکل ہوش نہ تھا۔ دن بھر وہ اسی بخار مین بیدم پڑا رہا۔ رات بھی ہو گئی مگر وہ نہ چونکا۔ اس وقت کوئی اس کے حلق مین پانی ٹپکانے والا بھی نہ تھا۔ ساری رات شدتِ بخار سے وہ بےحس و حرکت پڑا رہا۔

(۹)

شانتی کی شادی ہو گئی اور وہ اب اپنی سُسرال چلی گئی۔ شنکر لال رام نگر مین ملازم تھا جب اُس کی رخصت ختم ہو گئی۔ تو وہ شانتی کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔

پریم کے لئے یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس نے پریم کی زندگی مین ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے لوگون سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ اور نوکری سے واپس آنیکے بعد تمام وقت اپنے جھوپڑے مین پڑے پڑے گذارنے لگا۔ وہ کسی کھیل اور تماشہ سے دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ اور اب ہفتون گذر جاتے تھے مگر وہ مہاراج کے یہان بھی نہ جاتا تھا۔ اس اثنا مین شانتی کا حسب ذیل خط آیا۔

"میرے پریم۔ مین تمھین دیکھنے کو بہت تڑپتی ہون۔ میرے شوہر نے تمھین بُلانیکی اجازت دیدی ہے۔ تم آکر مجھے دیکھ سکتے ہو۔"

پریم نے خط پڑھا تو اس کی بےچینی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُسکا سر چکرانے لگا اس نے اپنے دل کو اپنے دونون پنجون سے مسل ڈالا۔ اور آہ بھر کر رہگیا۔ اس خط سے محبت کی دبی ہوئی چنگاریان بھڑک اُٹھین اور وہ آنسو بہانے لگا۔

اس خط کے بعد اکثر اسی قسم کے خطوط آتے رہے۔ اور اُن کو پڑھکر پریم کی حالت دیوانون کی سی ہوجایا کرتی تھی۔ مگر معلوم نہین کیا خیال کرکے وہ جواب نہ دیتا تھا۔ لیکن جب شانتی کے خطوط کی بھرمار ہونے لگی تو اس نے بہت جبر کرکے جواب لکھا۔

"ش.........."

"تمھارے سب خطوط مل چکے ہین۔ مین انکا کیا جواب دون۔ تمھین شاید ناگوار ہوگا۔ مگر بہتر یہی ہے کہ تم مجھے بھلا دو۔ اور جو وقت میری یاد مین گذارتی ہو وہ اپنے شوہر کی راحت و آرام کے خیال اور فکر مین صرف کردو۔ مین جانتا ہون کہ اس تحریر سے تمھین صدمہ ضرور ہوگا۔ مگر مین بالکل مجبور ہون۔ مین اپنی موجودگی سے تمھارے موجودہ سکون کو پراگندہ کرنا نہین چاہتا۔ اور اس لئے مناسب یہی ہے کہ ایک ایسے انسان کو، جسکا اب تم پر کوئی حق نہین ہے اور جس سے نہ اب تمھین کوئی اُمید رکھنی چاہئے۔ بھول جاؤ۔ شاید اب تمھین اور کوئی خط بھیجنے کی ضرورت محسوس نہوگی۔"

"پریم"

(۱۰)

چار برس گذر گئے۔ یکایک جگت پور مین طاعون پھیلا اور مہاراج اور مہاراجن دونون اس دنیا سے چل بسے اب ساری جائداد کی مالک شانتی اکیلی تھی۔ جب مہاراج اور مہاراجن بیمار تھے تو شانتی جگت پور آئی تھی اس کے علاوہ بھی وہ کئی بار مان باپ سے ملنے آچکی تھی اور یہان آنیکے بعد اُس نے پریم کو بلایا بھی تھا۔ مگر وہ پھر کبھی نہ آیا۔

جائداد بہت مختصر سی تھی۔ لیکن پھر بھی شانتی کے لئے بہت کافی تھی۔ اسے پالینے کے بعد شانتی نے پریم کو ایک بار پھر لکھا۔

"پریم میرے۔ تم جانتے ہو کہ میرے مان باپ اب زندہ نہین اور جو کچھ تھوڑا بہت سرمایہ وہ چھوڑ گئے ہین اس کی اب تنہا مالک اکیلی مین ہی ہون۔ مین تمھین اپنی زمین وغیرہ کا مختار بنانا چاہتی ہون اور کچھ جائداد تمھارے نام لکھنا چاہتی ہون۔ بہتر ہوگا کہ تم مجھسے آکر مل لو۔ اور میرے اس ناچیز ہدیہ کو قبول کرو"

"تمھاری شانتی"

پریم نے جواب دیا "..........ش۔ مجھے نہ جائداد کی خواہش ہے نہ مال و دولت کی۔ پرماتما سب تمھین مبارک کرے۔ مین اب اس قابل بھی نہین ہون کہ جائداد کا کام سنبھال سکون۔ میری صحت اچھی نہین رہتی نہ ہوش و حواس بجا رہتے ہین۔ اُمید ہے کہ معذور سمجھکر تم مجھے معاف کردوگی۔"

"پریم"

دن و رات، ہفتے اور مہینے اسی طرح گذرتے رہے۔ دنیا گردش کرتی رہی، موسم آتے جاتے رہے لیکن پریم کی حالت مین کوئی تغیر رونما نہوا۔ وہ وہی پریم تھا۔ اُسکی آہین وہی تھین اس کی خاموشی وہی تھی اور اس کی وحشت مین بھی کوئی تبدیلی

نہوئی تھی۔ صرف اسکی صحت ضرور انحطاط کی طرف مائل تھی اور وہ روز بروز نحیف وکمزور ہوتا جارہا تھا۔

شانتی سے جدا ہوکر اب پانچوان برس بھی ختم ہونے والا تھا۔ ایک دن شام کو جب پریم اپنے جھوپڑے کے باہر بیٹھا ہوا ندی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک آدمی اسکے پاس آیا اور اُس سے پریم کا پتہ پوچھنے لگا۔ پریم کے جواب پر اس نے ایک خط نکالکر اُسے دیا۔ پریم سے کر پڑھنے لگا۔

”پریم۔ یہ میرا آخری پیغام ہے۔ مین بستر مرگ پر پڑی ہوئی ہون۔ میرے سوامی یہان نہین ہین وہ یہان سے بہت دور ہین اور اسوقت ان کا آنا ناممکن ہے۔ اس وقت اگر مین مرجاؤن تو کوئی ایسا نہین جو میرے ننھے بچے موہن لال کی دیکھ بھال کرسکے۔ اور مین اپنے سسرال کے لوگون کو اس کے لئے مناسب نہین سمجھتی۔ مین اُسے تمھارے سپرد کردینا سب سے بہتر سمجھتی ہون۔ پیارے پریم میری اس آخری آرزو اور التجا کو نہ ٹھکرانا ورنہ مرنیکے بعد بھی چین نصیب نہوگا اب مین تمھارے لئے سراپا انتظار بنی رہونگی۔ میری روح جسم سے گھبرا گئی ہے اور وہ صرف تمھاری ملاقات کے لئے پھڑپھڑا رہی ہے۔

غم نصیب شانتی“

یہ تحریر پڑھکر پریم آپے مین نہ رہا۔ اس کی بیقراریان آنسو کی شکل مین سیلاب کی طرح بہنے لگین۔ وہ یہ پڑھکر بہت رویا۔ پھر اپنے جھوپڑے مین آیا۔ ایک مختصر گٹھڑی لی اور اس آدمی کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔

(۱۱)

پریم کی موجودگی مین شانتی نے دنیا کو خیرباد کہا۔ پریم کے رنجور دل پر اس حادثۂ جانگاہ سے جو گہرا زخم لگا اُس کا اندازہ ناممکن تھا۔ وہ گرم ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ مگر موہن کی موجودگی سے اس کے درد مین کسی قدر کمی ہوگئی۔ وہ موہن لال کو اپنے گھر لے آیا۔ اور اچھی طرح اس کی پرورش کرنے لگا۔

اکثر اوقات موہن کو دیکھکر اس کے جذبات محبت مین ایک غیر معمولی تلاطم برپا ہوجاتا وہ موہن کو قہر وغضب کی نگاہون سے دیکھنے لگتا۔ وہ اپنی دونون مٹھیان بند کرکے برہم ہوکر موہن کی طرف خونی نگاہون سے دیکھتا۔ وہ اُسے گھونسا مارنے کے لئے آگے بڑھتا۔ اُسے گھورنے لگتا اور چاہتا کہ ایک ہی حملہ مین اس کی رُوح کو قیدِ حیات سے رہا کردے۔ مگر وہ اُسکے پاس پہونچتے ہی یک لخت ساکت ہوجاتا۔ وہ اُسے دیوانون کی طرح دیکھنے لگتا۔ اور کانپنے لگتا۔ پھر اپنی مٹھیان کھول دیتا۔ ہاتھ دونون نیچے چھوڑ دیتا۔ پھر بیساختہ کھل کھلا کر ہنس پڑتا۔ جوش مین آکر موہن کو اپنی گود مین اٹھا لیتا۔ اُسے پیار کرنے لگتا۔ پیار کرتے کرتے اُسے شانتی کی یاد دامنگیر ہوجاتی۔ اور اس کی محبت نواز آنکھون مین آنسو بھر آتے۔

موہن کی عمر صرف چار برس کی تھی۔ وہ پریم کی ان مجنونانہ حرکات کو نہ سمجھ سکتا تھا وہ پریم کو برہم دیکھکر ڈرجاتا تھا۔ مگر جب اُسے روتا دیکھتا تو اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کے منہ اور چہرہ پر پھیرنے لگتا۔ اس کے بڑے اور لمبے لمبے بالون کو اپنی انگلیون سے سلجھانے لگتا۔ اس سے لپٹتا اور کھیلتا۔ موہن کے ان معصوم اور محبت آگین انداز واطوار سے پریم چپ ہوجاتا

اور اُسکا غم کسی قدر گھٹ جاتا۔

پریم کو موہن کی راحت کا خیال بہت تھا۔ وہ اس کی خاطر اپنے آلام و مصائب، اپنی زندگی اپنی راحت، اور زندگی کی لذتون اور مسرتون کو بالکل بھول گیا تھا۔ وہ جو کرتا صرف موہن کے آرام کے لئے ہوتا تھا۔ رات مین اکثر جنگلی جانور، سیار، اور بھیڑیے وغیرہ مکان کے گرد بولا کرتے تھے۔ اور جب کبھی رات مین موہن کی آنکھ کھُل جاتی تو وہ سنکر ڈر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے پریم سے کہا۔ "چچا بھیڑیے کی آواز سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے" یہ سنکر اب پریم کو بھیڑیے کو مارنے کی فکر ہوگئی جواب روزانہ آکر گھر کے اطراف پھرا کرتا اور چلاتا رہتا۔ اس نے دوسرے ہی دن گھر کی ایک دیوار سے ملا ہوا ایک بڑا پنجرہ تیار کیا۔ رات مین جب موہن سوگیا تو وہ اُسے گود مین اُٹھا کر دریا کے کنارے لے گیا۔ اور اُسے درختون مین ایک محفوظ مقام پر لٹا دیا اور واپس آکر گھر کا دروازہ کھولکر بھیڑیے کا انتظار کرنے لگا۔ آخر بھیڑیا آیا اور پریم نے اُسے پنجرے کے اندر بند کر لیا۔

موہن سوتے سوتے چونک پڑا وہ اُٹھ بیٹھا اور نیند کی حالت مین بلا خوف وخطر گھر کی طرف بھاگا اس نے گھر کا دروازہ کھولدیا۔ بھیڑیے کے پنجرے کا دروازہ اس دروازہ کی وجہ سے بند تھا۔ پریم ابھی یہان سے اٹھا بھی نہ تھا کہ دروازہ کھُلا۔ بھیڑیے کے دروازہ کا کھٹکا بھی ساتھ ہی کھُل گیا۔ دروازہ ایک طرف گر پڑا اور پریم بھیڑیے کے قریب جا پہنچا موہن کو اس بات کی خبر نہ تھی۔ وہ جلدی سے اوڑھ کر لیٹ رہا۔

پریم جب بھیڑیے کے پنجرہ سے باہر نکلا تو اس کی بُری حالت تھی۔ اسکا تمام جسم خون مین لت پت تھا۔ اس کے تمام کپڑے پھٹ کر چندی چندی ہوگئے تھے اور اس کے چہرے اور جسم پر بھیڑیے کے پنجون کے خونی نشانات بن گئے تھے۔ اُسنے بھیڑئے کو مار ڈالا تھا۔

(۱۲)

تین مہینے گذر گئے۔ ایک دن پریم ندی کے کنارے بیٹھا ہوا موہن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اور ریت سے گھر بناتا پھر رہا تھا۔ جن مین موہن دیکھ دیکھکر خوش ہو رہا تھا۔ ایک آدمی سامنے سے آتا ہوا نظر آیا اور آکر پریم کے نزدیک ٹھہر گیا۔ موہن نے اُسے دیکھا اور دوڑ کر اس کی گود سے لپٹ گیا۔ پریم حیرت سے تکنے لگا۔

یہ شنکر لال، موہن کا باپ تھا۔ جو اپنے سیٹھ کے ساتھ تجارت کی غرض سے رنگون چلا گیا تھا اور اب تین مہینے کے بعد واپس آیا تھا۔ اُسے بیوی کے مرنیکی خبر معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے پریم سے کہا "پریم تم مجھے شاید نہ پہچانتے ہوگے مین شنکر ہون" پریم نے گھبرا کر پوچھا۔ "اور ابتک کہان تھے؟" شنکر نے جواب دیا "رنگون مین اپنے سیٹھ کے ساتھ تھا اب اپنے بیٹے کو لینے آیا ہون" پریم یہ سنکر غم اور غصہ سے بیتابانہ چلا اُٹھا۔ "موہن کو۔؟ پرماتما میری زندگی کا آخری سہارا۔ میری محبت کی آخری تصویر!" یہ دردناک الفاظ سنکر شنکر بہت متاثر ہوگیا۔ اس نے دبی زبان سے کہا

"ہان پریم مین موہن کو اپنے گھر لیجانا چاہتا ہون اور جی چاہے تو تم بھی چلو۔" پریم بولا "نہین ایسا نہین ہو سکتا۔ مین موہن کو نہ دونگا۔ لاؤ میرا موہن مجھے دیدو" اُس نے آرزومند انداز سے موہن کی طرف اپنے دونون ہاتھ بڑھا دیئے۔ شنکر نے کہا۔ "پریم کیسی باتین کر رہے ہو۔ موہن میرا بیٹا ہے اور اس پر تمھارا کوئی حق نہین ہے"۔ پریم نے دیوانون کی طرح کہا۔ "نہین کوئی حق نہین۔ لیجاؤ۔ مگر شنکر میری زندگی موہن کے دم سے ہے۔ تم پہلے مجھے مار ڈالو۔ پھر موہن کو لیجاؤ۔" شنکر نے سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ کیا بک رہے ہو پریم۔ موہن تمھارا ہی لڑکا ہے۔ تم جب چاہنا اُسے آکر دیکھ لینا"۔ پریم نے دوڑ کر موہن کو شنکر کی گود سے لے لیا۔ اُسے سینے سے لگایا۔ اُسے پیار کیا اور بہت دیر تک اُسے لئے ہوئے اس کے منہ پر منہ رکھے ہوئے روتا رہا۔ پھر شنکر بولا۔ "پریم اب مجھے جانیکی اجازت دو"۔ پریم یہ سنکر وہان سے بڑھا اور آہستہ آہستہ اپنے جھونپڑے کی طرف قدم اُٹھانے لگا شنکر بھی پیچھے پیچھے چپ چاپ چلتا رہا۔ وہ سب جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ پریم نے پوچھا۔ "شنکر تم موہن کو ابھی لیجاؤ گے؟" موہن نے جواب دیا۔ "یہان ٹھہر کر کیا کرونگا؟" اور یہ کہتے ہوئے اس نے پریم کی گود سے موہن کو لے لیا۔ پریم نے آہستہ آہستہ موہن کو اپنی آغوش سے جُدا کیا۔ اور اُس کی طرف ہاتھ پھیلائے کھڑا گرسنہ نگاہون سے دیکھنے لگا۔ شنکر نے کہا "مین اب جاتا ہون پریم" اور وہ موہن کو لے کر گاؤن کی طرف جانے لگا۔ پریم اُسی عالمِ محویت مین ہاتھ آگے پھیلائے کچھ دُور تک اُسکے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ پھر اس کے پاؤن مین طاقت نہ رہگئی۔ وہ گر پڑا اور کہنے لگا "موہن میری محبت کی آخری تصویر!"

(۱۴)

موہن کے چھن جانے سے پریم کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ اس جدائی نے اُسکے سینے کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ موہن کے ساتھ اس کی ساری جان چلی گئی۔ اب کہان کی نوکری اور کیسی ملاقات۔ سب کچھ چھوٹ گیا۔ وہ تارک الدنیا ہو گیا۔ اُسے مجبوراً دنیا کے جھگڑون سے الگ ہو جانا پڑا۔ اب اس کی صحت بھی برقرار نہ رہ سکی اور وہ دوسرے ہی دن سے بیمار ہو گیا۔ اب اس کی زبان سے "شانتی"! "شانتی" کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا۔ ہوش اور بیہوشی یا بیداری اور خواب کی حالت مین بھی "شانتی" کی جگہ خراشِ اور حسرت آگین صدائین جھونپڑے کے اندر گونجتی رہتی تھین۔

کبھی کبھی ایک آدمی اُس کے حلق مین پانی ٹپکا دیتا تھا اور بس۔

رات بہت تاریک اور خوفناک تھی۔ آندھی کے طوفان اُٹھ رہے تھے اور جانورون کی چیخ پکار سے دل لرز جاتا تھا۔ رات کی ہیبتناک تاریکی موت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ "شانتی" کی آخری صدا جھونپڑے مین گونجی۔ در و دیوار پر مردنی چھا گئی اور فضا مین ایک غیر معمولی سناٹا پیدا ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کبھی "شانتی" کا

نام نہ سنائی دیا۔

(اس افسانہ مین نام اور مقامات فرضی ہین)۔

مخشر عابدی

دنیائے طب مین ہل چل

آجکل طب یونانی کی بڑی شد و مد سے مخالفت ہو رہی ہے جو لوگ اسکے کرشمہ سے ناواقف ہین وہ ذیل کے مضمون کا مطالعہ کرین جو رسالہ الحکیم سے پبلک کے فائدہ اور اطلاع کیلئے اقتباس کیا گیا ہے "رنگون کے ایک صاحب ثروت سوداگر اسباب معلومہ کیوجہ سے ...... موذی کا شکار ہو کر بالکل ...... ہو گئے تھے۔ مدت تک مشہور و معروف اطبا کا علاج کرایا مگر جب نشا فائدہ نہ ہوا یہ قاعدہ ہے کہ مایوس العلاج مریض ذلیل سے ذلیل طریقہ علاج کی طرف مائل ہو جاتا ہے انہون نے بھی عطائیون و اناڑیون سب سے ہی رجوع کیا اور آخر مین ناکامیاب ہونے پر قصید کرلیا کہ ہندوستان کے تمام مشہور مقابر پر جاکر دعائین مانگین اور دوران سفر مین جو فقیر یا طبیب لگے ہاتھ اس سے رجوع کرین وہ اپنے اسی دورہ پر تھے کہ اتفاقاً حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ مین مجھ سے شناسائی ہوئی اور یہ معلوم ہونے پر کہ مین طبیب ہون اپنا حال مجھے سنا دیا اور ایک ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو رہے مجھ پر انکے طرز بیان کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ فوراً علاج کر نیکا وعدہ کر لیا چنانچہ مین نے انکا علاج نہایت محنت و جانفشانی سے شروع کیا لیکن کچھ فائدہ مرتب نہوا۔ قریب تھا کہ وہ بد دل ہو کر واپس چلے جائین کہ حسن اتفاق سے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ گوڑگانوہ مین کوئی نذیر احمد صاحب ہین جنکے پاس اس کا **نادر نسخہ** موجود ہے لیکن وہ طبیب ہین نہ صاحب غرض بلکہ گھر کے رئیس اور کھاتے پیتے ہین نسخہ کسیکو نہین بتلاتے البتہ اگر کوئی زبردست سفارش لیکر پہنچ جائے تو دوا تیار کر کے دیدیتے ہین۔ اسقدر تعریف سنکر مین ایک تعارفی خط لیکر سیدھا گوڑگانوہ پہنچا وہ بہت خلاق سے پیش آئے اور دوا مجھے دیدی مین نے سیٹھ صاحب پر اسکا استعمال شروع کر دیا **سیٹھ صاحب کی قوت حیرت انگیز** طور پر ترقی کر گئی اور اسقدر **طاقت** پیدا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے مین نے متعدد مریضون پر مختلف حالات مین آزمانے پر بھی ہمیشہ تیر بہدف پایا۔ یقیناً میرے علم مین ایسا پر اثر نسخہ کسی دوسرے شخص کے پاس نہین ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ نسخہ **بوعلی سینا** کی خاص دماغی کوششون کا نتیجہ ہے جو کسی بادشاہ کیلئے تجویز کیا گیا تھا یہ ایک **معدنی لوح** پر کندہ ہے وہ اس نسخہ سے کوئی فائدہ نہین اٹھاتے اس لئے میری یہ تمنا بیجا نہ ہوگی کہ ایسے صاحب کمال کے اس نسخہ کو **الحکیم** مین شائع کرا کے تمام اطبائے ہند کو شکریہ کا موقعہ دین

(خادم الاطبا مسعود الرحمٰن)

ایڈیٹر صاحب الحکیم کا نوٹ

یہ مکتوب کئی دن ہوئے ہمارے پاس پہنچا تھا لیکن اشاعت سے قبل ہم نے ان واقعات کی مزید تحقیق کیلئے اپنے کرمفرما خان بہادر ملک سردار علی صاحب کو تکلیف دی جو حسن اتفاق سے آجکل گوڑگانوہ مین قیام پذیر ہین۔ چنانچہ جناب موصوف کا جواب جو ہمین موصول ہوا درج ذیل ہے :-

مکرمی جناب حکیم صاحب۔ اسلام علیکم مین کل نذیر احمد قریشی سے ملا تھا وہ حکیم نہین ہین لوہی برکت علی صاحب وکیل لاہوری کے فرزند ہین انکے پاس **واقعی قوت باہ کا ایک عجیب نسخہ ہے**۔ تابعدار (خان بہادر ملک) سردار علی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مارچ سنہ ۲۹ء

(**نوٹ**) اس دوا کو اسقدر قلیل عرصہ مین اتنی مقبولیت و ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے کہ اس کیلئے دواخانہ قائم کرنا پڑا حکیمون اور ڈاکٹرون کی یہ متفقہ رائے ہے کہ یہ دوا **ضعف باہ** کے لئے **اکسیر اعظم** ہے قیمت اکسیر سینا پانچ روپے۔ طلاء سینا پانچ روپے محصولڈاک وغیرہ ۸ بذمہ خریدار۔

دواخانہ اکسیر سینا۔ گوڑگانوہ (**پنجاب**)

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

صوفیائے اسلام" اور ڈاکٹر نکلسن کا تاریخی خطبہ تصوف

ڈاکٹر نکلسن نے دیوان شمس تبریز کا فاضلانہ مقدمہ ۱۸۹۸ء مین لکھا تھا، اسوقت وہ ٹرینٹی کالج مین رفیق (فیلو) کی حیثیت سے علمی زندگی گذار رہے تھے، "مسٹکس آف اسلام" انھون نے اسوقت لکھی جب کیمبرج مین فارسی زبان کے خطیب تھے، اس لئے تصوف کی تاریخی معلومات کے اعتبار سے یہ چھوٹی سی کتاب دیوان شمس تبریز کے معرکۃ الآرا مقدمہ سے بھی بڑھی ہوئی ہے، تصوف کی تاریخ بیان کرتے ہوئے انھون نے مقدمۂ (دیوان) مین ایک مقام پر جس عجز کا اظہار کیا ہے، "مسٹکس آف اسلام" مین انھون نے اسکی قابل فخر تلافی کردی ہے، انھون نے "صوفیائے اسلام" کو چھ ابواب پر تقسیم کیا ہے، اور بالترتیب طریقت، تجلی وحال، معرفت، عشق آلہی، اولیاء اللہ وکرامات، اور "مقام وصل" پر محققانہ بحثین کی ہین اور شروع مین تاریخ تصوف کے متعلق ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے، اور اس مین ثابت کیا ہے، کہ اسلامی تصوف پر مسیحیت، فلسفہ اشراقی، مذہب بدھ اور (Gnosticism) کا اثر پڑا ہے، سب سے پہلے مین ذیل مین ڈاکٹر صاحب کے مباحث کی تلخیص پیش کرونگا۔

مسیحیت اور تصوف اسلامیہ

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہین کہ مسلک تصوف کا زاہدانہ اور امن پسندانہ رجحان مسیحی اصول کے بالکل موافق ہے، انجیل کے بہت سے اقتباسات اور حضرت مسیح کے مقالات صوفیائے کرام کے سوانح زندگی مین پائے جاتے ہین۔ اور یہ بھی مسلم ہے، کہ پشمینہ (صوف) کا لباس جس سے اصطلاح "صوفی" مشتق ہے، مسیحیت کی پیداوار ہے عہد خموشی، ذکر وشغل، اور دوسرے صوفیانہ اوراد وظایف کا عہد بھی اسی کو قرار دیسکتے ہین۔

ایک شامی صوفی احمد ابن الحواری نے ایک مسیحی راہب سے سوال کیا، تمھارے کتب سماوی مین کونسا سب سے بڑا حکم ہے، راہب نے جواب دیا کہ ہملوگ اس سے بڑا کوئی حکم نہین پاتے کہ انتہائے وسعت اور قوت کے ساتھ اپنے خالق کی محبت رکھی جائے۔

ڈاکٹر نکلسن نے اس قسم کی اور بھی مختصر روایات نقل کی ہین، اور ان سے استدلال کیا ہے، کہ عشق اللہ کے متعلق صوفیہ کے تاثرات اسی مبدء سے لئے گئے ہین۔

صوفیانہ افکار اور فلسفۂ اشراقی

مسلمانون کے فلسفہ مین ارسطو کی ایک مقتدر شخصیت ہے، لیکن عربون نے اشراقی شارحین کی وساطت سے ارسطو کے فلسفہ کی تعلیم پائی، اس صورت سے "الٰہیات ارسطو" جسکا ایک عربی نسخہ نوین صدی مین ظاہر ہوا، گویا فلسفہ اشراقی کا ایک رسالہ تھا،

روایات علمیہ کے علاوہ اور بھی بہت ذرایع تھے، جنکی وساطت سے تجلی، معرفت اور "حال" کے عقاید حاصل کئے گئے۔ اور یہ تو ایک حقیقت تاریخی ہے، کہ مغربی ایشیا اور مصر مین جو تصوف کا گہوارہ تھے، اہل یونان کے صوفیانہ افکار وعقاید موجود تھے، جن سے وہان کے باشندون نے استفادہ کیا، ان مین ذوالنون مصریؒ جو اسکے سلسلہ ارتقاء کے ایک زبردست رکن ہین، ایک فلسفی اور ماہر کیمیا یا دوسرے الفاظ مین علوم یونانیہ کے طالب العلم گذرے ہین، اور جب یہ مطالعہ کیا جاتا ہے، کہ ذوالنون مصری کے افکار وعقاید دیانیسیوس (Dionysius) کی تحریرون مین پائے جاتے ہین تو سطا یہ خیال پیدا ہوتا ہے، کہ فلسفۂ اشراقی نے اسلام مین صوفیانہ فکر واحساس کی وہی اثر آفرینی کی جس سے مسیحیت اثر پذیر ہو چکی تھی۔

بدھ مذہب اور تصوف

گیارھوین صدی مین مسلمانون کے فتح ہند سے قبل گوتم بدھ کی تعلیم نے مشرقی ایران اور توران مین ایک گہرا اثر پیدا کر لیا تھا، بلخ مین پیروان بدھ کی مہتم بالشان خانقاہین پائی جاتی ہین، مشاہیر صوفیہ کا نشیمن ہونیکی حیثیت سے بلخ ایک مشہور شہر ہے، پروفیسر گولڈزیہر نے اس طرف پر معنی توجہ دلائی ہے، کہ تارک الدنیا صوفی ابراہیم ابن ادہمؒ بلخ کے شاہزادہ تھے، انھون نے سلطنت ترک کردی، اور ایک بادیہ پیما درویش بنگئے، یہی واقعہ گوتم بدھ کی زندگی کا بھی ایک اہم جزو ہے۔

صوفیہ نے دانہ تسبیح کا استعمال بدھ مذہب کے انہین تارک الدنیا زہاد سے حاصل کیا[1]۔ اور بلا تاویل کئے ہوئے یہ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے، کہ طریق تصوف جہان تک یہ اخلاقی تربیت نفسی، مراقبہ زاہدانہ اور ذہنی تجربہ سے متعلق ہے، بڑی حد تک بدھ مذہب سے ماخوذ ہے۔

صوفیہ کا عقیدہ "فنا" یعنی انفرادیت کو مٹا کر کلیت مین ملجانا، میرے خیال مین یقیناً ہندوستان کی پیداوار ہے، اسکے سب سے پہلے واضح کرنے والے حضرت بایزید بسطامیؒ تھے، جنھون نے اسے اپنے پیر ابو علی سندھی سے سیکھا ہوگا، بدھ مذہب کا "نروان" تصوف کے عقیدہ فنا سے ملتا ہوا ہے، فرق یہ ہے، کہ نروان مین صرف ایک منفی پہلو پایا جاتا ہے، لیکن یہان فنا کے بعد بقا ہے بدھ مذہب کا نروان اس خیال پر مبنی ہے کہ انسان کو اپنے خالق کے لیے مٹ جانا چاہئے لیکن صوفیہ کے عقیدہ مین حصول فنا کے بعد بقائے دوام حاصل ہوتا ہے، لہذا فنا کے متعلق حضرت بایزید بسطامیؒ کے مقالات سے پتہ چلتا ہے، کہ صوفیہ کا طریقہ، ویدانت (علم آلہی) کے عقیدۂ وحدۃ فی الکثرت سے اثر پذیر ہوا ہے، بہت سے افکار جن سے مسلمانون کی فکر واحساس پر اثر پڑا ہے ہندوستانی کہلانے کے بجائے، بدھ مذہب کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہین، پھر بھی "فنا"، کا عقیدہ جو ایک اخلاقی پہلو رکھتا ہے، اور جسکا مقصد ہے، شہوات وخواہشات کا مٹانا،

---

[1] یہی وجہ ہے کہ اہلحدیث (غیر مقلد) تسبیح کا استعمال نہین کرتے، اللہ بخشے والد مرحوم کو مینے بچپن مین ان سے سوال کیا کہ آپ انگلیون پر کیون پڑھتے ہین، انھون نے مختصراً کہدیا۔ نبی صلعم نے اسی طرح پڑھا ہے نکلسن کی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ بدعت کہان سے آئی؟

نزدان کی تعریف سے ملجاتا ہے، جو پروفیسر رائز ڈیوڈس کے عالمانہ مقالہ مین پائی جاتی ہے، لہذا کہا جا سکتا ہے، کہ تصوف کا عقیدۂ فنا ایک حدتک بدھ مذہب اور فارسی ہندی مسلک وحدۃ فی الکثرت سے اثر پذیر ہوا ہے۔

اسکے بعد نکلسن ایک انصاف پسند محقق کی طرح لکھتا ہے، کہ ہماری تفصیلات کا یہ مطلب نہین ہے، کہ تصوف ایک مجموعہ ہے، خارجی عناصر کا، جسے اسنے دور ارتقا مین جذب کرنا شروع کیا، بلکہ اگر اسلام معجزانہ حیثیت سے دوسرے مسالک فلسفہ کے افکار اور مجامع صوفیہ کے عقاید سے الگ بھی رہتا، تاہم اسکے اندر تصوف کی کوئی نہ کوئی صورت رونما ہوتی کیونکہ مادہ موجود تھا۔

میکڈونلڈ اور تاریخ تصوف

میکڈونلڈ نے اس محققانہ انداز سے تصوف کی داخلی صورت پیش کی ہے، کہ اسکے تبحر علوم عربیہ پر بے اختیارانہ زبان سے داد نکلتی ہے، نکلسن موجودہ مستشرقین مین ایک خاص پایہ کا عالم ہے، جسکی تصنیفات کا سلسلہ یورپ کی علمی مجالس آجتک شایع کر رہی ہین، لیکن اسکے افکار کا مطالعہ کرنے سے پتہ جاتا ہے کہ ایک حدتک اسنے میکڈونلڈ کی خوشہ چینی کی ہے، اور بعض مقامات مین تو اسنے اسکے خیالات کا اقتباس دیکر اسکے تحقیقی ذوق کی داد بھی دی ہے، تاریخ تصوف کے متعلق میکڈونلڈ کے خیالات اسقدر وسیع نہین، با اینہمہ اسکی تصنیف مین اس موضوع پر بھی مختصر بحث پائی جاتی ہے۔

میکڈونلڈ کہتا ہے، کہ ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ مین "صوفیہ" کے عنوان سے ایک مورخانہ بحث پائی جاتی ہے جس مین اسنے ثابت کیا ہے کہ "صوفی" لفظ صوف سے مشتق ہے، نکلسن لکھتا ہے، یورپ مین لفظ صوفی کی وجہ تسمیہ پر مباحث شروع ہوئے تو مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا، بعض علمانے اسے لفظ (σοφός) کا مترادف قرار دیا، جسکے معنی "تھیاسفسٹ" ہین، لیکن جرمن کے محقق نالڈک نے بتایا کہ یہ "صوف" سے مشتق ہے، نکلسن نے یہ نہین لکھا آیا نالڈک کی یہ ذاتی تحقیق تھی، یا اسنے علامہ ابن خلدون ہی کا نظریہ اپنی طرف منسوب کر دیا، میکڈونلڈ نے "صوفی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق علامہ ابن خلدون کا خیال ظاہر کرتے ہوئے نالڈک کا بھی حوالہ دیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے۔ نالڈک علامہ ابن خلدون ہی کی یہ تحقیق مغربی دنیا مین پیش کی تھی اور اسکی یہ خدمت یورپ مین بہت مستحسن خیال کی گئی، نکلسن نے لفظ صوفی کے متعلق جو مباحث کئے ہین وہ غالبًا میکڈونلڈ ہی کی کتاب "اسلام مین مذہبی طریقہ اور زندگی" سے لئے ہین، اور اسنے ماخذ تصوف، بیان کرتے ہوئے فلسفہ اشراقی کا جو تذکرہ کیا ہے، غالبًا میکڈونلڈ ہی کے خیال سے مستفاد ہے، میکڈونلڈ نے اسے مجمل لکھا، نکلسن نے اسکی تفصیل کی ہے، البتہ نکلسن نے فلسفہ اشراقی کی تخیلات اور فلاطینوس کے افکار سے تصوف اور مولانا روم کی شاعری کا جو موازنہ کیا ہے، وہ آجتک خود یورپ کی کسی دوسری کتاب مین نہین پایا جاتا، اور مشرق کو کیا غرض پڑی تھی کہ وہ فلاطینوس کی تخیلات کا مطالعہ کرے، نکلسن نے اپنے

ایک دوست کی غیر مطبوعہ تصنیف سے فلاطینوس کے افکار کا مطالعہ کیا، جسکا تذکرہ دیوان شمس تبریز کے دیباچہ مین پایا جاتا ہے،

میکڈونلڈ لکھتا ہے، ابتدا ہی سے اکابر صحابہ اور نبی صلعم کے خلفائے راشدین مین طریق تصوف کا ذوق عمل پایا جاتا ہے، اسی لئے صوفیہ کا سلسلہ بیعت عشرہ مبشرہ تک منتہی ہوتا ہے، تصوف کی یہ ابتدائی شکل مفصلہ ذیل احساسات پر مبنی تھی، (۱) عبادات مین مصروفیت (۲) صرف خدا ہی کے لیے زندگی بسر کرنا، (۳) آرائش دنیوی سے منہ موڑ لینا، (۴) جمہور انسان کے اغراض مثلاً شاد کامی، ثروت، اور حوصلہ سے قطع نظر، (۵) ہجوم انسان سے علیحدہ ہوکر عزلت مین عبادت کرنا، یہ علامہ ابن خلدون کے نظریات ہین، جنھین میکڈونلڈ نے لکھا ہے، علامہ موصوف کے نزدیک مفصلہ بالا ذوق صوفیانہ تمام صحابہ اور قرن اولی کے مسلمانون مین پایا جاتا تھا، لیکن دوسری صدی مین دنیا کی طرف لوگ ایسے مائل ہوئے کہ اسی مین ملگئے ایک جماعت اس ابتدائی ذوق پر قایم رہی اور اسی جماعت کا امتیازی لقب "صوفی" مقرر ہوا،

اب یہ جماعت دوسرے لوگونکا حلقۂ ارادت اور مطمح پرستاری بن گئی، اولیاء اللہ کا تخیل قایم ہوا اور لوگون نے خیال کرنا شروع کیا، کہ یہ جماعت تجلی و معرفت کی حامل ہے، اور کرامات اس سے ظہور پذیر ہوتے ہین، لہذا انسانی قلوب مین انکی طرف سے جذبات احترام اور مرادطلبی پیدا ہوئے، اور اس جذبہ نے یہ صورت اختیار کرلی، کہ اسلام کو (کاشانۂ توحید سے اتار کر) شرک و دوئی کی سطح پر صف آرا کردیا، مین اسوقت اسکی دلچسپ تفصیل نہین کرسکتا، ارباب ذوق اسے ایک حدتک ڈاکٹر گولڈزیہر کی کتاب الاعلام لاہل الاسلام (mohammedanische-Studien) مین مطالعہ کرسکتے ہین[لہ]۔

ابتدأ (صوفیہ کی) یہ جماعت منظم شکل مین نہ تھی، بلکہ اسکا ایک رکن ایک مرشد کی طرح اپنے مسترشدین کو دینیات کی تعلیم دیتا، عشق الٰہی کا راز بتاتا، اور انہین مراحل طریقت مین رشد و ہدایت کرتا، ارباب استرشاد کیلئے یہ لازم نہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے مرشد کے ساتھ منسلک رہین، کیونکہ اسوقت تک سلسلہ بیعت کا وجود نہ تھا، اور نہ موجودہ خانوادۂ صوفیہ کی طرح کوئی خاص خاندانی رشتہ اتحاد پیدا کیا جاتا تھا اسوقت مرشد کے لیے بھی یہ ضرور نہ تھا کہ ایک راہب کی طرح خانقاہ مین گوشہ گیر رہے، بلکہ وہ کسی اعلی درسگاہ مین الہیات کا پروفیسر ہوتا، یا قانون کا خطیب، اسطرح

لہ اولیاء اللہ کے مقابر پر آج جو بدعات دیکھنے مین آتی ہین، وہ ایک نہایت ہی المناک افسانہ ہے طبقۂ صوفیہ کے اکثر افراد اسلام کے روح رواں گزرے ہین، اور اس طبقہ سے اہل اسلام کی ارادت اور محبت لازمی ہے، لیکن اسکے یہ معنی نہین کہ قبور پر چراغان ہو، کمخواب اور زربفت کی چادرین چڑھائی جائین، لیکڈونلڈ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ۱۲

صدیاں گذر گیئں، ایک مرشد لوگوں کو تلقین کرتا اور جب اسکی زندگی کے ایام ختم ہو جاتے، تو مسترشدین کی جماعت منتشر ہو جاتی، اسکے بعد خانوادہ صوفیہ میں سلسلہ بیعت کا رواج شروع ہوا، ان میں سلسلہ قادریہ سب سے قدیم ہے، جسکے بانی خود عبد القادر جیلانی تھے یا آپکے قریبی متبعین، اس سلسلہ نے ایسی وسعت اختیار کی، کہ تمام عالم پر چھا گیا، سلسلہ قادریہ کے مرید سلسلے بغداد شمالی افریقہ، اور شمالی (Northern China) مین پائے جاتے ہین، سب سے آخر سلسلہ سنوسیہ ہے جو بحر کاہل سے جزائر فلپائن تک پھیلا ہوا ہے،۔

تعریف تصوف

نکلسن نے "صوفیاے اسلام" مین تصوف کی مفصلہ ذیل تعریفین کی ہین،

تربیت نفسی کا نام تصوف ہے، تصوف یہ ہے کہ انسان نہ تو کسی پر قابض ہو نہ کسی کا مقبوض،

تصوف، قواعد وضوابط کا ایک نظام نہین، اگر یہ کوئی قاعدہ ہوتا، تو مجاہدانہ سعی سے یہ کسی کا اپنا ہو جاتا اگر یہ حکمت ہوتا، تو تعلیم کے ذریعہ حاصل ہو جاتا بلکہ اُسکے برعکس یہ ایک سیرت (Disposition) ہے، جیسا کہ حدیث مین وارد ہے تخلقوا باخلاق اللہ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی اخلاقی فطرت کو نہ تو قواعد کی وساطت سے حاصل کر سکتے ہین نہ حکم کے ذریعہ،۔

تصوف تعبیر ہے آزادی اور فیاضی کی، اور یہ مسلک ہے، ذاتی پابندیون سے علیحدہ ہو جانے کا تصوف کا وظیفہ ہے، عالم فانی کی بے کمالی کا مشاہدہ کرنا، بلکہ اس مستجمع کمال کے تصور مین، جو بے کمالی سے پاک ہے، ہر نا کمل کی طرف سے اپنی آنکھین بند کر لینا، تصوف نام ہے، قویٰ پر تصرف رکھنے اور انفاس کا لحاظ رکھنے کا،۔

تصوف یہ ہے کہ جو کچھ تمھارے سر مین ہے اسے دور کر دا جو تمھارے ہاتھ مین ہے، اسے دیدو اور جو حادثہ بھی تم پر آے تم مایوس نہ ہو،۔

یہان تک تو تصوف کے خارجی معلومات کے متعلق تھا، میکڈونلڈ نے تصوف کی داخلی صورت پیش کرتے ہوے جن عنوان کے ماتحت بحثین کی ہین، وہ اسکے "تمہیدی بیان" کے سلسلہ مین آیندہ ورق مین درج ہین اسلیے مین تصوف کی داخلی تشریح مین میکڈونلڈ ہی کے منتخب عنوان کے مطابق مفصلہ ذیل سطور مین کسی قدر تفصیلی بحث کرنا چاہتا ہون،

میکڈونلڈ کا تمہیدی بیان

مجھے اجازت دیجیے کہ مین مسیحی اور اسلامی دو نقطہ ہاے نظر سے بطور سند اپنے خطبات کے لیے ولیم جیمس کی عالمانہ تصنیف "اصناف تجربہ مذہبی" سے اقتباس نقل کرون،

پروفیسر موصوف اپنے تیسرے خطبہ کی ابتدا مین جہان حقیقت "غیر مشہود" کے وسیع سوال پر پہونچا ہے، رقم طراز ہے،

"جہانتک عام اصطلاحات مین ممکن ہو سکتا ہے، اگر کسی سے حیات مذہب کی مرقع آرائی کے متعلق سوال کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے، کہ حیات مذہب تعبیر ہے، اس عقیدہ کی، کہ (کائنات مین) ایک حقیقت غیر مشہود جاری اور ساری ہے، اور یہ کہ ہماری سب سے بڑی فلاح اسی مین ہے کہ ہم اس

(نظام غیر مشہود) سے وثوق و اتحاد پیدا کرین، یہی عقیدہ اور توافق، نفس کے اندر مذہبی رفتار کا سنگ بنیاد ہے"۔

اسلام مین یہ مذہبی رفتار کیونکر ترقی پذیر ہوئی مین اسی کو پیش کرنا چاہتا ہون، اس بحث کو تین حصون مین تقسیم کر سکتے ہین، اول، غیر مشہود کی حقیقت کیا ہے، اور یہ کہ کس طرح ہم لوگ حواس جسمانیہ کی وساطت سے اس حقیقت تک نہین پہونچ سکتے؟ دوم یہ کہ بہ لحاظ ایمان اور کیفیات باطن، اس "غیر مشہود" سے انسان کا کیا تعلق ہے؟ اس مین عبادت گذارانہ رفتار سے لیکر صوفیا کے چشمہائے بینش کے سامنے حضور خداوندی (شہود) اور اسکے متعلقہ کی پر پیچ الہیاتی موشگافیان شامل ہین، اور آخری تقسیم یہ کہ اس بلا واسطہ معرفت الٰہی کے حصول کے لیئے ایک طریقت کو تربیت (ریاضت و شغل) کے کون کون مراحل طے کرنا ہین، اور اس دور مین اسکی زندگی کا کیا نقشہ ہوتا ہے؟ فلسفہ کے مختلف مذاہب کے متعلق میری تعلیمی حالت بہت مختصر ہے، لیکن مین دیکھتا ہون، کہ ان تینون موضوع بحث مین میری تحقیقات کے لیے، مادرارطبعی، نفسیاتی اور اخلاقی (Ethical) پہلو موجود ہین، مین عربی زبان اور علوم اسلامیہ کا ایک محض طالب العلم ہون، میری خواہش ہے کہ مین اُنلوگون کے سامنے جو علمائے مابعد الطبیعہ، ماہرین نفسیات، اور دانایان فلسفہ اخلاق ہین، بعض ایسے مسائل پیش کرون، جو انلوگون کے علوم کے متعلق اس وسیع اور غیر معروف مخزن (اسلام) مین بھرے پڑے ہین، میری التماس ہے کہ ناظرین مجھے ایک ایسا سیاح تصور کرین، جو اپنی دور دراز بادیہ پیمائیون کے بعد وطن مین بعض ایسے نوادر روزگار ساتھ لاتا ہے، جنھین حکمائے جغرافیہ و ماہرین نباتات و حیوانات مابعد بہ نظر امتحان دیکھتے ہین، اور انہین مرتب صورت مین پیش کرتے ہین۔

مین سمجھتا ہون بہت کم لوگون نے غور کیا ہوگا، کہ ان افکار و عقاید مین نوع انسان کے لاکھون بہترین دماغ کی موت و حیات کا مدار ہے، وہ اسکی اہمیت سے کماحقہ واقف ہو سکتے ہین، یہ اس قوم کے افکار ہین جو تیرہ صدیون سے بزم ہستی مین رونق افروز ہے، اور تقریباً کرۂ ارضی کے چوتھائی حصہ پر آباد ہے، ہم لوگون کو طفلانہ ہنگامہ خیال کی بجائے غور کرنا چاہئے، کہ اس قوم نے جو ہر چند زبان مین ہم سے مختلف لیکن خیالات مین ہمنوا ہے، زمانہ اور ازل کے متعلق کیسے کیسے دقیقہ سنج اضافے کئے ہین۔

مسلمانون کے نظریہ خواب کا مبدء میکڈونلڈ علامہ ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ مترجمہ ڈی سلین جلد سوم کے حوالہ سے لکھتا ہے، کہ علامہ موصوف کے نزدیک مسلمانون مین خواب کی اہمیت اور اسکی تقدیس، کسی خارجی اثر کے ماتحت نہین، بلکہ یہ اسلام ہی کی پیداوار ہے، میکڈونلڈ نے ابن خلدون کے دعویٰ کی تائید کی ہے، لیکن وہ لکھتا ہے کہ مسلمانون کا فن تعبیر خواب ایک حد تک کہا جا سکتا ہے، کہ یونانی علمائے تعبیر (Oneirocritic) کے افکار سے متاثر ہوا ہے، اس واقعہ سے اس نظریہ کی اور بھی تائید ہوتی ہے،

کہ ابن ندیم کی کتاب الفہرست مین علمائے اشراقیین کی بعض کتابونکے (عربی) تراجم کا تذکرہ پایا جاتا ہے، خواب سے متعلق اسلامی تصنیفات کے تفصیلی واقعات رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جریدہ جلد ۱۶ مین ایک فاضلانہ مضمون کے اندر پائے جاتے ہین، جو اِن بلینڈ کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔

خواب کے متعلق قرآن وحدیث کا مسلک

عام انسانی نقطۂ نظر سے خواب کے متعلق بحث کرنا، ایک نہایت تفصیل طلب مسئلہ ہے، (Studies in dreams) کے نام سے انگریزی مین ایک کتاب ہے، جو جین لائبریری مین میری نظر سے گذری ہے، انسائیکلوپیڈیا بریٹنکا مین بھی فلسفیانہ مباحث پائے جاتے ہین قرآن مجید مین چند خوابون کا تذکرہ ہے، اور انکی تعبیرین بھی پائی جاتی ہین، سورۂ یوسف اسکے لئے خاص امتیاز رکھتی ہے، اس مین حضرت یوسفؑ، عزیز مصر، اور دو قیدیون کے خواب اور انکی تعبیرین نہایت ہی دلچسپ ہین، قرآن مجید کے ان بیان کردہ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور مین مصر و بابل کے اندر خواب کو کتنی اہمیت دیجاتی تھی، اور اسکے معبرین کیسی ممتاز حیثیت رکھتے تھے، سورۂ یوسف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ اسوقت حکومت مین علم تعبیر کے ماہرین نوکر بھی تھے، یا کم ازکم دربار سے انکا تعلق تھا، چونکہ عام لوگ قرآن مجید کا ترجمہ بھی دیکھکر اسکے متعلق معلومات حاصل کرسکتے ہین، اسلئے ان آیات کو مین یہان نقل نہین کرتا، اسی طرح سورۂ صفت مین حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا خواب نہایت تاثیر انگیز ہے، اور سورۂ انا فتحنا مین ایک خواب کا تذکرہ ہے، جو فتح مکہ (یا امن کے ساتھ داخلہ بیت الحرام وادائے حج) کے متعلق، جب صلح حدیبیہ واقع ہوئی تھی، خود آن حضرت صلعم نے دیکھا تھا، اس سورہ مین واقعہ کے فوری ظہور پذیر نہ ہونیکے باعث، صحابہ کے استفسارات اور انکی تشفی کے متعلق مجمل بیانات پائے جاتے ہین۔

میکڈونلڈ نے علامہ ابن خلدون، اور الغزالی کے جو اقتباسات دئے ہین وہ احادیث سے مالامال ہین جنہیں تو بین کے اندر، اور بعض مقامات پر حاشیہ مین حدیث کے صحیح الفاظ کی تشریح بھی کردی ہے، حدیث مین اور بھی بہت سی روایتین ہین جن مین بی بی عائشہ رضؓ کی روایت سے، جو ایک خواب کا تذکرہ پایا جاتا ہے، وہ بہت دلچسپ ہے، آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ صدیقہ رضؓ سے فرمایا کہ مینے دو بار خواب مین دیکھا کہ ایک شخص تمھین ایک ریشمی کپڑے مین اوڑھائے ہوئے ہے، اور کہہ رہا ہے، یارسول اللہ یہ آپکی بیوی ہے، مینے کپڑا کھول کر جو دیکھا تو تم نظر آئین مینے کہا، اِنْ یَکُن ھٰذا مِن عِندَ اللّٰہ یمضہ (اگر اللہ کی یہی مرضی ہے تو پوری ہوکر رہیگی)۔

الغرض اسلامی عقیدہ کے اعتبار سے خواب ایک اہم مسئلہ ہے، اور اسلام کے مایہ ناز علمانے، تاریخ، ماہرین فلسفہ و متکلمین کے ذاتی بیان کردہ خواب کی (مفصلہ ذیل) روایات سے پتہ چلے گا، کہ نفس انسانی کے اس عجیب وغریب کرشمہ کے اندر کیسی کیسی تاریخی حقیقتین پنہان ہین۔

ابن خلدون کے نظریات خواب

عالم خواب کی ماہیت طبعی یہ ہے کہ نفس مدرکہ اپنے جوہر روحانیہ کی وساطت سے

ایک لحظہ مین حادثات کی صورتون کے متعلق آگاہی حاصل کرتا ہے، نفس مین روحانیت کا جس قدر زیادہ حصہ ہوگا اشکال حادثات کی جلوہ گری بھی اس مین حقیقی ہوگی، جیسا کہ تمام جواہر روحانیہ کی خصوصیت ہے، اور یہ مادی ملوثات اور قوت جسمانی کے سرچشمہ سے جدا ہوکر بالکل روحانی بن جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم بیان کرینگے نفس مدرکہ پر خواب کے اندر ایک لحظہ مین وقتاً فوقتاً یہ کیفیت طاری ہوتی رہتی ہے، اسلئے یہ نفس مدرکہ حادثات مستقبل کے متعلق علم حاصل کرتا ہے، اور اس علم کے ساتھ اپنے ینابیع وقوف وادراک کی طرف لوٹ آتا ہے، جب یہ حصول قوت مصورہ مین مجازیات اور مثال کے استعمال سے غیر محکم اور مبہم ہوتا ہے، تو ان مجازیات کے باعث تاویل کی ضرورت ہوتی ہے، بعض اوقات حصول محکم اور استوار ہوتا ہے، اور اس مین مجازی رنگ نہین پایا جاتا، اسوقت اسکی تاویل کی حاجت نہین ہوتی، نفس مین اس پرتو فہم وادراک نقش طرازی کا سبب یہ ہے کہ نفس طبعاً جوہر روحانیہ سے تعلق رکھتا ہے، اسے اس امر کی کاوش رہتی ہے، کہ جسم وجسمانیات کے چشمہائے وقوف ہی مین رہکر وہ اس عالم بالا کی لذت آگینیون سے مستفیض ہوا کرے، یہانتک کہ نفس علم ومعرفت کا مہبط ہوجائے، اور حقیقت کا آئینۂ کمال، اور پھر اسی صورت سے خود بھی سراپا جوہر روحانیہ ہوجاتا ہے، اسے علم ومعرفت کے لیئے آلات جسمیہ کی ضرورت لاحق نہین ہوتی، اسلئے نفس کے یہ درجات، ملائکہ کے ماتحت ہین، جنھین اپنی ذات طبعی کو جسمانی اور دوسرے چشمہ ہائے علم ووقوف کی وساطت سے پرکرنیکی ضرورت نہین صرف نفس انسانی سے (جب تک اسکا تعلق جسمانیات سے وابستہ رہے) اس طریق علم ووقوف کا علاقہ رہا کرتا ہے، اسکی ایک مخصوص نوعیت ہوتی ہے، جو اولیاء اللہ سے مخصوص ہے، دوسری قسم عامیانہ پہلو رکھتی ہے، جسکا تعلق عوام الناس سے رہا کرتا ہے، اور یہ آخری قسم رویت (خواب) کی اصل بنیادی ہے، حصول علم معرفت کی وہ نوعیت جو انبیائے کرام کی ذات سے مخصوص ہوتی ہے، وہ یہ کہ مرسلین کو یہ قدرت ہوا کرتی ہے کہ وہ فطرت انسانیہ سے نوامیس ملکوتیہ کی خالص کیفیات مین مبتدل ہوجاتے ہین، اور یہ اقتضائے روحانیہ کا نقطہ انتہا ہے، انبیائے کرام مین اس قدرت کا اظہار نزول وحی کے وقت ہوا کرتا ہے، الہام کی وہ حالت جب جسمانیات کے ذرایع علم وبصیرت کے میدان مین داخل ہوتی ہے، تو اسے تقریباً انھین مدارج سے گذرنا پڑتا ہے، جو (ذرایع جسمیہ کی وساطت سے) حصول وقوف کیلیے ناگزیر ہین، اس صورت مین حالت نوم سے یہ بہت ممثل ہوتا ہے، اسی مماثلت کے باعث خواب کے متعلق پیغمبر صلعم نے فرمایا کہ یہ نبوت کے چھیالیس حصون مین سے ایک حصہ ہے (یہ صحیح حدیث کا رویا المومن جزءٌ من ستۃ واربعین جزءًا من النبوۃ کا ترجمہ ہے، جو صحیح بخاری مین بروایت عبادہ بن صامت موجود ہے)۔

ابن خلدون کہتا ہے، کہ ہر چند فطرت انسانیہ سے گذرکر ناموس ملکوتیہ مین منتقل ہونیکی قدرت نوع انسان مین مشترک ہے، لیکن اسکے ساتھ بہت سے موانع اور حجابات ہین، ان مین سب سے زیادہ قوی سبب حواس ظاہری ہین، لیکن اللہ جل شانہ نے فطرت انسانی مین یہ صفت بھی ودیعت کی ہے کہ نیند مین اس سے حجابات حواس اوٹھ جاتے ہین اور اسوقت نفس عالم الحق سے اس شے کا علم حاصل کرتا ہے، جسکے لئے اسکی سعی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت نے اس ساعت کو

"مبشرات" (مژدہ رسان) تعبیر کی، آپنے فرمایا مبشرات کے سوا نبوت باقی نہین رہی، لوگون نے کہا یا رسول اللہ مبشرات کیا ہین آپنے فرمایا "سچے خواب" جو ایک صالح آدمی دیکھتا ہے، یا جو کچھ اسے دکھایا جاتا ہے، (یہ ایک حدیث کا ترجمہ ہے، جو مشکوۃ مین بھی موجود ہے، اور بخاری کی کتاب التعبیر مین بھی بروایت ابوہریرہؓ پائی جاتی ہے، لم یبق من النبوۃ الا المبشرات قالوا وما المبشرات قال الرؤیا الصالحۃ)۔

علامہ موصوف لکھتے ہین اب مین یہ بتانا چاہتا ہون، کہ اس حجاب کے برطرف ہونے کا کیا سبب ہے، نفس عقلیہ کے مدرکات اور وظایف عمل کی بنیاد روح جسمانیہ حیوانی پر قایم ہے، یہ ایک لطیف انجرہ ہے، جسکا مقام عمق قلب کے دائین جانب واقع ہے، اسکی وضاحت جالینوس اور دوسرے علما کے مصنفات متعلقہ تشریحات مین پائی جاتی ہے) یہ انجرہ خون کے ساتھ رگ اور شرائین مین منتشر ہوجاتا ہے، اسکی وساطت سے حس و حرکت، اور تمامی جسمانی اور ادو ظایف کا نظام عمل قایم ہے، اسکے لطیف اجزا دماغ مین صعود کرتے ہین، اور دماغ سے برودت (یا رطوبت) زایل ہوجاتی ہے، اور اعمال قوی جو معطل رہتے ہین، تیار ہوجاتے ہین، اسلئے نفس عقلیہ محض روح بخاریہ کی وساطت سے فہم و درک حاصل کرتا ہے، نفس عقلیہ کے مدرکات کی دو قسمین ہین، ایک تو وہ درک جو حواس خمسہ ظاہری کی وساطت سے حاصل ہوتا ہے، اور دوسرا وہ جو حواس خمسہ باطنی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اور تمام محسوسات ظاہرہ و باطنہ نفس عقلیہ کو جواہر روحانیہ کا ادراک نہین کرنے دیتے جو حسیات سے بالاتر ہین، چونکہ حواس ظاہرہ کا تعلق جسمانیات سے ہوتا ہے، اسلئے انھین تکان اور محنت کے باعث بے خبری (غفلت یا نیند) ضروری ہے، اسوقت نفس، ہجوم مشاغل کے باعث بیہوش ہوجاتا ہے، اسلئے خدا نے اس مین جستجوئے استراحت کا ذوق پیدا کردیا ہے، تاکہ اسکی قوت مصورہ مین تازگی ہوتی رہے، یہ اسوقت ہوتا ہے جب روح حیوانیہ سے حواس ظاہری کے تمام حجابات ہٹ جاتے ہین، اور وہ حواس باطنی کی طرف عود کرتی ہے، جب جسم پر بے خبری کا تسلط ہوجاتا ہے، رات کی سردی اس امر کی موید ہے، حرارت غریزیہ جسم کے تمام پر سکون مقامات مین روح حیوانیہ کے ساتھ ظاہر سے باطن کی طرف دوڑتی پھرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر لوگون کو رات ہی کے وقت نیند آتی ہے،۔

اسلئے روح جب حواس ظاہری سے حواس باطنی کی طرف رجوع کرتی ہے، اور نفس سے حجابات اور موانع کی گرانی کم ہوجاتی ہے، اور جب یہ ان صور و اشکال کی طرف لوٹتی ہے، جو قوت حافظہ مین جمع رہتے ہین اسوقت (قانون) حل و عقد کے ماتحت خیالی صورتین سامنے آجاتی ہین، جو مرتب اور عامیانہ ہوتی ہین چونکہ یہ صورتین انھین منتزع معلومات سے لیجاتی ہین، جو عام اور معہود ہین، اور اسکے بعد وہ حواس عامہ جسے حواس ظاہری کی متحدہ صورت کہہ سکتے ہین اسے حواس خمسہ ظاہری کے مختلف طریقون سے مطابق سمجھتی ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نفس ایک لحظہ کے لیئے اپنے جوہر روحانیہ کی طرف چلا جاتا ہے، (ہرچند اسوقت قوائے باطنی متصادم رہتی ہین) اور اپنے ادراک روحانیہ کے ذریعہ

بعض علم و وقوف حاصل کرتا ہے، اسے چیزون (خیالات) کی بعض صورتین دستیاب ہوتی ہین، جو اسکے بعد اسکی ذات سے وابستہ ہوجاتی ہین، اسکے بعد قوت مصورہ ان صور (مدرکہ) کو لیتی ہے، اور انہین یا تو انکی اصلی شکل مین پیش کرتی ہے، یا مجازی رنگ مین، حبیب مجازی۔ اگر ہوگا تو تاویل کی ضرورت ہوگی، بعض اوقات نفس کی جدت طرازیون (قانون حل و عقد کے ماتحت حافظہ جو صورتین پیش کرتا ہے) ”اضغاث احلام“[51] (خوابہائے پریشان[51]) کی صورتین رونما ہوتی ہین، اور یہی وجہ ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا تین طرح کا خواب ہوتا ہے، لاہوتیہ، ملکوتیہ، اور شیطانیہ[52] اس تفصیل کا وہی مطلب ہے جسکا پہلے اوپر تذکرہ کیا ہے، جو خواب بین ہوگا وہ لاہوتی ہے، جسپر رنگ مجاز غالب ہو وہ ملکوتی ہے، اور ”خوابہائے پریشان“ (اضغاث احلام) شیطانیہ ہین۔

یہ انسانی نفس کی متاع خاص ہے، اور عام انسان مین مشترک ہے، کوئی انسان اس سے خالی نہین ہر انسان نے اپنی زندگی مین متعدد بار ایسا خواب ضرور دیکھا ہوگا، جو عالم بیداری مین بعینہ حادث ہوا ہو، اور اسنے نتیجہ نکالا ہوگا کہ نفس نیند کے اندر عالم غیب کے سرچشمہ سے علم و عرفان حاصل کرسکتا ہے، اور جس طرح یہ نیند مین ممکن ہے، اسی طرح دوسرے منازل ”حال“ مین بھی ممکن الوقوع ہے، کیونکہ ذات مدرک (علم حاصل کرنے والی) ایک ہے اور اسکی خصوصیات ہر ”حال“ کے لئے مشترک پہلو رکھتی ہین، خواب کا زیادہ حصہ انسانی قصد اور ارادہ سے بالاتر ہوتا ہے، یہ صرف اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ نفس کسی چیز کا متلاشی رہتا ہے، اسوقت انسان کو نیند آتی ہے، اور وہ خواب دیکھتا ہے، یہ وجہ نہین ہوا کرتی کہ نفس چاہتا ہے کہ خواب دیکھین، اور اسکے ارادہ سے خواب کا ظہور ہوتا ہے، ان ارباب فضل کی تصانیف مین جو مجاہدہ زاہدانہ اور ریاضت صوفیانہ کے متعلق ہین بعض اسماء پائے جاتے ہین، اگر سوتے وقت یہ اسماء پڑھ لئے جائین تو جس شے کو خواب مین دیکھنا ہو، اُسے انسان دیکھ سکتا ہے، انہین ”حلومیہ“ کہتے ہین[53] - ایک مصنف ان مین سے ایک اسم کا تذکرہ کرتا ہے، اور اسے حلومۂ ”طبیعت کاملہ“ سے تعبیر کرتا ہے، اسکا عمل یہ ہے کہ سوتے وقت، مذہبی اشتغال سے فارغ ہونیکے بعد توجہ کامل کے ساتھ انسان یہ اسم پڑھ لے[54] طالب کو چاہئے کہ اپنی حاجت پیش نظر رکھے، کیونکہ نیند کے اندر جسکی طلب ہے، وہ ظاہر ہو جائیگا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی نے

---

[51] قالوا اضغاث احلام و ما نحن بتأویل احلام بعالمین (سورۂ یوسف، ابن خلدون نے ”اضغاث احلام“ ہی لکھا ہوگا کیونکہ میکڈونلڈ نے اسکے بعد سورۂ یوسف کا حوالہ دیا ہے، اسنے (Bundle of Dreams) اسکا ترجمہ کیا ہے، جارج سیل نے اسے Confused Dreams لکھا ہے [52] الرؤیا من اللہ والحلم من الشیطان کی حدیث بخاری کی کتاب التعبیر مین بروایت ابی قتادہؓ پائی جاتی ہے، اس مین خواب ملکوتیہ کا تذکرہ نہین لیکن لاہوتیہ اور شیطانیہ کے اقسام موجود ہین [53] یہان میکڈونلڈ لکھتا ہے، یہ غالباً عبرانی لفظ ”حیلوم“ سے مشتق ہے، جسکے معنی ”خواب“ ہین، [54] اس مقام پر میکڈونلڈ نے قوسین کے اندر لکھا ہے کہ یہان چند ایسے حروف کا غیر مفہوم مجموعہ ہے، جسکا تلفظ مین نہین کرسکتا، غالباً یہ عبرانی یا شامی لغت کے الفاظ ہین۔

چند راتون کی تیاری کے بعد یہ عمل کیا، تب ایک صورت ظاہر ہوئی، اور اسنے کہا، مین تمھاری "طبیعت کاملہ" ہون اس آدمی نے سوال کیا، اور جو کچھ وہ چاہتا تھا اس "صورت" نے اسے بتایا، علامہ ابن خلدون کہتا ہے، مینے خود بھی یہ اسماء پڑھے ہین، اور نیند مین عجیب و غریب شکلین نمودار ہوئین، جن سے مجھے اپنے ان واقعات کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہوئے، جن کو مین جاننا چاہتا تھا، لیکن اسکا یہ مطلب نہین کہ جستجوے خواب سے یہ ظہور پذیر ہوتا ہے، بلکہ صرف یہ ہے کہ ان اسماء سے نفس مین حدوث رویت کے لئے استعداد پیدا ہو جاتی ہے، اسلئے نفس جسقدر مستعد ہوگا، اسی قدر اس شے سے جس کے لئے اسکی مستعدی ہوگی قریب تر ہو جاویگا۔

(باقی آیندہ)

عبد الماجد (آروی)

علم الکیمیا کا ایک حیرت انگیز معجزہ

کایا پلٹ ہیر آیل

کہنے کو صرف یہ تیل ہی لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہی۔ یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود نباتاتی و کیمیاوی اجزا سے جدید اصول پر طیار کیا گیا ہی جسکی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانون نے کی ہی۔ اس کے فوائد کی تفصیل مختصر اشتہار مین ناممکن ہی مختصراً یون سمجھ لیجئے کہ گھر مین اسکی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کر دینا ہے۔

(۱) اگر چندیا کے بال صاف ہو گئے ہین یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہی یا بال گرنا شروع ہو گئے ہین یا کمزور و باریک ہو گئے ہین یا سفید ہونے لگے ہین تو اس تیل کا استعمال بالون کی جڑون کو فاسد رطوبتون سے صاف کر کے بال کا گرنا موقوف کر دیگا، بال بڑھائیگا اور جہان جہان کے بال گر گئے ہین وہان نئے بال سیاہ پیدا کریگا۔

(۲) جن کو نزلہ درد سر یا شقیقہ دوران سر ضعف دماغ، ضعف بصارت بے خوابی اور نسیان وغیرہ کی شکایت رہتی ہے ان کیلئے یہ تیل بڑی نعمت ہے۔ نزلہ کو فوراً روکدیتا ہے اور دماغ و بصارت کو قوی کر کے عجیب قسم کا سکون پیدا کر دیتا ہے اور عینک کے استعمال کو بھی غیر ضروری کر دیتا ہے۔

(۳) شدت تپ کی حالت مین اسکی مالش فوراً ہذیانی حسیات کو دور کر کے پسینہ لے آتی ہی اور بخار کو کم کر دیتی ہے۔

(۴) ایسے مہلک امراض سے جیسے کنٹھ مالا آتشک وغیرہ اسکا استعمال کرنیوالا، اور تمام اثرات فاسدہ کو خواہ وہ موروثی یا ذاتی ہون اور سوزشون مین یکقلم دور کر دیتا ہی۔

(۵) اسرا اور جسم کے پھوڑیان، پھنسیان، گرمی دانے، خارش اور ہر طرح کے جلدی امراض اسکے مالش سے کافور ہو جاتے ہین۔

(۶) اس کے استعمال سے بال نرم چمکدار، بڑے اور مضبوط ہوتے ہین اور تقویت دماغ کی وجہ سے چہرہ پر ایک خاص قسم کی تازگی اور نرمی پیدا ہو جاتی ہی۔

(۷) یہ تیل اپنی بھینی خوشبو کی وجہ سے بھی عجیب چیز ہے اور ہمارا دعوی ہی کہ اس کا استعمال کرنیوالا کبھی کسی اور تیل کو پسند نہین کر سکتا۔

(۸) اس تیل کا استعمال اگر حفظ ما تقدم کے لحاظ سے کیا جائے تو پھر کوئی وہ شکایت پیدا نہین ہو سکتی جن جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

اگر کسی کو ہمارے دعوی کے مطابق نہ ہو تو قیمت واپس کر دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے

جوابی امور کے واسطے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہی۔ قیمت معہ محصول ...

مینجر کایا پلٹ ہیر آیل - لکھنؤ

شیطان کی آنت

مین اکثر غور کرتا رہا ہون کہ آخر شعراء درد گردہ مین کیون نہین مبتلا ہوئے اور اگر ہوئے تو اُنھون نے اسکا تذکرہ کیون نہین کیا۔ جہان تک انکے "اعترافات" (کلیات اور دواوین) کا تعلق ہے یہ اعضاء رئیسہ کی ہر قسم کی بیماری مین مبتلا پائے گئے جن مین دل و جگر کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس قسم کے شاعرانہ امراض اور اُنکے نتائج و عواقب کی مکمل داستان شعراء لکھنؤ کے کلام مین زیادہ تر پائی جاتی ہے اسیلئے مین نے عین حالت بیماری مین اس دفعہ لکھنؤ کا قصد کیا اور اس مقصد سے کہ وہان پہونچکر اس حقیقت کی تفتیش کرونگا جس کا تذکرہ اس مضمون کے اولین جملہ مین کیا گیا ہے یا بقول لکھنؤ والون کے جو سوال اس مضمون مین "چھوٹتے ہی" کیا گیا ہے۔

میرے نزدیک مرض کی کوئی نہ کوئی حد ہونا چاہئے، بصورت دیگر مریض کو اختیار ہے کہ وہ حد سے گذر جائے جسطرح ہمیشہ تندرست رہنا بھی غیر طبیعی ہے اسیطرح ہمیشہ بیمار رہنا بھی بد مذاقی ہے۔ پھر چونکہ یہ دور ترقی و تہذیب کا ہے یعنی تم جو چاہو کر سکو یا نہین تمھاری بیویان جو چاہین کر سکین، مین نے گردہ صاحب کی متواتر اور مسلسل کئی ماہ تک تالیف قلوب کی لیکن جب دیکھا کہ میرے اغماض اور چشم پوشی کو یہ ایک روشن خیال تعلیم یافتہ بیوی کے مانند میری کمزوری پر محمول کرنے لگے ہین تو پھر اس اندیشہ سے کہ کہین مین، بالکل مہذب ہی نہ بن جاؤن مین نے ایکدن گردہ صاحب کو نوٹس دیدیا "بنابر دکھانے اس وجہ کے"، کہ چونکہ اب تک میرا سلوک تمھارے ساتھ نہایت درجہ شریفانہ رہا ہے اور مین نے تمھاری زیادتیون پر چشم پوشی کی ہے لیکن تم اسکو میری کمزوری اور اپنی خوش نصیبی پر محمول کرتے آئے ہو اس لئے مین تمکو آخری بار متنبہ کرتا ہون کہ راہ راست پر آجاؤ ورنہ پھر سمجھ لو مین عمر بھر اور ہمہ وقت مہذب رہنے کا کسی طور پر پابند نہین ہون اور اپنے فطری حربہ جہالت سے تمھارا تدارک کرونگا۔ میری اس بجا اور باضابطہ نوٹس کا جواب ایک "برجستہ قہقہہ" (اس ترکیب کے جواز مین "نقرئی تبسم" پر غور فرمائے) سے دیا گیا۔ یہی نہین بلکہ گردہ صاحب نے اور ہاتھ پاؤن پھیلائے اور نہایت بے باکی کے ساتھ جگر اور معدہ کے حدود مین اپنا اقتدار "شہنشاہت" پھیلانے لگے۔ جگر، معدہ، آنتین یہ سب ہماری نہایت صلح جو، مرنجامرنج اور وفادار رعایا تھین جن سے ہمکو عمر بھر آرام و اطمینان نصیب رہا۔ لیکن اطبا، اور ڈاکٹرون نے تشخیص کیا کہ یہ کرتوت انہین کا ہے۔ گردہ صرف بدنام ہے۔ بحیثیت ایک جدید الخیال حکمران کے جو صرف ماہرین فن کے فتاویٰ پر حکومت کرتا ہے ہم ان وفادارون سے بدظن ہوگئے اور چونکہ بادشاہ کی بدظنی کی معنی جنگ و خونریزی کے ہین اسلئے ہم نے اونکے خلاف معجون، عرقیات، جوشاندہ، حبوب، سفوف وغیرہ قسم کی تادیبی ارضی و فضائی مہمین روانہ کرنی شروع کر دین۔ ان بیچارون نے صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ سب گردہ کی بالشوزم یا شہنشاہیت ہے ہم لوگ اب تک وفادار خیر اندیش "برٹش سبجکٹ" ہین۔ چنانچہ ایک رات جبکہ زلف شب گردہ تک پہونچ چکی تھی ہم علیگڈھ سے کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگئے اور ارادہ کر لیا کہ اس کمبخت گردہ کو بالکل "ملیا میٹ" (اس لفظ کے معنی غور طلب نہین ہین

بلکہ اسکی ہیئت صوتی داد طلب ہے۔ بناڈالون گا۔ بیوی بچون سے کہدیا کہ حکیم صاحب (حکیم عبد اللطیف صاحب وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ) کا اصرار ہے۔ وہ لکھنؤ کے خربزے کھلانے لیجا رہے ہین تمھارے لئے بھی بھیجون گا۔ غرض دوسرے دن دوپہر کے قریب لکھنؤ پہونچ گیا اور جھوائی ٹولہ مین مقیم ہو گیا۔

چار دن تک حکیم صاحب کا مہمان رہا اور اس دوران مین بالائی، قفلی، پراٹھے، بریانی اور قورمہ کھاتا رہا اور حکیم صاحب کے تانگہ پر ہاضمہ اور میڈیکل کالج مین داخل ہونے کے ابتدائی مراحل طے کرتا رہا۔ ایکبار خیال آیا کہ جب تک میڈیکل کالج مین نہین داخل ہوتا اطبائے جھنوائی ٹولہ کو بھی اپنے مرض سے آشنا کرادون چنانچہ ایک روز صبح سے دوپہر تک نبض اور قارورہ کے ساتھ "نائی کا نوشہ" بنا رہا۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ جس نے "تجر ثقیل" و "ولند یزی" زبان مین یہ مرض تشخیص کرتے رہے اسکے معنی کچھ بھی میری سمجھ مین نہ آئے اور دریافت کرنے کی یون ہمت نہ ہوئی کہ کہین واقعی ایسا ہی "تجر ثقیل" مرض بھی نہ ہو۔ بڑی ناانصافی ہو گی اگر اس سلسلہ مین حکیم صاحب کے تانگے اور گھوڑے کا تذکرہ نہ کیا جائے کیونکہ میرا خیال ہے اس تانگے مین سوار ہونیسے بہت سے امراض خود بخود زائل ہو سکتے ہین اور اتنے ہی غیر متوقع امراض پیدا بھی ہو سکتے ہین۔ تانگے کا گھوڑا "حبشی خواجہ سرا" ہے یعنی مشکی اور آختہ۔ اس تانگے مین کامیابی کے ساتھ صرف وہ لوگ سوار ہو سکتے ہین جنکو موٹر سائیکل پر بیٹھنے کی مہارت ہو آپ بیٹھنے کا ارادہ کرین گے اور یہ چلدیگا ان "حرکات مذبومی" کی اطلاع حکیم صاحب نے پہلے سے دیدی تھی لیکن اسکی ضرورت نہ تھی۔ ہم بھی اپنے مکرم دوست سید عبد الجلیل صاحب کے تانگے پر بیٹھنے کی مشق کر چکے تھے۔ اسلئے ہمکو کوئی تشویش نہ تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ حکیم صاحب کا گھوڑا صرف "سلف اسٹارٹر" تھا اور جلیل صاحب کا "سلف اسٹارٹر" (Self starter) اور "کک اسٹارٹر" (Kick starter) دونون۔ دونون کے صرف رنگ مین فرق تھا ورنہ عادت و اطوار کے اعتبار سے یکسان تھے۔ مین نے ان تانگون سے دور رہ کر اکثر اس مسئلہ پر غور کیا ہے کہ حکیم صاحب اور جلیل صاحب دونون اتنے شریف النفس دوست پرست اور مخلص ہونیکے باوجود اس قسم کے بے لگام اور عافیت عامہ مین خلل انداز ہونے والے گھوڑے کیون رکھتے ہین اور اکثر اس مسئلہ پر غور کرتے کرتے مجھپر ضمیر انسانی کی بعض دلچسپ و متبائن کرشمہ کاریان بھی منکشف ہوئین یعنی ایک ہی جذبہ سے متاثر ہو کر دو شخص دو مختلف یا متضاد فعل کے مرتکب ہو سکتے ہین اور خراج تحسین بھی وصول کر سکتے ہین۔ مثال مین ان دونون گھوڑونکو پیش نظر رکھئے۔ حکیم صاحب نے طب و تحفظ کے نقطہ نظر سے اپنی مشکین نسب گھوڑے کو آختہ کرا ڈالا، جلیل صاحب نے انسانی نقطہ نظر سے اُسے گوارا نہ کیا۔ اب دیکھنا یہ رہ گیا ہے کہ اس طبی اور انسانی نقطہائے نظر مین کیا فرق ہے۔ یہ بحث زیادہ طویل ہو جائے گی اس لئے اب اسکو یہین ختم کر دینا چاہئے۔ بہرحال میرے نزدیک غالباً وہی فرق ہے جو ایک طبیب اور غیر طبیب مین ہونا چاہئے!

حکیم صاحب کے تانگہ پر بیٹھنے کے بعد کوئی شخص نہ اپنے آپکو محفوظ خیال کر سکتا ہے اور نہ دوسرون کو جو سڑک پر چل رہے ہون یا دوکان پر بیٹھے ہون۔ "چال جیسے کڑی کمان کا تیر"۔ تیور جیسے کسی دیہاتی تھانہ کا تھانیدار کسی دیہاتی ہی ٹٹو کے گھوڑے پر سوار ہو۔ جلیل صاحب کے موٹر کے مانند صبا رفتار نہین بلکہ انکے گھوڑے کے مانند طوفان رفتار۔

مرض اور ازالہ مرض کے سلسلہ مین حکیم صاحب کے ساتھ مین ڈاکٹر بھاٹیا صاحب کی کوٹھی میڈیکل کالج اور بعض دیگر

مقامات پر موٹر مین بھی گیا ہون لیکن تیز رفتاری کا رعب مجھ پر جیسا کچھ حکیم صاحب کے تانگے کا ہے موٹر کا کبھی نہین ہوا اس تانگہ پر قطع مسافت اتنی ہی سریع اور شاید مرد افگن ہے جتنا خطرہ جسم وجان متیقن۔ گومتی کے کنارہ یہ اس بے پناہ رفتار سے جا رہا تھا جیسے میجر سیگریو کا موٹر۔ مجھے خیال نہین بلکہ یقین تھا کہ اگر جادۂ مستقیم سے ایک آدھ درجہ بھی لگام ادھر اُدھر ہوئی تو پھر یہ تانگہ بلا تکلف گومتی کے لہرون سے دست و گریبان نظر آتا۔ یہ لکھنؤ میونسپلٹی کی غلطی اور ستم ظریفی ہے کہ اپنے سڑک اور دریا کے درمیان کسی قسم کی حدبندی نہین کی ہے میری تجویز ہے کہ اس بارہ خاص مین جو شخص یا ممبر میونسپلٹی قصوروار ہو اوسکو حکیم صاحب کے تانگے پر سوار کرا کے "ریور بنک روڈ" (River Bank Road) کی طرف ہانک دینا چاہیے۔

اس تانگے پر مین نے اکثر محسوس کیا ہے کہ میرا اصلی مرض یکلخت کافور ہو گیا ہے۔ لیکن دو چار دوسرے مرض پیدا ہو گئے ہین۔ ہمارے حکیم عبداللطیف صاحب کی ایک کمزوری ہے جس سے ممکن ہے وہ انکار کرین لیکن یہ یقینی ہے کہ اس سے نجات نہین حاصل کر سکتے۔ اور وہ برف ہے۔ میرا خیال ہے اگر گرمی کے موسم مین برف نہ ملے اور صرف قطب شمالی پر اسکا پتہ لگے تو حکیم صاحب یقیناً اپنے ہی تانگہ پر قطب شمالی کے لئے روانہ ہو جائین گے۔ ایکدن ہم سب، خدا رکھے، اسی تانگہ پر قارورہ کا امتحان کرانے کے لیے پتھالوجی ڈیپارٹمنٹ آئے۔ زینون پر چڑھتے اُترتے، مختلف مقامات پر آتے جاتے کم سے کم مین تو نہایت خستہ ہو گیا تھا۔ دوپہر ہو چلی تھی، دھوپ کی شدت، لُو اور گرمی کا غلبہ، سوا اتفاق حکیم صاحب کو پیاس کا غلبہ ہوا فوراً مجھے ساتھ لے کر تانگے پر بیٹھ چوک کے لئے روانہ ہو گئے۔ مین نے دریافت کیا کہان کا قصد ہے کہنے لگے چوک چلکر برف پیون گا۔ تانگہ چوک مین اسطور پر داخل ہوا ہے جیسے کوئی بھونچال آگیا ہو۔ کسی دوکان والے کے پردہ سے الجھا، کسی کا سائن بورڈ سربسجود ہو گیا اور ہماری یہ حالت۔

رو مین ہے رخش "برف" کہان دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب مین

کتنے برف والون کی دوکان راستے سے گذر گئی اور کتنے اپنی جان اور اعضاء و جوارح کی خیر مناتے اور ہمکو گھورتے اور بڑبڑاتے ہوئے ادھر ادھر کترا گئے گھوڑا اسطور پر بے محابا گذر رہا تھا جیسے بلوائیون کے ہجوم سے سوار پولیس کا دستہ۔ لیکن حکیم صاحب اسطور پر خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے گویا یہ سب کچھ متوقع بھی تھا اور خوش آیند بھی۔ میرا حلیہ ان "جاکیون" کا تھا جو گھوڑ دوڑ مین گھوڑون کی پشت پر نظر آتے ہین۔ عجب ثم العجب، گھوڑے نے ایک ایسے مقام پر جا کر دم لیا اور "جمنے لگا" جسکے ایک طرف "کارگاہ شیشہ گر"، دوسری طرف مٹی کے کھلونے والے اور اوپر "کم خرچ بالا نشینون" کا عشرت کدہ تھا۔ مجھے اس مقام کی تاریخ اور جغرافیہ سے کوئی واقفیت نہ تھی، میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ اس تانگے پر انسان سوائے تحفظ ذات کے گرد و پیش کے حالات و مناظر پر مطلق غور نہین کر سکتا۔ اور یہی نہین بلکہ اسپر سے اُترنے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک اپنی اعضاء و جوارح کو ٹٹولتا رہتا ہے کہ ان مین سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر صحیح سالم موجود بھی ہے یا نہین۔ لیکن جب مین نے دیکھا کہ حکیم صاحب کے چہرہ پر دائمی شگفتگی کے بجائے کچھ کبیدگی اور تنغص کے آثار پیدا ہین تو مین نے سمجھا کوئی بات بے موقع ضرور ہے۔

چنانچہ ہم سب تانگہ سے اتر آئے اور اُسے بدقت تمام ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا گیا جسے ایکطور پر ایک طویل سائبان کہنا زیادہ موزون ہوگا۔ اس سائبان کے عرض مین تو کئی دروازے تھے لیکن طول مین صرف ایک در تھا۔ کشادہ و مسطح دوسرے کنارہ پر کوئی دروازہ نہ تھا۔ بلکہ محض ایک بلند دیوار۔ اس سائبان کا عرض زیادہ سے زیادہ چھ فٹ ہوگا۔ غرض تانگہ کھڑا کر دیا گیا اور ہم لوگ برف اور شربت کی مہم پر روانہ ہوئے۔ ابھی ایک لور اگلاس بھی ختم نہ کر پائے تھے کہ۔

اک شور طوفان خیز اٹھا ہے

کے بجائے ایک شور مردم خیز اٹھا۔ پھو بگر دیکھتے ہین تو گھوڑا اور تانگہ دونون سائبان مین داخل ہین اور سامنے کی دیوار پر چھاپہ مار رہے ہین گھوڑا۔ تانگہ۔ سائیس اور تماشائی سب کے سب دست افشان۔ ہائے کوبان۔ نعرہ زنان۔ لڑکے تالی بجا رہے تھے۔ عورتین چیخ رہی تھین بوڑھے بدعائین دے رہے تھے اور نوجوان کچھ ہماری مدد کر رہے تھے اور کچھ گھوڑے اور تانگے کی۔ غرضکہ کسی نہ کسی طرح تانگہ نکالا گیا اور ہم سب ایک دفعہ پھر میڈیکل کالج کے لیے روانہ ہوگئے اور وہان سے تقریباً دو بجے دنکو جھوائی ٹولہ واپس ہوئے۔ حکیم صاحب اس مہم سے ایسے مسرور و مطمئن تھے جیسے میجر سر سیگریو ۲۳۱ میل فی گھنٹہ کا موٹر ریکارڈ قایم کر کے تماشائیون کے ہجوم مین داخل ہو رہے ہین۔ اور میری یہ حالت کہ بس چلتا تو اپنے ساتھ ساتھ اس گھوڑے کو بھی میڈیکل کالج مین داخل کرا دیتا۔ سنا ہے آختہ ہونے سے قبل اس گھوڑے کی تاریخ اور زیادہ ہولناک تھی سازر کھے جانے سے قبل پہلے تو اسکی آنکھون پر پٹی باندھی جاتی تھی پھر گردن مین موٹی رسی ڈالکر دونون طرف سے دو دو آدمی رسی کا سرا مضبوط پکڑتے تھے اور پھر دوسرے دو آدمی مضبوط ڈنڈے لیکر وقتاً فوقتاً انکے ساتھ تفریح کرتے جاتے تھے لیکن باوجود اس قسم کے غیر شاعرانہ سلوک کے ایک دفعہ آپ نے کسی سائیس کا ہاتھ چبا ڈالا۔ ان اعمال حسنہ کے ہوتے ہوئے کوئی تعجب نہین اگر انکے آختہ کر دینے کا فیصلہ کر دیا گیا ہو۔ لیکن یہ سلوک میرے نزدیک کسی حد تک قبل از وقت اور جابرانہ تھا بعض بزرگون کا خیال ہے کہ ہمکو جانورون سے بھی وہی سلوک کرنا چاہیئے جو ہم خود بنی نوع انسان کیلئے روا رکھتے ہین۔ اس نظریہ کے ماتحت اس گھوڑے سے بلکل مختلف قسم کا سلوک ہونا چاہیئے تھا۔ کسی ہندستانی نوجوان کو بے راہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہین تو والدین جلد سے جلد اوسکی شادی کر دیتے ہین اور یہ شکنجۂ ازدواجی ساری شاعری خاک مین ملا دیتا ہے۔ اسیطور پر میرا خیال ہے اس گھوڑے کو آختہ کرنے کے بجائے متاہل زندگی بسر کرنے کا موقعہ دیا جانا چاہیئے تھا۔ ممکن ہے کہ صاحب کے ذہن مین یہ خیال آیا ہو لیکن دقت یہ رہی ہو کہ اس جنس کی صنف نازک نے ان بزرگ کو "نامہذب"، قرار دیکر مردود کر دیا ہو!

میرا خیال ہے یہ گھوڑا پوری طور پر آختہ نہین ہوا ہے اور یہ ناممکن بھی تھا۔ جب ان بزرگ کا یہ عالم ہو کہ اپنے فرایض منصبی ادا کرنے کے خلاف اسطور پر آمادہ جنگ رہتے ہون تو پھر کسی ایسے سلوک کو آسانی کے ساتھ کیونکر گوارہ کیا ہوگا جو سراسر انکے فرایض جنسی کے منافی تھا اگر اکس ریز (X - rays) سے انکا معائنہ کرایا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ آپریشن ٹھیک نہین ہوا، اور بعض سرکش غدود قطع برید سے بچ گئے ہین اور وہی آمادۂ فساد ہین۔

مین نے کوشش کی تھی کسی عزیز، دوست، دشمن کو میرے ارادۂ عمل جراحی کی خبر نہ ہونے پائے لیکن مجھے کیا معلوم تھا پردۂ تقدیر نہین بلکہ پردۂ تحریر مین کیا ہے۔ لکھنؤ مین ہمارے دوست اور رفیق کار مسٹر مشیر احمد علوی بی۔ اے (علیگ) ملگئے۔ ایک روز ذرا دیر کے لیے ملاقات ہوئی تھی، تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور پھر ہم دونون رخصت ہو گئے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ہماری آمد اور ارادہ کی خبر لکھنؤ کے کسی روزنامہ مین موجود ہے۔ اب کیا تھا۔ راز کا افشا ہونا تھا کہ احباب و اعزہ صف اندر صف اور قطار اندر قطار چلے آرہے ہین، خطوط اور تار اسکے علاوہ!۔

اب میرا زیادہ وقت موت و حیات کے فلسفہ یا تندرستی و مرض کے نظریہ پر بحث کرنے مین صرف ہوتا تھا کوئی شخص ایسا نہ تھا جسکے ذہن یا تجربہ مین کوئی بات ایسی نہ آئی ہو جو میرے ارادہ کے نامعقول یا نامسعود ہونیکے مقابلہ مین نص قطعی کا حکم نہ رکھتی ہو ایک صاحب نے فرمایا اس قسم کے عمل جراحی سے عہدہ برا ہوتے تو کسی کو دیکھا نہین۔ فلان شخص اپریشن کراتے ہی جان بحق ہوا۔ مین نے کہا میرا ارادہ جان بحق ہونیکا نہین ہے۔ یون اسکو کیا کیجیے گا لوگون کی شادیان بھی ہو جاتی ہین، مر بھی جاتے ہونگے۔ پھر اسکو کیا کیجیے۔ مین ایسی زندگی کو موت سے زیادہ ہولناک سمجھتا ہون۔ جس مین انسان زندگی کے فرائض اور لذاید دونون سے محروم رہے۔ انسان اپنے بیوی۔ بچون، اعزہ اور احباب کی نسبت سے زندگی کو ناچیز یا محبوب سمجھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہین سے خاطر خواہ طور پر عہدہ برآ ہونا کامیاب اور کامران زندگی کی دلیل ہے۔ لیکن اگر مین انکی تقویت یا تفریح کے بجاے انکے لئے بارگران ہو کر رہا۔ مانا۔ انکی ہمدردی اور شیفتگی میرے مریض وجود کو بارگران نہ سمجھے لیکن کیا ہوا اگر مین ہر دم و ہر لحظہ یہ محسوس کرتا رہا کہ یہ صورت حال بدلنے والی نہین ہے اور مین خود تکمیل فرایض کی مسرتون اور خوش آیند توقعات سے لطف اندوز ہونے کے بجاے جو زندگی کی ناگزیر شدایداور تلخیون کو دلچسپ اور محبوب بناتی ہین صرف ایک پیکر حزین یا جسد معطل بنکر رہ گیا جسپر صرف حیات کی درماندگیون کا اطلاق ہوسکے۔ مین بذات خود زندگی کو ایک ذمہ دارانہ تفریح سمجھنے کا عادی رہا ہون اور ہر ایسی حالت یا واقعہ کو جلد سے جلد بھول جانے کا خوگر ہون جو زندگی کے اس مفہوم کا منافی ہو۔ لیکن اندنون مسلسل اور غیر شاعرانہ طور پر بیمار رہنے سے میری طبعی شگفتگی مضمحل ہونے لگی تھی اور یہی سبب ہے کہ مین نے ایک آخری اور قطعی فیصلہ پر پہونچنے کا جلد سے جلد عزم کر لیا۔ اب رہا یہ کہ مین جانبر نہ ہوسکوں گا تو کیا ہوگا۔ بیوی بچون پر کیا گذرے گی۔ یہ صورت حال بھی ایک سمجھدار شخص کے نزدیک ناقابل تسخیر نہ ہونا چاہیے۔ ایک معمول اور مریض شوہر یا باپ اپنے بیوی بچون کے لئے ایک متوفی باپ یا شوہر سے زیادہ حیثیت نہین رکھتا بشرطیکہ وہ اتنی دولت و ثروت کا مالک نہ ہو جو اسکے روزی کمانے یا نہ کمانے سے بے نیاز ہو۔ اور میری حالت ایسی نہین ہے۔ پس میرے نزدیک لوگون کی انتہائی گمراہی یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین کی صلاح و فلاح کا تنہا اپنے آپکو ذمہ دار سمجھتے ہین۔ اگر ایسا ہوتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا یا شاید دنیا اور اسکا نقشہ دونون ناپید ہوتے۔۔ دنیا مین کافی مثالین ایسی ملین گی جسمین

بیوہ اور یتیم کافی عافیت اور شہرت کے ساتھ دادِ حیات دیچکے ہین۔ اسی طور پر کافی مثالین ایسی بھی ملین گی جہان شوہر اور باپ کی موجودگی مین بھی صرف محرومیان حصہ مین آئی ہین۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کی کمزوری ہے اور اسکی بے بنیاد دہشتین ہین جنکے سبب سے اوس نے اپنے مرنیکے عدم جواز مین یہ افسانے اور کمزور دلائل قایم کرلئے ہین۔ مرنے اور بیوی بچون کے چھوڑ جانے کی تو مصیبت عام ہے بہت کم گھرانے ایسے ہون گے جہان یہ ہولناک حادثے نہ پیش آئے ہون گے۔ اگر ہمارے گھر مین یہ مصیبت پیش آنیوالی ہے تو برُا ماننے یا ضرورت سے زیادہ ماتم کرنیکے کیا معنی۔ ایک ایسا سانحہ جو تمام دنیا اور تمام خاندان کے لیئے عام ہے آخر میرے خاندان کے لیے کیون نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر خاندان کی کفیل خود دنیا اور اسکی بوالعجبیان ہین یا اگر ہمارے ناظرین زیادہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال نہ ہون تو مین کہون گا کہ اس مین تھوڑا بہت خدا کا بھی ہاتھ ہوتا ہے اور جب ہم خدا کے قائل ہین تو اسکی واضح یا پُراسرار قدرتون اور مصلحتون کا بھی قائل ہونا پڑیگا۔!!

میرے ایک دوسرے دوست اوستاد اور بزرگ۔ جو مرے خیال مین مجھے اسدرجہ عزیز رکھتے ہین جتنا شاید مین کوشش بھی کرون تو خود انکو یا کسی دوسرے کو عزیز نہین رکھ سکتا یا جس حد تک وہ میرے لئے قربانی یا ایثار کرسکتے ہین مین انکیلئے نہین کرسکتا اور نہ شاید آمادہ ہوسکتا ہون، مرے اس ارادہ کے موئید تھے لیکن مین محسوس کرتا تھا کہ اُن کا عزم و استقلال محبت یا بشریت کی بنا پر مرے اس ارادہ سے کبھی کبھی متاثر اور متزلزل ہوجاتا تھا۔ چنانچہ مین نے ایک موقعہ پر بسبیل تذکرہ انسے عرض کیا کہ آپ دیکھتے ہین۔ مرض کی آئے دن کی مصیبت کیسی تلخ ہے آپکو یہ بھی معلوم ہے اس صورت حال کے ماتحت زندگی کا کوئی مقصد نہین رہ جاتا۔ آپ جانتے ہین اب اس کا علاج صرف اپریشن رہ گیا ہے۔ رہا یہ کہ عمل جراحی کامیاب ہوگا یا ناکامیاب۔ بصورت اول فہو المراد، بصورت دیگر یہ دیکھنا ہے کہ اس انجام کا کیا انجام ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک آخری انجام بر وقوف نہ ہو اس پر حکم لگانا بے محل اور غلط طریقہ کار ہے۔ آخری انجام ایک ایسا سلسلہ لامتناہی ہے جسکی کسی کو خبر نہین۔ موت ہو یا زندگی یا کوئی بھی واقعہ کیون نہ ہو وہ انجام نہین ہے بلکہ صرف ایک جدید آغاز۔ ساری دنیا ایک مسلسل آغاز ہے انجام اسکے ہاتھون مین ہے جو آغاز مطلق اور انجام مطلق دونون ہے یا دونون سے بے نیاز! اس لئے میرے نزدیک انجام کو غیر معمولی اہمیت دنیا اور وہ بھی ایسا انجام جو صرف چندروزہ ہو غیر ضروری اور غیر دانشمندانہ ہے لیکن فلسفہ اور آلہیات کی پیچیدگیون سے طبیعت اکثر سکون وتسکین نہین حاصل کرتی اس لئے اس مسئلہ پر صرف دنیاوی نقطہ نظر سے بھی غور فرمایئے۔ مین قسمت کا قائل ہون اور یہان مین قسمت کے آلہیاتی یا مذہبی مفہوم سے نہین بلکہ معنوی مفہوم سے بحث کرنا چاہتا ہون۔ میرے نزدیک قسمت نام ہے صرف "حصہ" یا "تقسیم" کا یعنی ہر شخص کو دنیا کی نعمتین اور دنیا کی محرومیان تقسیم کردیگئی ہین۔ مساوی اور عدم مساوی کا سوال نہین ہے۔ کسی شخص کو تندرستی۔ کسی کو دولت وقناعت، کسی کو ہمت وحیا، کسی کو زن وفرزند، کسی کو علم وفضل، کسی کو قبول عام ارزانی کیا گیا ہے۔ اسیطور پر محرومیان اور نامرادیان بھی حصہ مین آئی ہین، عام طور سے ہمکو جو

جو نعمت حاصل ہوئی ہے اور کوئی شخص ایسا نہین ہے جسکو کوئی نعمت حاصل نہ ہوئی ہو اسکو بالعموم ہم نظر انداز کر دیا کرتے ہین اور دوسرونکو جو نعمت حاصل ہے اسکو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہین حالانکہ دنیا کی مجموعی نعمتین مجموعی طور پر کسی کو کبھی نصیب نہین ہوئین اور نہ ہونگی اور بالفرض نصیب بھی ہوئین تب بھی میرا خیال ہے آپ اُسکو مطمئن نہ پائینگے۔ زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ فطرت کی طرف سے انسان کو جو نعمت عطا کی گئی ہو اُسپر قناعت کرے - اِن سے جایز طور پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائے اور دوسرون کو فائدہ پہونچائے -

اب مجھے دیکھیے - آپ میرے سوانح زندگی سے واقف ہین خدا نے علم کی دولت عطا فرمائی - کھانے پینے سے خوش رکھا - جان نثار احباب و اعزہ دئے، شہرت و قبول عام ارزانی فرمایا، مجموعی اور انفرادی طور پر یہ نعمتین ایسی ہین جنکے وجود وحصول پر ہر سمجھدار انسان کو شکر گذار ہونا چاہیے - میرے استاد محترم مولنا حاجی سید سلیمان اشرف صاحب جب پچھلے سال حج کے لیے تشریف لے گئے تھے تو کتنون نے آپ سے فرمائش کی تھی کہ خانہ کعبہ مین پہونچکر انکے مختلف امور دینی یا دنیادی کے بارہ مین دعا فرمائیگا - مولنا محترم کے پاس مین نے ایک عریضہ بھیجا تھا اور یہ استدعا کی تھی کہ حریم قدس مین میری طرف سے یہ عرض کر دیا جائے کہ اے خدا تیرا ایک ناچیز بندہ تیری دی ہوئی نعمتون کا شکر گذار ہے - وہ مانگتا نہین، اس کا صرف سجدۂ شکر قبول فرمایا جائے - آپ یقین فرمائین مین اپنی زندگی کو کامیاب سمجھتا ہون، اب اگر پیام رحلت آگیا ہے تو گھبرانا بے معنی ہے - ابتک خدا نے ہر خجالت و مصیبت سے محفوظ رکھا ہے، معلوم نہین آیندہ کیا پیش آئے، اِسوقت تک میری زندگی جیسی کامیاب اور مسرور گذری ہے وہ غالبًا میرے بعد میرے احباب اعزہ اور ملک و ملت کے لئے ایک سرمایہ نیک ہوگی اس کے علاوہ اور کیا چاہئے، دوسری طرف اگر اس مرض کو میری زندگی کا دردناک پہلو تصور فرمائے تو اِس حقیقت کو بھی مدنظر رکھئے کہ مین اس مرض کی شدت اور سختی کے باوجود ہمیشہ غیر معمولی طور پر شگفتہ اور بشاش رہا ہون اور یہی نہین بلکہ جو لوگ مجھ سے وابستہ رہے ہین انکو بھی شگفتہ اور بشاش رکھ سکا ہون - پھر اس مرض کو عذاب جان یا میری زندگی کی محرومی کیون تصور فرمائے اچھا اِن سب کو جانے دیجیے - وہ لوگ جو مرض اور ازالہ مرض کے بارہ مین ماہرین فن کا درجہ رکھتے ہین اونکی راے ہے کہ اپریشن ہوجانا چاہئے - اسلئے جہانتک دنیادی تدابیر میری جان بچانے اور مرض کے دفعیہ کے لئے کیجا سکتی ہین وہ کیجائینگی - بہت ممکن ہے جانبر ہوجاؤن، پھر اسوقت کی خوشی اور شادمانی کا کون اندازہ کرسکتا ہے -

قصہ مختصر، ہم یورپین وارڈ کے ایک کمرہ مین پہونچ گئے -

وہ مرا پہلے پہل داخل زندان ہونا!

نہایت پاکیزہ کمرہ، پاکیزہ سامان، پاکیزہ بستر، پاکیزہ زمین اور ان سب سے زیادہ پاکیزہ سامان قطع برید اور مرہم پٹی جو نہایت کثرت، نہایت اہتمام اور انتہائی خوش سلیقگی کے ساتھ ایک میز پر ہمارے پذیرائی کے لئے موجود تھا - غسلخانہ

انگریزی طرز کا بنا ہوا، نہایت صاف ستھرا۔ کھانے کے لئے مرغ، دودھ، مکھن، توس، انڈے، غرض ہر قسم کے حوائج ضروری یا غیرضروری سامان، کافی اور کافی سے زیادہ۔ لیکن ابھی بعض اور سہولتون کی تلاش وتحقیق کی طرف طبیعت مائل ہونے والی ہی تھی کہ جیتر ہیاڑ کے سامان دیکھکر اوسان خطا ہوگئے۔ اتنے مین ایک سیم فام، سفید پوش۔ شیرین کام لیکن تلخ کار نرس داخل ہوئی اور قبل اس کے کہ مجھ سے کوئی اضطراری فعل سرزد ہو اسنے منہ مین تھرمامیٹر ڈالدیا، نبض ہاتھ مین لے لی اور تنفس کا معائنہ شروع کردیا۔ تھوڑی دیر مین تھرمامیٹر نکالکر کہا ملیریا کے مریض ہو مین نے کہا نہین بعض اعضاء رئیسہ کا، فرمایا حرارت ہے! مین نے کہا مجھے تو محسوس نہین ہوتی شاید اس فضا یا میرے بودے پن کا اثر ہو، غرضکہ پھر تھرمامیٹر لگایا گیا اب مین بھی حواس مین آچکا تھا۔ چنانچہ حرارت اور بات دونون آئی گئی ہوئی۔

۳ بجے سے ۵ بجے تک ہر روز دن مین کئی کئی بار یہ ہی مشغلہ رہتا۔ مڈیکل کالج مین جتنے طلبہ اور ڈاکٹر تھے ایکبار سب آکر مجھ عجوبۂ روزگار کو دیکھ جاتے، مرض کی داستان سناتے سناتے اور تلئین وعمل لیتے لیتے بدحواس ہوگیا۔ میرا خیال خیال ہے محض اس احتیاط کو مدنظر رکھکر کہ کوئی مریض کسی شاعرانہ حماقت کا مرتکب ہوکر اسپتال کے ڈسپلن مین مخل نہ ہو، ارباب میڈیکل کالج اس قسم کی بعض غیر شاعرانہ تدابیر اختیار کرتے رہتے ہین اور یہ تلئین وعمل اسی کا ایک شاخسانہ ہے، اپریشن سے ایک روز پہلے گروہ اور مضافات گردہ کا بپتسمہ ہوا، یعنی سب سے پہلے رسمًا حجامت بنائی گئی اس کے بعد مختلف اقسام کے عروق اور روغنیات کی مالش کی گئی اور پھر روئی اور گاز رکھکر عمامہ باندھ دیا گیا۔ یہی دستار فضیلت کل اپریشن تھیٹر مین اُچھالی جانے والی تھی۔ اپریشن کے قبل کے مراحل ومراسم خود اپریشن سے زیادہ ہراس آفرین ہوتے ہین اور یہ کوئی نئی بات نہین ہے مصیبت کی آمد کا تخئیل (یا حالت منتظرہ) نمودار اور مصیبت سے زیادہ پریشان کن ہوتا ہے۔ چنانچہ جس روز اپریشن ہونیوالا تھا اسکی صبح ہر آنے والے نے بشارت دی کہ آج اپریشن ہوگا، ڈاکٹرون نے دلاسا دیا، نرسون نے پوچھا ڈرتے تو نہین، بعض صاحبون نے کہا "شاباش" اور کسی نے صرف "افسوس" پر اکتفا کیا۔ اعزہ پریشان اور افسردہ تھے دوستون پر یاس طاری تھا۔ ڈاکٹر اور نرسین مستعد اور آمادہ کار نظر آتی تھین۔ مجھے نوٹس دیا گیا کہ دس منٹ کے اندر تیار ہوجاؤ۔ مین نے وضو کیا۔ دو رکعت نفل ادا کی اور دعا مانگی، خدایا جو کچھ تو کر رہا ہے وہ بلکل صحیح اور درست ہے۔ اب تک تو نے مجھپر جو احسان وکرم کیا ہے تو علیم ہے مین کتنا شکر گذار ہون۔ ایک تمنا یہ البتہ ہے کہ اگر یہ آخری وقت ہے تو میری یاد کو مجھ سے محبت کرنے والون کے لئے آسان کر دے، زندگی مین مین نے تجھے اکثر بھلایا ہے اس کے گواہ بہت ملین گے لیکن اس وقت صرف تجھے یاد کر رہا ہون اس کا گواہ صرف تو ہے، اس کے بعد ایک ڈاکٹر نے آکر مارفیا کا انجکشن دیا اور دو خدمتگار دن نے بیمار دہکی کرسی پر بٹھاکر اپریشن تھیٹر پہونچا دیا۔

کرسی سے اوترکر اپریشن تھیٹر مین داخل ہوا۔ جو میز بتائی گئی اوس پر لیٹ گیا، سرہانے سے ایک ڈاکٹر نے کلوروفارم دینا شروع کیا۔ مین نے سوچا دیکھون کلوروفارم کا اثر کسطور پر ہوتا ہے اس لئے یہ ارادہ کرلیا کہ بے ہوش

ہونے میں عجلت سے کام نہ لوں بلکہ کلوروفارم کے اثر کی مدافعت کروں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ۳-۴ منٹ تک کلوروفارم دیا گیا اور دماغ پر کچھ اثر نہیں ہوا البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز حلق میں رہ رہ کر اٹکتی ہے اور سوزش پیدا کرتی ہے اس لئے میں نے دو دفعہ سر کو ایک طرف جھٹک بھی دیا۔ لیکن پھر میں نے خیال کیا کہ یہ تجربہ کچھ پُرلطف یا دلچسپ نہیں ہے اور مجھے کلوروفارم کا اثر قبول کر لینا چاہئیے چنانچہ میں نے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا اور ایک ہی سکنڈ میں یہ معلوم ہوا گویا دماغ دُھنی ہوئی روئی کے مانند تھا اور اس میں آگ لگا دیگئی پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا۔

آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو کمرے میں پایا۔ تکیوں کے سہارے تقریباً ۱۳۰ درجہ کے زاویہ پر لٹا دیا گیا تھا۔ سر پر سرو پانی میں تر کیا ہوا تولیہ لپیٹا ہوا تھا نہ اپریشن کی کوئی تکلیف تھی اور نہ کلوروفارم کا کوئی مخصوص اثر۔ میں نے دو اسپیشل نرسین بھی رکھ لی تھیں جن سے دریافت کیا۔ اپریشن کیسا ہوا۔ جواب ملا نہایت کامیاب اور خاموش ہو جاؤ۔ مجھ پر بھی کچھ تکان سی غالب تھی تھوڑی دیر میں غافل ہو گیا یا سو گیا۔ سہ پہر میں آنکھ کھلی تو اپنے چھوٹے بھائی کو جنکو ہمہ وقت ساتھ رکھنے کی پہلے سے اجازت لے لی گئی تھی پٹی سے لگا ہوا بیٹھا پایا۔ کچھ دیر تک اپریشن کا حال پوچھتا رہا۔ پیاس غالب تھی۔ چند قاشیں سنترہ کی کھائیں اور پھر سو رہا۔ رات ہوئی اور تکلیف میں اضافہ ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے گردہ کے مضافات کی رگیں آتش سیال بن گئی ہیں اور درد گردہ عود کر آیا ہے۔ یہ تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ یہانتک کہ ایک ڈاکٹر اور نرس نے آکر مورفیا کا انجکشن دیدیا اور پھر صبح تک غافل رہا۔ یہ حالت صرف شب میں تین چار دن تک رہی اور دو روز مارفیا کا انجکشن لیتا رہا لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ سونے کے لئے منوم یا منشی چیزوں کا عادی ہونا مضر ہے۔ اس لئے اسکی کوشش کرو کہ نیند خود بخود آجایا کرے۔ چنانچہ اس کے بعد پھر نیند آنے کے لئے نہ کوئی انجکشن لیا گیا اور نہ کوئی اور دوا استعمال کی گئی۔ دو تین راتیں نہایت تکلیف سے گذریں۔ میں نے اپنی تکالیف کا سبب پوچھا تو ڈاکٹروں نے جواب دیا یہ سب متعلقہ متاذی یا متاثر ہونے والے اعصاب کا کرشمہ ہے چونکہ گردہ کا اپریشن ہوا ہے اس لئے متعلق جتنے اعصاب ہیں ان میں اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کیفیت محض عارضی ہے کچھ عرصہ میں خود بخود زائل ہو جائے گی۔ باوجود اسکے تین چار دن تک میں نے آہ و بکا اور اظہار مایوسی اور واماندگی میں کچھ ایسی بدمزاقی کا بھی ثبوت دیا کہ تیماردار پریشان ہو گئے اور نرسوں و ڈاکٹروں نے کبھی کبھی کسیقدر درشت لہجہ میں میری خبر بھی لی۔ ایکدن صبح ڈاکٹر صدیقی اور ڈاکٹر ظریف صاحبان نے پوچھا کہ رات میں آخر میں اسدرجہ تکلیف وہ کیوں ہو جاتا ہوں۔ میں نے کہا بات یہ ہے کہ آپ لوگوں نے گردہ کو تو بلکل «آنجہانی» کر دیا اب ماتم گسار اعصاب کے حلقہ سے انکے دیرینہ رفیق کار کا «شور ماتم» اٹھتا ہے تو آخر شریک ماتم ہونے والا بھی کوئی ہو۔ یہ فرض مجھے ادا کرنا پڑتا ہے۔ چار یا پانچ دن کے بعد ہر تکلیف میں تخفیف شروع ہو گئی غالباً ساتویں دن ٹانکے علیٰحدہ کر دیے گئے اور تقریباً کوئی تکلیف وہ شکایت باقی نہیں رہی۔ میں خود اٹھنے بیٹھنے لگا۔

تھوڑا بہت کمرہ مین ٹہلنے بھی لگا اور - خوب کھانے پینے لگا -

اب ہمکو اجازت دیدی گئی تھی کہ "کھاؤ پیو اور ٹہلو"، چنانچہ سب سے پہلے مین نے خربزے کی فرمائش کی - موسم گرما اور خربزے دونون شباب پر تھے خربزے نہایت لطف سے کھائے گئے - دوستون اور اعزہ نے کھانے پینے کی چیزین خوب خوب بھیجین اور مین نے بھی انتہائی انتقامی جذبہ کے ساتھ انکی پذیرائی کی بیماری اور پرہیز میرے لئے ہمیشہ لازم ملزوم رہے، لیکن کوئی سلیم المذاق انسان ہندوستانی علاج و پرہیز سے عرصہ تک ہم آہنگ نہین رہ سکتا - اسلئے تھوڑی سی غور و فکر کے بعد مین ہمیشہ دوا اور پرہیز مین ایک حد اوسط یا مفاہمہ قائم کر لیا کرتا تھا - مثلاً ایک حکیم صاحب نے بتایا کہ پیٹھے کو کچل کر گردہ پر ضماد کیا جائے اور اس کا عرق پی لیا جائے - اس سے مین نے یہ نتیجہ نکالا اور اسپر کاربند بھی رہا کہ پیٹھے کی مٹھائی براہ راست کھائی جا سکتی ہے - ایکدن مین نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ لوگ لکھنؤ مین رہتے ہین اور ہر قسم کے امراض اور ادویات پر غور کیا کرتے ہین، کبھی اس سلسلہ مین لکھنؤ کا خربزہ بھی آپ کے ذہن مین آیا - آپ جانتے ہین آجکل ہر قسم کے علاج دنیا مین رائج ہین - کوئی پانی سے علاج کرتا ہے، کوئی دودھ سے، کوئی آفتاب کی شعاعون سے کوئی نمک سے کوئی فاقہ سے - کیا آپ مین خدا کا کوئی بندہ ایسا نہین پیدا ہوا جو امراض کا نہ سہی مریضون کا علاج، داخلی اور خارجی ہر قسم کے خربزون سے کرتا - کھانا، پینا، سینکنا، باندھنا سب کچھ خربزون سے کیا جاتا مثلاً ضماد، تکمید وغیرہ ہین علیگڑھ کے خربزون سے ہوتی، اور کھانے پینے مین لکھنؤ، جونپور یا ٹونک کے خربزے استعمال مین آتے!

میرے نزدیک ہسپتال سے زیادہ تکلیف دہ کوئی مقام نہین ہوتا - اس اعتبار سے نہین کہ وہان انسان کو رہنے سہنے کی کوئی تکلیف ہوتی ہے بلکہ محض اس بناء پر کہ یہان ہر ہر قدم پر ہر سمت اور ساری فضا مین سوا افسردگی، یاس، نالہ و شیون کے نہ کچھ نظر آتا ہے نہ کچھ اور محسوس ہوتا ہے درماندہ مریض اور حزین تیمارداروں کے تکلیف دہ منظر کو تندرست ڈاکٹر اور غالباً تندرست ترنرسون کی مستعدی اور کبک خرامی اور زیادہ وحشت یا افسردہ کن بناتی ہے - صفائی اور ستھرا پن میرے نزدیک بہترین چیزین ہین - لیکن ہسپتال اور جیل خانہ کی صفائی اور ستھرا پن میرے لئے اکثر وحشت انگیز ہوتا ہے مفصلات کے ہسپتال تو یون بھی کچھ معمولی اور ناصاف ہوتے ہین - وہان مرض اور مریض کا احساس نہ زیادہ قوی یا موثر نہین ہوتا لیکن لکھنؤ میڈیکل کالج جسکی عمارت اور ساز سامان کو دیکھکر زیادہ صحیح معنون مین لکھنؤ ہی کے ایک مشہور شاعر کا شعر،

یہ کس رشک مسیحا کا مکان ہے　　زمین جسکی چہارم آسمان ہے

بے اختیار یاد آ جاتا ہے - میرے نظریہ کی ایک بین مثال ہے - ہر شخص پر نفسی نفسی کا عالم طاری ہوتا ہے کہین آہ و زاری ہے کہین نالہ و شیون اور کہین پر محض ایک گورستانی سکوت! -

لیکن اس کا دوسرا پہلو اتنا ہی تابناک اور قابل قدر بھی ہے۔ عرفی کو آستانۂ محبوب سے

ہم شوق آمدہ بودم ہم حرمان رفتم

کہتے ہوئے پلٹنا پڑا تھا لیکن ہسپتال بالخصوص لکھنؤ میڈیکل کالج کی حیثیت بلکل مختلف ہے۔ یہان مایوس آتا ہے اور بالعموم شادمان واپس ہوتا ہے مشرقی شاعری یا دنیائے محبت مین چونکہ شاعر کو یہ حالت وحیثیت کبھی نصیب نہین ہوئی کہ وہ دیار محبوب مین مایوسانہ داخل ہوتا اور کامران واپس ہوتا اس لئے کافی غور فکر کے بعد بھی مجھے کوئی شعر یا مصرعہ ایسا یاد نہ آیا جو عرفی کے مصرعہ کا جواب ہوتا۔

اس عمل جراحی کے بعد اکثر سوچتا ہون کہ موجودہ سائنس اور ایجادات نے فن جراحی کو کس حیرت انگیز درجہ تک بلند اور کامیاب بنا دیا ہے اور ایک کامیاب اور ماہر فن سرجن کو اپنی استعداد اور اپنے فن کی کامیابی کا کیسا یقین محکم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بھاٹیا صاحب لکھنؤ میڈیکل کالج کے چیف سرجن ہین۔ انھون نے مجھے دیکھا اور حال سنا۔ کچھ دیر تک سکوت مین رہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی انکو مرض کی تشخیص پر پورا عبور نہین ہوا ہے تھوڑی دیر کے بعد کہا اچھا کپڑے اتار دیجئے اور ایک کوچ کی طرف اشارہ کرکے کہا اسپر لیٹ جائیے۔ انکے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مرض کی تہہ تک پہونچ جانے کا عزم کر چکے ہین۔ کچھ دیر تک صرف نظری جایزہ لیتے رہے۔ اسکے بعد جو ہاتھ ڈالا ہے تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا مرض کو اپنے آہنی پنجہ مین گرفتار کر لیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر مین ایک مخصوص فاتحانہ لیکن دلنشین انداز تبسم کے ساتھ اپنا فیصلہ اس طور پر صادر کیا گویا تشخیص مرض ایک بہت معمولی سی بات تھی اور انکا غیر معمولی عارضی انہماک کچھ غیر ضروری سا تھا۔ حکیم عبدالمعید صاحب قبلہ جنکے خلوص، محبت اور ایثار وانسانیت کا مین اتنا ہی معترف ہون جتنا ایک شریف انسان کا شکر گذار قلب ہو سکتا ہے، ہمراہ تھے اس مرض کی نوعیت پر گفتگو فرمانے لگے۔ یہ مکالمہ کچھ فنی اور اصطلاحی حیثیت کا تھا جسکو مین پورے طور پر نہ سمجھ سکا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اپریشن کر دیا جائے۔ مین نے دریافت کیا یہ آپریشن اندیشہ ناک ہوگا یا اُمیدافزا، ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر فرمایا ہر اپریشن خواہ جسم انسانی مین سوئی ہی چبھونا کیون نہ ہو اندیشہ سے خالی نہین لیکن آپ مطمئن رہین کامیابی کی پوری توقع ہے۔ میرے نزدیک میری تشخیص مکمل ہے اور چونکہ مین دیر مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون اس لئے اُس پر نظر ثانی کرنے کے لیے آمادہ نہین ہون۔ چنانچہ بعد مین اکس ریز فوٹو اور قارورہ وغیرہ کے کیمیائی تحلیل اور جراثیمی امتحان نے ڈاکٹر صاحب کی تشخیص کی پورے طور پر تصدیق کی۔

بہرحال اپریشن ہوگیا اور جتنی کلفتین تھین وہ بھی گردہ کے ساتھ لکھنؤ میڈیکل کالج کے عجائب خانہ مین منتقل کر دیگئین۔ مجھے تعجب ہے جسم انسان کے اندر سے کسی حصہ ماؤف کو اس طور پر علٰحدہ کر دینا کہ نظام جسمانی مین کوئی خلل نہ آئے بلکہ وہ ذریعۂ راحت بجائے کتنا نازک، اہم، اور مشکل کام ہے جسے انسانی ذہن وفکر نے کسدرجہ آسان بنا دیا ہے۔ ۲۵ منٹ تک کلوروفارم کی ماتحت بیہوش رکھنا اور پانچ چھ انچ لمبا شگاف دیکر ایک گردہ کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا اور پھر زخم کو ٹانکے دیکر مریض کو ہوش مین لانا اور ساری تکالیف سے آزاد کر دینا کسدرجہ حیرت انگیز ہے۔

بعد مین معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بھاٹیا صاحب کیلئے اس قسم کے اپریشن محض ایک تفریحی حیثیت رکھتے ہین۔ یہی نہین بلکہ یہان آنے پر معلوم ہوا کہ پسلیون کو تراشکر پھیپھڑے پر عمل جراحی کر دینا اور پچکاری کے ذریعہ سے پیپ اور مادہ فاسد کو نکالدینا بھی یہان ہوتا رہتا ہے۔ اور ڈاکٹر بھاٹیا صاحب کے نزدیک۔

ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

کا مصداق ہے۔ بذات خود مین ڈاکٹر صاحب کے کمال فن کا اتنا ہی قائل ہون جتنا ملیریا کے علاج مین کونین کا یا عورتون کے ناقص العقل ہونے کا!

میری روزانہ دیکھ بھال کے انچارج ڈاکٹر صدیقی صاحب ام۔بی۔ایس تھے اور روزانہ کے ملنے والے ڈاکٹر ظریف صاحب (علیگ) ام بی۔بی۔ایس۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب کے بارہ مین میرا خیال ہے کہ کسی وقت وہ ذہانت اور خود اعتمادی مین اپنے استاد ڈاکٹر بھاٹیا صاحب سے کم نہ ہونگے۔ لیکن ابھی اسمین اتنا ہی عرصہ لگے گا جتنا کہ۔ ایک شاعر کے نزدیک ”فتنہ“ کو ”قیامت“ مین تبدیل ہونے کیلئے درکار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی کو مین نے اپنے بے بنیاد اندیشہ ناکیون لیکن صحیح شکایات مرض سے کافی پریشان کیا۔ اور انھون میرے اس قسم کی حماقت رائیون کا مضحکہ بھی خوب اُڑایا ہے۔ مین چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو وہ بیمار پڑگئے اور ملیریا کے شکار ہوکر میرے ہمسایہ بنگئے۔ ڈاکٹر صدیقی کی تندرستی کچھ اسدرجہ ”ادہوڑی استر“ واقع ہوئی ہے کہ انکو ۱۰۲ درجہ کا بخار تھا اور خبر نہ تھی کہ بخار ہے۔ کہنے لگے مین عمر بھر بخار مین مبتلا نہین ہوا۔ اس لئے مجھکو احساس ہی نہین کہ بخار کیا چیز ہے اور کیسطرح محسوس کیا جاتا ہے۔ مجھے ان سے خاص طور پر دلچسپی وأنس ہے اور اس کا سبب انکا شگفتہ مزاج، غیر معمولی طور پر محنتی اور ٹنیس کا شایق ہوتا ہے۔

ایسے لوگون کو دیکھکر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ قضا وقدر کو مرض کی تقسیم مین زیادہ خوش مذاقی کا ثبوت دینا چاہیے ایک شگفتہ، آزاد اور وارستہ مزاج شخص کو صاحب فراش بنا دینا یقیناً بے معنی اور بد مزاقی ہے۔ ان لوگون کا کام مرض مین مبتلا ہونا نہین ہے۔ اس قسم کے لوگ تو صرف خوش رہنے اور خوش رکھنے کے لئے بنائے گئے ہین۔ ایک شخص جو زندگی اور معاشرت کے پابندیون سے آزاد ہے یعنی وہ جب چاہے کھائے پیے اور جب چاہے سو جائے، کام کرنے اور نہ کرنے مین کوئی چیز خلل انداز نہ ہوتی ہو۔ موقعہ پڑا تو وہ دھوپ اور لُو مین باہر گھوم رہا ہے اور جی چاہا تو تمام دن رات پڑا سو رہا ہے۔ کھانے پینے کو جو کچھ ملا کھا پی لیا نہ اسکی شکایت کہ کھانا بُرا تھا یا دیر ہضم تھا اور نہ اسکی پرواہ کہ بہت اچھا تھا۔ نہ لباس کا غم اور نہ اچھے دھوبی اور نہ درزی کی تلاش۔ کبھی اس عالم مین ہے کہ نوکر پانی لائے اور گلاس منہ کو لگادے تو پانی پیا جائے اور کبھی ضرورت پیش آئے تو کوئین سے پانی کھینچ لانے مین بھی باک نہین۔ ایسے لوگون کو بیمار ڈالدینا۔ انکی اور مرض دونون کی توہین ہے اور یہ صرف ”ہرن پر گھاس لادنے“ کا مرادف ہے۔

بیمار ایسون کو ہونا چاہئے جو ہر چیز کا ایک پروگرام رکھتے ہون - ہر چیز مین احتیاط کے پابند ہون - برف نہین ہے تو زندگی دشوار وقت سے سونا یا کھانا نہ ملا تو چین بجبین - نوکر موجود نہ ہوا تو عضو معطل - دھوبی اچھا نہ ملا تو مکدر - درزی نے کپڑے خراب تیار کئے تو جامہ سے باہر - کسی نے تعریف کردی تو پھولے نہ سمائے اور کسی نے بُرا کہدیا تو شمشیر برہنہ - ڈرائنگ روم بھی ہے اور فرش فروش بھی، پنکھا بھی ہے اور حقہ بھی - اجابت کھُل کر آئے تو زندگی دلچسپ اور ایسا نہ ہوا تو زندگی اور زندگی کے ساری متعلقات بلا جان ایسے لوگ بیمار پڑین تو بیماری کا پورا احترام بھی ہو - صاف بستر، صاف تولیہ صاف میز پوش - کہین سوڈا واٹر کی بوتلین بھیگ رہی ہین اور کہین چینی کے ظروف مین آش جو اور شوربہ رکھا ہوا ہے، ایکطرف سنترے رکھے ہوے ہین دوسری طرف دوا کی شیشیان چنی ہوی ہین ایک جانب دد کھِل پڑنے،، کے لیے "حاجتی" لگی ہوی ہے ا ایک شخص پنکھا جھل رہا ہے دوسرا مکھیان، ہانک رہا ہے تیسرا ڈاکٹر یا حکیم کو بلانے جا رہا ہے - چوتھا دروازہ پر بیٹھا اونگھ رہا ہے - کمرے مین سناٹا ہے اور تقریبًا ایک درجن دوست احباب اعزہ چارپائی کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے ہوئے ہین، مریض نے کروٹ کا ارادہ کیا اور ان مین سے ایک نے اُچک کر گلے مین یا کمر کے نیچے ہاتھ دیدیا - مریض نے بات کرنے کے لیے ذرا مونہہ کھولا اور ان مین سے کسی نے آش جو سنبھالا اور کسی نے سنترہ کی قاب اور تیسرے نے اپنا کان مریض کے لبون سے لگا دیا - بقیہ نے ایکدوسرے کو آنکھ اور انگلی کے اشارہ سے دم بخود رہنے کی تاکید کی - غرضکہ یہ بیماری کے لطایف و ظرایف ہین - اور بیمار انہین لوگون کو ہونا چاہئے جو بیماری کے رکھ رکھاؤ پر قدرت رکھتے ہون -

ڈاکٹر ظریف تو علیگڈھ کے گنہگارون مین سے ہین - انکے بارہ مین کیا کہنا - وہی خلوص، وہی آزادی، وہی بے تکلفی اور رواداری جو ایک علیگڈھ والے کو دوسرے علیگڈھ والے سے ہے - وہ جب کبھی آجاتے تھے تو پھر کیا تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہین اور نہ مین مریض - وہی علیگڈھ ہے - وہی بیفکری ہے اور وہی فضا اور وقت، دلجمعی ہے اور خوش گپی - مجھے اُن لوگون پر ترس آتا ہے جو علیگڈھ مین طالب علمانہ زندگی نہین بسر کر سکے ہین - علیگڈھ کے واقف کار،، اور ہمدرد" بنکر اس پر اعتراض کرتے ہین - اِن سے کوئی پوچھے کہ تم علیگڈھ کے مستون سے کیا واقف تمکو کیا معلوم اس نام مین کیا جاذبیت ہے - اور یہ نام کیسا محبوب ہے! بعض کہین گے دیکھتے نہین آج خود علیگڈھ والے علیگڈھ کو بُرا بھلا کہتے ہین، مین کہتا ہون یہ تمھاری کم فہمی اور سطحیت ہے جو ایسا کہتے ہو کوئی علیگڈھ والا علیگڈھ کو بُرا نہین کہتا کیونکہ وہ ایسا کر نہین سکتا - وہ علیگڈھ والونکو بُرا کہتا ہوگا اُس کے اور اسباب ہین جنپر یہان اظہار خیال کی ضرورت نہین اور کالج سے کون منحرف ہو سکتا ہے - کسی علیگڈھ والے کے سامنے علیگڈھ کا نام لیجیے پھر دیکھئے وہ چشم زدن مین کیا سے کیا ہو جاتا ہے - وہ اپنے مصائب اور مناصب سب کچھ بھول جائے گا - اور تھوڑی دیر کیلئے اس کا تصور اسکو زمان و مکان سے آزاد کر کے اُسے مادر کالج کی آغوش مین پہونچا دیگا - وہی کمرے وہی ڈائننگ ہال

وہی مسجد، وہی یونین، وہی کچی بارک، وہی کرکیٹ فیلڈ، وہی شرارتین، وہی صحبتین، وہی بیفکری، سب کچھ وہی جس سے وہ اب دور ہے۔

آنکھین اسکو ڈھونڈھتی ہین دل اس کا گردیدہ ہے

مین خود جب علی گڑہ سے باہر گیا اور کسی علی گڈہ والے سے ملاقات ہوئی تو کچھ ایسا معلوم ہونے لگا گویا خود کالج مین ہون۔ اور اب مجھے اجنبی یا غریب الدیار محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہین ہے سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ایک علیگڈہ والا دوسرے علی گڈہ والے سے ملتا ہے تو پھر بالعموم اسکو تکلف رکھ رکھاؤ یا تصنع کی ضرورت نہین محسوس ہوتی یہی نہین بلکہ ان چیزون سے نفرت ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا ہم دونون ایکدوسرے کے پشتہا پشت سے واقف ہین۔ اس کا یہ مطلب نہین کہ ایکدوسرے کی کمزوری یا اس کے خاندانی حالت سے واقف ہوتے ہین بلکہ علی گڈہ بجائے خود ایک "قومیت" ایک "خاندان" معلوم ہونے لگتا ہے اگر ایک وایسرائے ہے اور دوسرا محض ایک کلرک لیکن دونون "پروردۂ علی گڑہ" ہین تو اس طور پر ملین گے یا ملنے کا جی چاہیگا گویا دونون ایک سطح پر ہین وہی سطح جو علی گڈہ نے قائم کی ہے!

بات مین بات نکلتی آتی ہے مین ایک وقت سفر کر رہا تھا، انبالہ کے اسٹیشن پر آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کوئی بزرگ نوٹ اور روپیون کا بٹوا میرے تکیہ کے نیچے سے نکالکر فرار ہو گئے ہین۔ مجھے جلد سے جلد منزل مقصود پر پہونچنا تھا اب ایک ایسے اجنبی مقام پر یہ حادثہ پیش آیا کہ تھوڑی دیر کے لیئے مین پریشان ہو گیا۔ مین کا لکا پر اتنی دیر کے لیئے بھی نہین ٹھہر سکتا تھا کہ روپیون کے لیئے علی گڈہ تار دیتا۔ معاً خیال آیا دیکھون کوئی علی گڈہ والا تو سفر نہین کر رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر اتر کر دو ہی چار قدم گیا ہونگا کہ ایک صاحب میرے ہی طرف آتے نظر آئے۔ معمولی علیک سلیک کے بعد مین نے دریافت کیا آپ علی گڈہ سے آرہے ہین۔ فرمایا۔ ہان، مین نے کہا جا کہان رہے ہین، کہنے لگے شملہ بھائی کے پاس۔ مین نے پوچھا مجھے پہچانتے ہین کہا۔ جی ہان۔ مین نے کہا میری نقدی کوئی صاحب لے کر چلدیئے۔ آپ کے پاس جتنے روپے ہون مجھے دیدیجئے۔ آپکو علیگڈہ سے روپیہ پہونچ جائے گا۔ چنانچہ انھون نے کافی روپے دیدئے۔ مین نے علیگڈہ خط لکھدیا اور روپیہ اونکے پاس شملہ پہونچ گئے، اور ساری تشویش لمحہ بھر مین ختم ہو گئی۔

"داخل ہسپتال" مریضون کی دیکھ بھال تقریباً تمام تر نرسون (Nurses) سسٹر (Sisters) اور میٹرن (Mat… کے سپرد ہے اور یہ اپنے فرایض کو اس خوبی، تندہی اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتی ہین کہ بیان سے باہر، انکی جفاکشی اور احساس ذمہ داری، نفاست، اور خوش سلیقگی کا اثر مجھپر نہایت اچھا اور گہرا پڑا ہے انکو سخت سے سخت اور پست سے پست کام کرنے مین کبھی عار نہین ہوا۔ اور مریض کی صحت اور عافیت کے مقابلہ مین یہ خود اپنی صحت اور عافیت کا

خیال نہین کرتین - اِن مین انگریز بھی ہین - انگلو انڈین بھی اور ہندوستانی عیسائی بھی - لیکن جہانتک میرا خیال ہے انہین ''مدھم روشن'' یہی تیسرے درجہ کی ہین! -

اُنکے اوقات فرایض ۸ بجے دن سے ۸ بجے رات اور ۸ بجے رات سے ۸ بجے دن ہین - - اس دوران مین مشکل سے کھانے پینے کے لئے یہ ایک آدھ گھنٹہ کے لیے ساکت ہوتی ہین - ورنہ مسلسل مصروف و منہمک رہین گی - میرا اندازتو یہ ہے کہ ۱۲ گھنٹہ مین یہ کم سے کم پانچ چھ میل کی پیادہ مسافت توضرور طے کرتی ہین - مین یہان پر ایک خاص نرس کا تذکرہ ضرور کرونگا - اسکی ڈیوٹی رات کی ہوا کرتی تھی - مجھے نہین معلوم دوا دینے ٹمپریچر لینے اور عام دیکھ بھال کے جو اوقات ہین اس مین اس نے ایک منٹ کے تفاوت سے بھی کام لیا ہو، ہمیشہ ہر کام کو ٹھیک وقت سے ادا کرنا اس کا کام تھا - اپریشن کے بعد کی چار پانچ راتین مجھپر سخت گزرین - یہ ہمیشہ آجایا کرتی تھی - کبھی دوا لاتی، کبھی مارفیا کا انجکشن دیتی اور کبھی یون بھی خیریت پوچھ جاتی - ایک ہفتہ بعد جب مجھے کوئی خاص تکلیف باقی نہین رہی تھی تو یہ حسب معمول ۲ بجے رات کو ٹمپریچر پرے آئی، مین جاگ رہا تھا، پوچھا کیسے ہو! مین نے کہا یونتو اچھا ہون لیکن پڑے پڑے کچھ بیوقوف سا محسوس کرنے لگا ہون - کہنے لگی سوجاؤ یہ احساس جاتا رہیگا، مین نے کہا اس مین یہ خرابی ہے کہ پھر دوسرے احمق سمجھنے لگین گے - کہنے لگی یہ حالت پہلے سے بہرحال بہتر ہے - ایکدن مجھے برآمدہ مین ٹہلتا دیکھکر پوچھا کہو، تمھاری عجیب غریب احساس کا اب کیا عالم ہے - مین نے کہا کیا اس کا اندازہ تمکو ٹمپریچر سے نہین ہوا!! -

ہسپتال مین مریضون سے ملنے کے خاص اوقات ہین - مثلاً آج کل صرف پانچ سے سات بجے شام تک اسکے علاوہ کسی دوسرے وقت ملنا جلنا قطعًا ناممکن ہے لیکن ہم ہندوستانیون کو اس پابندی سے کیا سروکار - اُنکے نزدیک اونکے اوقات فرصت اس قسم کی پابندیون سے بے نیاز ہین - اس سلسلہ مین بعض دلچسپ واقعات بھی پیش آئے - لیکن انکا ضبط تحریر مین لانا غیر مناسب ہے، یہان ایک ''مسز پنکھرسٹ'' تھین جو ملنے ملانے کے بارہ مین ہسپتال کے قواعد کی نہایت شدت کے ساتھ پابندی کرتی تھین - انکے تیور اور عتاب کو دیکھکر، عام طور پر غصہ، حقارت یا جھنجھلاہٹ محسوس کرنے کے بجائے انسان پر کچھ اس درجہ خجالت طاری ہوتی تھی کہ وہ بغیر زبان ہلاے ہسپتال سے باہر ہوجاتا تھا -

میرے ایک قدیم دوست، اسکول کے ساتھی لکھنؤ مین مل گئے، مین انکو شروع زمانہ طالب علمی ہی سے بور سمجھتا تھا جس کا اردو مفہوم کسی قدر ''بلائے جان''، ''عافیت سوز'' یا ''مخل عافیت'' ہوسکتا ہے - پستہ قد، چیچک رو، سیاہ فام، سبک خرام، ذرا جھلے، کافی بیوقوف لیکن اپنی دانست مین فرزانہ، عمر اپنی کبھی نہین بتاتے تھے - اور اس قسم کے تذکرہ سے بہت جلد غضبناک ہوجاتے تھے - انکو ہمیشہ اسکی حسرت رہی ہے کہ کوئی کرورپتی حسینہ

اپر عاشق کیون نہ ہوگئی، ہر قسم کا لباس زیب تن فرماتے تھے - اور لوگون کے ہنسنے یا مذاق اُڑانے سے اِسے فوراً ترک بھی فرما دیتے تھے - بہت جلد فریفتہ ہو جانیکے عادی تھے - خود بخود کبھی نہین بلکہ دو چار آدمی اسبارہ مین اصرار کرین تو پھر انکا عاشق ہو جانا - یقینی تھا - یہ ہمیشہ ممنوعہ اوقات مین مرے پاس آتے اور نکالے نہ جاتے تو گھنٹون اپنے مرض اور اپنے کارنامون پر اس طور سے گفتگو کرتے گویا مرض اور اپریشن کے اعتبار سے مین نرا احمق ہون اور اپنے کارنامون کے اعتبار سے یہ لارڈ ریڈنگ کے حریف! دنیا مین جتنے وبائی امراض یا آفات ارضی وسماوی ہو سکتے ہین، باری باری یہ سب کے مورد رہے - اِنکے اثرات کچھ تو جسم پر نظر آتے ہین اور بقیہ دماغ پر مستولی ہین - علی گڑھ کا خواب بھی نہین دیکھا ہے کہین علیگڈھ کے حالات اور وہانکے زندگی پر اس خود اعتمادی اور وثوق کے ساتھ گفتگو کرتے تھے گویا خود مین نے پندرہ سال تک علی گڑھ مین بھاڑ جھونکا ہے اور یہ کالج کے کھلنڈرے رہ چکے ہین یا کورٹ کے ممبر ہین - مجھپر ہمیشہ مہربان رہے اور اس کا سبب محض یہ ہے کہ مین نے ہمیشہ اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک نیازمند کی حیثیت سے پیش کیا - اور انکی ہر حماقت پر سر تسلیم خم کیا -

ہمارے دوست کو نرسون سے خاص دلچسپی تھی - اور اکثر انسے اُلجھنے یا سُلجھنے کی کوشش فرماتے اور مجھے اس وقت خاص لطف آتا جب یہ گھبرا کر یا غلط انگریزی کی رو مین "یس سر" (Yes Sir) یا "نو سر" (No Sir) فرما جایا کرتے تھے - یہ سب کچھ تھا لیکن "مسز نیگھر سٹ" سے یہ بھی گھبراتے تھے اور آتے ہی دریافت فرماتے "اور کیون جی کہین " اس" کے آنے کا تو وقت نہین ہے!"

ہمارے اِن دوست کو میرے کمرہ کا غسلخانہ بے حد پسند آگیا تھا - اور سپید، صاف اور کشادہ ٹب کو پانی سے لبریز دیکھکر اکثر غور فرمایا کرتے تھے - انکو معلوم نہ تھا کہ یہ غسل کرنیکا ٹب ہے - لیکن جب معلوم ہوا تو اس کا "وجہ ترکیب استعمال" دریافت فرمانے لگے مین نے کہا اس مین نہانے کی مشق ہونا چاہئے - ورنہ اسمین داخل ہو کر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے اور اکثر تو نادانستگی مین لوگون کی جانین تلف ہو گئی ہین - کہنے لگے اور یہ ٹب کے سرہانے لمبی لمبی برنجی سلاخین کیسی ہین مین نے کہا اس مین ایک لمبی رسی باندھ لیتے ہین اور نہاتے وقت اس رسی کو مضبوط پکڑے رہتے ہین اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ کودتے اچھلتے، اور ڈبکیان لگاتے رہتے ہین - کہنے لگے بھئی آخر تم لوگ کیسے نہاتے ہو - مین نے کہا دیکھتے نہین یہ ربڑ کا حلقہ رکھا ہوا ہے یہ "لایف بلٹ" ہے اسکو گلے مین ڈال لیتے ہین پھر ڈوبنے کا امکان نہین تھا - اصل مین یہ ربڑ کا حلقہ جسکے اندر ہوا بھردیجاتی ہے اُن مریضون کے بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے ہوتا ہے جو عرصہ تک صاحب فراش رہے ہون یا جنکے عرصہ تک صاحب فراش رہنے کا امکان ہو تاکہ انکی بیٹھ یا کمر مجروح نہ ہونے پائے - کہنے لگے بھئی کچھ ہو، اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہون -

مین نے کہا شوق سے فرمائے، کہنے لگے مین ایکدن اس غسلخانہ مین نہانا چاہتا ہون - مین نے کہا بسم اللہ، ابھی کہنے لگے برہنہ نہانا تو شرعًا ممنوع ہے، مین نے کہا اپنی قمیص تہمد کے طور پر باندھ لو، فرمایا واہ پھر پہنون گا کیا، مین نے کہا میری قمیص بکس مین سے نکال لینا۔ بہت خوش ہوے، فورًا قمیص سے ستر پوشی کی، ربڑ کا حلقہ گلے مین ڈالا اور غسلخانہ مین داخل ہوگئے کہنے لگے ارے میان وہ رسی کہان ہے - مین نے کہا رسی تو شاید جلد نہ مل سکے - مین تو اُس کا کام کمربند سے لیا کرتا ہون یہ سنکر بیحد مسرور ہوے - مین نے کہا دیکھو کوئی مشکل پیش آئے تو تکلف نہ کرنا آواز دیدینا، مین آجاؤنگا - یہ سنکر باہر نکل آئے اور فرمایا کہ کیاجی تمنے مجکو طفل مکتب سمجھ لیا ہے - مین نے کہا بھئی ناراض مت ہو - مین نے یونہی کہدیا آخر حرج ہی کیا ہے - فرمانے لگے اتنے احتیاط کے پابند تھے تو اپریشن ہی کیون کرایا، ابھی اور تقریر کرنے والے تھے کہ مین انکے حُلیہ اور ارادہ دونون سے گھبرایا - مین نے کہا اچھا نہانا ہے تو جلدی کرو ورنہ پانی گرم ہو جائے گا اور سارا لطف جاتا رہیگا - غسلخانہ کا کواڑ بند نہ کرنا شاید مجھکو کوئی ضرورت پیش آجائے - غرض یہ گنگناتے ہوے غسلخانہ مین داخل ہوے اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ ٹب مین دو مگرمچھ ایکدوسرے سے اختلاط یا اختلاف کر رہے ہین - تھوڑی دیر مین مین نے "مسز پنکھرسٹ" کے پاؤن کی چاپ سنی اور جھوٹ موٹ سوتا بنگیا - معزز خاتون داخل ہوئین، مجھے سوتا اور غسلخانہ مین بے پناہ ہنگامہ سنکر سیدھے غسلخانہ کی جانب بڑھین - چونکہ دروازہ اندر سے بند نہ تھا اور باہر سے معلوم بھی ہوتا تھا کہ بند نہین ہے ہماری ہیروئین دروازہ کھولکر یکلخت غسلخانہ مین داخل ہوگئین اور ساتھ ہی ساتھ دو چیخین سنائی دین ! -

اس دور ابتلا مین مجھپر جو گذرا وہ ظاہر ہے - احباب، اعزہ اور بزرگون نے تشویش اور اضطراب کے جو لمحات گزارے وہ میرے لئے بیماری مین پریشان کن تھے اور اب جبکہ صحتیاب ہوکر پھر اُنکی صحبت سے لطف اندوز ہونے اور اُنکے دامن عافیت مین پناہ گزین ہونے جارہا ہون میرے لئے انتہائی باعث تشکر و مسرت ہین - میرا ایمان ہے کہ اس بارہ مین مین غیر معمولی طور پر خوش نصیب ہون - دعا ہے کہ انکو میرے لئے آیندہ پھر کبھی اتنا پریشان اور مضطرب نہ ہونا پڑے اور نہ کوئی اب موقع آئے کہ مین انکے لئے پریشان اور مضطرب ہون - آمین

خدا حافظ -

(رشید احمد صدیقی)

علم فراست الید | اگر آپنے ابتک نہین ملاحظہ کی تو اب طلب فرمائیے۔ قیمت علاوہ محصول (عہ)
(مینیجر نگار)

باب المراسلۃ والمناظرۃ

عبادت کی معنوی و صوری حیثیت

گزشتہ ماہ کے رسالہ مین بہ سلسلۂ ملاحظات مین نے عرض کیا تھا کہ اس مہینے کی اشاعت مین مدیر مُبصر کے اُس اعتراض کا جواب پیش کرونگا، جو مسئلۂ عبادت کے متعلق انھون نے مجھ پر کیا ہے۔ ہر چند بہ حالت موجودہ جبکہ بعض نہایت عزیز ہستیان بستر درد و علالت "پر پڑی کراہ رہی ہین میرے لئے ایک لفظ لکھنا بھی دشوار ہے، لیکن اس خیال سے کہ ناظرینِ نگار اس مہینے ایفاء وعدہ کے منتظر ہونگے، مختصراً اپنے خیالات پیش کرتا ہون، ہر چند یہ بحث بہت طویل و بسیط گفتگو کی محتاج ہے، لیکن افسوس ہے کہ پراگندگی حواس کی وجہ سے حد درجہ ایجاز و اختصار سے کام لے رہا ہون۔

مئی کے باب الاستفسار مین جو کچھ مینے مذہب کے متعلق لکھا تھا اسپر جناب ناطق نے جو اعتراضات کئے ہین ان مین سے صرف دو جواب طلب ہین (۱) اکرمکم عند اللہ اتقاکم مخصوص مسلمانون کے لئے ہے اور انھین کو خطاب کیا گیا اس لئے دائرۂ اسلام" سے خارج ہونے والے اس تعریف (definition) مین نہین آتے۔ (۲) مین نے لکھا تھا کہ جہان جہان کلام مجید مین عبادات کا ذکر ہے وہین ان کی غرض و غایت بھی بتادی ہے۔ اسپر جناب ناطق نے چند آیات کلام مجید سے پیش کرکے فرمایا ہے کہ ان مین عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کوئی غرض و غایت نہین بتائی گئی۔

امر اول کے متعلق باوجود اس اعتراف کے کہ آیت مین مسلمانون سے خطاب کیا گیا ہے اصول قرآن کے صرف خاص نکتہ کے اظہار پر کفایت کرونگا کہ تمام احکام اخلاقی خواہ انکا مخاطب کوئی ہو، ہمیشہ عام ہوا کرتے ہین اور انکا دائرہ تمام عامۃ الناس کیلئے وسیع ہوا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ کلام مجید صرف مسلمانون کیلئے نازل ہوا ہے اور اس مین غیر مسلمانون کے لئے کوئی ہدایت موجود نہین ہے اگر محض کریم الاخلاق ہونا کوئی فعل محمود ہے تو وہ ہر جگہ اور ہر وقت ویسا ہی ہے۔ اور کوئی وجہ نہین کہ ناطق صاحب چونکہ وہ مسلمان ہین) اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے متقی کہلائین اور گنگا دھر کے مکارم صفات (غیر مسلم ہونے کے لحاظ سے، بالکل بے معنی چیز قرار دیئے جائین۔

چونکہ اخلاق حسنہ کا تعلق بالکل نظام تمدن سے ہے اسلئے ہر وہ شخص جس کے اخلاق بلند ہین سلسلۂ تمدن،، کا ایک صالح فرد کہلائے گا اور اس غایت کے لحاظ سے اس کی تعریف کیجائے گی خواہ وہ کسی ملک و ملت کا ہو۔ چنانچہ رسول اللہ کا بعض غیر مسلم اکابر و اعاظم کی تعریف کرنا اسی بنا پر تھا۔

امر دوم کے متعلق جناب ناطق کا اعتراض صرف اس عقیدہ کی بنا پر ہے کہ وہ عبادت کے معنی صرف روزہ نماز وغیرہ کے لیتے ہین، حالانکہ عبادت سے جو چیز مراد ہے وہ اس سے بہت بلند ہے اور کلام مجید مین کسی ایک جگہ بھی نماز کے مخصوص

ارکان کا ذکر نہ کرنا اسی بناء پر ہے کہ وہان عبادت سے مقصود کوئی خاص طریقۂ نیایش نہین تھا۔

کلام مجید مین چار لفظ یا ان کے مشتقات ایسے ہین جن سے بندگی کا مفہوم کھلے طور پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ چار لفظ "عبادت، صلوٰۃ، رکوع و سجود" ہین۔ لیکن مین یہ ماننے کے لئے طیار نہین کہ ان مین سے کوئی لفظ ہماری موجودہ نماز کے لئے کلام مجید مین استعمال ہوا ہے۔

(۱) لفظ صلوٰۃ، عربی زبان کا لفظ نہین ہے بلکہ وہ ارمی زبان سے لیا گیا ہے اور اس امر کا ثبوت کہ اس سے مراد موجودہ ہیئت نماز نہین ہے خود قرآن سے دو طرح ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ غیر مسلم لوگون کے طریقۂ عبادت کو بھی جو نماز سے بالکل علٰحدہ چیز تھی لفظ صلات سے تعبیر کیا گیا ہے ملاحظہ ہو سورۂ انفال کی چھبیسوین [۲۶] آیت:۔ وما کان صلاتھم عند البیت الا مکاءً و تصدیۃ - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر طریقۂ عبادت کو خواہ وہ نماز کی صورت مین ہون یا ناقوس و گھنٹہ کی صورت مین صلات کہہ سکتے ہین۔

دوسرا ثبوت اس امر کا کہ صلوٰۃ کے معنی نماز کے نہین بلکہ خیر و برکت اور دعا کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، ذیل کی آیتون سے ہوتا ہے:۔

(۱) ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی - یہان لفظ صلات کی نسبت خدا اور ملائکہ کے ساتھ کیگئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ میان اور ان کے فرشتون نے کبھی نماز نہین پڑھی۔

(۲) یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما - یہان صلوٰۃ کے معنی کھلے طور پر دعا اور طلب خیر و برکت کے ہین۔

تیسرا ثبوت اس امر کا کہ صلوٰۃ سے مقصود مخصوص حرکات نہین ہین، یہ بھی ہے کہ صبح کی عبادت کو سورۂ بنی اسرائیل مین۔ قرآن الفجر کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح سورۂ طٰہٰ مین صلوٰۃ کو صرف تسبیح و تہلیل بتایا ہے:۔

وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا ومن آناء اللیل واطراف النہار لعلک ترضیٰ

دوسرا لفظ عبادت ہے جس کے مشتقات کی چند آیتین جناب ناطق نے نقل کی ہین اور اپنے پندار مین اس کا مفہوم صرف نماز قرار دیا ہے حالانکہ جب لفظ صلوٰۃ، موجودہ نماز کے لئے کلام مجید مین استعمال نہین ہوا تو لفظ عبادت اور اس کے مشتقات نماز کے معنی مین کیا استعمال ہو سکتے ہین۔ کلام مجید مین ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون - اگر یعبدون سے مراد نماز پڑھنا ہو تو معنے یہ ہونگے کہ انس و جن صرف اسلئے پیدا کئے گئے ہین کہ ہر وقت نمازین پڑھتے رہین یا نماز کی طرح کوئی نہ کوئی عبادت کرتے رہین، حالانکہ حقیقت یہ نہین ہے اور عبادت یا نماز کی تقسیم اوقات خود اس کو ظاہر کرتی ہے کہ ہر وقت عبادت کرتے رہنا مقصود نہین ہے۔ اب رہگئے الفاظ رکوع و سجود کے جن سے بظاہر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے رکوع

وسجود مراد ہین۔ سو خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ رکوع کے معنے گھٹنون پر ہات رکھکر جھک جانے کے ہین اور نہ سجود کا مفہوم یہ ہے کہ سر کو زمین پر ٹیک دیا جائے۔

سورۂ رحمان مین ارشاد ہوتا ہے:۔ والنجم والشجر یسجدان۔ حالانکہ ان مین سے کوئی اپنا ماتھا زمین پر نہین رگڑتے۔اس طرح سورۂ نحل مین:۔ وللہ یسجد مافی السموات ومافی الارض من دابۃ درآنحالیکہ یہ بھی غلط ہے کہ کائنات مین جو چیز ہے وہ ہر وقت اپنی پیشانی کو زمین پر ٹیکے رہتی ہے۔

رکوع کا لفظ بھی جھک جانے کے معنی مین نہین آیا ہے جس کا ثبوت سورۂ آل عمران کی یہ آیت ہے:۔ یامریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین۔ اس آیت مین جناب مریم کو ہدایت ہوتی ہے کہ سجدہ کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والون کے ساتھ۔ اگر رکوع وسجود سے مراد مسلمانون کی نماز کا رکوع وسجود ہو تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اسوقت یہود و نصاریٰ کے طریق عبادت کی بھی یہی صورت تھی۔ حالانکہ اُن کی نماز مین اسلامی نماز کا رکوع وسجود کبھی شامل نہین تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ رکوع وسجود کا مفہوم وہ نہین ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

اسلئے کلام مجید مین لفظ عبادت، صلوٰۃ، رکوع وسجود سب ایک ہی معنی مین استعمال ہوئے ہین اور وہ معنی یقیناً ظاہری اوضاع نماز سے بہت بلند ہین۔

وہ معنی کیا ہین، وہ مفہوم خداوندی کیا ہے؟ اس کو ظاہر کرنے کے لئے جس طرح دفتر کے دفتر ناکافی ہین اسی طرح صرف ایک فقرہ بھی کافی ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ ان تمام الفاظ مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر کیف عبودیت پیدا کرے اور عبودیت نام ہے قوانین فطرت رموز قدرت اور سنن آلہیہ پر کاربند ہونے کا اور اُس قوت بے ہمتا کے برکات و نعایم پر شکر ادا کرتے ہوئے ان سے فایدہ اُٹھانے کا۔ صلوٰۃ کو تسبیح وتہلیل کہنا اسی بنا پر ہے اور جن وانس کو عبادت ہی کے لئے پیدا کرنے کا بھی یہی منشا ہے، ورنہ صرف خدا کے نام کو اونگلیون پر شمار کرتے رہنا محض جھک جانا یا سجدہ مین گر پڑنا بالکل فعل عبث ہے اور اُس سے کوئی نتیجہ مترتب نہین ہوتا۔ مین نے جو یہ عرض کیا تھا کہ کلام مجید مین جہان جہان عبادت کا حکم دیا ہے وہین اس کی غرض وغایت بھی ظاہر کردی ہے اس بنا پر تھا کہ یہ تمام الفاظ خود اپنے مفہوم کے لحاظ سے اسقدر بلند وعمیق ہین کہ محض ظاہری و رسمی طریق عبادت پر منطبق نہین ہوسکتے اور اپنے اندر وہ تمام ہدایات پوشیدہ رکھتے ہین جو واقعی ایک نماز کو نماز بنانے والے ہین۔ پھر کلام مجید مین صرف بلاغت سے کام نہین لیا گیا بلکہ کہین کہین اُس کے وہ صراحت بھی کردی گئی ہے جس کے جناب ناطق صاحب محتاج ہین اور غالبًا تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر وال آیت انھین بھی معلوم ہوگی۔

ابتداء اسلام مین نماز کا رواج نہ تھا۔ بعد کو نہ محض یہود ونصاریٰ کی تقلید مین بلکہ اس لئے بھی کہ نظام جماعت قایم رکھنے کے لئے اور اجتماعی حیثیت پیدا کرنے کے لئے کوئی صورت پرستش ونیایش کی پیدا کرنا چاہئے، نماز کا موجودہ طریقہ پیدا کیا گیا جو یقیناً نہایت عمدہ ہے اگر واقعی اس کی اصلی غرض وغایت فوت نہ ہوجائے۔

مین نماز کا مخالف نہین ہون بلکہ اس کو بہترین طریق عبادت جانتا ہون لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ کلام مجید مین اس نماز کا کہین ذکر نہین ہے اور نہ خدا کی بتائی ہوی عبادت کسی رسم ورواج یا ظاہری نقوش وحرکات کے پابند ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر مصالح اجتماعی کی بنا پر ایک صورت قائم کردی گئی ہے تو اس کی پابندی یقیناً فرض ہے اور اس کا تارک نظام قومی اور سوسائٹی کا مجرم ہے۔ "نیاز"

(۲)

مغالطہ کو دیکھ کر

علامہ "نیاز"!

تسلیم، "نگار" اشاعت جون کا "مغالطہ ذرا ہٹا کر" میرے سامنے ہے، آخری فقرہ ملاحظہ ہو۔

"ایک صاحب۔ اور مین جن کا .... تا .... معنون کردیا جائے گا،"

صدیقی صاحب کا یہ عالی پایہ مضمون واقعی بلا معنون رہنا ناموزون ہے انھین اس انتساب کے لئے ایک ایسے عقیل کی ضرورت ہے۔ جسے خداداد عقل کے ساتھ علم غیب پر بھی کچھ دسترس حاصل ہو۔

مین قہستانی دنیا کا ایک فرد لمعاتِ علوم وفنون سے ہر چند بیگانہ ہون، تاہم رموز واسرارِ حیات سے کلیتہً ناواقف نہین اعقل مخصوص سے گو بے بہرہ ہون۔ لیکن شعور عام سے مستثنیٰ نہین مجھے آغاز سے صاحبِ تصنیف بننے کا شوق تا بحد دیوانگی دامنگیر ہے کئی دفعہ دماغ مین سمایا۔ کہ گلستان کو رومن مین لکھ کر صاحبِ تصنیف ہونے کا اعزاز حاصل کرون، کبھی خیال آیا کہ ہملٹ کے سرورق سے شیکپیئر کا نام کاٹ کر مفت مین اجارہ دارئہ "بقاءِ دوام" ہو جاؤن، بسا اوقات خیال کرتا ہون۔ کہ جرمنی مین جاکر "آبِ حیات" اپنے نام پر طبع کرا دُون، یہ سب کچھ دماغ مین آتا ہے، لیکن کرتا اسلئے نہین، کہ شاید کوئی موضوع حسب ذوق مِل جائے۔ اور ہم بلا منتِ غیرے واصلِ منزل ہون۔

آج رشید صاحب کا یہ وعدہ دیکھکر کہ وُہ اس مضمون کا انتساب صرف اُس صاحب سے کرینگے۔ جو تمام دنیا کو مبتلاءِ مغالطہ سمجھنے والے کا نام بتلا دین۔ کچھ عرض کرنا چاہتا ہون۔

یہ صاحب خود رشید احمد صدیقی ہین جو تمام عالم کو زندانی مغالطہ سمجھنے کے خوگر ہین۔

حضرت نیاز! دیکھئے۔ گو مین آپ کے رسالہ کا باقاعدہ خریدار نہین اور اسلئے کسی رعایت کی تمنا آپ سے یا کسی ایسے ایڈیٹر سے رکھنا، جب کے رسالہ ہم ہر ماہ مفت پڑھ لیتے ہون، "عبث ہے، تاہم آپ کی آزادہ روی، بلند عزمی، فراخ مشربی اور "علماء براندازی"، پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے امید واثق ہے، کہ آپ رشید احمد صاحب کے ہان تعنون کے لئے صرف میرا نام پیش فرمائینگے، مجھے رشید احمد صاحب کا پتہ معلوم نہین، ورنہ مین انھین اسقدر متاثر کرتا۔ کہ وہ چار و ناچار یہ انتساب منظور فرمالیتے

اب کے اتفاقاً صاحب انتساب ہونے کا ایک زرین موقعہ بروئے کار آگیا ہے، اور اس لئے کہ ہمین صاحب تصنیف وصاحب انتساب بننے کا جنون ”بلا مبالغہ“ تا ”بحد مبالغہ“ ہے، اسلئے ”ہم“ کمر رآ آپ سے ملتجی ہوتے ہین ”ہم“ کا لفظ اسلئے استعمال کر رہا ہون۔ کہ مین اور میرے اشواق متعدد مل کر یقیناً صیغۂ جمع بنانے مین کامیاب ہو رہے ہین، آخر حضرت ابراہیم بھی تو انھین مختلف ولولون، اور متعدد آرزوہائے عمل کی بنا پر ”امۃ واحدہ“ بن گئے۔ ہم کیون ”ہم“ تک باین ہمہ ہنگامہائے شوق نہ بن سکین، کہ آپ ہماری پر زور الفاظ مین سفارش فرما کر ہمین صدیقی صاحب کے بلند پایہ مضمون کا انتساب حاصل کرنے مین کامیاب بنا دین، ہم بشرطِ کامیابی آپکے دربارِ بے نیاز مین متعدد تحفہ ہائے نیاز بصورت ذیل پیش کرینگے۔

(۱) ہم ریش مبارک کے بقیۃ الآثار کو رخصت فرما دین گے۔

(۲) ہمین عربی سے کچھ لگاؤ پیدا ہو رہا ہے آپکے خاطر ترک فرما دین گے۔

(۳) آپ کا ایک مضمون پڑھ کر نمازون کی تعداد مین ۲ اور ۵ کی نسبت سے کمی کر دی تھی، آیندہ کے لئے انشاء اللہ مضمون جدید کے ماحصل کو دیکھتے ہوئے شکل وصورت مین حسب خواہش تغیر وتبدل کر دین گے۔

(۴) مذہب وملت کے نظام کہنہ کو برہم کرتے ہوئے ہم ایک ایسے آزاد، حریت، دوست اور سہل ممتنع دین کی بنیاد ڈالین گے، کہ جو خداء عالم کے بجائے متمدن دنیا کی نئے پود کا صحیح ترجمان ہو گا۔

(۵) ہم دنیا کے ہر مسئلہ پر آلہیاتی ہو یا طبعیاتی، نفسیاتی ہو یا نباتاتی منطقی ہو یا فقہی الغرض کسی علم سے تعلق رکھتا ہو، بے ساختہ، بے تحاشا اور بے باکانہ قلم اٹھائینگے، نقص بیان، ضعف استدلال اور نقاہت معقولیت پر تابناک الفاظ اور جمیل تراکیب کا حجاب ڈال دینگے۔

(۶) آئمہ کرام کی فقہی موشگافیون، اکبرائے ملت کی آئینی نکتہ سرائیون محدثین ماضیہ کی جگر گداز عرق ریزیون اور متکلمین اولی کی تابناک کاوشون کو ہفوات سے زیادہ وقعت نہین دینگے۔

(۷)۔ الغرض (حسب تجویز نو) مطبع ”نگار“ کے نوزائیدون کو اپنا رہبر، مجلدات نگار کو صحف مقدسہ تسلیم کرتے ہوئے اپنی ہر تحقیق کا منتہا اپنی ہر جستجو کی آخری منزل الہامات نیاز کو قرار دون گا۔

میرا خیال ہے۔ کہ الہامات ”نیاز“، مین سے نگارستان کے افسانے خصوصیت سے قابل تمسک ہین، کیوپڈ ءسائکی۔ حمراز کا گلاب یہ وہ ایمان طلب تحریرات ہین، جنکی ہر سطر (خصوصاً جبکہ موضوع تحریر صنف نازک کی ستم شعاریان ہون) حلقۂ ایمان کے لئے پیغامِ انہدام ہے، گو ایمان متان اس سے حیاتِ نو مستعار لیتا ہے، پیوست حیات افراد کے لئے پیام اجل ہے، نتیجۃً نگارستان کا ہر افسانہ افسانہ کی ہر سطر۔ ہر سطر کا ہر حرف شورش سے لبریز ہے، اس سے بحث نہین، کہ وہ ہیجان دنیا روح مین ہو، یا عالم عناصر مین۔ بہرحال یہ مسئلہ طول طلب ہے، اگر آپ

اجازت دین تو مین ایک "قہستانی فردِ نگارستان یا کلامِ نیاز" پر ایک نو مسلمانہ تنقید لکھکر بھیجون، جسے آپ نگار مین شایع کرین۔ اور اس طرح مجھے اہلِ تصانیف کی فردوسی صف مین جگہ مل جائے) اسلئے اس وقت مجرمانہ نقاشی کے لئے عفو طلب ہوتا ہون۔

نیازمند

غلام جیلانی برق۔ بی اے

نگار:- آپ کی یہ تحریر نگار مین شایع کی جاتی ہے اس لئے مضمون نگار تو آپ ہو ہی گئے اور اس طرح غالباً آپ کے بڑھے ہوئے "ہیجان علمی" کی یک گونہ تسلی ہو گئی ہوگی۔ رہا معاملہ تعنون کا سو، اس پر مجھے اختیار نہین۔ اگر رشید احمد صاحب کے نزدیک آپ کا "التقاف" واقعی صحیح و درست ہے تو کوئی وجہ نہین کہ وہ اپنے "مغالطہ" کا انتساب جناب کے نام نامی سے نہ کر دین، حالانکہ اس وقت تک آپ کا "مغالطہ" مین مبتلا ہونا "بحد مبالغہ" کیا بلکہ "بحد ضرورت" بھی کسی جگہ سے ثابت نہین ہوتا۔

آپ نے جو تحفہ ہائے نیاز پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے ان کے جواب مین سوائے اس کے کیا عرض کر سکتا ہون کہ۔

"کہین نظر نہ لگے نہ اُن کے دست و بازو کو"

یہ سب توفیق کی باتین ہین جو ازل سے "باندازۂ ہمت" عطا ہوتی ہین۔

ممکن ہے کہ دفترِ نگار آپ کے ان ہدایائے گرانمایہ کے خاطر خواہ قدر نہ کر سکے لیکن یہ یقینی ہے کہ جس وقت "قہستانی" دنیا کی تاریخ مرتب کی جائیگی تو اس کے سرنامہ کو سب سے پہلے جناب ہی کے اسم گرامی کے طغرا سے مزین کیا جائے گا اور تا "ابد لا نہایت" صرف آپ ہی دہان کے "بطل اعظم" اور "صاحبقران اکبر" تسلیم کئے جائین گے۔ لیکن اگر ناگوار خاطر نہ ہو، تو عرض کر دون کہ براہ کرم پہلے "فلسفۂ تہذیب" کے اصول کا مطالعہ ضرور فرما لیجئے تاکہ آیندہ آپ اپنی فطری "سیرچشمی" اور "غیر معمولی رواداری" کے زیر اثر گران اشیاء سے محروم نہ ہو جائین جو ہر چند "کالائے بد" تو نہین ہو سکتین، لیکن پھر بھی "ریش خاوند" تک پہونچنے کے لئے بیتاب نظر آتی ہین۔

(۱)۔ ہم کو معلوم نہین کہ آپ کی ریش مبارک کے "آثار باقیہ" واقعی "ضاد یہ عجم" کی حیثیت رکھتے ہین یا نہین اگر ایسا ہے تو ان کے قائم رکھنے مین بھی کوئی مضایقہ نہین کہ "خزان" کو دیکھ کر بھی "بہار" کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا نہین تو پھر آپ خود ہی انصاف فرمائیے کہ تحفہ کس چیز کا ہوگا؟ "بقیۃ الآثار" کا یا اس "فضا" کا جہان سے وہ محو کئے گئے ہین۔

(۲) - آپ عربی سے اپنا لگاؤ ترک کیجیئے یا نہ ترک کیجیئے، لیکن اُس سے "لاگ" بھی نہ رکھئے کہ آپ کی اور ہر ذہین آدمی کی انشاء کی جان وہی ہے - آپ کا یہ تحفہ آپ کو بے برگ و بار کردیگا اور ہمین کسی کی تباہی منظور نہیں -

(۳) - اگر ہمین آج معلوم ہو جائے کہ واقعی آپ نے کبھی نماز پڑھی تھی، تو ہم آپ کو مشورہ دین کہ ۱۲ اور ۵ کی نسبت سے گھٹانے کے بجائے آپ اُسے ۵ اور ۵۰ کی نسبت سے بڑھا دین (کیونکہ ایک حدیث کے مطابق اصل مین نماز پچاس ہی وقت کی فرض ہوئی تھی لیکن جناب موسیٰ کے مشورہ سے رسول آخر الزمان نے خدا سے بعد التجا و مکرر اُسے اتنا مختصر کر دیا) - لیکن واقعہ یہی ہے کہ آپ بھی انھین لوگون مین سے معلوم ہوتے ہین جو یہ تمنا رکھتے ہین کہ کاش اُس وقت وہ بھی ہوتے اور رسول اللہ سے اصرار کر کے نماز کو بجائے ۵ کے صفر تک پہونچا دیتے جس مین اضافی قوت ۵۰ سے بھی زیادہ ہے -

(۴) - متمدن دنیا کا ساتھ دینا والا جو مذہب ہے وہی اسلام ہے - ہمین آپ کی اس بے خبری پر تاسف ہے کہ جس سہل ممتنع دین کی آپ بنیاد ڈالنا چاہتے ہین وہی مذہب و ملت کا نظام کہنہ ہے آپ وہی کیون نہ کہین جو کسی شہید صداقت نے کہا تھا "من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را"۔

(۵) آپ کا یہ تحفہ چونکہ یکسر "طنزیات" سے متعلق ہے اسلئے اگر یہ تحفہ بھی ہے تو شاید اُس قسم کا جیسے کلیوپیٹرا اپنے جاندادگان الفت کو سرشار لذت کرنے کے بعد "جام زہر" کی صورت مین پیش کیا کرتی تھی اسلئے تصور سے کام لیکر ہم کسی کے "لب شکرخا" کا جواب تلخ سمجھ کر اس کا بھی شکریہ ادا کرنے کے لئے طیار ہین -

(۶) - اکابر متقدمین کی کاوشون کو آپ کا ہفوات سمجھنا اگر دنیا سے انھین "وحی یوحی" تسلیم کرسکتا ہے تو اس "نیشتر کی خلش" بھی ہمارے لئے بہت کچھ باعث لذت ہو سکتی ہے -

(۷) - مجلدات نگار کو صرف زبان سے صحف مقدمہ کہنا کافی نہیں - "تصدیق بالجنان" ایمان کی ضروری شرط ہے اور آپ کی تحریر کا سارا انداز تو کفار عرب کا "راعنا" نظر آتا ہے در آنحالیکہ آپنے کلام مجید مین یہ بھی دیکھا ہوگا "واللہ یستہزئ بھم و یمدھم فی طغیانھم یعمھون"

نگارستان کے متعلق آپ نے جو اظہار خیال فرمایا ہے اس کا تعلق چونکہ مدیر نگار سے نہیں بلکہ مصنف نگارستان سے ہے اس لئے اس باب مین اگر شرمندۂ احسان ہونگے تو وہ نہ کہ ہم - اڈیٹر

ہمیشہ یاد رکھئے

(۱) خط و کتابت میں نمبر خریداری درج کرنا (۲) جوابی امور کیلئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا - (۳) ۲۰ بیس تک پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع کرنا (۴) منی آرڈر کے کوپن میں نمبر خریداری درج کرنا -

(مینیجر نگار لکھنؤ)

باب الاستفسار

علم غیب

(جناب محمد نواز صاحب خلش - دیوالہ)

آجکل ضلع میانوالی میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ آیا نبی صلعم کو علم غیب جزءً تھا یا کلاً، براہ نوازش بذریعہ رسالہ نگار مطلع فرماکر ممنون کیجئے۔

اس سوال کے جسقدر مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوسکتی ہے بالوضاحت بیان فرمائیں، یعنی (۱) علم غیب سے کیا مراد ہے (۲) جزءً یا کلاً سے کیا مراد ہے (۳) حضرت آدمؑ کو علم غیب عطا فرمایا گیا تھا یا نہیں۔

(نگار) کچھ زمانہ قبل یہ مسئلہ شمالی ہند میں اٹھایا گیا تھا اور مولویوں نے خوب خوب داد شجاعت دی تھی۔ زبانی مناظرے ہوئے، تحریری مجادلے ہوئے، سب و شتم اور تکفیر کے حربے استعمال کئے گئے۔ لیکن آخر کار جو نتیجہ اس نوع کے نزاع و بحث کا ہوا کرتا ہے وہی ہوا۔ یعنی تھوڑے دنوں کے بعد ہر فریق اپنی اپنی جگہ تھک کر بیٹھ گیا اور کچھ پتہ نہ چلا کہ نبی آخر الزماں کو علم غیب حاصل تھا یا نہیں؟

تمام ان مسائل میں جن کا تعلق کلام مجید سے ہو، ہم لوگوں کی بڑی غلطی یہ ہوا کرتی ہے کہ خود کلام پاک سے سمجھنے کے بجائے منقولات، روایات اور تفسیرات وغیرہ کی جستجو کرنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں باہم تعارض و تضاد پاکر رہی سہی کیفیت مطمئنہ بھی کھو بیٹھتے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ابو حنیفہ کی تقلید کریں یا شافعی کی، امام احمد کا کہنا مانیں یا امام حنبل کا، رازی کے لکھے کو صحیح مانیں یا غزالی کی تحریر کو، اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ باوجود تباین و تضاد کے جو ان اکابر کے اقوال یا احادیث کے روایات میں پایا جاتا ہے، ایک مولوی اس امر پر بھی مجبور کرتا ہے کہ سب کو صحیح مانو کسی کو غلط نہ سمجھو، گویا وہ اس بات کا قائل ہے کہ دو نقطوں کے درمیان ایک سے زیادہ خط مستقیم کھینچے جا سکتے ہیں۔

بظاہر اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ اصل چیز کلام مجید ہے، لیکن عمل یہ ہے کہ اصل سمجھا جاتا ہے اقوال مفسرین کو اور اسکے اتباع میں کلام پاک سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ کلام مجید کا علم آسان نہیں اور ہر شخص کو اسکی جسارت نہ کرنا چاہیئے، لیکن میں اس بت پرستی کو بھی ناجائز سمجھتا ہوں کہ متقدمین کے اقوال کو "وحی یوحیٰ" قرار دیا جائے اور ان کی ہر بات خواہ سمجھ میں آوے یا نہ آوے ضرور تسلیم کرلیا جائے کیونکہ جب علم قرآن کی وسعت اتنی زبردست ہے کہ کوئی انسان اس کے تمام رموز کو نہیں جان سکتا تو پھر جس طرح میں اس کے ماہر و عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا،

صاحب کشاف وجلالین بھی نہیں کرسکتے، البتہ فرق یہ ہے کہ اگر ان سے دس غلطیوں کا امکان ہے تو مجھ سے بیس یا اس سے زاید کا، لیکن اس کے کیا معنی کہ ان کی ہر "غلطی" اجتہاد تسلیم کیا جائے اور باوجود غلطی ہونے کے بھی، تواب کے مستحق ہوں اور میری ہر بات خواہ وہ کتنی ہی قرین عقل وانصاف کیوں نہ ہو، محض اس لئے غلط قرار دیدی جائے کہ اس سے قبل کسی نے ایسا نہیں لکھا، حالانکہ اگر نہیں لکھا تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے، نہ کہ مجھ پر، لیکن ہم لوگوں کی کورانہ تقلید اس حد تک بڑھ گئی ہے اور اپنے حواس وادراک کو اس درجہ بیکار بنالیا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ تمہارے چہرہ پر بھی آنکھیں ہیں تو ہم اسکا یقین کرنے کے بجائے خود اس کو اندھا سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر عقول انسانی کی ترقی کا دروازہ واقعی بند ہوگیا ہے اور مبدء فیاض اپنے تمام انعامات ختم کرکے اب بالکل معطل ہوگیا ہے، تو خیر، ورنہ ہر شخص کا ایمان خود اسکی ذاتی چیز ہے اور اسی کے اطمینان نفس سے اس کو متعلق ہونا چاہئے۔ اگر متقدمین کے اقوال سے اس کو طمانینت قلب حاصل نہیں ہوتی بلکہ خود غور کرکے کسی نتیجہ پر پہونچنے سے اسکو اطمینان حاصل ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اسے کافر ومرتد کہہ دیں اور اس کو مجبور کریں کہ نہیں تجھے تو "صاحبین" یا "شیخین" ہی کے ساتھ جنت و دوزخ میں جانا ہے اور خدا نے صرف متقدمین ہی کو صحیح راستہ بتایا تھا اور وہی اسکے "روح القدس" تھے۔

مدعا اس سے یہ ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں کے علماء اکثر وبیشتر مسائل میں کلام مجید میں غور کرنے کے بجائے منقولات کو لے بیٹھتے ہیں، اور خود اپنی عقل، اپنے تدبر وتفکر اور اپنے اجتہاد سے کام نہیں لیتے، اس لئے وہ نہ اوروں کو مطمئن کرسکتے ہیں اور نہ خود ہوتے ہیں، یہی حال مسئلہ غیب کے جھگڑے کا ہوا کہ چند دنوں تک باہم دست وگریبان رہنے کے بعد خاموش ہوگئے اور کوئی لٹریچر ایسا نہ چھوڑا جس سے کسی شخص کو اطمینان ہوسکتا۔

میرے نزدیک غیب کا مسئلہ نہایت صاف وآسان مسئلہ ہے اور اسمیں کسی نوع زیادہ عقل آرائی کی ضرورت ہے اور نہ کسی بحث ونزاع کی۔

لفظ غیب یا غائب لغوی معنے میں ہر اس امر کو کہتے ہیں جو مستور ہو آنکھوں سے نظر نہ آئے اور جس کا ہم زمان ومکان متعین نہ کرسکیں۔ چنانچہ جب کوئی آواز کسی ایسے مقام سے آتی ہے جس کا پتہ نہیں ہوتا یا جو نظر نہیں آتا تو عربی زبان میں اسکو اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

"سمعت الصوت من وراء الغیب"

اب دیکھنا یہ ہے کہ کلام مجید میں اس لفظ کا استعمال لغوی معنے سے ہٹ کر تو نہیں ہوا؟ قرآن میں متعدد جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو سورۂ بقر کی بالکل ابتداء میں "یومنون بالغیب" نظر آتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت میں "غیب" کے جو یہ معنے لکھے ہیں (کہ آنکھ بند کرکے ایمان لاتے ہیں) ان سے مجھے اختلاف ہے۔ اس کا جو مفہوم عبداللہ ابن عباس نے ظاہر کیا ہے وہی درست معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے "الغیب ھو اللہ" یعنی غیب

مراد خدا کی ذات ہے۔ چونکہ خدا کی ذات مستور ہے اور نظر نہیں آتی اس لئے اس کو لفظ غیب یا غائب سے تعبیر کرنا، بالکل لغوی معنے کے لحاظ سے ہے جسمیں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔

سورۂ آل عمران میں جب جناب مریمؑ کو ان کی تطہیر و پاکیزگی کا یقین دلاتے ہوئے اطاعت و عبادت کی ہدایت کیگئی تو اسکے ساتھ ارشاد ہوا کہ:-

ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک

یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تجھے بتاتے ہیں۔ یہاں غیب کے معنی خواہ خدا کے لیجئے یا محض عالم مستور کے (جو "عالم الشہادۃ" کا ضد ہے) کوئی فرق نہیں ہوتا اور وہی لغوی معنے بدستور قائم رہتے ہیں۔

دو مقام پر صاف صاف علم غیب کے متعلق اظہارِ حقیقت کیا گیا ہے:-

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:- "وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ھو"

یعنی خدا ہی کے پاس غیب کے خزانے یا کنجیاں ہیں جن کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔ دوسری جگہ سورۂ جن میں مرقوم ہے:-

"عالم الغیب فلا یظہر علےٰ غیبہ احداً الا من ارتضیٰ من رسول"

یعنی وہ عالم الغیب (خدا) اپنا بھید کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر اس پر جسے وہ رسالت کے لئے چن لے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ انعام، سورۂ جن کی آیتیں متعارض ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ سورۂ انعام میں جو حقیقت ظاہر کی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے یعنی یہ کہ رموز غیب کا جاننے والا صرف خدا ہے اور سورۂ جن میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان رموز کو وہ اپنے رسولوں پر ظاہر کر دیتا ہے۔

اس طرح گویا سورۂ جن سے یہ امر روشن ہو گیا کہ خدا رسولوں کو علم غیب عطا کرتا ہے۔ لیکن فیصلہ کرنے سے قبل دو باتوں پر غور کر لینا ضروری ہے ایک یہ کہ عالم غیب، عالم مستور، رموز غیب وغیرہ سے کیا مراد ہے اور علم کی کتنی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

عالم غیب اور عالم شہادت، دو عالم مانے جاتے ہیں۔ عالم شہادت تو وہ جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے یا جس کا ہم کو علم ہو چکا ہے اور عالم غیب وہ جو ہماری نگاہ اور ہمارے حواس و ادراک سے پوشیدہ ہے۔ اور یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ "عالم شہادۃ" بہ نسبت عالم غیب کے نہایت مختصر ہے۔ انسانی معلومات کا نقص اور انکی تنگی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ جو کچھ انسان کو معلوم ہے اور جن امور کا وہ اپنے آپ کو محقق کہتا ہے وہ بھی اسے پوری طرح نہیں معلوم، چہ جائیکہ تمام کائنات اور رموز کائنات و آفرینش سے آگاہ ہونا۔ الغرض انسان کے سامنے جو کچھ ہے وہ عالم غیب کا نہایت ہی حقیر و مختصر سا حصہ ہے جس کا علم اس کو حاصل ہو گیا ہے اور جس کو ہم عالم الشہادۃ کہتے ہیں وہ بھی کسی وقت

عالم الغیب ہی میں داخل تھا۔

علوم حاضرہ کی تمام تحقیقات، فنون جدیدہ کی تمام معلومات کسی وقت سب عالم غیب ہی میں داخل تھیں جو بعد کو عالم الشہادت میں داخل ہوئیں، علم الکیمیا کے تمام نظریے، علم طبقات الارض کے تمام انکشافات طبعیات کے جملہ مسایل الغرض اسوقت کے، م معلومات سب عالم غیب سے متعلق تھے جواب عالم الشہادت میں آگئے ہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی کتنے غیب کے خزانے ہیں جو آیندہ انسان کو عطا ہونے والے ہیں، اسلئے یہ کہنا کہ غیب کا علم رسول کو نہیں تھا اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ کلی علم کسی انسان کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا لیکن جزئی علم ہر انسان کو حاصل ہے چہ جائیکہ انبیاء و رسل جو بہر نوع زیادہ مکمل انسان تھے۔

علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جسے علم کنہ و حقیقت کہتے ہیں دوسرا علم علت و معلول۔ قسم اول کا علم تو یقیناً سوائے ذات باری کے کسی کو نہیں ہو سکتا، لیکن قسم دوم کا علم ہر انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور عقل و دماغ کے تفاوت سے اس میں بھی مدارج ہوتے ہیں۔ اگر اسکی زیادہ تشریح کی ضرورت ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ ایک انسان یہ تو سمجھ سکتا ہے کہ جب دو چیزیں آپس میں ملیں گی تو ایک تیسری چیز پیدا ہو گی، لیکن وہ "کیوں"، کا جواب نہیں دے سکتا، کیوں کا علم صرف خدا کو ہے اور انسان اتبک بقدر یک دانۂ خردل بھی اسکو حاصل نہیں کر سکا ہے۔

اب اگر انبیاء یا رسول اللہ کے متعلق کہا جائے کہ وہ کنہ و حقیقت کا علم رکھتے تھے تو میں اسکے ماننے کیلئے طیار نہیں، لیکن جس طرح اور دوسرے انسانوں کو بعض نوامیس قدرت کا "علم معلولی"، ہو سکتا ہے، اسی طرح ان کو بھی حاصل تھا، البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کا علم، ان کی عقول عالیہ اور نفوس ذکیہ کی وجہ سے زیادہ بلند و وسیع رہا ہو۔

اب ذرا مادی دنیا سے بالکل جدا ہو کر صرف روحانی عالم میں آجائیے تو یہاں بھی وہی صورت نظر آئے گی۔ اسوقت مسمریزم، ہپناٹیزم، قوت مقناطیسی، اخبار عن الغیب، پیشین گوئی، قرأۃ افکار (دل کا حال معلوم کر لینا) یا اس قبیل رمل، جفر، نجوم وغیرہ کے ذریعہ سے احکام صادر کرنا، یہ سب علم غیب ہی سے متعلق ہیں اور انسان دماغ کو مخصوص طور پر تربیت کرنے کے بعد یہ تمام باتیں بتا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی علم کنہ و حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ نتیجہ ہے اس قوت کا جو خاص مشق کے بعد بلا کسی اصول و ضابطہ کے کسی امر کے طرف رہبری کرتی ہے۔ انبیاء چونکہ قدرت کی طرف سے نہایت ہی اعلیٰ دماغ لیکر آئے تھے اس لئے اگر وہ کوئی پیشین گوئی کر دیتے تھے، یا کسی امر غیر معلوم کے متعلق کوئی صحیح حکم لگا دیتے تھے تو حیرت کی کوئی بات نہیں اور نہ اسکو علم غیب سے متعلق کرنے میں کوئی غلطی ہے۔

آپ کے دوسرے سوال کا جواب بھی اسمیں آگیا کیونکہ اگر آدم کسی پیغمبر کا نام تھا تو پیغمبر ہونے کی وجہ سے اور اگر اس سے مراد محض انسان ہے تو انسان ہونے کی وجہ سے اسپر بھی عالم غیب کے انکشافات ہونا مستبعد نہیں تھا۔ سب سے پہلے جب انسان نے پتھروں کے اوزار بنا کر ان سے کام لیا تو یہ بھی علم غیب ہی تھا اور آج جبکہ انسان ہوا میں اُڑتا پھر رہا ہے،

غیب ہی کے خزانہ کا عطیہ ہے اور کل جب وہ کرۂ قمر میں اپنی نوآبادیوں کی بنیاد ڈالے گا، اور اہل مریخ کے ساتھ لاسلکی ٹیلی فون قایم کرے گا، اس وقت بھی یہ سب عالم غیب ہی کے ایک جزو کا انکشاف ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اگر اس سے زیادہ ترقی کرکے وہ کچھ ہو جائے جسے انسان نہیں کہہ سکتے تو بھی وہ مجبور و جاہل ہی رہیگا، اور کنہ و حقیقت کا علم یا عالم غیب کی وسعت و پہنائی کا انکشاف اس پر کبھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے دماغ میں اس ادراک کی اہلیت ہی موجود نہیں۔

نیاز

نگار بک ایجنسی کی زیر طبع کتابیں

نگارستان یعنی حضرت نیاز کی بہترین شاہکاروں کا مجموعہ ختم ہوگیا ہے۔ اسکے دوسرے اڈیشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جسمیں پہلے اڈیشن سے بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔

شاعر کا انجام حضرت نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، جسمیں زور انشار، بلندی تخیل، ندرت بیان، اجدت ادا اور جذبات حسن و محبت کا اظہار معجزانہ طور پر کیا گیا ہے۔ اور جس کی نسبت عام طور پر یہ فیصلہ ہوگیا ہے کہ ایسا مست و پر شباب افسانہ، عبارت کی ایسی رنگینی اور خیال کی ایسی بلندی کے ساتھ اردو میں کوئی نہیں لکھا گیا۔

فلسفہ مذہب سید مقبول احمد بی۔ اے کا تمام وہ سلسلۂ مضامین جو اس عنوان سے نگار میں مسلسل شایع ہو چکا ہے اور جسکو ملک نے حد درجہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

سائنس کے عجائب ہندوؤں کے بہت سے پوشیدہ علوم میں سے ایک علم سائنس کا بھی تھا جس کی مدد سے وہ بیماروں کو اچھا کرتے تھے، ماضی و مستقبل کا حال بتاتے تھے، نیک و بد ساعتوں کی تعیین کرتے تھے، اور اسی طرح کے بہت سے عجیب و غریب اعمال محض سائنس کی مدد سے دکھاتے تھے۔ اس علم کے تمام راز اس کتاب میں محفوظ کر دیے گئے ہیں اور ہر شخص اس کے مطالعہ کے بعد حیرت انگیز طور پر پیشین گوئیاں کر سکتا ہے۔

ان کتابوں کی درخواستیں درج رجسٹر ہو رہی ہیں اور جن کی درخواستیں پہلے سے درج ہو جائیں گی ان کیساتھ کوئی خاص رعایت کی جائے گی جس کا فیصلہ بعد کو ہوگا۔

"مینیجر نگار لکھنؤ"

"......ولے بخیر گزشت"

میری انکی محبت کا فسانہ اپنے آغاز، انجام اور تمام درمیانی کڑیوں کے لحاظ سے بہت مختصر تھا۔ سینما ہال کے اندر جب کہ بجلی کی روشنی عورت کو خدا جانے کیا چیز بنا دیتی ہے (مرد کا حال نہیں معلوم کہ وہ عورت کی نگاہ میں اسوقت کیسا نظر آتا ہے) انہوں نے مجھے دیکھا۔ اور میں نے انکو، تماشہ کے دوران میں ایک خاص منظر کے اثر سے ان پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ میں نے سنبھال لیا، ادھر سے شکریہ، ادھر سے اظہار عجز و انکسار پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ڈرامہ پر تنقید، فلسفۂ محبت پر ہلکی سی گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن صبح کی چاء کی دعوت اور شام کو انتہائی بے تکلفی ——— یہ تھا اس محبت کا انجام جس کے متعلق ایک ایشیائی شاعر خدا جانے کیوں یہ لکھتا ہے:—

من کردہ ام آغاز بہ پایاں کہ رساند

میں ہفتہ میں صرف دو بار سینما جانے کا عادی تھا لیکن اب روز کی شرکت ضروری ہوگئی۔ اس سے قبل بکس کے اندر بیٹھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ ہال کے تاریک ہونے کے بعد بکس کی چار سیٹوں کو جب صرف دو آدمی گھیرے ہوتے ہیں تو تماشہ کی طرف سے کیوں بالکل آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں۔

بیوی نے ایک دن پوچھا، "آجکل روز سینما جانے کی ضرورت کیوں پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے تو ہفتہ میں صرف دو بار کا معمول تھا۔ آجکل کیا روز نیا تماشہ ہوتا ہے"——— ان کی گفتگو سے ہمیشہ ایک خاص قسم کی ہیبت اپنے اوپر طاری ہوتے ہوئے محسوس کیا کرتا ہوں، خاصکر اسوقت جبکہ کسی معاملہ میں خطا میری ہو۔ میں انکے پہلے ہی فقرہ سے تقریباً بدحواس سا ہوگیا تھا لیکن انکے آخری فقرہ نے خود جواب کی طرف میری رہبری کی اور میں نے گھبرا کر کہا "ہاں، آجکل روز نیا تماشہ ہوتا ہے۔"

یہ سن کر وہ خاموش ہوگئیں، کچھ میں نے موضوع بدلنے کے لئے فوراً ہی ان کے بھائی کا ذکر شروع کر دیا جن کا خط شام کی ڈاک سے آیا تھا۔

——— "آپ نے دیکھا میری پکفورڈ کی یہ ایکٹنگ کس حد تک غیر فطری تھی"

——— "نہ صرف غیر فطری بلکہ بالکل غیر جمالیاتی"

——— "یہ لوگ کیوں اسے "محبوبۂ عالم" کہتے ہیں۔ اسمیں آخر وہ کونسی بات ہے جو کسی اور میں نہیں ہوسکتی"

——— "لوگ ہر اس چیز کو "محبوب" بنانے کے عادی ہیں جو انہیں نہ ملے۔ حالانکہ میرے نزدیک یہ بالکل غلط اصول ہے"

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا نرم ہات اپنے ہات میں لے کر دبایا اور ہال کی تاریکی میں اس نے اپنا سر میری آغوش میں رکھدیا گویا وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔

فلم تیزی کے ساتھ "چک چک" کرتا ہوا ختم ہوا۔ روشنی سے ہال جگمگا اٹھا۔ اور سب سے پہلی چیز جس نے مجھکو چونکایا، وہ ایک ہاتھ تھا۔ جس نے میرے شانوں کو جھنجوڑ کر رکھدیا۔

—— "چلئے سواری کا انتظام کیجئے۔ میں تنہا ہوں"۔ یہ میری بیوی کی آواز تھی۔ میری حالت کیا ہوئی ہوگی؟ اسکا صحیح اندازہ تو اسی وقت ہو سکتا۔ جب کوئی شخص میرے اس وقت کی حالت کا فلم تیار کرلیتا۔ لیکن مختصراً تشبیہاً یوں سمجھ لیجئے کہ اسوقت سارا کرۂ ارض مجھے دلدل نظر آرہا تھا اور میں اس میں نہایت تیزی سے سمایا جارہا تھا۔

میری بیوی یوں تو صحیح معنے میں بیوی ہے، لیکن ہے آجکل کی بیوی ہر ہر بات پر محاسبہ کرنے والی، تنقید کی اہلیت رکھنے والی۔ اور ہر طرز عمل کا سبب دریافت کرکے غیر مطمئن رہنے کی حالت میں "ستیاگرہ" اور "سوراج" کا اعلان کردینے والی، اور حقیقت یہ ہے کہ میں انکی اس آزادی سے برہم بھی نہیں تھا۔ لیکن رات بغیر میرے علم کے ، مجھے دھوکا دیکر، جاسوسی کی غرض سے سینما پہونچ جانا اور وہاں اپنے آپ کو ایک سخت ٹریجڈی کی صورت میں میرے سامنے پیش کرنا۔ یہ باتیں اسدرجہ غیر معمولی اور غیر متوقع تھیں کہ جب میں اپنے حواس میں آیا اور رات کی تنہائی میں ان پر غور کیا، تو یکسر ناقابل برداشت نظر آئیں —— میں بہت صبح اٹھ کر باہر چلا آیا اور غور کرنے لگا کہ دیکھئے نتیجہ کیا ہوتا ہے —— دفعتہً اندر سے خادمہ آئی اور ملازم کو آواز دی کہ ٹیکسی لاؤ اور اندر آکر اسباب باندھو بیگم صاحب چھوٹے میاں (یعنے اپنے بھائی) کے پاس جائیں گی" —— ٹیکسی لاؤ! اسباب باندھو! —— "اب واقعی میرا غصہ بڑھنے لگا اور "الرجال قوامون علی النساء" کی آیت پر نہایت انہماک سے غور کرنے لگا۔

یہاں تک کہ میں نے بھی عزم کرلیا کہ جاتی ہیں تو جائیں۔ نہ روکوں گا اور نہ خود بلاؤں گا —— اس کے بعد ہی میرا خیال اپنی نئی محبوبہ کی طرف منتقل ہوا اور اس کی بری باتیں بھی مجھے اچھی معلوم ہونے لگیں —— "وہ کسقدر مہذب و شایستہ ہے، کیسی محبت کرنے والی اور کسدرجہ جمیل ہے —— اگر بیوی نہیں رہنا چاہتیں تو مناسب ہے طلاق حاصل کرلیں۔ میں بھی آزاد ہو جاؤں گا اور پھر مس ..... سے شادی کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا، اسی روک کی وجہ سے میں نے ہمیشہ شادی کے ذکر کو ٹالا، لیکن اب خدا کی طرف سے اسباب پیدا ہورہے ہیں" یہ سوچتے ہوئے میں نے خط کا کاغذ نکالا اور قلم ڈبو کر لکھنے والا تھا کہ مس ..... کا آدمی آیا اور یہ رقعہ دیکر چلا گیا۔

"کل رات کے واقعہ نے میرے خیال کی دنیا کو بدل دیا ہے ممکن ہے آپ اب بھی مجھے مبتلائے فریبا

رکھنے کی کوشش کریں۔ بہرحال آیندہ کبھی مجھے مخاطب کرنے کی زحمت نہ گوارا کیجئے، میں آپ کی محبوبہ کے طرزِ عمل سے خوش ہوئی کہ اُس نے آپ کے پُرفریب خط و خال کو یوں میرے سامنے بے نقاب کر دیا۔ اُمید ہے کہ اب آپ نکاح کے وعدہ کو میری طرف سے منتقل کر کے انہیں کی خدمت میں پیش کریں گے۔ میں آج نینی تال جا رہی ہوں۔

خط پڑھ کر ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے، سر چکرانے لگا اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ بدن کا جوڑ جوڑ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر تک اس نیم مردہ حالت میں گزرنے کے بعد پھر ردِ عمل شروع ہوا، اور بیوی کے تمام محاسن ایک ایک کر کے میرے سامنے آنے لگے۔ اب مجھے کچھ ہنسی بھی آ رہی تھی کہ بیوقوف نے میری بیوی کو اپنا ہی جیسا آبرو باختہ سمجھ لیا —— اب یہ جوش پوری قوت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ اور کشاں کشاں مجھے اندر لئے جا رہا تھا۔

—— "جی ہاں، اب میرا یہاں رہنا بیکار ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی بیوی گھر میں نہیں رہ سکتی جب سینما کا پروگرام روز بدلنے لگے۔

ان کے اس فقرہ پر بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "اچھا اگر آج سے میں یہ عہد کر لوں کہ سینما کا پروگرام روز نہ بدلے گا تو بھی تم نہ مانو گی، چلی جاؤ گی"

—— "ہاں چلی جاؤں گی"

—— کیوں

—— "اس لئے کہ تمہارا کیا اعتبار"

جب ضد دلائل کے حدود میں آتی ہے تو ضد نہیں بلکہ رواداری ہو جاتی ہے۔ اسی لئے میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہا اور حلف کی تمام ممکن صورتوں کے ساتھ میں نے انہیں یقین دلایا کہ آیندہ کبھی بغیر تمہاری اجازت کے سینما کیا معنے گھر سے باہر قدم نہ نکالوں گا، کیونکہ ممکن ہے کہ پھر تمہیں مغالطہ ہو جائے اور تم ایک غیر عورت کو جس سے مجھے سوائے وقتی گفتگو کے کوئی واسطہ نہ ہو، میری محبوبہ سمجھنے لگو۔"

—— "اچھا اگر اس عورت سے تمہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور کل ہی اتفاق سے تمہاری ملاقات وہیں سینما میں ہو گئی تھی تو مجھ سے جھوٹ کیوں بولے کہ آج کل پروگرام روز بدلتا ہے"

"واللہ بیگم، یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میں کیوں جھوٹ بولا، لیکن خیر جانے دو، یہ کوئی ایسا بڑا جھوٹ نہیں کہ تم آیندہ کے لئے بھی مجھے سچ بولنے کا اہل نہ سمجھو —— اور ہاں، دیکھو آج میں نے جاوید مرحوم کے کلام پر تبصرہ کیا ہے، کل ہی سے خیال کر رہا تھا کہ تمہیں

ایک شعر سناؤں گا، دیکھو کیا خوب لکھا ہے:-

بس اک بوسہ پراتنی بحث زیبا ہے نہ شایاں ہے
نگاہیں نیچی کرلو، خیر، اچھا لے لیا ہوگا

———"چلو ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں"

ان کے "چلو ہٹو" کا میرے پاس صرف ایک ہی "مسکت" جواب ہوا کرتا ہے۔ جس سے ان کا منہ بند ہوجاتا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس سے کام نہ لیتا۔

"سنیما میں اب بھی جاتا ہوں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس دن کے بعد سے پھر کبھی سنیما کا پروگرام روز نہیں بدلا"

نیاز

تذکرۂ خندۂ گل

یا

ظریف شاعروں کا تذکرہ

مکمل ہو کر شایع ہو گیا ہے اور ان حضرات کے نام روانگی شروع ہو گئی ہے جنکی پیشگی رعایتی رقم وصول ہو چکی ہے، رعایتی میعاد خریداری ۲۰ جون کو ختم ہو گئی اسلئے اب جو صاحب طلب کرینگے انسے معہ محصول للعہ (چار روپیہ) لئے جائیں گے۔

یہ تذکرہ اُردو زبان میں بالکل نئی چیز ہے جسمیں ۳۰ سے زاید ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطائف اور کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب تنہائی کی بہترین مونس، غمزدہ دل کیلئے باعث تفریح اور ایک محقق کیلئے نادر خزینہ ہے۔

حجم معہ فہرست و سرورق ۹۲ ۴ صفحات یہ کتاب صرف نگار بک ایجنسی لکھنؤ سے معہ محصول للعہ مل سکتی ہے۔

مغنیۂ مصر
"المی" سے

بیخود سرور کیف — مست ناز ساقیہ!
رنگ بخشِ زندگی — جال طراز قاتلہ!
خضر جادۂ نجات — پاکباز کافرہ!
دلنواز نغمہ گر — دل ربا مغنیہ!
مستیاں لٹائے جا
زمزمے اڑائے جا

لڑکھڑا خمار سے! — تھرتھرا شراب میں!!
جگمگا جمال سے — جھلملا حجاب میں!!
مستیوں میں جھوم جا — مسکرا شباب میں!!
ہاں کوئی اثر بھرا — گیت گا رباب میں!!
جوش دل بڑھائے جا
زمزمے اڑائے جا

نازنین صدائیں ہوں — نازنین زمزمے
یاسمیں نوائیں ہوں — یاسمین زمزمے
دلنشین ادائیں ہوں — دلنشین زمزمے
اے حسین مطربہ! — گا! حسین زمزمے
آگ سی لگائے جا
زمزمے اڑائے جا

تیری اک نظر میں ہے — صد جہانِ میکدہ
تجھ پہ جان دے چکے — بے کسانِ میکدہ
تیری خاکِ پا میں ہے — آستانِ میکدہ
مستِ بادۂ جمال — جانِ جانِ میکدہ
آتشیں پلائے جا
زمزمے اڑائے جا

آبشارِ نیل میں — رقصِ موجِ نور ہے
قطرۂ خراب بھی — چشمۂ سرور ہے
گوشہ گوشہ خلد ہے — ذرہ ذرہ طور ہے
مطربہ نہیں ہے تو! — ہاں "ارم" کی حور ہے
عظمتیں لٹائے جا!
زمزمے اڑائے جا!

ہے سرودِ زمزمہ — یا خمارِ رنگ و بو
"کیف گاہِ نیل" ہے — سجدہ زارِ رنگ و بو
تیری ہر ادا میں ہے — صد بہارِ رنگ و بو
کیا ترا ہی نام ہے؟ — "تاجدارِ رنگ و بو؟
شوخ گیت گائے جا!
زمزمے اڑائے جا!

نجم ضو بدست ہیں — مہر ضیا بدوش ہے
عشق میگسار ہے — حسن مے فروش ہے
"رنگ" جنت نظر — راگ خلد گوش ہے

مرمریں لباس میں حور پردہ پوش ہے
بجلیاں گرائے جا!
زمزمے اڑائے جا!

زلفِ عنبریں تری کفرِ دل نواز ہے
اس حسیں حجاب میں زندگی کا راز ہے
ابروئے سیاہ میں کعبۂ مجاز ہے
تیری خاکِ راہ میں سجدہ گاہِ ناز ہے
بے خبر بنائے جا!
زمزمے اڑائے جا!

سرمگیں نگاہ میں نشۂ حجاب ہے
شوخیٔ لباس میں عصمتِ شباب ہے
زلفِ نازنیں نہیں کیف گر سحاب ہے
موجِ مستِ کن ہے یا نغمۂ رباب ہے
جھوم اور جھمائے جا!
زمزمے اڑائے جا!

تیرے زمزموں میں ہے سوز و سازِ زندگی
بے نقاب کر دیا تو نے رازِ زندگی
تری اک نگاہ ہے امتیازِ زندگی
آج کائنات ہے بے نیازِ زندگی
حسرتیں مٹائے جا
زمزمے اڑائے جا

روش صدیقی

غزل فرخ بنارسی

ایسا بیگانہ کیا تیری شناسائی نے — پھیر لی سب سے نظر چشمِ تماشائی نے
امتیازِ حرم و دیر بھی باقی نہ رہا — ایسا خود رفتہ کیا شوقِ جبیں سائی نے
بیخودی جذبِ محبت کی الٰہی توبہ — درد کو درد نہ سمجھا ترے شیدائی نے
کم نہیں زندگیٔ خضر سے ایک ایک نفس — مدتِ عمر بڑھا دی غمِ تنہائی نے
پردۂ برق میں اے ہوش اڑانیوالے — اب نہ چھپ دیکھ لیا تجھکو تماشائی نے
تپش اندوز ہے ہر ذرہ بزمِ ہستی — تہلکہ ڈالدیا ہے تری رعنائی نے
حشر میں دیکھتے ہی سب مجھے پہچان گئے — طول کھینچا ہے کہاں تک مری رسوائی نے
اب عناصر میں وہ ترتیب تناسب ہی — اسقدر خاک اڑائی ترے سودائی نے
عبرت آموز ہے نیرنگ جہاں اے فرخ
انقلابات کے ہیں شام و سحر آئینے

غزل نظیر لودھیانوی

غم سے گھل گھل کے محبت میں فنا ہو جانا — بزمِ ہستی میں ہے آپ اپنی دوا ہو جانا
زیرِ خنجر بھی جبیں جھک گئی اللہ اللہ! — اسقدر بندۂ تسلیم و رضا ہو جانا
چشم پر آب، زباں بند، نظر سوئے فلک — یہ ہے غافل ہمہ تن دستِ دعا ہو جانا
جاگ اٹھا دردِ محبت سے مرا ہر ذرہ — سہل ہے اب مرے ہر عقدہ کا وا ہو جانا
دل ترا خیر طلب آنکھ تری دست نگر — اب تری قید سے مشکل ہے رہا ہو جانا
چشمِ حسرت نے دمِ ذبح یہ کیا قہر کیا — ہائے اس قاتلِ برکش کا خفا ہو جانا
عقل ہر دم دلِ مضطر کو یہ سمجھاتی ہے — اب مجھے چاہیے آزادِ وفا ہو جانا
میرے نزدیک ہے محبوبِ دو عالم بننا — دمِ خنجر سے ترے سرخ قبا ہو جانا
میرے گہوارۂ دل میں بھی وہ آتے ہیں نظیر
کر اسے آتا ہے آغوش حرا ہو جانا

غم روزگار

میں اک حکیم ہوں میرے حریم دانش میں   نوائے ساز حقیقت ہے نغمۂ تمثیل

ضمیر دہر پہ فطرت کے راز کھل نہ سکیں   گرہ کشا جو نہو، میرا ناخن تاویل

مری نگاہ میں پنہاں حقائق تخلیق   مرے خیال میں رخشاں معارف تکمیل

بہار گلشن اسرار ہے۔ مری توضیح   ضیائے جلوۂ پندار ہے، مری تفصیل

میں اس فضا میں ہوں سرگرم شام و سحر   جہاں ہے۔ عاجز پرواز، شہپر جبریل

مگر بایں ہمہ، دانش، غم زمانہ تلخ،   بجھا رہا ہے مری بزم فکر کی قندیل

ہوئے ہیں جس سے ارادات دلنشیں مجروح   کیا ہے جسنے مری ہمتوں کو پست و ذلیل

تجھے دکھاؤں کہ کیا چیز ہے مری ہستی   ہزار جلوۂ باطن ہیں طالب تحصیل

یہ خار کاش مرے قلب سے نکل جائے

(۲)

میں ایک صاحب اہل و عیال شوہر ہوں   مری مسرت معصوم صد چمن بر دوش

طلوع صبح کے ہمراہ مسکراتی ہے   سکوت شب میں سناتی ہے نغمۂ خاموش

عطا ہوئی ہے وہ چھوٹی سی سلطنت مجھکو   کنار امن ہے جسکا طرب فزا آغوش

مرے حدود قلمرو میں عداوتیں مفقود   مرے چمن کی فضا میں خزاں بہار فروش

مگر زمانۂ نا اہل کی ستم گاری   دبا رہی ہے مرے ولولوں کا پیہم جوش

مری جبیں سے عیاں ہے مری شکستہ دلی   اگرچہ شاہد عشرت ہے میری حلقہ بگوش

بتا کہ اسکے سمجھنے کی تجھکو قدرت ہے!   وہ تلخ ساعت ہستی، وہ برق خرمن ہوش

کہ تیرے سامنے معصوم ہستیوں کو لئے   جب ایک چاند سے زائد حسین حیا پوش

سجی ہو جلوۂ عصمت سے جسکی پیشانی   جو نشہ ہائے پاکیزگی سے ہو مدہوش

کھڑی ہو چشم غزالیں میں ڈبڈبائے اشک   نگاہ حزن بہ دامن لوائے غم بر دوش

اور اسکی ہو نہ سکیں تجھسے حاجتیں پوری   اگرچہ ہو تو خرد آشنا و صاحب ہوش

زمانہ گرچہ مرے پاؤں چومتا ہے مگر   یہ زندگی ہے مری حق میں موت کی آغوش

خدا کرے کہ زمانہ کا رخ بدل جائے

(۳)

میں ایک شاعر رمز آشنائے فطرت ہوں   مری نگاہ میں ہے خوب و زشت شام و سحر

ہر ایک پھول ہے میرے لئے حریم جمال   کلی کلی ہے مرے واسطے بہشت نظر

ادھر سحر ہے بہ اندازۂ رباب نشاط   ادھر ہے شام بہ طرز سرود کیف اثر

تجھے ہے، سطح کے جلووں سے یکسر اطمینان   مری نگاہ ہے با وصف تہ رسی مضطر

مجاز ہا میں پاتا ہوں گاہ خاموشی   کبھی خموش فضاؤں میں شورش محشر

وہاں ہوئی ہے ضیا بار مری شمع دماغ   چراغ کشتہ ہیں جس انجمن میں شمس و قمر

مری نگاہ سے تو کاش اسکو دیکھ سکے   یہ کارخانۂ ہستی ہے اک فریب نظر

مگر وہ روح کہ غمگینیوں سے ہے لبریز   رہین بیخبری ہے جو باوجود خبر

جسے کیا ہے زمانہ کی سرد مہری نے   قفس رسیدۂ آلام، طائر بے پر

حیات جسکے سبب سے ہوئی ہے "مرگ حیات"   نشاط جسکے اثر سے ملال غم پرور

اسی سے ہے مرے افکار کی جبیں تاریک   اسی سے ہے مری لیلائے شعر خاک بسر

تجھے دکھاؤں جو حالت مری سنبھل جائے

سید علی اختر

"آجا"

(۱)

کوئل کوک رہی ہے پیہم کیری آنے کا ہے موسم
پچھلی رات کا سناٹا ہے سویا ہوا ہے سارا عالم
تاروں کی چشمک سے ہوئی ہے اوجِ فلک پر جھم جھم جھم جھم
چاند افق میں ڈوب رہا ہے مہک رہی ہے "شب کی بیگم"
اب بھی آنے والے آجا!
آ، اللہ ستالے آجا!

(۲)

رخ سے ہٹا کر زلفِ پریشاں اٹھی "عروس شب" وہ عریاں
بگڑی مانگ میں کاہکشاں کی بکھری ہوئی ہے گویا افشاں
زہرہ رشک سے جھانک رہی ہے رقص کناں ہیں رات کی پریاں
اک دریائے "موسیقی" میں ڈوب رہی ہے بزمِ امکاں
آجا تو بھی گا لے آجا،
اپنا رباب اٹھا لے آجا!

(۳)

اپنی نیند سلانے والے اپنی نیند اٹھانے والے
بھولی باتیں یاد دلا کر! ساری رات جگانے والے
ہر ہچکی پہ چٹکی لے کر! دل کی خلش کو بڑھانے والے
روح میں ایک چراغ جلا کر جسم میں آگ لگانے والے
آجا! اور جلا لے آجا!
تڑپا لے ترسا لے آجا!

(۴)

دل سے اک سیلاب اٹھا ہے سینہ میں ہیجان بپا ہے
یاس کی طوفانی موجوں میں آس کا بیڑا ڈوب رہا ہے
آنکھ کی روشن بینائی پر اشک نے پردہ ڈال دیا ہے
خاموشی ہے تاریکی ہے! کون ایسے میں دیکھ رہا ہے
میرے بھولے بھالے آجا!
اب بھی دیکھ ستالے آجا!

(۵)

....آجا کوئی شراب پلا دے ہوش میں ہوں مدہوش بنا دے
چھیڑ دے احساسِ خوابیدہ قلب کی حرکت اور بڑھا دے
اچھا اپنا پتہ نہ بتلا..... مجھکو میرا پتہ بتا دے
یعنی پردۂ راز اٹھا کر آج حریمِ ناز دکھا دے
محرم راز بنالے آجا!
آ میرے متوالے آجا!

طالب باغپتی

نگار

فہرست مضامین اگست ۱۹۲۹ء

ملاحظات ــــــ ۲

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز ــ عبدالقیوم پیا ۹

بازگشت ــــ (مجنون گورکھپوری) ۲۰

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر (عبدالمالک آروی) ۳۹

وعدہ شکن ــــ (محشر عابدی) ــ ۴۹

فسانۂ عجائب ــــ (نقاد) ــ ۵۶

ریختی گوئی کا موجد کون تھا؟ (سید تمکین کاظمی) ۶۵

باب المراسلۃ والمناظرۃ ــــ ۷۲

باب الاستفسار ــــ ۷۵

مطبوعات موصولہ ــــ ۸۲

بہاریہ ــــ (م۔بہار) ــ ۸۸

صبح۔ راوی کے کنارے (راشد علیپوری) ۸۹

مقبرہ ہمایون ــــ (محمود۔ اسرائیلی) ــ ۹۰

آزادی ــــ (جگر بریلوی) ــ ۹۲

غزلیات ــــ ۹۳

معلومات ــــ ۹۵

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶) اگست سنہ ۱۹۲۹ع شمار (۲)

ملاحظات

اگر خالص لکھنوی آبادی کا تجزیہ کیا جائے تو غالباً اس کے صرف تین عنصر دریافت ہوں گے۔ شاعر، حکیم، افیونی اور ان تینوں کو اپنی فطرت، پیشہ اور مشرب کے لحاظ سے جس درجہ مرنجاں مرنج، صلح کل اور منکسر مزاج ہونا چاہئے ظاہر ہے۔ یہ میں اس وقت کہتا ہوں ورنہ اس سے قبل اوائل عمر اور زمانۂ طالب علمی میں، جس لکھنؤ کو میں نے دیکھا وہ موجودہ لکھنؤ سے بہت مختلف تھا۔ مولوی صدیق حسن غازیپوری میرے اتالیق ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے اور ہر چند یہ اپنے حلقۂ احباب میں بہت رنگین مزاج مشہور تھے، مگر میرے لئے وہ ایک مستقل بے آب و رنگ چیز تھے اور میں نے ہمیشہ انکو نگاہ کراہت سے دیکھا۔ دن کا تمام حصہ اور رات کے کچھ گھنٹے انہیں کی بے مہری اور عبوس فطرت کی معیت میں بسر ہوتے تھے اور میری حالت ایک طایر پر بند سے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے اگر کسی دن مجھ کو آزادی نصیب ہو جاتی تھی، تو میں لکھنؤ کو حد درجہ حریص نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اس قلیل فرصت کو تتبع و مطالعہ نہیں بلکہ زیادہ تر صرف قیاس و خیال سے کام لیکر رنگین بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی مجھے وہ نامعلوم سی کشش یاد ہے جو یہاں کی در و دیوار میں محسوس کرتا تھا اور ہنوز اس محبت کی لذت میرے دل سے محو نہیں ہوئی، جو یہاں کی فضا سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو میری

لکھنوی زندگی کا دور اولین سمجھنا چاہیے

میری عمر اسوقت زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ سال کی ہوگی، لیکن نہ صرف صحت جسمانی و استواری اعضاء کے لحاظ سے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ فارسی ادبیات ختم کر چکا تھا اور عربی کے درس نظامی کی نشاط کش اور ہادم لذات مشغلہ کے باوجود ابھی تک عرفی و نظیری، غالب و بیدل میرے دل و دماغ پر مستولی تھے۔ صوری و معنوی دونوں طرح دوسروں کو بھی نوجوان نظر آتا تھا اور خود بھی عنفوان شباب کی لذت کو ایک نئی کھلنے والی کلی کی خوشبو کی طرح محسوس کر رہا تھا۔

میرے والد اسوقت دولت گنج کے تھانہ میں انچارج تھے اور چونکہ خود فارسی کے اچھے ادیب شاعر تھے اور اپنے اخلاق و خصائص کی وجہ سے نہایت ہی دلچسپ و ہر دلعزیز انسان تھے، اس لئے صبح و شام ایک اچھی خاصی مجلس شعراء، امراء و ظرفاء کی برپا ہو جاتی تھی

شاعروں میں سے صرف ایک صاحب (نتھو میاں شفیق) کا نام مجھے یاد رہ گیا ہے، اور انکی یہ خصوصیت بھی یاد ہے کہ کان پر نیم کا تنکا (غالباً خلال کرنے کیلئے) ضرور رکھا رہتا تھا۔ ظرفاء میں سے ایک صاحب سید باقر حسین تھے افیون اور ٹیر ان کے نشاط زندگی کا جزو لازم تھیں۔ میں نے اسوقت تک ایسا دلچسپ و لطیف گفتگو کرنے والا انسان نہیں دیکھا۔ وہ بات بات پر انکی لطیفہ سنجیاں، شعر خوانیاں، خوش الحانیاں اور لکھنؤ کے صحیح ٹکسالی محاورات کا استعمال مختصراً یوں سمجھئے کہ :-

"از اثر ناطقہ بند م طراز"

کی صحیح و مکمل تصویر تھے

الغرض وہ ماحول جو اوایل عمر میں یہاں پیدا ہو گیا تھا وہ میرے احساسات کے لحاظ سے ایسا پر لطف تھا کہ ہر وقت میرے دماغ پر نشہ سا چھایا رہتا تھا اور لکھنؤ کی ساری فضا کو اسی کیفیت میں ڈوبا ہوا پاتا جس نے مجھے سرشار بنا رکھا تھا۔ یہ دوسرا دور تھا، جو یہاں آکر ختم ہوتا ہے

دن گزرتے گئے اور رفتہ رفتہ میری عمر کے ساتھ پابندیاں بھی کم ہوتی گئیں، یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب والد نے اپنے خاص اصول تربیت کی بنا پر مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا اور یہی وہ تیسرا دور تھا جس نے مجھے بتایا کہ زندگی کسے کہتے ہیں، شاعری کا خلاق کیا ہے اور بہت سے شاعرانہ الفاظ و تراکیب کا صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے قبل فارسی ادبیات اور اردو شاعری کا جو مطالعہ میں نے کیا تھا، وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی مرئی چیز کا درس صرف سامعہ کے ذریعہ سے دیا جائے۔ لیکن اب مجھے اجازت تھی کہ دیکھنے کی چیزوں کو دیکھوں، سننے کی باتوں کو سنوں اور اشیاء چھونے کے لئے وضع ہوئی ہیں انہیں اپنے لمس سے محسوس کروں۔

اس سے قبل میں غالب کی ایک مثنوی کا یہ شعر پڑھ چکا تھا:

جلوہ گرے آفت نظارۂ برق زمستاں دے انگارۂ

لیکن حقیقت یہ ہی کہ میرا استاد باوجود کوشش بلیغ کے مجھے کبھی نہ سمجھا سکا کہ جلوہ گری کا صحیح مفہوم کیا ہے اور "آفتِ نظارہ" کس نوع کا "آشوب چشم" ہے۔ لیکن اب از خود اک الہامی کیفیت کے ساتھ نہ صرف یہی بلکہ:۔

"میانہا نازک و دلہا توانا" کی حقیقت

"قیامت قامتاں مژگاں درازں" کا مفہوم

"زرنگیں جلوہا غارتگر ہوش" کا علم مجھے حاصل ہو رہا تھا

بلکہ اس سے بھی زیادہ

"زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام" اور

"کتان خویش می شوئیم بہ مہتاب"، کے

مدارج و منازل سے گزر رہا تھا

الغرض لکھنؤ کے مطالعۂ اولین کا آخری منظر جس طرح ختم ہوا وہ تو ایک ایسی چیز تھا جو ہر حال و صورت میں جائے

دعوتِ برگے و نوائے کند

اور اس لئے جب میں یہاں سے جدا ہوا تو میری حالت ایسی تھی جیسے ساون میں کسی کی بینائی زایل ہو

میں نے لکھنؤ کو اپنی عمر کے جس خوشگوار موسم میں اول اول دیکھا اُسے

"زموج گل بہاراں بستہ زنار"

کہنا چاہئے اور اسکا تعلق بالکل خود فراموشانہ اور اس لئے غیر ذمہ دارانہ زندگی سے تھا۔ اُس کے بعد بھی بارہا لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا لیکن بالکل مسافرانہ یا کبھی کبھی کسی خاص ضرورت سے مجبورانہ جس کو شاعری یا شاعرانہ احساس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مرتبہ جب میں نے مستقلاً یہاں قیام کا ارادہ کیا تو حالاتِ زندگی بالکل بدل چکے تھے، حیات کی مشکلات اور عاملانہ ذمہ داریوں نے بقول غالب

"زدشواریِ زیستن مردہ"

بنا رکھا تھا، نہ وہ فراغتِ خیال تھی، نہ آسودگی حال، نہ وہ جوش نشاط تھا نہ وہ سِن و سال۔ "فکر فضول"، کی جگہ "غور و تامل" نے "جراتِ رندانہ" کی جگہ "احتراز پیرانہ" نے لے لی تھی اور خیالات کے شیریں عالم سے ہٹ کر واقعات کی "تلخ گزار" دنیا میں آ گیا تھا۔ بہرحال اس مرتبہ میرا لکھنؤ آنا نہ عہد گذشتہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے تھا اور نہ اس کا ماتم کرنے کے لئے،

بلکہ بجائے تماشائی کے، یہاں کی آبادی میں شامل ہو کر خود تماشا بننے کے لئے

اگر گذشتہ تین سال کا مسلسل قیام اور آیندہ کے لئے تا بقائے حیات یہیں رہنے کا عزم راسخ، مجھے (اہل لکھنؤ تو خیر کیا) خادمانِ لکھنؤ میں شامل کر سکتا ہے، تو مجھ کو یہ حق غالباً حاصل ہے کہ باشندۂ لکھنؤ ہونے کی حیثیت سے اپنے اُن تجربات کا ذکر کروں جو اسوقت تک دورانِ قیام میں مجکو یہاں حاصل ہوئے۔

اب آپ اس مقالہ کے اولین فقرہ کی طرف پھر توجہ کیجئے جو خالص لکھنؤ کی آبادی کے "عناصر سہ گانہ" کے متعلق میں نے لکھا تھا ——— ہاں، تو ان تین عنصروں میں سے اس وقت مجھے جس سے بحث کرنا ہے وہ "عنصر شعراء" ہے، جسمیں اہل صحافت کو بھی شامل کر لینا چاہئیے

لکھنؤ کے شاعروں میں بڑا حصہ تو ان حضرات کا ہے جو یہیں کی خاک سے پیدا ہوئے یا یہیں کی سرزمین سے اپنے آپ کو منسوب کر کے لکھنوی لکھتے ہیں (اس جماعت میں بعض وہ حضرات بھی شامل ہیں جو ہیں تو ضلع لکھنؤ کے کسی قریہ یا دیہہ کے، لیکن اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں وہ لکھنوی ہی) دوسرا چھوٹا حصہ ان بیرونی شاعروں کا ہے جو بسلسلۂ ملازمت، تجارت یا تعلیم و تعلم وغیرہ یہاں مستقلاً یا عارضی طور پر مقیم ہیں

گذشتہ تین سال کے اندر میں نے اسکو نہایت تکلیف سے ساتھ محسوس کیا کہ یہ دونوں جماعتیں، باوجود ہم مشرب و ہم مسلک ہونے کے ایک دوسرے کی حد درجہ مخالف ہیں اور کسی محفل میں ان دونوں کا اجتماع گویا دو متصادم عناصر کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ وہ دہقانی ہے، گنوار ہے، لکھنؤ کے محاورات، یہاں کی زبان اور یہاں کے لب و لہجہ سے کیا واقف ہو سکتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ

انچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

لکھنؤ میں آجتک کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا، یہاں کی سرزمین میں اس جنس بے بہا کی پیداوار کی اہلیت ہی نہیں ہے۔ تغزل نام ہے جذبات نگاری کا جس سے یہاں کے شعراء بالکل ناآشنا ہیں اور صرف رعایت لفظی کے جھوٹے طلسم میں اپنے آپ کو پھنسائے ہوئے ہیں

ہر چند میں، اس وقت لکھنوی و غیر لکھنوی شاعری کے فرق و امتیاز پر بحث کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں، مگر جہاں تک تنقید صحیح کا تعلق ہے ضمناً یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اس مسئلہ میں دونوں زیادتی پر ہیں

اہل لکھنؤ کا ظلم تو یہ ہے کہ وہ یہاں کی فضا میں کسی بیرونی شاعر کا در خور دیکھ ہی نہیں سکتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی غیر کا ان کی محفل یا ان کے شہر میں غزل پڑھ دینا گویا "باندازۂ یک غزل" انکی شہرت کو صدمہ پہونچانا ہے۔ اور اس کا انتقام لینے کے لئے وہ زبان، محاورہ وغیرہ کے دلایل سامنے لاتے ہیں جو اسوقت واقعی بالکل بے معنی سی بات ہے

غیر لکھنوی شعراء کی یہ زیادتی ہے کہ اُن کو لکھنؤ مین کوئی شاعر نظر ہی نہین آتا اور زبان کی شاعری یا رعایت الفاظ کو وہ ایسی معمولی بات سمجھتے ہین کہ ہر شخص اس کو حاصل کر سکتا ہے علاوہ اس کے اگر جذبات نگاری ہی کو اصل چیز مان لیا جائے تو بھی اس کے نمونے یہان کے شعراء (اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ آجکل کے شعرا) کے کلام مین ملسکتے ہین

حال ہی مین رسالۂ مبصر نے بعض لکھنوی شعراء کے کلام کا انتخاب دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بعض بعض شعر بہت خوب ہین مثلاً جناب آشفتہ کے یہ اشعار:-

کوئی پوچھے دل وحشی سے حقیقت اسکی   وہ جو اک چیز نظر آتی ہے ویرانون مین
جلا کے خاک نہ کر دو نگاہ برق سے پہلے   پرون مین آگ لگائے ہون آشیان کیلئے
تو نے اُسے بھی لغزش منصور کھو دیا   اک اعتبار تھا رسن و دار پر مجھے
ایسا تلاش دوست نے بیگانہ کر دیا   پہچانتی نہین ہے کسی کی نظر مجھے

جذبات نگاری سے الگ ہٹ کر بھی خالص لکھنوی رنگ کے یہ اشعار جناب آشفتہ کے بُرے نہیں:-

اپنی ہوس تو دیکھ کہ تو اور نگاہ ناز   اے دل خدا کرے تجھے رسوا کرے کوئی
ہان مرے دل یہ ابھی زخم ہے ناسور نہین   تم سلامت ہو تو وہ دن بھی کوئی دور نہین

اس طرح منظر لکھنوی کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے

اے نسیم سحری ڈھونڈھتی پھرتی ہے کسے   اب کہان جاگنے والا شب تنہائی کا
گلے تک یون نہین آیا ہے خنجر   جفاؤن کو وفا کہنا پڑا ہے
مجھے تو خندۂ گل نے کیا تھا آپ سے باہر   تمھین نے ہات بڑھکر رکھدیا ہوتا گریبان پر

قدیر لکھنوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے

اب مری آواز پر اے بیخبر آواز دے   سنتے سنتے تھک گیا ہون مین کہ منزل دور ہے

شمس لکھنوی کہتے ہین:-

روتے روتے ابھی آئی تھی ذرا دل کو ہنسی   آپ نے پھر وہی ذکر دل ناشاد کیا
یہ کیا کیا کہ جدا ہو گئے گلے مل کے   ابھی تو زخم بھی بھرنے نہ پائے تھے دل کے
یہ کس نے آتے ہی رخ سے اُٹھا دیا ہے نقاب   کہ جھلملانے لگے سب چراغ محفل کے
ادھر نقشہ پھرا آنکھون مین اور بجلی ادھر چمکی   نہین اب خوف آتا ہے خیال آشیان کرتے
اب زلیخا ہے نہ وہ بھیڑ خریدارون کی   لے گیا لوٹ کے رونق کوئی بازارون کی

سراج لکھنوی کا یہ شعر کیا داد طلب نہیں؟

وہ سر مرا وہ یار کا زانو وہ شام وصل　　　اللہ پھر وہ خواب نہ آیا نظر مجھے

الغرض اسی طرح اور لکھنوی شعراء کے کلام مین بھی اچھے نمونے غزلگوئی کے ملسکتے ہین ۔ یہ اُن حضرات کا کلام ہے جو آجکل کے نوجوان شعراء مین شمار کئے جاتے ہین، ورنہ کہنہ مشق شاعرون مین صفی، عزیز، اثر وغیرہ کا جو رنگ شاعری ہے اسکے اچھا ہونے مین کسے کلام ہو سکتا ہے:۔

الغرض بیرونی شاعرون کی بھی یہ زیادتی مجھے پسند نہین کہ اُن کو یہان کی شاعری مین کوئی خوبی نظر ہی نہین آتی ہے چونکہ ضمناً شاعری کا ذکر آگیا تھا اس لئے اس سے زیادہ مجھے اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت نہین ۔

میرا اصل مقصود بالکل اس سے علیحدہ صرف انسانیت، اجتماعیت، و اخوت کی بنا پر یہ عرض کرنا تھا کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے شعر و شاعری کے جھگڑون کو علیحدہ کر دیا جائے تو بھی ایک رشتہ بیرونی و اندرونی شعراء مین فطرت کی طرف سے ایسا قایم ہے کہ اگر اس کا پاس کیا جائے تو یہ باہمی مناقشت و منافست بہ آسانی دور ہو سکتی ہے اور مخالفت کی موجودہ صورت جو سب و شتم تک پہونچگئی ہے بڑی حد تک اصلاح کو قبول کر سکتی ہے

معین الادب، معراج الادب، خاصان ادب، لکھنوی، غیر لکھنوی، اور اسی طرح کے تمام بے معنی اصطلاحون کو جن سے بوئے تفریق آتی ہے یکسر مٹ جانا چاہئے اور سب کو یہ سمجھکر کہ ایک جگہ کے باشندہ ہین، ایک ہی فضا مین سانس لے رہے ہین، انسان پیدا ہوئے ہین، نظام تمدن کے سلسلہ مین تعاون عمل ضروری ہے، رواداری و ایثار سے کام لے کر باہم مل جانا چاہئے ۔ شاعری سے زیادہ ضروری و اہم چیز ”پاس انسانیت“ ہے ۔ ایک شاعر اگر دوسرے سے اچھا ہے تو کوئی خوبی کی بات نہین ۔ قابل فخر یہ امر ہے کہ کون ”انسان“ زیادہ ہے، اگر میرا شعر تقطیع سے گرتا ہے تو گرنے دیجئے مجھ سے نفرت نہ کیجئے میرے عادات و اطوار کو دیکھئے کہ وہ تو انسانیت سے گرے ہوئے نہین ہین، اسی طرح اگر آپ کے تمام اشعار جواہر کی لڑیان ہین تو مجھے کیا اگر آپ کے اخلاق خذف ریزون سے بدتر ہین

مجھے نہین معلوم کہ یہان کی مختلف انجمنون کا سر رشتۂ حیات و عمل کن ہاتھون مین ہے اور بیرونی شعراء مین کس کو ”سرغنہ“ ہونے کا مرتبہ حاصل ہے، اس لئے مین تخصیص کے ساتھ کسی سے خطاب نہین کر سکتا بلکہ عمومی طور پر ہر جماعت اور جماعت کے ہر ہر فرد کی توجہ اس جانب مبذول کرنا چاہتا ہون کہ شاعری کی بے بود نمایش پر ”حقیقتون“ کو پامال نہ کرین اور ایک دوسرے کے ساتھ ملکر زندگی بسر کرنا سیکھین کہ وقت کی نزاکت اب اس سے زیادہ خطرناک مرکز پر نہین پہونچ سکتی ۔ پھر اگر یہ مقصود ترک شاعری کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے تو مین اس کے ترک کا مشورہ دونگا کیونکہ شاعری کا ماتم اسقدر سخت چیز نہین ہے جسقدر انسانیت و اخلاق کا ماتم ۔ اُس کے نہ ہونے سے تو صرف ہماری گرمی محفل پر اثر پڑیگا، لیکن اس کا فقدان تو ہماری موت، قوم کی موت اور روحانیت کی موت ہے، جو یقیناً حشر سے بھی بے نیاز ہے ۔

مین باوجود سعی و ارادہ ابھی تک سفر دکن کے لئے طیار نہین ہوسکا۔ اور اب آیندہ کے لئے ماہ و تاریخ کی تعیین کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہون کیونکہ میرے اور خدا کے درمیان اکثر یہی معاملہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی برتری و خداوندی کو میرے عزائم توڑکر ثابت کرتا ہے اور مین بھی "علاجے نیست داغ بندگی را" کہکر خاموش ہو جاتا ہون

اس درمیان مین دکن کے جن احباب نے میرے اس عزم کا ذکر نگار مین دیکھ کر مجھے دعوتی خطوط روانہ کئے انکا شکریہ ادا کرتے ہوئے بہ ادب عرض کرتا ہون کہ جب تک مین وہان پہونچ نہ جاؤن، میرے کسی قول کا اعتبار نہ کرین، کیونکہ یہان کے مشاغل پیچھا نہین چھوڑتے اور باوجود ہر ممکن کوشش کے مین ہنوز روانگی کا انتظام نہین کر سکا۔ یہ یقینی ہے کہ مین ایک بار "خاک پاک دکن" کی زیارت کرونگا ضرور، لیکن کب؟ اس کا جواب بجائے وعدہ کے "ایفاء عہد" سے دینا چاہتا ہون، بشرط آنکہ "عمر بے وفائی نہ کرے"۔ آرزو تو یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اخیر اگست یا اوایل ستمبر تک وہان پہونچ سکون

گذشتہ چند ماہ سے مسلسل نگار مین "علمی و ادبی دعوت" کے عنوان سے جو اعلان شایع ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق مین یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہون کہ جو حضرات ظفر یا ظفر کی شاعری کے متعلق لکھین وہ واقعی محنت و تحقیق کا نتیجہ ہونا چاہئے، محض اس کی شاعری پر معمولی تبصرہ کافی نہ ہوگا۔ مین چاہتا ہون کہ ظفر کے متعلق جو مضمون ہو وہ سیرت نگاری و تنقید کا بہترین نمونہ ہو۔ سو روپیہ کا جو ہدیہ مقرر کیا گیا ہے، اس سے مقصود صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ اس باب میں نگار اپنی پوری ذمہ داری کو محسوس کر رہا ہے، نہ یہ کہ وہ ارباب علم و ادب جنکا مرتبہ اس نوع کے حقیر ہدایا قبول کرنے سے بلند و ارفع ہے، ان کو اس طرح نایل کیا جائے یہ مین نے اس لئے ظاہر کر دیا کہ مبادا رفیع المرتبت ہستیان محض انعام یا ہدیہ کے خیال سے محفل ظفر مین شرکت کرنے سے ابا کرین

اس ماہ کی اشاعت مین پہلا مضمون سلسلہ کا ہے اور جس کی اہمیت کی طرف مین اس سے قبل توجہ دلا چکا ہون، اگر یہ ترجمہ، ترجمہ کی شان سے ہٹکر پیش کیا جاتا، تو زبان کی سلاست اور جملون کے ربط مین زیادہ حسن پیدا ہو جاتا۔ بہر حال مفہوم اور معنی کے لحاظ سے یہ سلسلہ خاص چیز ہے۔

ایک ماہ کے بعد پھر جناب مجنون گورکھپوری کا افسانہ شایع ہو رہا ہے جس کا سلسلہ آیندہ دو ماہ تک قایم رہیگا ناظرین نگار کے لئے چونکہ مجنون اور ان کے افسانے کوئی نئی چیز نہین ہے اس لئے تعارف کی ضرورت نہین

دوسرا افسانہ وعدہ شکن المحشر عابدی کا ہے جو گولڈ اسمتھ سے لیا گیا ہے۔

تنقید فسانہ عجائب کے سلسلہ مین جناب نقاد نے اردو کے قدیم فسانون پر نہایت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون ماہ آیندہ مین ختم ہو جائیگا۔ ریختی گوئی پر جناب تمکین کاظمی کا مضمون نہایت معقول ہے۔ حصۂ منظومات مین فارسی کی نظم بہاریہ، ایران کے ملک الشعراء مرحوم بہار کی ہے جو طہران کے مشہور اخبار وطن سے نقل کی گئی ہے۔ مقبرۂ ہمایون پر جناب محمود اسرائیلی نے بھی بہت پاکیزہ نظم لکھی ہے۔ غزلون مین اختر شیرانی کی غزل کے بعض اشعار غایت درجہ شعر واقع ہوئے ہین

نیاز

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

اور

قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

— "نگار" —

سلطنت ہند اس سلسلہ مین نوآبادیات کی طرح سلطنت ہند سے اسی حد تک بحث کی جائیگی جہان تک اس قانون توسیع کی تشریح ہوتی ہو جو انگلستان کی تاریخ کے حصہ جدید مین کارفرا ہے یعنی ہندوستان سے صرف اسی حد تک بحث کی جائیگی جہان تک اسکا تعلق ہماری اپنی سلطنت سے ہے۔ اسپر تاریخی (یعنی اس کے اسباب وجود) اور سیاسی (یعنی اسکے فوائد یا استحکام) دونون حیثیتون سے روشنی ڈالی جائیگی۔

اس نقطۂ نظر سے تاریخی ترتیب ملحوظ رکھنا ہمارے لئے آسان نہ ہوگا۔ ہم نے ہندوستان کو اندھون کی طرح حاصل کیا انگریزون نے جتنے بڑے بڑے کام کئے ان مین کوئی اتنا اتفاقی اور غیر ارادی نہین تھا۔ یقیناً نوآبادیات کے قیام مین ہم نے بہت کم فکر و ارادہ سے کام لیا۔ جب ہمارے قدیم باشندے ورجینیا اور انگلینڈ جدید مین توطن پذیری کے لئے گئے تو ہمارا خیال کبھی نہین تھا کہ ہم ایک بڑی جمہوری سلطنت کی بناڈالینگے۔ لیکن یہان واقعہ نے اپنی نوعیت مین صرف مدارج سے اختلاف کیا ہے۔ ہم نے ایک جدید قومیت کی بنا کا خیال ضرور کیا تھا اور ہمکو یہ علم بھی تھا کہ اسکا میلان جمہوری ہوگا البتہ اسکی بے پایان وسعت ہم سے مخفی تھی۔ لیکن ہندوستان مین ہماری غرض کچھ تھی اور ہو گیا کچھ۔ ہمارا مقصد تجارت تھا لیکن اسمین خصوصیت سے کامیابی نہین ہوئی۔ ہم نے یہان آنے کے ۱۰۰ برس بعد تک دیسی ریاستون سے جنگ کا مطلق خیال نہین کیا اور اُسکے بعد بھی جو لڑائیان ہوئین وہ صرف ایسی ہی تھین جنسے ہمارے تجارتی اعراض کو تقویت پہونچتی تھی۔ اسکے بعد بھی تقریباً نصف صدی تک ہمکو ملک گیری کا خیال نہین پیدا ہوا۔ انیسوین صدی شروع ہو چکی تھی جب ہم نے دیسی ریاستون پر غلبہ حاصل کرنیکی پالیسی اختیار کی۔ اور جو اعلیٰ مرتبہ آج ہمکو نصیب ہے لارڈ ڈلہوزی کی گورنر جنرلی سے قبل کا حاصل کردہ نہین کہا جا سکتا۔ اسکو مشکل سے چوتھائی صدی کا عرصہ ہوا۔ ہم برابر تاکتے رہے دوسری طرف اور چلتے تھے دوسری طرف۔ اس صورت مین تاریخی ترتیب کیساتھ مطالعہ کرنا بدترین انتخاب ہوگا اگر ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کی سال بسال تاریخ کا پتہ ڈائرکٹران کمپنی کے نقطۂ خیال کے مطابق لگانا چاہین تو گویا ہم اپنے کو بالکل اندھا تسلیم کرینگے کیونکہ وہ قوتین جن کی بدولت سلطنت ہند معرض وجود مین آئی۔ ہمیشہ ڈائرکٹران کی مرضی پر غالب رہین اگرچہ

ڈائرکٹران نے ان قوتون کا سخت مقابلہ بھی کیا لیکن بیکار۔ اس سبب سے یہ نہایت ضروری ہے کہ دوسرے سرے سے آغاز کیا جائے اور یہ دریافت کرنے سے قبل کہ سلطنت اس موجودہ عظمت کو کس طرح پہونچی ہم معلوم کرین کہ درحقیقت اسوقت یہ کیا ہے۔

ہم اس سلطنت کو ایک مفتوح سلطنت کہتے ہین تاکہ یہ امتیاز ہوجائے کہ ہم نے بحیثیت نوآبادی کے اسکو نہین حاصل کیا ہے بلکہ کمپنی کو متواتر لڑائیون مین دیسی ریاستون سے یہ ملک ملا ہے۔ لیکن کیا ہمین یقین ہے کہ اس موقع پر لفظ "فتح" استعمال کرنا درست ہوگا۔

مین نے اس سے پہلے "مقبوضات انگلینڈ" اصطلاح پر اعتراض کیا تھا جو عام طور پر نوآبادیات کے لئے مستعمل ہے۔ مین نے سوال کیا تھا کہ اگر انگلینڈ سے مراد وہ لوگ ہون جو انگلینڈ مین آباد ہون اور نوآبادیات سے وہ چند انگریزی قومین مراد ہون جو سمندر پار بستی ہون تو کس طرح ان مین کی ایک آبادی دوسری کی ملک ہوسکتی ہے۔ یا اگر انگلینڈ سے تم سلطنت انگلشیہ مراد لیتے ہو جو خود نوآبادیات کی بھی حکومت ہے تو ہم کیون ایک حکومت کی رعایا کو اسکی مقبوضہ یا ملک کہین ایسی حالت مین کہ وہ مفتوح ہوکر رعایا نہین ہوی ہو یہ اعتراض براہ راست ہندوستان پر نہین عائد ہوتا کیونکہ یہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت مین فتح ہوکر آیا۔ اس طرح ہندوستان انگلینڈ کی ملک ہوسکتا ہے لیکن اس معنی مین نہین جس معنی مین کہ نوآبادیات ہیں۔ تاہم لفظ فتح، مثل دیگر لغات حرب کے نہایت قدیم زمانہ کا لفظ ہے اسلئے ممکن ہے کہ اسکے مفہوم مین غلطی ہوجائے۔ پھر بھی ہم پوچھ سکتے ہین کہ ہندوستان کس معنی مین انگلینڈ کی ملک ہوسکتا ہے۔ جو چیز ہمارے قبضہ مین ہوتی ہے ہم اسکو اپنے مصرف مین لاتے ہین۔ اگر میرے پاس کچھ زمین ہے تو مین یا تو خود اس کی فصل سے منافع اُٹھاؤنگا یا اگر لگان پر دیدون تو اسکا لگان پاؤنگا۔ زمانہ قدیم مین بھی کسی ملک کے فتح کرنے سے یہی مطلب سمجھا جاتا تھا کہ فاتح نے واقعی کسی چیز پر اپنا قبضہ کیا ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ فاتحین ملک، مفتوحہ یا اسکے ایک جزو کے تعلقہ دار ہوگئے جیسا کہ اُس فتح بیت المقدس مین ہوا جسکا حال بائبل کی کتاب یسوع مین درج ہے یا اُن فتوحات روم مین جن مین ضبط شدہ زمین کا کچھ حصہ اکثر چند رومی شہریون کو دیدیا جاتا تھا۔ یقیناً ہندوستان اس معنی مین مفتوح نہین کہا جاسکتا۔ انگلینڈ نے ہندوستان کی زمین پر قبضہ نہین کیا اور نہ دیسی زمینداروں کو اُس سے بیدخل کرکے انگریزون کے قبضہ مین دیا۔

اس کے علاوہ ایک اور مفہوم بھی مفتوحہ ملک، سے متبادر ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ باجگذار ہو البتہ اسکا لحاظ ضرور رکھنا چاہئے کہ ہم اس اصطلاح سے کیا مفہوم سمجھتے ہین۔ اگر اس سے یہ مراد ہو کہ اہل ملک ٹکس ادا کرتے ہین یا بالفاظ دیگر اپنی حکومت یا سرحدی فوجون کے اخراجات برداشت کرتے ہیں تو اس مین کوئی ایسی بات نہین جو مفتوح قوم کے لئے عجیب ہو۔ تقریباً تمام قومین کسی نہ کسی صورت مین اپنی حکومت کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہین۔ اگر لفظ

باجگذار، مفتوح، یا، محکوم، کا مترادف ہو تو یقیناً اسکے معنی یہ ہونگے کہ اہل ملک علاوہ اخراجات حکومت کے کچھ اور بھی ادا کرتے ہین۔ اسکی مثال مصر جدید مین تم کو ملیگی۔ مصر کی حکومت ایک خدیو کے ہاتھ مین ہے جو قوم کے روپیہ سے اپنی جیب بھرتا ہے۔ لیکن مصر سلطان ٹرکی کا باجگذار ہے یعنی مصر سلطان کو ایک معقول رقم نذر کرتا ہے جو کسی دوسری شکل مین ملک مین واپس نہین آتی۔ بلکہ سلطان کے ساتھ مصر کا رشتہ محکومیت ظاہر کرتی ہے۔

ایسا خراج صاف طور سے بتاتا ہے کہ اسکا ادا کرنے والا لینے والے کی ملک ہے۔ کیونکہ یہ بجنسہ وہی صورت ہے جس مین ایک کاشتکار اپنے زمیندار کو لگان دیتا ہے۔ کیا ہندوستان اس معنی مین انگلینڈ کا باجگذار ہے؟ ہرگز نہین کم از کم براہ راست یا مسلمہ طور پر تو نہین۔ ہندوستان کی طرح انگلینڈ مین بھی ٹکس وصول کیا جاتا ہے۔ تو کیا انگلینڈ کو باجگذار کہا جائیگا۔ ہندوستان سے جو روپیہ کھینچا جاتا ہے وہان کی حکومت پر صرف کیا جاتا ہے اور ضروری اخراجات کے علاوہ ایک کوڑی بھی نہین لیجاتی۔

البتہ یہ امر قابل بحث ہو سکتا ہے اور اکثر ہوا بھی ہے کہ ہندوستان اور مختلف صورتون مین انگلینڈ پر قربان کیا جاتا ہے خصوصاً رنگ برنگ کی حیلہ سازیون سے اُسکی دولت اینٹھی جاتی ہے۔ مجھے اس وقت اس سوال سے کوئی بحث نہین کیونکہ مین محض یہ دریافت کر رہا ہون کہ قانوناً ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان کون سا رشتہ ہے مجھے اس سے تعرض نہین کہ بد دیانتی سے کہان تک اس رشتہ مین پیچیدگی پیدا کر دی گئی ہے۔ لہذا ہندوستان اس معنی مین کہ وہ اصولاً انگلینڈ کا باجگذار ہے کبھی موخرالذکر کی ملک نہین کہا جا سکتا اور نہ ہماری نوآبادیات سے زیادہ کھلانے کا مستحق ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان اور انگلینڈ کا موجودہ رشتہ تاریخی حیثیت سے صرف لڑائی کی بدولت پیدا ہوا لیکن انگلینڈ نے کبھی، کم از کم علانیہ، ہندوستان پر اپنا یہ حق نہین ظاہر کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے فرمان خسروی مورخہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء مین جسکی رو سے علیا حضرت نے اپنی حکومت کا بالاعلان اظہار کیا، یہ صاف اور صریح الفاظ موجود ہین "ہم پر جو فرائض اور پابندیان ہماری دوسری رعایا کی طرف سے عائد ہوتی ہین بالکل وہی مملکت ہند کے باشندگان کی طرف سے بھی ہم پر عائد ہین اور ہم اُن فرائض کا اپنے کو مکلف سمجھتے ہین"، یعنی فتح کیوجہ سے کسی کو مخصوص استحقاق نہین حاصل ہوتے یا بالفاظ دیگر یون کہئے کہ ہندوستان عملی اغراض کے لئے مفتوح ملک نہین ہے۔

اگرچہ تہذیب و تمدن کی ترقی نے نہ تو جنگون کا سلسلہ یک قلم موقوف کیا اور نہ کم، تاہم اپنی نوعیت مین بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ نام نہاد فتح اب بھی ممکن ہے۔ لیکن اس لفظ کے اب وہ معنی نہین رہے۔ آج کل کسی مستبد ملوکیت کے استیصال یا تسخیر کا نام فتح نہین ہے۔ اسی وجہ سے اب فتوحات کی حرص و تمنا مین نمایان کمی واقع ہو گئی ہے۔ الغرض ہندوستان پر قبضہ کی وجہ سے ہم پر بہت اور ناقابل تحمل ذمہ داریان عائد ہوتی ہین۔ لیکن یہ امر کہ ہم کو ہندوستان سے

کوئی نفع ہے پہلی نظر مین نہین واضح ہوتا۔

لہذا ہمین اپنے دماغ سے اس خیال کو نکالدینا چاہئے کہ ہندوستان عملی معنون مین انگلینڈ کی ملک ہے عام محاورہ مین ملکیت اور حکومت دونون کے مفہوم اسقدر مخلوط ہین کہ خواہ مخواہ الجھن پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم ہندوستان کو اپنا ایک ،، عالیشان محکوم ملک ‘‘ کہتے ہین یا اسکو انگریزی جواہر خانہ کے سب سے بیش قیمت اور درخشان لعل سے تشبیہ دیتے ہین تو یہ صرف ایک استعارہ ہوتا ہے جو زمانہ قدیم سے ابتک مستعمل ہوتا چلا آیا ہے حالانکہ اب وہ قدیم سوسائٹیان ایک گذشتہ چیز ہو گئی ہین۔ ہندوستان اس معنی مین البتہ انگلینڈ کا محکوم ہے کہ اسکی قسمت اور پالیسی انگریزون کے اختیار مین ہے اس معنی مین نہین کہ وہ انگلینڈ کی کوئی خدمت کرتا ہے یا بلا واسطہ انگلینڈ کو قوی تر یا زیادہ مالدار بناتا ہے۔ ٹھیک نوآبادیات کی طرح ہندوستان کا مسئلہ بھی جب ہمارے سامنے آتا ہے تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے ،، آخر اس سے کیا فائدہ ہے؟ ‘‘ ایشیا کے ۳۰ کروڑ باشندون پر حکومت کرنیکی ذمہ داری اور پریشانی ہم کیون اپنے اوپر لئے ہوے ہین؟

یہ سوال نوآبادیات کے لئے الجھاؤ ہے اگرچہ قدرتی طور پر ایسا نہ معلوم ہوتا ہو۔ البتہ اس صورت مین الجھاؤ نہ ہوگا جب یہ ثابت ہو جائے کہ نوآبادیات ہم سے اتنی دور واقع ہین کہ اُنسے افادہ یا استفادہ بالکل ناممکن ہے نوآبادیان ہماری ہی نسل سے ہین۔ صرف انگریزی قومیت نئی آبادیون مین پھیل گئی ہے۔ اگر یہ ممالک انگلینڈ سے ملحق ہوتے تو نگریزی آبادی جون جون بڑھتی ان پر پھیلتی جاتی اور بظاہر یہ مناسب بھی ہوتا بشرطیکہ سیاسی علیحدگی کی نوبت نہ آتی۔ لیکن چونکہ وہ ملحق نہین ہین بلکہ بہت دور واقع ہین اسلئے کچھ دشواریان پیدا ہوتی ہین لیکن برقی اور دخانی ایجادات کے زمانہ مین ان دشواریون پر غالب آنا مشکل نہین ہے۔ تم نے دیکھا کہ یہ دلیل انگلینڈ اور اسکی نوآبادیات کے لئے ٹھیک ہے کیونکہ ان دونون ممالک مین خون کا اتحاد ہے۔ ہندوستان کے متعلق یہ دلیل ناموزون ہے۔ انگریزون اور ہندؤن سے زیادہ شاید ہی کوئی دو قومین اسدرجہ ایک دوسرے سے مغائرت رکھتی ہون۔ البتہ تاریخ علم السنہ نے ایک ایسا رشتہ ان دونون قومون مین ڈھونڈھ نکالا ہے جسکا آج سے قبل کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جو زبان ہندوستانی قومون مین مروج ہے وہ ہماری ہی زبان کے خاندان سے ہے۔ لیکن اور دوسرے اعتبار سے انہین شدید ترین مغائرت ہے۔ انکے رسم ورواج ہم سے بالکل مختلف ہین۔ اسلام سے کہین زیادہ غیریت انکے مذہب کو ہمارے مذہب سے ہے۔

ہماری نوآبادیات زیادہ تر کرہ زمین کے غیر آباد حصون مین قائم ہوئین۔ اسی وجہ سے انکی پوری یا غالب آبادی انگریزی ہے۔ مین نے یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ یہ صورت اسپین کی ان نوآبادیات کی نہین ہے جو وسطی اور جنوبی امریکہ مین قائم ہوئین کیونکہ اسپینی نوآبادون کی تعداد کم تھی غالب حصہ آبادی سرخ انڈین کا تھا جن کو

ان لوگون نے بالکل غلام بنالیا تھا۔ یہان پر اب نوآبادی کی دو قسمین ہوئین جن مین سے ایک بہ نسبت دوسرے کے مادر وطن سے زیادہ قریب ہے لیکن دونون قسم کی نوآبادیان رشتۂ خون سے مادر وطن سے منسلک ہین۔ ہندوستان ان دو قسمون مین سے کسی مین نہین آتا۔ کیونکہ اسکی آبادی کا کوئی خونی تعلق انگلینڈ سے نہین ہے۔ اگر انگلینڈ کے نوطن پذیر ہندوستان مین جاکر آباد بھی ہوتے تو انکی کچھ حقیقت نہ ہوتی کیونکہ ہندوستان کی دیسی آبادی اُنکے مقابلہ مین بہت زیادہ ہوتی۔ قدرت نے ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان ایسی مستحکم حد فاصل قائم کردی ہے کہ ہندوستان انگلینڈ کی نوآبادی ہو ہی نہین سکتا۔ قدرت نے یہان کی آب و ہوا ایسی بنا دی ہے کہ اس مین انگریز نشو و نما نہین پا سکتے۔

جس طرح انگلینڈ کا تعلق اسکی نوآبادیات سے بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے اسی طرح ہندوستان کے ساتھ اسکا تعلق پہلی ہی نظر مین قطعی غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ ان دو ممالک مین کوئی قدرتی رشتۂ اتحاد نہین ہے۔ نہ تو نسلی اتحاد نہ مذہبی کیونکہ ہم عیسائی اور وہ ہندو اور مسلمان اور نہ اتحاد مقاصد بجز ان عام مقاصد کے جو ایک ملک کو دوسرے سے ہوتے ہین یعنی سامان تجارت کی درآمد برآمد۔ تم خود سوچو اسکے علاوہ انگلینڈ اور ہندوستان کے درمیان کون مشترکہ غرض ہے۔ انگلینڈ کی اغراض زیادہ تر یورپ اور دنیاء جدید سے وابستہ ہین۔ ہندوستان ایسے الگ تھلگ ملک کا کوئی بیرونی تعلق اگر ہو سکتا ہے تو فارس، افغانستان اور وسط ایشیا سے ہو سکتا ہے جنسے براہ راست ہمارا کوئی تعلق نہین ہے البتہ ہندوستان کے توسط سے۔

ہندوستان کی فتح نے اسپینون کی فتح امریکہ سے زیادہ تعجب خیز نتائج پیدا کئے اگرچہ میرا خیال ہے کہ اسکے اسباب نسبتاً بہت کم حیرت انگیز تھے۔ یہ واقعہ انگلینڈ کی تاریخ جدید مین نہایت نمایان ہے چاہے ہم کچھ خیال کرین اگرچہ ہمارے مورخین اس واقعہ پر اتنی توجہ نہین مبذول کرتے جتنی اسکے شایان شان ہے۔ تاہم انگلستان کی تاریخ جدید مین اسکو اہمیت خصوصی حاصل ہے۔ لیکن اس وقت تک ہمین اسکی اہمیت کا اندازہ نہین ہو سکتا جب تک ہم اپنے دماغ سے اسکی غرابت کا خیال نکالکر اسکی بے پایان وسعت پر نظر نہ رکھین۔ اسکے متعلق بہت خامہ فرسائی ہو چکی ہے کہ ہندوستان کا بڑا بھاری فرض ہمارے ذمہ ہو گیا ہے لیکن اس سے کوئی نتیجہ بمشکل پیدا کیا جاتا ہے۔ جب اعداد و شمار ایک خاص حد سے متجاوز ہوتے ہین تو ہمارے تخیلات مین رعشہ آجاتا ہے۔ اپنی خانگی سیاست مین جب ہماری دلچسپی زیادہ بڑھتی ہے تو اسی نسبت سے مسئلہ تنقیح طلب کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن جب ہماری سلطنت کے وسیع مسائل ہمارے سامنے آتے ہین تو ہماری دلچسپی غائب ہو جاتی ہے۔ اگر ہم سے یہ کہا جاے کہ سلطنت ہند کی مثال سلطنت روم کے اس دور کی سی ہے جب موخر الذکر ترقی کے اعلی زینہ پر تھی اور یہ کہ ہم اس کے ذمہ دار ہین، تو ہماری طبیعت پھر جاتی ہے اور اس مضمون کے مطالعہ کو جی نہین چاہتا۔

کیا واقعی ہم ایسا کرنے مین حق بجانب ہین۔ مین سمجھتا ہون ہم ایک حد تک اس غلط فہمی مین مبتلا ہین کہ دنیا کے طرفی ممالک کی وسعت یا تنگی سے کوئی فرق نہین ہو سکتا۔ اس طرح سے اگر ہندوستان وسیع ملک ہے تو کناڈا اور آسٹریلیا اس سے بھی زیادہ وسیع ہین لیکن اُنکے امور ہماری توجہ کے اتنے زیادہ محتاج نہین ہین۔ یہ صحیح ہے لیکن ایک خاص مابہ الامتیاز شے کو نظر انداز کر دیتے ہین۔ کناڈا اور اسٹریلیا رقبہ مین تو بڑے ہین لیکن انکی آبادی بہت مختصر ہے۔ یہ ممالک ہندوستان کی طرح ہم سے دور ہی نہین ہین بلکہ یہ اُن بڑی سلطنتون سے بھی دور واقع ہین جنسے ہمین جنگ کا امکان ہو۔ ہندوستان کی بالکل مختلف حالت ہے۔ آبادی کے لحاظ سے وہ یورپ کی طرح گنجان ہے بلکہ بعض حصے تو یورپ سے بھی زیادہ گنجان ہین۔ یہ وہ ملک ہے جس مین ہمکو بار بار اعلیٰ اعلیٰ پیمانہ پر جنگ کرنا پڑی۔ مرہٹون کی دوسری لڑائی مین ۱۸۱۸ء لارڈ ہسٹنگز کی فوج ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ ہندوستان کتنی ہی دور واقع ہو لیکن یہ یورپ کی سیاست سے باہر نہین کہا جا سکتا۔ چنانچہ اٹھارھوین صدی مین یہ ایک شطرنج کی بساط تھا جس پر شاطران فرانس و انگلینڈ نے اپنی ہنرمندی دکھلائی۔ اور صرف ہندوستان ہی کی بدولت ۱۸۳۰ء سے ہمارے اور اوس کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اسوقت سے ہمکو مشرق کے معاملات سلجھانے سے خاص تعلق پیدا ہو گیا ہے۔

اگر ہندوستان کو تشبیہ دیجا سکتی ہے تو ممالک یورپ سے نہ کہ دنیائے جدید کے دور افتادہ غیر گنجان ممالک سے۔ ہم اس ملک کے طول و عرض کا خیال اپنے دماغ مین قائم کرین پھر اس کا مقابلہ کسی ایسے ملک سے کرین جس سے ہم واقف ہون ماسوائے یورپ کے اس حصہ کے جو چند صدی قبل تمدن تاریخ گہوارہ تھا اور جسکے اندر سلطنت روم کے تمام یورپی ممالک معہ جرمنی اور (Scandinavian) ریاستین شامل ہین ہندوستان سے مشابہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستان بلحاظ آبادی و رقبہ ان تمام ملک کے جمہوریہ کے برابر ہے۔ وہ سلطنت جس پر ہم ڈاؤننگ اسٹریٹ سے بیٹھکر حکومت کرتے ہین اور جسکا بجٹ ہر سال دار العلوم مین پریشانیون اور ناامیدیون کا باعث ہوتا ہے نپولین کی سلطنت سے کہین بڑی ہے۔ جیسا کہ مین بیان کر چکا ہون یہ ملک جنوبی امریکہ کی قدیم اسپینی ریاستون کی طرح غیر آباد اور وسیع نہین ہے بلکہ ایک گنجان آباد خطہ ہے جسکی تہذیب نہایت قدیم ہے جو خود اپنے مذاہب، زبان، فلسفہ اور ادبیات کا مالک ہے۔

اگر ہندوستان کو کئی حصون مین ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تو اسکے سمجھنے مین آسانی ہو جائیگی۔ یورپ کا خیال ہم پر کیون اتنا اثر کرتا ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ جہان یورپ کا نام لیا گیا فوراً ہمارے دماغ مین اسکی تمام بڑی ریاستون کا تصور آگیا جو تعداد مین ۶ یا ۷ ہین۔ یورپ کا تصور انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا، اٹلی، اسپین اور یونان کا مجموعی تصور ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان بھی ایسی ہی چھ بڑی سلطنتون کا مجموعہ ہوتا تو اسکا تصور ہمکو بڑا معلوم ہوتا۔ مین ایک بات یہان پر ظاہر کر دینا چاہتا ہون۔ ہندوستان مین صرف ایک ایسا خطہ ہے جو آبادی مین

یورپ کی ہر سلطنت سے ماسوائے روس کے اور اضلاع متحدہ امریکہ سے بڑا ہے۔ یہ علاقہ لفٹننٹ گورنر بنگال کے ماتحت ہے۔ اسکی آبادی ۶ کروڑ ۶۰ لاکھ ہے حالانکہ اسکا رقبہ فرانس سے بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ دو اور ایسے خطے ہین جو یورپی ریاستون کے مقابلہ کے ہین۔ یہ شمالی مغربی صوبے ہین جو برطانیہ کلان ماسوائے آئرلینڈ کے مقابل ہو سکتے ہین۔ البتہ رقبہ مین کچھ کم ہین مگر آبادی اُنکی زیادہ ہے۔ پھر احاطہ مدراس ہے جو رقبہ مین تو برطانیہ کلان بشمول آئرلینڈ کے برابر ہے لیکن بلحاظ آبادی کم آباد ہے اور مملکت اٹلی کے برابر ہے ان تینون صوبون کی آبادی ۲ کروڑ سے بہت زیادہ ہے۔ انکے علاوہ دو اور صوبے ہین جنکی آبادی بھی قریب قریب ۲ کروڑ ہے۔ ایک تو پنجاب ہے جو بلحاظ آبادی اسپین سے کسی قدر بڑا ہے اور دوسرا احاطہ بمبئی جو کسی قدر چھوٹا ہے لیکن رقبہ مین برطانیہ کلان اور آئرلینڈ سے بڑا ہے۔ دوسرے درجہ پر اودھ ہے جو بلجیم اور ہالینڈ کے مجموعی رقبہ سے کچھ بڑا ہے اور پھر صوبہ متوسط ہے جو ان دونون ملکون کے برابر ہے۔ ان صوبہ جات اور نیز دیگر غیر مشہور اضلاع کے مجموعہ کا نام ہندوستان ہے جو براہ راست گورنمنٹ برطانیہ کے زیر حکومت ہے۔ لیکن وہ خطہ جو عملا برطانوی سیادت کے اندر ہے اس سے بھی بڑا ہے۔ سلطنت پنولین سے ہماری مراد صرف انھین ممالک سے نہین ہوتی جو براہ راست اسکے عمال کے زیر حکومت تھا بلکہ اسکے اندر وہ ریاستین بھی تھین جنکے فرمانروا برائے نام تھے اور عملاً وہ پنولین کی ماتحت تھین۔ چنانچہ جمعیت رائن جس مین متعدد جرمنی ریاستین شامل تھین باضابطہ آئین کی روسے پنولین کو اپنا محافظ تسلیم کرتی تھی۔ اسی طرح ہندوستان ین انگلینڈ کی ایک اور ماتحت جمعیت ہے یعنی خود مختار ریاستین جو باعتبار آبادی امریکہ سے بڑی ہیں۔

کیا یہ صحیح ہے کہ علاوہ اپنی خوفناک کثیر آبادی کے جسکی سیاست نہایت پریشان کن ہے اور علاوہ اپنی وسیع نوآبادیات کے ہم ہندوستان کے بھی ذمہ دار ہین جسکی آبادی یورپ کے برابر ہے۔ کیا واقعی یہ بھی سچ ہے کہ ہمکو اس کے متعلق نہایت معمولی واقفیت بھی نہین ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر ہمکو یہ واقفیت حاصل بھی ہو جائے تو ہم ایسے پیچیدہ اور بعید معاملات کے متعلق کوئی صائب رائے قائم کر سکتے ہین؟

اس سے پہلے بڑی بڑی سلطنتین گذر چکی ہین جنکی عنان حکومت صرف چند تجربہ کار شخصون کے ہاتھ مین تھی روم کو مجبوراً اپنی سلطنت ایک غیر ذمہ دار مدبر کی حفاظت مین دینا پڑی یہان تک کہ وہ اپنی قدیم معاشرتی آزادی بھی کھو بیٹھا۔ امریکہ مین البتہ باوجود اس غیر محدود وسعت کے جمہوری حکومت قائم ہے۔ اگرچہ یہ ملک بہت وسیع ہے لیکن مربوط اور مسلسل ہے، اسکی آبادی کتنی ہی زیادہ ہو جائے لیکن ہمیشہ متحد رہیگی۔ اگر امریکہ ایسے ملک کے قبضہ مین آجائے جو اس سے بذریعہ سمندر الگ ہو اور اسکی قومیت بھی مختلف ہو تو پھر اسکی پوزیشن دنیا مین فوراً بدل جائیگی۔ ہندوستان اور انگلینڈ کے رشتہ مین جو بات سب سے زیادہ انوکھی ہے وہ یہ ہے کہ انگلینڈ ایک ایسے ملک پر حکومت کرنیکی کوشش کرتا ہے جسکی آبادی صرف دور ہی نہین واقع ہے بلکہ حکمران قوم سے کلیۃً مخالف ہے

اور طرز حکومت بھی جمہوری ہے شخصی نہین - رائے عامہ عام طور سے چند سیدھے اور سہل خیالات پر مبنی ہوتی ہے جب ملک کی اغراض سادہ اور حکومت کے اصول ناقابل خطا ہون تو رائے عام بڑے بڑے مسائل کا بھی تصفیہ بغیر خطرہ کے کرسکتی ہے - لیکن جب سیاسی چالاکیون اور موشگافیون کی نوبت آتی ہے اور کبھی ایک اصول چھوڑ کر دوسرا اصول کام مین لانا پڑتا ہے تو رائے عامہ ششدر رہ جاتی ہے - اور ایسے ششدر کن معاملات ہماری سلطنت ہند مین پیدا ہوتے رہتے ہین ہندوستان اپنی نوعیت مین نوآبادیات اور خود انگلینڈ سے اتنا جداگانہ واقع ہوا ہے کہ اُسکے لئے سرتاپا مختلف طرز حکومت کی ضرورت ہے - اسی لئے رائے عامہ حیران ہے کہ کیا کرے وہ حکومت کو جو اپنے طرز مین قطعی غیر انگریزی ہے نہایت غضب آلود اور مایوس نگاہون سے دیکھتی ہے - ایسی حکومت جو مستبد ہے جو ایک حکمران قوم کے ہاتھون مین ہے جسکا قیام فوجی طاقت پر ہے جسکے محاصل یوروپین طریقہ پر نہین وصول کئے جاتے بلکہ نمک اور افیون کی اجارہ داری ہے جسکی حیثیت ایک عالمگیر تعلقہ دار کی ہے الغرض جو انگلینڈ کی روایات سے سیکڑون بات مین مختلف ہے -

ہم سے سوال ہوسکتا ہے "آخر اس سے فائدہ" جیسا کہ مین نے کہا ہے اس تعلق سے براہ راست ہمکو کوئی نفع نہین ہے اب ہمکو دیکھنا چاہئے کہ آیا اس سے کوئی ضمنی فائدہ بھی ہے یا نہین - ہم دیکھتے ہین کہ صرف ایک تجارت ہے جو رفتہ رفتہ دونون ملکون کے درمیان اعلی پیمانہ پر پہونچ گئی ہے - اگر ہندوستان مین ہمارے خلاف بغاوت رونما ہوجائے یا ہندوستان ایسی حکومت کے قبضہ مین آجائے جو تمام بندرگاہون کو ہم پر بند کردے تو چھ کروڑ پونڈ سالانہ کا ہمارا نقصان ہوگا - بالفاظ دیگر ہندوستان کی تجارت کا خاتمہ ہوجائیگا - لیکن اُس بار کے مقابلہ مین جو ہندوستان کی بدولت ہماری خارجی حکمت عملی پر پڑتا ہے یہ نفع کچھ حقیقت نہین رکھتا - آج کل محکوم ممالک کو فوجی طاقت کے زور سے قبضہ مین رکھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی قوم کے گلے مین چکی کا پاٹ باندھ دیا جائے - کیونکہ اس طرح فاتح قوم کو ہمیشہ ایک فوج محفوظ رکھنا پڑتی ہے کہ شاید کسی وقت اپنے تحفظ یا دیگر اغراض کے لئے اسکی ضرورت پڑ جائے - ہم جانتے ہین اسوقت بسمارک کس اطمینان سے افریقہ اور ایشیا مین فرانس کو فتوحات کی تدابیر مین مشغول دیکھ رہا ہے - اگر انگلینڈ کو، جو یقیناً فوجی سلطنت نہین ہے، ۲۰ کروڑ باشندون کو بذریعہ فوج محکوم رکھنا ہو تو میرے خیال مین اسکے اظہار کی ضرورت نہین ہے کہ یہ بار ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوگا - مگر ایسا نہین ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ سلطنت ہند مین ایک بنیادی خصوصیت ہے جس پر آئندہ مین مفصل بحث کرونگا - وہ خصوصیت یہ ہے کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح تو کیا لیکن اب ہندوستانی ہی فوج سے اسپر قابض ہے اور لطف یہ کہ فوج کی تنخواہ بھی ہندوستان ہی دیتا ہے - ہماری انگریزی فوج ہندوستان مین صرف ۶۵۰۰۰ ہے لیکن صرف یہی بار ہم پر نہین ہے - ایک طرف وہ ہماری فوج کو مقفل رکھتا ہے تو دوسری طرف ہماری خارجی پالیسی مین دوچند مشکلات پیدا کرتا ہے - کسی ملک کی کمال مسرت یہ ہے کہ وہ قانع رہے دوسری قومون سے کوئی مطلب نہو - واشنگٹن کی یہ نہایت

دانشمندانہ نصیحت اپنے ہمقوموں کو تھی "کہ جب تک ہو سکے تم اس حقیقی مسرت کو ہاتھ سے نہ جانے دو"۔ انگلینڈ کی یہ قسمت نہین تاہم اگر ہندوستان اُسکے قبضہ مین نہ ہوتا تو نسبتہً اسکو اس حقیقی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا۔ ہماری نوآبادیات کے باشندے زیادہ تر یا تو امن پسند ہین .... یا قطعی وحشی اور اب یوروپ مین جدوجہد مین ہمارے پرانے مفاد ختم ہو چکے ہین البتہ مشرق مین ہمارے تعلقات بہت گہرے ہین۔ چنانچہ اسی وجہ سے مجبوراً ہم ترکی کی ہر تحریک، مصر کی ہر نئی بات اور ایران، برما اور افغانستان کی ہر نئی کروٹ کو نہایت ہوشیاری سے دیکھتے ہین۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ ہندوستان پر ہمارا قبضہ ہے۔ محض اسی وجہ سے دول ایشیا مین ہماری پوزیشن ممتاز ہے اور ان تمام ممالک کے معاملات سے جو ہندوستان کی راہ مین حائل ہین ہمکو خاص دلچسپی ہے۔ محض ہندوستان کی بدولت روس سے ہمنے دائمی رقابت مول لی اور یہ رقابت انیسوین صدی مین انگلینڈ کے لئے بجنسہ ویسی ہی جیسی اٹھارہوین صدی مین دنیاے جدید کی خاطر فرانس سے تھی۔

میری غرض اس لکچر سے یہ ہے کہ تمھارے سامنے ہندوستان کے مسئلہ کا خاکہ پیش کر دون مین نے شروع مین چند ایسی باتین بیان کی ہین جنسے شاید تم اس مسئلہ کے متعلق کوئی پریشان کن یا مایوسانہ خیال قائم کرو۔ اگر یہ امر مشتبہ ہے کہ ہندوستان سے ہمین کوئی فائدہ ہے اور یہ حقیقت بالکل غیر مشتبہ ہے کہ اسکی وجہ سے ہم ایسی ذمہ داریون مین پھنسے ہین کہ ہمارا دماغ یاس انگیز مشکلات سے مختل ہو رہا ہے تو کیا اُس ساعت کو ہم انگلینڈ کے لئے ایک منحوس گھڑی کہنے مین حق بجانب ہونگے جب کلایو کی بے خوف عالی دماغی نے ایک تجارتی کمپنی کو سیاسی سلطنت مین تبدیل کر دیا اور سیکڑون سال کے بے مسلسل لڑائیون کی بنیاد ڈالدی؟ کیا ہم اُن ممتاز سیاست دانون کی طرح جنھون نے اپنی زندگی ہندوستانی معاملات مین گذاری ہے یہ راے نہین قائم کر سکتے کہ یہ سلطنت سریع الزوال ہے اور وہ زمانہ کچھ دور نہین ہے جب ہمکو اس ملک سے واپس آنا پڑے؟۔

دوسری طرف ایسے مسئلہ پر غور کرنے مین عقلمند سے عقلمند انسان غلطی کر سکتا ہے۔ سلطنت ہند کی انتہا شاید اتنی ہی بعید از قیاس ہے جتنی اسکی ابتدا۔ تاریخ مین ایسی کوئی نظیر نہین ہے۔ اگر ایک دور افتادہ جزیرہ سے ہندوستان کی حکومت ایک ناپائدار شے نظر آتی ہے تو یہ بالکل قدرتی ہے کیونکہ ہم جانتے ہین ایک وہ دن تھا جب اُسکے وجود کا ہمکو گمان بھی نہین تھا .... بہرکیف اگر اسکو زوال ہونا ہے تو اس زوال کے ثبوت کا جاننا ہمین لازم ہے۔ جن بے حساب مشکلات کا اسکو مقابلہ کرنا پڑتا ہے انکا ثبوت البتہ ہم دریافت کر سکتے ہین لیکن اسکے زوال کے آثار شاید ہی کوئی بتا سکے۔ اور پھر اگر ہم تسلیم کرین یا انکار نہ کرین کہ انگلینڈ کو اس سلطنت کی پیدا کردہ مشکلات کا معاوضہ نہین ملا تو اس اقرار مین کوئی علمی اہمیت نہین پیدا ہوتی۔ اس طرح کے اقرار اور کسی ایسی عملی تجویز مین (جیسے اس سلطنت کو چھوڑ دینا) بڑا فرق ہے۔

یہ خیال قائم کرنا ممکن ہے کہ اگر انگلینڈ سرے سے کسی سلطنت کی بنیاد نہ ڈالتا اور چین کی طرح ہندوستان کے ساحلون پر بھی محض ایک تاجر کی حیثیت سے رہتا تو اسوقت اسکی حالت بدرجہا بہتر ہوتی۔ مگر وہ لوگ بھی جن کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمکو ہندوستان چھوڑنا ہے اس خیال پر عملی حیثیت سے غور وخوض کرنے کے عادی نہین ہین۔ بہت سے ایسے کام ہین جنکا نہ کیا جانا اچھا تھا لیکن ہوجانے کے بعد انکا بگاڑنا کچھ اچھا نہین ہے۔ ایسا وقت آسکتا ہے جب ہندوستان کو اسکے حال پر چھوڑنا ممکن العمل ہوگا لیکن فی الحال اسپر اسی طرح حکومت کرنی چاہئے گویا ہمکو ہمیشہ کرنا ہے۔ ایسا کیون؟ یہ نہ سمجھو کہ اس مین ہماری ہی غرض ہے۔ بعض لوگ کہتے ہین کہ ہماری عزت قومی اس بات کی متقاضی ہے کہ جس ملک کو ہمارے آباد اجداد نے اپنا خون بہا کر حاصل کیا ہو اور جو ہماری قوم کی بیپاہ بہادری کی عظیم یادگار ہو اسپر قابض رہین۔ لیکن میرے خیال مین عزت کے تمام ایسے مفہومون مین درندگی کی بوآتی ہے۔ ان مفہومون کی بناء جیسا مین کہہ چکا ہون، حکومت اور ملکیت کے قدیم اور تروک معنی کو خلط ملط کر دینے پر ہے ایک لمحہ کے لئے بھی سوائے ہندوستان اور انگلینڈ کی بہبودی کے کوئی اور بات نہین ملحوظ رکھنا چاہئے لیکن چونکہ ہندوستان کا مفاد زیادہ وابستہ ہے اور وہ انگلینڈ سے زیادہ بڑا اور زیادہ غریب بھی ہے لہذا اُسکا خیال انگلینڈ سے پہلے کرنا چاہئے۔ انھین اصول کی بناپر اور خصوصًا ہندوستان کے مفاد کی رعایت سے ہمارا اسکو چھوڑ دینا فی الحال غیر ممکن ہے۔ اگر صرف ہمارے ذاتی نفع کا سوال ہوتا تو ہم ایسا کر سکتے تھے۔ اگرچہ آج تجارت اس اعلی پیمانہ پر پہونچ گئی ہے اور انگلینڈ نے اپنا کثیر سرمایہ گذشتہ چند سالون کے اندر ملک مین لگا دیا ہے تاہم اسکا چھوڑ دینا آسان ہی نہین بلکہ ممکن بھی ہے۔ برخلاف اسکے جب ہم ہندوستان کے مفاد کا خیال کرتے ہین تو یہ امر قطعی ناممکن نظر آتا ہے ہمارے طرز حکومت پر بہت سے بجا اعتراضات ہو سکتے ہین۔ بعضون کو کلام ہو سکتا ہے کہ ہماری حکومت یہان کے باشندون کے مزاج کے ناموافق ہے اور اسکے اخراجات بلاضرورت اور مسرفانہ ہین۔ اور اسی طرح کے دوسرے اعتراض کئے جا سکتے ہین۔ اس نامتوازی تجربہ کے انجام کے متعلق ہمین جائز اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے لیکن میرے نزدیک اس امر سے انکار کرنا کہ مسلمانون کی فتح کے بعد سے جتنی حکومتین ہندوستان مین قائم ہوئین اُن سے ہماری حکومت اچھی ہے، درست نہ ہوگا۔ اگرچہ اکثر لوگون کا خیال ہے کہ ہماری حکومت آخر کار ناکام ہوگی لیکن ملک کو کبھی ہم ایسی قابل رحم حالت مین نہین چھوڑ سکتے جو اُسوقت سے جب ہم نے اسکو حاصل کیا کچھ زیادہ اطمینان بخش نہین ہے۔ ایک متوسط درجہ کی حکومت بالکل نہونے سے تو بہتر ہی ہے۔ ایک ظالم اور مستبد حکومت کا بھی یکایک ہٹ جانا خطرناک تجربہ ہے۔ بلاشبہہ ایسے ممالک ہین جو اس آزمائش مین بغیر فتنہ وفساد مین مبتلا ہوئے ثابت قدم رہ سکتے ہین۔ اُن ممالک سے جو غیر گنجان آباد ہین یا جنکے باشندے عرصہ دراز سے آزادی عمل کے عادی ہین امید کی جا سکتی ہے کہ وہ جلد از جلد حسب ضرورت کوئی نظام حکومت ترتیب دے لین گے۔ لیکن ہندوستان کی

بابتہ ایسی تجویز کا خیال کرنا کسی قدر مضحکہ خیز ہے۔ جس وقت ہندوستان مین ہمارا قبضہ شروع ہوا وہ ایسے خوفناک فتنہ و فساد کی حالت مین تھا کہ شاید یورپ کو اپنی ساری زندگی مین ویسا تجربہ نہ ہوا ہوگا۔ جو رہی سہی حکومت باقی تھی وہ بھی جابر تھی اور عموماً ایسے جنگ و جدال پسندون کے ہاتھ مین تھی جنکا سہارا ایسی فوج پر تھا جس مین آوارہ گرد اور لٹیرے بھرے تھے جنکا پیشہ غارتگری کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسوقت مرہٹون نے ہندوستان کے بڑے حصہ کو گھیر لیا تھا، دہلی اور کلکتہ دو نون اُنکے خوف سے کانپ رہے تھے حالانکہ انکا مرکز پونہ تھا۔ لیکن یہ قوت بھی غارتگری کی ایک باقاعدہ تحریک تھی۔ ادھر شمال مین نادر شاہ اپنی معمول مین تیمور لنگ کی ہمسری دکھا رہا تھا لیکن یہ عذر کیا جاسکتا ہے کہ یہ بدامنی صرف چند روزہ تھی اور سلطنت مغلیہ کی تباہی سے پیدا ہوی تھی۔ تاہم اس سے اسقدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان ایسا ملک نہین ہے جو حکومت کی علٰحدگی برداشت کر سکے۔ کیا سلطنت مغلیہ کے متعلق ہمارا قیاس مبالغہ آمیز نہین ہے؟ اسکا عروج بہت قلیل عرصہ تک رہا۔ دکن مین اسکو حقیقی استقامت کبھی نہین ہوی جس طرح کی انارکزم سے کلایو اور ہسٹنگز کو ہندوستان مین سابقہ پڑا وہ اپنی نوعیت مین ایسی نادر نہین تھی جیسی بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اُس وقت ابتری اور بدامنی اتنی سخت تھی کہ اسکی نظیر نہین ملتی محمود کے زمانہ سے برابر ہندوستان ایک قسم کی بدنظمی مین مبتلا چلا آتا تھا البتہ اکبر اور شاہجہان کے عہد مین اسکا شمالی حصہ چندے اس بلا سے مامون رہا۔

الغرض ہندوستان ان تمام ممالک سے جن مین مستحکم سلطنت کے ارتقا کی قابلیت ہے زیادہ ناقابل ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ رہی سہی قابلیت اسکے اندر تھی اسکو ہماری حکومت نے کم کر دیا ہے کیونکہ ہمارے تسلط نے ان طبقون کو جنمین کچھ بھی حکومت کی استعداد اور عادت تھی یقیناً پست کر دیا ہے۔ قدیم شاہی نسل امراء و شرفا کے طبقہ نے خصوصاً مسلمانون نے جو سلطنت مغلیہ کے عمال حکومت مین جزو غالب تھے ہماری حکومت مین سب سے زیادہ نقصان برداشت کیا اور سب سے کم نفع اٹھایا۔ اور یہ بربادی اور تباہی اُن لوگون کے لئے جو ہماری سلطنت کا تاریک پہلو دیکھتے ہین صد درجہ غم انگیز ہے لیکن کیا یہ اس امر کی دوسری دلیل نہین ہے کہ ہماری حکومت کو ابھی قائم رہنا چاہیے۔ اب تم ملک کے اس طول و عرض کو دیکھو اور سوچو کہ ہنے برہمنی روایات کی جگہ کس طرح مغربی سائنس رائج کر کے روشن دماغ طبقہ کے اخلاقی اور مذہبی خیالات کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا ہے۔ جب تم ان پہلوؤن پر غور کروگے تو تمکو معلوم ہو جائیگا کہ ایسے ملک سے جو صرف ہماری حکومت کا محتاج ہے اور نہ بجز ہمارے کسی دوسرے کی محکومیت کا اہل نہین، اپنی حکومت کا سایہ اُٹھا لینا سخت ...... ناقابل عفو جرم ہوگا۔ اور بہت اندیشہ ہے کہ اسکی وجہ سے ناقابل قیاس آفات و ابتلا رونما ہو جائین۔

یہ ہے خاکہ، مسئلہ ہند، کا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ کیونکر پیدا ہوا؟ ہمارے قبضہ مین اتنی عظیم الشان سلطنت کس طرح آئی؟۔

(باقی آیندہ)

عبدالقیوم رسا

بازگشت

(۱)

ادریس کو صرف یہ غم نہ تھا کہ محبت میں اس کے ساتھ دغا کی گئی اور رابعہ سے اس کو محروم ہونا پڑا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو رابعہ کے ساتھ شدید الفت تھی اور رابعہ کے حرکات و سکنات سے بھی پایا جاتا تھا کہ وہ ادریس کو چاہتی ہے۔ ادریس کو یقین تھا کہ وہ اس کے سوا کسی غیر کیطرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھے گی۔ اس کو رابعہ کی محبت پر اعتماد تھا۔ رابعہ نے طوطے کی طرح اسکی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور رؤف کے ساتھ کچھ ایسا جو ہوئی کہ ادریس اک بھولا ہوا خواب ہو کر رہ گیا۔ اس سے ادریس کو . . . صدمہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ کرنے کی کوشش بیکار ہے۔ لیکن شاید وہ اس صدمہ کو برداشت کر لیجاتا مگر سب سے بڑا دھکا اس کو یہ لگا تھا کہ رابعہ جس کو وہ محبت اور معصومیت کا مجسمہ سمجھتا تھا، آزمایش سے اس طرح مغلوب ہوگئی اور اپنی نسوانیت کا بھی پاس نہ کیا۔ ادریس عورت کی ہر کمزوری اس کے ہر عیب کو معاف کرنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن تردید محبت عورت کا وہ جرم تھا جس کی سزا میں جو عقوبت بھی تجویز کیجائے وہ کم تھی۔ آج اس نے سمجھ لیا کہ محبت اور معصومیت دنیا سے اٹھ گئی ہے۔ اس لئے کہ جب رابعہ میں یہ خوبیاں نہیں تو دنیا کی کسی عورت میں نہیں ہو سکتیں۔ رابعہ ایسی بے اعتبار نکلی تو دنیا کی ہر عورت بے اعتبار ہوگی یہ تھی ادریس کی منطق جس نے اسکو اس نتیجہ پر پہونچایا تھا کہ عورت سے وفا و محبت کی امید رکھنا اپنی غلطی ہے۔ عورت صرف گناہ کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ محض ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ قدرت اپنا کام پورا کرتی ہے اور انسان کو آسانی سے آزمایش و ابتلا میں گرفتار کرتی ہے۔ عورت کو بھی اب وہ "پردۂ زنگاری" کے "معشوق" کا ایک جانستاں غمزہ سمجھنے لگا تھا۔

ادریس ایک نہایت غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔ سات پشت سے محتاجی و ناداری اس کے گھر میں چلی آتی تھی اس کے باپ نے اپنے قوت بازو سے کما کر موضع رام نگر میں چار آنہ کا حصہ خریدا تھا، اس کے علاوہ آٹھ دس بیگہ کھیت آبائی تھے۔ یہ کھیت اس جاگیر کی یادگار تھے جو کسی زمانے میں ادریس کے مورث اعلیٰ کو معافی ملی تھی اور جو غدر کے ایام میں یا کچھ دنوں پہلے زمانے کی چند کروٹوں میں خاندان کے قبضہ سے نکل گئی تھی۔

ادریس کا باپ اس کم بضاعتی میں تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کی پرورش کر رہا تھا اور ادریس کو انگریزی تعلیم دلا رہا تھا۔ تینوں لڑکیاں زاہدہ۔ شاہدہ۔ اور عاصیہ ادریس سے بڑی تھیں۔ ادریس کی عمر چودہ سال کی تھی اور وہ نویں درجہ میں پڑھتا تھا جبکہ تینوں بہنوں کی شادی ہوگئی اور وہ اپنی اپنی سسرال گئیں۔ باپ کے سر سے بوجھ ہلکا ہوگیا مگر اب دوسری فکر دامنگیر تھی کہ جو کچھ زمینداری ہے اس کا کافی حصہ دختری میں نکل جائے گا۔ اور ادریس کی وہی حالت ہوگی جو ابتدا میں اس کے باپ کی تھی۔

اسی لئے باپ اس دُھن کے ساتھ اپنا پیٹ کاٹ کر ادریس کو پڑھا رہا تھا کہ آگے چلکر اپنا ذریعہ معاش آپ نکال سکے۔ لیکن اس کو بیٹے کا وہ خوش آیند مستقبل دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ جس سال ادریس نے انٹرنس کا امتحان دیا۔ باپ ہیضہ کا شکار ہو گیا

اس مصیبت پر سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ ادریس کو یہ دوسرا صدمہ ہوا۔ رابعہ اسکی رشتہ کی بہن ہوتی تھی اس کے ماں باپ امیر اور فکر معاش سے آزاد تھے۔ ادریس بچپن سے رابعہ کا دلدادہ تھا۔ رابعہ بچپن سے ادریس کے ساتھ منسوب تھی۔ رابعہ کے دادا کی وصیت تھی کہ وہ ادریس کے ساتھ بیاہی جائے وہ چاہتے تھے کہ ان کی دولت خاندان کے اور لوگوں میں بھی تقسیم ہو جائے اور ادریس سے ان کو خاص محبت تھی اس لئے کہ لڑکا ہونہار اور سعادتمند تھا

ادریس گورکھپور میں پڑھتا تھا۔ ایف۔ اے کا پہلا سال تھا۔ امتحان کے دن قریب تھے۔ ادریس آج تک درجہ میں دوئم نہ ہوا تھا۔ کالج کی ابتدائی زندگی تھی طلبہ میں حریفانہ چشمک بڑھی ہوئی تھی، ہر شخص اول آنے کی فکر میں تھا، ادریس بھی خاموشی اور محویت کے ساتھ محنت کر رہا تھا اسکو وظیفہ کی بھی فکر تھی۔ انٹرنس کا وظیفہ اسکو مل رہا تھا اور اگر یہ مقامی وظیفہ بھی مل گیا تو ماں کو بار سے یکلخت سبکدوش کر دیگا، ادریس امروز فردا کی نیرنگیوں سے بے خبر امتحان کی تیاری میں مشغول تھا کہ اس کو ممتاز کا خط ملا جس نے اسکے سکون و اطمینان کی دنیا کو آناً فاناً برباد کر کے رکھدیا۔

رؤف، رابعہ کا چچازاد بھائی تھا اس کا باپ کانپور میں تجارت کرتا تھا، اور بڑا آدمی سمجھا جاتا وہ زیادہ تر پردیس ہی میں رہا کرتا تھا گھر بہت کم آتا تھا۔ رؤف کو اس نے بڑے ارمانوں کے ساتھ پڑھایا تھا۔ رؤف نے بی۔ اے کر لیا تھا اور سرکاری ملازمت پا گیا تھا۔ ملازمت میں اس کا جی نہ لگا تو اس کو شوق ہوا کہ اپنی زمینداری کو چل کر سنبھالے، اس غرض سے اُسنے چھ ماہ کی رخصت لی اور رام نگر میں اپنے چچا کے یہاں آکر ٹھہرا۔ رابعہ کے ساتھ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ نتیجہ جو ہوا وہ خلاف توقع ہرگز نہ تھا۔ رؤف نے رابعہ کو اپنا گرویدہ بنالیا اور تین چار مہینوں میں تو یہ عالم تھا کہ رابعہ اگر کبھی تمام دن رؤف کو نہ دیکھتی تو ایسا محسوس کرتی کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ رابعہ کے والدین اس کا یہ حال دیکھ دیکھ کر خوش تھے اس لئے کہ وہ رؤف کو رابعہ کے لئے بہترین شوہر سمجھتے تھے، ادریس کا خیال رفتہ رفتہ سب کے ذہن سے نکل گیا۔ رابعہ خود بھی اس کو چند مہینوں میں خاطر انداز کر چکی تھی۔

ممتاز، ادریس اور رابعہ دونوں کا رشتہ دار تھا۔ کئی پشت سے اس کا گھرانہ فلاکت و تنگدستی میں بسر کرنے کا خوگر تھا، ادریس اور ممتاز بچپن کے ساتھی تھے، ممتاز کے والدین ایسے نادار تھے کہ دو وقت کی روٹیاں بھی مشکل سے مہیا کر سکتے تھے، لیکن رابعہ کے دادا بڑے کنبہ پرور تھے انہوں نے ادریس اور ممتاز دونوں کو فارسی کی تعلیم گھر پر دلوائی دونوں کو انگریزی پڑھنے کا بڑا ارمان تھا۔ اکثر جب وہ تنہائی میں اکٹھا ہوتے تو اسی موضوع پر بڑے ولولوں کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے۔ دونوں مصمم ارادہ کئے ہوئے تھے کہ گورکھپور میں چلکر انگریزی اسکول میں نام لکھائیں گے اور جہاں تک ان کے بس میں ہوگا تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں گے مگر زمانہ کی رفتار کچھ عجیب بے معنی اور بے قاعدہ ہوتی ہے وہ سب کو یکساں موقع نہیں دیتا ادریس کی حسرت پوری ہوگئی لیکن

ممتاز بیچارہ کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی۔ رابعہ کے دادا اگر زندہ ہوتے، تو بہت ممکن تھا اس کا بھی حوصلہ پورا ہو جاتا لیکن اس نیک نہاد اور خدا ترس بزرگ کے بعد کوئی ایسا نہ تھا جو کسی دوسرے کے دل کی لگی کو بجھاتا اور اس کے ساتھ ہمدردی کرتا اور ممتاز کے ماں باپ کی مقدرت سے یہ باہر تھا کہ وہ بیٹے کو پڑھاتے لکھاتے۔

ممتاز، مقدر کے آگے سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ اہل قضا و قدر کی بے نیازی کا اگر کوئی جواب ہو سکتا ہے تو وہ سر تسلیم ہے ممتاز جانتا تھا کہ ہم پر آپ پر اختیار کا دروازہ جب کھلا نہیں ہے تو پیشانی پر بل ڈالنا ایک فعل عبث ہے۔ سوا اسکے کہ جو کچھ آپ کو دیا گیا ہے اسپر صبر و شکر کر کے بیٹھ رہیئے۔ اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ رہ گیا یہ کہ اس کے بعد اپنی قسمت کو کوس کوس کر اپنی زندگی کو دوزخ بنا لیجئے یا ہر بات میں ایک راحت کا پہلو نکالکر دوزخ کو بھی جنت سمجھئے سو ممتاز کے خیال میں بالکل اپنی اپنی توفیق کی بات تھی، یہاں اس سے بحث نہیں کہ ممتاز کا خیال صحیح تھا یا غلط۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ وہ اپنی تلخیوں سے لذت حاصل کر رہا تھا۔

ادریس کی طرح ممتاز بھی بچپن سے رابعہ کا دلدادہ تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ رابعہ کی آرزو کرنا زمین پر رہ کر چاند کی آرزو کرنا ہے۔ ادریس اور ممتاز ایک دوسرے کے راز سے واقف تھے اور ادریس میں ممکن ہے کہ جذبۂ رقابت کا کوئی شائبہ رہا ہو۔ مگر ممتاز شوق کی اس منزل تک پہونچ گیا تھا جہاں "عداوتِ اغیار" تو ایک طرف دل میں "ہوس یار" تک باقی نہیں رہتی جس دھن کے ساتھ ممتاز رابعہ کو چاہنے کا دعویٰ کر سکتا تھا، شاید ادریس نہیں کر سکتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے دل میں یہ بھی سمجھے ہوئے تھا کہ:-

"مرا ازاں چہ کہ شیریں لبے است در کشمیر مرا ازاں چہ کہ نوشیں لبے است در نوشاد"

ممتاز طبعاً صوفی منش آدمی تھا اس کے ضمیر میں وہ جذبات موجود تھے جو آخر میں انسان کو صوفی یا بیراگی بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے رابعہ سے ہاتھ اٹھا لینا اس کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی اس کے سکون نفس کے لئے یہ خیال کافی تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ رابعہ کی شادی ادریس سے ہوگی اور وہ خوش تھا کیونکہ یہ بھی جانتا تھا کہ رابعہ کو ادریس سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا۔

ممتاز موضع یوسف پور میں رہتا تھا جو رام نگر سے تقریباً آدھی میل اُتر پورب کے کونے پر ہے یہ دونوں گاؤں ضلع بستی میں گھر کے قریب دریائے آمی سے کچھ دور پچھم واقع ہیں اور گرد و نواح کی آبادیوں میں اس لئے ممتاز سمجھے جاتے ہیں کہ یہاں زیادہ تر شرفا کی بستی ہے۔ ممتاز کے باپ کو مرے ہوئے چار سال ہو گئے تھے۔ اس نے کچھ دنوں تک تو ان کھیتوں پر زندگی بسر کی جنکو ایک کم مایہ زمیندار سے لگان پر اس کے باپ نے لے رکھا تھا۔ مگر پھر یہ بھی سہارا نہیں رہا۔ اس ملک میں زمین تو زمیندار کی ازلی میراث ہوتی ہے۔ فاقہ کرنے والے کسان ان کے دست کرم کے محتاج ہوتے ہیں۔ انہوں نے جب چاہا کاشتکار سے کھیت اس طرح نکال لیا جس طرح چور سے مال مسروقہ۔ ممتاز کے پاس بھی وہ کھیت رہنے نہ پائے، زمیندار نے نہ جانے

کس مصلحت سے اسکو ممتاز کے قبضہ سے نکال لیا۔ ممتاز نے بڑی بڑی مشکل سے ایک چھوٹی سی پونجی مہیا کی اور خلیل آباد میں کپڑے کی ایک دوکان کھول کر توکل کے ساتھ بیٹھ گیا۔

خلیل آباد بستی کی ایک تحصیل ہے اور نگر سے کوئی چار، پانچ میل پچھم ہے۔ ممتاز دن کو خلیل آباد میں رہتا اور شام کو دوکان بڑھا کر گھومتا پھرتا ہوا سب سے پہلے رام نگر پہونچتا تھا اور ایک نظر رابعہ کو دیکھتا ہوا اپنے مکان کو چلا آتا تھا۔ رابعہ اسکی بے غرض محبت سے واقف تھی مگر کبھی اس نے اسپر زیادہ غور نہیں کیا اور نہ اس کے نزدیک ممتاز کوئی قابل اعتنا ہستی تھا وہ بس کبھی کبھی ممتاز سے دلربایانہ انداز کے ساتھ مسکرا کر دو چار باتیں کر لینا ممتاز کی نیاز مندیوں کا کافی صلہ سمجھتی تھی۔

ممتاز زندگی کی ماہیت سے آگاہ تھا اسکو معلوم تھا کہ "اسفل السافلین" میں کرب و الم بہ مقابلہ راحت و انبساط کے کہیں زیادہ ہے مگر وہ ان لوگوں میں سے تھا جو خدا کو "حکیم و بصیر" مانتے ہیں۔ اسکا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کو جس چیز نے انسان بنایا ہے وہ اس کا دکھا ہوا دل ہے ورنہ آج وہ بھی زیادہ سے زیادہ کروبیوں کا ہم بزم ہوتا اور اشرف المخلوقات کہے جانے کا کسی طرح مستحق نہ ہوتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری یہ زندگی محنت و ابتلا کی زندگی ہے لیکن ہماری روحانی تحسین و تکمیل کے لئے یہ ایک لازمی چیز ہے سنائی نے ارتقاء انسانی کے لئے یہ شرط بتائی ہے

"درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن"

ممتاز کا فلسفۂ زندگی بھی یہی تھا وہ زمانہ کی تلخیوں اور زمین و آسمان کی ستم ایجادیوں سے بے خبر تو نہیں مگر بے پرواضرور تھا۔ اس کو "نفس مطمئنہ" جیسی دولت نصیب تھی اس کے لئے سب سے بڑی راحت رابعہ کی محبت تھی جس کو وہ بجائے خود ایک نصب العین سمجھے ہوئے تھا۔

لیکن جب اسکو معلوم ہوا کہ رابعہ نے اپنے جذباتِ محبت ادریس سے رؤف کی طرف منتقل کر دیئے ہیں اور اسکے والدین اب سال کے اندر رؤف کو اسکا رفیق زندگی بنانے والے ہیں تو ممتاز کے دل کو غیر معمولی دھکا لگا۔ دنیا کی یہ سفلہ پروری برداشت کے قابل نہ تھی۔ اسکا دل دکھ گیا وہ ادریس کو رابعہ کے لئے بہترین شوہر سمجھتا تھا۔ ادریس کی اس سے بڑھ کر حق تلفی اور کیا ہو سکتی تھی۔ ممتاز نہ جانے کیوں رؤف سے پہلے ہی نظر میں نفرت کرنے لگا تھا۔ رؤف کے تیور سے اسکی طبیعت میں ایک غیر واضح بدمزگی سی پیدا ہو گئی تھی جو پھر کبھی دور نہیں ہوئی۔ جس وقت ممتاز نے رابعہ اور رؤف کو پہلی بار اکٹھا دیکھا اسکا دل ایک نامعلوم اندیشہ سے دھڑکنے لگا، اور یہ دھڑکن قایم رہ گئی۔ رؤف کے آتے ہی ممتاز نے رابعہ سے ملنا کم کر دیا تھا اور اب جبکہ یہ بات گرد و نواح میں مشہور ہو گئی کہ عنقریب رابعہ کی شادی رؤف سے ہونے والی ہے تو اس نے رام نگر کا آنا جانا بھی بند کر دیا اور ادریس کو مفصل حالات لکھ بھیجے۔

(۴)

ادریس افتاد طبیعت کے لحاظ سے ممتاز کا مد مقابل تھا۔ بچپن سے وہ زندگی کو ایک روگ سمجھتا تھا۔ جن ناہمواریوں سے

اسکو گزرنا پڑ رہا تھا انکو وہ کسی رحیم و کریم کارساز کی عنایت سمجھنے سے طبعاً معذور تھا۔ دنیا کی کسی چیز میں اسکو کوئی روشن پہلو نظر نہ آتا تھا۔ رابعہ اور رابعہ کی محبت ہی ایک چیز تھی جو کبھی کبھی اسکے دل میں یہ خیال پیدا کر دیتی تھی کہ ممکن ہے اس دنیاوی زندگی کا انجام بخیر ہو مگر اب تو وہ ایک ایسی تاریک خلا میں پھینکدیا گیا جہاں اس کے سہارے کے لئے ایک تنکا بھی نہ تھا۔ ممتاز کے خط کے ساتھ اس کی ماں نے بھی ایک تحریر بھیجی تھی جس میں بیٹے کی تسلی و تشفی کے لئے بیچاری نے اپنا کلیجہ نکالکر رکھدیا مگر ادریس کی تسلی آسان نہ تھی۔ کچھ دنوں تک تو ایسا معلوم ہوتا کہ خود اپنے کو نہیں پہچانتا۔ گرد و پیش جو بر صورت مانوس تھے اسکو غیر مانوس نظر آرہے تھے اگر اس میں ارادہ کی قوت زبردست نہ ہوتی تو شاید بہت جلد ڈاکٹر اسکو فتور دماغ کی سند دیدیتے وہ نہ جانے کیسی کیسی امنگوں کو اپنے دل میں پرورش دے رہا تھا، وہ یہ سوچ سوچ کر رگوں میں اک روح افزا گرمی محسوس کر رہا تھا کہ جب رابعہ اسکی اپنی ہو جائے گی تو وہ اس زندگی کو جو "نمرود کے آتشکدہ" سے کسی طرح کم نہیں "ابراہیم کا گلزار" بنانے کی کوشش کریگا اور اسکو قوی امید تھی کہ اس کوشش میں کامیاب ہوگا، مگر امیدیں پوری کب ہوتی ہیں۔ قدرت کا کارخانہ ہی کچھ نرالا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اندھیری رات روشن ہو جائے اور ہمارا دن بھی سیاہ کر دیا جاتا ہے۔ ہم اپنی تمام قوت "باراں" کی آرزو" میں صرف کر دیتے ہیں اور آخر کار ہمارے لئے آگ برسائی جاتی ہے۔ حسرتوں کا خون کرنا قدرت کا کھیل ہے اگر کبھی کسی کی کوئی حسرت پوری ہو جائے تو اسکو صرف ایک حسن اتفاق یا قدرت کی.... فروگذاشت سمجھنا چاہئے۔ قطرہ بالعموم موتی نہیں ہوتا اس تمنا میں نہ جانے کتنے قطروں کو "کام نہنگ" کی نظر ہو جانا پڑتا ہے۔

ادریس دنیا میں صرف دو ہستیوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ایک تو رابعہ تھی اور دوسری اپنی ماں۔ رابعہ سے دفعتہً اسکو اپنا دل ہٹانا پڑا تو ماں کے ساتھ اسکی محبت دگنی ہو گئی۔ یہ ماں ہی کی محبت تھی جس نے اسکو ایک خطرناک لمحہ سے بچا لیا ورنہ اس کے اعصاب کو ایسا دھکا لگا تھا کہ شاید اب آگے بڑھنا اس کے بس کی بات نہ ہوتی لیکن اس خیال نے کہ اس کے ماں کی آیندہ خوشیاں اسی کے دم سے ہیں اس کو اپنے کام میں ثابت قدم رکھا۔ کچھ دنوں میں اس نے اپنے منتشر حواس کو مجتمع کیا اور اب پہلے سے کہیں زیادہ انہماک کیساتھ پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے فرصت کے اوقات کو بھی اس نے کام میں صرف کرنا شروع کیا۔ وہ اسکول کے تین چار لڑکوں کو پڑھانے لگا تھا اور اب ماں سے ایک پیسہ بھی اپنے خرچ کے لئے نہیں مانگتا تھا بلکہ کبھی کبھی کچھ روپیہ اپنی کمائی سے اسکو بھیجدیا کرتا تھا، یہ سب ادریس کی غیر معمولی قوت ارادی کا نتیجہ تھا۔ اس میں ایک تغیر البتہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے اسکو خوش پوشی کا شوق تھا وہ اپنی بے مائگی میں جیسے صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا بڑے بڑے امیرزادوں کو نصیب نہ تھے ادریس کا سلیقہ ضرب المثل تھا مگر اب وہ اسکی طرف سے بھی غافل تھا اور زیادہ تر موٹے کپڑے پہننے لگا تھا دفعتہً یہ انقلاب ادریس کے ہم جماعتوں کی سمجھ میں نہ آیا۔

پہلے سال ایف۔ اے کے امتحان میں ادریس بڑی کوششوں کے بعد ممتاز رہا۔ اسکو مقامی وظیفہ ملگیا اور اس کا علمی حوصلہ بڑھ گیا۔ گرمی کی تعطیل میں وہ صرف چند دنوں کے لئے اپنی ماں کے پاس آکر رہا اور پھر اسکو دلاسا دے کر چلا گیا۔

رام نگر کی بدلی ہوئی فضا سے بقدر جلد وہ موانست نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ رابعہ کا قرب تو ایک طرف ادریس کے لئے اب ہر وہ چیز سوہانِ روح تھی جو اسکو رابعہ کی یاد دلادے اس لئے اب وہ کم از کم رام نگر میں رہنے کی تاب نہ لا سکتا تھا، اس کے علاوہ جن لڑکوں کو وہ پڑھاتا تھا ان کے لئے چھٹیوں میں بھی اسکا گورکھپور رہنا ضروری تھا۔ لہذا وہ ماں کو سمجھا بجھا کر چلا گیا۔ غریب سکینہ ان ماؤں میں سے تھی جو اولاد کی فلاح و بہبود کے لئے جان سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ اسکو اسکا صدمہ تھا کہ بیٹا سال بھر کی جدائی کے بعد بھی دو ماہ کے لئے اطمینان کے ساتھ اس کے پاس نہیں رہ سکتا مگر وہ خوب جانتی تھی کہ ادریس کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ اس نے پردہ ہی پردہ میں ادریس کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور جب یہ دیکھا کہ بیٹے کے لئے رام نگر سے دور ہی رہنا بہتر ہے تو ہنسی خوشی سے اسپر بھی راضی ہو گئی۔

ایف۔ اے کا دوسرا سال تھا، جاڑوں کا موسم تھا۔ رابعہ کی شادی کے دن قریب تھے۔ ادریس کے نام بھی دعوتی رقعہ آیا تھا ادریس پر اس سے زیادہ ظلم ممکن نہ تھا اس کے دل کے ایک ایک ریشہ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر اس نے بڑے ضبط سے کام لیا انگیٹھی میں ڈال کر خاموش ہو رہا۔ وہ رابعہ کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔ رابعہ اب رابعہ نہ تھی اب وہ رؤف کی بیوی تھی پہلی رابعہ کو ادریس خواب کی رابعہ سمجھکر بھول گیا تھا۔

(۴)

پانچ برس گذر گئے رابعہ اور رؤف کی زندگی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خوشگوار تھی اگرچہ رؤف نے اس عرصہ میں کچھ جوہر ایسے نکالے جس کی لوگوں کو امید نہ تھی۔ اس نے ملازمت ترک کر دی تھی اور اب اپنی جائداد کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ اسکی جایداد رابعہ کی جایداد سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ صاحبِ نقطہ تھا اور اس حیثیت سے بھی ملازمت کا محتاج نہ تھا پھر کیا وجہ کہ وہ گھر پر عیش و بے فکری سے زندگی بسر نہ کرے، اس نے اپنی ماں اور چھوٹی بہن کو بھی گاؤں پر بلا لیا اور پرانے مکان کو از سر نو شہری طرز پر تعمیر کرا کے وہیں سکونت اختیار کر لی اس کا بس ہوتا تو باپ کو بھی بلا لیتا مگر باپ نے کانپور چھوڑنا پسند نہیں کیا۔

رؤف فطرتاً اوباش تھا۔ عیاشی اور لذت پرستی اس کو وراثت میں ملی تھی۔ اسکی محبت بوالہوسی تھی۔ رابعہ کے ساتھ دو سال تو اس نے بڑے انہماک میں گذارے اس کے بعد اس نے اپنے خروش نفسانیت کو آسودہ کرنے کے لئے نت نئی دلچسپیاں نکالنا شروع کیں لیکن پھر بھی رابعہ کے ساتھ اسکا برتاؤ ایسا نہ تھا جو کسی طرح قابلِ ملامت سمجھا جاتا۔ البتہ اب وہ اسکو ایک ہندوستانی بی بی سے زیادہ قابلِ قدر نہیں سمجھتا تھا۔

رؤف کی روش لوگوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ قریب و دور کی بہو بیٹیوں کو بہکانا اور ان کو مبتلا کر کے چھوڑ دینا دن رات کا اسکا مشغلہ ہو گیا تھا۔ گھر والوں نے مجبوراً اس کو ریاست کی ایک شان سمجھ لیا مگر گاؤں والے رؤف کو پورا شیطان سمجھتے تھے اگر اس کے پاس اتنی دولت نہ ہوتی جو ہر موقعہ پر اسکے کام آتی تھی تو شاید آج اسکا اس جوار میں رہنا دشوار کر دیا جاتا۔ فاقہ مست کسان بکشتی کے خلاف کوئی سست سے سست تدبیر اختیار نہ کر سکتے تھے ناچار سب دیکھتے تھے اور رؤف کی جان کو کوستے

چپ رہ جاتے تھے۔

رؤف نے چاروں طرف اپنا سکہ جمانے کی اک صورت اور بھی نکالی رکھی تھی وہ سود پر روپیہ تقسیم کرتا تھا زمین پھاڑ کر پیٹ پالنے والے کسان اور چھوٹی پونجی والے زمیندار اس کے قرضدار رہتے تھے اور رؤف ان سے جو چاہتا تھا روپیہ کے بل پر کرا لیتا تھا بظاہر وہ ان ناداروں کی روپیہ سے مدد کرتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ بیچاروں کا خون چوس رہا تھا۔ سرمایہ داری کا روگ یوں تو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے مگر ہندوستان اس کے ہاتھوں بری طرح مٹ رہا ہے اور سرمایہ داری و زمینداری نے ملک کا شتکاروں کے پاس سوا جسم اور سانس کے اور کچھ نہیں چھوڑا ہے اس ملک کی آبادی میں کسانوں کی تعداد غیر متناسب طور پر زیادہ ہے ہندوستان کی فلاح و بہبود در اصل انہیں "غم زدوں" کی فلاح و بہبود پر موقوف ہے مگر شامت ہو تو ایسی ہو کہ آج طرح طرح کی اقتصادی اور سیاسی شورشیں ملک میں پھیل رہی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو اس طرف اپنی توجہ مبذول کرے اور خلوص نیت کے ساتھ گانوں کی پست اور گندی زندگی کو ابھارنے کی کوشش کرے۔

(۵)

اگہن کا مہینہ تھا۔ سنیچر کی شام تھی۔ ممتاز آج خلیل آباد سے سویرے لوٹ آیا تھا۔ ہاتھ پاؤں دھو کر اور ماں نے جو کچھ رکھا سو کھا سامنے رکھدیا اس کو کھا کر حسب معمول سیر کے لئے نکل گیا اسکا روزانہ دستور یہی تھا صبح شام وہ ٹہلنے ضرور نکلتا تھا اور دور کا چکر لگا آیا کرتا تھا۔ شام کے وقت تو وہ بڑی دیر تک گھر سے غایب رہتا تھا۔ زیادہ تر وہ پریتیا کے جنگل یا اس کے نواح میں گشت کیا کرتا تھا۔ آبادی سے دور ویرانوں میں اس کے لئے دلچسپی کا سامان زیادہ تھا۔

پریتیا کا جنگل جو قرب و جوار میں مشہور ہے آمی کے کنارے واقع ہے اور رام نگر اور یوسف پور کی سرحد سے لیکر چاروں طرف ڈیڑھ کوس کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے جنگل بے انتہا گھنا ہے لیکن اس میں بڑے درخت کم ہیں زیادہ تر ببول اور ڈھاک کے درخت ہیں۔ رات کو اس جنگل سے جو گذرتا ہے بڑا دلیر سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ درندوں اور سانپ بچھوؤں کے علاوہ یہاں ڈاکوؤں کا بھی ڈیرا رہتا ہے اور جاہل و غیر متمدن کسانوں کا خیال ہے کہ پریتیا بھوت پریت کا بھی اکھاڑا ہے۔ چنانچہ پریتیا اسے اسی نسبت سے کہتے ہیں۔ ممتاز کو جو لوگ نہیں جانتے تھے وہ حیرت کرتے تھے کہ وہ اتنی رات تک جنگل میں صحیح و سالم کیسے پھرا کرتا ہے مگر جو لوگ جانتے تھے وہ اسکو صاحب کرامات سمجھتے تھے وہ اللہ والا مشہور تھا۔ اکثر لوگ اس کے مرید تھے۔ اور دعا تعویذ کے لئے اس کے پاس آتے تھے وہ بھی انکو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا اور اپنی بندگی اور بیچارگی کا دل میں خضوع و خشوع کے ساتھ اعتراف کر کے ان کے لئے دعا کر دیا کرتا تھا یا تعویذ لکھدیا کرتا تھا۔ یوں تو اس جنگل کو دیکھکر ہمیشہ ممتاز کے دل میں ایک جلیل القدر قوت کا احساس ہونے لگتا تھا لیکن جاڑے کے موسم میں اسکا یہ احساس تیز ہو جاتا تھا جبکہ اس جنگل کا جلال پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتا تھا۔ آج کہر بے طرح گر رہی تھی۔ زمین اور آسمان ملگئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدسیوں اور خاکیوں میں کچھ مشورے ہو رہے ہیں۔ جنگل کا ایک ایک درخت اور درخت کا ایک ایک پتہ ذی روح معلوم ہوتا تھا۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ آبادیوں میں ابھی دھوپ تھی لیکن پربتیا، تیر و تار ہو رہا تھا، اگر کوئی بہ یک وقت پربتیا کا قریب کی بستیوں سے مقابلہ کرتا تو اسکو ماننا پڑتا کہ اگر یہ بستیاں اس دنیا کی چیزیں ہیں تو یہ جنگل کسی دوسری دنیا کی چیز ہے۔ دن ابھی باقی تھا مگر لکڑ ہارے اپنے اپنے بوجھ سنبھال رہے تھے کیونکہ جنگل میں ایک گھنٹہ پہلے ہی رات ہو گئی تھی۔

پربتیا کی سیر کا مناسب وقت یہی ہے جبکہ ساری دنیا دھیرے دھیرے خواب میں محو ہونے لگتی ہے اور جنگل کی روحیں بیدار ہونے لگتی ہیں ہر طرف ایک حرکت ایک دوا دوش ہونے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیتا بیتا کسی اہم کام میں مصروف تھے۔ ایسے وقت پربتیا کے "رموز مملکت" میں دخل در معقولات کرنا یا ممتاز جیسے از خود رفتہ لوگوں کا کام تھا، یا چور اور ڈاکوؤں کا۔

پربتیا میں ایک سرے سے دوسرے تک نالوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ یہ نالے آمی سے نکلے ہیں جو برسات میں بھر جاتے ہیں اور جنگل کے سماں کو اور بھی بھیانک بنا دیتے ہیں لیکن جاڑوں میں ان میں پانی کم رہ جاتا ہے۔ ممتاز اپنے عصائے موسیٰ کے بل پر نالوں کو پھاندتا ہوا پربتیا کے شمالی کنارے تک پہونچ گیا، رات ہو گئی تھی مگر گھر پلٹنے سے ابھی اسکی "شب پرست" طبیعت اسکو روک رہی تھی۔

ممتاز نے جنگل کے آخری حد تک پہونچ کر پلٹنا چاہا۔ اپنا رخ پھیرنے بھی نہ پایا تھا کہ جنگل کے باہر سے کچھ کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی اور اسی کے ساتھ کسی نے پکار کر کہا "رؤف میاں آج اتنی دیر کیوں ہوئی" آواز میں کچھ نسوانی نزاکت تھی۔ ممتاز پہلے تو کچھ سہم سا گیا مگر دریافت حال کی غرض سے جنگل کے باہر نکل آیا۔ ایک بیس سال کی عورت سفید ساری پہنے ہوئے اسکی طرف آ رہی تھی لیکن ممتاز کے قریب آکر جھجک گئی اور یہ کہکر ایک کنارہ ہو رہی "دھوکا ہوا!" ممتاز اندھیرے میں تو اس کی صورت نہ دیکھ سکا لیکن وہ سمجھ گیا کہ اس جوار مین ایسی سفید پوش عورت سوا ایک کے اور کون ہو سکتی ہے۔ ممتاز واپس ہونے لگا کہ جنگل کے اندر سے کسی کے کرنے کی آواز آئی۔ ممتاز آواز پر دوڑ پڑا تھوڑی دور پر ایک گہرا نالا تھا جس مین پانی برائے نام تھا۔ ممتاز نے دیکھا کہ ایک شخص اُس مین سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہُوا کہ رؤف ہے۔ ممتاز نے اُسکی مدد کی۔ رؤف نالے سے باہر نکلا تو اسکو احساس ہُوا کہ وہ کس کے سامنے ہے۔ اُس کا اس جنگل مین ایسے نا وقت پایا جانا ہر طرح کے شبہے دل مین پیدا کر سکتا تھا۔ وہ اس خیال سے نادم تھا کہ ممتاز اپنے دل مین کیا سمجھتا ہوگا اُس نے اپنی بندوق کو جو کیچڑ مین لت پت تھی پتون سے صاف کرکے کاندھے پر رکھا اور ممتاز سے کہا "مین شام کو ادھر شکار کی غرض سے روز آتا ہون۔ آج مجھے اپنے منشی سے ایک ضروری کام کے متعلق کچھ کہنا تھا اسلئے تیواری پور جا رہا تھا مگر اب چلو گھر واپس چلونگا" ممتاز نے طنز آمیز لہجہ مین کہا "نہین اب آپ اپنا کام پورا ہی کر لیجئے۔ آپ کا منشی جنگل کے اُس سرے پر آپ کا دیر سے انتظار کر رہا ہے" یہ کہکر وہ تیزی کے ساتھ وہان سے روانہ ہو گیا۔ رؤف دیر تک اُس کے الفاظ پر غور کرتا رہا

وہ سمجھ گیا کہ ممتاز اُس کے راز سے واقف ہے۔

(۶)

مگہر ضلع بستی کے اُن مقامات مین سے ہے جو تاریخی شہرت رکھتے ہین۔ یون تو اکثر ٹوٹے پھوٹے کھنڈر یہان آپ کو نظر آئین گے جن کی عبرت آموز ہیئت آپ کو ایک مٹے ہوے تمدن کی یاد دلاکر آپ کے نازک ترین جذبات کو اُبھادیتی ہے اور آپ اپنی آنکھون مین نمی محسوس کرنے لگتے ہین لیکن جس چیز نے اس مگہر کو سارے ہندوستان مین ایک قابل احترام جگہ بنادیا ہے وہ کبیر داس کا روضہ ہے جو قصبہ سے اتر دریائے آمی کے کنارے واقع ہے اس عمارت کا نصف حصہ ہندؤن کے قبضہ مین ہے اور نصف مسلمانون کے۔ کبیر دراصل ایک شاعر صوفی تھے اُن کو کفر و اسلام سے کوئی سروکار نہ تھا مگر اُن کی معاشرت کچھ ایسی تھی کہ ہندؤن نے اُنکو ہندو سمجھا اور مسلمانون نے مسلمان۔ ظاہر پرست عوام اس حقیقت کو سمجھنے سے معذور ہین کہ ایک ہی شخص بیک وقت مسلمان اور ہندو دونو رہ سکتا ہے۔ بہر حال مرنے کے بعد کبیر کی خاک دو حصون مین بٹ گئی۔ ایک حصہ کو مسلمانون نے لیکر مقبرہ بنایا اور دوسرے حصہ سے ہندؤن نے ایک مندر تعمیر کیا۔

یہ تو ہوئی مگہر کی تاریخی حیثیت فی الحال مگہر بیرونی مقامات مین جلاہون کے بُنے ہوے موٹے کپڑون اور پان کیلئے مشہور ہے۔ لیکن مقامی طور پر یہان کے تاڑی خانون کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ کوس ڈیڑھ کوس تک کے فاصلہ پر رہنے والے یہان تاڑی پینے آتے ہین۔ ان تاڑی خانون کو دیکھکر انگلستان کے وہ قہوہ خانے یاد آجاتے ہین جو سولھوین اور سترھوین صدی مین گرما گرم بحثون سے ممتاز تھے۔ شام کو جب دن بھر کے تھکے ماندے مزدور اور جولاہے (جن مین جوان ادھیڑ اور بڈھے سبھی شامل ہوتے ہین) "بادہ فروش" کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہین۔ اُسوقت کون سا ایسا مسئلہ ہوتا ہے جسپر چہ می گوئیان نہین ہوتین۔ حکومت برطانیہ کی گندم نما جو فروشیون سے لیکر آٹے دال کے بھاؤ اور ہمسایون کی بیبیون تک سبھی کچھ پر باآواز بلند مباحثے ہوتے رہتے ہین۔ ان مباحثون مین اکثر ہاتھا پائی کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ ایسے موقعے پر عموماً ساقی یا ساقیہ کی برمحل مداخلت سے جھگڑا چک جاتا ہے اور پھر سب آپس مین ہنسنے بولنے لگتے ہین نہین تو فریقین کے سرون کیساتھ کوزے اور مٹکے بھی معرض خطر مین آجاتے ہین۔ ہفتہ مین ایکبار بدھ کے دن مگہر مین بازار لگتا ہے اس دن اُن تاڑی خانون کی رونق مین معمولی طور پر بڑھجاتی ہے۔

جس سنیچر کا ذکر کیا جاچکا ہے اُسکے چار روز بعد مگہر مین بازار لگا ہُوا تھا۔ بازاریون کی آمد و رفت سے سڑک آباد ہو رہی تھی۔ سہ پہر کیوقت قصبہ سے باہر سڑک کے کنارہ تاڑی کی ایک دوکان پر اور دکانون سے زیادہ ہجوم تھا اُسکی وجہ یہ تھی کہ یہان جو بحث چھڑی ہُوئی تھی وہ حال کے ایک واقعہ سے متعلق تھی اور اسقدر دلچسپ تھی کہ بہتیرے پرہیز گار جو تاڑی کی مہک کو بھی گناہ سمجھتے تھے۔ بحث مین آکر شریک ہو گئے تھے۔

میان رؤف اور مریم کے درمیان گذشتہ چھ مہینون مین جو تعلقات پیدا ہو گئے تھے اُنھین پر ہر شخص اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا آخر کار دکان کی مالکہ کی تائید سے ایک بڑے میان کا بول بالا رہا اور کثرت رائے سے مریم جادوگرنی تسلیم کر لی گئی

مریم کا شہرہ دور دور تھا۔ وہ تیواری پور مین گانؤن کی آبادی سے باہر اپنے دادا رسول شاہ کے ساتھ ایک کچے مکان مین رہتی تھی۔ اُس کو پڑوس مین آئے ہوئے سال بھر سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اُس کے متعلق طرح طرح کی افواہین مشہور تھین۔ بعض اسکو ہرجائی بیسوا کہتے تھے اور اُسکو ملامت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بعض اُسکو جادوگرنی سمجھکر اُس سے کانپتے تھے۔ عام طور پر مشہور تھا کہ پربتیا کے جتنے بھوت پریت ہین وہ سب اس کے تابعدار ہین۔ گانؤن کے نوعمر لڑکون اور لڑکیون کو بڑے بوڑھے مریم کے پاس آنے جانے نہین دیتے تھے لیکن چھپ چھپ کر لڑکیان خصوصیت کے ساتھ اُس کے پاس آیا کرتی تھین۔ مریم ہُنر والی عورت تھی۔ اُس کی زبان نسبتاً صاف اور شستہ تھی۔ وہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتی تھی اور سینے پرونے کے کام مین ماہر تھی۔ آس پاس کے لوگون کو اگر کوئی خط لکھوانا یا پڑھوانا ہوتا یا اگر کبھی کسی شوقین کو کوئی اچھا کپڑا سلوانا ہوتا تو مریم ہی یاد کیجاتی تھی۔ چونکہ مریم کو کسی کیساتھ دوستانہ لگاؤ نہین تھا اس لئے وہ اُن کے کام اُجرت پر کیا کرتی تھی۔

افواہون سے برطرف ہو کر مریم کے بارے مین صحیح حالات جو معلوم ہو سکے ہین وہ یہ ہین۔ رسول شاہ کا آبائی پیشہ فقیری تھا۔ باپ دادا کے وقت سے یہی روزی کا ذریعہ تھا۔ اور زکواۃ خیرات سے اُس کا روٹی کپڑا چلتا تھا۔ رسول شاہ کے باپ کے زمانہ سے کچھ کھیتی بھی ہونے لگی۔ رسول شاہ نے آمدنی کی ایک اور تدبیر نکالی وہ ڈاکوؤن کے گروہ مین داخل ہو گیا جس مین اُس نے کافی نمود حاصل کر لی۔ دس بیس کوس کے حلقہ مین جہان کہین ڈاکہ پڑتا رسول شاہ اُس مین ضرور شریک ہوتا تھا۔ اب بڑی فرغت سے بسر ہونے لگی۔ رسول شاہ کے ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹی بیاہی جا چکی تھی اور سسرال مین رہتی تھی۔ بیٹے کا نام سجاد تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ ابھی شادی نہین ہوئی تھی۔ راہزنی مین وہ باپ سے سبقت لے گیا تھا۔ اس عمر مین دو دفعہ وہ قید خانہ کی سیر کر آیا تھا۔ ایکدفعہ ایک ڈاکہ کے سلسلہ مین جس مین کئی خون بھی ہوئے تھے۔ سجاد گرفتار ہو جانے کے خوف سے گھر چھوڑ کر بھاگ گیا اور پھر کوئی اُس کا پتہ نہ پا سکا۔ رسول شاہ عرصہ تک اس جرم مین پولیس کے ہاتھون بندھا پھرا کہ بیٹے کا پتہ جانتا ہے اور بتاتا نہین مگر واقعہ یہ تھا کہ اُس کے فرشتون کو بھی خبر نہ تھی کہ سجاد کہان ہے رسول شاہ قسی القلب ڈاکو ہونیکے باوجود اولاد پر دم دیتا تھا۔ بیٹے کے غم مین وہ نہ جانے کتنے یعقوبی آنسو گرا چکا تھا مگر اُس کے ''کلبۂ احزان کو ''گلستان'' ہونا نصیب نہ ہوا۔

تقریباً بیس برس بعد کلکتہ سے سجاد کی چھٹی آئی جس مین اُس نے اپنی مختصر سرگذشت بیان کر دی تھی وہ یہان سے بھاگ کر سیدھا کلکتہ پہونچا تھا اور برسر روزگار ہو گیا تھا۔ سال بھر بعد وہین ایک یتیم بھکارن سے

شادی کرلی تھی دوسرے سال ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بیوی چند سال بعد مر گئی اور لڑکی کو سجاد نے بڑی بڑی منتوں کے ساتھ پالا۔ اب لڑکی کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ رسول شاہ کو خط لکھنے کی تقریب یہ تھی کہ کوئی آٹھ نو مہینہ سے سجاد سخت تپ میں مبتلا تھا اور بچنے کی کوئی امید نہ تھی اب وہ چاہتا تھا کہ رسول شاہ جاکر اس کی بیٹی مریم کو اپنے ساتھ وطن لے آئے اور اسکو اسی طرح اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھ کر رکھے جس طرح ابتک خود سجاد نے رکھا تھا۔

رسول شاہ خط پاکر بہت رویا اور دو دن کے اندر ادھر ادھر سے کچھ نقد کا بندوبست کرکے کلکتہ روانہ ہوا۔ سجاد کی حالت ابتر تھی۔ وہ دم توڑ رہا تھا اگر رسول شاہ ایک دن اور دیر کرکے پہونچتا تو بیٹے کو زندہ نہ دیکھتا۔ سجاد میں زیادہ بولنے کی تاب نہ تھی۔ اس نے اکھڑے ہوئے جملوں میں مریم کو رسول شاہ کے سپرد کیا اور ایک آخری سانس لیکر زندگی کے جھگڑوں سے بے خبر ہوگیا۔ رسول شاہ مریم کو لے کر وطن آیا اور اسکو اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھ کر اپنی توجہ اسپر وقف کردی۔ مریم کی کوئی خواہش ایسی نہ تھی جس کو رسول شاہ پورا نہ کرتا ہو۔ مریم بھی دادا سے بڑی محبت کرتی تھی، اور ہر طرح اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ سینے پرونے سے اسکو جو کچھ ملتا تھا وہ سب رسول شاہ کی ہاتھ میں لاکر دیتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر مریم اپنی آزادی اور بیباک روی میں کسی کو خلل انداز نہ ہونے دیتی تھی۔ رسول شاہ نے چاہا کہ اسکی شادی کردے مریم نے انکار کردیا اور رسول شاہ دوبارہ کچھ کہنے کی ہمت نہ کرسکا۔ مریم مردوں سے بے جھجک ملا کرتی تھی۔ رسول شاہ نے دبی زبان سے منع کیا مگر مریم نے توجہ نہ کی، وہ ان عورتوں میں سے تھی جو اپنی عصمت اور اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے مردوں کی ابلہانہ فریفتگی سے لطف اٹھایا کرتی ہیں

مریم خوبصورت تھی رنگ سرخ و سپید تھا۔ جسم نرم و نازک تھا اعضا کی ساخت سڈول تھی اس کے گھنے اور سیاہ بال جس وقت بکھر جاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ پھولی ہوئی شفق پر طوفانی رات مسلط ہوگئی ہے۔ وہ کپڑوں کی شوقین تھی اور ان کو ایسے سلیقہ سے پہنتی اور رکھتی تھی کہ سال سال بھر کے کپڑے نئے معلوم ہوتے تھے۔ اس وجہ سے بھی دیہاتی اسکو عامل سمجھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چند فرمانبردار موکل ہیں جو مریم کو کپڑے اور روپئے لالاکر دیا کرتے ہیں

مریم کو کسی دوسرے عالم کی بہار کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کے حسن و جمال کی پوری تصویر کھینچنا ایسا ہی ہے جیسے کسی لطیف شعر کے اثرات کی تشریح کرنا۔ اس میں اکثر ایسے ''نکات دلبری'' تھے جنکا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا، مثلاً اسکی کالی پتلیاں تاریکی کے ان اسرار سربستہ سے معمور تھیں جنکا علم صرف آدھی رات کے جاگنے والوں کو ہوسکتا ہے اسکی آنکھوں میں جو اثر تھا وہ اس کو جادوگری ماننے پر مجبور کرتا تھا جس نے اسکی آنکھوں کا ایک بار سامنا کیا وہ اپنے دل میں ایک عجیب و غریب کیفیت لے کر گیا جس کی طرف اسکی نظر اٹھ گئی اسکا قرار و سکون پامال ہوکر رہ گیا۔ ایسی ہی آنکھوں کا نہ دیکھنا بقول مومن ''عین نگہہ التفات'' ہوا کرتا ہے۔ خود مریم اپنی آنکھوں کی سحر آفرینیوں سے اکثر مغلوب ہوجاتی تھی اسوقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں کھولے ہوئے سو رہی ہے اور گرد و پیش سے بالکل بیخبر ہے۔ اسکے نازک رسیلے ہونٹوں کے متعلق یہ کہنا بجا ہوگا کہ باتیں کرنے کیلئے نہیں بلکہ صرف چوسے جانے کیلئے اور بوسوں کے ہیجان سے کپکپانے کیلئے بنائے گئے تھے۔

مریم بلاناغہ صبح و شام جنگل اور ندی کی سیر کے لئے نکلتی تھی اسکو قدرت اور قدرت کی نیرنگیوں میں تنہا رہنے کی لت تھی۔ گرمیوں میں شام کو جب وہ لٹیں چھٹکا کر آمی کے کنارے کھڑی موجوں کا تماشا دیکھتی ہوتی تو کسی طرح اسکو اس عالم عناصر کی مخلوق تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ جنگل کی دیوی ہے یا کوئی جل پری جو آسمان والوں کو بھی سر بسجود کر کے چھوڑے گی یا پھر زہرہ و مشتری کی کوئی ہمجنس ہے جو کسی فرشتہ کی ملکوتیت خاک میں ملا کر سانس لے گی پھر اگر تنگ خیال دیہاتی اسکو جادوگرنی کہتے تھے تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی وہ اس جوار میں کم از کم ایک اجنبی سی چیز ضرور تھی۔

رؤف نے پہلی بار مریم کو اسی آن سے دیکھا تھا اور اسکی صورت کا پرستار بن گیا تھا۔ رؤف کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا جسنے اسکو بے قابو کر دیا وہ اب تک نہ جانے کہاں کہاں اپنا دل لگا چکا تھا، لیکن اس کے دل میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا۔ اب اس نے اپنے دل کو متغیر ہوتے ہوئے پایا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھی ایک نئی کیفیت تھی۔ مریم دوسری عورتوں کی طرح نہ تھی جسپر ایکبارگی دسترس پا کر رؤف پھر قطع نظر کر لیتا۔ مریم کو رؤف کی افتادگی میں لذت ملی وہ اسکی بوالہوسی کے کارنامے سن چکی تھی وہ اپنے کو آسانی سے سپرد کر دینے والی ضعیف الاعصاب عورتوں میں سے نہ تھی۔ وہ اپنے دامن کو آلودگی سے بچائے ہوئے رؤف کی دل کی آگ کو بھڑکا رہی تھی اور اس سے لطف اٹھا رہی تھی۔ ڈیڑھ سال یوں ہی گذر گیا اور رؤف کے شوق کی آگ تیز ہوتی گئی لیکن مریم کے جلال حسن کے سامنے اسکی اتنی ہمت نہ پڑی کہ اپنی تمناؤں کو سیراب اور سرسبز کرنے کی کوشش کرے۔ ناچار انکو اپنے دل کے خون سے سینچتا رہا، وہ مریم کا بے عذر غلام ہو کر رہ گیا تھا اسکی گرویدگی کا چرچا دور دور پھیل گیا تھا۔ گھر والوں سے بھی حقیقت حال چھپی نہ رہ سکی۔ رابعہ اپنی سرنوشت کو کوس رہی تھی اس لئے کہ رؤف میں جو زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا تھا وہ اسکی برداشت سے باہر تھا۔ رؤف رات رات بھر مریم کے خیال میں تڑپا کرتا تھا۔ اب تک اس نے جو بے عنوانیاں کی تھیں وہ اپنے لئے کیں تھیں۔ رابعہ کے ساتھ اس کا برتاؤ بدستور قایم تھا۔ مگر اب اسکو رابعہ سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ اس نے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اپنے کو مریم کے حوالہ کر دیا۔

(۷)

زمانہ داغ بھی دیتا ہے اور زمانہ اسکو مٹا بھی دیتا ہے۔ ادریس کے دل کو جو داغ لگا تھا وہ کچھ اس کلیہ سے بری نہ تھا وہ اپنے "غم عشق" کو بھول چکا تھا اور اب "غم روزگار" میں سرگرم تھا اس نے بی۔ اے امتیاز کے ساتھ کیا تھا۔ اسکو بارہ بنکی میں اسکول کی ہیڈ ماسٹری ملگئی وہ اس کام کے لئے فطرتاً موزوں تھا۔ وہ اب بھی لڑکوں کو گھر پر پڑھاتا تھا اور اس طرح مہینے میں اسکی اوسط آمدنی دو سو روپیہ کی تھی، اسکا ذاتی خرچ بہت کم تھا، کم از کم دو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ماں کو بھیجدیا کرتا تھا، سکینہ کا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب دن پلٹ رہے ہیں اور اگرچہ وہ اپنی زندگی کا نصف حصہ طے کر چکی تھی اور زمانہ کے اس نئے دور کی راحتوں سے خود اسکو زیادہ عرصہ تک بہرہ اندوز ہونے کی امید نہ تھی مگر وہ اس

خیال سے خوش تھی کہ بیٹے کے اچھے دن آگئے ہیں اور اسکی زندگی آرام کی زندگی ہوگی۔ تین سال کے اندر ادریس کی زمینداری میں بھی کچھ اضافہ ہوگیا تھا گاؤں والے بھی ادریس کے گھر کو خوشحال دیکھکر مالک تقدیر کی درگاہ میں شکر ادا کر رہے تھے۔ ادریس اپنے حسن اخلاق سے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھا۔ کاشتکاروں کے ساتھ اسکو دلی ہمدردی تھی۔ اکثر خود تکلیف اٹھاکر وہ ان کے برے وقت میں کام آجایا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ گاؤں والے بھی اسکی خوشی اپنی خوشی اور اسکی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھتے تھے۔ مرد عورت چھوٹے بڑے سب اس کے گھر کے کام بلا اجرت کیا کرتے تھے۔

ادریس چھٹیوں میں برابر آیا کرتا تھا۔ ماں کے علاوہ اگر وہ کسی سے مل لینا ضروری سمجھتا تھا تو وہ ممتاز تھا اس کے دو اسباب تھے ایک تو ممتاز کے ساتھ اس کے بچپن کی یاد وابستہ تھی۔ دوسرے وہ ممتاز کی شخصیت کا قایل تھا اور اسکا دل سے احترام کرتا تھا۔ ممتاز کو بھی ادریس کے ساتھ روحانی خلوص تھا۔ وہ ادریس کو ایک "معصوم گمراہ" سمجھتا تھا جو اتفاق زمانہ سے مجبور ہوکر سکون و طمانینت کی راہ کھو بیٹھا ہے اور اب جس کو زندگی میں سوا دکھ کے کچھ نظر نہیں آتا۔

ادریس کو ملازمت کرتے ہوئے تقریباً ساڑھے تین سال ہوگئے تھے۔ اس درمیان میں اسکی صحت کچھ خراب ہونے لگی تھی۔ اب اپنے لئے وہ اسکی سخت ضرورت محسوس کرتا تھا کہ شہر اور تمدن کے ہنگاموں سے دور کسی گوشۂ عافیت میں جاکر سکون قلب حاصل کرے۔ اسکی بہترین صورت یہ تھی کہ اپنے گاؤں پر جاکر رہے اور جو کچھ نقد اسکے پاس موجود ہے اسکو کسی کاروبار میں لگاکر حلال کی روٹی کھائے۔ گذشتہ سال اس نے پورے سال بھر ایک متمول تعلقدار کے لڑکے کو مفت پڑھایا تھا۔ صاحبزادے کچھ ایسے خدا کے سنوارے ہوئے تھے کہ تین سال سے جان توڑ کوششیں کر رہے تھے اور کسی طرح انٹرنیس پاس نہیں ہوتے تھے، ادریس نے ان کے ساتھ بڑی جانفشانی کے ساتھ محنت کی اور اب کے سال وہ کامیاب ہوگئے۔ ان کے گھر والوں کو دریادلی سوجھی تو ادریس کو یکمشت دو ہزار روپئے دے ڈالے، ادریس کو ان روپیوں سے بڑی تقویت ہوگئی تھی اب وہ بلا کسی قسم کی دقت کے نوکری سے کنارہ کش ہوکر رام نگر میں گوشہ گیر ہوسکتا تھا۔ اسمیں اسکا ایک مقصد اور بھی تھا۔ ملک میں سیاسی شورشیں شروع ہوچکی تھیں ادریس میں بچپن سے بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کا مادہ موجود تھا اور رفتہ رفتہ یہ مادہ غالب ہو رہا تھا وہ جانتا تھا کہ اپنی تنہا ذات سے ساری دنیا کو فایدہ نہیں پہونچایا جاسکتا۔ اسلئے اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے جو کچھ انسان کرسکتا ہے ضرور کرنا چاہئے۔ ہندوستان کی آبادی کا زیادہ حصہ ان پڑھ اور بھوکے کسانوں پر مشتمل ہے۔ ادریس محسوس کر رہا تھا کہ سب سے پہلے انہیں کی حالت کو سدھارنے کی ضرورت ہے۔ جبتک یہ ترقی نہیں کرتے ملکی ترقی کا شور بادپیمائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اسلئے ادریس نے یہ سوچا تھا کہ رام نگر میں چندہ اکٹھا کرکے ایک مدرسہ کھولے گا اور پڑوس کے دیہاتوں میں اتنی تعلیم پھیلانے کی پوری کوشش کریگا جتنی کہ ان کی بہبودی کے لئے ضروری ہے۔

ادریس نے پیشتر ہی سے ممتاز اور سکینہ کو مطلع کردیا تھا۔ گرمی کی لمبی تعطیل میں وہ استعفا داخل کرکے چلا آیا آتے ہی ایک طرف تو وہ ممتاز کی دوکان میں پانچسو روپیہ لگاکر حصہ دار ہوگیا اور دوسری طرف مدرسہ قایم کرنے کے لئے زمینداروں سے

ان کی حیثیت کے مطابق چندہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس کارِ خیر میں ممتاز بھی اسکا شریک تھا۔ رام نگر اور یوسف پور کے درمیان ایک پر فضا آم کا باغ ہے اسی میں ایک بڑی جھونپڑی ڈالی گئی اور مدرسہ کا افتتاح ہو گیا۔ گانوں گانوں اس کا چرچا پھیلا۔ دور دور سے لڑکے آکر بھرتی ہونے لگے۔ ممتاز بھی ایک گھنٹہ روزان کو پڑھانے میں صرف کرتا تھا۔ اسکے بعد دوکان کی نگرانی میں لگ جاتا تھا۔ ادریس زیادہ تر مدرسہ کے کام میں مشغول رہتا تھا۔

(۸)

مریم نے جب پہلی بار یہ سنا تھا کہ ادریس جو "یاران وطن" کی "بے مہریوں" دلگیر ہو کر پردیس چلا گیا تھا۔ اب غربت کی ناسازگاری سے مجبور ہو کر پھر وطن آنے والا ہے۔ اسی وقت اس نے اپنی رگوں میں ایک خفیف ہیجان محسوس کر لیا تھا۔ وہ ادریس کی پوری سرگذشت جانتی تھی۔ اس کو ادریس سے غایبانہ انس پیدا ہو گیا تھا، وہ یہ بھی سن چکی تھی کہ ادریس کی صورت بڑی دلکش ہے اسلئے اسکو کم سے کم ایکبار دیکھنے کی مشتاق تھی۔

ادریس کو آئے ہوئے پانچ چھ مہینہ ہو گئے تھے اور مریم کو اسے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے کو چھپا کر ادریس کی جھلک دیکھ لینا چاہتی تھی۔ اسکی ابتک کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی لیکن کبھی کبھی مسبب الاسباب کی طرف سے ہماری مرادیں بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ مریم کے پرستاروں میں ایک پٹھان کا لڑکا بھی تھا۔ جس کا نام نور محمد تھا، اسکی عمر کوئی بیس بائیس برس کی تھی۔ وہ یوسف پور کا رہنے والا تھا اور رسول شاہ کے کھیت کھلیان کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ وہ مریم کی صورت کا پروانہ تھا مریم اس کی والہانہ نگاہوں کا اپنی پر خلوص مسکراہٹ سے جواب دے دیا کرتی تھی۔ نور محمد اس کو بھی غنیمت سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مریم سے اس سے زیادہ امید نہیں کیجا سکتی۔

ایک روز سوچتے سوچتے مریم نے سوچا کہ نور محمد کو اپنا ہمراز بنانا چاہیے اور اسکی شیفتگی سے کام لینا چاہیے۔ جب دوسرے دن شام کو نور محمد اپنا کام ختم کر کے اور مریم پر ایک حسرت بھری نظر ڈالکر گھر جانے لگا تو مریم نے کہا "نور بھر دمیں بھی تمہارے ساتھ ندی تک چلوں گی۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے" مریم کا لہجہ آج کچھ غیر معمولی سا تھا نور محمد رک گیا۔ مریم اس کے ساتھ ہولی۔ راستہ بھر وہ خاموش تھی اور نور محمد متحیر۔ دریا کے کنارے پہونچکر مریم نے نور محمد پر اپنی مسحور کر دینے والی نگاہیں جما کر کہا "نور تم مجھ کو چاہتے ہو؟" نور محمد کا دل دھڑکنے لگا۔ مریم نے اس سے پہلے اسکو کبھی اس طرح مخاطب نہیں کیا تھا۔ نور محمد اپنے رگ وپے میں ایک بے چینی محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے اسکی زبان بند ہو گئی، لیکن جب مریم نے اپنا سوال دھرایا تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اسکا جواب میری آنکھوں سے ملسکتا ہے" مریم نے کہا "دیکھو میں کسی کی محبت نہیں کر سکتی البتہ تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں۔ یقین مانو رؤف میاں سے کہیں زیادہ میں تمہاری قدر کرتی ہوں، میں تم سے کوئی ایسے وعدے نہیں کر سکتی جس کو پورا نہ کر سکوں اور بعد کو شرمندہ ہوں اور تم مایوس۔ میں تم کو ایک بار اپنا منھ چومنے کی اجازت دے سکتی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم بھی میرا ایک کام کسی طرح کر دو"

نور محمد کی دنیا چمک اٹھی اس نے بغیر آگا پیچھا سوچے ہوئے کہا "مریم اس دولت کو پانے کے لئے جو کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں"۔ مریم نے اپنا منہ نور محمد کے منہ کے قریب کرکے کہا "اچھا لو چوم لو"۔ نور محمد نے ہچکچاتے ہوئے اس کا بوسہ لے لیا۔ مریم نے اسکو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ اس لذت کو پوری طرح محسوس کرے۔ مریم نے فوراً کہا "میں نے ادریس میاں کی شہرت اس نواح میں بہت سنی ہے۔ میں ذرا ان کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ میرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ بہرحال اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم میرے لئے اس کی کوئی تدبیر نکالو"۔ دفعتہً نور محمد کا دل سرد ہونے لگا مگر وہ مریم سے معاملہ کر چکا تھا اور اب پلٹنا اس کا کام نہ تھا۔ اس کی صورت سے حسرت اور بیچارگی ٹپک رہی تھی۔ اس نے غیر معمولی ضبط سے کام لیا اور کہا "اچھا اب کی جمعرات کو بشن گڈھ کا میلہ ہے۔ اگر تم چار کوس آنے جانے کی تکلیف برداشت کرسکو تو میرے ساتھ چلو۔ وہاں تم جس کو دیکھنا چاہتی ہو دیکھ لوگی اور بھیڑ میں تم پر خاص طور پر کسی کی نظر بھی نہ پڑے گی"۔ مریم پر دھیرے دھیرے ادریس کو دیکھنے کا جن سوار ہوگیا تھا۔ وہ دھن والی عورت تھی اور اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہر طرح کی صعوبت گوارا کرسکتی تھی۔ اس نے تین دن تڑپ تڑپ کر گذارے۔

بشن گڈھ خلیل آباد اسٹیشن سے ڈیڑھ دو کوس دکھن ہے وہاں ہر سال ہندوؤں کا ایک میلہ ہوتا ہے۔ جمگھٹا اچھا خاصہ رہتا ہے جسمیں ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے ہیں۔ اس ملک میں ہندو مسلم اتحاد و مشارکت کی امید اگر ہوتی ہے تو وہ انہیں کو "مست جاہل مگر صاف باطن دہقانیوں کو دیکھکر ہوتی ہے ورنہ شہروں کو تو "شہریت کا دیوتا" اتنا غارت کرچکا ہے کہ بظاہر ہندوستان کی قومی اصلاح کے آثار نظر نہیں آتے۔

ممتاز اور ادریس دونوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ بشن گڈھ چل کر عام مجمع میں مدرسہ کے فوائد بیان کرکے چندہ کی تحریک کریں۔ نور محمد ان کے ارادے سے واقف تھا۔ جمعرات آئی تو وہ بڑے سویرے مریم کو لے کر بشن گڈھ پہونچا، جاڑے کا زمانہ تھا، ادریس اور ممتاز مندر سے کچھ دور ایک میدان میں تخت بچھائے ہوئے بیٹھے تھے، سامنے تقریر سننے والوں کی بھیڑ تھی۔ پوجا سے فارغ ہوکر لوگ سب سے پہلے اسی طرف آتے تھے۔ ادریس اور ممتاز اپنا سارا زور اس بات پر صرف کر رہے تھے کہ ان سادہ لوح دلوں کو تعلیم و تعلم کی ضرورت محسوس ہوجائے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش بنا سن رہا تھا۔ درمیان میں جس کو جو کچھ بطور چندہ کے دینا ہوتا وہ اپنی جگہ سے اٹھتا اور ممتاز کے آگے چپکے سے لے جاکر رکھ دیتا۔ ممتاز کے سامنے پیسوں اور دوسرے چھوٹے سکوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

مریم کو نور محمد نے قریب ہی ایک دوکان پر بٹھا دیا جہاں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ ادریس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مریم کے دل میں تمناؤں کا ایک خروش تھا۔ اس نے یوسفؑ کے حسن کی داستان پڑھی تھی۔ آج اسکو معلوم ہوا کہ حسن واقعی ایسی ہی چیز ہے جو زلیخا اور اسکی ہم جنسوں کو "پردۂ عصمت" سے باہر نکالکر چھوڑتی ہے۔ رؤف، ادریس کی گرد بھی نہ تھا۔ مریم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اگر رابعہ کے والدین نے دولت کے لالچ میں رؤف کو ادریس پر ترجیح دی تو خود رابعہ ادریس کے خیال کو اپنے دل سے کیسے نکال سکی۔ شام تک ادریس اسی تخت پر بیٹھا دھواں دھار تقریر کرتا رہا اور شام تک مریم اپنی جگہ سے دم بخود اس کو دیکھتی رہی اور

اور پھر بھی اسکا جی نہ بھرا۔ اس کو اپنی بھوک پیاس کا بھی ہوش نہ تھا۔ محبت کی ابتدا شاید یونہی ہوتی ہے کہ محبوب کو پہروں محویت کے ساتھ دیکھا کیجئے اور پھر جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو تو "حسرت و دیدار" کا وہی عالم ہو جو دیکھنے سے پہلے تھا۔ مریم گھر واپس آئی تو اسکے دل میں خلش نہیں بلکہ درد تھا جس سے اسکی رگ رگ بیکل تھی۔

مریم کو اس کے بعد کوئی تین ماہ تک ادریس کے دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ مگر اسکی محبت شعلہ زن ہوتی رہی۔ وہ چلی جا رہی تھی اور کسی طرح چل نہیں سکتی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ رؤف سے ملنا کم کر دیا اور آخر کار رؤف سے ایک دن صاف صاف کہہ دیا کہ "میں اب اپنے اور تمہارے دونوں کے لئے بہتر سمجھتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے سے ملنا بند کر دیں۔ تم اب اپنی اور رابعہ کی زندگی سدھارو۔ میں کسی سے سچا خلوص نہیں رکھ سکتی۔ رؤف مریم کا بھید نہیں جانتا تھا، اس نے لاکھ چاہا کہ مریم اس سے قطع نظر نہ کرے، لیکن اس کا کوئی زور نہ چل سکا۔ مریم نے فیصلہ کر دیا اور رؤف مایوس ہو کر چلا گیا۔ اس نے درمیان میں کئی بار مریم سے کوشش کی مگر مریم اس سے کتراتی رہی۔ ناچار رؤف کو رابعہ کے ساتھ از سر نو منہمک ہونا پڑا، اگرچہ مریم کا داغ اسکے دل سے کبھی نہیں گیا۔

(۹)

پھاگن کے دن تھے۔ ہولی گذر چکی تھی۔ ہوا اپنا زور بھر رہی تھی گویا گذشتہ موسم کی جو افسردگی اور مردنی بطور یادگار باقی رہ گئی ہے اسکو دور کرنے کے لئے اپنی تمام قوت صرف کر رہی ہے۔ بسنت رت کا چپہ چپہ سے اعلان ہو رہا تھا۔ سبزہ زار اور چراگاہ ابھی سوکھے پڑے تھے۔ جھاڑیاں بے جان اور برہنہ تھیں لیکن بالیدگی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ڈھاک میں نئی کونپلیں نکل رہی تھیں۔ اور وہ زمانہ آگیا تھا کہ پرپیتا اپنی عروسی خلعت سے آراستہ ہو جائے۔ فضا صداؤں سے معمور تھی۔ چرند پرند نے اپنی رام کہانیاں چھیڑ دی تھیں۔

ادریس اور ممتاز دونوں اپنے مشترکہ کاروبار میں روز افزوں ترقی کر رہے تھے۔ دولت و اقبال کی دیوی جسکی دوستی اور دشمنی دونوں ناقابل اعتماد ہیں ان پر مسکرا رہی تھی۔ مدرسہ چل رہا تھا اور دوکان تو ممتاز کے حسن انتظام سے اس طرح چمک اٹھی تھی کہ اس سے جو منافع ہوتا تھا اس کا آدھا غلے اور اینٹوں کی تجارت میں لگانا پڑا۔ ممتاز اور ادریس زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی خرید رہے تھے، مگر دونوں کی معاشرت ویسی ہی سادہ اور نمایش سے عاری تھی۔ ادریس میں شہری زندگی کی صرف ایک برائی تھی۔ وہ چائے پیتا تھا۔ ممتاز کو بھی چند مہینوں میں یہ لت لگ گئی۔

تیواری پور میں ایک آنہ حصہ ایک بنئے کا تھا جسمیں کچھ آم مہوے اور کٹھل کے درخت بھی تھے باقی رؤف کا حصہ تھا۔ بنیا رؤف کا بری طرح مقروض تھا۔ رؤف نے اسکو ستانا شروع کیا۔ غرض یہ تھی کہ بنیا کسی طرح تنگ آکر وہ ایک آنہ حصہ بھی اس کے حوالہ کر دے۔ مگر بنیا بھی اپنی ہٹ کا آدمی تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ بغیر اس ایک آنہ کو جدا کئے چھٹکارا نہیں ہوتا تو اس نے قسم کھالی کہ رؤف کے ہاتھ کبھی نہ بیچوں گا۔ اس لئے وہ ادریس کے پاس آیا اور اس سے معاملہ کیا۔ سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ صرف

کھیتوں اور درختوں کو ایک نظر دیکھ لینا رہ گیا تھا۔ بنیئے کے جانے کے بعد ممتاز اور ادریس نے صلاح کی کہ صبح طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر چلیں اور سب کچھ دیکھ بھال کر دس بجے تک واپس آجائیں۔

رات کا سماں دلکش تھا۔ دن بھر کی تپش کے بعد اسوقت ہوا میں ایک مسکن خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن ممتاز اور ادریس جاگ رہے تھے۔ ممتاز کو سویرے سو جانے کی عادت تھی۔ ادریس پر کبھی کبھی بیخوابی کا دورا پڑ جاتا تھا۔ ایسی حالت میں ممتاز اسی کے مکان پر سویا کرتا تھا اور شب بیداری میں اسکا ساتھ دیا کرتا تھا۔ ساری رات مباحثوں میں کٹ جاتی۔

آج شام کے وقت رام نگر میں ایک ہلچل سی مچی تھی۔ ایک گوالے کا لڑکا جو تمام دن پرمیتا میں اپنے مواشی چرا تا رہا شام کو گھر لوٹا تو اسکو تیز بخار چڑھا ہوا تھا اور سرسامی حالت تھی۔ ڈاکٹروں سے اگر رائے لی جاتی تو وہ فوراً "ضربۃ الشمس" یا "تپ محرقہ" بتا دیتے، مگر دہقانیوں کا نظریہ ہی کچھ اور رہتا ہے۔ رام نگر والوں کو یقین تھا کہ لڑکے کو آسیب ہو گیا ہے اور یہ پرمیتا کے کسی بھوت کا کام ہے جسمیں کارفرما تم ہے۔ ادریس کا دماغ بھی آج اسی عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ممتاز سے حجت ہو رہی تھی۔ ممتاز ادریس کی طرح کوئی فلسفی نہ تھا۔ وہ جو کہتا تھا ادعائی ہوتا تھا۔ اگر وہ ادریس کو قائل نہ کر سکتا تھا تو خود بھی کبھی قایل نہ ہوتا تھا اور بحث زیادہ تر دونوں کے سکوت پر ختم ہوتی تھی۔ آج ادریس اپنی تمام منطق زندگی کو اک بلا ثابت کرنے میں صرف کر رہا تھا۔ ممتاز اس سے متفق نہ تھا۔ آخر کار ادریس نے کہا "کم از کم ہمارے مشاہدات اور تجربات یہی بتاتے ہیں کہ قدم قدم پر ہم کو غارت کرنے کے لئے قوتیں سلط ہیں۔ اس گوالے کے لڑکے کو دیکھو اس نے خود تو اپنے کو بیمار ڈالا نہیں اور نہ اس معصوم کے کسی گناہ کا پتہ چلتا ہے۔ پھر یہ مصیبت کیوں اس پر نازل کی گئی۔ یہ کسی ایسی ہستی کا کام ہے جو ہمارے تمہارے قابو سے باہر ہے اور جو دراصل گناہ و ثواب کا امتیاز نہیں جانتی"۔

ممتاز نے جواب دیا "اگر تمہارا کہنا مان بھی لیا جائے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم کو بلاؤں کا مقابلہ کرنا ہے۔ زندگی تو اس سے بلا ثابت نہیں ہوتی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ زندگی محض جہد للبقا نہیں بلکہ جہد للارتقا ہے اور اس کے لئے حالات و موانع لازم ہیں ورنہ ارتقا کے کوئی معنے نہیں ہوتے"۔ اسی پر دونو چپ ہو گئے تھے اور اپنی اپنی جگہ کچھ سوچنے لگے تھے۔

تین بجے دونوں نے ملکر چائے تیار کی اور ایک گھنٹہ بعد مکان سے چل کھڑے ہوئے۔ پرمیتا کے قریب پہونچکر ممتاز نے کہا "دیکھو ادریس سماں کتنا سہانا ہے، سعدی نے ایسی ہی وقت کے لئے کہا ہے:-

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار   خوش بود دامن صحرا و تماشائے بہار

ادریس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "جس کا جو جی چاہے کہہ لے مگر حقیقت یہ ہے کہ "در دست دگر است خزان و بہار ما"۔ ایسی حالت میں ہماری خزاں و بہار ہی کیا۔ چاہے آپ بہار میں غزلخوانی کیجئے اور خزاں کا رونا روئیے یا خزاں سے زبردستی لذتیں حاصل کیجئے اور بہار پر اپنا دل خون کیجئے میں دونوں کو ایکساں سمجھتا ہوں"۔ ممتاز پھر چپ ہو گیا۔

بیچ جنگل میں پہونچکر اک ادریس نے پھر سکوت توڑی۔ نہ جانے کیوں اس نے ممتاز سے پوچھا "کیوں ممتاز!

"رابعہ کے بارے میں اب تمہارا کیا خیال ہے؟۔ کیا اب بھی اس کو اسی طرح چاہتے ہو؟" ممتاز نے جواب دیا "میں بھی تم سے یہی سوال کر سکتا ہوں، لیکن مجھے چونکہ تمہارے جذبات معلوم ہیں اس لئے خوامخواہ تم کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ رابعہ اب تمہارے لئے کچھ نہیں رہی........"

ادریس نے بات کاٹ کر کہا "رابعہ ہی نہیں بلکہ دنیا کی کوئی عورت کچھ نہیں رہی"

"خیر یونہی سہی" ممتاز نے رفع تکرار کے لئے تسلیم کر لیا اور اپنی محرومیوں کی طرف رجوع کیا "میرے لئے رابعہ وہی ہے جو پہلے تھی۔ مجھے اس سے امیدیں کبھی نہ تھیں اس لئے مایوسی بھی نہیں ہوئی۔ پہلے وہ تمہاری ہونے والی تھی اب رؤف کی ہو گئی۔ مجھے کچھ تو تمہارے خیال سے اور کچھ خود اس کے خیال سے تکلیف تو ضرور ہوئی کیونکہ رؤف کو میں برخلاف رابعہ کے والدین کے رابعہ کے لئے بدترین شوہر ہمیشہ سے سمجھتا تھا۔ لیکن جہاں تک میری اپنی ذات متعلق ہے رابعہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، یا یوں سمجھو کہ میری محبت اپنی اصلی حالت پر قائم ہے۔ محبت محبوب سے شروع ضرور ہوتی ہے مگر اسکی ہر تبدیلی کے ساتھ بدلتی نہیں رہتی۔ میں محبت کو ارتقاء شخصیت کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ کسی موہنی صورت کا دیوانہ ہونا در اصل اپنے دل کا دیوانہ ہونا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر رابعہ کو لوگ میرے ساتھ بیاہنا چاہتے تو میں انکار کر دیتا۔ میں سب کچھ تج کر اس سے شادی کرتا اور ممکن ہے اس وقت صورت حال کچھ اور ہوتی۔ لیکن بحالات موجودہ جبکہ مجھ کو رابعہ کے ساتھ کوظاہری لگاؤ نہیں ہے میں اپنے کو یوں تسلی دیتا ہوں:۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے　　روانی روش و مستی ادا کہئے!!

اور ادریس تم یقین مانو یہ تسلی جھوٹی تسلی نہیں ہے"

ادریس آج ممتاز کی زبان سے ہیگل اور گیٹے کا فلسفۂ محبت سن رہا تھا جس کی دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن چونکہ اس قسم کی باتیں کبھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اتریں اس لئے حسب عادت چڑھ کر بولا "میں بشریت کے دائرہ سے باہر جانا نہیں چاہتا۔ تم نے جو کچھ تصوف بکا ہے وہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو جان کھو کر قاتل کو خوں بہا دیتے ہیں اور زبان کٹتے پر خنجر کو مرحبا کہتے ہیں۔ اور تمہیں کہو ایسے لوگ ہیں کتنے؟"

ممتاز نے یہ کہہ کر بحث کو چھوڑ دیا "تم نے میرے متعلق پوچھا تھا۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ساری خدائی سے مجھے کیا کام"

جنگل کی مسافت طے ہو چکی تھی مشرقی افق سورج کی نرم کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ ہر طرف ایک دھندلی روشنی پھیل رہی تھی سامنے دریا تھا جس کی ہلکی ہلکی لہریں سورج کی سنہری کرنوں کو جذب کر رہی تھیں۔ اس منظر سے ادریس اور ممتاز دونوں اپنے اندر ایک فرحت محسوس کرنے لگے۔ اتنے میں دونوں نے کچھ دیکھا، ادریس کو تو یہ بھی ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کچھ ایسا مبہوت ہو گیا تھا۔ ممتاز نے ادریس کے استغراق کو محسوس کر لیا۔

مریم ندی کے کنارے بے حس و حرکت ایک بت کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تبسّم تھا اور وہ لہروں کی سیر میں بے خود تھی۔ ادریس کو یونانیوں کی آرزو رایاد آگئی اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا آج وہ اس دور معصومیت کے یونان میں سانس لے رہا ہے جبکہ نوریوں اور خاکیوں میں خلاملا تھا یا الف لیلہ کا زمانہ سیکڑوں گردشوں کے بعد پھر آگیا ہے اور وہ کسی پری بانو کے سامنے پہونچ گیا ہے۔

ادریس کی رفتار سست ہو گئی تھی، ممتاز بھی قدم سے قدم ملائے چل رہا تھا۔ جب دونوں کچھ دور نکل گئے تو ادریس نے مڑ کر مریم کو ایک نظر بھر دیکھا۔ اس نے بہت چاہا کہ خاموش رہے لیکن آخر کار نہ رہا گیا اور اس نے ممتاز سے پوچھا "ممتاز تم جانتے ہو یہ کون ہے؟ اسکو دیکھ کر مجھے بیساختہ یہ شعر یاد آرہا ہے:۔

تو غنچۂ سحر و من چراغ صبحدمم   تو خندہ برلب و من جان در آستیں دارم

ممتاز کا دل نہ جانے کس خطرہ کے احساس سے دھڑکنے لگا، لیکن اس نے اپنی حالت کو چھپا کر بے پروائی کیساتھ کہا "مریم ہی ہے" اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ادریس مریم کے نام سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔

جس کام کو انجام دینے کے لئے دونوں تیواری پور گئے تھے وہ پورا ہونے کو تو ہو گیا مگر ادریس کے بشرہ سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا دل کہیں اور ہے۔ ممتاز اگر نہ ہوتا تو شاید تیواری پور کا کام بھی رہ جاتا۔

(باقی آئندہ)

مجنوں گورکھپوری

ایک شاعر کا انجام

مصنفہ نیاز فتحپوری

اڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن و عشق، جسمیں تخئیل کی بلندی، زور تحریر، اسلوب بیان اور ندرت انشار کے ایسے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہیں جو ساحری کی حد تک پہونچتے ہیں۔ جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف میں ظاہر کئے گئے ہیں اسکا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ یہ افسانہ جناب نیاز نے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے قیمت مع محصولڈاک ۱۲ار "منیجر نگار۔ لکھنؤ"

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(بہ سلسلہ سابق)

خواب کا اسلوب و ماہیت اور امام غزالی کا نظریہ

المظنون مطبوعہ قاہرہ (ورق ۵ طبع سنہ ۱۳۰۳) کے حوالہ سے میکڈونلڈ نے امام غزالی کے وہ فلسفیانہ مباحث پیش کئے ہین جن مین انھون نے خواب کی حقیقت اور اسکے طریق حدوث کے متعلق عقلی اور نقلی پہلو سے روشنی ڈالی ہے۔ امام غزالی نے صحیح حدیث قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطان لا یتخیل بی (اسکے راوی حضرت انس ہین دوسری مین جو حضرت ابی ہریرہؓ کی روایت سے ہے ولا یتمثل الشیطان بی۔ ہے) کی جو فلسفیانہ تاویل کی ہے وہ ملک کے ان علم برداران جدل و تنقید کے لئے باعث عبرت ہے، جو اپنے ولولہ قدامت پسندی اور انہاک عقاید عامیانہ مین صحیح استنباط نتایج سے محروم رہجاتے ہین یہ مانا کہ وطن کے بعض متکلمین کے بعض مجتہدانہ خیالات اور افکار قابل رد ہین، مثلاً اثبات نماز سہ گانہ اور انکار معاد وغیرہ مجھے بھی اس قسم کی فکر و احساس سے سخت اختلاف ہے، لیکن یہ کیا غضب ہے کہ معائب احساس کے مطالعہ سے انسان اپنی حریت فکری اس حد تک کھو بیٹھے کہ اسے محاسن افکار نظر ہی نہین آئین علمائے ملت، اور ادبائے قوم کا تو فرض تھا کہ وہ دلایل اور براہین سے ان مسائل پر ناقدانہ روشنی ڈالتے، لیکن اسکے بدل انھون نے مجالس خاص و عام مین سب و شتم کرکے اپنے اطمینان قلب کا سامان پیدا کرنا چاہا، اہل بینش اور ماہرین خصایص نفسی جانتے ہین کہ یہ اظہار عجز و ناتوانی کی ایک طفلانہ ہنگامہ آرائی ہے۔

امام غزالی فرماتے ہین، جو شخص رؤیا (خواب) کی حقیقی ماہیت نہین جانتا، وہ اقسام رویا کے مختلف حقایق سے بھی نابلد ہے، اور جو شخص آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیا کے رؤیا کی حقیقت نہین جانتا وہ خدا تعالی کی رویت خواب سے بھی ناواقف رہتا ہے، اسلئے ایک عامی انسان یہ تصور کرتا ہے کہ جو شخص نبی صلعم کو خواب مین دیکھتا ہے، وہ گویا خاص آپکے جسد مبارک کو دیکھتا ہے، لیکن جس طرح نفس مین ایک پرتو خیال آتا ہے، اور وہ قوت مصورہ کی بدولت لفظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اسی طرح ہر اثر نفس کے لئے قوت مصورہ ایک خاص شکل تجویز کرتی ہے کوئی شخص آن حضرت صلعم کے خاص جسد مبارک کو کیونکر دیکھ سکتا ہے، جب آپکا جسم مبارک مدینہ منورہ مین سپرد خاک ہے اور اسے چھوڑکر اس مقام مین نہین جاتا جہان ایک آدمی نے خواب مین دیکھا، اور اگر ہم لوگ یہ مان بھی لین کہ ہان یہ خاص اپکا جسد مبارک ہی رہتا ہے، تب بھی یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ ایک ہی رات مین ہزارون آدمی آن حضرت کو مختلف

صورتوں مین دیکھتے ہین عقل سلیم کہتی ہے، کہ ایک ہی شخص کو لوگ بیک وقت دو مختلف صورتون مین نہین دیکھ سکتے لیکن غالباً وہ کہہ سکتا ہے، جیسے اس نے خواب مین دیکھا، وہ آن حضرت کی مثال تھی، آپکی شخصیت نہین تھی، تب یہ بحث پیدا ہوگی کہ یہ یا تو آپکی شخصیت کی مثال ہوگی یا آپکی حقیقی روح مقدسہ کی جو شکل وصورت کے ملوثات سے پاک ہے، اگر یہ مانا جائے کہ یہ آپکی مثال شخصیت ہوتی ہے، جو مجموعۂ استخوان و لحم ہے، تو ہملوگون کو اسکی کیا ضرورت آپکا جسد یا تشخص بذاتہ مطمح تصور و محسوسات ہے، تب اس سے یہ بات نکلے گی کہ جس شخص نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپکی وفات کے بعد خواب مین دیکھا، اس نے نبی صلعم کو نہین دیکھا، بلکہ اس جسد (مطہر) کو دیکھا جو آپکے اشارہ اور ارادہ سے حس وحرکت کیا کرتا تھا، تب وہ شخص جو آپکی "مثال شخصیت" دیکھتا ہے، کیونکر کہہ سکتا ہے کہ مینے آن حضرت کو خواب مین دیکھا، حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ کی "مثال" ہوتی ہے، جو مہبط وحی (الہیہ) ہے اور اسی کو انسان آپکی روح یا جوہر ذات، یا آپکی شخصیت (جسد مطہر) خواب مین نظر نہین آتی، بلکہ فی الحقیقت یہ آپکی مثال ہوتی ہے، اسوقت یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ تب آپکی حدیث کا کیا مطلب ہے! آپ نے فرمایا جسنے مجھے خواب مین دیکھا درحقیقت اس نے مجھی کو دیکھا کیونکہ شیطان خود کو میرے مثل نہین بنا سکتا، (امام غزالی رح نے وہ حدیث لکھی تھی جسے مینے اوپر نقل کیا، میکڈونلڈ نے اسی کا ترجمہ کیا ہے) اس کا عقیدہ یہ ہے، کہ خواب دیکھنے والا ایک مثال دیکھتا ہے، جو اسکے اور نبی صلعم کے درمیان مین واسطہ پیدا کرتی ہے اور اسے حق وصداقت کی تعلیم دیتی ہے، جس طرح جوہر نبوت یعنی آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ جو آپکی وفات حقیقی کے بعد باقی ہے، اور وہ رنگ، شکل اور صورت سے منزہ ہے، اور پھر بھی لوگون کو اس سے محض ایک حقیقی مثال کے ذریعہ، جس مین رنگ بھی رہتا ہے اور شکل وصورت بھی رہتی ہے، (آپکی تلقین و مواعظت کا) علم حاصل ہوتا ہے، حالانکہ جوہر نبوت اس (رنگ شکل وصورت) سے پاک ہے، ٹھیک اسی طرح ذات الٰہی بھی شکل وصورت کے رسوم و قیود کی حامل نہین، لیکن ایک مثال محسوسہ کی وساطت سے مخلوقات کو اسکا علم ہوتا ہے، یہ مثال محسوسہ ایک مہبط انوار ہوتی ہے، یا حسن وجمال کا کوئی دوسرا مرقع جسے اس ذات الٰہی کے پرتو حسن سے تعبیر کرسکتے ہین جس مین نہ رنگ کی آرائش ہے، نہ شکل وصورت کی قید و بند، وہ مثال حقیقی ہوتی ہے، اور حصول علم و معرفت کے درمیان مین واسطہ پیدا کرتی ہے، اسلیے جو شخص یہ کہتا ہے کہ مینے اللہ جل شانہ، کو خواب مین دیکھا تو اسکا یہ مطلب نہین ہوتا کہ اس نے ذات باری تعالی کو دیکھا جس طرح ایک شخص جو یہ کہتا ہے، کہ "اسنے نبی صلعم کو خواب مین دیکھا، تو اس سے ذات اور روح یا شخصیت نبوت مراد نہین لیجا سکتی، بلکہ محض رویت مثال مقصود ہوتی ہے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر صلعم کا مثل تو ممکن ہے، لیکن خدا کا مثل تو دراح امکان ہے، تو یہان "مثل" (Like) اور "مثال" (Image)

کے مابہ الامتیاز کے سمجھنے مین غلطی ہوگی۔ مثال اور مثل مین فرق ہے ۔ مثل کے لئے ضروری ہے کہ تمام صفات مین مساوات ثابت ہو ، اور مثال مین یہ شرط نہین رہتی، "قوت ادراک" ایک ایسی چیز ہے کہ اسکا مثل نہین پھر بھی ہملوگ اسکے لئے آفتاب کی مثال دیسکتے ہین، کیونکہ دونو ایک حیثیت سے متشابہ ہین، آپکی وساطت سے ہملوگ محسوسات ظاہرہ کا علم حاصل کرتے ہین، اور قوت ادراک کی بدولت محسوسات باطنہ کا، مثال کے لئے صرف یہی ایک وجہ تشبیہ کافی ہے، اس سے بھی واضح مثال یون سمجھنا چاہئے، کہ ایک بادشاہ کو کوئی شخص آفتاب کی شکل مین دیکھے اور وزیر کو چاند کی شکل مین، بادشاہ اور آفتاب، چاند اور وزیر شکل وخیال کے اعتبار سے مساوی نہین ہین لیکن وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ تمام عالم پر حکمرانی کرتا ہے اور تمام چیزین اسکے زیر اثر ہین یہی حیثیت آفتاب کی ہے، اور جسطرح ایک وزیر، بادشاہ اور اسکی رعایا کے درمیان مین صحیح احکام کے اصدار کے لئے واسطہ رہتا ہے، اسی طرح چاند بھی، آفتاب اور کرۂ ارضی کے درمیان مین، روشنی پہونچانے مین واسطہ رہتا ہے، یہ مثالین ہین "مثل" نہین۔

نبی صلعم کے حضور مین لوگون نے بعض ایسے خواب کا تذکرہ کیا، جس مین دودہ اور رسی کا ذکر تھا[1] آپ نے تعبیر بتائی کہ دودہ سے اسلام مراد ہے، جس طرح دودھ ظاہری زندگی کی غذا ہے، اسی طرح اسلام باطنی زندگی کی، رسی سے قرآن مجید مراد ہے، جس سے ہملوگ سلامتی مین رہتے ہین، اسی طرح خدا کا بھی "مساوی" نہین لیکن اسکی "مثالین" ہین، جو اسکے صفات کے ساتھ ذہنی تشابہ رکھتی ہین، ہملوگ کسی طالب تحقیق کو تعلیم دیتے ہین کہ خدا کس طرح پیدا کرتا ہے، کس طرح ارادہ کرتا ہے؟ ان تمام مسائل کے لئے ہملوگ، ایک انسان کی مثال پیش نظر رکھتے ہین، اگر انسان (ذات الٰہی کے ادراک مین) اپنی ہی صفت سے ہوگا، تو وہ خدا کے متعلق بھی مثال نہین سمجھ سکتا، خدا کے متعلق ایک مثال ممکن ہے، اور اسکا مثل ناممکن، چونکہ مثال سے صرف تصریح و وضاحت ہوتی ہے، لیکن "مثل" مشابہ ہوا کرتا ہے۔

لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ تمنے ذکر کیا، اس سے یہ نتیجہ تو نہین نکلتا ہے کہ خدا کو دیکھ سکتے ہین بلکہ ان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب مین نظر آنے کا انکار ثابت ہوتا ہے، کیونکہ کسی شے کی مثال کا دیکھنا اس شے کی ذات کا مشاہدہ کرنا نہین ہے، تب آن حضرت صلعم نے کیونکر یہ فرمایا کہ "جس نے مجھے خواب مین دیکھا، اُسنے

[1] بخاری شریف مین حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے ایک حدیث مروی ہے، جس مین آنحضرت کا خواب مین دودھ دیکھنا مذکور ہے، لیکن آپنے اسکی تعبیر "علم" بتائی ہے فما اولت ذلک یا رسول اللہ قال العلم۔ اسی طرح آپکے سامنے ایک شخص نے اپنا خواب بیان کیا جس مین شہد، رسی، اور گھی کا تذکرہ تھا، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسکی تعبیر بتائی، اور رسی کو کہا کہ اس سے وہ طریقہ مراد ہے جسپر آنحضرت لوگون کو چلارہے ہین، واما السبب الواصل من السماء الی الارض فالحق الذی انت علیہ۔

مجھی کو دیکھا" (من رانی فی المنام فقد رانی) تو گویا یہ ایک ناجائز تعبیر مجازی ہے، اس مفہوم کی کہ "گویا اسنے مجھی کو دیکھا"، تب اسکا جواب یہ ہے کہ ٹھیک یہی صورت تو اسوقت بھی پیدا ہوتی ہے، جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ "مینے خواب مین خدا کو دیکھا" اسکا یہ مطلب نہین ہوتا کہ اسنے ذات باری تعالی کو دیکھا، کیونکہ یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ ذات باری تعالی کو نہین دیکھ سکتے، بلکہ ذات باری تعالی، یا ذات نبوت کی ایک "مثال" دیکھ سکتے ہین، اس قسم کے خواب سے انکار نہین ہو سکتا، حتی کہ وہ شخص جسنے اس قسم کے خواب نہین دیکھے اسے بھی متواتر احادیث کے ذریعہ ماننا پڑیگا، بعض اوقات یہ مثال صادقہ ہوتی ہے، اور بعض اوقات کاذبہ[۵۱] جب صادقہ ہے، تو اسکا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالی اس رویت "مثال" کو خواب دیکھنے والے اور نبی صلعم کے درمیان مین ایک واسطہ بنا دیتا ہے، قدرت آلہیہ اسپر حاوی ہے کہ مخلوقات اور اسکے حصول صداقت کے درمیان مین وہ ایک ایسا واسطہ پیدا کر دے"۔

امام غزالی کا خواب میکڈونلڈ نے امام غزالی کے متعلق بھی دو خواب کا تذکرہ کیا ہے، جن مین ایک خود امام غزالی کے الفاظ مین ہے، امام موصوف فرماتے ہین۔

پہلے مین اولیاء اللہ کے رموز بیخودی کا منکر تھا، اور مجھے مبتدی طریقت کے مدارج ترقی سے بھی انکار تھا، یہانتک کہ مجھے اپنے شیخ یوسف نساج کا فیض صحبت میسر آیا، شیخ موصوف نے میرے قلب کی جلا کرنی شروع کی، یہانتک کہ اللہ تعالی نے مفاوضات کشف و الہام سے مجھے نوازا، مینے خواب مین اللہ تعالی کو دیکھا اور اسنے کہا "الی ابو حامد؟" مینے کہا کیا شیطان مجھ سے کلام کر رہا ہے، اسنے کہا "نہین بلکہ مین ہون تمہارا خدا کیا مین تمہارا خدا نہین ہون (اشارہ ہے قرآن کی آیت کیطرف) تب اسنے کہا الی ابو حامد تم اپنے رسمی ضوابط ترک کرو، اور ان ارباب ذوق کا جلیس و ندیم اختیار کرو، جو زمین پر میری عزت کا مستقر ہین، یہ لوگ وہ ہین جنھون نے دو نو جہان کو میری محبت کے بدل بیچ ڈالا (عرفی نے اپنی ایک رباعی مین یہی نظریہ پیش کیا ہے ع

گوید کہ دل و دین فروشید بدرد) تب مینے عرض کیا یا اللہ تیری قدرت کی قسم، مین تجھ سے التماس کرتا ہون کہ تو مجھے انکے متعلق اچھے خیال کا ذوق عطا کر"، اسنے کہا مین قبول کرتا ہون، تیرا ان سے جدا رہنا، اس بنا پر تھا کہ تو اس عالم فانی کی محبت مین سرشار تھا، اسلئے تو خود، اپنے ارادہ سے اس بند محبت سے آزاد ہوجا تاکہ موت کے

---

[۵۱] امام غزالی نے جو متکلمانہ مباحث کئے ہین وہ مینے میکڈونلڈ کے انگریزی ترجمہ سے لئے ہین۔ امام غزالی کی بحث ہر چند فلسفیانہ ہے، لیکن یہان انھون نے حدیث کی تائید مین جو بحثین کی ہین، وہ تشفی بخش معلوم نہین ہوتین خصوصًا، جب "مثال" الٰہی یا مثال نبوت کاذبہ بھی ہو سکتی ہے تو آخر حدیث کے لفظ فان الشیطان لا یتمثل بی کی کیا توجیہ ہو سکتی۔

وقت تجھے زبردستی اس سے جدا کرنیکی ضرورت نہ ہو، مین تجھ پر نزول انوار کی بارش کرتا ہون، اس لئے اسے اوڑھ اوڑھ مستفیض ہو، تب مین بڑی خوشی مین بیدار ہوا، اور اپنے شیخ یوسف نساج کے پاس گیا، اور ان سے اس خواب کا تذکرہ کیا، وہ مسکرا کر بولے، اے ابو حامد! یہ تغیر پذیر حالات و مقامات ہملوگون کے نزدیک کوئی وقعت نہین رکھتے، اگر تم میری صحبت مین رہو، تو تمھاری نظر باطن منکشف ہو جاویگی، اور تم عرش اور اسکے ماحول کا مشاہدہ کروگے، تمھارے ذوق طلب کی تشنہ کامی ایک صبر آزما شورید گی تم مین متہیج رہیگی اور تم اسوقت وہ چیزین مشاہدہ کروگے، جنکی حد کشش تک احساس نظر کی رسائی نہین، اور تم اپنی کثافت فطریہ سے ایسے پاک و صاف ہو جاؤگے، کہ پھر تمھارا گذر وہان ہوگا، جو تمھاری ادراک کے حدود سے متجاوز ہے، تم موسی کی طرح اللہ جل شانہ کا کلام سنوگے۔

امریکن اورینٹل سوسائٹی کے جریدہ جلد ۲۰ مین میکڈونلڈ نے ابو بکر الشاشی کی مفصلہ ذیل روایت نقل کی ہے، ابو بکر نے امام غزالی کی وفات کے صرف دو برس کے بعد انتقال کیا، وہ کہتے ہین دہ ہمارے عہد مین ایک شخص تھا جو امام غزالی سے نفرت رکھتا تھا، اور انھین برا کہتا، اسنے آن حضرت صلعم کو خواب مین دیکھا، حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ آپکے پہلو مین تھے، امام غزالی آپکے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے، یارسول اللہ یہ شخص میرے خلاف بولا کرتا ہے، اسپر آن حضرت نے فرمایا کوڑا لاؤ۔ اور امام غزالی کو برا کہنے کی پاداش مین اس شخص کو کوڑے لگائے گئے، تب وہ آدمی خواب سے بیدار ہوا، اور اسکی پشت پر کوڑے کی علامت پائی تھی، وہ نالہ و بکا کرتا اور یہ واقعہ کہتا،

ابن خلکان کا خواب

ابن خلکان ایک دینی عالم، ایک فقیہ، ایک نحوی اور ایک ادیب بھی تھے، انھون نے ۱۲۸۲ھ مین وفات پائی، اپنی کتاب، وفیات الاعیان مین انھون نے اپنے ایک خواب کا تذکرہ کیا ہے، مصنف کے ہات کا لکھا ہوا، وفیات الاعیان کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم مین موجود ہے، وہ لکھتے ہین،

"ایک مرتبہ مینے المبرد کو خواب مین دیکھا اور اسکے ساتھ ایک نہایت تعجب انگیز معاملہ ہوا، اسلئے مین اسے کہنا چاہتا ہون، ۱۲۳۶ھ مین مین اسکندریہ کے اندر تھا، اور وہان پانچ مہینہ تک مقیم رہا اسوقت المبرد کی کتاب "کامل" اور "عقد" مصنفہ ابن عبد ربہ بھی میرے پاس تھین اور مین انکا مطالعہ کر رہا تھا"۔

اسکے بعد علامہ موصوف نے صاحب "عقد" اور المبرد کی دوسری کتاب "روضتہ" کے متضاد بیان کا تذکرہ کیا ہے، جو اسکی دلچسپی کا مرکزی نقطہ تھا، اور اسکے بعد کہتے ہین۔

جب مینے ان متضاد بیانات کا مطالعہ کیا، اسکی چند راتین گزرنے کے بعد مینے خواب مین دیکھا کہ جیسے

مین حلب کے اندر قاضی بہاؤالدین معروف بہ شداد کے مدرسہ عالیہ مین ہون، جہان مین طالب العلمی کے زمانہ مین رہ چکا تھا، اور دیکھا کہ مین جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھ رہا ہون، جب مین اپنی نماز ادا کر چکا تو جانے کے لئے اوٹھا، لیکن مینے ایک شخص کو گوشہ مین کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا، حاضرین مین سے ایک شخص نے مجھ سے کہا یہ المبرد ہے، اسلئے مین اسکے نزدیک گیا، اور اسکی فراغت نماز تک مین منتظر رہا وہ نماز سے فارغ ہو گیا تو مینے اسے السلام علیک کیا اور کہا مین آجکل آپکی کتاب "کامل" کا مطالعہ کر رہا ہون، وہ بولا کیا تم نے میری کتاب روضہ دیکھی ہے؟ مینے کہا "نہین" چونکہ مینے اسے اسوقت تک نہین دیکھا تھا، تب اسنے کہا آؤ مین تمھین دکھاؤن، اسلئے مین اسکے ساتھ ہو لیا، اور ہم دو نو اسکے مکان پر آئے اور اندر داخل ہوئے، مینے بہت سی کتابین دیکھین، وہ ان کتابون کے سامنے بیٹھ گیا، اور اپنی کتاب "روضہ" تلاش کرنے لگا، مین اسکے سامنے بیٹھا رہا تب اسنے ایک جلد اوٹھائی، اور مجھے دی، مینے اسے کھولا، اور اپنے زانو پر چھوڑ دیا، اسکے بعد کہا، "یہان آپ پر لوگون نے کچھ اعتراض کیا ہے، اسنے دریافت کیا وہ کونسا اعتراض ہے، مینے کہا، آپنے ابو نواس کے فلان فلان اشعار پر تنقید کی ہے، اور مینے وہ اشعار اسکے سامنے نقل کئے، اسنے کہا یقیناً وہان غلطی پائی جاتی ہے، مینے کہا، نہین، وہ صحت پر تھا، اور لوگو نکا خیال ہے، اسپر تنقید کرنے مین آپ نے غلطی کی ہے، اسنے کہا کیسے؟ اسلئے مینے اسکے سامنے صاحب "عقد" کی رائے بیان کی اسنے دانت سے اپنی انگلی دبائی، اور ایک وارفتگی کے عالم مین جیسے گھبرایا ہوا ہو، تعجب سے میری طرف دیکھتا رہا وہ اسی حالت مین تھا کہ مین خواب سے بیدار ہو گیا۔

ابوریحان البیرونی

میکڈونلڈ کہتا ہے، المبرد نے سنہ ۸۹۵ھ مین وفات پائی، ابن خلکان سے تقریباً چارسو برس قبل وہ گذرا ہے، ابن خلکان ایک کامل مسلم شخصیت کی نیابت کرتا ہے، لیکن اگر خیال کیا جائے کہ ایک دینی عالم اور فقیہ پر وہمیت کا اثر ہو سکتا ہے، تو ابوریحان البیرونی کا واقعہ لے لیجئے جسنے سنہ ۱۰۴۸ھ مین وفات پائی، البیرونی قریب قریب یقیناً اپنے زمانہ کا سب سے بڑا حکیم تھا، اسکا دماغ بالکل ناقدانہ واقع ہوا تھا، وہ ایک ہیئت دان تھا، ایک مورخ تھا، اور سنجیدگی کے ساتھ رسم و رواج اور مذہب و ملت کا مطالعہ کیا کرتا، وہ کہتا ہے، میری حیات کے ۶۱ سال کی آخری رات تھی، مینے خواب مین دیکھا کہ طلوع قمر کا مشاہدہ کرنے کے لئے مین افق آسمان کی طرف دیکھ رہا ہون جہان اسروز اسے ظاہر ہونا چاہئے تھا مینے ایک آواز سنی، "چاند کو چھوڑو، تم ۱۹۰ مرتبہ اسکے بیٹے ہو" اسنے اسکی تعبیر سمجھی کہ مین ابھی ایکسو نوے قمری مہینہ تک اور زندہ رہونگا، میکڈونلڈ کہتا ہے، اس واقعہ سے اسکی مزید تائید ہوتی ہے کہ اسکی اصل زندگی اس حساب سے صرف ایک ہی مہینہ کم واقع ہوئی۔

ناصر خسرو علوی

مذہبی دنیا کی طرف توجہ کیجائے تو ایسے خواب کا پتہ معلوم ہوتا ہے جسکے باعث ایک شخص نے شعار ملت کے مطابق اپنی زندگی کی اصلاح کی، ناصر خسرو، اپنے سفرنامہ مین خود لکھتا ہے۔ کہ اس ذریعہ سے پینے دنیا سے منہ موڑ لیا، حکومت مرو مین وہ سکریٹری (نظامت) کے عہدہ پر مامور تھا دولت کی فراوانی اور اسکی لذت آگینیان اسکی رفیق زندگی تھین وہ ظاہر کرتا ہے، کہ اکتوبر ۱۰۴۵ء مین مجھے موقعہ ملا کہ اگر مین اسرار نجوم کے مطابق دولت کے لئے خدا سے دعا، کرون تو مقبول ہو گی، بظاہر اسکی زندگی انقلاب پذیر نہ معلوم ہوتی تھی، مذہب، نجوم، دنیاوی ہوس اور لذات کے مخلوط اثرات مین وہ مبتلا تھا، ایک شب اسنے خواب مین دیکھا کہ ایک صورت یون خطاب کر رہی ہے "کبتک تم شراب پیتے رہو گے، جو انسان کی عقل کھو دیتی ہے، اچھا ہوتا کہ تم اپنے مین آجاتے،" اسنے جواب دیا عقلمندون نے شراب سے بڑھکر ترددات دنیوی کی زائل کرنے والی کوئی دوسری چیز نہین پائی، اس شکل نے کہا، عقل کے فقدان اور اپنی ذات پر تصرف نہ رکھنے کی گم گشتگی سے روح کو اطمینان نہین ہوتا، کوئی عقلمند آدمی کسی کو جنون کی رہنمائیون کی صلاح نہین دے سکتا، بلکہ اسکی تلاش ضروری ہے، جس سے عقل بڑھتی ہے، ناصر خسرو نے کہا "تو مین کیا کرون" اس صورت نے جواب دیا "جوینده یابنده" .... اور مکہ کی طرف اشارہ کیا

اس خواب نے ناصر خسرو کی زندگی بدل دی، اسکی نفسیاتی حالت مین کتنی ہی استعداد کیون نہ آگئی ہو، اسکے دماغ کے پیش نظر کوئی ایسا سوال نہ تھا، جسکے ماتحت اسقدر سرعت کیساتھ اسکی زندگی انقلاب پذیر ہو جاتی، صبح کے وقت اسنے ارادہ راسخ کر لیا، کہ وہ تمام چیزین ترک کردے جو چالیس سال تک زندگی سے متعلق رہی تھین، اسنے سکریٹری کے عہدہ سے استعفا دیدیا، اپنی دولت لٹا دی صرف ضرورت سفر کے مطابق رکھ لی، اور ۶ر مارچ ۱۰۴۶ء کو مرو سے بارادہ حج بیت اللہ روانہ ہوا، اسکے بعد اسنے ایک مذہبی سیاح کی طرح زندگی گذاردی اور ۱۰۸۸ء مین ایک تارک الدنیا درویش کی طرح بدخشان کے پہاڑ پر مر گیا۔

امام اشعری

اسی قسم کا ایک مذہبی انقلاب علامہ ابو الحسن الاشعری کی زندگی مین بھی واقع ہوا تھا، امام اشعری مسلمانون مین اشعریہ فرقہ کے بانی گذرے ہین، انکے متکلمانہ افکار و احساسات اور فقیہانہ اجتہاد و نظریات آٹھ سو برس سے اسلامی مذہب مین متداول ہین، انھون نے معتزلی فکر و عقیدہ مین نشو و نما پائی تھی، معتزلہ وہ ہین جو عقلی اصول کی بنا پر انکار کرتے ہین کہ قرآن مجید غیر مخلوق ہے، یہ کہ ایمان والون کو بہشت کے اندر خدا کا دیدار ہوگا اور یہ کہ مخلوقات کے تمام اعمال کا خالق خدا ہے، عموماً ان لوگون نے الہیات مین بحث و تمحیص کی، اور اہل سنت والجماعت کی طرح انھون نے آبائی معتقدات کا تتبع کرنا نہ چاہا جو قرآن مجید کے نظریات اور آنحضرت صلعم کے ذاتی کلمات، مواعظ پر مبنی تھے۔

امام اشعری نے معتزلہ کی طرح نشو ونما اور تربیت پائی تھی، اور چالیس برس کی عمر تک آپ نے آبائی مسلک کے مطابق بحث وجدل بھی کرتے رہے، میکڈونلڈ لکھتا ہے، کہ امام اشعری چونکہ سامی الاصل (semitic) تھے اسلئے انکی حیات شاعرہ ایک سیدھے سادے نصیحت آمیز عقیدہ کی خواہان تھی، اس وجہ سے وہ اپنے مسلک کے ارباب فکر کی منطقیانہ سخن پردازیون سے دل مین اکتا گئے تھے،

مطالعہ نتیجہ سے واضح ہوتا ہے، کہ وہ سمجھ رہے تھے، (گو انکا یہ ادراک انکی سطح شعور سے فروتر تھا) کہ ایک خالص عقلی علم کلام بیکار ہے، اور یہ کہ انسانی خیال مین اسرار کائنات کی ترجمانی نہین ہوسکتی انکے نفس باطن مین یہ خواہش پیدا ہورہی تھی کہ "اس طرح خدا کہتا ہے" کی بلا واسطہ صدا ..... سن لین، جو فراغ خاطر کا سبب ہو وہ روحانی انقلاب پذیری کی رزمگاہ مین تھے، کہ ماہ رمضان کے ایک دن جب انہین صائمانہ اور متعبدانہ انہماک تھا، خواب کے اندر ایک سروش غیب آیا، میکڈونلڈ کہتا ہے، یہ قصہ مختلف طریقون سے بیان کیا جاتا ہے لیکن مین یہان اسپٹیا کی کتاب "سیرت ابو الحسن الاشعری" سے یہ روایت نقل کرتا ہون، جو نفسیاتی اعتبار سے زیادہ قابل توجہ ہے، یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ایک معتزلی کی حیثیت سے ابو الحسن الاشعری کے نزدیک خواب کی کوئی اہمیت نہ تھی، پھر بھی یہ تعجب انگیز امر ہے کہ انکی فکر و احساس نے خواب کی صورت اختیار کر لی۔

امام اشعری فرماتے ہین۔

"ایکدن جب کہ مین ماہ رمضان کے پہلے عشرہ مین سویا ہوا تھا، مینے آن حضرت صلعم کو خواب مین دیکھا آپنے فرمایا۔ اے علی! تم میری حدیث کی تائید کرو، کیونکہ وہ صحیح ہے، پھر جب مین بیدار ہوا، مجھے نہایت مصیبت معلوم ہوئی، اور مین برابر خیالات اور اندیشہ مین پڑا رہا، چونکہ ان مسائل (حدیث) کے متضاد پہلوؤن کے متعلق براہین ساطعہ میرے پیش نظر تھے، آخرکار دوسرے عشرہ مین بھی مینے ایک رات آن حضرت صلعم کو خواب مین دیکھا، آپنے فرمایا تم نے اسکے متعلق کیا کیا جسکے بارہ مین مینے تمھین حکم دیا تھا مینے کہا یا رسول اللہ! مین کیون کرون؟ آپکی حدیث سے مینے ایسے ایسے مسائل استنباط کئے، جنکے متعلق الہیاتی استدلالات نے فتوائے جواز دیا، اور مینے اس صحیح سند کی پیروی کی جو خالق پر مجموعی حیثیت سے منطبق ہوسکتی تھی، تب آپنے فرمایا، میری حدیث کی تائید کرو، چونکہ وہ صحیح ہے، مین حزن و ملال کی گرانی کے ساتھ بیدار ہوا، اور ارادہ کر لیا کہ متکلمانہ استدلالات ترک کردونگا، مینے احادیث نبوی، کا مطالعہ اور تلاوت قرآن مجید شروع کر دی،

اسکے بعد جب (رمضان کی) ستائیسوین تاریخ آئی جس رات مین میرا دستور تھا کہ مین بصرہ مین علما، صلحا، اور حفاظ قرآن مجید کے ساتھ شبینہ پڑھا کرتا تھا، حسب دستور مین اس جماعت کے ساتھ تھا لیکن مجھ پر نیند کا

ایسا غلبہ ہوا، کہ مین قیام نہ کرسکا، اور جب مین گھر آیا، سورہا، اس رات کے قیام اور تلاوت کے ترک ہوجانیکا مجھے سخت صدمہ تھا، مینے آن حضرت صلعم کو خواب مین دیکھا، آپنے فرمایا تمنے اسکے متعلق کیا کیا جسکے بارہ مین مینے تمھین حکم دیا تھا، مینے کہا، "مینے الہیاتی استدلالات ترک کردیے اور تلاوت قرآن مجید، اور آپکے اقوال و سنن کی روایات کا مطالعہ شروع کردیا، لیکن آپنے فرمایا کیا مینے تمھین حکم دیا تھا کہ الہیاتی مباحث ترک کردو، مینے تمھین صرف یہ حکم دیا تھا کہ تم میری احادیث کی تائید کرو، چونکہ وہ صحیح ہین، تب مینے کہا یارسول اللہ مین کیونکر ان مسائل کی تائید کرون جن کے عناصر مینے بوضاحت سمجھے ہین، اور جنکا ثبوت اس تیس برس تک مینے خواب سے زیادہ نہین تصور کیا، آپنے فرمایا اگر مین یہ نہین جانتا کہ خدا تعالیٰ تم پر خاص نظر رحمت موقوف کریگا تو مین جب تک ان پیچیدہ مقامات کی توضیح نہ کردیتا، تمھارے نزدیک سے نہ ہٹتا، اور تم جب میرا یہ آنا محض خواب (وخیال) تصور کرتے ہو، تو مجھ پر حضرت جبریل کا آنا بھی خواب (وخیال) تھا؟ اسکے بعد تم اس طریقہ سے مجھے نہ دیکھوگے اسلئے تم اس امر مین مشغول ہوجاؤ، خدا کی طرف سے تمھاری خاص مدد ہوگی، تب مین خواب سے بیدار ہوا، اور مینے کہا صداقت کے لئے جستجو مشروط ہے، اسکے بعد مینے آن حضرت صلعم کی اُن احادیث کی تائید و توکیل شروع کی جو خواب، مداخلت نبوی، اور رویت الٰہی کے متعلق ہین اسکے بعد قسم خدا کی میرے دماغ مین ایسی ایسی باتین آنا شروع ہوئین جنکا تذکرہ نہ کبھی میرے مخالفین نے کیا تھا، اور نہ جنکے مباحث مینے کسی کتاب مین دیکھے تھے، اسلئے مین یہ سمجھا، کہ یہ وہی تائید الٰہی ہے جسکے متعلق ہمارے نبی صلعم نے بشارت دی تھی۔

اس خواب کو نقل کرکے میکڈونلڈ لکھتا ہے، کہ امام اشعری نے سچ مچ یہ خواب دیکھا تھا، اسکے متعلق شبہ نہین، کیونکہ اسکے بعد انکی زندگی مین انقلاب رونما ہوا، اور وہ معتزلی عقاید ترک کرکے اہل سنّت والجماعت مین داخل ہوگئے، امام اشعری آئے تو علم کلام بھی ساتھ لائے جسکا وجود صرف معتزلہ کی جماعت مین تھا امام اشعری کے قبل اہل سنّت والجماعت مین متکلمانہ ذوق مفقود تھا، یہ اسلام کی مذہبی تاریخ کا ایک انقلابی دور تھا، اسوقت سے اہل سنّت والجماعت نے اپنے عقاید کی تائید مین صرف احادیث ہی سے مدد نہین لی بلکہ اس مین قیاس ورائے بھی شامل کرلیا، یہ واقعہ تیسری صدی ہجری مین واقع ہوا،

میکڈونلڈ نے اسکے بعد برٹن کے سفرنامہ سے ایک پنجابی کے خواب کی روایت نقل کی ہے جس نے حضرت علیؓ کو خواب مین دیکھا تھا اور حج کے لئے چلا گیا، برٹن اپنی سیر و سیاحت کے سلسلہ مین اس پنجابی سے خود مکہ معظمہ مین ملا تھا، چونکہ اس نے اس خواب کا تاریک پہلو پیش کیا ہے، جو عصبیت سے ملوث معلوم ہوتا ہے، اس لئے مین اسے نظر انداز کرتا ہون، جن ارباب ذوق کو دلچسپی ہو وہ میکڈونلڈ کی کتاب کا مطالعہ کرین،-

"خواب مین تعلق" "غیر مشہود" کے باب کو میکڈونلڈ مفصلہ ذیل تتمہ کے بعد ختم کرتا ہے، وہ کہتا ہے، کہ اسلامی جماعت کا ہر رکن خواہ وہ اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتا ہو، یا ارباب کفر والحاد کے زمرہ سے خواہ وہ علمائے دین کے مشرب سے وابستہ ہو یا فلاسفہ کے مسلک سے، خواب کے اوپر ایمان رکھتا ہے، اسکے بعد لکھتا ہے کہ اہل اسلام مین خواب کے متعلق ایک کتاب ہے، جو ہر چند اپنی مختلف النوع مرکزیت دلچسپی، اور مصنف کے موضحانہ طریق نقش طرازی، اسکی سیر وسیاحت اور تاریخ عصری کا مرقع ہونیکی حیثیت سے، اسقدر مشہور نہین ہے، حالانکہ اسے مشہور ہونا چاہئے......... یہ کتاب ابن بطوطہ کی زندگی اور اسکا سفرنامہ ہے جسے اسنے سنہ ۱۳۵۵ھ مین بمقام فیض پیش کیا اسے مصنف نے ۲۸ سال کے سفر سے واپس آنے، اور تقریباً ۷۰ ہزار میل کی رہ نوردی کرنے کے بعد لکھا ہے، سینگوئینیٹی اور ڈفرامیری نے اس کتاب کا اصل عربی نسخہ عمدہ فرنچ ترجمہ کے ساتھ شایع کیا۔

باقی ـــ باقی

"عبدالمالک آروی"

تذکرۂ خندۂ گل
یا
ظریف شاعروں کا تذکرہ

جس میں ۲۰۰ سے زاید اردو، فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطایف وظرایف اور انتخابات کلام درج ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری میں اسکا رہنا ضروری ہے۔ تنہائی مین اس سے بہتر مونس، غمگینی میں اس سے زیادہ کامیاب ذریعہ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہیں نہیں ملسکتا۔ حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات قیمت معہ محصول ڈاک للعہ (چار روپیہ)

"منیجر نگار لکھنو"

وعدہ شکن

(سرزمین چین کی ایک عبرتناک داستان)

(۱)

سلطنتِ کوریا (چین) کے گوشے گوشے مین چوداگ کی محبت پرستی کا شہرہ پہنچ گیا تھا۔ اور اس کی پاک اور حقیقی محبت لوگون کے لئے ایک عجیب اور نادر مثال بن گئی تھی۔ چوداگ حسن وجمال مین بھی نہایت ممتاز تھا اور حکمت پر بھی کامل دسترس رکھتا تھا۔ قسمت سے اُسے بیوی بھی نہایت شریف اور نیک طینت اور پاک باطن ملی تھی۔ اور وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ اپنی وفاشعاری، اور شوہر پرستی مین یکتائے زمانہ تھی دنیا ان کی محبت پر رشک کرنے لگی تھی۔

چوداگ جب کہین سیر و تفریح کو جاتا تو ہانسی کو بھی اپنے ساتھ لیجاتا۔ اور ہانسی کی تمام خوشیون اور مسرتون مین چوداگ اسکا ہم جلیس رہا کرتا۔ جب وہ کسی جلسے یا دعوت مین شریک ہوتے تو دونون ایک دوسرے کے ہاتھ مین ہاتھ ڈالے رہتے۔ اور انبساط وسکون ان کے چہرون سے ظاہر ہوتا۔ جب وہ گفتگو کرتے تو ان کی زبان سے ایک ہی قسم کے الفاظ نکلتے۔

وہ محبت کے رازہائے پنہان اور رموز مخفی سے بھی بخوبی آشنا ہو گئے تھے۔ اور کسی کو کبھی یہ خیال بھی نہو سکتا تھا۔ کہ ان کے اس سکون مین کوئی چیز خلل انداز ہو سکتی ہے۔

(۲)

ایک شام ہر طرف سکوت چھایا تھا۔ پرندے اپنے آشیانون مین چھپتے جا رہے تھے اور ہر طرف اس وقت سناٹا طاری تھا۔ شہر سے باہر ایک قبرستان مین انتہائی خاموشی حکمران تھی۔ اور اس عالم سکوت مین اور ایسے بھیانک مقام پر، ایک عورت سفید لباس مین ملفوف، ایک بہت بڑا پنکھا اپنے مرمرین نازک ہاتھون مین لئے ہوئے، ایک قبر پر جھلنے مین مصروف تھی۔ اور کسی خیال مین یکسر محو تھی۔ اس کا چہرہ نہایت دلکش اور خوبصورت تھا اور شباب کی رعنائیان اس کے عضو عضو سے جھلک رہی تھین وہ اس لباس مین ایک حور خیال سے کم نہ نظر آتی تھی۔ تاہم وہ کسی قدر بے چین اور بیقرار تھی۔ وہ بار بار اپنا چہرہ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی۔ آہ سرد بھرتی اور پھر خاموش ہو جاتی اور پنکھا جھلنے لگتی۔

اس اثناء مین قبرستان کی چاردیواری کے قریب ایک انسانی شکل متحرک نظر آئی۔ وہ بدستور حرکت کرتی رہی

——پھر چند منٹ تک ایک مقام پر ٹھہر گئی۔ اور پھر متحرک ہوئی اور آخر اس عورت کے بالکل قریب پہنچ گئی عورت نے پُرارمان نگاہون سے آنیوالے کی طرف دیکھا۔ اور پھر سر جُھکا کر اپنے کام مین مصروف ہوگئی۔ آنیوالا شخص اس عورت کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ اور ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ کسی گہرے خیال مین مستغرق ہے پھر کچھ دیر کے بعد وہ چونکا۔ اور اس نے نہایت جُرأت کرکے اس جوان عورت سے نرم لہجے مین پوچھا۔ "تم یہان کیون کھڑی ہو اور اس قبر پر پنکھا جھلنے سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟"

عورت نے غمگین لہجے مین جواب دیا۔ (اس کی آنکھون مین آنسو ڈبڈبا رہے تھے) "مہربان اس ہمدردی کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتی ہون۔ لیکن آپ پوچھکر کیا کرینگے۔؟"

چو دانگ بولا: "مگر آپ کو بتانے مین کیون عُذر ہے، مین اس لئے دریافت کر رہا ہون کہ شاید آپکی مدد کرسکون"

عورت نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "آہ افسوس اب دنیا مین مجھے ایسا شوہر کہان ملے گا جو اس قبر مین راحت ابدی کی نیند سو رہا ہے۔ میرا پیارا شوہر، ایک نہایت رحمدل، اور نیک خصلت انسان تھا۔ مرتے وقت اس نے مجھسے کہا تھا کہ جب تک اس کی قبر کی مٹی خشک نہو جائے۔ اس وقت تک مین دوسری شادی نکرون۔ اسوقت آپ مجھے اسی حکم کی تکمیل مین منہمک دیکھ رہے ہین"

چو دانگ نے پوچھا:۔ "ہان مٹی تو ضرور خشک ہو جائیگی مگر پنکھا جھلنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟

عورت نے جواب دیا:۔ "اس لئے کہ مٹی جلد سوکھ جائے۔ اس کام مین مین نے دو دن صرف کر دیئے ہین اور یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک اس وعدہ کی تکمیل نہو جائے دوسری شادی نکرونگی۔ خواہ اس قبر کے سوکھنے مین اور چار دن کیون نہ لگ جائین۔

چو دانگ، بیوہ کے حسن سے متاثر ہو چکا تھا۔ اور اب تک نہایت سنجیدگی اور احترام کے ساتھ اُس سے گفتگو کر رہا تھا۔ مگر بیوہ کے اس عُجلت کے خیال سے وہ مسکرا دیا۔ تاہم فوراً ضبط کرکے اس نے نہایت ہمدردی کے انداز سے کہا۔ "محترمہ۔ اگر آپ میری ناچیز التجا کو نگاہ مشکوک سے نہ دیکھین۔ تو مین یہ عرض کرونگا۔ کہ میرے غریب کدے پر تشریف لے چلئے۔ میری بیوی آپ کو دیکھکر بہت مسرور ہوگی اور آپ کی تشفی اور دلداری ہی کریگی"

عورت نے شرمگین انداز سے جواب دیا:۔ "مہربان آپ کی اس عنایت کی ممنون ہون۔ مین آپکے اس جذبۂ ہمدردی کو احترام کی نظر سے دیکھتی ہون۔ مجھے آپ کی شرافت پر کامل اطمینان ہے اور چلنے مین کوئی عذر نہین۔

(۳)

ہانسی اپنی خلوتگاہ مین ایک مسہری پر دراز تھی۔ سرہانے ایک چھوٹی خوبصورت میز پر ایک شمع جھلمل کر رہی تھی اور وہ کسی کتاب کے مطالعہ مین محو تھی۔

چو دانگ کمرہ مین داخل ہوا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ ہانسی اُسے دیکھکر اٹھ کھڑی ہوئی اور چو دانگ اسکے برابر بیٹھ گیا اور بولا "پیاری ہانسی ایک بات کہنے آیا ہون۔ سنو گی اور میرا کہنا مانو گی"۔

ہانسی نے مسکراتے ہوئے جوابدیا:۔ "تمھاری بات سننے سے بھلا مجھے عذر ہو سکتا ہے اور مین نے تم سے انکار کس بات مین کیا ہے؟"۔

چو دانگ نے کہا:۔ پیاری ہانسی۔ آج اتفاقاً مین قبرستان چلا گیا تھا وہان ایک بیوہ عورت کو غمگین حالت دیکھکر مین بیحد متاثر ہو گیا ہون۔

ہانسی نے قدرے بیچین ہو کر پوچھا:۔ کس بات سے؟۔

چو دانگ نے جوابدیا:۔ اس کا شوہر مر گیا ہے اور مرتے وقت اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ جب تک اسکی قبر کی مٹی خشک نہو جائے وہ دوسری شادی نکرے۔ چنانچہ وہ بیچاری قبر پر پنکھا جھل کر مٹی خشک کر رہی تھی اُسے مین اپنے گھرے آیا ہون۔ تم اس کی تسلی اور تسکین کرو، یہ ایک انسانی ہمدردی ہے، مگر ہانسی ———

ہانسی ابتک چپ چاپ سن رہی تھی اور دل ہی دل مین اس عورت کو کوس رہی تھی۔ مگر اس نے بیچین ہو کر پوچھا:۔ کیون چپ ہو گئے۔ پیارے چو دانگ کہو نا کیا مجھسے کوئی بات چھپا رکھی ہے۔

چو دانگ بولا:۔ نہین ہانسی تم سے کون راز پوشیدہ ہین۔ ہان مین کچھ کہنے والا تھا۔ مگر شاید تمھین ناگوار گذرے

ہانسی نے کہا:۔ نہین تمھاری کوئی بات مجھے ناگوار نہ گذریگی۔ تم شوق سے کہو۔

چو دانگ نے کہا:۔ میرا یہ خیال ہے کہ اگر میرا بھی یہی انجام ہوا تو شاید تم بھی اسی بیوہ کی طرح کرو۔

ہانسی یہ سنکر بے ساختہ رو پڑی۔ اس کے تمام جسم مین لرزش پیدا ہو گئی۔ وہ ہمہ تن غصہ بنگئی۔ اس نے پرنم نگاہون سے چو دانگ کو گھور کر دیکھا۔ اور بولی "چو دانگ۔ چو دانگ تم نے مجھے کیون ایسا سمجھ لیا ہے۔ آہ مجھے تو تم سے ایسی بدگمانی کی کبھی بھی امید نہ تھی"۔

چو دانگ نے تسلی دیتے ہوئے کہا:۔ پیاری ہانسی تم غصہ ہو گئین۔ مین نے صرف اپنا ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ تمھین اس سے صدمہ پہنچا۔ پیاری ہانسی معاف کردو۔ مین تو سمجھتا تھا کہ تمھین اس سے کوئی تکلیف نہو گی

ہانسی نے اشک آلود نگاہون سے دیکھکر جوابدیا:۔ چو دانگ ان الفاظ سے تم نے میرے قلب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے مین اب کس دل سے تم سے بات کرون۔ آہ تم کس قدر ظالم ہو کہ بلا کسی وجہ کے ایسا فضول خیال قائم کر لیا۔ چو دانگ مین اور میری جان صرف تمھارے لئے ہین مین کسی دوسرے سے محبت نہین کر سکتی چو دانگ۔ میری باتون کو دل پر نقش کر لو۔ مین تم سے سچ کہہ رہی ہون۔

چو دانگ نے متاثر ہو کر کہا:۔ ہانسی پیاری ہانسی مجھے تمھاری طرف سے ذرا بھی بدگمانی نہین معلوم نہین کیون

یہ خیال آگیا تھا۔ اور مین چونکہ اپنے دل کی کوئی بات تم سے مخفی رکھنا نہین چاہتا۔ اس لئے مین نے اسکا بھی اظہار کر دیا مگر خیر اب اسے درگذر کرو۔ پیاری ہانسی چودانگ تم سے معافی مانگتا ہے۔

ہانسی نے جواب دیا:۔ مین تمھین معاف کرتی ہون۔ لیکن مین قسم کھا کر کہتی ہون کہ جہان ایسی بے وفا اور بیشرم عورت رہیگی مین ایک لمحے وہان ٹھہرنا گوارا نہ کرونگی۔ اُسے ابھی نکالدو۔ اس کی وجہ سے میرا گھر ناپاک ہو جائیگا۔

چوداانگ نے کہا:۔ اچھا تم اس قدر ناراض نہو اس قدر برہم نہو۔ پیاری ہانسی مین کبھی تمھاری دلشکنی گوارا نہین کرسکتا۔ مین ابھی اُسے نکالے دیتا ہون۔ پیاری ہانسی میری پیاری" اور یہ کہکر اس نے ہانسی کو اپنی آغوش مین لیا۔

(۴)

رات نہایت طوفانی اور سرد تھی۔ آندھی بہت زور شور سے چل رہی تھی۔ اور رات زیادہ بھیانک ہو گئی تھی بیچاری بیوہ عورت، چپ چاپ گھر سے نکلی اور تاریکی مین کسی طرف روپوش ہو گئی۔

ایک گھنٹہ گذر گیا دروازہ کھٹکھٹانیکی آواز آئی۔ دروازہ کھولدیا گیا۔ چوداانگ کا ایک شاگرد، جسے چوداانگ نے بہت عرصہ سے نہ دیکھا تھا۔ اندر داخل ہوا۔ دونون اس کے خیر مقدم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوے اور نہایت فرخندہ روی اور زندہ دلی سے پیش آئے ———— سب لوگ گفتگو مین مشغول ہو گئے۔

ایک نہایت بڑے اور آراستہ کمرے مین فرش بچھایا گیا مختلف قسم کے کھانے دسترخوان پر چنے گئے۔ اس وقت چوداانگ اور ہانسی کے انداز و اطوار سے اطمینانِ قلب، نشاط و بہجت کے آثار ہویدا تھے۔ اور ان کے اس اتحاد کی مسرت ان کے چہرون سے ظاہر ہو رہی تھی۔

یکایک چوداانگ بیٹھے بیٹھے زمین پر گر پڑا۔ اور بیہوش ہو گیا۔ اور اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی تمام لوگ یہ منظر جانگداز دیکھکر بہت مضطرب اور پریشان ہو گئے۔ کوئی ادھر دوڑنے لگا کوئی اُدھر۔ کوئی ڈاکٹر کو بلانے گیا کوئی پنکھا جھلنے لگا۔ چنانچہ چند ہی لمحون مین ہر شخص بدحواس ہو گیا۔ اور چوداانگ کو ہوش مین لانیکی تدابیر کی جانے لگین۔ بیحد دوا دوش اور کوششون کے بعد بھی کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ اور سب نے چوداانگ کو مردہ سمجھ لیا۔

شوہر پرست ہانسی پر اس صدمۂ جانکاہ سے ایک بجلی سی گر پڑی اور وہ سر پکڑ کر ایک کرسی پر گر پڑی ———— بہت دیر تک اُسی پر پڑی رہی۔

(۵)

شاگرد، اپنے استاد کی اس اچانک موت سے بہت سراسیمہ اور غمزدہ ہو گیا اُسے کسی کل چین نہ آتا تھا۔ ہانسی شاگرد کی اس حالت کو دیکھکر بہت متفکر ہو گئی اور آخرکار چوداانگ سے وفاشعاری کا وعدہ اس نے فراموش کر دیا بیوہ عورت کی حالت بھی اس کے دماغ سے محو ہو گئی۔ اور اب وہ شاگرد کی بےچینی کو رفع کرنے مین سراپا محو ہو گئی

ایک دن گذر گیا۔۔۔ دوسرے دن وہ شاگرد سے نہایت دلچسپ گفتگو کرکے اس کی تسلی اور تشفی کرتی رہی۔ گفتگو مین اس قدر آزادی اور عریانی خیال موجود ہوتی تھی کہ دونون کے جذبات مین ایک ہل چل سی مچ جاتی تھی۔ تیسرے دن دونون ایک دوسرے سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئے۔

(۶)

چو دانگ کی آرام گاہ اس وقت غم و آلام کے آثار سے معرا تھی۔ مسرت کی رنگینیان بہار کی طرح ساری فضا پر چھائی تھین۔ نشاط و فرحت کی صدائین ہر طرف سے بلند ہو رہی تھین۔

چو دانگ کی نعش ایک تابوت کے سپرد کرکے ایک تنہا کمرہ مین رکھدی گئی تاکہ جب تک عدالت سے دفن کرنیکا حکم نہ ملے۔ وہان محفوظ پڑی رہے۔

دولھا اور دولھن نے نہایت بیش قیمت، زرین اور لباس فاخرہ زیب تن کئے۔ ہانسی نے ناک مین ایک بیش قیمت بلاق پہنا۔ اور توشہ نے مرحوم استاد کے ملبوس سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ عقد کا وقت قریب آ گیا۔ تمام خاندان اس آئندہ مسرت سے نہایت مسرور اور شاد نظر آ رہا تھا اور تمام کمرے، برآمدے، اور دالان روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ عطر و عنبر کی خوشبوؤن سے فضا معطر ہو رہی تھی۔

اس وقت ہانسی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ، ایک نہایت آراستہ خلوتکدے مین تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اپنے نوجوان شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ ایسی عالم فرحت و بہجت مین ایک ملازم نہایت متوحش اور مضطرب کمرے مین داخل ہوا۔ اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز مین کہا۔

"ہمارا ۔۔۔ نوجوان آقا ۔۔۔ اچانک ۔۔۔ ایک سخت مرض ۔۔۔ مین ۔۔۔ مبتلا ہو گیا۔۔۔ ہے ۔۔۔ مرض نہایت خطرناک ہے ۔۔۔ جب تک ۔۔۔ کسی مردہ ۔۔۔ انسان کا دل ۔۔۔ اُس کے سینے ۔۔۔ پر نہ رکھا جائے اس ۔۔۔ کی زندگی کی کوئی ۔۔۔ امید نہین"

ان الفاظ کو سنتے ہی ہانسی دفور غم سے تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی اس کی رُوح کو شکنجے مین کس رہا ہو۔ اس کے مضمحل اور حسین چہرے پر اضطراب کی لہرین سیلاب کی طرح دوڑنے لگین وہ دیوانی سی ہو گئی۔ تاہم اُس نے جلد جلد اپنے لمبے جوڑے اور زمین پر گھسٹنے والے کپڑون کو سمیٹا۔ وہان سے نکلکر دوسرے کمرے مین گئی ایک کلہاڑی لی۔ اور دوڑ کر اس کمرے مین جا پہنچی۔ جہان اس کے شوہر کی نعش پڑی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مردہ شوہر کا دل نکالکر زندہ شوہر کی روح کو موت کے چنگل سے چھڑائے۔ وہ اس خیال مین کھوئی ہوئی تھی۔ اُسے انجام کی ذرا بھی فکر نہ تھی۔ وہ زور زور سے کلہاڑی صندوق پر مارنے لگی۔ چند ضربون کے بعد صندوق ٹوٹ گیا۔ اور ساتھ ہی چو دانگ کی نعش حرکت کرنے لگی۔ جسے تمام لوگون نے مردہ سمجھ لیا تھا۔

اس ہیبتناک منظر سے خوفزدہ ہو کر ہانسی نے کلہاڑی چھوڑدی۔ اس کا تمام جسم اور جسم کا رونگٹا رونگٹا خوف سے تھرتھر کانپنے لگا۔ وہ اس منظر کو زیادہ نہ دیکھ سکی اور وہان سے بھاگ آئی۔

(۷)

چوداانگ صندوق سے باہر نکل آیا۔ اور اپنی بیوی کی اس غیر معمولی آرائش اور اسکی پریشانی دیکھکر سخت متحیر ہوا۔ وہ کچھ دیر تک ساکت رہا۔ لیکن جب ہانسی وہان سے چلی گئی تو وہ وہان سے نکلکر باہر آیا۔ تاکہ اس آرائش کا سبب دریافت کرے۔ اُسے وہان کوئی نہ ملا وہ آگے بڑھا۔ اس اثناء مین دو ملازم داخل ہوئے اور اور انھون نے چوداانگ کو دیکھکر بھاگنا چاہا۔ چوداانگ نے ان کو پکارا۔ اور وجہ دریافت کی۔ لوگون نے اُسے بہت دیر کے بعد زندہ سمجھا اور گذشتہ واقعات بلاکم وکاست بیان کردیئے۔

چوداانگ کو ملازمون کی باتون پر یقین نہ آیا۔ وہ اپنی بیوی کے متعلق ایسی باتین سنکر بہت برہم ہوا اور ملازمون کو بُرا بھلا کہکر خود ہی ہانسی کو تلاش کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان تمام واقعات کی حقیقت سے آشنا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ ہانسی کے متعلق لوگون کے بیانات غلط ثابت ہون۔ اور وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اگر یہ تمام واقعات سچ ہون تو وفاشعار ہانسی سے اُس کی وعدہ شکنی کا تذکرہ کرکے اُس پر اظہار نفرت کرے۔

(۸)

ہانسی، نفس پرست اور وعدہ شکن ہانسی بدنامی اور رسوائی کے خوف سے لرز گئی۔ اس کے لئے دنیا مین اس سے بڑھکر اور کوئی ذلت نہو سکتی تھی کہ اس نے اپنے عزیز شوہر سے وعدہ شکنی کی تھی۔

چوداانگ اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا۔ اور آخر کار پھر اُسی کمرے مین جا پہنچا جہان اسکا تابوت رکھا تھا۔ اس نے دیکھا اور دیکھکر چونک پڑا۔ اس نے دیکھا اور اپنا دل تھام کر رہگیا۔ ہانسی نے ذلت، ندامت اور بیوفائی کا صدمہ نہ برداشت کرکے خودکشی کرلی تھی۔

چوداانگ ایک فلسفی تھا۔ وہ نہایت عمیق نظر اور نکتہ رس اور دانشمند تھا۔ اُس نے یہ سب دیکھا۔ اُس نے اپنی مونس زندگی، اپنی رفیقۂ حیات اور محبوبۂ دلنواز کو خاک وخون مین آلودہ دیکھا۔ لیکن اس کی زبان سے اُف تک نہ نکلا۔ وہ جون کا تون کھڑا رہا۔ اور واقعات پر غور کرنے لگا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا کہ اگر اس وقت اور کوئی شخص ہوتا تو رو دیتا۔ لیکن چوداانگ اپنی ذات کو اس کمزوری سے افضل اور برتر سمجھتا تھا۔ وہ ساکت کھڑا رہا۔ کچھ دیر گذر گئی۔ اس کی باریک بین نگاہون نے سب کچھ دیکھ لیا۔ سارے راز یکے بعد دیگرے اس پر منکشف ہوگئے۔ اور اُس نے پُرانے تابوت کو درست کرکے اُس مین اپنی وعدہ شکن بیوی کی نعش رکھدی۔

(۹)

چو دانگ پھر خاموش ہو گیا - اور کسی سوچ مین پڑ گیا - پھر وہ اُٹھا - اس کے دماغ مین کوئی مفید تدبیر آگئی تھی - اس نے تمام آرائش اور ساز و سامان کو اسی حالت مین رکھ کر اُس پنکھے والی بیوہ عورت کو تلاش کیا اور اپنے گھر لے آیا - چونکہ دونون ایک دوسرے کی فطرت اور اخلاق کی کمزوری سے واقف ہو چکے تھے اس لئے وہ شادی کے بعد ایک دوسرے کی غلطی معاف کرنے اور عیوب سے چشم پوشی کرنے کے رموز سے بھی آشنا بن گئے تھے -

محشر عابدی

(گولڈ اسمتھ)

علم الکیمیا کا ایک حیرت انگیز معجزہ

کایا پلٹ ہیر آیل

کہنے کو صرف یہ تیل ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہے - یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود نباتاتی و کیمیاوی اجزا سے جدید اصول پر تیار کیا گیا ہے جسکی تصدیق بڑے بڑے سائنس والون نے کی ہے اسکے فواید کی تفصیل مختصر اشتہار مین ناممکن ہے مختصراً یون سمجھ لیجئے کہ گھر مین اسکی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امرض کو دفع کر دینا ہے -

(۱) اگر خدا نخواستہ کسی کے بال صاف ہو گئے ہین یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہے - یا بال گرنا شروع ہو گئے ہین یا کمزور و باریک ہو گئے ہین یا سفید ہونے لگے ہین تو اس تیل کا استعمال بالونکی جڑون کو فاسد رطوبتون سے صاف کرکے بال کا گرنا موقوف کر دیگا، بال بڑھائیگا اور جہان جہان کے بال گر گئے ہین وہان نئے بال سیاہ پیدا کریگا -

(۲) جن کو نزلہ درد سر یا شقیقہ دوران سر ضعف دماغ ضعف بصارت بے خوابی اور نسیان وغیرہ کی شکایت رہتی ہے ان کیلئے یہ تیل بڑی نعمت ہے، نزلہ کو فوراً روک دیتا ہے اور دماغ و بصارت کو قوی کرکے عجیب قسم کا سکون پیدا کر دیتا ہے اور عینک کے استعمال کو بھی غیر ضروری کر دیتا ہے -

(۳) شدت تپ کی حالت مین اسکی مالش فوراً ہذیانی حالت کو دور کرکے پسینہ لے آتی ہے اور بخار کو کم کر دیتی ہے -

(۴) ایسے مہلک امرض سے جیسے کنٹھمالا سل و دق اسکا استعمال کرنیوالا محفوظ رہتا ہے اور تمام اثرات نزلہ کو خواہ سر مین ہو یا دانتون یا مسوڑھون مین بلکلیہ دور کر دیتا ہے -

(۵) سر اور جسم کے پھوڑیان پھنسیان، گرمی دانے، خارش اور ہر طرح کے جلدی امرض اسکے مالش سے کافور ہو جاتے ہین - ایک تازہ سرٹیفکیٹ ملاحظہ ہو -

مکرمی بتسلیم

آپکا عنایت کردہ تیل بہت مفید ثابت ہوا ابھی ایک شیشی ختم نہین ہوئی ہے اور سر کی خشکی جاتی رہی بال گرنا بند اور نئے بال نکلنے شروع ہو گئے - براہ کرم حکم دیدیجئے کہ ایک شیشی اور بھیجی جائے اور آئندہ بغیر میری استدعا کے ہر مہینے کے شروع مین ایک شیشی بذریعہ وی پی روانہ ہوا کرے والسلام -

نیازمند جعفر علیخان (ڈپٹی کلکٹر) رائے بریلی -

جوابی امور کے واسطے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے قیمت معہ محصول (ایک روپیہ)

مینجر کایا پلٹ ہیر آیل - لکھنو

ہماری قدیم فسانہ نگاری

اور

فسانۂ عجائب کے اجزائے ترکیبی

جہانتک خیال کیا جاتا ہے۔ اور مشہور ہے۔ لکھنؤ کی سرزمین نے نثر و نظم مین اپنے یہان کے باکمالون کے دو ادبی شاہکار پیش کئے۔ اور آجتک تفاخر اور ناز کے ساتھ یہی دونون پیش کئے جاتے ہین۔ ایک اُن مین سے مرزا رجب علی بیگ کا "فسانۂ عجائب" ہے۔ اور دوسرا منشی دیاشنکر نسیم کی "گلزار نسیم"۔

گلزار نسیم ایک شاہکار ادب سہی۔ ایک عجوبۂ روزگار مثنوی سہی مگر اس حقیقت کو کوئی طاقت نہین چھپا سکتی کہ وہ صرف ایک شراب کہنہ ہے جسکو دو آتشہ کر دیا گیا ہے جیسا کہ خود اس کا مصنف کہتا ہے ؎

وہ نثر تھی داد نظم دون مین اس مے کو دو آتشہ کرون مین

یعنی قصہ پرانا تھا اب اوسکو نظم کر دیا گیا ہے۔ بعض مضمون نگارون نے اس طرف توجہ کی ہے کہ آیا وہ مے جسکو دو آتشہ کیا گیا ہے وہ اپنی ہی آگ سے دو آتشہ کی گئی ہے یا اُسکے لئے بھی حرارت کا کہین اور سے دست نگر ہونا پڑا ہے۔ چنانچہ اس مین بھی تحقیق کے بعد بہت بڑا شک پڑ جاتا ہے۔ کہ یہ مے دو آتشہ خود مصنف کی گرمی سخن کی کہان تک رہین منت ہے۔ بعض ستم ظریفون نے فارسی کے مصرع کے مصرع سامنے رکھدئے ہین۔ اور بتا دیا ہے کہ نسیم کی کاوش نمائش کی منزل سے آگے نہین بڑھتی۔ بہتون نے اور ذرا عنایت کی ہے انھون نے اسکو آتش کے دل و دماغ کا نتیجہ بتایا ہے۔ اور اگر بڑھنے والے زیادہ قدم اوٹھاتے ہوے اس راہ مین بڑھ گئے ہین اور مثنوی بدر منیر سے اوسکا تقابل کر دیا ہے تو پھر ایک قیامت ہی آگئی ہے ان قضیون کے دیکھنے والے کو سوائے "وائے بر جان سخن" کہنے کے اور کچھ بن ہی نہین پڑتا۔

یہ ہے اوس گلزار نسیم کا حال، جو ہمیشہ میدان ادب مین ہل من مبارز کے ساتھ پیش کیجاتی ہے۔

فسانۂ عجائب ایک ایسی چیز ہے جس پر شاید کوئی اعتراضی داغ ابتک نہین پڑا ہے۔ اور جسکے جواب مین سرورش سخن کو ہمیشہ نقش ثانی سمجھا گیا ہے۔

اس فسانہ کی بدیعی سحر کاری، شاید تین چار حیثیتین رکھتی ہے۔ یعنی یہ کہ اوسکی نثر مقفی ہے۔ دلکش ہے، اور اپنے وقت کا ادبی معجزہ ہے۔

دوسرے یہ کہ سرور نے فسانۂ عجائب کا قصہ بالکل طبعزاد لکھا ہے اور صرف اپنی کوشش وکاوش کو اہل دماغ کے سامنے پیش کر کے اپنی جودت طبع کا شیدا بنا دیا ہے۔

کہنے والے یہ بھی کہتے ہین کہ فسانۂ عجائب کی گفتگو خاص قلعۂ معلی یا بیگمات کی گفتگو ہے۔ اور یہ عقیدہ بقدر عام ہے کہ ایمان بالغیب کی حد تک پہونچگیا ہے۔

یون تو سراسر ان دعاوی کی تکذیب نہین کیجا سکتی۔ مگر پھر بھی بہت سے شکوک اور اوہام کی اسمین گنجایش ہے۔ اور پھر بہت سے شکوک حد شک سے گزر کر یقین کی حد تک پہونچے ہین۔ چنانچہ ہم فسانۂ عجائب کی ان چارون حیثیتون پر ایک غایر نظر ڈالتے ہین۔ اور بتانا چاہتے ہین کہ گو ظاہر پرست سطحی نظرون کے سامنے وہ معجزہ ادب ہو۔ سحر نگاری ہو۔ بد لیۂ ادب ہو مگر غایر نگاہون کے سامنے یہ دعوی ع دم شرط ایمان بود ورزش ایمان بالغیب سے ایک قدم بھی آگے نہین بڑھتا۔ سب سے پہلے ہم بتانا چاہتے ہین کہ فسانۂ عجائب قصہ کے لحاظ سے کیا حیثیت رکھتا ہے۔

ہمارے یہان کے قدیم افسانون کی ابتدا کے لئے تین چار مضامین سنگ بنیاد قرار پاگئے ہین اور غور وفکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کد وکاوش کے باوجود بھی ادبی سیاح ان طلسمی مضامین کے جنگل سے باہر قدم نہین رکھ سکے۔ وہ لاکھ لاکھ تجربہ کار ہوئے اونکی گرم رفتاری کسی حد پر پہونچی۔ مگر پھر پھر کر آخر کار دائرہ ہی مین قدم رکھا۔

یہ کچھ شرط سی قرار پاگئی ہے۔ ایک واجب سی بات ٹھیر گئی ہے کہ مہتم بالشان قصہ کے لئے کسی ذی مرتبہ ہستی کو انتخاب کیا جائے جس کا درجہ زیادہ سے زیادہ شاہ جنات تک پہونچتا ہے اور ادنی سے ادنی ہو تو کوئی نواب یا امیر وزیر اس سے کم کے لئے ایشیائی افسانہ نگاری مین گنجایش ہی نہین ہے۔ اگر الف لیلہ کو مستثنی کر دیا جائے تو قریب قریب یہ بات ایک کلیۂ قرار پاجائیگی کہ گویا غریب اور ادنی درجہ اور طبقہ کے لوگون مین کوئی ایسا واقعہ کبھی پیش ہی نہین آتا جسکو افسانہ کے طریق پر لوگون کو سنا سکین۔ قصہ نویسون داستان گویون۔ قدیمی افسانہ نگارون کے نزدیک گویا ادنی اور غربا کی زندگی ایک سادہ ورق ہے جسپر کسی واقعہ کا دھبا پڑا ہی نہین۔ نظم ونثر دونون اصناف کے قصے ایسے ہی ہین۔ چنانچہ نظم مین گلزار نسیم مثنوی قلق۔ مثنوی زہر عشق۔ مثنوی ماہ پیکر۔ مثنوی سحر البیان۔ قصۂ سیاہ پوش۔ مثنوی شیرین خسرو مثنوی نلدمن۔ مثنوی پدماوت۔ مثنوی شوق قدوائی۔ مثنوی موجۂ عم۔ مثنوی یوسف زلیخا۔ مثنوی گلشن عشق۔ مثنوی جوہر عشق۔ مثنوی دریائے تعشق وغیرہ وغیرہ اور نثر مین قصۂ ممتاز۔ داستان امیر حمزہ۔ حاتم طائی۔ باغ وبہار۔ گل وصنوبر۔ بلکہ الف لیلہ۔ بوستان خیال۔ سروش سخن۔ قصہ سیاہ پوش۔

وغیرہ وغیرہ سب اسی دائرہ مین ہین۔ سب کی ابتدا بادشاہون اور امیرون کے آوارہ مزاج صاحبزادون سے ہوتی ہے۔ یا خود اوباش مزاج حکمران کی سیاہ کاریون سے افسانون کے کاغذ کو رنگا گیا ہے۔ یہ ہم نہین کہتے کہ ان سب کا راستہ ایک ہے اور ایک ہی داستان اون سب مین ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہان سے چلے ہین وہ جگہ ایک ہی ہے۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ سرور کے دماغ نے کوئی نئی بات نہین کہی بلکہ وہ بھی اُسی آموختہ کو دُہراتے رہے۔ جو استاد ازل نے اونکو سکھا دیا تھا۔ اونکو بھی سوائے بادشاہ کے اور کوئی ایسا نہ ملا جس سے وہ اپنے قصہ کی ابتدا کرتے۔ اوسکی نظیر مین ہمنے متعدد قصے پیش کئے ہین۔ لہذا اُن کے قصّہ مین کوئی نُدرت برائے نام بھی نہین ہے۔

اسکے بعد دوسری منزل آتی ہے۔ عمومًا ایشیائی قصون کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے کہ کسی بادشاہ کے لڑکا پیدا نہوا۔ تمام اسباب شاہی ہیچ نظر آنے لگے۔ دولت وحشمت بیسود ہوگئی۔ آخر بادشاہ سلامت مایوس ہوئے۔ وحشت نے زیادہ زور کیا تو وہ ترک شاہی کا ارادہ کر بیٹھے اور اگر خلل دماغ اسدرجہ پر نہ پہونچا تو خیر پھر گوشہ گیری اور عزلت اختیار کرلی۔ بعد خرابی بصرہ صاحبزادے یا شاہزادے صاحب پیدا ہوئے تو دیوانہ ومجنون نے رسوا سر بازارے کی صحیح مثال۔ اور حماقت کی مجسم تصویر۔ چنانچہ سرور نے بھی یہی کیا اور یہ خیال مثنوی میر حسن۔ یا باغ وبہار سے لے لیا۔

اسکے بعد تیسری منزل آتی ہے جس مین صاحبزادے یا شہزادے کو عشق پیدا ہوتا ہے مگر اسکے لئے بھی چند مخصوص ذرائع ہوتے ہین۔ کسی کی طبیعت بیٹھے بیٹھے اکتاتی ہے پیچ وتاب کھا کر شیدائے محض بنکر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ فیضی نے راجہ نل کو اسی حال مین پھنسایا ہے۔ دوسرا ذریعہ قبول خاطر ولطف سخن خداداد کی بموجب خواب ہے۔ یہ خواب بھی ایک بلائے بد ہے۔ عمومًا اسکی تعبیر آیندہ چلکر صحرا نوردی اور جنون۔ غربت ہوا کرتا ہے۔ اس خیال کی ابتداء یوسف زلیخا کے قصے سے ہوئی ہے اور پھر لوگون نے اس سے اسقدر جائز وناجائز فائدے اُٹھائے کہ آج بہت سی داستانین اس سے بھری ہوئی نظر آتی ہین۔ تیسرا دام فریب تصویر ہے۔ جسکے ذریعہ سے ظاہر دل شکار کئے جاتے ہین۔ چوتھا حیلہ نظارہ محض یا نظارہ لب بام ہے اس کے ذریعہ سے بھی بہت سے عشاق طائر بسمل کی طرح رقص بسمل کرائے جاتے ہیں۔

ان سب کے بعد افسانہ نویسون کی تدریجی ترقی اسدرجہ پر پہونچی ہے کہ بادشاہ کے گھر مین لڑکا پیدا ہوتا ہے اور جوان ہوکر اتفاق سے سیر بازار کو جاتا ہے کوئی طوطا خریدتا ہے۔ اور اوس طوطے سے کسی حسن جانسوز کا افسانہ عشق سنکر مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فسانہ عجائب مین بھی یہی کہا گیا ہے جان عالم نے طوطا خریدا ہے اور اس کے بعد ہی اوسکو جلاوطنی نصیب ہوئی۔ یہ ایک پامال خیال ہے اسکو ہر گذرنے والے کے

دماغ کی پیداوار نہین کہا جاسکتا - اصل مین یہ خیال پدماوت - یا بہار دانش سے لیا گیا ہے - کیونکہ پدماوت مین راجہ رتن سین - اور بہار دانش مین بہرہ ور بانو کے عشق مین شاہزادہ جہاندار شاہ طوطے ہی کی بدولت مبتلا ہوا ہے اور پھر سفر کی بہت سی مصیبتین اُٹھائی ہین -

جیسے جانعالم کے ساتھ یہ طوطا گیا ہے اسی طرح جہاندار شاہ کے ساتھ بھی طوطا ہر ایک سفر مین رہا ہے اور اسی واسطے اس خیال کو مصنف بہار دانش کے دل و دماغ کا نتیجہ کہا جائے گا -

جانعالم چلتے چلتے ایک جنگل مین پہونچا جو نہایت ہی پر فضا تھا - وہان اسکو دو ہرن نظر آئے - اور جانعالم انکو دیکھکر بے چین ہوگیا - وزیرزادے سے کہا کہ کسی طرح انکو جیتا گرفتار کیجئے - ہرن اِن دونون کو اپنے درپے دیکھکر دوڑے - آگے چلکر وہ ہرن ایک دوسرے سے جُدا ہوگئے اور بادشاہزادہ اور وزیرزادہ بہین سے علیحدہ ہو کر گمراہ ہوئے

یہ خیال بظاہر مصنف فسانہ عجائب کا پیدا کیا ہوا معلوم ہوتا ہے - مگر جب باغ وبہار مین تیسرے درویش کی سیر پر نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال وہان سے لیا گیا ہے - باغ وبہار مین یہ ذکر تیسرے درویش کی سیر مین اس طرح کیا گیا ہے کہ تیسرا درویش عجم کا شاہزادہ ہے - ایک روز یہ شکار کے لئے گیا تو بالکل ایسے ہی جنگل مین پہونچ گیا جیسے جنگل مین جان عالم پہونچا ہے - وہان اسکو ایک کالا ہرن نظر آیا ، جو طرح طرح کے نفیس سامانون سے سجا ہوا تھا - اور اس جنگل مین جہان خود رو سبزے اور پھولون کی کمی نہ تھی چرتا پھر رہا تھا - شاہزادہ عجم کو شوق ہوا کہ کسی طرح اس کو زندہ گرفتار کیا جائے اُسنے اپنے ساتھیون سے کہا کہ تم یہین ٹھرو - مین اس کو زندہ گرفتار کرون گا چنانچہ اس نے اوس ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑایا - اور آخر گمراہ ہو گیا ہرن غائب ہو گیا -

اس واقعہ کے بعد جانعالم کو - اور ایک سخت ہولناک جنگل مین پہونچایا گیا ہے اور وہان اُسکو ایک چشمۂ آب نظر آیا ہے - یہ خیال بھی باغ وبہار سے لیا گیا ہے اُسنے بھی اپنے شاہزادہ کو چشمہ پر پہونچایا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اُسنے ایک باغ مین یہ چشمہ دیکھا ہے اور جان عالم نے جنگل مین -

اسکے بعد ایشیائی مذاق قصہ گوئی کے موافق کسی پیرمرد کا ملنا ضرور تھا - چنانچہ شاہزادہ جانعالم کو ایک پیرمرد ملا ہے جسنے اسپر ترس کھا کر راستہ بھی بتایا ہے - اور ایک نظر ملک زرنگار کو (جہان جانعالم کی محبوبہ انجمن آرا رہتی تھی) بھی دکھا دیا ہے اسکے بعد پیرمرد نے اسکو سُلا دیا ہے - اور صبح کو جب اسکی آنکھ کھلی ہے تو وہ اسی جگہ آ پہونچا ہے جہان سے ہرن کے پیچھے اُس نے گھوڑا دوڑایا تھا

یہ خیال بھی باغ وبہار کا ہے چنانچہ شاہزادہ عجم کو بھی ایک پیرمرد ملا ہے - اور اُسنے بھی ازراہ مہمان نوازی جان عالم کو کچھ ماحضر کھلایا ہے - شاہزادہ سو گیا ہے اور آنکھ کھلنے پر اسکو بھی اپنے سوا دس ڈالان مین

کوئی نظر نہین آیا۔ اس واقعہ کے بعد مصنف فسانہ عجائب باغ و بہار کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے راستہ پر چلنے لگتا ہے۔ یعنی جانعالم جب اُس جگہ پر آیا جہان سے اُسنے گھوڑا دوڑایا تھا۔ تو وہ از سرنو سرگرم سفر ہوا۔ اور پھر ایکروز تمازت آفتاب کی شدت سے گھبرا کر ایک روز ایک حوض پر پہونچا۔ اُس حوض مین اسکو انجمن آرا کی شکل نظر آئی اور اُسی مین کود پڑا۔

کسی پُر تعجب اور سخت سے سخت جگہ پر پہونچانا ایشیائی مضمون کا خاص شیوہ ہے۔ چنانچہ مصنف بہار دانش نے جہاندار شاہ کو ایک آب ناپیدا کنار پر پہونچایا ہے۔ اور وہان وہ ایک درویش کی مدد سے عبور کرسکے ہین۔ اسی صورت سے دوسرے مصنفین نے بھی یہ سخت مناظر دکھائے ہین۔ مگر یہ چشمہ اور اس مین کودنا ایک حد تک کسی خاص دماغ کی کاوش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن وہ دماغ سرور کا دماغ نہین ہے۔ بلکہ یہ خیال پہلے مصنف قصہ حاتم طائی کے دماغ مین پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ حاتم طائی جب منیر شامی کی امداد کرنے اور حسن بانو کے سوالون کے جوابات دینے کی غرض سے روانہ ہوا ہے اور پہلے سوال (ایکبار دیکھا ہے پھر دیکھنے کی ہوس ہے) کے جواب کیلئے سرگردان اور پریشان ہے تو ایک ہرے بھرے جنگل مین پہونچا ہے وہان سو گیا ہے اور وہین ایک آدمی سے اسکی ملاقات ہوئی ہے اُسنے راستہ بتایا ہے اور حاتم ایک دشت ہولناک مین پہونچا ہے تو وہان اسکو ایک تالاب ملا ہے۔ حاتم اوس تالاب کے کنارے بیٹھا ہے اوس تالاب مین اُسکو ایک حسین عورت نظر آئی ہے (جو بالکل برہنہ تھی وہ حاتم کا ہاتھ پکڑ کر اُس تالاب مین کود گئی ہے۔ جب حاتم تہ پر پہونچا ہے اور اسکی آنکھ کھلی ہے تو اُسنے اپنے آپ کو ایک مکلف مکان مین پایا ہے۔ جہان لاکھون طرح کی تصویرین دیوارون پر لگی تھین۔ وہان اسکو ایک خوبصورت عورت ملی ہے۔ اور اُسی نے لات مار کر حاتم کو دشت ہویدا مین پہونچایا ہے کسی ذی وقار با اختیار عیار عورت کے ملنے تک مصنف فسانہ عجائب مصنف آرائش محفل کا ہم خیال رہا ہے۔ مگر اسکے ملنے کے بعد اُس کا خیال بدل گیا ہے اور یہین سے اُسنے قصہ حاتم طائی سے قطع نظر کی ہے۔

جانعالم ایک جادوگرنی کے دام فریب مین پھنسا ہے۔ اور اُسکو اسکی ہم جنسی اور ہمصحبتی کی تکالیف سے دوچار ہونا پڑا ہے اُسنے چاہا کہ کسی صورت سے اس مصیبت سے نجات ملجائے۔ مگر وہ ناکام رہا۔

یہ خیال بھی ایک عام اور پامال خیال ہے مشرقی قصہ نویسون کا ایک خاص رنگ ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو ضرور اس قسم کی مصیبت سے دوچار کراتے ہین اور ضرور ایسی جگہ پہونچاتے ہین جہان اُسکو کوئی مصنوعی معشوق ملتا ہے۔ یہ بھی عام دستور ہے کہ ہیرو سے کوئی جوان یا ستر برس کی بڑھیا محبت کرتی ہے اور ہیرو التفات نہین کرتا۔ چنانچہ میر حسن کے مصنف نے یہی کہا ہے بینظیر کا فرخ پری کے یہان پہونچا اور اُس کا اسکی خاطر تواضع مین محبت کے مارے آنکھین بچھا دینا۔ اور میان بینظیر کا متوجہ نہ ہونا بالکل ایسا ہی واقعہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ

فرخ بنظیر کو اُسکے کوٹھے پر سے اُڑا کر لائی تھی اور یہان جانعالم قریب قریب اپنے پاؤن سے اپنی قبر مین پہونچے ہین۔ اگرچہ بہت ممکن ہے کہ سرور کے دماغ نے یہین سے فائدہ اُٹھایا ہو۔ مگر اس داستان کا اصلی فائدہ لکھنؤ کے ایک دوسرے مشہور مصنف یعنی امانت نے اندر سبھا کے لئے اُٹھایا۔ وہ بھی شاہزادہ گلفام کو صاف کوٹھے سے اُڑالے گئے اور دیو سیاہ کی بدولت اوسکو سبز پری کے جال مین پھنسا دیا۔ جہان غریب گلفام کو اپنی تنہائی پر آنسو بہاتے ہوئے یہ شعر پڑھنا پڑے کہ۔

حیف صد حیف کسی نے نہ خبر لی میری کیا عزیزون نے مرے دل سے بھلایا مجھکو
نیند سے آنکھ کسی کی نہ کھلی کوٹھے پر اُٹھ کے موذی کے نہ چنگل سے چھڑایا مجھکو

اگر ہم اسباب کو نظر انداز کردین کہ سرور نے مثنوی میر حسن سے یہ واقعہ نہین لیا تو ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ گل وصنوبر سے ضرور مدد لی گئی ہے۔ شمشاد لعل پوش کا ساتوان لڑکا الماس روح بخش جب مہر انگیز اور دل آرام کے پاس سے رخصت ہوکر چلا ہے تو اسکو بھی حسب معمول ایک پیر روشن ضمیر نے راستہ بتایا ہے۔ مگر وہ بدقسمتی سے ایک باغ مین پہونچکر لطیفہ بانو جادوگرنی کے قبضہ مین گیا ہے۔ اور جب اُسنے لطیفہ بانو سے رخصت چاہی ہے تو ایک معجون کھلادیا گیا ہے اسکے بعد ایک الکڑہی سانپ کی صورت کی شاہزادے کے مونڈھے پر ماری جس سے مسحور ہوکر وہ ہرن کی صورت بن گیا ہے۔

کہنے والا اگر یقین کے ساتھ نہین تو گمان غالب کے ساتھ یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ یہ مضمون وہین سے لیا گیا ہے اور اگر یہ نہین تو یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ خیال بھی پہلے سے موجود تھا سرور کے دماغ نے کوئی نئی بات نہین نکالی ہے۔

ہیرو کو بلا مین پھنسانے کے بعد مصنفین کو اس وجہ سے کہ قصہ جاری رہے فوراً یہ خیال آتا ہے کہ اس دام بلا سے صاحب قصہ کو رہائی دلائی جائے۔ مگر الفاظ کی زبردست اور غیر متزلزل زنجیرون مین وہ پہلے ہی سے جکڑا ہوا ہوتا ہے اسواسطے اُس کا چھڑانا بغیر کسی زبردست غیبی امداد کے دشوار ہوجاتا ہے اور یہ بھی ایک مقام ہے جہان قصہ نویس کے دماغ کو اختراع اور ابداع کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے طریقہ مختلف رکھے گئے ہین۔ کہین کوئی پیر مرد بصورت اصلی نمودار ہوجاتے ہین۔ اور کہین خواب مین جلوہ افروز ہوتے ہین۔ کہین کوئی عمل بتاتے ہین۔ کہین اسم اعظم سکھاتے ہین۔ کہین نقش سلیمانی ملجاتا ہے۔ کہین اوس جادوگرنی کے والدین کو خبر ہوجاتی ہے غرض کہ اسی قسم کے مافوق الفطرت اتفاقات واقع ہوتے ہین اور وہ اسیر دام بلا اس سے رہائی پاجاتا ہے سرور نے بھی اس دائرہ سے باہر قدم نہین رکھا اور اس ترکیب سے شاہزادہ کو چھڑا دیا کہ ایکروز اس خیال سے کہ مبادا کوئی اور جادوگرنی جانعالم کو لے اڑے ایک تعویذ سلیمانی اوسکو دیدیا۔

میر حسن کو بھی یہ موقع پیش آیا ہے لیکن اُنھون نے بنظیر کو ایک کاٹ کا کل دار گھوڑا دلواکر اسکو رہائی سے

قریب کر دیا ہے۔ پھر اُسے ایک اندھے کنوین مین قید کرا کے فرخ کے باپ کو خبر ہونے کے ڈر سے شاہزادہ کو رہائی دلادی ہے

اسکے بعد وہ مقام آتا ہے جہان جان عالم ملکہ مہر نگار کے باغ مین پہونچتا ہے۔ اور ملکہ سے اوسکی ملاقات ہوئی ہے یہ کوئی ایسی بات نہین ہے کہ اس مین افسانہ نویس کو کوئی دقت اور کاوش اٹھانا پڑے، مگر اکثر ہوتا یہی ہے کہ بعد اس دام بلا اور مصیبت کے رہائی و آسایش کا منظر بھی دکھایا جاتا ہے۔ اور کوئی مونس یا رفیق پیدا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تاج الملوک جب گل بکاؤلی لیے لیتا ہے راستہ مین اسکی ملاقات حمالہ کی لڑکی اور دلبر بیسوا سے ہوئی۔ اور ان دونون سے وہ وہ کام نکلے جن سے وہ اپنے مقصد مین کامیاب ہو گیا۔

اسی طرح قصہ گل وصنوبر مین شاہزادۂ الماس روح بخش کو جمیلہ بانو ملی ہے اور اسکی توجہ سے شاہزادے نے رہائی بھی پائی ہے اور اپنے مقصود مین کامیاب بھی ہوا ہے۔

بوستان خیال مین اس خیال کی کوئی انتہا ہی نہین ہے۔ بیسیون جگہ عورتون نے مردون کی اسی صورت سے مدد کی ہے۔ داستان امیر حمزہ مین بھی بار بار اس خیال کا اعادہ اور اس مضمون کی تکرار کی گئی ہے۔ اسی طرح آرایش محفل مین بھی جا بجا یہ مضمون ملتا ہے۔

ملکہ مہر نگار سے ملنے کے بعد جانعالم کو ملکہ مہر نگار کے باپ سے ملایا جاتا ہے۔ اور وہ ایک لوح عنایت فرماتے ہین جو دراصل فتح وظفر کی کنجی اور تمام آفات ارضی وسماوی کی سپر ہے۔ یہ لوح ایک ایسی عام چیز ہے کہ اکثر طلسم کشایان اور رہنوردان غربت کو مل ہی جاتی ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ اسکے بغیر کام چلنا دشوار ہے۔ بوستان خیال مین جا بجا اسی لوح نے مشکل کشائی کی ہے اور دوسرے طلسمی کتابون مین بھی لوح آڑے آئی ہے

اسکے بعد جانعالم انجمن آرا کے شہر زرنگار مین پہونچتا ہے۔ اور وہان پہونچکر لوح کی مدد سے اسکو جادوگر کے قبضہ سے چھڑا لیتا ہے۔ اور اُسکے گھر پر آجاتا ہے۔ اسی طرح سے جا بجا اس لوح کی بدولت فتوحات کثیرہ میسر ہوئی ہین اور یونہی بہت سے آوارگان غربت کی محبوبہ بلاؤن مین پھنسی ہوئی ملتی ہین۔ چنانچہ داستان امیر حمزہ۔ اور بوستان خیال مین برابر انھین کا فرماجرائیون کے طلسم ہین داستان امیر حمزہ سے میری مراد وہ داستان ہے جو فارسی مین تھی اور جو فسانہ عجائب سے بہت پہلے موجود تھی۔

اسکے بعد انجام کار مین وہی شادی کتخدائی انجمن آرا کی ہے جو ہونا چاہئے تھی اسکے لئے کوئی مثال متعین کرنا فضول ہے۔ لب لباب اور خلاصہ تمام مصائب غربت کا یہی ہے اور اکثر ایشیائی قصون کی یہین آکر تان ٹوٹتی ہے۔ مگر اس مسلمہ قاعدہ کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کردہ مسئلہ ہے کہ دولہا اور دُلھن کو کبھی چین سے نہین بیٹھنے دیا جاتا۔ اور آسمان کو انکا دشمن کر کے برابر انکے اوپر بلاؤن کے پہاڑ توڑے جاتے ہین۔ مصنف فسانہ عجائب نے بھی وہی کیا ہے پہلے انجمن آرا کی شادی کرائی ہے اور اسکے بعد تاج الملوک پھول لینے کے بعد محمودہ۔ اور

دلبر بسیوا کو اپنے حبالۂ نکاح مین لایا ہے اسی طرح میان جانعالم نے بھی اپنی رفیقہ قدیم - مہر نگار سے شادی کرلی ہے -

سب سے بڑا کارنامہ اس داستان کے بعد شروع ہوتا ہے اور بادی النظر مین معلوم ہوتا ہے کہ سرور کے دماغ نے ایجاد و اختراع سے کام لیا ہے - یعنی یہ کہ وزیر زادے نے شہزادۂ جانعالم کو دغا دی ہے شہزادہ بندر بنا ہے - وزیرزادہ نے اپنے قالب کو چھوڑ کر شہزادے کے قالب مین حلول کیا ہے مگر یہ بھی کوئی نئی بات نہین ہے - ابن نشاطی دکنی کی کتاب موسومہ بہ مثنوی پھول بن ترجمہ بساتین فارسی اسی الٹ پھیر پر مبنی ہے اور اسی وجہ سے ایک نقاد نے یہ فقرہ لکھا ہے کہ عجب نہین فسانۂ عجائب اسی کو دیکھکر لکھی گئی ہو - اس کتاب مین تمام تر ایک قالب سے دوسرے قالب مین روح کے لیجانے کا بیان ہے - سرور کے یہان قصہ کا بڑا دارو مدار اسی ایک عنوان پر ہے -

اسکے علاوہ الف لیلہ جو ایک قدیم کتاب ہے اوس مین اس قسم کے قصے موجود ہین کہ آدمی بکری وغیرہ بنا دیا گیا - چنانچہ ابتدا ہی مین سوداگر اور جن کا قصہ اس قسم کا لکھا گیا ہے کہ تین بڈھون نے اپنے قصے بیان کرکے بڈھے سوداگر کی خطا جن سے معاف کرائی ہے انیہ وغیرہ کا قصہ بھی ایسا ہی ہے - غرضکہ تبدیل قالب کا جادو بھی مدتون سے ایشیائی قصہ نگارون مین پھیلا ہوا ہے - اور داستانون کی داستانین اسی سے بھری ہین - کسی خاص شخص کی دماغی پیداوار نہین ٹھہر سکتی - اور اسکی ایجاد کا سہرا بھی سرور کے سر نہین رہتا -

جانعالم کا بندر کے قالب کو چھوڑ کر طوطے کے قالب مین آنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ انسان کے قالب کو چھوڑ کر بندر کے قالب مین آنا - اور یہ تو ایک مشہور بات ہے کہ بہت سے لوگون کی پرانی کہانیون مین طوطے کے قالب مین روح پائی جاتی ہے -

اسی طرح وزیر زادے کا بکری کے بچہ کے قالب مین آنا - اور پھر جانعالم کا توتے کے قالب کو چھوڑ کر انسان بنجانا یہ سب اُسی تبدیل قالب والے جادو کے توابعات مین سے ہین -

اسکے بعد جب جانعالم معہ انجمن آرا و مہر نگار تشریف لیچلے ہین تو اُسی جادوگرنی نے اپنی بدمعاشیان شروع کی ہین اور تمام لشکر کو نصف پتھر کا بنا دیا ہے - یہ نصف پتھر کے جسم کا معاملہ اتنا عام ہے کہ اسکے لئے کچھ لکھنا بیکار ہے - بیچاری بکاؤلی بھی مدتون راجہ اندر کی بد دعا سے گلزار نسیم مین نصف پتھر کی بنی ہوئی مٹھ کے اندر بند رہی ہے - اور اُس نے بھی برسون اسی طرح دنیا کی ہوا کھائی ہے - اور سیکڑون اسیران بلا کو یہ واقعہ پیش آیا ہے جسے اکثر لوگ جانتے ہین انکا لکھنا بیکار ہے - مگر ہان نصف جسم کے پتھر ہونے کے بعد ہی ہمیشہ کسی مشکل کشا کی ضرورت پڑتی ہے - اسی واسطے یہان ملکہ مہر نگار کے والد کو جادوگر سے لڑانے کی صورت پیش آئی - اور کسی نہ کسی طرح قضیہ کا انفصال ہوا - لڑائی مین بھی وہی تبدیل قالب کا قصہ ہے - یعنی جادوگر کی شیرنی تھی - اور ملکہ مہر نگار کے والد شیر بنے یہ لڑائیان سیکڑون جگہ طلسمی قصون مین ملتی ہین اور اس لحاظ سے ان مین کوئی ندرت نہین ہے جنگ کے بعد جیسا کہ دستور ہے

ہمیشہ پیر مردون کی فتح ہوتی ہے اور جادوگرون کو شکست یہان بھی وہی ہوا۔

اسکے بعد شاہزادے معہ ہر دو بیگم کے چلدیتے ہین اور خدا معلوم کس نئے راستہ کا سفر ہے کہ بیچ مین دریائے شور بھی آجاتا ہے۔ حالانکہ پہلے ایسا نہین ہوا تھا۔ اب یہ سب جہاز پر سوار ہوتے ہین۔ جہاز کی سواری گویا تباہی کا نشان ہے۔ اور قصہ نگارون کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے ہزارون عشاق کے بھرے ہوئے جہاز تباہ ہوئے ہین۔ اور لطف یہ ہے کہ موت ایک کو بھی نہین آتی سب تختے پر ترتے ترتے کنارے پہونچے ہین۔ یہ محفوظ مضمون سرور نے بھی دیکھا۔ اور الف لیلہ والے سندباد جہازی کی طرح جانعالم کا جہاز بھی تباہ کردیا۔ اور پھر بال بال بچالیا۔ اور پھر ایک باکمال جوگی سے ملادیا۔ یہان بھی جان عالم کو وہی تبدیل قالب کا لٹکا جوگی نے سکھایا ہے۔ جو آگے چلکر بہت کام آیا ہے۔

اسکے بعد مصنف نے قصہ کا رخ دوسری طرف پھیر دیا ہے یہ کہ جان عالم ایک دریا پر پہونچا اور وہان اسکو ایک لعل پانی پر بہتا ہوا ملا۔ پھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سے لعل ملے۔ وہ انکو دیکھتا ہوا ایک عمارت کے قریب پہونچا جہان اوسکو باوجود تلاش کے بھی دروازہ نہ ملا اسنے پھر وہی تبدیل قالب کیا۔ اور بلبل بنکر اندر پہونچا۔ وہان ایک بنگلہ تھا۔ بنگلہ مین دیکھا کہ کوئی دوشالہ اوڑھے سوتا ہے۔ اور یاقوت کی تپائی پر پھولون کا دستہ نصف سرخ نصف سفید رکھا ہے۔ مگر دوشالہ اُٹھا کر جو دیکھا تو وہ ایک بے سر کی لاش تھی۔ اور اسکے بعد معلوم ہو گیا کہ وہ انجمن آرا ہے ایک دیو کے قبضہ مین گرفتار تھی اور جسے سفید دیو کی امداد سے رہائی دلائی گئی ہے۔

(باقی) ——— (باقی) "نقاد"

ملنے کا پتہ ہے: آنریری سیکرٹری

طرز زندگی

مہتمم نسیم بکڈپو ایک آنہ فنڈ لکھنؤ

منیجر نسیم بکڈپو ایک آنہ فنڈ لکھنؤ

مینجر کا پتہ:

کا آخری رعایتی اعلان

نسوانی تعلیم و تربیت پر ایک نہایت ہی لاجواب تصنیف ہے جسے فسانہ کی صورت مین لکھا گیا ہے اتنی زیادہ دلچسپ اور عبرت خیز ہے کہ شاید و باید یہ کتاب ایک شفیق استانی کی ضرورت کو رفع کرتی ہے اسمین پند و نصائح کے خزائن پوشیدہ ہین۔ اسکا مقدمہ شوکت دولھن صاحبہ نے قلمبند فرمایا ہے جو کتاب سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کتاب کا ہر گھر مین ہونا انتہائی ضروری ہے اسلئے کہ اسمین ازدواجی زندگی پر پوری بحث کی گئی ہے۔ شوہر اور زوجہ کے تعلقات کیسے ہونا چاہئین اسمین وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد زوجین مین کبھی نااتفاقی نہین ہو سکتی۔ حجم تقریباً ۲۰۰ صفحہ کاغذ لکھائی اور چھپائی نفیس ٹائیٹل خوشرنگ قیمت عہ (۲۰) اگست ۲۹ء تک ۱۲/

ریختی گوئی کا موجد کون تھا؟

ریختی کی ایجاد کا سہرہ تمام تذکرہ نویسون نے سعادت یار خان رنگین کے سر باندھا ہے مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہین
،،ریختی کا شوخ رنگ سعادت خان رنگین کا ایجاد ہے،، (آب حیات)

اور ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔
،،اس دور مین میان رنگین سب سے نئے گلدستے بنا کر لائے اور اہل جلسہ کے سامنے سجائے یعنی ریختے سے ریختی نکالی،، (آب حیات)

خود رنگین نے اپنے دیوانِ ریختی کے دیباچے مین۔
،،گندہ بروزہ باخشکہ خوردن ہر چند گندہ مگر ایجاد بندہ،،

لکھکر ریختی گوئی کو خود اپنے آپ سے نسبت دی ہے اور نہ صرف یہی بلکہ انشا پر حملے بھی کرتے ہوئے اسی کا ادعا ہے کہ:۔

ریختی کہنی اجی رنگین کا یہ ایجاد ہے منہ چڑھاتا ہے موا انشا جیا کس واسطے

زبس ہے ریختی ایجاد رنگین اسی باعث کہا کرتا تھا اکثر
موا انشا بھی اب کہنے لگا ہے چہ خوش اس چیونٹی کے بھی ہوئے پر

مولانا عبد الحی مرحوم فرماتے ہین:۔
،،شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ رنگین کی طبیعت ایجاد پسند واقع ہوئی تھی اسی بنا پر ریختہ سے ریختی نکالی جس کو ان کے لنگوٹئے یار میر انشاء اللہ خان نے چمکا دیا اور لکھنؤ مین یہ رنگ خوب مقبول ہوا،، (گل رعنا صفحہ ۲۶۷)

مولانا عبد السلام ندوی فرماتے ہین:۔
،،اس سے بڑھ کر یہ کہ اسی زمانے مین سعادت یار خان رنگین نے جنکو اکثر پردہ نشین عورتونکی صحبت مین رہنے کا اتفاق ہوا تھا، ریختی نکالی اور ایک مستقل دیوان عورتون کی زبان مین مرتب کیا،،
(شعر الہند جلد اول صفحہ ۸۸)

قادر بخش، صابر، وغیرہ رنگین کو ریختی کا موجد نہین تصور کرتے بلکہ انشا اللہ خان انشا کو یہ اعزاز دیا جاتا ہے

البتہ رنگین مشیر بنائے جاتے ہین مگر خود انشا لکھتے ہین :-

"اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوائی ریختہ آپکو جانتا ہے رنگین تخلص ہے ایک قصہ لکھا ہے اسی مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے، رنڈیون کی بولی اس مین باندھی ہے میر حسن پر زہر کھایا ہے ہر چند اس مرحوم کو بھی شعور نہ تھا "بدر منیر" کی مثنوی نہین لکھی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہین، بھلا اس کو شعر کیونکر کہئے، سارے لوگ دلی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہین"

چلی وان سے دامن اُٹھاتی ہوئی کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوی

"سو اس بیچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے کوئی پوچھے۔ بھائی! تیرا باپ رسالدار مسلم لیکن بیچارا برچھی بھانے کا رکھنے والا تیغے کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہان سے ہوا، اور شہدپن جو بہت مزاج مین رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئین چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے اسواسطے کہ بھلے آدمیون کی بہو بیٹیان پڑھ کر مشتاق ہون، بھلا یہ کلام ہے۔ اور ایک کتاب بنائی ہے اس مین رنڈیون کی بولی لکھی ہے" (دریائے لطافت)

مگر مولانا عبد الحی نے ہاشمی بیجاپوری کو ریختی گو اور انکی یوسف زلیخا کو ریختی قرار دیا ہے اور خاکی کے دو شعر نقل کر کے اسکی ریختی گوئی کا ثبوت بھی دیا ہے۔ مولانا نے ہاشمی کے ہندی آمیز اشعار کو ریختی تصور فرمایا ہے اور اسی طرح خاکی کے اشعار کو بھی۔ خاکی کے جس دیوان کا حوالہ مولانا نے اپنے تذکرہ مین دیا ہے وہ ہماری نظر سے گزر چکا ہے جس مین باوجود تلاش کے ہمین کوئی شعر ریختی کا نہ ملا بلکہ ہندی آمیز شعر اکثر ہین، جن پر مولانا کو ریختی کا دھوکا ہوا۔ مولانا عبد السلام ندوی بھی ہمارے ہم خیال ہین وہ لکھتے ہین کہ۔

"ہمارے نزدیک امیر خسرو کے زمانے سے لیکر قدما کے دور تک کے جو اشعار ان تذکرہ نویسون نے نقل کئے ہین انکو ریختی نہین کہہ سکتے بلکہ وہ ہندی شاعری کے طرز و روش پر کہے گئے ہین جس مین عورت کو عاشق اور مرد کو معشوق قرار دیا گیا ہے" (شعر الہند جلد دوم بیان ریختی)

انہین پر نظر کر کے ہم نے بھی اپنے مضمون "ریختی اور رنگین" مطبوعہ رسالہ قوس قزح" لاہور (سالنامہ سنہ ۲۷ء) مین رنگین ہی کو ریختی کا موجد قرار دیا تھا مگر محمد صدیق قیس کے کلیات کے مطالعہ کے بعد ہمین اپنی رائے بدلنی پڑی۔

قیس حیدر آباد کے مشہور شاعر ہین تاریخ "گلزار آصفیہ" مین انکا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ۔

"محمد صدیق قیس ہمشیر زادہ شیر محمد خان ایمان تخلص شعر نازک و دلپسند بوضع خواجہ میر درد و میر تقی میر میگوید و مضامین دلچسپ و نوبنو رنگارنگ می آرد از نزد مہاراجہ بہادر دو روپیہ یومیہ نوازہ

نزد امیر کبیر[1] دو روپیہ یومیہ روزمی یابد نہایت مرد خلیق خوش فکر درین ولا بمذاق کم کسے

میرسد۔ ... ... صاحب دیوان است کہ نام دیوان خود "پیشکار"

داشتہ است" (گلزار آصفیہ صفحہ ۴۵۴ و ۴۵۵) -

مولوی عبد الجبار خان صوفی ملکاپوری لکھتے ہین۔

"قیس تخلص محمد صدیق نام آپکا اصلی وطن حیدر آباد دکن ہے آپ کے بزرگ اکثر سرکار عالی نظام مین وقائع نگاری اور اخبار گوئی کی خدمات پر مقرر تھے چنانچہ آپکے نانا محمد عاقل نائک مخبرین کے افسر تھے اور آپ کے خالو شیر محمد خان ایمان اعظم الامراء ارسطو جاہ کے مصاحب تھے اور شعرا مین استاد الشعراء مشہور تھے، آپ نے نشو ونما کے بعد سن شباب مین بقدر ضرورت فارسی عربی پڑھ کے تحریر و تقریر کی استعداد حاصل کی اور موروثی وقائع نگاری و تاریخ دانی کا کمال پیدا کیا، شعر گوئی بھی شروع کی، کلام کی اصلاح خالوئے بزرگوار سے لیا کی - - - - - -

- - - - - - آپ نے ایک دیوان ریختی شاہجہان آباد کی بیگمات کی بول چال مین لکھا

فقیر مؤلف کو آپکا دیوان ملا تھا - - - - - - آخر ۱۲۳۰ھ مین جان بحق ہوے"

(تذکرۂ شعراء دکن جلد دوم صفحہ ۹۴۱ و ۹۴۲)۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہین۔

"محمد صدیق قیس متوفی ۱۲۳۰ھ شیر محمد خان ایمان کا ہمشیر زادہ خواجہ میر درد اور میر تقی میر کی وضع کا پیرو تھا غزل کے ساتھ قصائد بھی مشہور ہین" (دکن مین اردو صفحہ ۱۲۹)

قیس مہاراجہ چندو لال کے معاصر تھے اور بقول صوفی ملکاپوری اور نصیر ہاشمی ۱۲۳۰ھ مین انتقال کیا، اور رنگین کے متعلق مولانا عبد الحئی فرماتے ہین کہ اسّی سال کی عمر مین ۱۲۵۱ھ مین وفات پائی (ملاحظہ ہو گل رعنا ص ۲۶۵) اس طرح قیس اور رنگین معاصر بھی تھے اور پھر قیس نے رنگین سے اکیس سال قبل وفات پائی۔

قیس کے کلیات مین (۱۴۱) سطری مسطر کے (۴۴) صفحات ریختی کے بھی موجود ہین جو ہاشمی، خاکی، رحمان، ورحیم، معاصر ولی کے ہندی آمیز ریختہ سے بالکل جدا اور رنگین کے رنگ مین رنگے ہوے ہین، قیس اور رنگین کی ریختی کا مطالعہ کرنیوالا صرف دو نتیجون پر پہونچ سکتا ہے کہ قیس نے رنگین کے دیوان کا جواب کہا ہے یا رنگین نے قیس کے دیوان کا۔ مگر ہماری رائے اسمین یہ ہے قیس نے اسقدر غیر معمولی شہرت حاصل نہین کی تھی جو انکا دیوان حیدر آباد سے باہر نکل کر رنگین تک پہونچتا اور نہ قیس کی وفات سے قبل یعنی ۱۲۳۰ھ سے پہلے رنگین ہی کو اسقدر شہرت حاصل ہوئی تھی جو انکا دیوان حیدر آباد تک آتا ہماری رائے مین قیس اور رنگین نے الگ الگ کام کیا ہے یعنی قیس نے الگ ریختی کہی ہے اور رنگین نے جدا!

[1] نواب شمس الامرا امیر کبیر

رنگین اپنی ریختی کے دیوان کے دیباچے مین لکھتے ہین۔

"بعد حمد رب العالمین اور نعت سید المرسلین خاکپائے شعراء نکتہ چین سعادت یار خان رنگین عرض کرتا ہے کہ بیچ ایام جوانی کے یہ نامہ سیاہ اکثر گاہ بیگاہ عرس شیطانی کہ عبارت جس سے تماش بینی خانگیون کی ہے کرتا تھا اور اس قوم کی ہر ایک فصیح کی تقریر پر دھیان دھرتا تھا ہر گاہ چند مدت جو اس وضع پر اوقات بسر ہوئی تو اس عاصی کو انکی اصطلاح اور محاورون سے بہت سی خبر ہوئی پس واسطے انہین اشخاص کے عام بلکہ خاص بیویون کو انکی زبان مین اس بے زبان ہیچمدان نے موزون کرکے ترتیب دیا"

(دیکھو دیباچہ ریختی رنگین و انشاء مطبوعہ نظامی پریس بدایون)

قیس کے کلیات مین ریختیون کے آغاز پر۔

"منتخب دیوان ریختی قیس محاورۂ بیگمات شوخ محل بادشاہی شاہجہان آباد"

لکھا ہوا ہے، گویا ریختی، قیس کی نظرون مین محلات شاہی شاہجہان آباد کی شوخ چشم بیگمات کا محاورہ تھی، ملاحظہ کیجئے کہ قیس اور رنگین مین کتنا فرق ہے وہ "عرس شیطانی" مین جاکر "خانگیون کی تماش بینی" کرکے ریختی کہتے ہین اور یہ حیدرآباد مین بیٹھے ہوئے "دلی کی شوخ چشم بیگمات" کا تصور کرکے انکے محاورے استعمال کرتے ہین۔ گو دونون کی رسائی ایک ہی نقطے پر ہوتی ہے اور ایک ہی جگہ سے چل کر ایک ہی جگہ ملتے ہین مگر خیال دونون کا جدا جدا ہے،

بعض زمینون مین قیس اور رنگین دونون کے شعر موجود ہین دیکھئے۔

قیس

تو نے چڑیا وہ بنائی کہ ابھی بو اُٹھے — تیرے ہاتون کے مین قربان گئی مُغلانی
اتنے کیون موتی لگائے ارنی دان دوا — جھک گئے بوجھ سے موتی کے میرے کان دوا
ٹھیک تین مونڈھے تو اس کرتی کے نیکن تنا — تنگ ہوا ہے گلے مین ہے گریبان دوا

رنگین

قہر ہے ربط ہزار جائے یہ چڑیا کم بخت — تیپہ ڈوری یہ عجب ڈھب کی کسی مُغلانی
مجھ نگوڑی نانِ بے جاہ کا چل ور ددا — جھوٹے منہ کا تیرے جائیگا اڑ نور دوا
پک گیا ہی تیرے ہاتون نے کلیجہ میرا — تجھ کو دون بیجلیون کو گر ہو میرا مقدور دوا

افسوس ہے کہ میرا مختصر کتب خانہ گلبرگہ شریف مین بے ترتیب پڑا ہوا ہے اور مین حیدرآباد مین بیٹھا ہوا روا روی مین یہ مضمون لکھ رہا ہون اسوقت رنگین کے دیوان کا کوئی نسخہ میرے پیش نظر نہین ہے ورنہ اور شعر بھی اسی طرح بالمقابل نقل کرتا۔

کپڑے لتون کا تذکرہ اپنی ریختیون مین جس طرح رنگین نے کیا ہے اسی طرح قیس نے بھی کیا ہے، دیکھئے۔

چلنپا ٹکا تھا جس کے گریبان کے اوپر — کرتی وہ مری کیا ہوی پستائی جمیلا
لاڈ بازار[1] کو جاتی تو ہے صدقے تیرے — بھول مت یاد سے لے آ مری ڈوری اَنّا

[1] حیدرآباد کے ایک بازار کا نام ہے جو بفضلہ اب بھی اسی نام سے موسوم اور موجود ہے ۱۲

یوالادے ایسا طرح دار جوتا ۔۔۔ چھلا یورے[1] کا کوئی دھوان دھار جوتا
کاہے کو بہنون گی باجی مین تمھاری انگیا ۔۔۔ ایک سے ایک میرے پاس ہے بھاری انگیا
جسکی چڑیا کا وہ عالم تھا کہ اب اڑ جائے ۔۔۔ مین نے باجی سے جو کل شرط مین ہاری انگیا
ٹوکیان ڈھیلی ہین اور تنگ پھاؤن مین ددا ۔۔۔ اس طرح کوئی بھی سیتا ہے گنواری انگیا
کیا بنالائی ہے منہیارن ممانی چوڑیان ۔۔۔ مین نہ پہنون گی کبھی یہ آسمانی چوڑیان
بڑ گئین جو چوڑیان تو بد گئین کڑہتی ہے کیا ۔۔۔ ہین بے چل ہاتھ ڈھیلا چھوڑ جانی چوڑیان
قیس پر کرتے تھے فرمائش کہ یون جوڑا بنا ۔۔۔ سبز، سالو ورنہ دھانی، آسمانی چوڑیان
آگے پیچھے عاشق و معشوق کی گوٹین لگا ۔۔۔ دہار چھلا دہار کے کل اس مین دھانی چوڑیان

جانؔ صاحب طرحدار اصیل رکھتے ہوے گھبراتے تھے کہ:-

جان سولی پہ رہیگی میری بھیا منصور ۔۔۔ بد نظر وہ ہین نہ رکھون گی طرحدار اصیل

مگر قیسؔ نفیس سے نفیس دھوان دہار اصیل رکھتے ہین:-

ایکے رکھی ہون دوگانا وہ طرحدار اصیل ۔۔۔ نوجوان پتلی سی، گوری سی دھوان دہار اصیل

مگر اسپر بھی اصیل کو نزدیک بلانیکی ہمت نہین ہوتی اعلیٰ دماغی تو دیکھیے:-

ابٹنا مل کے نہا۔ آتی ہے بو تجھ مین سڑی ۔۔۔ کتنی گندی ہے اری دور ہو مردار اصیل

قیسؔ کو باوجود معصیت کے امید مغفرت تھی۔

بخشنے والا ہے صاحب میرا دیر وا اتا ۔۔۔ یہ تو کہتی نہین مین نیک ہون بدکار ہون مین

مگر جانؔ صاحب کا اور ہی عالم ہے کہتے ہین۔

اپنے پتے سے نہ باندھو مجھے صاحب چھوڑو ۔۔۔ لاکھ مکارون کی مکار ہون بدکار ہون مین

اوڑھنی اور ریختی گوؤن نے بھی لکھی ہے مگر قیسؔ نے ایک خاص بات پیدا کی ہے۔

کیا مین کرون گی لیکے تیری ہلکی اوڑھنی ۔۔۔ لادے ددا وہ مجھ کو جل جل کی اوڑھنی
چھیپے کا اسپہ کام تھا کیا خوب واچھڑے ۔۔۔ کوٹھے پہ جو لٹکتی تھی وہ کل کی اوڑھنی
شعلہ سا ایک آنکھ مین میرے چمک گیا ۔۔۔ سر پر سے انکے وہ جو کہین ڈھلکی اوڑھنی

رنگینؔ نے اُسی خانگیون کی تماش بینی کے مدنظر ”ڈولی“ کا استعمال کیا ہے مگر قیسؔ بیگمات شوخ چشم کی خاطر منگواتے ہین تو پینس

---

[1] یہ شاید کسی گاؤن کا نام ہے جہان جوتے عمدہ تیار ہوتے تھے ہونگے۔

مجھ کو رخصت دے اب میرے گھر سے — لیکے بینس اصیل آئی ہے

ڈولی "بینس" ہی کا امتیاز نہیں ہر بات میں قیس نے بیگماتی شان نبھائی ہے۔

کل پاؤں میرے دابنے جو آئی جمیلا — نیند آ گئی تلوؤں کو جو سہلائی جمیلا

بی چاندنی سے کہدو ہو فرش کی تیاری — آتی ہے میرے گھر کو مہمان میری گوکا

ایسا نہو محل میں کوئی دیکھ لے تجھے — باندی کنارے بیٹھ کے دھولا ازار بند

راحت افزا سے یہ کہیو اجی گلشن بوبو — ہاتھ دھونے کو میرے لائیو بے سن بوبو

تکیہ جوں جوں کا تو زانو کے تلے دھر دینا — بیٹھے مسند پہ جب آ کر میری سمدھن بوبو

قیس نے ہر ایک غزل میں ایک اور بعض وقت دو دو قطعے بھی کہے ہیں۔

دوگانا تو کیا ہے کسو کے بھی آگے — اری قیس کا کرنہ مذکور باندی

قسم ہے علی جی کی کہتی ہوں تجہ سے — کروں گی تیری ہڈیاں چور باندی

ہاتھ سے تیرے اے ددا۔ ناک میں جان ہے میری — ایکدن ایسا کر اری زہر تو ہی کھلا مجھے

کاہیکو طعنے[1] وعنے تو دیتی ہے اٹھتے بیٹھتے — جینے سے جی تنگ ہے آتی نہیں قضا مجھے

بعض شعر بہت ہی صاف اور عمدہ کہے ہیں۔

ٹکڑے ہوی جاتی ہے زبان مارے طلب[2] کے — راتب کا میرے پان بھی منگوا لی جمیلا

نل ٹھہر گئے پیڑو میں میرے درد ہے میٹھا — مت چھیڑ میں ہوں جان سے حیران دوگانا

تیری گود میں تو میں کھیلی ہوی ہوں — مری بات کا مت برا مان آجا

اری قیس کے میں تو جاتی ہوں گھر کو — مرے ساتھ چل تو بھی مہمان آجا

غرض دیکھ کر تو بھی خوش ہو گی دل میں — عجب طور[3] کا ہے وہ انسان آجا

ہوتی ہوں تیرے پرسے قربان میری کوکا — منہ پر تو دوشالے کو مت تان مری کوکا

رسوائی کا مت، اب یہ خلل جائے تو اچھا — باندی تو میرے گھر سے نکل جائے تو اچھا

میں آئی تھی میلے میں دوگانا سے خفا ہو — جی دو گھڑی واں میرا بہل جائے تو اچھا

تم ہو پائل[4] چمکتی ہے بجلی ٭ — بیٹھو پردے میں جاؤ باجی جان

دیکھ انا تجھے دیتی ہوں میں سر کی سوگند — جوک جاتی ہے میرے واسطے لاری گڈیاں

کہدو یہ دوگانا سے میں شام کو آتی ہوں — کل پیر بلاقے[5] کی درگاہ کو جاتی ہوں

---

[1] یعنی طعن تشنیع [2] عادت [3] طرح [4] پائل اور بچلن لڑکیوں کو بجلی چمکتے وقت ہٹا دیتے ہیں عورتوں کا خیال ہے کہ ان پر بجلی گرنا چاہتی ہے [5] نہ جانے یہ پیر بلاقے کون تھے آج تک ہم نے نام بھی نہیں سنا۔ (ت ک)

مدپر تو جوانی کے ہے اب چور رز ناخی بھرتی نہین آنکھون مین تیرے حور رز ناخی

بعض جگہ ایسے والہانہ شعر کہدئے ہین کہ جی لوٹ جاتا ہے۔

کیا جانئے کیا ہوگی جوانی مین یہ آفت کوکی بھی میری ایک دھوان دہار ہے گوئیان

کیا دھوان دہار ہے پرکالۂ آتش آف رے آگ لینے جو وہ آئی تھی پڑوسن بُوبُو

بعض بعض پتے پتے کی باتین بھی کہہ گئے ہین مگر بڑے مزے سے،

رات مجھے جگا جگا تونے کیا ہے رُت جگا اب بھی نہین ہے جی بھرا سونے دے مت جگا مجھے

رات کوٹھے پہ تیری دیکھ لی چور ہی اتا کالی اوپر تھی چڑھی نیچے تھی گوری اتا

کبھی میلا دیکھنے کے لئے نکلتی ہین انا مٹکتی تھرکتی، بے دھڑک آگے آگے ہولیتی ہے تو فرماتی ہین:۔

انا تجھے کیا ہوگیا چھاتی پہ سے کپڑا اس بھیڑ مین چھاتی کوئی مل جائے تو اچھا!

مصرعۂ ثانی عریاں ہے مگر بے ساختہ ہے۔

ایک شعر اور اسی رنگ کا کہا ہے۔

لوگ سُن لینگے ٹھر جا کم بخت بولتی میری چار پائی ہے

قیس نے بعض کھُلی ہوی باتین بھی کہی ہین جو بیہودگی کی حد تک پہونچ گئی ہین نمونتاً بعض مصرعے نقل کئے جاتے ہین۔

ع۔ خالی جو لڑاتی ہے بلبل تو لڑاتی ہون

یا ع۔ کل کا تو دن ہے باقی پرسون مین نہاتی ہون

یا ع۔ بن گیا پھول سمٹ غنچۂ سوسن بُوبُو

ایسے شعر بہت کم ہین۔ رنگین اور جان صاحب کیطرح اکثریت نہین۔

ایک شعر سے صرف اسقدر پتہ چلتا ہے کہ قیس نے عنفوان شباب مین ریختی کہی ہے اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔

قیس کو مین نے دیکھی ہون کل سبزہ بھی آغاز نہین اچھی اٹکی باجی تو نے جاکر گورے بالم سے

ایک دکھنی شاعر کا جسنے کبھی دلی کی صورت نہ دیکھی ہو اس بے تکلفی سے "بیگماتی اردو" کا استعمال کرنا نہ صرف حیرت انگیز بلکہ تعجب خیز بھی ہے، قیس نے دلی کی زبان ہی استعمال نہین کی بلکہ جابجا ضرورتاً دکھنی محاورے بھی ستعمال کئے ہین اور اس لطف کے ساتھ کہ دکنیت کا شبہ تک نہین ہوتا۔ بخلاف ریختی کے قیس کا ریختہ ایسا نہین ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ قیس دکھنی تھے اور قدم قدم پر دکنیت نظر آئیگی۔

"سید تمکین الکاظمی"

باب المراسلۃ والمناظرہ

ایک صاحب جن کا نام ضیاء الدین احمد خاں ہے اور جو ضلع اٹاوہ میں گرداور قانون گو کی خدمت پر مامور ہیں نگار کے قدیم خریدار تھے۔ اِن کی میعاد خریداری چونکہ جون سنہ ۱۹۲۹ء میں ختم ہوتی تھی اس لئے منیجر نگار نے حسب معمول اِن سے آئندہ کی خریداری کے متعلق استصواب کیا۔ جس کا جواب یہ آیا کہ "بعض حالات کی بنا پر جن کا تعلق معتقدات سے ہے وہ آئندہ خریداری سے معذور ہیں"۔ منیجر نے ان کو لکھا کہ "اگر نگار کے مذہبی مقالے آپ کے معتقدات کے خلاف ہیں تو بھی اُن کا مطالعہ آپ کو کرنا چاہئے تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ ایک مذہب کی صحت و سقم کا کیا معیار قائم ہو سکتا ہے۔ علاوہ اس کے نگار میں مذہبی حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے، اگر آپ اُسکو نظر انداز کر دیں تو بھی کافی سامان آپ کے ادبی و علمی ذوق پورا کرنے کے لئے اس میں موجود ہوتا ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھایئے" اس کے جواب میں اُن کی حسب ذیل تحریر موصول ہوئی:۔

"مکرمی جناب منیجر صاحب۔ تسلیم۔ صحیفہ گرامی موصول ہوا۔ مجھ کو خود نگار سے جدائی کا بیحد صدمہ ہے۔ مگر اس کے وجوہ یہ ہیں۔ آپ ہی مشورہ دیں کہ مجھکو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔

مجھ کو نیاز صاحب کے ہموطن ہونے کا فخر حاصل ہے اور مجھے نگار سے خاص اُنس ہے۔ والد ماجد قبلہ نہایت متشدد اور سادہ مسلمان ہیں اور ہر قسم کی بدعات کے دشمن۔ جب کبھی وہ یہاں تشریف لائے، نگار کو ملاحظہ فرمایا اور اکثر مذہب کے معاملہ میں نگار کی روش پر سخت اعتراض کیا۔ میں اکثر تاویل سے کام لیتا اس مرتبہ یعنی جون کا نگار جس میں نیاز صاحب نے موجودہ ارکان نماز کو غیر قرآنی ثابت کرنے کا دعویٰ کیا ہے اِن کی برداشت سے باہر ہو گیا اور انھوں نے سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اس رسالہ کا مطالعہ بند کر دو۔ ورنہ میری سخت ناخوشی کا باعث ہوگا۔ اب میں مجبور ہو گیا۔ والدین کے ارشاد کی تعمیل تمام دنیاوی امور پر بہر حال مقدم ہے۔ ہر چند مجھے نیاز صاحب کے بتائے ہوئے مذہب سے اتفاق نہیں ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا اثر میرے قلب پر ضرور ہے اور اب بعض سوالات اضطراراً فقہ و حدیث کے متعلق میرے دل میں ایسے پیدا ہو گئے ہیں جنکا جواب میں نہیں دیکھتا اور نہ کسی سے پوچھ سکتا ہوں کیونکہ ان کا دریافت کرنا ہی میرے لئے بارگاہ دیوبند و بریلی سے فتوائے کفر و شرک صادر کرا سکتا ہے "متبع نیاز" کا خطاب پہلے ہی سے مل چکا ہے۔.........."

اس تحریر نے چونکہ بعض اصولی بحثیں پیدا کر دی ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف تحریر کی تنقید اور صاحب تحریر کی تسکین کے لئے بلکہ تمام ناظرین نگار کو آگاہ کرنے کے لئے مجمل طور پر اُن کو صاف کر دیا جائے۔

سب سے پہلے تو مجھے اُن حضرات کی ذہنیت پر تاسف کرنا ہے جن کے نزدیک مذہب نام ہے صرف کورانہ تقلید کا اور اس قدامت

پرستی کا جو نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہے۔ گویا مذہب کوئی ترکہ یا جائداد ہے جو میراث میں ہاتھ آتا ہے اور خود اپنے ذہن و عقل سے اُسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ حالانکہ مذہب بالکل انفرادی یقین و اطمینان کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص کورانہ تقلید کے بعد اپنے نفس کو مطمئن پاتا ہے تو کوئی حرج نہیں، اس کا مذہب وہی درست ہے اور اس کو اس راستہ سے نہ ہٹنا چاہئے کیونکہ فطرت کی طرف سے اس کے دماغ میں تفتیش و تحقیق کی اہلیت موجود نہیں ہے، لیکن اگر اس کے دل میں کوئی خلش پیدا ہوتی ہے، کوئی اُلجھن موجود ہے (جیسا کہ صاحب تحریر کے دل میں پائی جاتی ہے) تو پھر اس کا خاموش بیٹھ جانا محض اس خیال سے کہ باپ خفا ہوگا یا دیوبند اور بریلی سے کفر کا فتویٰ صادر ہو جائے گا، اسقدر عجیب و غریب فلسفہ قبول مذہب کا ہے کہ کم از کم میرا ذہن اس کے فہم سے بالکل قاصر ہے۔

اگر میرے مذہبی مقالات نے میرے محترم دوست کے دل میں کوئی کیفیت مستفسرہ پیدا کر دی ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ان کا یقین سابق متزلزل ہو گیا ہے اور وہ کبھی اپنے آپ کو راسخ الاعتقاد نہیں کہہ سکتے جب تک ان کی خلش دور نہ ہو جائے اور اس کی تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ یا تو وہ خود غور کر کے کسی نتیجہ پر پہونچیں یا دوسروں سے دریافت کر کے یکسوئی حاصل کریں۔ ایسی صورت میں تو نگار کا مطالعہ اور ضروری ہو جاتا ہے نہ کہ اس سے احتراز و بیزاری۔ علاوہ اس کے یہ بھی ایک اہل مذہب (اور خصوصیت کے ساتھ ایک مسلمان) کی حد درجہ کمزوری ہے کہ وہ تحقیق و تنقید سے خائف ہو اور یہ اندیشہ کرے کہ اس کا مذہب اس کی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا تو اعتقاد ہے کہ دنیا کا اگر کوئی مذہب سخت سی سخت تنقید کے بعد بھی پورا اتر سکتا ہے تو وہ اسلام ہے اور ایک مسلمان سے زیادہ بے خوف اس باب میں کوئی نہیں ہو سکتا، بشرطیکہ مذہب نام اُس ابلہانہ اتباع کا نہ ہو جو اس وقت کم سواد علماء کے گمراہ کن تعلیمات سے ہر جگہ نظر آتا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ صاحب تحریر اس کو دنیاوی امور میں شامل کر کے والدین کے ارشاد کی تعمیل کو اس پر مقدم جانتے ہیں حالانکہ جب کوئی خطرہ قلب پر مذہب کے باب میں مستولی ہو گیا اور بعض سوالات اضطراراً ایسے پیدا ہونے لگے جن کا وہ خود کوئی جواب نہیں دے سکتے تو یہ حالت دنیاوی امور سے بالکل علیحدہ ہو گئی اور اس کا تعلق معتقدات مذہبی سے ہو گیا، جہاں خود ارشاد نبوی کے مطابق والدین کا فرمان بھی اپنی ساری اہمیت کھو بیٹھا ہے۔ اگر خدانخواستہ کل کو ان کے والد محترم کسی اور مسلک کو اختیار کر لیں اور ہمارے معزز دوست کو اس کے اتباع پر مجبور کریں تو کیا وہ اپنے موجودہ مسلک کو صرف اس لئے ترک کر دیں گے کہ "والدین کے ارشاد کی تعمیل مقدم" ہے اور "لکم دینکم ولی دین" کی ہدایت کو نظر انداز کر دیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر حیرت ہے کہ باوجود دل میں خلش رکھنے کے وہ کیونکر اُن کے فرمان کی تعمیل کو ضروری سمجھتے ہیں جبکہ اس کا تعلق یکسر مذہب و معتقدات مذہب سے ہے۔

دوسرا مسئلہ ارکان نماز کو "غیر قرآنی" کہنے کے متعلق ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر کسی کو برہمی کا کیا سبب پیدا ہو سکتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ نماز کی موجودہ صورت "غیر الہامی" یا "غیر محمدی" ہے، قرآن میں بہت سی باتوں کا ذکر نہیں ہے

بہت سی ہدایات ایسی ہین جو صرف رسول اللہ کے اقوال سے مستنبط ہوتی ہین، تو کیا ہم اُن کو "غیر قرآنی"، کہکر ان کی اہمیت سے انکار کرسکتے ہین، یہ تو آپ بھی جانتے ہونگے کہ وحی کی دو قسمین ہین ایک "متلو" دوسری "غیر متلو"، قسم اول کو قرآن کہتے ہین اور قسم دوم کو "احادیث"۔ اس لئے اگر نماز کی موجودہ صورت اور اس کے جملہ ارکان کی صراحت قرآن مجید مین نہین ہے بلکہ رسول اللہ کے طریق عمل سے ثابت ہوتی ہے تو کیا ہم اس کی اہمیت کو نظر انداز کرسکتے ہین اور اس کو غیر قرآنی کہکر (جبکہ واقعی قرآن مین اس کی تفصیل وصراحت موجود نہین ہے) اس کی فرضیت سے قطع نظر کرسکتے ہین۔

مین نے اگر ارکان نماز کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کی تفصیل کلام مجید مین نہین ہے تو اس سے مقصود یہ نہین تھا کہ مین ان کو غیر ضروری سمجھتا ہون بلکہ مدعا صرف ایک واقعہ کا اظہار تھا اور ضمناً یہ بتانا تھا کہ خدا کے نزدیک ارکان عبادت کی تفصیل سے زیادہ اس کے غایت کا اظہار ضروری تھا جس کو ہم لوگون نے نظر انداز کردیا ہے۔

مجھے حد درجہ افسوس ہے کہ بعض حضرات میرے مضامین کو پڑھکر ایسے نتائج پیدا کرلیتے ہین جو نہ نفس مضمون سے کوئی تعلق رکھتے ہین اور نہ میرا مقصود ہوتے ہین۔ اگر مین نے یہ ظاہر کیا تھا کہ ارکان نماز کا ذکر قرآن مجید مین نہین ہے، تو اس کے یہی معنی لینے چاہئے تھے جو ان الفاظ سے ظاہر ہوتے ہین۔ اس سے ہٹنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ مین نماز کا مخالف ہون یا اس کو ضروری نہین سمجھتا۔

اسی سلسلہ مین مین اپنے معزز دوست سے عرض کرونگا کہ اگر واقعی ان کے دل مین کوئی ایسی خلش پیدا ہوگئی ہے جس کو وہ دور کرنا چاہتے ہین تو دیوبند اور بریلی کے فتواۓ کفر وشرک سے نہ ڈرین، کیونکہ اوّل تو اب ان بارگاہون کی کوئی وقعت ہی نہین رہگئی ہے کہ ان کے احکام کو کوئی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے اور دوسرے یہ کہ کفر واسلام کا معاملہ صرف خالق ومخلوق کے درمیان کا معاملہ ہے جس مین "کراماً کاتبین" کو بھی دخل دینے کی ضرورت نہین، اچہ جائیکہ اہل دیوبند وبریلی جنھون نے کبھی خدا کی ہستی کو اہرمن کی ہستی سے آگے بڑھنے نہین دیا۔

نیاز

تصویر زیب النسا بیگم

جو دربار عالمگیری کی ایک بے مثل مصورہ نادرہ کے قلم کا ہے
اور بعد تحقیق وتنقید بسیار اس کی صحت کی توثیق ہوچکی ہے
یہ تصویر تین خوشنما رنگ سے طیار کی گئی ہے اور ۲۲ء کے نگار مین
شایع ہوچکی ہے قیمت معہ محصول .... (۸/)

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور نقاش ومصور مزدار کی ایک بہترین تصویر جو
حضرت نیاز کے مشہور مضمون رقاصہ کے گجراتی ترجمہ کے
ساتھ کلکتہ کے مشہور گجراتی رسالہ نوجیتن مین شایع ہوئی تھی۔
قیمت (۴/)

"منیجر نگار"

باب الاستفسار

حقوق اللہ و حقوق العباد

(جناب ناظم حسین صاحب - گوالیار)

کہا جاتا ہے اور غالباً ہر مسلمان کا اعتقاد ہے کہ انسان کے فرائض اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق پر مشتمل ہیں اور خدا اگر چاہے تو اپنے حقوق کے ترک کرنے والے کو معاف کر دے، لیکن بندوں کے حقوق ادا نہ کرنے والوں کو وہ معاف نہ کرے گا بعض وقت اعمال کی اس تفریق کے سمجھنے میں مجھے الجھن پیدا ہوتی ہے اور ذہن میں اک خاص تشویش محسوس کرتا ہوں کہ یہ تفریق کیوں اور کیسی ہے اور اس سے کیا نتیجہ ملحوظ ہے - کیا آپ اس مسئلہ میں کوئی شافی گفتگو کر کے مجھے مطمئن کر سکینگے۔

"نگار" "حقوق اللہ اور حقوق العباد" کا مسئلہ بھی منجملہ اُن دیگر مسائل کے ہے جن کو معتقدات اسلامیہ سے غیر متعلق ہونے کے باوجود غلطی سے جزو ایمان و اسلام قرار دے لیا گیا ہے اور وہ ہر وہ شخص جو اسلام و اسلامیات پر تنقید کرنے کے بعد پورے اطمینان نفس کے ساتھ مسلمان ہونا چاہتا ہے وہ اس مسئلہ میں آپ ہی کی طرح مشوش ہوگا اور ہونا چاہئے

اول اول جب مذاہب عالم کی تفتیش و مطالعہ کے سلسلہ میں، مذہب اسلام میری جستجو و تحقیق کا مرکز قرار پایا اور مہمات مسائل سے گزر کر جزئیات تک پہونچا تو میرا ذہن بھی اس مسئلہ میں آپ ہی کیطرح مشوش ہوا اور آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ فرائض انسانی کی یہ تقسیم ممکن ہے کسی مصلحت کے لحاظ سے درست ہو لیکن حقیقت کے اعتبار سے بالکل نادرست ہے۔

قبل اس کے کہ میں ان دلائل کو پیش کروں جنکی بنا پر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے، - یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرض اور حق میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ جس کی طرف سے ادائے فرض کا مطالبہ ہوتا ہے وہ اس کو حق کہکر طلب کرتا ہے اور جو ادا کرتا ہے وہ اُسے فرض کے نام سے موسوم کر کے انجام دیتا ہے اس لئے اگر حق کا مفہوم متعین ہو جائے تو فرض کی صورت بھی متعین ہو سکتی ہے اور اس کی غایت کا بھی علم ہو سکتا ہے۔

ادائے فرض یا حق نام ہے کسی ایثار، یا احسان و کرم کے اعتراف کا ایثار کے ذریعہ سے یا کسی اور ایسے ذریعہ سے جسے احسان کرنے والا اپنے لطف و کرم کا معاوضہ سمجھ سکے - ایک شخص کی احتیاج کو ہم پورا کرتے ہیں تو اس کا فرض ہو جاتا ہے

وہ کسی وقت ہمارے بھی کام آئے اور اگر وہ ایسا نہ کرے، تو تارک فرض کہلائے گا' اسی طرح ایک شخص ہمکو قرض دیتا ہے تو ہمارا فرض ہوتا ہے کہ اُس کو وقت معین پر ادا کردیں اور اس کے احسان کی تلافی کردیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو فرض کے ترک کرنے والے کہلائیں گے ایک صورت تو یہ ہوئی جب کہ حق کا طلبگار اور ادائے فرض کرنے والا دونوں احتیاج کے لحاظ سے قریب قریب ایک سطح پر ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ احسان کرنے والا بہت بلند ہو اور وہ اس کے معاوضہ کا وقت احسان بظاہر محتاج نہ ہو اس صورت میں ایک معنوی اور اخلاقی احساس احسان کا تو ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے عوض کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ کہ ہم کسی نہایت ہی مفلوک الحال فقیر یا اپاہج کی کچھ مالی اعانت کریں تو اس وقت نہ ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کا عوض اس سے کسی وقت چاہیں گے اور نہ اس کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ کبھی اس کا عوض دینا پڑے گا۔ لیکن اگر کسی وقت ہم اس کی طرح مفلوک الحال ہوجائیں اور وہ ہماری طرح دولتمند یا کسی اور صورت سے ہم کو اس کی مدد کی ضرورت لاحق ہوجائے تو پھر اس کے ادا کئے جانے کا سوال از خود پیدا ہوجائے گا گو بحالت موجودہ ہم اور وہ دونوں اس سے خالی الذہن ہیں۔ تیسری صورت ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ احسان و کرم کرنے والی ذات ایک ایسا عمومی مبدء و منبع ہو جو بلا تخصیص و تعیین بلا غرض و سبب لطف عمیم کی عادی ہے' جیسے آفتاب کا وجود کہ اس کی روشنی کوہ و راغ' صحرا و باغ' وادی و مرغزار' ہر جگہ یکساں جاں بخش و حیات افروز ہے' یا پھول کی نکہت کہ اس کی شامہ نوازی کسی مخصوص و محدود زمان و مکان کے لئے مختص نہیں ہے یا ابر مطیر جس کے نزدیک شاہ و گدا' نشیب و فراز' شب و روز' صبح و شام کسی چیز کی تخصیص نہیں ہے ایسی صورت میں کوئی سوال حق و فرض کا پیدا ہوتا ہے نہ اس کے ادا کئے جانے کا۔

خدا اور انسان کا تعلق اگر کسی شق میں آسکتا ہے تو وہ یہی تیسری صورت ہے' کیونکہ ذات خداوندی کے انعامات بغیر کسی وجہ و سبب' بلا کسی غرض و غایت کے ہر ایک ہستی و مخلوق پر یکساں ہیں اور اگر آج تمام نوع انسانی بلکہ جملہ مخلوق ان سے منکر ہوجائے تو بھی اس کے الطاف اسی حال سے جاری رہیں گے اور اُن کے اعتراف یا عدم اعتراف سے اُن کے استمرار و دوام پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ جس کی طرف سے کسی حق کا مطالبہ ہوتا ہے یا جس کا کوئی حق ہم اپنے اوپر تسلیم کرتے ہیں' تو گویا ضمنی طور پر اس کا کسی حد تک صاحب احتیاج ہونا بھی تسلیم کرتے ہیں ورنہ مطالبہ و ادائے فرض کا مفہوم بالکل لغو قرار پاتا ہے'

اس لئے اگر خدا کا کوئی حق بندوں پر ہے اور اس کا ادا کرنا ہم پر فرض ہوتا ہے تو اس کے صرف ایک ہی معنی ہوسکتے ہیں اور وہ یہ کہ خدا کا ہمکو پیدا کرنا' عقل و ادراک کی نعمت بخشنا' دنیا کے نعائم و لذائذ مہیا کرنا' کوئی ایسی غایت و غرض رکھتا تھا جس میں شاید خود خدا کا کوئی فائدہ تھا اور اس لئے ہمارا اس کے فائدہ کو ان احسانات کے عوض میں نظر انداز کردینا ایک ایسی غلطی و سرکشی ہے جس کی سزا ہمیں ملنا چاہئے۔ حالانکہ خدا کی ذات اسقدر بلند ہے کہ اس کے ساتھ کسی سبب یا غرض کی نسبت ہوہی نہیں سکتی اور وہ ہر قسم کے تاثرات سے بے نیاز ہے۔

اگر حقوق اللہ میں کوئی چیز ایسی ہوسکتی ہے جس کا احساس فطرت کی طرف سے ہر شخص میں ودیعت کیا گیا ہے تو سب سے

پہلے اس کی ذات اور وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اگر آج کوئی اس سے انکار کر دے، بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ اس کو گالیاں دینے لگے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خدا اُس سے ناخوش ہو جائیگا اور اپنے اُن انعامات عمیم سے اُسے محروم کر دیگا جو بلا کسی سبب کے اُس نے ہر شخص کے لئے ارزانی کر رکھے ہیں؟ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم خدا اور اس کے کاروبار کو بالکل دنیاوی اصول زندگی کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اس کے مطابق حکم لگاتے ہیں۔ ہم خدا کی حقیقت سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بڑے سے بڑے بادشاہ کی مثال پیش کرتے ہیں اور جس طرح یہاں ایک بادشاہ کے حقوق رعایا پر ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے حقوق کو بھی بندوں پر ثابت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ عوام کے سمجھانے کے لئے اور اُن کے اخلاق کی تہذیب و تربیت کے لئے یہ ایک مفید طریق کار ہو، لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے معاملہ بالکل اس کے خلاف ہے اور خدا کی حقیقت یا اس کے ساتھ تعلق مخلوق کو سمجھنے کے لئے ہم عالم حواس و ادراک کی کسی چیز کو مثال یا تشبیہ کی صورت سے پیش ہی نہیں کر سکتے۔ ایک ایسی ذات جو یکسر غنا ہے، جو بے نیازی کے سوا کچھ نہیں، جو ازل سے لیکر لا نہایت تک صرف ایک قوت کامنہ کی حیثیت میں ذرہ سے لیکر آفتاب تک۔ ہر جگہ کار فرما ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے بندوں پر حقوق ہیں، یا وہ ہم سے کسی فرض کی ادائی اپنے لئے چاہتی ہے میرے نزدیک ذات باری کا استخفاف اور معنوی شرک ہے

اب آپ اصولی گفتگو سے ہٹ کر نیچے آیے اور دیکھئے کہ جن باتوں کو خدا کے حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کیا ہیں اور ان میں کونسی وہ خصوصیت ہے جو "حق اللہ" کو ہم پر ثابت کرتی ہے ہر مذہبی تعلیم دو چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ عبادات و معاملات معاملات کو تو چھوڑیئے کیونکہ وہ بین طور پر حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ رہگئی عبادات سو حق اللہ کو انھیں سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ درانحالیکہ ان میں سے ایک بھی حق اللہ نہیں ہے اور عبادت خواہ کسی صورت سے ہو حقوق العباد ہی سے متعلق ہے۔ اسلام میں جہانتک عبادت کا تعلق ہے اس میں نماز، روزہ، حج داخل ہیں اور انھیں کو حق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب آپ انھیں کی حقیقت پر غور کریجیے کہ وہ خدا کا حق کیونکر ہو سکتی ہیں اور خدا کو ہماری عبادات کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے

وہ لوگ جو نماز، روزہ اور حج کو حق اللہ میں داخل کرتے ہیں، وہ بھی غالباً اس امر کا انکار نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو صرف ہمارے ہی فائدہ کے لئے نہ بتائی گئی ہو۔ مثلاً نماز کو لیجئے کہ اس وجہ سے جو طہارت و پاکیزگی کا خیال پیدا ہوتا ہے وہ خود ہماری ہی صحت کے لئے مفید ہے، یا جو اجتماع و یکجہتی کی صورت صف بستہ عبادت گزاروں میں پائی جاتی ہے وہ خود ہماری اجتماعی زندگی اور تمدنی ترقی کے لئے کسقدر کار آمد ہے یا "فحشاء و منکر" سے باز رہنے کی صورت میں جو تزکیۂ اخلاق رونما ہوتا ہے وہ کس حد تک ہماری قومی و انسانی ارتقاء کا ضروری جزو ہے۔ اس لئے اگر ہم تارک الصلوۃ ہیں تو اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنی اجتماعی و تمدنی ترقی کے لئے سعی نہیں کرتے، ہم دنیا میں سعادت و خوشحالی حاصل کرنے کی طرف سے متوجہ نہیں ہوتے اور اسطرح گویا نماز کا ترک کرنا اُن حقوق کو پامال کر دینا ہے جو قوم کی طرف سے اس کی ایک ایک فرد پر عائد ہوتے ہیں اور داعیات قومی کی بزداہ

نہ کرنا یقیناً قوم کا گناہ ہے جسے صرف حق العباد ہی سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ حج چونکہ نماز باجماعت ہی کی ایک زیادہ وسیع صورت ہے اور اس کا مقصود بھی محض اخوت عامہ کی بنیاد کو مستحکم کرنا ہے اس لئے اس کا بھی حق العباد میں شامل ہونا ظاہر ہے۔ یہی حال روزہ کا ہے کہ اس کی تاکید بھی صرف اس لئے کی گئی ہے کہ ہم اپنی قوم کے مسکین و بیکس افراد کی حالت کا احساس کر سکیں اور اُن کی مدد کی طرف متوجہ ہوں اور اگر یہ جذبہ ہم میں پیدا نہیں ہوتا تو روزہ بالکل بے معنی چیز ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عبادات بھی سراسر حق العباد سے متعلق ہے۔ الغرض دنیا میں کوئی عبادت یا کوئی طریق نیایش ایسا نہیں ہو سکتا جو حق اللہ کہلایا جائے۔ کیونکہ خالق و مخلوق کا رشتہ ایک ایسے غنی و محتاج کا رشتہ ہے جس میں حق کے پیدا ہونے یا اُس کے ادا کئے جانے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

رہا یہ امر کہ جب حقیقت یہ ہے تو کیوں ایسا بتایا گیا اور یہ تقسیم و تفریق حق کی کس غرض سے کی گئی اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ مذہب اور فلسفۂ مذہب دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں، یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص فلسفۂ مذہب جاننے کے بعد مذہب اختیار کرے۔ کیونکہ جو نتائج محض کسی مذہب کے اختیار کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ بہرحال بغیر فلسفۂ مذہب کے علم کے بھی مترتب ہو سکتے ہیں اور اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کو پہلے کسی عبادت یا فعل حسن کی فلسفیانہ حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے بلکہ اگر ہم یہ دیکھیں کہ کوئی شخص بغیر ان موشگافیوں کے علم کے احکام خداوندی پر اچھی طرح کاربند ہو سکتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کو اس طرف سے بے خبر ہی رکھیں طبقہ عوام میں چونکہ علمی توجیہوں کے سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی اور نہ وہ اُن کی اہمیت سے واقف ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ ان کو عبادت یا تعلیم اخلاق کی طرف بالکل اس انداز سے راغب کیا جائے جس طرح ہم بچوں کو مختلف پیرایوں سے کسی امر کی طرف راغب یا کسی بات سے متنفر کرتے ہیں۔ ایک بچہ ہاتھ میں چاقو لیکر کھیلنے لگتا ہے اور ہم اس سے یہ نہیں کہتے کہ دیکھو اس میں تیز دھار ہے، جس کا استعمال تم نہیں جانتے اور اندیشہ ہے کہ تمھاری بے احتیاطی سے یہ جسم کو مجروح کر دے۔ بلکہ اس سے گھبرا کر یہ کہتے ہیں کہ چاقو پھینک دو نہیں تو کن کٹی ہو جائیگی بلی پکڑ لیجائے گی، کتا کاٹ لیگا وغیرہ وغیرہ اور وہ خائف ہو کر چاقو پھینک دیتا ہے، حالانکہ حقیقت ان میں سے ایک بھی نہیں ہے اور نہ ہمارے اس کہنے کو کوئی کذب و دروغ کہتا ہے انبیاء کرام اور اکابر دین نے بھی تبلیغ و ہدایت کے لئے یہی فلسفہ اختیار کیا تھا کہ عوام کی ذہنیت اور اُن کے نارسیدہ عقول کو دیکھکر اعمال و افعال کے عواقب و نتائج اور اسباب و علل سمجھائے تھے۔ اگر ایک جاہل کے سامنے نماز کی حقیقی روح پر لکچر دیا جائے اور اس کو بتایا جائے کہ اس میں یوں اجتماعی فوائد مضمر ہیں تو اس کے نزدیک نہ نماز میں کوئی اہمیت باقی رہیگی اور نہ وہ اس کے پابندی کریگا، لیکن اگر اس سے صرف یہ کہدیا جائے کہ دیکھو یہ خدا کا حکم ہے، خدا کا حق ہے جو تمہیں ادا کرنا ہے، تو ایک خاص قسم کی خشیت اُس پر طاری ہو جائے گی، وہ اس کا پابند بن جائیگا اور آخر کار وہ نتیجہ از خود بغیر اس کے علم کے پیدا ہو جائیگا جو نماز کی پابندی سے پیدا ہونا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی بحث طلب ہے کہ کسی معصیت کو خدا کا معاف کر دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ میرا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کا کوئی حق بندہ پر نہیں ہے، اسی طرح خدا کو عفو و درگزر یا تعذیب و تعزیر سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یعنی جس طرح ایک انسان کے اعمال حسنہ خود اس کے لئے مفید ہیں اسی طرح اعمال سیئہ اس کے لئے مضر ہیں اور اس فائدہ و مضرت کا دوسرا نام ثواب و عذاب ہے۔ خدا کی شان اس سے بہت بلند و ارفع ہے کہ وہ ہمارے اچھے کاموں کی تحسین اور بُرے کاموں کی تشنیع کے لئے کوئی اہتمام کرے۔ ہمارا عذاب و ثواب ہماری دوزخ و جنت خود ہمارے اندر اور ہمارے ساتھ ہے جو بالکل اسطرح لازمی طور پر ظہور پذیر ہو جاتی ہے جس طرح دو اور دو کا نتیجہ چار۔ اگر ہم ان ہدایات پر عمل نہیں کریں گے جو شارع نے بتائے ہیں تو اس کا نتیجہ از خود ہمارے اور ہماری قوم کے حق میں بُرا پیدا ہوگا اور اگر اُن پر کاربند ہوں گے تو ہم خود اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ خدا نے جو سلسلہ اسباب و علل اور نتائج کا پیدا کر دیا ہے اس کے مطابق تمام مظاہر رونما ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ جس میں خدا کی معافی یا سرزنش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس جگہ یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ کلام مجید میں اکثر جگہ خدا نے عذاب و ثواب کو اپنے سے متعلق کیا ہے۔ اس مسئلہ پر غالباً میں اس سے قبل اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں لیکن مختصراً پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ نہ صرف مذہبی بیان کا انداز بیان ہے تاکہ عوام پر اس کا اثر ہو بلکہ ایک لحاظ سے حقیقت بھی ہے کیونکہ خدا کے بتلائے ہوئے اصول سے منحرف ہو کر یا ان پر کاربند ہو کر نقصان و نفع اٹھانا گویا اس کے مقرر کردہ نتائج کو حاصل کرنا ہے جسے ہم بجا طور پر ہر وقت خدا سے منسوب کر سکتے ہیں۔

دوسرا شبہ یہ بھی وارد ہو سکتا ہے کہ خدا نے جا بجا "مغفرت ذنوب" کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے کسی گناہ کا بُرا نتیجہ نہ پیدا ہوگا۔ بلکہ اس سے مدعا صرف یہ ہے کہ اگر ہم معاصی سے باز آجائیں گے تو اُن کے اثرات بھی رفتہ رفتہ محو ہو جائیں گے اور یہی گناہوں کی بخشش و معافی ہے۔

نماز کی موجودہ صورت

(ی۔ س۔ صوفیہ صاحبہ عیسیٰ میاں بازار حیدر آباد دکن)

در آپکے لعن طعن نے جہاں ہو بیون کی جماعت کے وقار کو جو ہم ناقص العقل عورتون کے ذہن مین تھا گھٹا دیا وہان ہمارے ان عقائد کو بھی کمزور کر دیا جن کو ہم نے باپ دادا سے سیکھا اور جن پر اپنے شوہرون کے سامنے بلاخوف تردید ابتک عمل پیرا رہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مین آپکا رسالہ ہر ماہ پڑھتی ہون اور جتنی چیزین قرین عقل و قیاس ہوتی ہین ان کو درست

ہی نہین جانتی بلکہ انپر عمل بھی کرتی ہون۔ مگر جولائی کے رسالہ مین ملاحظات پڑھنے کے بعد میرے دل و دماغ مین ایک عجیب قسم کا ہیجان پیدا ہو گیا ہے اور عجیب قسم کے خطرات پیدا ہو گئے ہیں جنکا علاج مین خود نہین کر سکتی۔ کیا آپ بتا سکتے ہین کہ اگر قرآن شریف مین نماز کے متعلق اور خاصکر رکوع و سجود کے متعلق قطعی احکام صادر نہین ہوئے ہین تو پھر یہ نماز جو ہم پڑھتے ہین درست ہے یا نہین۔ کم از کم مین یہ سمجھتی ہون کہ خداوند بزرگ نے ہمکو نماز کے احکام رسول کریم کے توسط سے صادر فرمائے۔ اور اب یہ بتایئے کہ جس طرح سے نبی کریمؐ نے ان احکام کی پابندی کی اور عملی پیرایہ مین جس طرح ہمارے آگے پیش کیا وہ قابل تقلید ہے یا نہین براہ مہربانی میرے اس سوال کا جواب آیندہ پرچے مین رقم فرما کر میرے شبہات دور فرمایئے ورنہ اس کج عقیدگی کو جو آپکی تحریر سے میرے دل مین پیدا ہو گئی ہے مین آپکی طرح سے سمجھون گی اور آپ جیسے عالمون پر لازم ہے کہ ان شکوک کو رفع کرین جو آپکی تحریر کیوجہ سے پیدا ہو گئے ہون۔ فی الوقت مین اس سے زیادہ نہین لکھ سکتی البتہ آیندہ نگار مین جواب پڑھنے کے بعد اپنے خیالات پریشان کو قلم بند کر کے روانہ کرونگی

دوسرا سوال یہ ہے کہ گراموفون کے ذریعہ سے اگر اذان مقرر کی جائے تو درست ہوگا یا نہین

”نگار“ ”آپ کی تحریر پڑھکر مجھے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ خوشی تو اس لئے کہ آپ اُن تنگ نظر اور کوتاہ خیال لوگون مین نہین ہین جو اپنے عقاید و مزعومات کے خلاف کوئی بات سننا پسند ہی نہین کرتے، خواہ وہ کتنی ہی صداقت کے ساتھ کیون نہ کہی گئی ہو، اور افسوس اس بات پر ہوا کہ آپ نے میری تحریر کو غور سے نہین پڑھا اور خواہ مخواہ آپ کے دل مین نماز کی درستی کے طرف سے شک پیدا ہو گیا حالانکہ میرا مقصود وہ نہ تھا جو آپ نے یا بعض اور حضرات نے سمجھا۔

نماز یا عبادت کی جو موجودہ صورت و ہیئت مسلمانون مین پائی جاتی ہے وہ با دنیٰ اختلاف وہی ہے جیسے رسول اللہ نے بتایا، صحابہ نے عمل کیا اور اُس وقت سے لیکر تا ایندم مسلمانون کے مذہبی مرکزیت کا بڑا راز اس مین پوشیدہ رہا ہی کیونکہ اسی نے ہماری اجتماعیت کو قائم رکھا اسی نے ہمارے اندر جذبۂ اخوت و ہمدردی پیدا کیا اور بلا خوف تردید اس کو ایک بہترین طریقہ عبادت کے صورت مین پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نماز صرف قیام، قعود، رکوع و سجود کا نام ہے، کیا عبادت سے مراد محض چند اعضا کی جنبش و حرکت ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اس کا مدعی نہین ہو سکتا اور نہ دنیا کا کوئی مذہب یہ کہہ سکتا ہے کہ عبادت کا مدعا صرف جھکنے، سجدہ کرنے یا کھڑے ہو جانے سے پورا ہو سکتا ہے۔

انسانی حرکات اگر وہ بے اختیارانہ طور پر سرزد ہون، تو ہمیشہ ان کو جذبات کا تابع سمجھا جاتا ہے اور اسی لئے صورت کو دیکھ کر قلب کی حالت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارے سامنے بے اختیارانہ ہات جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے یا جھک کر ہمارے قدم چھوتا ہے، یا سامنے زمین پر سر ٹیک دیتا ہے تو اس کے صرف ایک ہی معنے ہوا کرتے ہین اور وہ یہ کہ اس نے اپنے آپ کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے، اپنی خطاؤن سے پشیمان ہے، اپنی عاجزی کا اعتراف کرتا ہے اور آیندہ کے لئے طاعت و وفاداری کا عہد کرتا ہے۔ لیکن اگر ہمین کسی طرح معلوم ہو جائے کہ اس کے یہ ظاہری خوشامد حقیقت سے دور ہے

اور اس کے دل مین بدستور سرکشی پائی جاتی ہے تو ہم ایسے آدمی کو ٹھکرا دیتے ہین اور اس کے اظہار عجز و نیاز پر رحم کرنے کے بجائے اور زیادہ بیزاری کا اظہار کرتے ہین۔

بالکل اسی پر نماز کو منطبق کر لیجئے کہ اگر ایک شخص کا رکوع و سجود حقیقتاً دل کی اس کیفیت کے ساتھ ہے جو بے اختیارانہ طور پر انسان کو جھک جانے کے لئے مجبور کرتی ہے تو اس کی نماز واقعی نماز ہے، ورنہ اک فعل عبث ہے اور خدا کی توہین ہے

اس لئے ظاہر ہوا کہ نماز و عبادت سے اصل مقصود صرف ایک کیفیت عبودیت اپنے اوپر طاری کرنا اور معاصی و مناہی سے محترز رہنے کا عہد واثق کرنا ہے اور اسی مقصود کے ساتھ رسول اللہ نے اس کی پابندی مسلمانوں پر عاید کی تھی

میرا مدعا یہ کہنے سے کہ نماز کی موجودہ ہئیت و صورت کے ذکر سے کلام مجید ساکت ہے یہ نہین ہے کہ وہ کوئی فعل عبث یا غیر ضروری ہے یا یہ کہ رسول اللہ نے اس کا حکم نہین دیا، یقیناً وہ نہایت اہم و ضروری ہے اور رسول اللہ نے ہمیشہ اس کی پابندی کی اور دوسرون کو پابندی کی ہدایت نہایت شدت سے کی، بلکہ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ خدا نے عبادت کی صرف اصلی روح اور اس کی حقیقی غایت بتا کر اس کی صورت و ہئیت سے کوئی بحث نہین کی ہے جس سے گویا یہ بتانا مقصود تھا کہ خدا کے نزدیک اصل چیز عبادت کی کوئی مخصوص صورت نہین ہے، بلکہ اصل مقصود صرف خشیت الٰہی کا پیدا کرنا ہے اور اسی غایت کو پیش نظر رکھ کر رسول اللہ نے موجودہ صلوٰۃ کو قایم کیا۔

کلام مجید مین جہان جہان صلوٰۃ قایم کرنے کا حکم دیا ہے وہان اس سے نماز کے اصطلاحی معنی مراد نہین ہین جو اس کی ہئیت و ارکان کو ظاہر کرتے ہین، بلکہ مقصود صرف عبادت کا قیام ہے جس کو رسول اللہ نے نماز اصطلاحی کی صورت مین ادا کیا اور اس کی ہدایت کی۔

مجھے حیرت ہے کہ میری تحریر سے لوگون نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ مین نماز کا مخالف ہون یا اس کو غیر ضروری قرار دیتا ہون البتہ یہ ضرور کہتا ہون کہ کلام مجید مین اس کے ارکان یا اس کی موجودہ ہیئت سے کہین بحث نہین کی گئی اور اس حقیقت سے غالباً کسی کو انکار نہین ہو سکتا۔

رہا آپ کا دوسرا سوال کہ اذان گراموفون کے ذریعہ سے ادا کیجا سکتی ہے یا نہین۔ یہ مسئلہ بہت کھلا ہوا ہے کیونکہ اذان خود عبادت ہے، عبادت کی تمہید ہے اور اس کے ادا کرنے مین کوئی صورت لہو و لعب کی پیدا کرنا قرین عقل و انصاف نہین ہے۔ آج اذان کے متعلق گفتگو ہوئی ہے تو کل امام کی جگہ بھی گراموفون مشین رکھنے مین کوئی حرج نہ قرار دیا جائیگا اور اس طرح عبادت ایک تمسخر اور غیر سنجیدہ حرکت مین تبدیل ہو جائے گی۔

مین اس کا بھی سخت مخالف ہون کہ گراموفون مین کلام مجید کے ریکارڈ بھرے جائین اور ایسے لوگون کو جو چند دراہم کے عوض ایسی سخیف حرکت کرتے ہین یا جو ایسے ریکارڈ سننا پسند کرتے ہین نہایت ہی بُرا سمجھتا ہون کیونکہ میرے نزدیک یہ کلام پاک کی سخت توہین ہے اور کلام الٰہی کے متعلق ایسا جذبۂ استخفاف ہے جسکو کوئی صحیح العقل مسلمان کبھی گوارا نہین کر سکتا

مطبوعات موصولہ

پنجاب میں اردو

جناب حافظ محمود خان صاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے جو ناقدانہ تصانیف کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں یہ کتاب اس مقصد کے ساتھ لکھی ہے کہ اُردو زبان کی قدامت اور اس کے نشو و آغاز پر روشنی ڈالی جائے۔ فاضل مصنف نے پہلے ایک مختصر سا مقدمہ تحریر فرمایا ہے جسے ہم کتاب کا ملخص کہہ سکتے ہین۔ اس مین انھون نے ظاہر کیا ہے کہ اردو کا آغاز پنجاب سے ہونا معلوم ہوتا ہے اور تاریخی و لسانی اشارون سے اس کو ثابت کیا ہے اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس مین اس مقصد کو بہت زیادہ فصاحت و تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھا گیا ہے۔

پہلے لفظ اُردو کی وجہ تسمیہ، لفظ ریختہ کی تحقیق اور ریختہ کی قسمون سے بحث کی ہے اور اخیر مین یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اُردو کا قدیم ترین نام ہندی یا ہندوی تھا اور اُسے گوجری بھی کہتے تھے۔

دوسرا باب اُردو کے آغاز سے بحث کرتا ہے۔ جس مین بتایا گیا ہے کہ اُردو کیونکر برج سے نکلی، دہلی اور پنجاب کے کیا تعلقات تھے فارسی پر ہندی کا کیا اثر پڑا اور اسی سلسلہ مین انھون نے عہد غزنوی سے بحث کرتے ہوے ثابت کیا ہے کہ لاہور اسوقت مرکز اسلام تھا اور اُس عہد کے اکابر شعراء و مصنفین کے حالات و خصوصیات شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کا نشو و آغاز پنجاب سے ہوا۔

اس کے بعد تیسرے باب مین اکابر و اعاظم پنجاب کا ذکر کرکے بتایا ہے کہ اُس عہد مین یہان کے مصنفین و شعراء نے کیا کیا تصانیف کی اور زبان سے ان کو کس حد تک کس طرح کا تعلق تھا۔

چوتھے باب مین پنجابی اور اُردو کے عنوان سے لسانی تحقیق کی گئی ہے اور میری رائے مین کتاب کا اہم ترین حصہ یہی ہے اس کے بعد قدیم اُردو پر پنجاب کے اثر کو دکھایا ہے اور بہت سے قدیم پنجابی شعراء و مصنفین کے تذکرہ سے اپنے دعوی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

الغرض موضوع کے لحاظ سے جتنے پہلو بحث کے پیدا ہو سکتے تھے ان سب پر مصنف نے نہایت فاضلانہ و محققانہ بحث کی ہے اور اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک شخص یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو نتیجہ فاضل مصنف نے نکالا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔

ہر چند شمالی ہند کے رہنے والون کو اور خصوصاً اہل لکھنؤ کو یہ دعوی نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگا کہ اُردو کا آغاز پنجاب سے ہوا۔ لیکن جس طرح اس سے قبل دکن مین اُردو لکھنے والا یہ فخر ان لوگون سے چھین لے گیا اور وہ کچھ نہ بول سکے۔ اسی طرح اب پنجاب مین اُردو پر بھی خون کے گھونٹ پی پی کر رہجانا پڑیگا۔ اور شاید اس سے بہتر انتقام یہان کے اہل علم و ادب کی تنگ نظری کا اور کوئی نہین ہو سکتا تھا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ اہل پنجاب یا اہل دکن یہ دعوی نہین کرسکتے کہ انھون نے اُردو زبان مین وہ مہارت حاصل کی

جو شمالی ہندوؤن کو حاصل ہے، لیکن ان مین اس فخر سے کبھی محروم نہین کیا جا سکتا کہ اردو کا نشو و آغاز انھین کی وجہ سے ہوا اور وہ اب بھی اس کی ترقی مین کافی حصہ لے سکتے ہین۔

جناب شیرانی نے یہ کتاب لکھ کر تاریخ زبان اردو مین ایک ایسی بیش بہا تحقیق کا اضافہ کیا ہے، اور ایک ایسا جدید راستہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال نظر نہین آتی۔

اسی سلسلہ مین، یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ جناب شیرانی اہل پنجاب سے نہین ہین اور اس لئے اُن پر یہ الزام قائم نہین ہو سکتا کہ انھون نے صرف وطن پرستی کی بنا پر ایسا لکھ دیا ہے۔ ہر چند اگر وہ پنجابی ہوتے تو بھی اُن کے پیش کردہ تحقیق کے سامنے سوائے سکوت کے اور کوئی جواب نہ ہو سکتا تھا۔

اس کتاب کا مطالعہ ہر اُس شخص کے لئے ضروری ہے جو کچھ بھی زبان اردو سے لگاؤ رکھتا ہے۔ کتابت و طباعت بہت پسندیدہ ہے۔ حجم ۳۱۲ صفحات ہے۔ قیمت عہ؎ ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اردو اسلامیہ کالج لاہور۔

بصائر مجموعہ ہے جناب آسی کے قطعات و رباعیات کا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل دو جدا چیزین ہین قطعات کا حصہ زیادہ تر اُن اقوال حکماء پر منحصر ہے جو اُن کو مختلف کتابون کے دوران مطالعہ مین قابل نظم نظر آئے اور رباعیات کا حصہ خود اُن کی طبعزاد چیز ہے۔

قطعات تقریباً ۱۶۰ ہین اور سب مین کوئی نہ کوئی خیال ایسا موزون کیا گیا ہے جو اخلاق انسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مین شک نہین کہ کسی دوسرے کے خیال یا کسی نثر کو نظم مین ادا کرنا اور اس خوبی کے ساتھ کہ قایل کے قول کی اصل رُوح باقی رہے، دشوار کام ہے، لیکن جناب آسی کی کہنہ مشقی اور خوش ذوقی نے اس مشکل وادی سے گزرنے مین ان کی بڑی مدد کی ہے اور اس خوبی کے ساتھ انھون نے ان خیالات کو نظم کیا ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس ہی نہین کر سکتا کہ وہ کسی اور جگہ سے لئے گئے ہین۔

قطعات مختلف بحور و اوزان مین ہین لیکن کسی جگہ ان کے انتخاب مین بد ذوقی ظاہر نہین ہوتی۔ ان کی زبان جناب آسی نے اسقدر سادہ اور انداز بیان اسدرجہ سہل و شیرین رکھا ہے کہ معمولی پڑھا لکھا انسان بھی ان سے پورا لطف اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک حضرت آسی کی یہ کوشش قابل داد و ستایش ہے اور حقیقی معنی مین زبان کی خدمت کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ یہانتک کہ اگر اس کو مدارس و مکاتب مین لڑکون اور لڑکیون کے مطالعہ کے لئے ضروری قرار دیدیا جائے تو اُن بہت سی نظم کی کتابون سے بہتر ہوگا جو آجکل نصاب مین داخل ہین۔

دوسرا حصہ: اسے زیادہ رباعیات پر مشتمل ہے جناب آسی اس دور کی بہترین رباعی لکھنے والون مین ہین اور مشکل ہی سے کوئی رباعی ایسی ہوگی جو معیار پر صحیح و کامل نہ اُترے۔ چار چھوٹے چھوٹے مصرعون مین کسی خیال کو اس تکمیل کے ساتھ نظم کر دینا کہ جذبات کے تمام مدارج و منازل اس مین آجائین اور چوتھا مصرعہ بالکل ایک لطیفۂ غیبی کی صورت سے سننے والے کے ذہن و عقل

مین خاص لذت سرور پیدا کردے آسان نہین ہے۔ لیکن جناب آسی کی رباعیون مین یہ تمام باتین نہایت تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہین جو ان کے قادر الکلامی کا بہترین ثبوت ہے۔ ان کی رباعیان یقیناً خیام کے رنگ کی نہین ہین اور نہ سرمد و عطار کا تتبع انھون نے کیا ہے، بلکہ جو کچھ انھون نے لکھا ہے، خود انھین کے جذبات ہین اور اس لئے پورے جوش کے ساتھ نظم ہوئے ہین۔ ہم یہان چند رباعیان درج کرتے ہین جن سے ناظرین نگار کو ان کی خوبی کا اندازہ ہو سکیگا۔

مین ہاتھ جگر پہ رکھ کے درد دل کہتا ہون ۔ سمجھا نہین قافلہ مرے مقصد کو ۔ کہنے سے خجل ہون اور خجل کہتا ہون ۔ افسانۂ شوق متصل کہتا ہون

کاسہ کے لئے کرتا ہون دریوزہ گری ۔ دریوزہ کے واسطے نہین ہے کاسہ ۔ اللہ رے یہ درد اور یہ خونین جگری ۔ اللہ رے یہ جذب آہ کی بے اثری

بولا کہ چمن مین ہنس لیا تھا دم بھر ۔ پوچھا مینے کہ کیون جلاتے ہین تجھے ۔ دیکھا اک خشک پھول کو مجمر پر ۔ اک محفل عیش مین ہوا میرا گزر

یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۱۶۰ صفحات کو محیط ہے اور طباعت و کتابت وغیرہ مین بھی کافی اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ۔ یونائیٹڈ انڈیا پریس نمبر ۱۸ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔

الروضۃ البہیۃ سلاطین فاطمیہ اور بہتانات خارجیہ کے رد میں ذاکر حسین جعفر صاحب نے یہ کتاب مرتب کی اور مطبع نادری جبل پور نے شایع کی ہے۔ اس تصنیف مین شاہان بنی فاطمہ کے مختصر حالات درج کئے گئے ہین اور ابن العذاری کے اُن الزامات کا جواب دیا گیا ہے جو اسنے شاہان بنی فاطمہ مصر پر قائم کئے تھے۔ اخیر مین قوم بوہرہ کی بھی مختصر تاریخ درج کی گئی ہے۔ کتابت و طباعت وغیرہ پسندیدہ ہے اور ۱۲؍ مین مطبع مذکور سے ملسکتی ہے۔

سیرت و کردار ۵۶ صفحات کا مختصر سا رسالہ جس مین بچون کے لئے چند اخلاقی و معاشری اسباق درج کئے گئے ہین۔ کتابت وغیرہ بہت صاف اور روشن ہے اگر بچون کے سامنے ابتدا ہی سے اس قسم کا لٹریچر پیش کیا جائے تو بڑا اچھا نتیجہ پیدا ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ ہملوگون مین مطلق اس کا خیال نہین کیا جاتا اور ایسی ناقص کتابین پیش کردیجاتی ہین کہ شروع ہی سے بچون کے دماغ مین مُہلک ذوق کے جراثیم پیدا ہوتے ہین۔

یہ کتاب مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے ملسکتی ہے۔

رہنمائے تعلیم الف۔ بے کا ابتدائی قاعدہ ہے جسے جناب شیخ چاند بھائی بی اے ماسٹر راجکمار کالج راجکوٹ نے بالکل جدید اصول پر مرتب کیا ہے۔ بچون کے ابتدائی تعلیم کا مسئلہ بے انتہا اہم ہے اور بدقسمتی سے اس وقت تک بہت کم توجہ اس طرف کی گئی ہے کہ اُن کی ابتدائی تعلیم کے لئے کس قسم کا نصاب مقرر کرنا چاہئے۔ شیخ چاند صاحب نے اس قاعدہ کو کنڈرگارٹن اصول پر مرتب کیا ہے اور اس کے ساتھ ایک کلید بھی شایع کی ہے جس مین اساتذہ کو طریق تعلیم بتایا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قاعدہ بہت مفید ہے۔ اس کی قیمت معہ کلید کے ۲؍ رکھی گئی ہے۔

غلط فہمی ۵۰ چھوٹے صفحات کا ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جسے جناب نصیر ام۔ اے نے لکھا اور شمس الاسلام بکڈپو بلیماران دہلی نے شایع کی ہے۔ یہ ڈرامہ اپنی زبان، اپنی طرز انشا اور پلاٹ کے لحاظ سے ایسی چیز ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص بآسانی اس نتیجہ پر

پہونچ سکتا ہے کہ جناب نصیر ام - اے اپنی قابلیت ڈرامہ نگاری کے متعلق سخت مغالطہ مین مبتلا ہین۔

اگر بلند انگریزی تعلیم کا یہی معیار ہے اور اُس سے اس طرح کا ذوق تحریر و انشا ایک انسان مین پیدا ہو سکتا ہے، تو ہم حیران ہین کہ ایک جاہل سے ایسے تعلیم یافتہ انسان کو کیونکر ممیز کر سکتے ہین۔

پلاٹ صرف اسقدر ہے کہ ایک شریف خاندان کی شریف لڑکی ہے جسکا نام رضیہ ہے ایک اور شریف مرد کی نسبت قرار پائی ہے جسکا نام اختر ہے اور دونون مین محبت بھی ہے۔ ایک اور اوباش شخص فرید جو میخوار بھی ہے اس نسبت کا مخالف ہے اور خود وہان شادی کرنا چاہتا ہے۔ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے وہ پہلے توڈاکہ مار کر مال حاصل کرتا ہے اور پھر رضیہ کو ایک گمنام تحریر بھیجتا ہے کہ اختر بد چلن میخوار ہے اور پھر ایک صحبت بادہ مرتب کرکے اس مین دھوکہ سے اختر کو شریک کرتا ہے اور رضیہ اسی وقت نقاب پوش ہو کر آتی ہے اور اختر کو اس مجلس مین دیکھ کر بدگمان و متنفر ہو جاتی ہے۔ چند دن تک یہ حالت رہنے کے بعد راز کھل جاتا ہے، فرید گرفتار ہوتا ہے اور اختر کے ساتھ رضیہ کی شادی ہو جاتی ہے۔

یہ پلاٹ ہے ایک انتہائی تعلیم یافتہ کے دماغ سے نکلا ہوا جس کی ترتیب مین ہر وہ بد ذوقی جو پیدا ہو سکتی ہے موجود ہے۔

مکالمہ کی زبان اسقدر سوقیانہ و بازاری ہے کہ صرف جامع مسجد کی سیڑھیون ہی پر سنی جا سکتی ہے رضیہ کا جو کیرکٹر اُس کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے وہ بھی نہایت ہی معمولی اور شرافت سے گرا ہوا ہے۔

الغرض یہ ادبی کوشش جناب نصیر کی اسی لٹریچر مین شامل کیجا سکتی ہے جسے انگریزی مین ([illegible] production [illegible]) نابدائی پیداوار کہتے ہیں اس کی قیمت ۸ر رکھی گئی ہے جو ڈرامہ کا ایک بدترین نمونہ دیکھنے کے لئے زیادہ نہین ہے ڈرامہ کا نام "غلط فہمی" یقیناً بہت موزون ہے کیونکہ مصنف نے واقعی اپنی قابلیت کے متعلق سخت غلطی فہمی مین مبتلا ہو کر اس کو تحریر کیا ہے۔

فغان درد دیوان ہے جناب سردار عطا محمد خان صاحب درد کا جو نسباً دُرانی اور موطناً قندہاری ہین۔ فی الحال آپکا قیام گجرات مین ہے اور وہین سے یہ دیوان شائع کیا گیا ہے۔

اس دیوان مین جس شاعری کو پیش کیا گیا ہے وہ اسقدر عجیب و غریب چیز ہے کہ مشکل سے اس زمانہ مین اس کی دوسری مثال سوائے دیوان شاد ان کے کوئی اور نظر آسکتی ہے میر کی شاعری یکسر متشائم (Pessimistic) شاعری ہے اس لئے موجودہ دور انحطاط مین اس کا مطالعہ مناسب نہین، غالب کے سمجھنے کے لئے جو وقت صرف ہوتا ہے اس کا استعمال دوسرے مفید کامون مین ہونا چاہئے۔ جان صاحب کا مطالعہ انسان مین نسائیت پیدا کرتا ہے، جعفر زٹل، بے غیرتی کا درس دیتا ہے اور چرکین عفونت و غثیان کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی ایسا کلام مطالعہ مین رہے جو ان تمام باتون سے علحدہ ہو کر وجہ تفریح ثابت ہو اور میرے نزدیک یہ مقصد اس دیوان سے پورا ہوتا ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہون۔

رخِ یار جلوہ فگن بن گیا مرے دل کا دیدہ لگن بن گیا

چھوئے جس نے گیسوئے مشکین ترے سراسر وہ مشک ختن بن گیا

دیدۂ دل کا پھیل کر لگن ہو جانا اور انسان کا از سرتا پا مشک ہی مشک بن جانا کسقدر جدید تخییل ہے۔

دیکھ اے گل نہ کر ہماری جانچ　　　تو نے رہنا ہے چار دن یا پانچ
خار سینہ میں بھی لگے اس کے　　　جس نے دل میں مرے لگائی آنچ

پہلے شعر بے ثباتی کا نقشہ جس موثر انداز سے کھینچا گیا ہے وہ صرف جناب درد کا حصہ ہے اور دوسرے شعر میں عاشقانہ نیاز و فتادگی کے مقابلہ میں درس خودداری دیا گیا ہے جو ہر انسان کا فطری حق ہے۔

ہرگز نہ آب جینی ہے ظرف روغنی میں　　　بیگم میں ہی جو خاصہ پایا نہ ڈومنی میں
شب کو رقیب سے منہ ملتا ہی ناچ گھر میں　　　اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

پہلے شعر میں معاشرت کے تعمیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور دوسرے میں تخریبی پہلو کو۔

بے نیازی کے تیرے صدقے تڑپتا میں ہوں　　　اور توڑے باغ سے کوئی انار زندگی
ہند میں ضائع ہوئی عمر گران شربت کو چل　　　کچھ گزار اب چین میں دن دو دیار زندگی

پہلے شعر میں محبوب کی جوانی کو انار زندگی کہنا اور دوسرے شعر میں "دن ورد یار زندگی"، کی ترکیب داد سے مستغنی ہے

بعض مشکل ردیف و قوافی میں ایسے ایسے شعر نکالے ہیں کہ باید و شاید۔ مثلاً:۔

مسقط کا نہ لا شیخ تو حلوا مرے آگے
رہنے ہی دے گلفام کے بہلاوے آگے

مژگان بت کا حال سنا جب چھوک سے
سینہ یہ چھد گیا مرا اور دل بھی دوک سے

اس کے فراق و عشق میں میرا ہے زرد رنگ
خون چوسنے میں کم نہیں دلبر زلوک سے

کوئی بھی جانتا نہیں اسد کے سب علوم
عاجز ہیں کل فلاسفہ بے بس ہیں فی ہی فہوم

بہر بتان شراب و کباب و رباب و چنگ
ہے عاشقوں کے واسطے دن رات یان قوم

شب کو اٹھا کے لیگیا کوئے بتان میں دل
آیا نہ باز حیف خصومت سے یہ خصوم

حاسد ہے کیا یہ درد کا اے ہمدمو عجیب
دل میں ہے بالخصوص تو پہلو میں بالعموم

سوز فرقت کی لگ گئی ہے آگ　　　تم بجھاؤ تو میرے جاگیں بھاگ
تابش حسن نے تری خورشید　　　منہ سے عاشق کے ہے بجھائی جھاگ

خوش نصیبی ہے آجکل اس کی
جس کو ملتی ہے دال روٹی ساگ

صدمہ ہائے درد سے دل ہو گیا ہے پاش پاش
اب ہو گیا اس کا مداوا تو بتا دے تاش تاش

درد و غم نے کر دیا ایسا نخیف و ناتوان
اندنوں پھر ہو گئی میری غذا ہے آش آش

گر نہیں صاحب تمھارے دل میں کچھ مکر و فریب
کیوں بھلا خلوت سرا کا بند کرتے ہو کواڑ

ہو سکے گی کس طرح ان کی مرمت اے بتو
درد ہجران سے پڑے ہیں خانۂ دل میں دراڑ

مست بازاروں میں جو پھرتا ہے سانڈ
والدہ اُسکی ہے گھر میں ایک رانڈ

ایکدم جاتے رہے عیش و طرب
درد نے آ کر دیا جب دل کو مانڈ

فارسی کی بھی ایک غزل جناب ورمانے تحریر کی جس کے بعض شعر یہ ہیں :-

چون بہ پورب رفتم وو ایر شدم ہم زبان مغربی تا در شدم
حل نمودم نکتہ ہائے فلسفہ از حطاب مغربی فاخر شدم
یافتم ہر اوج جاہ و منزلت چون بہ بزم دوستان حاضر شدم
چون عروسے خوبرو ہر شعر من میکشد ہر قلب را ساحر شدم

یہ مجموعۂ لطایف مصنف سے یا دوکان شیخ الٰہی بخش رحیم بخش تاجران کتب گجرات سے عہ میں ملسکتا ہے۔

کوئی صاحب بغیر اجازت تحریری مصنف اس کو طبع نہیں فرماسکتے اور اگر کسی جلد میں مصنف کا فوٹو نہ ہو تو اس کو مال مسروقہ سمجھنا چاہیئے ۔ مین نے بھی اس کا اظہار اس لیئے کردیا کہ حلقۂ نگار مین کوئی صاحب طمع زر مین اس دیوان کو طبع کرانے کا قصد نہ کرین ، ورنہ وہ بجائے نفع کے نقصان ،، اٹھائین گے ، اور مصنف کبھی اس کو گوارا نہ کرینگے کہ ان کے جواہر ریزے ملک عام ہو کر رہ جائین۔

موید المسلمین یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس مین جناب ابو الظفر موید الدین حسن صاحب مددگار ناظم کورٹ آف وارڈز حیدر آباد نے چند اسباق توحید و رسالت ، نماز و روزہ حلال و حرام ، نکاح و طلاق وغیرہ کے درج کردیئے ہین ۔ رسالہ بہت صاف و سلیس زبان مین ہے اور عورتون اور بچون کی ابتدائی تعلیم کے سلسلہ مین اس کو سبقاً سبقاً پڑھا دینا ضروری ہے طباعت و کتابت صاف و روشن ہے ۔ قیمت درج نہین ہے ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے ملسکتا ہے ۔

شہاب کی سرگزشت

جناب نیاز فتحپوری کا وہ معرکۃ الآرا افسانہ جو سیرۃ نگاری نفسیاتی تحلیل ، بلندیٔ خیال زور تحریر ، ندرت بیان نزاکت تخییل اور قوت انشاء کے لحاظ سے ادب اردو مین ایک بالکل نئی اور نادر چیز ہے ، اول بار اسکا مطالعہ انسان کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے ، دوسری بار اسکا مطالعہ حقیقت سے قریب کے تیسری مرتبہ کے مطالعہ کے بعد انسان اسکے لذات مین بالکل غرق ہو جاتا ہے اگر پسند نہ ہو تو مطالعہ کے بعد واپس کردیجئے اور اپنی قیمت لے لیجیئے ۔ معہ محصول ۱ عہ مین ملیگا ۔ مینیجر نگار ۔ لکھنؤ

تذکرۂ خندۂ گل ہین

کن کن شاعرون کا حال اور انتخاب کلام درج ہے

اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہین تو ایک کارڈ ڈالدیجئے ہم آپ کو مکمل فہرست چھپی ہوئی بھیجدین گے اس کو دیکھ کر آپ خود فیصلہ کرلین گے کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ اس موضوع کے لحاظ سے اتنا بسیط و مکمل شایع نہین ہوا ۔

مینیجر نگار ،، لکھنؤ

بہاریہ

رسید موکب نوروز و چشم فتنہ غنود
درود باد، برین موکب خجستہ درود

کنون کہ برشد آوائے مرغ از بر مرغ
شنید باید آوائے رود بر لب رود

بکتف دشت یکے جوشنیست مینا فام
بفرق کوہ یکے مغفریست سیم اندود

سپہر گوہر بارد ہمی بہ مینا درع
سحاب، لولو پاشد ہمی بسیمین خود

شکستہ تاج مرصع بشاخہ بادام
شکستہ عقد گہر بر ستاک شفتالود

تل شقیق، بمانند مقتلی است شریف
درخت سرو، بمانند گنبدیست کبود

بطرف مرز بر، آن لالہ ہائے نشگفتہ
چنان بود کہ سر نیزہ ہائے خون آلود

بروی آب نگہ کن گہ از تطاول باد
چنان بود کہ، گہ نکرمت جبین جہود

ہزار طرفہ ز آثار باستان یابی
کجا بخواہی، کامے دو باغ را بپیمود

صنیع آذر بینی و حجت زرتشت
گواہ موسی یابی و معجز داود

بہر کہ بر گزری شادی بزد در دل
بہر چہ در نگری، اندہی کند بدرود

یکیست شاد بہ سیم و یکیست شاد بزر
یکیست شاد بچنگ و یکیست شاد برود

ہمہ بچیزے شادند و خرمند ولی
مرا بخرمی ملک شاد باید بود

(م - بہار)

صبح — راوی کے کنارے!

یہ صبح کا وقت، اور یہ راوی کا کنارا — وجد آور و صد کیف بد امان ہے نظارا
فطرت نے ہے کس ذوق سے دریا کو سنوارا

بکھرا ہوا ہے چار طرف حسن فراوان! — میدان مین سارے! راوی کے کنارے!
بکھرے ہوئے موتی ہین کسی زہرہ جبین کے — کھوئے ہوئے منظر ہین کسی خواب حسین کے
ٹکڑے ہین مگر کیف گہہ خلدِ برین کے

یا رند ہین میخانۂ افلاک مین لرزان! — یہ ڈوبتے تارے! راوی کے کنارے!
راوی کے کنارے کی یہ خاموش فضائین! — بیتاب کنان ہجر در آغوش فضائین!
رنگینی فطرت سے ضیا پوش فضائین!

یہ صبح طرب ریز، لب رود خرامان — یہ مست نظارے! راوی کے کنارے
فردوس کی موسیقی سے لبریز ہے دریا — یا خلد کے نغمون سے جنون خیز ہے دریا
یا رقص سے حورون کے طرب ریز ہے دریا

حورین!-جو ہین آغوش مین راوی کے خرامان — دلکش ہین نظارے، راوی کے کنارے
لیکن ہے غم آلود یہ موسیقی رنگین — نغمات مین راوی کے ہے رودادِ غم آگین
موجون کے تبسم مین ہے اک گریۂ خونین!

اور "عہد گزشتہ" کی طرف لہرون کا ہیجان — کرتا ہے اشارے! راوی کے کنارے
رنگِ "مئے پارینہ" سے شاداب ہے راوی — اُس "عشرت برباد" کا اک خواب ہے راوی
اُن "محفلون" کی یاد مین بیتاب ہے راوی

ہان، یادِ جہانگیر مین راوی بھی ہے گریان — لرزان ہیں ستارے، راوی کے کنارے

"راشد علی پوری"

مقبرہ ہمایون

نکہت رسیدہ غنچہ کے برگِ جگر فگار　　اک نازنین کے جذبۂ الفت کی یادگار
اے تاجِ ہند کے صدفِ دُرِّ آبدار

اے آسمان جاہ کے بے نور ماہتاب　　اے شاہدِ جمال کے اُترے ہوئے شباب
عبرت سرائے دہر کی تصویر بے نقاب

تو نغمۂ خموش ہے نا آشنائے چنگ　　وہ صحنِ گلکدہ کہ جو ہو بے نیاز رنگ
وہ تیغ جس کے رُخ پہ پڑی ہو نقاب زنگ

وہ سنگ جس کے دلمین ہو پنہان جمال طور　　وہ قطرہ جس کے سینہ کے اندر ہو بحر نور
وہ ذرہ جس کے بطن سے ہو مہر کا ظہور

وہ طوق جس مین بسمل تیر قضا ہو قید　　وہ دام جس مین طائر شیرین نوا ہو قید
یا وہ قفس کہ تارون مین جسکے ہما ہو قید

اے چشمِ مضطرب یہ تجھے کیا ہوا کہ تو　　ہے آج اس مزار پہ سرگرم جستجو
کیون اے لب خموش یہ کیسی ہے گفتگو؟

اک جنبشِ نگاہ سے تربت اُچھال دی　　اُف! آرزوے مردہ مین پھر جان ڈال دی
محمود تو نے نعشِ ہمایون نکال دی!!

"محمود اسرائیلی"

"شکوۂ تغافل"

بھولنے والا مرا ہر وقت مجھکو یاد ہے　　مین تو ہون ناشاد لیکن بھول کر وہ شاد ہے
سنگدل کہتے بھی ڈرتا ہون اُسے صدمہ نہ ہو　　مجھ سے ہو سکتی نہین فریاد بھی فریاد ہے

(قاضی محمد مرید صابر وزیر آباد)

آزادی

تو کیا شے ہے اے آزادی | تیرے غم نے آفت ڈھا دی
تیرے نام کا شیدائی ہون | تیرے شوق کا سودائی ہون
آنکھ سے سیلِ اشک رواں ہے | لب پر ہر دم آہ و فغاں ہے
اپنی کہانی کس کو سناؤن | کس کو داغِ سینہ دکھاؤن
آنکھ کھلی صیاد کے گھر مین | دہر قفس ہے میری نظر مین
یاد بھی مجھ کو اب نہین آتا | تھا بھی نشیمن یا کہ نہین تھا
غنچۂ خاطر کھل نہ سکا اُف | سعی کا سامان مل نہ سکا اُف
جب ذوقِ پرواز دیا تھا | یارب کیون پابند کیا تھا
زہر ہوا ہے رنجِ اسیری | حد سے گزری بے توقیری
خون ہوا ہے دل سینے مین | اب کیا رکھا ہے جینے مین
عالم مین بیکار سی شے ہون | خُم مین گویا دُردِ مے ہون
رونا میرا ننگِ دیدہ | دستِ دعا ہے دستِ بُریدہ
نقشِ سجدہ داغِ جبین ہے | میری عبادت دشمنِ دین ہے
جو آزاد ہین شاد وہی ہین | شاد وہی آباد وہی ہین
عیش اُنکا آرام اُن کا ہے | ہستی اُن کی نام اُن کا ہے
اے آزادی تو کیا شے ہے | مین تو زندانی ہون ہے ہے
تو عالم کی روحِ رواں ہے | بزمِ فنا کی شمعِ جان ہے
رودِ آبِ رواں ہے تجھ سے | موجِ بادِ دواں ہے تجھ سے
سازون مین آواز ہے تجھ سے | چڑیون مین پرواز ہے تجھ سے
دام مین پروانہ گر ہوتا | شمع سے واصل کیونکر ہوتا
عشق و دین و مذہب تجھ سے | دنیا عقبےٰ ہے سب تجھ سے
زہر بھی ہے کچھ جام مین تیرے | دھوکا بھی ہے نام مین تیرے

دیکھی نہین ہے صورت تیری | پھر بھی ہے یہ حالت میری
دل ہے مشتاقِ نظارہ | غم سے جگر ہے پارہ پارہ
نام ترا مین جب سُنتا ہون | بیتابانہ سر دھُنتا ہون
میرا کوئی یار نہین ہے | ہمدرد و غمخوار نہین ہے
آہ بہارِ چمن کیا جانون | مین لطفِ گلشن کیا جانون
نشو و نما ہونے نہین پائی | پیدا ہوتے ہی موت سی آئی
مجھ کو ملے تھے جتنے جوہر | رہ گئے دل کے دل مین دب کر
گر یہ بال و پر ہی نہ ہوتے | تو پرواز کو ہم کیون روتے
کوئی نہ پوچھے اب مین کیا ہون | اُف زندہ در گور ہوا ہون
اک اک پل بھاری ہے جینا | جینا خونِ جگر ہے پینا
میرا وجود ہے بارِ ہستی | جینا رہنا عارِ ہستی
جوشِ عشق فریبِ دل ہے | میرا عہدِ وفا باطل ہے
عشق ہے حیرت کا طالب | ذوقِ عمل وسعت کا طالب
عاشق وہ ہین عامل وہ ہین | ہر پہلو سے کامل وہ ہین
مالک اس دنیا کے وہ ہین | بندے اپنے خدا کے وہ ہین
تیرا راز جنھون نے جانا | کہتے ہین وہ عاقل و دانا
جب تو نے صورت دکھلائی | شمس و قمر مین گردش آئی
تجھ سے نشو و نما ہے بن مین | جوشِ گل صحنِ گلشن مین
تجھ سے خونِ تن مین روانی | تجھ سے دل مین جوش جوانی
گر دیندار آزاد نہ ہوتے | دیر و حرم آباد نہ ہوتے
کہتے ہین لیکن یہ بھی مبصر | کرتی ہے گمراہ تو اکثر
مطلق آزادی تو جنون ہے | عقل کا کھونا کارِ زبون ہے

یہ مانا آزاد ہے عالم | لیکن دیکھیں غور سے گر ہم | پابندِ آئینِ قدرت | ہیں سارے اجزاے فطرت
انجم و ماہ و مہرِ اعظم | ہیں پابندِ جذبِ باہم | جذبِ باہم ربطِ جان ہے | نظمِ عالم کا سامان ہے
جو ہے کشش اس نظمِ جہاں میں | ہے اخلاق وہی انسان میں | اس آزادی کو روتا ہون | جب مین بہت بیکل ہوتا ہون
گلشن مین آزاد رہون مین | بے خوفِ صیاد رہون مین | پابندِ اخلاق و محبت | ہو میرا ہر جزو طبیعت

عشق گلشن روحِ روان ہو
کار وفا ایمانِ جان ہو

جگر بریلوی

ترانۂ دل

مری نمود کفِ خاک سے ہے وابستہ | وہ نشہ ہون کہ رگِ تاک سے ہے وابستہ
مین ہون تو نخل بہ آغوش دانہ مین لیکن | مری نمو رگِ گلِ نمناک سے ہے وابستہ

(۲)

خودی پرست بھی ہون مین خدا پرست بھی ہون | مین اپنی آپ ہی تعمیر بھی شکست بھی ہون
مرے تضاد سے رونق ہے بزم ہستی کی | مین ہوشیار بھی ہون اور سیاہ مست بھی ہون

(۳)

خمِ سفال اِنہ بادہ ہے نہ سرور ہے تو | بذاتِ خود ہے گلِ تیرہ بے شعور ہے تو
مرے ظہور سے تابان ہے ذرہ ذرہ ترا | مری نمود سے اے مشتِ خاک طور ہے تو

امین حزین

غزلیات

اختر شیرانی :-

بیوفا کو عبث الزامِ جفا دینا تھا!
ہم ہی بھولے کہ تجھے دل سے بھلا دینا تھا!

حسن و الفت میں نہیں تفرقۂ فرد و دوئی
جذبِ کامل کو یہ پردہ بھی اٹھا دینا تھا!

مبتلا ہو کے ترے عشق کی سرمستی میں
دل سے نقشِ غمِ ہستی کو مٹا دینا تھا!

رسمِ فرہاد ہے دنیا میں ابھی تک زندہ!
یہ تماشا بھی کبھی اُن کو دکھا دینا تھا!

ہو کے ناکام، ہوس کار بنے کیوں اختر
یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا!

اثر رحمانی رامپوری :-

خدا سرسبز رکھے گلستانِ حسنِ جانان کو
تصور ہی میں ہم بھر لیتے ہیں پھولوں سے دامان کو

جہان تک چھپ سکا دل میں چھپایا رازِ پنہان کو
مگر کیا کیجئے اس دیدۂ خونناب افشان کو

وفاؤں کا گلہ ہو یا جفاؤں کی شکایت ہو
پشیمان کیا کرے گا عشق حسنِ ناپشیمان کو

اثر گھر سے نکل کر بھی نہ وحشت کم ہوئی دل کی
بیابان میں کبھی پہنچا کبھی دیکھا گلستان کو

ثاقب جالندھری :-

مرے دل کو ہے ان کے حسنِ عالمگیر کی خواہش
خدا کی شان ہے ذرہ کرے تنویر کی خواہش

اگر پوری نہ کرنی تھی نہ کرتے پوچھ تو لیتے
کسی ناکام کی حسرت کسی دلگیر کی خواہش

مجھے صحرا کی جانب چند کانٹے کھینچ لائے تھے
لئے جاتی ہے زندان کی طرف زنجیر کی خواہش

بہت مشکل ہے میرے عقدۂ مشکل کا حل ہونا
نشاط انگیز ہے کیوں ناخنِ تدبیر کی خواہش

یہ مرگ و زیست کے ہنگامے گذرین تو وہان گذرین
جہان لے جائے رنگِ عالمِ تصویر کی خواہش

ابھی تک عالمِ بیم و رجا کی کشمکش مین ہون
خدا جانے دکھائے کیا مجھے تقدیر کی خواہش

شوق مرادابادی:۔

وعدہ کیا ہے آپ نے آنے کا خواب مین
اب کام کیا بھلا مری آنکھون مین خواب کا

ہر جنبشِ نگاہ پہ گھبرا رہا ہے دل
مورد ہو کون دیکھئے؟ ناز و عتاب کا

تھین کس کی چشمِ مست مین کل مےفروشیان
کس نے پلا دیا ہمین ساغر شراب کا

رنگِ پریدۂ رُخِ عاشق گواہ ہے
یارب! کسی کی برہمیِ بےحساب کا

دل ہے فریب خوردۂ طرزِ وفائے دوست
پرسان ہو کون اب مرے حالِ خراب کا

سوزِ غمِ فراق سے رگ رگ تپیدہ ہے
کیا خوف حشر مین تپشِ آفتاب کا

اے شوق سربزانوئے غم ہون تمام رات
کیون راز فاش ہو دلِ پر اضطراب کا

عشرت رحمانی:۔

ضبط کی تاب نہین، طاقتِ فریاد نہین
اور تسکین کا پہلو بھی مجھے یاد نہین

اب جہان چاہے مجھے خانہ خرابی لیجائے
خود فراموش کچھ ایسا ہون کہ گھر یاد نہین

پردہ ہائے حرم و دیر اُٹھے ہین لیکن!
سجدۂ عشق سے آگے مجھے کچھ یاد نہین

انتہا یہ ہے کہ جینے کا نہین ہوش مجھے
ابتدا کیا ہوئی اُلفت کی یہ کچھ یاد نہین

کیا شکایت کرین عشرت کہ بقول غالب!
ہمکو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہین!!

نظیر لودھیانوی:۔

شبِ غم زبان سے یارب کبھی وہ صدا نہ نکلی
جسے سُن کے خوابگہ مین کوئی بےقرار ہوتا

ہے فروغِ ماہ شب بھر ہے بہارِ باغ دو دن
تری دوستی پہ کیونکر مجھے اعتبار ہوتا

جو سکون کسی قدر ہے تو وفورِ یاس سے ہے
جو امیدِ وصل ہوتی تو کسے قرار ہوتا

اسے رائگان نہ سمجھو یہ نفسِ عجیب شے ہے
تب و تاب عشق رکھتے تو یہی شرار ہوتا

غمِ عشق وہ بلا ہے کہ جو مہرومہ نہ ہوتے
تو فلک پہ شعلہ بن کر یہ غمِ آشکار ہوتا

غمِ ہجر مین بھی آتا مجھے لطف زندگی کا
مئے خوشگوار ہوتی لب جو نبار ہوتا

ترے غم مین جان دیدی تو یہ کونسی خطا کی
کسی در پہ سر جھکا تا تو گناہگار ہوتا

مرا خونچکان فسانہ اگر ایک بار سنتا
کوئی دہر مین سکون کا نہ امیدوار ہوتا

جو نظیر اُس کے دل مین نہ خدا نے رحم ڈالا
تو مجھے ہی میرے دل پر کوئی اختیار ہوتا

معلومات

حقایق طبیعی کے بعض عجائب

ایک پونڈ پانی کو جوش دیجیے تو معلوم ہوگا کہ جسقدر وزن اُس کا نقطۂ انجماد پر تھا اس سے کچھ زیادہ ہو گیا ہے، لیکن یہ زیادتی $\frac{5}{1000000000}$ پونڈ سے زاید نہ ہوگی۔ اسی طرح جب پانی غلیانی حالت سے اُتر کر نقطۂ انجماد پر پہونچتا ہے تو اس کا وزن $\frac{3}{100000000}$ پونڈ کم ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا حجم بڑھجاتا ہے۔

اسی طرح جب آکسیجن اور ہیڈروجن دو گیسیس پانی کی مقدار معین بنانے کے لئے باہم ملتی ہین تو ان دونون کا وزن پانی سے زیادہ ہوتا ہے اور یہ زیادتی $\frac{1}{9000000}$ ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب پانی سرد ہوتا ہے تو حرارت کے ذریعہ سے کوئی چیز اس سے کم ہو جاتی ہے اور جب آکسیجن ہیڈروجن ملتی ہین تو وہ حرارت جو باہم ملنے سے قبل ان مین پائی جاتی تھی مفقود ہو جاتی ہے۔ یعنی دونون صورتون مین جسم سے قوت کا کچھ حصہ زایل ہو جاتا ہے اور قوت کے لئے جِرم اور جِرم کے لئے وزن ضروری ہے۔

ریاضی کے حسابات دقیقہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آفتاب ہر ثانیہ مین ۴۰۰ ملین ٹن مادہ شعاعون کے ذریعہ سے خارج کرتا رہتا ہے۔ اور اصولاً اس سے جرم شمس مین کوئی نقص پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اگر اسی حساب سے وہ ۱۰ ملین سال تک برابر اپنا مادہ ضایع کرتا رہے تو اس کے جرم اور قوت کشش کو لاکھوین حصہ سے بھی کم نقصان پہونچیگا۔

کہربائی آنکھ اور اس کا استعمال

جس وقت آفتاب غروب ہوجاتا ہے اور افق مین تاریکی پیدا ہوجاتی ہے اُس وقت اگر کسی کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو آنکھون کو بہت صدمہ پہونچتا ہے۔ اس زحمت کو دور کرنے کے لئے امریکہ کے مدارس نسوان کی مہتمم عورتون نے تعلیم پانے والی لڑکیون کے لئے کہربائی آنکھ کا استعمال شروع کیا ہے۔

کہربائی آنکھ کا ذکر اس سے قبل نگار کے باب معلومات مین آچکا ہے۔ یہ ایک کہربائی بیٹری ہے جو طبیعی روشنی کو جذب کرکے برقی رو مین اسے تبدیل کردیتی ہے۔

مدرسون کے کھڑکیون مین یہ آلہ رکھدیا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے فضا کے روشن حجرون کے ایک ایک گوشہ مین پہونچتی ہے اور رات کو بغیر برقی روشنی کے مدد سے اس کے ذریعہ سے مطالعہ ہوسکتا ہے اس آلہ کا ایک طبی فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ مکان کے جن حصون مین آفتاب کی روشنی بہ آسانی نہین پہونچ سکتی وہان اس آلہ کے زریعہ سے بخوبی روشنی پہونچ سکتی ہے اور تاریکی کے مضر اثرات سے مکان کے رہنے والے محفوظ رہ سکتے ہین۔

پتھر کے ملبوس

اسبسٹوس ایک قسم کی معدنی سنگین چیز ہے جس مین ریشے پائے جاتے ہین اور آگ کو قبول نہین کرتے۔ فلاڈلفیا کے ایک ماہر کیمیا نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اس سے کپڑا طیار کرنے والا ہے جو ریشم کی طرح نرم ہوگا لیکن نہ اس پر تیزاب کوئی اثر کرسکے گا اور نہ آگ اُسے جلاسکیگی۔

پروفیسر مذکور کا بیان ہے کہ قدیم روما مین اس کے لباس کا رواج پایا جاتا تھا لیکن اس طرح کہ ریشم کے تاگون کے ساتھ اس کے تارون کو بھی ملادیتے تھے اور یہ کپڑا کفن کے لئے مستعمل ہوتا تھا۔

اسی طرح سترھوین صدی مین چین کے تاجر اس کے مندیلون کی تجارت کرتے تھے۔ مدعا یہ کہ اسبسٹوس کے کپڑے طیار کرنا کوئی نئی بات نہین ہے، لیکن اس کا کپڑا ایسا صاف بن سکتا تھا کہ عام طور پر اس کا رواج ہوجاتا۔ اب پروفیسر مذکور نے اس کو ایک بہترین خوشنما کپڑے کی صورت مین تبدیل کرنے کا ارادہ کیا ہے جو عام کپڑون سے ارزان بھی ہوگا۔

اگر اس مین واقعی کامیابی حاصل ہوگئی تو مانچسٹر کو امریکہ کے مقابلہ مین ایک بالکل نئی مصیبت سے متصادم ہونا پڑیگا۔

ریڈیم کا جدید استعمال

اسوقت معدنی اشیاء مین ریڈیم سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہین ہے اور علاج امراض مین اس سے بہت کام لیا جاتا ہے، لیکن حال ہی مین اس سے اور کام لیا جانے لگا ہے یعنی روس کے پایۂ تخت لیننگراڈ مین ایک کارخانہ ربڑ کے کپڑے طیار کرنے کا ہے وہان اس سے حفاظت آتش کا کام لیا جاتا ہے۔

چونکہ ربڑ کے کارخانون مین آگ لگنے کا بہت احتمال ہوتا ہے اور بسا اوقات بجلی کے تارون سے آگ کی چینگاری نکل کر گودام کے گودام تباہ کردیتی ہے، اس لئے ریڈیم کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ آگ کے حادثے رونما نہ ہون۔

ریڈیم کا یہ بھی ایک خاصہ ہے کہ وہ بجلی کی مجتمع قوت کو آہستہ آہستہ فضا مین منتشر کردیتا ہے اور نقصان کے احتمال کو دور کردیتا ہے۔ اسلئے انھون نے ریڈیم لگادیا ہے جس سے بجلی کے تارون مین آگ پیدا ہونے کا احتمال نہین ہوتا۔

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین ستمبر ۱۹۲۹ء

ملاحظات ——— ۲

ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مشابہت — محمد نعیم الرحمن ایم اے ۹

بازگشت (فسانہ) — مجنوں گورکھپوری۔ ۱۶

ہندوستان کیونکر فتح ہوا — عبدالقیوم رسا ۲۷

انارکسٹ (فسانہ) — طالب باغپتی ۳۷

تصوف اسلام — سید عبدالمالک آروی ۴۳

چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ ——— ۴۹

فسانہ عجائب کے اجزاء ترکیبی — «نقاد» ۵۷

مشرقی مآثر۔ فلکیات و ریاضی مین — بدر اصلاحی ۶۷

ایک سیاح کی ڈایری ——— ۷۱

منظومات ناطق ——— ۷۵

باب الاستفسار ——— ۸۲

ہوا کا ترانہ (نظم) — طفیل احمد شمیمی بی، اے ۸۷

سیر کہسار (نظم) — حافظ غازی پوری ۹۱

تربیت اطفال (نظم) — محمود۔ اسرائیلی ۹۳

تحریص عمل (نظم) — امین حزین ۹۳

غزلیات ——— ۹۴

معلومات ——— ۹۵-۹۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶)　ستمبر ۱۹۲۹ء　شمار (۳)

ملاحظات

آپ کو معلوم ہے کہ مذہبیات عالم میں سب سے زیادہ مہتم بالشان رفیع المرتبت و جلیل القدر ساعت زابتدائے ظہور آدم تا ایندم کونسی ہے۔ وہ ۲۶ صفر ۱۳۴۸ھ یوم شنبہ مطابق ۲ اگست ۱۹۲۹ء وقت ۲ بجے دن کی ہے جبکہ آفتاب ۱۲ درجہ، ۲۰ دقیقہ ۴۸ ثانیہ پر پایل بمغرب قایم تھا اور تمام نجوم سعد کا قران اعظم فرنگی محل لکھنؤ کی محلسرا پر نور افگن

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ

واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

حضرت قبلہ مولینا قطب الدین عبدلوالی صاحب مدظلہ فرنگی محلی سرپرست انجمن معید الاسلام نے دعوت خاص دی اکناف ہند کے تمام ممتاز علمائے کرام اور اکابر رہنمایان قوم کا (ایڈیٹر ہمت کی تاب نہیں) شاندار اجتماع ہوا لامذہبی اور دہریت کے انسداد کی تدابیر پر غور و مشورہ کیا گیا اور اس طنطنہ و دبدبہ اور اس شوکت و جبروت کے ساتھ کہ

تزلزل در ایوان کسرے فتاد

راویان خجستہ اطوار و پیام رسانان ذی جاہ و وقار متفقہ طور پر یوں زمزمہ پرداز ہوتے ہیں کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ یہ اجتماع فرنگی محل میں برپا ہو رہا تھا،

امریکہ میں بہ مقام واشنگٹن، ایران میں بمقام طہران، ترکی میں بمقام انگورا، روس میں بمقام لینن گراڈ، اطالیہ میں بمقام وٹیکن، اور نظیر آباد میں بمقام دفتر نگار سخت خطرناک زلزلہ کے آثار محسوس ہوئے، روشنی کے منارے بجھ گئے، مشینیں چلتے چلتے رک گئیں کلیساؤں کے گھنٹے زمین پر آرہے، ماہی زمین نے کروٹ لی قطب اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے رہ گیا اور کوہ طور پر بجلی چمک چمک کر

سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ

جناب مولانا قطب الدین عبد الوالی صاحب نے اپنی "مؤثر و ایمان آفریں" انداز میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:-

لامذہبیت اور زندقہ کا سیلاب ہندوستان میں بڑھ رہا ہے اور تحریروں و تقریروں میں جس طرح مذہب کو بازیگاہ بنایا جا رہا ہے وہ آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ افغانستان ایران جس طرح آزاد ہو رہے ہیں وہ ایسی چیز نہیں ہے جس کا اثر ہندوستان پر نہ پڑے، اس لئے ضرورت ہے کہ علمائے کرام بہت جلد اپنے فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ادا کرنے کے واسطے میدان عمل میں اتر آئیں۔"

اس کے بعد متعدد "مولاناؤں" نے جنہیں بہ لحاظ حجم مولینا شوکت علی و بہ لحاظ انحنار مولانا آزاد سبحانی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اپنی "قیمتی تقریروں" میں "فاضل مقرر" کی تائید کرتے ہوئے علمائے کرام کی مستعدی و فرض شناسی کی ضرورت کا اعتراف کیا اور اس طرح گویا اصولاً تحریک کی ضرورت پر مہر توثیق ثبت ہو گئی۔

اس کے بعد مولینا شہید انصاری نے بعض "بزرگان قوم" کے خطوط کا خلاصہ سنایا جنہوں نے اس مقصد سے اظہار ہمدردی کیا تھا اور پھر "مختلف علمائے کرام" کا ایمان افروز اور خلوص پرور بیان پیش ہوا جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ:-

مغربی تعلیم۔ یورپی معاشرت اور فرنگی مادہ پرستی کا ایک خطرناک اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ بہت سے لوگ آزادی مذہبی بلکہ لامذہبی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ارکان دین میں ترمیم کی ضرورت ہے کوئی سمجھتا ہے کہ دین کی مطلقاً ضرورت نہیں کسی کا خیال ہے کہ دین علماء مذہبی آزادی و ترقی کے لئے سنگ راہ ہیں اور جس قدر جلد ممکن ہو انکا خاتمہ کر دیا جائے۔ غرض آزادی مذہبی مختلف صورتوں میں نمایاں ہو رہی ہے اور روز بروز مذہبی انذر جدید نسل کے قلوب میں گھر کر رہی ہے، یہاں تک کہ بعض نام نہاد حاملان دین بھی اس سیلاب میں بہہ گئے ہیں۔ ہندوستان کے نوجوان مختلف جماعتوں کے نام سے منظم ہو رہے ہیں جو علی الاعلان کہتے ہیں کہ کسی مذہب کو زندہ نہ رہنے دو۔ اور قصر مذہب کی اینٹ سے اینٹ بجا دو، ان لوگوں نے مذہب کے خلاف عام بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ اور نئے فتنہ کے احیاء و ابقا میں سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں اس مہلکہ عظیم سے اگرچہ دیگر اقوام کو بھی نقصان پہونچیگا، لیکن وہ قوم (مسلمان) سب سے زیادہ خسارہ میں رہیگی جنکی قومیت سیاست اور وطنیت سب کچھ مذہب ہی ہے اور جنکی اخروی نجات کا انحصار اسلام ہی پر ہے، ان حالات اور انکے خوفناک نتائج کو محسوس فرما کر انجمن سید الاسلام فرنگی محل لکھنؤ نے ۲۳ اگست سنہ ۱۹۲۹ء کو ہندوستان کے ہر طبقہ کے علماء کو مدعو کیا اور مقتدر اعیان ملت سے بھی مشورہ لیا گیا۔ اس جلسۂ مشاورت نے بالاتفاق مقتدر علماء کی ایک کمیٹی بنا دی جو اسباب لامذہبی کے انسداد پر غور کریگی۔ سردست ہم دستخط کنندگان یہ اعلان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ قوم مسلمین کی پناہ و حفاظت اور اسکی دینی اور دنیوی نجات اسلام اور صرف اسلام ہی سے وابستگی پر منحصر ہے۔ آزاد یورپ کی

ترقی یافتہ قومیں آجتک نام نہاد مسیحیت کی پرستش کرتی ہیں - بائیس کروڑ ہندو برادران وطن اسکی سرفروشانہ جدوجہد کر رہے ہیں کہ ویدک دھرم کی ہر رسم کی حفاظت کی جائے۔ ہمارا اسلام دین فطرت ہے اور خالق فطرت کی حکیمانہ تشریحات کا مقدس مجموعہ ہے وہ جہاں روحانیت و اخلاق کا بحر ذخار ہے وہاں سچی وطنیت اور سچی آزادی کا بھی علمبردار ہے، لہذا ہر کلمہ گو کا فرض ہے کہ وہ پکا اور سچا مسلمان بنے۔ اسلام ہی اسکی عقاید کی روح ہے اور وہی اسکی زندگی کے ہر لمحہ میں رہبر و راہ نما۔ نیز اوسے چاہئے کہ اپنے قول و فعل کی تمام طاقتوں سے لامذہبی اور الحاد کو پامال کرے اور خدا کے بندوں کو خدا کی بغاوت سے روک دے۔ اس بارہ میں داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے بہترین ہادی ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ دین و دنیا کے اس محسن اعظم کی ہر سنت کو زندہ رکھیں اور خود زندہ رہیں۔

اس کے بعد بعض علمار کرام کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور یہ ڈراما اس طرح ختم ہوا، کہ دستور العمل بنانے کے لئے مولانا آزاد سبحانی اور سید جالب کا انتخاب کیا گیا:-

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

یہانتک تو "اس اہم جلسہ" کی کارروائی کا بیان تھا جو ۲۰ اگست کو فرنگی محل میں لامذہبیت و دہریت کے انسداد کے لئے قایم ہوا، لیکن آئیے ساتھ ہی ساتھ "اس جلسہ" اور "ارکان جلسہ" کی حقیقت پر بھی اک نظر ڈال لیں، کیونکہ ممکن ہے یہ کہانی پھر دوبارہ آپکے سننے میں نہ آئے۔

سب سے پہلا سوال ان جلسہ کرنے والوں سے یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپکو علمار کرام میں کس استحقاق سے شمار کرتے ہیں اور ایک عالم کی وہ کیا خصوصیات ہیں جن کا حامل وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

کیا فرنگی محل کی سکونت، کیا دیوبند کا قیام، کیا درس نظامی کی چند کتابوں یا اس سے بھی زیادہ "یک خروار کتابوں" کا مطالعہ ایک شخص کو علمائے کرام میں شامل کر سکتا ہے؟ کیا عالم نام ہے صرف اس شخص کا جو بالکل مقلدانہ و غیر مجتہدانہ طور پر چند مسایل فقہیہ کا علم رکھتا ہو، کیا ایک عالم کا تشخص منحصر ہے محض اس امر پر کہ اسنے چند کتابیں حدیث کی پڑھ لی ہوں، کیا عالم کی پہچان یہی ہے کہ وہ عمامہ و عبا سے کبھی منفک نظر نہ آتا ہو، کیا عالم حقیقتاً وہی ہے جو صرف خوش بیان واعظ اور خوش الحانی سے مثنوی مولانا روم کے اشعار پڑھ سکتا ہو؟ کیا عالم اسکو کہتے ہیں جو اپنے آپکو مسجود دنیا سمجھے اور اپنے سوا سارے عالم کو حقیر و ذلیل۔ اگر واقعی ایک شخص انہیں خصوصیات کا حامل ہونے کے بعد عالم کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے تو کس کے منہ میں زبان ہے کہ اس جلسہ کی اہمیت سے انکار کرے۔ لیکن اگر عالم کہتے ہیں نبض شناس فطرت کو، اصلاح ملک و قوم کے لئے تمام دنیاوی اغراض کو ترک کر کے ایثار و قربانی کا عملی درس دینے والے کو، اس صالحیت و صلاحیت کے حامل کو جس کے لئے وراثت ارض کا وعدہ خدائے قدوس نے کیا ہے، ان صلحائے بےنفس کو جو سینوں کو بغض و حسد سے، دلوں کو نفاق و ریا سے پاک کر کے محض خالصتاً للہ ہدایات خداوندی پر عامل ہو کر دوسروں کے لئے دلیل راہ بنتے ہیں، اور اگر عالم کی ذات عبارت ہے اس استقامت عمل، اس استواری عزم اور اس روحانیت اخلاق سے جس کا لازمی نتیجہ دنیا میں ہمیشہ ایک اور صرف ایک (انتم الاعلون) ظاہر ہوا ہے، تو میں کہونگا کہ علمار کرام کے لئے یہ زیادہ موزوں ہوتا کہ وہ دوسروں کے ایمان کا جائزہ لینے کے

بجائے پہلے خود اپنے ہی اخلاق و اعمال کا احتساب کرتے اور دوسروں کی اصلاح پر متوجہ ہونیکے بجائے پہلے وہ اپنی ہی اصلاح سے فارغ ہوجاتے اور بجائے قال کے وہ صرف اپنا حال پیش کرتے کہ دنیا از خود انکی طرف جذب ہوجاتی

آج فرنگی محل میں علمائے کرام کی ایک جماعت ملک کے اندر دہریت و لامذہبیت کی اشاعت پر ماتم کرنے کے لئے فراہم ہوجاتی ہے، لیکن اس سے قبل کبھی اس کی توفیق اس کو نصیب نہیں ہوتی کہ وہ ضلالت و گمراہی کی تقسیم کرکے یہ متعین کرتی کہ اگر دنیا لامذہبیت کی بلا میں گرفتار ہے تو وہ خود صراطِ مستقیم سے منحرف ہونے میں کس نوع کی گمراہی کا اپنے آپ کو مجرم قرار دیتی ہے

جہانتک اعلان و نمایش کا تعلق ہے بیشک یہ اپنے آپ کو علمائے کرام کہنے والا گروہ بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یقیناً وہ نماز میں زیادہ پڑھتا ہے، پیشانی پر اثر سجود کو بھی نمایاں کرلیتا ہے، صیام کے سلسلہ میں ہزاری روزہ بھی ترک نہیں کرتا اور جب حج کو جاتا ہے تو وہاں سے خاکِ شفا کی تسبیح اور آبِ زمزم بھی اپنے احباب و اعزہ کے لئے لاتا ہے۔ لیکن اگر ایمان و اسلام کا تعلق بطون سے ہے، اگر عبادات سے مقصود تزکیہ نفس و اخلاق اور تصفیہ قلب و روح ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ محشر میں ان علمائے کرام کیلئے کوئی علٰحدہ صف قائم کیجائیگی

آج یہ "علمائے کرام" کا گروہ اس کا تو شاکی نظر آتا ہے کہ "لوگ مذہبی آزادی بلکہ لامذہبی کا شکار ہو رہے ہیں" لیکن خود اپنے گریبان میں منہ ڈالکر یہ غور کرنیکی توفیق کبھی نہیں ہوتی کہ "یہ" اور "وہ" "تست" تو نہیں ہے، وہ زمانہ گیا جب ایک طرف "حق را بسجودے دنبی را بہ درودے" کا افسوں کارگر ہوجاتا تھا اور دوسری طرف دامن امید پُر۔ اب دنیا ایک خاص اضطراب میں مبتلا ہے، علوم و فنون کی ترقی سے عقول انسانی ترقی یافتہ ہوکر مطالبہ کررہی ہیں کہ سب سے زیادہ مدعی صداقت مذہب، سب سے زیادہ ثبوت اپنے فطری ہونے کا دے اور علماء کی تنگ نظری، بیکسی و بیچارگی، تہی مائگی و ناداری کا یہ حال ہے کہ اگر انکے منقولات کے دفتر کو نظر انداز کردیا جائے تو پھر سوائے کافر کہدینے اور گالیاں دینے کے اور کوئی ذریعہ دفاع ان کے پاس نہیں رہجاتا کیونکہ خود اپنے اندر کوئی قوت اخلاق و روح کی ایسی ہے ہی نہیں جو دوسروں پر اثر ڈال سکے

جس وقت کسی گوشہ سے یہ صدا آجاتی ہے کہ "علماء کا جلد سے جلد خاتمہ کردیا جائے کیونکہ وہ آزادی و ترقی کے لئے سنگ راہ ہیں" تو یہ اپنی گردن چھڑانے کے لئے بہت اچھلتا کودتا ہے، لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ جو چیز عملاً بیکار ہوجاتی ہے وہ اصولاً آپ ہی حذف ہوجایا کرتی ہے، اسکا خاتمہ تو اسیوقت ہوگیا جب اس نے دین کو ذریعہ رزق قرار دیا۔ خدمت دینی کا منصب خدا نے اسیوقت اس سے چھین لیا جب اس نے اپنے آپکو ایک بت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا

وہ یہ زبان سے تو ضرور کہتا ہے کہ:۔

"ہمارا اسلام دین فطرت ہے، خالق فطرت کی حکیمانہ تشریح کا مقدس مجموعہ ہے، وہ سچی وطنیت اور سچی آزادی کا علمبردار ہے"

لیکن عمل کے لحاظ سے اسکی تعلیم یہی ہوتی ہے کہ اسلام نہ وطنیت کا حامی ہے نہ آزادی کا علمبردار، نہ اسمیں کوئی حکیمانہ تعلیم ہے اور نہ مصلحانہ تبلیغ، بلکہ وہ بالکل غیر فطری، غیر آلہی، اور غیر مہذب مذہب ہے جو دنیا میں صرف خود غرضی اور نفس پرستی کی اشاعت کے لئے رونما ہوا

ایک عالم یہ ضرور کہتا ہے کہ:۔

"داعی اسلام رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے بہترین ہادی ہے"

لیکن نہ وہ اسوۂ حسنہ کے مفہوم سے واقف ہے اور نہ داعی اسلام کے اخلاق و عادات سے، اس نے اس قسم کے چند الفاظ محض گرمیِ سخن قایم رکھنے کے لئے یاد کر لئے ہیں، قلب و روح کی حرارت کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا یہ علمار تاریخ اسلام سے مطلق واقف نہیں اور کیا انہیں نہیں معلوم کہ جب عہد عباسیہ میں اسلام کو ایک خدائی و فطری مذہب کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اور دیگر ملل و مذاہب کے علمار و حکما کو اس کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی تو کتنے جدید مسایل ابرسرِ کار آئے اور اس عہد کے علمار و متکلمین نے کس وسعتِ نظر اور مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ اور کیونکر انہوں نے منقولات کو علحدہ رکھکر صرف معقولات کی مدد سے فریق مخالف کو اسلام کا مدّاح بنا لیا۔ پھر آج جبکہ عباسیہ کے وقت سے زیادہ علم کی روشنی پھیل چکی ہے، اسوقت سے کہیں زیادہ تنقید و تحقیق کے ذرایع لوگوں کے ہاتھ آگئے ہیں آپ کا اپنے منقولات کا دفتر لے کر بیٹھ جانا کیا فایدہ پہونچا سکتا ہے، اور اگر آپ یہ دعوی کریں کہ نہیں آپ معقولات میں بھی اپنے خصم کو ساکت کر سکتے ہیں، تو معاف فرمایئے میں اسکو سوائے ”دخل در معقولات“ کے اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپکے یہاں کے معقولات تو اب فترپارینہ ہیں اور معقولات جدیدہ کی آپ کو ہوا بھی نہیں لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسوقت کی جماعت علمار کرام بالکل ایک (FOSSIL) متحجر چیز ہے اور موجودہ کاروبارِ حیات میں اسکا وجود مایۂ اعتبار و بینش کی حیثیت تو رکھ سکتا ہے، لیکن اسے سرمایۂ حیات و زندگی نہیں کہہ سکتے

میں اِن تمام علمار کرام سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اسوقت تک انہوں نے کونسی دینی خدمت انجام دی ہے؟ کیا حلال و حرام کے معمولی مسایل بتا دینا، کیا مساجد میں امامت کر لینا، کیا مجالس میلاد میں وعظ کہدینا، کیا رنگون و برما جا کر جاہل و احمق مسلمانوں سے خلافت و تبلیغ کی بے معنی تحریک کے لئے چندہ وصول کر لانا، کسی آریہ کی کتاب کا جواب لکھدینا، تقلید و عدم تقلید کے مسئلہ میں مناظرہ کر لینا، ایسی اہم خدمات ہیں جو ایک شخص کو علمار میں داخل کر سکتی ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان علمار کرام میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کو صحیح معنوں میں ہادی و مرشد یا عالم و فاضل کہہ سکیں

جہانتک علم ظاہر کا تعلق ہے ان کی بے مایگی کا یہ عالم ہے کہ سوائے ان چند دقیانوسی کتابوں کے جو انہوں نے کسی وقت مدرسہ میں پڑھ لی ہیں اور جنکی صحت پر اب بھی انہیں ایسا ہی ایمان ہے جیسے اندھے کو اپنے زوالِ بینائی کا، انکو کچھ خبر نہیں کہ دنیا میں کتنے اور علوم و فنون رونما ہو گئے ہیں اور عقول انسانی نے کسقدر ترقی کر لی ہے، نہ انکا مطالعہ وسیع، نہ انکی معلومات عامہ درست، نہ انکا ذہن ترقی یافتہ، نہ انکی عقل صحیح و پختہ، نہ ان میں بالغ نظری ہے، نہ نکتہ رسی، نہ مصلحت اندیشی ہے نہ دیدہ وری، دوسری قوموں کے علوم و فنون سے واقف ہونا تو درکنار ان غریبوں کو خود اپنے یہاں کے علوم کی بھی خبر نہیں، یہانتک کہ اگر آج ان سے دریافت کیا جائے کہ اسوقت سب سے بہتر کتاب فن تنقید میں کونسی سمجھی جاتی ہے تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے، وہ اب بھی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ جو ایک دو جن کتابیں انہوں نے پڑھ لی ہیں، اس سے زیادہ علوم اسلامی کے حدود وسیع ہو نہیں سکتے، اور دورِ زمانہ کی رفتار سے اسقدر بیگانہ ہیں کہ اگر آج مصر کی جدید کتاب انکے سامنے رکھدی جائے تو وہ ایک صفحہ بھی اسکا نہ سمجھ سکیں گے اور حیران رہجائینگے کہ یہ کونسی نئی زبان اسقدر جدید اصطلاحات کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ہے انکی عربی دانی کا حال، فارسی زبان چونکہ آتش پرستوں کی ہے اسلئے وہ اسے کیا حاصل کر سکتے ہیں، رہگئی اردو، سو اسکے متعلق شاید وہ فخر کے ساتھ کہہ سکیں گے کہ اس میں کمال حاصل کرنا انکی شان کے منافی ہے مغربی علوم و فنون کا کیا ذکر ان غریبوں کو تو انکے نام بھی نہیں معلوم

علم باطن جس کا تعلق یکسر اخلاق و روحانیت سے ہے، اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ اس کا دعوی شاید انہیں بھی نہ ہوگا اور بجز اس کے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ فقیر کا اضافہ کرکے ایک ہلکی سی جسارت اس نمائش کی کریں اور زیادہ ان کے بس کی بات نہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دنیا انہیں خوب جانتی ہے۔ رہی اس گروہ کی قوت عمل سو اسکی مثالیں بھی کثرت سے موجود ہیں اور آگرہ کا وہ منظر سامنے ہے جب اس سے کہیں زیادہ جوش و قوت کے ساتھ مذہبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی تھی، لیکن اسکا دوسرا جلسہ ہونیکی نوبت اسوقت تک نہیں آئی

پھر جب حالت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ یہ اپنے منہ سے اپنے آپ کو بغیر کسی استحقاق بعید کے بھی "علمار کرام" کہنے والا گروہ (بقول صائب) کن "محظوظ نفس" کے ماتحت اس جسارت پر آمادہ ہوا ہے اور دہریت و لامذہبیت کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے جبکہ وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا کہ جسکو وہ "لامذہبیت" کے نام سے موسوم کرتا ہے حقیقتاً اسلام وہی ہے، اور موجودہ اضطراب حقیقتاً مذہب کے محو کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ انہیں علمائے کرام کے بت توڑنے کے لئے پیدا ہوا ہے

یہ لوگ بالکل غلط کہتے ہیں کہ اسوقت بیدینی اور لامذہبیت کے خیالات پھیلتے جا رہے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا اب علمار سوء کے عذاب کو اپنے اوپر زیادہ عرصہ تک مسلط نہیں رکھنا چاہتی اور اس کو مٹا دینے کے لئے آمادہ ہوگئی ہے اس لئے جو کچھ اس جلسہ میں بیان کیا گیا، بالکل خلاف حقیقت ہے اور صداقت سے یکسر دور جو خوف انہیں اپنی ذات سے متعلق ہے اسے اسلام سے کیوں وابستہ کرتے ہیں۔۔ اور اگر اسلام عبارت ہے انہیں کی ذات سے تو پھر یقیناً "انہدام اسلام" ہی انسان کا فرض اولین قرار پائے گا

اس جلسہ کی کارروائی میں متعدد جملے ایسے نظر آتے ہیں جن سے انتہائی انہماک اور مستعدی کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جو کمر ہمت آج فرنگی محل کی محلسرا میں کسی گئی ہے وہ داور حشر کے سامنے ہی کھلے تو کھلے لیکن میں اس کے اعتراف میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

گزشتہ دو ماہ کے اندر جو مطبوعات موصول ہوئے ہین، ان پر اس مہینے کے نگار مین ریویو نہین کر سکا، ماہ آیندہ مین اسکا امکان ہے لیکن انھین کتابون مین ایک چیز ایسی موصول ہوئی ہے جس کا ذکر مین جلد سے جلد کر دینا چاہتا ہون اور وہ قانون مسعودی جلد چہارم کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے جو نمونتاً مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی طرف سے بہ طلب آراء شایع کیا گیا ہے

قانون مسعودی، البیرونی کی نہایت معرکۃ الآرا تصنیف ریاضیات فلکی پر ہے جس کے ترجمہ کا خیال سب سے پہلے نواب محمد اسحاق خان مرحوم کو پیدا ہوا تھا لیکن یہ ارادہ قوت سے فعل مین نہ آسکا

اب ہمارے فاضل دوست مسٹر محمد فاروق ام اس سی اس خدمت کے لئے منتخب ہوئے ہین انھون نے فی الحال صرف ۸ صفحات کا ترجمہ (بزبان انگریزی) معہ حواشی و استدراکات کے پیش کیا ہے اور موضوع کی دشواری کے لحاظ سے جس وقت اس کوشش پر نگاہ کیجاتی ہے تو بقول ہمارے ایک دوست کے فاروق صاحب کو بالکل "دیوتا" ماننا پڑتا ہے۔ انھون نے چار قدیم نسخون سے مقابلہ کرکے

اصل کتاب کو مرتب کیا ہے اور پھر اس کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ جو (اصطلاحات ریاضی کو علیحدہ کرنے کے بعد) بے انتہا صاف و سلیس ہے، ہر اس تشریح دلکشی کا اضافہ کیا ہے جو اس کتاب کو سریع الانتقال الی الذہن بنانے کے لئے ضروری تھا۔

ہمارے نزدیک جناب فاروق کا یہ کارنامہ ان کی اُس قوت کامنہ کا اعجاز ہے جس کا علم شاید انھیں بھی اس سے قبل نہ رہا ہوگا۔ ہمکو امید ہے کہ ارباب یونیورسٹی اب اس سلسلہ کو منقطع نہ ہونے دینگے اور فاضل مترجم کو ہر وہ آسانی فراہم کرینگے جو اس کام کو جلد انجام تک پہونچانے مین مفید و معاون ہو سکے۔ ترجمہ کے ساتھ اصل کتاب کی عبارت بھی ایک مرتب کی تمام ذمہ داریون کے ساتھ درج کتاب کی گئی ہے اور اس طرح فاروق صاحب بیک وقت دو نہایت مشکل مگر بے انتہا ضروری خدمت علم انجام دے رہے ہین۔

اس اشاعت کا پہلا مضمون ہمارے فاضل دوست پروفیسر محمد نعیم الرحمان ام۔اے کا ہے جو آیندہ ماہ مین غالباً ختم ہو جائے گا، تعارف و تقریب کی ضرورت نہین کیونکہ صاحب مضمون اور مضمون دونون خود آپ اپنی سفارش ہین۔

مجنون کا فسانہ ماہ آیندہ مین ختم ہو جائیگا۔ چونکہ مجنون کے اکثر افسانے ہارڈی کے مطالعہ کا نتیجہ ہوتے ہین اس لئے ان مین ایک خاص قسم کے دل دُکھا دینے والی ٹریجڈی کا پایا جانا ضروری ہے۔ ہر چند وہ ہارڈی کی طرح خدا کو صرف اہرمن سمجھنے والے تو نہین ہین لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے کچھ زیادہ خوش بھی نہین ہین۔

انارکسٹ، ایچ۔ جی ولس (عہد حاضر کی نہایت ہی مشہور انشاپرداز) کے ایک فسانہ کا ترجمہ ہے۔

جناب بدر اصلاحی کا مضمون مشرقی مآثر پر خوب ہے۔ فسانۂ عجائب اس ماہ مین ختم ہو گیا ناظرین نے اس مضمون کو پسند کیا اور نقاد کے تحقیق کی کافی داد دی لیکن مجھے کہیں کہیں اُن سے جادۂ اعتدال چھوڑ دینے کی شکایت ضرور ہے

تین مضمون اُن حضرات کے ہین جنھون نے اپنے نام کے اظہار کی اجازت نہین دی اور تینون مضمون چونکہ تنقیدی ہین اس کے لئے اظہار نام کی چندان ضرورت بھی نہ تھی۔

جناب ناطق کی غزل پر جو تنقیدی مضمون موصول ہوا تھا وہ کافی حذف کرنے کے بعد شایع کیا جا رہا ہے، اب بھی بعض مقامات کے لب و لہجہ سے مجھے اختلاف ہے۔

آیندہ اشاعتون مین بعض نہایت ہی دلکش و مفید مضامین شایع ہونے والے ہین منجملہ اُن کے ایک کلام حزین پر تبصرہ ہے جو بہت کاوش سے لکھا گیا ہے، اسی طرح مصحفی کی شاعری پر ایک صاحب نے جو یادگار مصحفی ہین، بسیط مضمون روانہ کیا ہے۔ مین نے بھی ایک افسانہ لکھا تھا جو اس ماہ مین نہ شایع ہو سکا آیندہ اشاعت مین درج ہوگا۔ ایک مختصر سا مضمون میرا حجاب کی شاعری پر آئندہ اشاعت مین درج ہوگا جو سلطنت اودھ کے عہد شباب کی ایک شاعر امیرزادی تھی اور حقیقتاً شعر کہتی تھی اسیطرح مولانا کیفی چریاکوٹی کا ایک عالمانہ مضمون مومن کی شاعری پر شایع ہوگا

ظفر کے متعلق جو حضرات مضامین لکھ رہے ہین ان کو یہ اطلاع دیدینا ضروری ہے کہ ستمبر بہت قریب ہے اور زیادہ سے زیادہ اکتوبر کے اخیر تک ظفر نمبر کی کتابت شروع ہو جائے گی

نیاز

ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مشابہت

متھیا (دیومالا، متھالوجی، علم الاصنام، خرافیات، وغیرہ جس نام سے چاہئے اُسے موسوم کیجئے) ایک جامع اصطلاح ہے اور اُن تمام قصون اور روایتون پر حاوی ہے جو دُنیا کی مختلف اقوام مین قدیم اور قدیم ترین زمانے مین رائج تھین اور جن پر وہ ایسا ہی راسخ اعتقاد رکھتے تھے جیسا آج ہم اپنی جدید سے جدید معلومات پر رکھتے ہین۔ اور زیادہ تفصیل سے یون کہا جاسکتا ہے کہ ان روایات مین آفرینش کی ابتدا، کائنات کی پیدائش، خدائی یا انسان سے بالاتر اشخاص کی پیدائش اور اُن کے اعمال اور افکار سے بحث ہوتی ہے کہ یہ حضرات کیونکر پیدا ہوئے، اُنھون نے کیا کیا کمالات حاصل کئے، کون کون سے کارہائے نمایان کئے، تمام بنی نوع انسان یا اپنے خاص فرقے اور قبیلے کی انھون نے کیا کیا خدمت کی، دُنیا کی حکومت مین انھون نے کیا حصہ لیا، انسان کے ساتھ اُن کی دوستی اور دشمنی کا کیا رنگ تھا، خود اُن کے آپس مین تعلقات کیا اور کیسے تھے، وغیرہ وغیرہ، دنیا کی ہر قوم اپنی زندگی کی ابتدائی منزلون مین ایسی روایات اور خُرافات کا ذخیرہ رکھتی تھی۔ ان مین سے اکثر قومون کی متھیا دریافت کی جاچکی ہے اور جو باقی ہین ان کے متعلق علم حاصل کرنے کی برابر کوشش کی جارہی ہے

مختلف ملکون اور قومون کی متھیا کے مطالعہ مین ایک نہایت دلچسپ بات جو فوراً ذہن مین آتی ہے یہ ہے کہ کئی کئی اقوام اور ممالک کے باشندون کے خیالات اور عقیدے آپس مین ایک دوسرے سے بہت کچھ مشابہ تھے، نہ صرف یہ کہ ایک ہی خاندان کی مختلف اقوام کے خیالات ایک ہی اسلوب اور نہج پر نظر آتے ہین، بلکہ مختلف خاندانون کے اور ایک دوسرے سے معقول فاصلے پر بسنے اور رہنے والی قومون کے خیالات بھی آپس مین مشابہت رکھتے ہین، اس وقت ذیل کی سطرون مین بابل اور ہندوستان کی متھیا کی مشابہت دکھانا مقصود ہے۔ اس غرض سے مجھے جو جو روایات اور قصے ایسے مل گئے ہین جن مین بابل اور ہندوستان آپس مین شریک ہین، وہ قلمبند کر دیئے ہین، ہندوستان کی قدیم عظمت اور جلال کے ثبوت کے لئے غالباً یہی چند مثالین فی الحال کافی ہونگی

لیکن قبل اس کے کہ بابلی اور ہندی علم الاصنام یا متھیا کی روایات کی مُشابہ تصویرون کو پیش کیا جائے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات کا زمانہ (عام اس سے کہ وہ بابل کے متعلق ہو یا ہندوستان کے) معین کرنا نہایت دشوار ہے۔ اس ضمن مین صرف دو باتین کہی جاسکتی ہین۔ ایک تو یہ کہ ان روایات کا زمانہ غالباً تین اور چار ہزار سال قبل مسیح سے لے کر ایک ہزار اور پانچ سو سال قبل مسیح تک کا ہے، دوسرے یہ کہ اغلب امر یہ ہے کہ یہ روایات بابل سے ہندوستان پہنچی ہین اب خواہ اُنہین آریا قوم وہان سے اپنے ساتھ لائی ہو (اور یہ امر آجکل مستشرق علما کے ہان زیر بحث ہے)

————————————————

خواہ ہندی سوداگرون اور سیاحون کے

ذریعہ سے ہمارے ملک مین پہنچ گئی ہون - اور اس لحاظ سے غالبًا ہندی کی ان روایتون کا زمانہ بابلی روایتون کے بعد آتا ہے۔

چونکہ زمانہ کا ذکر ہو رہا ہے، اس لئے سب سے پہلے اسی سے شروع کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱- جگ

ہندی (اور اسی طرح یونانی اور آئرلینڈی) متھیا مین دُنیا کی عمر کو چار زمانون مین تقسیم کیا گیا ہے - چاندی (سفید) سونا، (زرد)، برنج (سُرخ) اور لوہا (سیاہ)، جن کو ہمارے ملک مین بالترتیب کرت جگ، ترتیت جگ، دوآپر جگ اور کل جگ کہتے ہین - قدیم ہندی حساب سے ایک مہا جگ ۴۳۲۰۰۰۰ (تینتالیس لاکھ بیس ہزار) برس کا ہوتا ہے اسی طرح اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ اُن کے ہان "طوفان" سے پہلے دس بادشاہ راج کر چکے تھے اس تمام مدت کا مجموعہ ۱۲۰ (ایک سو بیس) "سروئی" ہوتا ہے، اور چونکہ ایک سروئی مین ۳۶۰۰ (تین ہزار چھ سو) برس ہوتے ہین، اس لئے ۱۲۰ سروئی، ۴۳۲۰۰۰ (چار لاکھ بتیس ہزار) برس کے برابر ہوئی - اس رقم کو اگر دس سے ضرب دیا جائے تو وُہی ہندی مہا جگ کے تینتالیس لاکھ بیس ہزار سال پیدا ہوتے ہین - غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل اور ہندوستان دونون مین وقت اور جگہ (زمان و مکان) کا اندازہ کرنے کے لئے دس (۱۰) اور چھ (۶) کے ہندسون سے بہت کام لیا جاتا تھا، کیا عجب ہے کہ ہندی اور بابلی حساب کے طریقہ کی بنا، ایک ہی ہو، اور یہ امر بھی نہایت دلچسپ ہے کہ آجکل تمام دُنیا ایک ڈگری سے لے کر گھنٹہ تک (جو وقت کی پیمائش کے اُصولی ذریعے ہین) ۱۰×۶ (=۶۰) ہی کے حساب سے کام کر رہی ہے!

۲- برہما....

جس طرح ہندی متھیا مین (چھوٹے چھوٹے دیوتاؤن سے قطع نظر کرکے) تین بڑے خدا مانے گئے ہین، اسی طرح اہل بابل کے بھی تین بڑے خدا تھے - بابل کی خدائی تثلیث مین آیع، بعل، انلیل اور آنُ کو بالکل وہی خدائی کاروبار سپرد تھے (بلکہ اب بھی ہین!) وشنوجی کی طرح آیع بھی دُنیا کا پالنے پوسنے، زندہ سلامت رکھنے اور حفاظت کرنے والا تھا، شوجی کی مانند بعل انلیل کو مارنے اور غارت، برباد، ہلاک اور تباہ کرنے کی خدمت سپرد تھی، اور برہماجی کی طرح آنُ دیوتا بھی سب کا پیدا کرنے والا اور سب کا باپ تھا، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی قوم کا ایک حصہ جب عرصہ تک ایک کیلے "یہووا" کا نام سنتے سنتے اور جپتے جپتے تنگ آگیا تو اُس نے اُسے معزول کرکے پھر ایک مرتبہ باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام سے اپنے پُرانے تین خداؤن کو زندہ کرکے بٹھا دیا اور اپنے اس کمال کی داد کو پاک و بے گناہ یسوع مسیح کے نام پر وقف کر دیا چنانچہ دُنیا کی انسانی آبادی کا ایک معتدبہ حصہ آج بھی ان کی داد دے رہا ہے - ملک اشوریا کا خدا اشور جگ دیوتا تھا، ہندوستان کے برہما کی طرح وہ بھی پرماتما اور پرمیشور تھا، سارے جہان کا خالق، نگہبان، محافظ اور ہلاک کرنے والا تھا آگ، پانی، زمین، ہوا، آسمان، سورج، چاند، ستارون اور بجلی کا بھی خدا تھا، گویا آنُ اور اشور وہان کے برہما تھے

۳- اِندر

بابلی متھیا مین رمّن دیوتا ہوا، گرج اور بجلی کا دیوتا تھا، وہ پانی برساتا، اناج پیدا کرتا اور باہم لوگوں مین فساد ڈالتا اور لڑائیان کراتا تھا، وہ عموماً پہاڑ دن پر رہتا تھا اور وہین سے اپنے فرائض منصبی ادا کیا کرتا تھا، وہ مغرب سے آریا قوم کی رو کے ساتھ چل کر پنجاب کے راستے ہمالیہ پہنچا اور وہین قیام کیا۔ یہان وہ "اندر" دیوتا کے نام سے مشہور ہوا۔ اندر دیوتا کے بھی بعینہٖ وہی سب کام ہین جو بابل مین "رمن" کے سپرد تھے، وہ بابل مین "تموز" کے نام سے سردی اور آندھی کے، اور ہندوستان مین "اندر" کے نام سے خشک سالی کے دیوؤن کو قتل کر کے پانی برساتا اور اناج پیدا کرتا تھا، وہان بابلی اور یہان ہندوستانی اپنے اس ان داتا کو خوش رکھنے کے لئے انسانون کی قربانیان چڑھاتے (اور اس غرض کے لئے عموماً غیر ملکون سے لوگون کو قیدی بنا بنا کر لاتے) تھے اس خدمت کے معاوضہ مین ان داتا اُنھین کھانے پینے کو دیتا تھا! بابل کے رمن کی طرح ہندوستانی اندر بھی ہر سال مرجاتا تھا۔ چنانچہ مہابھارت (آدی پرب) کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ پانڈو بھائی اصل مین پانچ پرانے اندر تھے جو اپنے اپنے وقت مین مرچکے تھے

بابل کا میرودخ دیوتا اپنے باپ آیع کے مرنے کے بعد اژدھون کے مارنے کی خدمت پر سرفراز ہوا تھا، اسی طرح ہندی اندر نے بھی اپنے باپ دیوس کو مار کر اس کے خدائی کامون کو اپنے ذمے لے لیا تھا

بابلی دیوتا آیع ہندی اندر کی طرح مختلف قسم کی صنعت اور دستکاری مین کمال رکھتا تھا، اکثر ضرورت کے وقت آیع اپنے (خلیج فارس کے) گھر مین سے نکل کر اپنے بندون کو نہرین کھودنا، کھیتی باڑی کرنا، دھات کا کام کرنا، مٹی کے برتن اور اینٹین بنانا اور اُن سے مندر اور عبادت گاہین تیار کرنا سکھاتا تھا۔ اُس نے اس دنیا کو بالکل اسی طرح بنایا تھا جس طرح کوئی معمار مکان بناتا ہے۔ اندر دیوتا نے بھی اپنے ہتھوڑے اور بسولے کے ذریعہ اسی طرح یہ تمام کائنات بنا کے رکھ دی تھی جیسے اُس وقت کے ہمارے آریا آباو اجداد لکڑی کو کاٹ، چھیل اور جوڑ کر اپنے گھر بنایا کرتے تھے۔

ہندی اندر بیک وقت بابلی آیع، رمن اور میرودخ کے برابر تھا!

۴۔ اگنی

ہندی متھیا مین اگنی آگ کا دیوتا ہے۔ ویدون کے بھجنون اور روایتون مین اُس کا نام اکثر پایا جاتا ہے، اُس کی مورتی مین دو چہرے، تین ٹانگین اور سات بازو ہوتے ہین، اور عموماً اُس کے ساتھ ایک مینڈھا ہوتا ہے[۱]۔ اسی طرح بابلی متھیا مین گرّو، گِشبار، گِبل اور نُسکو آگ کے دیوتا تھے۔ ہندوستان نے ان چار کے مقابلے مین اپنے ایک ہی دیوتا کو دو چہرے اور سات ہاتھ دے رکھے تھے، اس لحاظ سے پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان بابل پر فوقیت لے گیا۔

---

[۱] تاکہ اُس کی قربانی کر کے اُسے جلایا جا سکے۔ قربانی اور آگ اکثر قدیم قومون کے ہان لازم ملزوم چیزین تھین۔ ہندی مسلمان بھی بقرعید کے دن کباب کھانے کے بہت شوقین ہین! مگر ایک بزرگ ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ شب برات مین اگنی دیوتا بہت خوش رہتے ہین

گو یہ یقین کے ساتھ نہین کہا جاسکتا کہ بابلی بھی ہمارے آبا و اجداد کی طرح اپنے ان دیوتاؤن کو زندگی اور رُوح کی بنا (جس کا ظہور جانداروں کے بدن کی گرمی مین پایا جاتا ہے) سمجھتے تھے یا نہین، لیکن یہ ضرور ہے کہ قدیم (اور غالباً آجکل کے بھی) ہندوستانیون کی طرح اُن کے ہان بھی آگ کو جادو ٹونے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، مُردے کو جلاکر راکھ کردینے کا قاعدہ جو آج تک ہندو گھرانون مین باقی ہے، اُس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قدیم آریا یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اُن کے مُردے آگ مین بھسم (یا یون کہئے کہ اگنی دیوتا کی ذات والاصفات مین فنا - فنا فی النار) ہوکر براہ راست سورگ (جنت) مین پہنچ جاتے تھے، اسی طرح اہل بابل بھی کبھی کبھی اپنے مُردون کو جلایا کرتے تھے، قدیم سمیا طیقی قومون مین قربانی کے وقت جانورون کو (اور بعض اوقات انسانون کو بھی) آگ مین بھسم کردینے کا عقیدہ اور عمل بالکل عام تھا، اہل بابل کا (مذکور بالا) نسکو دیوتا ہمارے ملک کے اگنی دیوتا کی طرح دیوتاؤن کا دُوت (قاصد) بھی تھا - چنانچہ جب میرودخ دیوتا کو بابل کے تمام دیوتاؤن کی سرداری ملی ہے تو اُس نے نسکو ہی کو آیع دیوتا کے پاس اس ترقی منصب کی خبر پہنچانے کیلئے قاصد بناکر بھیجا تھا۔

اسی طرح بابلی دیوتا تمُوز (جس کے نام پر سُریانی تقویم کے ایک مہینہ کا نام بھی تموز ہے، جو ہمارے بیساکھ جیٹھ اور انگریزی جون جولائی کے وقت مین ہوتا ہے) اور اگنی دیوتا کی چند صفات آپس مین مشترک ہین تموز دیوتا "شفا دینے والا" تھا، اگنی "سب طرح کی بیماریون کو دور کرنے والا" تھا، تموز گھن گھرج آواز کا دیوتا تھا، اگنی بھی ایک مست سانڈ کی طرح چنگھاڑتا تھا، تموز اور اگنی دونون بڑے دلاور اور جنگجو تھے، دونون بڑے بڑے دیوون کو مارتے اور قتل کرتے تھے، اہل بابل کے ہان تموز دیوتا کا ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ رات کے وقت آسمان کی رکھوالی کرے - اس حیثیت مین وہ لوگ اُسے بکرے کی صورت مین تصور کرتے تھے، روایت ہے کہ ایک مرتبہ بابل مین طرح طرح کی بیماریون کی وبا پھیلی، تو لوگون نے عاجز آکر میرودخ دیوتا سے دُعا کی کہ انھین ان وباؤن سے بچائے، اور اس کے ساتھ ہی انھون نے ایک بکرا لے کر اُسے خوب بنایا سنوارا اور میرودخ کے نام پر جنگل مین چھوڑ دیا[1] - دیوتا نے بکرا قبول کیا، اور اپنے بندون کو وبا سے نجات دی - وہ بکرا آسمان پر پہنچ کر ستارہ بن گیا (جسے آجکل کی اصطلاح مین قطب تارہ کہتے ہین) - چنانچہ عربی زبان مین اب بھی اُس کو "جدی" (بکری کا بچہ) کہا جاتا ہے، اسی طرح ہندی تھیا مین بھی اگنی دیوتا اور وَرُن دیوتا کا بکرے سے تعلق ہے - قدیم آریا لوگ اپنے مردون کا کریا کرم کرتے وقت اس نیت سے بکرا قربان کیا کرتے تھے کہ اس طرح وہ دیوتاؤن کو خبر کردین کہ ایک نئی رُوح اس دنیا سے اُس دنیا مین داخل ہورہی ہے اور دیوتاؤن کی پناہ اور سرپرستی کی خواستگار ہے!۔

---

[1] ممکن ہے یہی بکرا ان بکرون کا مورث اعلیٰ ہو جن کو آج بھی ہمارے بعض دیندار بھائی خوب بنا سنوار کے بزرگان دین اور اولیاء اللہ کے نام پر چھوڑ دیتے ہین! پھر ان بکرون سے نہ معلوم ان کا کیا رشتہ ہے جن کو ہمارے ملک کے جادوگر اور سیانے کالی مائی کے نام پر قربان کرکے اور ان کا خون پی کر اپنے معتقدین کے حق مین حیرت انگیز پیشگوئیان کرتے ہین؟

۵- سورج

بابل مین سورج دیوتا کا نام شمش (عربی شمس - سورج) تھا - وہ قسمت اور تقدیر کا مالک تھا ، سب زندہ اور مُردہ ہستیون کا خدا تھا ، وہ سب سے بڑا منصف ، سب سے بڑا قانون ساز تھا ، اور سب سے انصاف کا برتاؤ کرتا تھا - وہ بدکاری کا دشمن تھا ، گناہ سے سخت نفرت رکھتا تھا ، صدق اور خلوص کا عاشق تھا ، اپنے پوجاریون مین سچائی اور ایمانداری کی روح پھونکتا اور گناہگارون کو سزا دیتا تھا ، وہ دُنیا کو روشن کرتا تھا اور اُس کے نُور کی شعاعین دنیا کے ہر ہر کونے مین پہنچتی تھین - وہ ہر چیز کو دیکھتا اور ہر انسان کے خیالات کو جانتا اور پڑھ سکتا تھا - کوئی چیز اُس سے پوشیدہ نہ تھی - اُس کا ایک نام مِتر بھی تھا -

ہمارے ملک کے ویدون (خصوصاً رگ وید) مین مِتر دیوتا وُرن کا ہمزاد تھا یہ دونون انسان کی زندگی کی مدت مقرر کرتے اور اُس کی نگہبانی مین مصروف رہتے تھے - وہ سورج اور چاند کے راستون اور عملون کا اندازہ اور اُن کی تعین کرتے تھے ، وہ ہوا ، پانی اور موسم سب سے اُن کے ٹھیک ٹھیک وقت پر کام لیتے تھے - وہ ہر گھر مین ہر شخص کے نگہبان اور سرپرست تھے ، اور گناہگارون کو سزائین دیتے تھے ، وہ زمین پر پانی برساتے تھے -

جس زمانے مین آریا لوگ پنجاب مین تھے اور وُرن اور مِتر کی پوجا کرتے تھے وہ اپنے مُردون کو جلاتے نہین تھے بلکہ "مٹی کے گھرون" مین دفن کرتے تھے - یہی حال شمش کے پوجنے والون کا بابل مین تھا ، ہندوستان کے یَم دیوتا کی طرح بابل کا مِتر دیوتا بھی اس دنیا سے جانے والی روحون کا بادشاہ تھا ، یہ روحین جس ملک مین رہتی تھین اُس مین پہنچنے کے لئے (بابلی اور ہندی دونون عقیدون کے مطابق) بڑے بڑے پہاڑون اور "موت کی ندی" کو پار کرنا پڑتا تھا ،

یہی مِتر ایران مین مِہر (سورج) کے نام سے جلوہ گر تھا !

۶- طُوفان

بابلی روایت کے مطابق پیرِ نپشتیم[۵۱] نے گلگمیش[۵۲] سے طوفان کا واقعہ جس طرح بیان کیا تھا وہ مختصراً یون ہے - دریائے فرات کے کنارے شُرپَک کے شہر مین سب دیوتاؤن کا مجمع ہوا اور اُنھون نے متفق طور پر یہ طے کیا کہ زمین پر پانی کا ایک طوفان پہنچنا چاہئے - ایَع دیوتا نے (جو عقل کا خدا تھا) پیرِ نپشتیم کو (خواب مین) یہ ہدایت کی کہ چونکہ ہم سب دیوتاؤن کی یہ مرضی ہے کہ زمین پر ایک سخت طوفان بھیجین ، اس لئے تم اس سے خبردار رہو اور اُس مین ہلاک ہونے سے بچنے کے لئے اپنے مکان کو توڑ کر ایک بہت بڑی سی کشتی بنالو ، اور جب طوفان شروع ہو تو اپنے سارے خاندان اور اسباب وغیرہ کو لے کر اُس کے اندر رہو ، بیٹھنا اور دروازہ بند کرکے کشتی کو پانی کے بہاؤ پر چھوڑ دینا تاکہ تمھین حفاظت اور احتیاط سے کسی مقام پر پہنچا دے - اس ہدایت کے

---

۵۱ پیرِ نپشتیم کی حیثیت بابلی روایت مین وہی ہے جو (اُس سے ماخوذ) یہودی روایت مین حضرت نوح (علیہ السلام) کی ہے - ۵۲ گلگمیش کو گویا بابل کا بھیم یا ہنومان سمجھنا چاہئے - اس کا ذکر ابھی آئیگا ۵۳ یہ "زبردستی" ملاحظہ ہو ، کیون نہ ہو آخر دیوتا تھے ، جو کچھ چاہتے تھے کرتے تھے !-

مطابق پیر پنشتیم (جسے مین آئندہ اختصار کے خیال سے صرف پیر کہونگا) نے ایک بہت بڑی کشتی تیار کی، جو ایک سو بیس ہاتھ لانبی اور اسی قدر چوڑی تھی اور اُس مین اوپر نیچے چھ منزلین تھین۔ اس کشتی کے بننے مین پورے چھ دن لگ گئے، اور جب ساتوین دن تیار ہو گئی تو پیر نے اپنے گھر کے سب لوگون کو اُس مین بٹھا دیا، پھر اپنا تمام ساز و سامان، گھر کا کل اسباب، سونا چاندی زیور، نوکر چاکر، جانور اور کھانے کے لئے اناج غلہ وغیرہ، غرض یہ کہ سب کچھ اس کشتی کی چھ منزلون مین بھر دیا، اُسی روز رات کے وقت دیوتاؤن نے خوب پانی برسایا۔ پیر نے ایَع دیوتا کی ہدایت کے مطابق سب دروازے بند کر لئے اور کشتی کو پانی کے بہاؤ پر چلنے دیا۔ پھر کیا تھا، بادل خوب گرجے اور کڑکے، بجلیان کوندین، زمین کے جتنے بھوت پریت اور دیو جن تھے سب کے سب زمین کے اندر سے اپنی اپنی مشعلین لیے کر باہر نکل آئے اور خوب جی کھول کے بادل اور بجلی کی مدد کی۔ ایک دن کے اندر ہی اندر یہ حال ہو گیا کہ ساری زمین پر سوا پانی کے اور کچھ نظر نہین آتا تھا! آخر اشتر دیوی کو زمین والون پر رحم آیا، اور اُس نے دیوتاؤن سے التجا کی کہ اب انسانون پر رحم کرو۔ تب کہین چھ دن اور چھ رات کے بعد پانی کم ہونا شروع ہوا۔ پیر نے یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ کہین کسی جگہ خشکی بھی نمودار ہو گئی ہے یا نہین، پہلے ایک فاختہ کو اڑایا، مگر اُسے کہین پاؤن رکھنے بھر کی جگہ نہ ملی اور وہ مایوس ہو کر پھر کشتی مین واپس آ گئی۔ اس کے بعد پیر نے یکے بعد دیگرے ایک ابابیل کو، پھر ایک کوّے کو اڑایا۔ ابابیل تو فاختہ کی طرح مایوس ہو کر واپس آ گئی، مگر کوّا ایسا گیا کہ پھر نہ آیا۔ اس کے غائب ہو جانے سے پیر کو یقین ہو گیا کہ کہین نہ کہین ضرور خشک زمین نکل آئی ہے، آخر جب ایک پہاڑ پر پہنچ کر اُس کی کشتی رکی، تو وہ خود بھی اُترا اور اپنے تمام انسان اور حیوان رفیقون کو بھی اُتارا۔ سب نے مل کر دیوتاؤن کا شکر ادا کیا اور اُن کے نام پر چڑھاوے چڑھائے[۱]۔ رفتہ رفتہ کچھ عرصہ کے بعد پیر کے خاندان مین پھر وہی اگلی سی چہل پہل ہو گئی، اور دُنیا کی آبادی مین اضافہ ہونے لگا۔

ہندی متھیا کی روایات کے مطابق اہل ہندوستان کا عقیدہ ہے کہ دُنیا کی زندگی کے چار زمانے ہین کرت جگ، تریت جگ، دواپر جگ اور کلجگ۔ اور ہر جگ کے خاتمہ پر ایک بڑا سا طوفان آتا ہے جس سے دنیا فنا ہو جاتی ہے، یا یون کہئے کہ اسی طوفان کے اُٹھنے سے ایک جگ ختم ہوتا ہے اور اُس کے بعد سے نیا جگ قائم ہوتا اور نئی دنیا آباد ہوتی ہے۔ مہابھارت (بان پرب) مین ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دُنیا مین انسانون کی آبادی اتنی بڑھ گئی کہ زمین پر اُن کے رہنے سہنے اور چلنے پھرنے کی جگہ باقی نہین رہ گئی اور دھرتی ماتا کے جوڑ جوڑ مین درد ہونے لگا، تو وہ گھبرا کے نارائن جی (سب سے بڑے دیوتا) کے پاس گئین اور اپنی ساری بپتا سنا کر اُن کی کرپا اور دیا چاہی، نارائن نے اُن کا یہ دُکھ دُور کرنے کے لئے ایک بڑا سا طوفان بھیجا، جس سے سب انسان فنا ہو گئے۔ اس کے بعد پھر آہستہ آہستہ انسانون کو پیدا کر کے زمین کو آباد کر دیا

[۱] اُس استبدادی طرز عمل کے بعد یہ ستم ظریفی قابل داد ہے، وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا!۔

مہابھارت کی اس روایت کے علاوہ طوفان کی ایک اور ہندی روایت "ست پت براہمن" مین درج ہے اور منوجی سے متعلق ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز صبح کو جب منوجی نے نہانے کے لئے پانی مانگا تو اُس مین ایک چھوٹی سی مچھلی تھی، جس نے اُن کے ہاتھ مین بیٹھ کے باتین شروع کین اور کہا کہ ایک طوفان آنے والا ہے اور مین اس شرط سے تمھین اس سے بچانے کا وعدہ کرتی ہون کہ تم میری اس طرح حفاظت کرو کہ پہلے مجھے ایک چھوٹی سی گھڑیا مین رکھو، پھر ایک تالاب مین رکھو اور جب مین اتنی بڑی ہو جاؤن کہ اس تالاب مین نہ سما سکون تو مجھے احتیاط سے سمندر مین چھوڑ دو۔ منوجی نے اُس کی حفاظت کا وعدہ کیا، اور بڑی سی ناؤ بنا کے اُس مین ہو بیٹھے۔ کشتی کے تیار ہونے تک وہ مچھلی بڑھتے بڑھتے اتنی بڑی ہو گئی کہ تالاب مین نہین سمائی تھی تب منوجی نے اُسے سمندر مین ڈالدیا مچھلی کی پیشگوئی کے مطابق ایک زبردست طوفان آیا اور اُس نے دنیا کے سب جاندارون کو ہلاک اور برباد کر دیا۔ منوجی کی ناؤ اس سراسیمگی کے عالم مین ڈگر ڈگر کرتی پھرتی تھی کہ اُن کی وہی مچھلی اُن کو سرن دینے کو آموجود ہوئی۔ منوجی نے اپنی ناؤ کو اُس کے سر سے باندھ دیا، اور اُس نے اُسے لے جا کر اُتر طرف کے (غالباً ہمالیہ) پہاڑون پر رکھ دیا۔ منوجی وہان اُتر گئے اور جیسے جیسے پانی ہٹتا اور کم ہوتا گیا وہ بھی نیچے کو آتے گئے۔ جب میدان مین پہنچ گئے تو انھون نے دیوتاؤن کے نام پر چڑھاوے چڑھائے اور قربانیان کین دیوتاؤن کے دل بھی آخر پسیج گئے اور انھون نے اپنی دیا سے دھرتی کو پھر نئے سرے سے آباد کر دیا۔

بھاگوت پران مین طوفان کا قصہ یون لکھا ہے کہ ایک دفعہ جب برہماجی سو رہے تھے ایک راکھشس سارے وید چُرا کر لے گیا ہری دیوتا ایک مچھلی کا بھیس بھر کے راجا ستیاورت کے پاس گئے، جو صرف پانی پی پی کے زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ یہ مچھلی (منوجی کی مچھلی کی طرح) بڑھتی رہی یہان تک کہ بیس لاکھ میل لانبی ہو گئی۔ راجا ستیاورت نے طوفان سے بچنے کے لئے ایک بڑی سی ناؤ بنائی (یا اُسے کہین سے مل گئی) جس مین وہ بہت سے برہمنون کو ہمراہ لے کر داخل ہو گیا۔ جب راجا نے برہمنون کی ہدایت سے دیوتاؤن کی تعریف کے بھجن گائے، تب کہین اُسے اس آفت سے خلاصی کی صورت نظر آئی۔ ہری دیوتا نے اُس راکھشس کو قتل کر دیا اور اُس سے سب وید جو وہ چرا لے گیا تھا چھین لئے اور ستیاورت کو اُس کی تپسیا اور بھجن گانے کے انعام مین ساتوان منو بنا دیا۔

(باقی)

"محمد نعیم الرحمن" ایم اے

تصویر زیب النسا بیگم

جو دربار عالمگیری کی ایک بے مثل مصورہ نادرہ کی فلکاری ہے اور بعد تحقیق و تنقید بسیار اس کی صحت کی توثیق ہو چکی ہے یہ تصویر تین خوشنما رنگ سے طیار کی گئی ہے اور سنہ ۲۲ء کے نگار مین شایع ہو چکی ہے قیمت معہ محصول (۸/)

"مینیجر نگار"

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور نقاش و مصور ہزدار کی ایک بہترین تصویر جو حضرت نیاز کے مشہور مضمون رقاصہ کے گجراتی ترجمہ کے ساتھ کلکتہ کے مشہور گجراتی رسالہ نوجیون مین شایع ہوئی تھی۔

قیمت .... (۴/)

"مینیجر نگار"

باز گشت

(بہ سلسلۂ ما سبق)

(۱۰)

دوسرے دن شام کو ممتاز دکان سے کسی قدر دیر کرکے آیا۔ ادریس خلاف معمول گھر پر موجود نہ تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کہین سیر کو گیا ہے۔ آج یہ پہلی بار ادریس بغیر ممتاز کو ساتھ لئے سیر کے لئے نکل گیا تھا۔ ممتاز اس سیرگاہ کو جانتا تھا۔ اسکی زبان سے اضطراری طور پر نکل گیا

نئے فتنون مین اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

یہ کہکر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اسدن رات کو پھر نہ وہ ادریس سے ملنے گیا اور نہ ادریس نے اسکو بلایا۔ مگر وہ تمام رات متفکر رہا

ادریس قصداً ممتاز سے پہلو بچا کر نکل گیا تھا۔ اور اسکے قدم بے اختیار اسکو تیواری پور کی سمت لئے جارہے تھے۔ آج وہ عمر مین پہلی بار ایسے نا وقت پر تنہا سے گذر رہا تھا لیکن اپنے خیالات مین کچھ اس طرح گم تھا کہ اسکو اسکا مطلق احساس نہ ہوا۔ جنگل سے باہر نکل کر اسکی نگاہین سب سے پہلے اس طرف کو اُٹھین جہان کل اُسنے مریم کو دیکھا تھا۔ مریم وہان نہ تھی۔ ادریس کی مایوسی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اپنے دل مین ایک ایسی گرانی محسوس کرنے لگا جسکو برداشت نہین کیا جاسکتا۔ اس گرانی کو لئے ہوئے پلٹنا چاہتا تھا کہ ایک طرف سے ایک لطیف و نازک آہ سنائی دی۔ آہ مین ایک کیفیت تھی جسکو گرد و پیش سے خاص مناسبت تھی۔ ادریس کی نظر اُٹھ گئی۔ مریم دریا سے کچھ فاصلہ پر جنگل سے قریب ایک ٹیلہ پر بیٹھی تھی۔ اُسنے ادریس کو دیکھ لیا تھا۔ ادریس نے جب اسکو دیکھا تو اسکی نگاہین جھک چکی تھین وہ ادریس سے زیادہ دور نہ تھی

ادریس دم بخود ہوکر اسکو دیکھنے لگا۔ مریم آنکھین نیچی کئے بیٹھی رہی۔ رہ رہ کر اسکے منہ سے وہی دہیمی آہ نکل رہی تھی جسکے معنی ادریس سمجھ نہ سکا۔ ایسی بھیانک تنہائی مین رات کی بلاؤن سے مریم کی بے پروائی اس بات کی دلیل تھی کہ اسکو دنیا مین کسی چیز کا ڈر نہین ہے۔

ہوا کے ہلکے جھونکون مین ترنم تھا کہا جاسکتا ہے کہ جنگل کی روحین اپنی زبان مین باتین کر رہی تھین اور مریم بھی انکی گفتگو مین شریک تھی اسکی آہون کا سلسلہ بدستور قائم تھا۔ اسکی صورت پر یاس و حرمان کا رنگ چھایا ہوا تھا جسکو شام کے دہندلکے نے اور بھی بڑھا دیا تھا۔ ادریس پتھر کی مورت بنا ہوا اسکو دیکھ رہا تھا اسکو یہ بھی خیال نہ تھا کہ اگر کسی نے اسکو اس حالت مین دیکھ لیا تو کیا کہیگا۔ مریم بھی کبھی کبھی ایک غلط انداز نگاہ ادریس پر ڈال لیتی تھی۔ ادریس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ وہ اسکو اپنی کنپٹی کی رگو نمین محسوس کر رہا تھا۔ اسکا دل اس "دوشیزۂ صحرا" سے ہم کلام ہونے کے لئے تڑپ رہا تھا مگر اُسنے اپنے اندر اتنی جرات نہ پائی۔

رات اپنا جادو جگا رہی تھی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ خواب کیطرف مائل تھا۔ ہر چیز پر ایک ہیبت و جلال کا رنگ پھر رہا تھا۔ پرندے بسیرا لے رہے تھے۔ شب بیدار جانورون نے اپنی گشت شروع کر دی تھی۔ اور ادریس اور مریم نے اپنی اپنی

جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔ مریم کا گھر تو خیر قریب تھا مگر ادریس اپنے گھر سے اسقدر دور تھا اور راستہ اسقدر ہولناک کہ ایک ہوش و حواس والے آدمی کے دلمین محض اسکے خیال سے کپکپی پیدا ہو جاتی لیکن ادریس بر خود غلط اتنا تھا کہ اسکو اسوقت مریم کے سوا ہر چیز اسکے احاطۂ شعور سے نکل گئی تھی

تھوڑی دیر بعد مریم نے حرکت کی اور ٹیلے سے اُتر آئی گویا ابتک وہ اسی پُر اسرار تاریکی کا انتظار کر رہی تھی ادریس کا دل اس زور سے دھڑکنے لگا کہ اسکے سارے جسم مین ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا اور وہ اسی جگہ بیٹھ گیا۔ اب مریم کی آنکھین ادریس پر جمی ہوئی تھین۔ وہ ادریس کے پاس آئی اور پوچھا ''آپ کون ہین اور کہان جانا چاہتے ہین؟ آپ تو صورت سے بیمار معلوم ہوتے ہین''

ادریس کی زبان سے ایک حرف نہ نکلا۔ وہ مریم کا مُنہ تکتا رہا۔ مریم اپنے اعصاب مین ایک لہر سی محسوس کرنے لگی وہ ادریس کی حالت کا اتنی دیر مین بہت کچھ صحیح اندازہ لگا چکی تھی۔ اُسنے بڑھکر ادریس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا ''آپکو بخار تو نہین ہے؟'' ادریس مین اب مقاومت کی تاب نہ تھی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چاہا کہ جلدی سے بھاگ کر مریم سے الگ ہو جائے اور اپنے گھر کا راستہ لے۔ مریم اسکی نیت سمجھ گئی۔ اُسنے ادریس کا ہاتھ تھام کر کہا ''ٹھہرئے مین آپکو یون نہین جانے دونگی۔ آپ بتا دیجئے کہ آپکو کیا ہوا ہے'' ادریس بے دست و پا ہو کر رُک گیا۔ مریم کا حکم اسوقت ایک ملکہ کے حکم سے کم نہ تھا۔ اور اس حکم مین نہ جانے کونسی قوت تھی جسنے ادریس کے رگ و پے مین ایک جوش پیدا کر دیا۔ اسکی بیزبانی دور ہو گئی اور اب وہ اس قابل تھا کہ اپنی زبان سے شرح آرزو کر سکے

اُسنے مریم کو پیار کی نگاہ سے دیکھکر کہا ''کیا بتاؤن مجھکو کیا ہوا ہے۔ وہی ہوا ہے جو ایک بار مجھکو غارت کر چکا ہے مین سمجھا تھا کہ اب اس بلا سے مین ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا ہون۔ آہ مجھکو اپنی طبیعت کا کتنا غلط اندازہ تھا''

مریم پھر کہا ''آخر کچھ بتائیے تو وہ کونسی بلا ہے؟''

ادریس نے بیساختہ مریم کے دونون ہاتھ اپنے ہاتھ مین لے لئے اور کہا ''مین دو دن کے اندر تمکو بری طرح چاہنے لگا ہون مین نے کل ساری رات ٹہل ٹہل کر کاٹی ہے۔ رہ رہ کر تمہارے خیال کو دل اور تمھاری صورت کو آنکھون کے سامنے سے ہٹانا چاہتا تھا مگر آخر کار اپنا چاہا کچھ نہ ہوا اور آج مین پاگلون کی طرح یہان تمکو کھڑا اتنی دیر سے دیکھ رہا ہون اور جی نہین بھرتا''

مریم نے اپنے تیور سے بغیر کسی قسم کی حیرت یا سراسیمگی کا اظہار کئے ہوئے پوچھا ''آپنے مجھکو اس سے پہلے کب دیکھا تھا؟''

ادریس نے کل کی سرگذشت بیان کر دی اور پھر رابعہ کے ساتھ اپنی ناکام محبت کا واقعہ بھی من و عن بیان کر کے کہا ''مریم شاید میرے مقدر مین یہی ہے کہ مین محبت کی آگ مین بھنکتا رہون۔ مین نے کل تمکو ایک نظر دیکھا اور دیکھتے دیکھتے تمھارا ہو کر رہ گیا۔ دیکھو اسکا انجام کیا ہوتا ہے!''

مریم کو معلوم ہو گیا کہ وہ بلا کسی قسم کی جد و جہد یا ریشہ دوانی کے اپنی منہ مانگی مراد پا چکی ہے اسلئے اُسنے فوراً بےتکلف

اور اجنبیت کا پردہ ہٹادیا اور ایک آہ کرکے کہا "تو آپ اسقدر ہراسان کیون ہوتے ہین؟ محبت تو مزے کی چیز ہے۔ کم از کم مجھکو تو اسمین بڑا مزہ مل رہا ہے۔ مین آپ سے پہلے یہ چوٹ کھا چکی ہون۔ آپ میری صورت دیکھ کر بے قابو ہو گئے۔ مین تو آپ کا نام سنکر تڑپنے لگی تھی۔ اللہ اللہ اسکے بعد مین نے آپکی صورت دیکھنے کے لئے کیا کیا نہین کیا۔ آپ آج صرف دو تین گھنٹون تک دیکھتے رہے ہین۔ اور مین بشن گڈھ کے میلے کے دن صبح سے شام تک آپکی صورت دیکھتی رہی ہون" مریم نے بھی اپنی داستان سنادی اور پھر کہنے لگی "وہ چاہت میری طرف سے شروع ہوئی اور یہ میری چاہت کا اثر ہے جسنے آپکو یون بے چین کر رکھا ہے اور یہ میری چاہت کا ثبوت ہے" مریم نے ادریس کا منہ چوم لیا۔ ادریس مبہوت ہو گیا۔ اسکو اپنے حواس پر اعتماد نہین رہا۔ اسکو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ خواب مین ہے اور یہ سب کچھ خواب مین ہو رہا ہے

دونون طرف کی آگ برابر تھی۔ مریم اور ادریس ایک دوسرے کے ساتھ جیسا اس ایک رات مین کامیاب ہوئے شاید دو چاہنے والے ساری عمر گریۂ تمنا مین گذار دینے کے بعد بھی نہ ہوتے ہون

(۱۱)

دن گذرتے دیر نہین لگتی۔ پورے پانچ مہینے گذر گئے اور ادریس آنے والی پیچیدگیون سے بے خبر مریم کے ساتھ روزانہ شام کے تین چار گھنٹے خود فراموشی کے عالم مین بسر کرتا رہا۔ محبت کے تیور چھپتے نہین۔ ادریس کے چلن سے سب واقف ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ لوگون کی نظرون مین گر گیا۔ اور یہ سب مریم کی بدولت۔ اچھے برے کا واقعی کوئی صحیح معیار ہے یا نہین؟ اخلاقیات کے اس مسئلے سے یہان بحث نہین۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا مین وہ معیار رائج نہین۔ دنیا والے جب کسی چیز کو اپنے گون کی نہین پاتے یا اسکو اپنے توقعات کے خلاف پاتے ہین تو اسکو برا سمجھنے لگتے ہین۔ ادریس کی نئی زندگی لوگون کے توقعات کے خلاف تھی اسلئے قطعاً بری تھی

ادریس نے سکینہ کو جس کوفت مین مبتلا کر دیا تھا اسکو اتنے دنون وہ ضبط کئے بیٹھی رہی۔ اسکی مایوسیون کی کوئی حد نہ تھی لیکن ابھی اسکو امید تھی اور قوی امید تھی کہ ادریس خود بخود پھر راہ راست پر آجائیگا۔ آخرکار یہ امید بھی موہوم ثابت ہوئی۔ مجبوراً سکینہ نے ایکدن جبکہ ادریس دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا اس ذکر کو چھیڑ کر کہا "ادریس تمکو سوجھی کیا ہے؟ کوئی اس طرح بھی اندھا بھی ہوتا ہے؟ آخر مریم کہانکی بکاؤلی ہے جو تم اسکے پیچھے یون باؤلے ہو رہے ہو؟ ایک آبرو باختہ ہرجائی کے ہاتھون بک کر خاندان کا نام کیون ڈبوتے ہو؟ میری امیدون کا سارا دارومدار تم پر تھا۔ اف کیسے کیسے ارمان میرے دل مین تھے! ان کا پورا ہونا تو درکنار مین دیکھتی ہون کہ تم الٹے میرا منہ کالا کر رہے ہو۔ خدا کو مانو۔ ہوش مین آؤ۔ دیکھو دنیا نے تم کو کس عزت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ کم از کم اسکا تو پاس کرو۔ آج دو روز ہوئے فیض آباد سے خط آیا ہے۔ مین نے مناسب موقع نہ پاکر تم سے ذکر نہین کیا۔ میرے بھائی جنھون نے ابتک اپنی بھکارن بہن کی بات بھی نہین پوچھی تھی اب چاہتے ہین کہ تمکو اپنی دامادی مین لے لین۔ یہ صرف اسلئے کہ تم ہونہار ثابت ہوئے اور تمھاری لیاقت نے تمھاری مفلسی کے عیب پر

پردہ ڈال دیا ہے۔ شاہدہ کو مین نے بچپن مین دیکھا ہے۔ صورت شکل والی ہے اور تمھارے مُنہ لائق ہے۔ لیکن مین بھائی سے کیا کہون اور کس برتے پر کہون؟ تم اپنی روش بدلو تو انکو اس نسبت کی منظوری کی اطلاع دیدون،،

ادریس سر جھکائے ماں کی جھڑکیاں سنتا رہا۔ اسکے بعد اسنے اپنے کو مجسم سنجیدگی بناکر جواب دیا۔ "اماں مین نے آجتک تم سے اس بارے مین ایک حرف اسلئے نہین کہا کہ مجھے اندیشہ تھا کہ تمکو میری باتون سے کوئی دکھ نہ پہنچ جائے۔ لیکن اب تمنے خود میری دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ اسلئے اب میرا فیصلہ بھی سُن لو اور اس فیصلہ کو اٹل سمجھو۔ رابعہ سے بدمزہ ہونیکے بعد مین نے قسم کھائی تھی کہ اب کسی عورت سے کوئی سروکار نہ رکھونگا اور اپنی تمام عمر تجرد مین بسر کرونگا مگر ارادے بہ حیثیت ارادون کے پورے نہین ہوتے۔ میری زندگی نے ایک دوسری کروٹ لی۔ مجھے اس مریم سے دلبستگی پیدا ہوگئی۔ تم نے آج اچھی طرح اپنے دل کا غبار نکال لیا اور مریم کو جو جی مین آیا کہہ ڈالا اور مین نے چپ چاپ سُن لیا۔ لیکن اب مین کہے دیتا ہون کہ آئندہ اسکی شان مین ایسے تبرے سننے کے لئے تیار نہ ہونگا۔ تم جو چاہو سمجھو۔ مین مریم کو اپنے حق مین سیتا سمجھتا ہون اور اسکو اپنی تمام عمر کا ساتھی بنانا چاہتا ہون۔ مجھے ٹھیک معلوم نہین کہ زمانہ کی ناسازگاریون نے تم پر کیا اثر ڈالا ہے لیکن مین اپنی ذات سے زندگی کے ہاتھون بُری طرح مٹ چکا ہون اور اب دنیا کے رسم ورواج اور تکلف وتصنع کی تاب نہین لاسکتا۔ مریم ہرجائی ہے تو ہوا کرے۔ شیخ سید نہین تو نہ ہو۔ مین اسکو دنیا کی شریف زادیون پر ترجیح دیتا ہون اور مجھکو یقین ہوگیا ہے کہ اگر اب مین کسیکے ساتھ خوش رہ سکتا ہون تو مریم کے ساتھ۔ تم فیض آباد میرا صاف انکار لکھ بھیجو۔

سکینہ کا پیمانہ صبر پہلے سے لبریز تھا۔ بیٹے کی اس صاف گوئی نے اسکو چھلکا دیا۔ اُسکا چہرہ تمتما اُٹھا۔ آج وہ ایک دوسری سکینہ تھی۔ جس ماں نے ابتک ادریس سے کبھی سختی یا ترشی کے ساتھ بات بھی نہین کی تھی آج وہ غضبناک تھی۔ ادریس کا فیصلہ سنکر اُسنے بھی اپنا مختصر فیصلہ سنا دیا "مین اس قحبہ کا نام آئندہ پھر کبھی سننا گوارا نہین کرسکتی اگر تمکو اپنے ارادہ سے باز نہین آنا ہے تو آج سے مجھے اپنی صورت نہ دکھانا،،

یہ سنکر ادریس کے تیور بدل گئے۔ اسکی صورت سے جلال وجبروت ٹپکنے لگا۔ آج وہ دبی ہوئی قوت کام کر رہی تھی جسنے اسکو زندگی کی تلخیون کو شربت کی طرح پی لینے کے قابل بنا دیا تھا اور رابعہ کو اکدم خاطر انداز کرکے یکسوئی کے ساتھ علمی مشاغل مین منہمک ہوگیا تھا۔ ادریس نے سنگدلی اور بے مہری کے ساتھ ماں کو جواب دیا "بہتر ہے،، اور فوراً اُٹھکر باہر چلا گیا اور پھر ماں کو اپنی صورت نہین دکھائی۔

بات کی بات مین ادریس کو ماں سے نفرت ہوگئی۔ اسکو یہ یقین ہوگیا کہ دنیا کے رسوم وقیود نے نہ صرف سکینہ کی آنکھون پر بلکہ اسکے دل پر بھی پردہ ڈال دیا ہے۔ اور وہ ان بندشون پر اپنے بیٹے کی مسرتون کو قربان کردینا چاہتی ہے۔

جسوقت ادریس ماں سے کبیدہ ہوکر باہر آیا تو ممتاز کو انتظار کرتا ہوا پایا جب سے ادریس مریم مین محو ہوا

ممتاز کو رام نگر مین سونیکی نوبت نہیں آئی ادریس نے اسکو اپنے ساتھ سونیکے لئے بلانا چھوڑ دیا تھا۔ اب ادریس کو اپنی بیخوابیون مین لذت ملنے لگی تھی اور وہ تنہا رہنا چاہتا تھا۔ ممتاز سے بہ ظاہر اب بھی وہی لگاؤ تھا لیکن حقیقتاً ادریس کی ساری گرمجوشی سارا تپاک دوسرے مرکز کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ ممتاز کے ساتھ جو کچھ گفت و شنید ہوتی وہ زیادہ تر معاملات تک محدود ہوتی تھی ممتاز اسکو خوب محسوس کر رہا تھا مگر ادریس کو ابھی چھیڑنا اُسنے مناسب نہین سمجھتا تھا۔ آج نہ جانے کیون اسکے دل نے کہا کہ چلو ایک بار اپنی سی کر آئین اور آنیوالی زندگی کا اونچا نیچا ادریس کے ذہن نشین کر آئین۔

ادریس باہر نکلا تو ممتاز کو اسکے تیور دھندلے نظر آئے۔ ادریس نے اسکو اپنی اس حالت پر غور کرنیکا موقع نہین دیا اور پوچھا "کہو ممتاز کیسے آئے؟ کیا دکان سے متعلق کوئی خاص بات ہے؟"

ممتاز نے بڑی جرأت کی اور کہا "نہین تمھاری ذات سے متعلق ہے۔ بُرا نہ مانو تو کہون" "کہو" ادریس نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔

ممتاز آنکھین جھکا کر کہنے لگا "کہنا یہ ہے کہ تمنے یہ جو نئی زندگی اختیار کی ہے اس مین شاید کافی سوچ بچار سے کام نہین لیا گیا ہے۔ مین اپنی جگہ یہی سمجھے ہوئے ہون کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ آنکھین بند کرکے کر رہے ہو۔ ادریس مین وعظ و پند کی غرض سے نہین آیا ہون۔ میرا دل نہ جانے کیون دھڑک رہا ہے کہ کہین ایک دن تمکو یہ کہکر رونا نہ پڑے کہ

"الٰہی دل لگا تھا کس گھڑی کا"

ادریس پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ ممتاز کوئی اسی قسم کی بات کہنے والا ہے۔ اسنے ایک تلخ تبسم کے ساتھ کہا "ممتاز معلوم ہوتا ہے آج ساری دنیانے اپنی پند و نصیحت سے مجھکو رہ راست پر لانیکا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ مگر خیر اتنی خیر اندیشی کا مختصر سا جواب سن لو مریم کو دیکھتے ہی میرے اندر ایک دبی ہوئی آگ بھڑ بھڑک گئی اور اس سے ملنے کے بعد مجھکو معلوم ہو گیا کہ مین اسقدر آشفتہ اور دلگیر کیون رہتا ہون۔ مریم نے مجھے بتا دیا کہ مین کس درد کا مارا ہوا ہون اور اسکا علاج کیا ہے۔ مین محبت کا بھوکا تھا۔ محبت میرے خمیر مین ہے۔ مجھکو کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جسمین مین کھو کر رہ جاؤن۔ وہ چیز مریم کی صورت مین مجھے مل گئی

جلوہ کرد کہ من ہم ہمہ او گردیدم

اس سے زیادہ مین کہنا سننا نہین چاہتا۔"

ممتاز تھوڑی دیر تک ادریس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر اُسپر ایک مایوسانہ نگاہ ڈالتا ہوا وہان سے چلا گیا۔ ادریس اپنے کمرہ مین جا کر لیٹ رہا اور سوچنے لگا۔ وہ بہت دنون سے ارادہ کر رہا تھا کہ مریم کے ساتھ شادی کر لے اور یکبارگی تمام جھگڑون کو اُبھار کر ختم کر دے۔ اُسنے اشارۃً مریم سے دو ایک دفعہ اپنے ارادہ کا اظہار بھی کیا تھا مگر مریم اسکے جواب مین ادریس کو صرف پیار کرکے رہ گئی تھی ادریس نے بھی زیادہ اصرار نہین کیا تھا۔ مگر اب وہ اس بات پر تل گیا تھا کہ آج ہی مریم سے اس مسئلہ پر واضح گفتگو کرکے کوئی فیصلہ کر لے

ساون کا آخری موسم تھا صبح سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ہوا مین ایک فرد دسی ٹھنڈک تھی۔ بستر پر کروٹین بدلتے بدلتے

ادریس کو نیند آگئی اور پھر جو آنکھ کھلی تو سورج مغربی افق تک پہنچ چکا تھا۔ ادریس جلدی سے اٹھا اور منہ ہاتھ دھوکر سر پتیا کی راہ لی مریم ابھی نہین آئی تھی۔ ادریس جنگل کے اندر پورب ایک کنارے بیٹھکر انتظار کرنے لگا۔

۱۲

رات ہو چلی تھی۔ بارش بند تھی۔ لیکن آسمان کی فضا مکدر تھی۔ چاند کا کہین پتہ نہ تھا ستارون کی روشنی مدہم تھی۔ اردگرد بارہ کے پانی سے جل تھل ہو رہا تھا۔ اندھیرے مین سطح آب کی روپہلی چمک، دلون کو ہیبت و جلال سے معمور کر رہی تھی۔ کونہ کونہ سے عبرتناک صدائین نکل رہی تھین اور ادریس اپنے مقدر پر غور کر رہا تھا۔ اُسنے رام نگر کی "صحرائی زندگی" اسلئے اختیار کی تھی کہ اسکو ہیئت اجتماعی اور اسکی لغو اور لاطائل شورشون سے نجات ملجائے اور وہ رسم و روایت کی جانگسل زنجیر سے آزاد ہوکر راحت و سکون کی سانس لے سکے۔ مگر اب اسکو معلوم ہوا کہ یہان بھی وہی خدا پوجا جاتا ہے اور یہان کا بادہ آدم بھی وہی ہے۔ دنیا مین رہکر دنیا کے جنجال سے آزادی چاہنا ایک خواب بے تعبیر ہے۔ پھر ان تمام جھگڑون اور محنتون سے گلو خلاصی حاصل کرنیکے لئے انسان عدم آباد کی راہ کیون نہین لیتا جہان یقیناً آسودگی نصیب ہے۔ ادریس اپنے خیال مین یہان تک پہنچا تھا کہ اسکو غالب کا یہ کہنا یاد آگیا

"وائے وان بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا   لے گیا تھا گور مین ذوقِ تن آسانی مجھے"

ادریس کی توجہ کا مرکز بدلگیا اور اب وہ آسمان کی فضا مین گم ہو گیا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ یہ کوئی خیالی پرواز نہین ہے بلکہ جسمانی معراج ہے۔ وہ "چاند" "سورج" "قوس قزح" "ذات الفرس" اور "مسلسلہ" کی سحابی دنیا کی سیر کر رہا تھا جہان وہ سکون ہی سکون محسوس کر رہا تھا۔ یہ دنیا لطافتون سے آباد تھی اور یہان اُن آلائشون کا خواب بھی کسی نے نہین دیکھا تھا جن سے اس "خراب آباد" کا ذرہ ذرہ مملو ہے۔

ادریس کی افلاک نوردی نہ جانے اسکو کہان لیجاتی اگر کسی کے قدمون کی آہٹ اسکو چونکا نہ دیتی۔ اب وہ پھر اسی گرد و غبار کی کثیف دنیا مین سانس لے رہا تھا جہان آدم اور انکے بہکانیوالے پھینکے گئے تھے۔ ادریس کو آواز پر کان لگائے ہوئے مشکل سے چند لمحے ہوئے ہونگے کہ کسی نے سرد لہجے مین کہا "آج مجھے دیر ہو گئی۔ دادا آج کچھ بیمار ہین انھین کے کامون مین لگی رہی"۔ ادریس کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مریم اسکی گود مین تھی۔ دونون کے ہونٹ ملے اور محبت کے عہدنامہ پر ایک تازہ مہر لگ گئی

چوبیس گھنٹے کے بچھڑے ہوئے دلون نے جب ایک دوسرے کے ساتھ جی کھول کر اپنے اپنے ارمان نکال لئے تو ادریس کو یاد آیا کہ وہ گھر سے کیا سوچ کر چلا تھا۔ اُسنے اپنی آواز کو غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور متین بنا کر کہا "مریم مجھے تم سے آج ایک بات کہنا ہے"!

"وہ کیا؟ یہی کہ ہم اب اپنی محبت کو نہین ختم کردین تو اچھا ہے؟" مریم نے بات کاٹ کر پوچھا

"نہین مریم نہین۔ مجھ پر ظلم نہ کرو۔ مین تمھاری اتنی محبت کرتا ہون کہ اسکے درد سے میرے دل و دماغ پھٹے جا رہے ہین۔ مین نے اس سے پہلے بھی محبت کی ہے مگر وہ محبت نہ تھی ایک خواب تھا۔ لاؤ مین تمھاری چاند سی صورت کو پھر غور سے

دیکھون۔ اسمین اور اُن بے شمار صورتون مین جنکو ابتک دیکھ چکا ہون کیا فرق ہے؟ کچھ نہین۔ مگر نہین اتنا فرق ہے جتنا کہ سورج اور خاک کے ذرون مین ہے۔ مریم تمھاری آنکھون مین نشہ ہے جسکو مین اپنے رگ و پے مین ساری ہوتے ہوئے محسوس کر رہا ہون مین نے شراب پی ہے مگر اس نشہ کا تجربہ مجھے کبھی نہین ہوا تھا۔ ادریس نے مریم کا منہ پھر چوم لیا

مریم نے افسردہ لہجہ مین کہا "مین نے آج دن مین خواب دیکھا ہے کہ آپ بلا وجہ مجھ سے خفا ہو کر چلے گئے ہین اور پھر میرے رونے دھونے کا آپ پر کوئی اثر نہین ہوا۔ مین نے کیسے کیسے خدا کیواسطے دلائے لیکن آپنے مُڑ کر مجھے دیکھا بھی نہین۔ میرا دل کانپ رہا ہے کہ دیکھیئے اس خواب کی تعبیر کیا ہوتی ہے"

"بیکار جی نہ کڑھایا کرو۔ یہ سب تمھارا وہم ہے اور کچھ نہین" ادریس نے جواب دیا "مین آج اسی مسئلہ کو طے کرنے آیا ہون۔ ہمارے دن یون کب تک بسر ہونگے۔ جہان تم ہر طرح سے میری ہو وہان شرعاً بھی میری ہو جاؤ۔ اب زیادہ غور و تامل کا وقت نہین ہے۔ صرف ایک بات میرے دلمین کھٹکتی ہے۔ اس کھٹک کو دور کر دو پھر جس تاریخ کو مناسب سمجھو ہم یہان سے کہین دور جا کر شادی کر لین۔ مین یہ جاننا چاہتا ہون کہ رؤف کے ساتھ تمھارے تعلقات کس قسم کے تھے؟"

مریم مسکرا دی۔ اسکی مسکراہٹ مین خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ شرارت بھی تھی۔ ادریس نے کہا "صحیح بتانا ورنہ میرے دل کا بوجھ بڑھتا جائیگا" مریم نے کہنا شروع کیا "رؤف میان نے خود مجھے چھیڑ کر مجھ سے راہ و رسم پیدا کی۔ مین اُن سے بھاگتی رہی۔ وہ میرا پیچھا کرتے رہے۔ آخر کار مجھے بھی ایسے بیدرد کی بےبسی مین مزہ آنے لگا۔ مین اُنکے سارے قصے سُن چکی تھی۔ مین اُن سے کھلکر ملنے لگی لیکن آپکو یقین ماننا ہے تو مانئے کہ آجتک رؤف میان نے میرے جسم کو چھوا تک نہین ہے۔ نہ جانے مجھ مین کیا تھا کہ میرے سامنے اُنکے ہاتھ پاؤن ڈھیلے رہتے تھے۔ جس تاریخ سے مین نے آپکی صورت دیکھی اُن سے ملنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ مجھے کہنا نہین چاہیئے۔ اُنھون نے میرے قدموں پر گر کر خوشامدین کی ہین کہ مین اُن سے دامن نہ چھڑاؤن لیکن مین نے اُن سے کھُلے الفاظ مین کہدیا کہ مجھے اُن سے دراصل کبھی کوئی لگاؤ نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے اور نہ زبردستی کی عشقبازی ہو چکی۔ رؤف میان اسکے بعد بھی اپنی سی کرتے رہے مگر آخر کار مجھے پتھر کی طرح اٹل دیکھکر صبر کر کے بیٹھ رہے۔ مین اُنکی زمین مین بسی ہوئی ہون۔ وہ اگر آج چاہین تو مجھکو یہان سے اُجاڑ سکتے ہین۔ مجھے اسکی بھی پروا نہین ہے۔ مین تو آپ کا سودا مول لے چکی ہون" مریم نے سلسلہ ختم کر کے ادریس کو غرور و پندار کے ساتھ دیکھا۔ ادریس نے اطمینان کی سانس لی اور مریم کو لپٹا کر کہا "تو آج سنیچر کا دن ہے۔ آیندہ جمعہ کو تم میری بیوی ہوگی۔ جمعہ کا دن مبارک دن ہے"

مریم کے چہرہ سے ایک بےچینی کا اظہار ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی۔ ادریس نے پوچھا "کیون؟ کیا تمکو منظور نہین ہے؟"

مریم نے ایک آہ کر کے کہا "منظور مجھے سب کچھ ہے مگر نہ جانے کیون میرا دل کہتا ہے کہ آپ مجھ سے شادی کر کے خوش نہین رہ سکینگے۔ میرے اندر بیوی بننے کی قابلیت بہت کم ہے۔ کیا یہ ممکن نہین کہ ہم ہمیشہ یونہی رہین؟ اچھا اس ذکر کو جانے دیجئے۔ دیکھئے چاند بادل کے پردون سے باہر نکل آیا۔ اسکی دھیمی روشنی مین آپ مجھے محبت کے دیوتا معلوم ہوتے ہین۔ آیئے اس رُت اور اس گھڑی سے

سے جو کچھ حاصل ہو سکے حاصل کرین۔ آنے والی گھڑیون کی بابت جب مین سوچتی ہون تو طرح طرح کے وسوسے دلمین پیدا ہونے لگتے ہین"
مریم کی آنکھین نم آلودہ تھین۔ ادریس پر ایک نشہ سا چھا گیا اور اسنے مریم کی کمر مین ہاتھ ڈالکر اسکو لپٹا لیا اور خوب پیار کیا
وہ اس سے پہلے بھی مریم کے مُنہ سے اسی قسم کی شاعری سُن چکا تھا اور اسکو معلوم ہو گیا تھا کہ اس پیکر نور کو اگر باقاعدہ تعلیم و تربیت دیجاتی تو وہ ہندوستان مین ایک چیز ہوتی۔ آج ادریس مریم کی باتون سے دیر تک لذت نہ اُٹھا سکا۔ اسکو ایک قطعی فیصلہ پر پہنچنا تھا۔ اُسنے پھر کہا "مریم ذرا سوچو۔ دنیا بڑی بُری جگہ ہے۔ بلا شرع کی زنجیر مین جکڑے ہوئے ہمارا اس طرح ملتے رہنا معیوب سمجھا جا رہا ہے اور ہر طرف شورشین پھیل رہے ہین۔ ہم دونون بدنام ہو رہے ہین۔ شادی کے بعد مجھے دنیا کے کہنے سننے کی مطلق پروا نہ ہو گی،،

"لیکن آپکی مان کیا کہین گی،، مریم نے رکتے ہوئے پوچھا

ادریس نے بلند آہنگی سے جواب دیا "اُنکا جو جی چاہے کہین۔ مجھے اسکی بھی پروا نہین۔ مین نے اُنکے روٹی کپڑے کیلئے کافی سامان کر دیا ہے۔ اُنکو میرے نہ ہونے سے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ اب اگر وہ بیٹے کی خوشی مین شرکت کرنا چاہتی ہین تو کرین ورنہ مین سمجھونگا میرے کوئی مان نہ تھی۔ مین ساری دنیا کی آسائشون کو تج دونگا اور تمھاری جھونپڑی کو بہشت سمجھکر تمھارے ساتھ رہونگا۔ للہ مریم تم میرے سوال کو رد نہ کرو اور شادی کا اقرار کرلو ورنہ مین پھر کہین کا نہ ہونگا،،

مریم مجبور ہو گئی۔ وہ اپنا دل خون کر سکتی تھی مگر ادریس کو آزردہ کرنا اسکو گوارا نہ تھا۔ اُسنے صرف ایک شرط پیش کی اور وہ یہ تھی کہ شادی کے بعد بھی وہ اسی طرح بے پردہ سیر و تفریح کیا کریگی۔ ادریس نے شرط منظور کرلی اور مریم نکاح پر آمادہ ہو گئی وہی جمعہ کا مبارک دن نکاح کا دن ٹھیرا۔

جمعہ کا وہ دن بھی آگیا مریم اور ادریس دو دن غائب رہے۔ اسکے بعد جو لوٹے تو گھر گھر اسکا چرچا تھا ہر شخص یہی کہتا تھا کہ ادریس کے دماغ مین ضرور کچھ فتور ہے جو اونچے خاندان کی پریزادیون کو چھوڑکر ایک بے نام و نسب بدقماش بھکارن کو یون گھر مین بٹھا لیا۔ نکاح کے مفصل حالات کا پتہ نہین۔ اتنا معلوم ہے کہ ادریس مریم کو لیکر بستی چلا گیا تھا اور وہان قاضی اور گواہون کو جمع کرکے خاموشی کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا۔ دیکھنے والونکا بیان ہے کہ جب دونون واپس ہوئے ہین تو اُنکے چہرون پر اس بشاشت اور شگفتگی کی کوئی جھلک نہ تھی جسکی ایسی حالت مین توقع کی جاسکتی تھی

ادریس کی زندگی مین اب کوئی کمی نہ تھی جس چیز کی اُسنے آرزو کی وہ اسکو "دربردۂ تقدیر،، سے ملگئی۔ اب اسکو آسودہ ہونا چاہیئے لیکن نکاح کے چند ہی گھنٹون کے بعد سے وہ اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگا جسکو وہ خود بھی نہین سمجھ سکتا تھا کہ کیا ہے۔ وہ مریم کی صورت دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا مگر اسکے دل کے اندر جو کانٹے کھٹکنے لگے تھے اُنکا علم سوائے اسکے دل کے اور کسی کو نہ تھا

مریم اب ادریس کیلئے کوئی دیوی یا پری یا دیفنی کی کوئی کاہنہ نہ تھی بلکہ دنیا کی ایک معمولی عورت تھی جس کیلئے اسکو دنیا کے طعنون اور سرزنشون کا مقابلہ کرنا تھا۔ مریم اب زمانہ کے تند جھونکون سے محفوظ رہنے کیلئے ادریس کے سایۂ دامن کی محتاج تھی

ادریس مریم کے ساتھ اپنے گھر مین نہ رہ سکتا تھا۔ وہ اپنے قول کا سچا نکلا۔ اُسنے رسول شاہ کی جھونپڑی مین بود و باش اختیار کرلی۔ اس جھونپڑی کو اُسنے اپنی ضرورتون کے مطابق پھر سے بنوایا اور تیواری پور مین ایک نیا مکان تعمیر کرانیکی فکر مین لگ گیا

مدرسہ اور دکان کا کام بدستور جاری رہا۔ ممتاز ضروری معاملات مین اب بھی ادریس سے ملکر اس سے مشورہ لیتا رہتا تھا مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونون کے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہو گئی ہے۔ ادریس کو مدرسہ کے ساتھ وہی انہماک تھا۔ مگر وہ چارون طرف بدنام ہو رہا تھا اور مدرسہ کا کام خود بخود سست ہونے لگا تھا

(۱۳)

سات مہینون کی مدتیں ادریس کو ہر طرف کی انگشت نمائیون سے پناہ ملگئی اور اب کہا جا سکتا تھا کہ مریم اور ادریس دونونکو یکسوئی نصیب ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ادریس پر ردعمل شروع ہو گیا تھا۔ وہ اگر پچھتا نہین رہا تھا تو اسکا یہ خیال جڑ ضرور پکڑ گیا تھا کہ اُسنے مریم کے ساتھ شادی کرنے مین غیر معمولی عجلت کو راہ دیا۔ ماں کے چھٹ جانیکا غم اسپر مستزاد تھا اور وہ اس غم مین بھی بہت کچھ گھل رہا تھا۔ ادریس بھی اپنی ماں کی طرح بات کا پکا آدمی تھا۔ اُسنے ایکبار بھی سکینہ سے ملنے کی آرزو ظاہر نہین کی مگر مریم سے اسکا درد چھپا نہ تھا۔ ادریس مریم سے ہنس ہنس کر میٹھی میٹھی باتین کیا کرتا تھا اور مریم اسکی ہنسی مین دُکھے ہوئے دل کی ایک جھلک دیکھ لیتی تھی

دو تین مہینون سے ادریس کی آنکھین سوجی ہوئی تھین۔ پہلے تو اسکو معمولی آشوب سمجھا گیا اور اسکی وجہ کثرتِ مطالعہ بتائی گئی لیکن کچھ دنون سے چارہ گرون کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ ادریس کی آنکھین کہین عمر بھر کیلئے بیکار نہ ہو جائین۔ گورکھپور کے ایک ڈاکٹر کا علاج شروع ہوا۔ ادریس کی آنکھون پر پٹی بندھ گئی اور روشنی سے پرہیز کرنیکی سخت تاکید ہو گئی۔ ادریس اب رسول شاہ کی جھونپڑی مین دن رات ایک اندھیری کوٹھری مین بند رہنے لگا۔ اب اسکا دماغ اپنی پوری جولانی کے ساتھ زندگی کی ناکامیون پر غور کر رہا تھا۔ اسکی اُمیدون کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور اسپر یہ سنگین حقیقت روشن ہو چکی تھی کہ مریم کے ساتھ آسودہ رہنا اس کے لئے اور بھی دشوار ہے

ادریس کا ادھر یہ حال تھا۔ اُدھر مریم کی مایوسیان بھی کچھ کم نہ تھین۔ شادی سے پہلے وہ طرح طرح کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اُسکی طبیعت اس خانقاہی زندگی سے اب اُچاٹ ہو چکی تھی۔ اُسنے ادریس کو لکھنؤ اور دوسرے بڑے شہرون کی پُرتکلف زندگی کا ذکر کرتے ہوئے سنا تھا جو اسکو دلفریب و خوش آئند معلوم ہو رہی تھی۔ اُسنے کئی بار ادریس سے کہا بھی تھا "آپ ناحق ایسے ایسے شہرون کو چھوڑ کر اس اُجڑے دیار مین اپنی زندگی کو خاک مین ملا رہے ہین۔ آپنے ایسی ایسی مشقتون کے بعد علم حاصل کیا۔ اس سے آپکو فائدہ اُٹھانا چاہیے تھا جن شہری دلچسپیون کا آپ ذکر کرتے ہین کاش وہ مجھے میسر ہوتین"۔ ادریس ہنس کر اسکا جواب دیتا تھا "مریم تمکو اس زندگی کا تجربہ نہین ہے اسلئے اُسکی آرزو نہ کرو مین جانتا ہون کہ وہ کیسی بے چین زندگی ہے اسلئے اس سے پناہ مانگتا ہون"

شادی کے بعد مریم نے زبردست تحریک شروع کی کہ ادریس اس کوردہ کو چھوڑدے اور کسی دور و دراز شہر مین ذریعۂ معاش تلاش کرکے اسکے ساتھ تعیش کی زندگی بسر کرے۔ ادریس برابر ٹالتا رہا۔ آخرکار ایک روز مجبور ہوکر اُسنے نہایت حقارت اور بیدردی سے کہدیا "مین تمھاری اس خواہش کو پورا کرکے اپنی زندگی کو عذاب نہین بنا سکتا"۔ مریم نے پھر کچھ نہ کہا مگر اس جواب سے اسکو جو ملال ہوا وہ کبھی اسکے دل سے گیا نہین۔

... مریم کو سب سے بڑا صدمہ یہ تھا کہ اب ادریس بات بات مین اس سے بگڑ جاتا تھا اور سخت سست کہنے لگتا تھا مریم سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن ادریس کی چڑھی ہوئی تیوریان اور اسکی ہر وقت جھڑکیان اسکے لئے زہریلے نشتر سے کم نہ تھین ادریس تھوڑی ہی دیر بعد مریم کو خوشامدین کرکے منانے لگتا تھا اور مریم من بھی جاتی تھی مگر مریم کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اب اسکو تمام عمر انھین کانٹون مین رہنا ہے جنکو خود اُسنے اپنے دل کے خون سے سینچ سینچ کر پرورش کیا ہے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ ادریس باوجود اپنے دعوی کے مان کو نظر انداز نہین کرسکتا اور چونکہ اپنے کئے کی لاج بھی ہے اسلئے مان سے معافی مانگ کر مصالحت بھی نہین کرسکتا نتیجہ یہ ہے کہ سارا نزلہ "عضوِ ضعیف" پر گرتا ہے اور مریم موردِ عتاب بنتی ہے۔ اب اسکو یہ فکر تھی کہ کسی طرح مان بیٹے مین ملاپ ہوجائے۔ اس ملاپ سے اسکو یقین تھا کہ ادریس کی کوفت تو قطعاً دور ہوجائیگی اور بہت ممکن اسکی خود اپنی زندگی بھی خوشگوار ہوجائے۔ اس خیال سے ایک دن جبکہ ادریس رات بھر کی بیخوابی کے بعد دوپہر کو سو رہا تھا مریم اُٹھی اور ایک چادر سر سے لپیٹ کر رام نگر کیطرف چلی۔ ادریس کے مکان پر پہنچکر وہ سیدھی اندر داخل ہوگئی۔ سکینہ ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ گھر مین کوئی دوسرا نہ تھا۔ مریم سکینہ کو سلام کرکے اسکے پاس بیٹھ گئی۔ سکینہ نے مریم کو کبھی دیکھا نہین تھا۔ مریم نے اسکو حیرت کا موقع نہین دیا۔ اور بلا کسی تمہید کے اپنا تعارف کرایا۔ سکینہ کے ماتھے پر بل پڑگئے۔ مریم نے چند منٹ کے اندر نہایت اختصار کے ساتھ ادریس کی اندوہناک حالت بیان کردی اور پھر آنکھون مین آنسو بھر کر کہنے لگی "آپ مجھے جو چاہئے سمجھئے اور جو چاہئے کہئے۔ مین آپکو اپنی مان سمجھتی ہون۔ گنہگار مین ضرور ہون لیکن اس گناہ پر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ مین نے آپکے بیٹے کو اس نادانی سے بہت روکنا چاہا مگر اُنھون نے میری ایک نہ سنی اور اب اگر وہ اپنے کئے پر پچھتا نہین رہے ہین تو آپ سے یون چھٹ جانیکے ملال مین گھل ضرور رہے ہین اگر آپ نے سچے دل سے انکو معاف نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ نصیب دشمنان اُنکی جان پر آبنے گی۔ اگر آپ یہ چاہین کہ مین اُنکو چھوڑ دون تو مین اسپر راضی ہون بشرطیکہ وہ مجھکو چھوڑ سکین۔ میرا خدا مالک ہے۔ کسی نہ کسی طرح زندگی کٹ ہی جائیگی"

مریم کا لب و لہجہ اتنا دردناک تھا کہ پتھر بھی پانی ہوسکتا تھا مگر سکینہ پر اس کا اُلٹا اثر ہوا۔ اسکا چہرہ سرخ ہوگیا اور اسکی صورت سے غیظ ٹپکنے لگا۔ اسمین شک نہین کہ مریم کی صورت اور اسکی باتون کا اسپر کافی رعب چھاگیا تھا اور اسمین بھی شک نہین کہ وہ ادریس پر جان نثار کرسکتی تھی لیکن کسی طرح اس خیال کو اپنے دل سے دور نہ کرسکتی تھی کہ وہ سیدھے اور مریم کوچہ و بازار کی ایک رذیل بدمعاش عورت ہے۔ اُسنے اپنے غصہ مین کانپتے ہوئے ہاتھ سے "دور باش" کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اپنی سفارش اپنے پاس رکھو اور اپنی چرب زبانی سے کہین اور جاکر کام لو۔ مجھے معلوم ہے کہ ادریس کو میری ضرورت نہین ہے ورنہ

آج وہ مجھ سے یون منہ موڑ کر میری محبت کو تم پر نہ قربان کر دیتا۔ اب تم ادریس کو بھیک سمجھ کر مجھے واپس دینے کے لئے تیار ہو؟ شاید اب کوئی اور نگاہ پر چڑھ گیا ہے۔ بس اب یہان سے چلی جاؤ اور پھر میرے گھر مین اپنے قدمون کی برکت نہ لانا،، سکینہ کو اسوقت دیکھنے والے جلاد سمجھتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ضد اور آن والی عورت تھی اسکو اپنی سیادت پر گھمنڈ تھا ورنہ آج وہ مریم کو ضرور اپنی بہو تسلیم کر لیتی۔ مریم آنکھو نمین آنسو بھرے چلی گئی۔ سکینہ اسدن شام تک پڑی سسکیان لیتی رہی۔

مریم رام نگر سے ملول و دلگیر چلی تھی اور راستہ بھر سکینہ کے برتاؤ پر غور کرتی رہی۔ پربتیا کے قریب پہنچتے پہنچتے اسکا رنج غصہ سے بدلگیا اور اب اسکے خیالات نے پلٹا کھایا۔ سکینہ کے انداز سے اسکو یہ معلوم ہوا تھا کہ اگر مان بیٹے ملگئے تو اب اسکی اپنی زندگی مصیبت ہو گی۔ اسکو یقین ہو گیا تھا کہ سکینہ کبھی اسکی دوست نہین ہو سکتی۔ مریم نے اسی جگہ قسم کھالی کہ جہانتک اسکا بس چلیگا وہ یہی کوشش کرتی رہیگی کہ ادریس اور سکینہ مین میل کی کوئی صورت نہ نکلنے پائے۔

مریم جنگل کے اندر سے ہو کر نہین جا رہی تھی بلکہ اس کھلے ہوئے راستہ سے جا رہی تھی جو آمی اور جنگل کے درمیان سے گذرتا ہے۔ آدھے سے زیادہ راستہ طے ہو چکا تھا۔ مریم اپنے خیالات مین گم تھی۔ اتنے مین بائین طرف سے کسی نے اسکا نام لیکر پکارا۔ آواز آشنا سی تھی مریم چونک پڑی۔ دیکھا تو جنگل کے کنارے رؤف کھڑا تھا۔ رؤف نے نگاہون سے التجا کرتے ہوئے کہا،، اگر کوئی ہرج نہ ہو تو اتنی مدت کے بعد دو باتین مجھ سے بھی کرتی جاؤ۔ مریم ہچکچاتے ہوئے رک گئی۔ رؤف قریب آگیا اور چند منٹ تک مریم کو پرستارانہ نگاہون سے دیکھتا رہا۔ مریم نے گھبرا کر کہا،، مجھے جلد گھر پہنچ جانا چاہئے۔ کہئے آپکو کیا کہنا ہے،، رؤف نے محسوس کر لیا کہ مریم اب وہ مریم نہین ہے۔ اسلئے کہ اسکے لہجہ مین آج وہ اکڑ وہ خودداری وہ معصومانہ سرکشی نہ تھی۔ رؤف نے ایک آہ کر کے کہا،، خدا جانے تمنے اپنی زندگی بنائی یا نہین مگر مجھکو تو بُری طرح مٹی مین ملا دیا۔ یون تو بظاہر مین جیسا تھا ویسا اب بھی ہون مگر کہہ نہین سکتا تمھاری صورت دیکھنے کو تمھاری باتین سننے کو ترستا ہون۔ اب اور کوئی آرزو کرنا تو بیکار ہے لیکن کیا یہ امید بھی ناجائز ہے کہ کبھی کبھی اپنی صورت دکھا دیا کرو۔ تم آزاد اب بھی ہو اور اتنا کر سکتی ہو۔ کہو تو مین اسی جگہ روز آیا کرون،، مریم نے سراسیمہ ہو کر جلدی سے جواب دیا،، نہین آپ اسکی کوشش نہ کیجئے۔ مین بدنام ہو جاؤنگی۔ ہان اگر آپ کی حسرت صرف اسقدر ہے تو مجھ سے جب کبھی ہو سکیگا آپکو اپنا شامت زدہ منہ دکھا دون گی،، مریم رخصت ہو جانا چاہتی تھی۔ مگر رؤف نے پوچھا،، کیون مریم شامت زدہ کیون؟ کیا تم خوش نہین ہو؟،، مریم نے ملاقات کو مختصر کرنے کے لئے کہا،، مجھے کوئی شکایت نہین۔ مجھے خدا کا دیا سب کچھ ملا ہے۔ لیکن اسکا کیا علاج کہ مین دنیا مین خوش رہنے کے لئے نہین بنائی گئی ہون۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو یقیناً خوش ہوتا،، یہ کہکر وہ وہان سے روانہ ہو گئی۔

ادریس ابھی سو رہا تھا۔ مریم بیٹھکر اپنی گذشتہ اور موجودہ زندگی کا موازنہ کرنے لگی۔ کیا اسکے حق مین یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ بلا کسی قسم کی زنجیر مین اپنے کو جکڑے ہوئے اپنی تمام عمر گذار دیتی؟ یا اگر اسکو کسی کا پابند ہی ہونا تھا تو کیا رؤف ادریس سے زیادہ مستحق اور اس سے زیادہ موزون آدمی نہ تھا؟ آج پہلا دن تھا کہ مریم نے رؤف کو قدر کی نگاہون سے دیکھا تھا۔ لیکن ادریس کے مقابلہ مین رؤف کا خیال آتے ہی اسکو اپنی ذات سے شرم آنے لگی اُسنے ”توبہ توبہ“ کہکے فوراً اس خیال کو اپنے ذہن سے دور کر دیا اور آہستہ سے ادریس کو جاکر جگا دیا۔ ادریس کے فرشتون کو بھی خبر نہ تھی کہ مریم اتنی دیر مین کہان کہان ہو آئی اور کیا کیا کر آئی مریم نے بھی ادریس سے آج کے واقعات کا کوئی ذکر نہین کیا

(باقی)

مجنون گورکھپوری

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

اور

قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

ہم نے ہندوستان کس طرح فتح کیا؟

یہ سوال کہ ہمنے ہندوستان کس طرح فتح کیا، اُن سوالات سے جنکو مین نے گذشتہ سلسلۂ تقریر مین اُٹھایا تھا، قطعی مشابہ نہین ہے۔ دنیائے جدید مین ہمارے نوآبادکارون نے یقیناً ایک وسیع خطہ پر تصرف کر لیا تھا لیکن وہ نسبتہً غیر آباد تھا، جن مشکلات کا اسکو مقابلہ کرنا پڑا زیادہ تر وہان کے دیسی باشندون کی طرف سے نہین تھین بلکہ یورپ کی دوسری قومون کی رقابت سے پیدا ہوی تھین۔ مین کسی حد تک بیان کر چکا ہون کہ رفتہ رفتہ کن کن طریقون سے ہم نے ان حریفون پر فوقیت حاصل کی۔ اس سوال کا جواب گو بادی النظر مین بالکل کھلا ہوا نہین معلوم ہوتا تاہم اسکا دریافت کر لینا زیادہ مشکل نہین۔ برخلاف اسکے یہ سوال کہ ہندوستان کس طرح فتح ہوا پہلی ہی نظر مین نہایت پریشان کن معلوم ہوتا ہے۔ یہان آبادی گنجان تھی، یہان کا تمدن، (گو اسکا سرچشمہ بالکل مختلف تھا) ایسا ہی حقیقی اور قدیم تھا جیسا ہمارا اپنا۔ ہم نے یورپ کی تاریخ مین متعدد مثالین ایسی دیکھی ہین کہ ایک سمجھدار قوم کو جو زبان و مذہب مین اپنے حملہ آورون سے قطعی مختلف تھی، فتح کرنا بالکل ناممکن ہو گیا۔ ہسپانیہ کی پوری طاقت اسّی سال مین بھی ڈچ کے صوبون کو جنکی آبادی نہایت مختصر تھی نہ فتح کر سکی۔ یہی حال پرانے زمانہ مین سوئٹزرلینڈ والون اور حال مین یونانیون کا تھا کہ وہ مغلوب نہ ہو سکے اور ٹھیک اُسی وقت جب ہم نے ہندوستان کی فتح کا پہلا قدم اُٹھایا، ہم امریکہ کے ۳۰ لاکھ باشندون کو جو ہماری ہی نسل سے تھے تاج برطانیہ کا وفادار رکھنے مین ناکام رہے۔ یہ کیسا عجیب اجتماع ضدین ہے! انگریزون نے جنگ امریکہ کی سی مایوس کن نااہلی کبھی نہین دکھلائی اسوقت بظاہر یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ انکے عروج کا زمانہ ختم ہو گیا اور انگلینڈ کا زوال شروع ہو گیا۔ لیکن اُسی وقت ہندوستان مین وہ بحیثیت ایک ناقابل مقاومت فاتح کے نظر آ رہے تھے اور اپنی اسی فوقیت کو دیکھکر وہ اپنے کو بہادرون کی ایک قوم سمجھنے لگے تھے۔ اس اختلاف کی کیا تشریح ہو سکتی ہے؟

تاریخ کا مطالعہ اسقدر سطحی نگاہ سے . . . . کیا جاتا ہے کہ یہ اختلاف بالکل . . . نظر انداز ہو جاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ہماری نظرون کے سامنے فتح کی ایک جھلک آ جاتی ہے جسکی وجہ سے ہم خیال کرتے ہین کہ باوجود اِن باتون کے اُسوقت ہمارے اندر آثار حیات موجود تھے۔ یقیناً (اگرچہ اس اختلاف کی تاویل کتنی ہی مشکل معلوم ہو) اسمین کوئی شبہہ نہین ہے کہ بارہا ہندوستان مین پلاسی یا دوسرے موقعون پر ہماری فوجون نے خوفناک مشکلات کے باوجود فتوحات حاصل کین۔ اگر ہم یہان اپنی قومی برتری پر ناز کرین اور محسوس کرین کہ ہندؤن کے مقابلہ مین ہم خوفناک لوگ ہین تو کوئی مضائقہ نہین۔

لیکن سچ مچ کیا یہ دعویٰ اس مشکل کو رفع کرسکتا ہے؟ فرض کرلو کہ ایک انگریز سپاہی ۱۰ یا ۲۰ ہندؤن کے برابر ہے۔ کیا اسوقت بھی یہ قیاس مین آسکتا ہے کہ انگریزون نے سارے ہندوستان کو فتح کرلیا جس وقت یہ فتح شروع ہوی انگریزون کی کل تعداد ۱۲ ملین (ایک کروڑ ۲۰ لاکھ) تھی اور ہندوستان کے علاوہ انکو دوسری جگہون پر بھی لڑائیان درپیش تھین۔ کلایو کا کچھ زمانہ یورپ کی جنگ ہفت سال مین پڑتا ہے اور جب ہم نپولین سے برسرپیکار تھے تو لارڈ ویلزلی ہندوستان مین بڑے بڑے ملحقات کا اضافہ کررہا تھا ہماری سلطنت فوجی نہین ہے۔ اُس زمانہ مین ہم کوی زبردست نبرد آزما فوج رکھنے کے قابل نہین تھے اور نہ ہمکو اس کا دعویٰ تھا۔ اسطرح یورپ کی جنگون مین ہم عام طور پر بحری بیڑون سے کام لیتے تھے اور جب خشکی پر مقابلہ کی نوبت آتی تو کسی اپنے حلیف کے طرفدار ہوجاتے۔ چنانچہ کبھی آسٹریا کا ساتھ دیتے اور کبھی پروشیا کا۔ باوجود اپنی بری طاقت کی کمزوری کے ایسے وقت مین کیونکر ممکن تھا کہ ہم ہندوستان کے بڑے حصہ پر فتح حاصل کرتے جسکا رقبہ تقریباً ۱۰ لاکھ مربع میل اور آبادی ۲۰ کروڑ تھی۔ اسکی وجہ سے ہماری فوجی قوت اور خزانہ پر کتنا بار پڑا ہوگا۔ تاہم کسی وجہ سے یہ بار کبھی محسوس نہین ہوا۔ یورپ کی جنگون نے ہم پر اتنا قرض لاد دیا جو کبھی ادا نہ ہوسکا، لیکن ہندوستان کی جنگون سے ہمارے قومی قرضہ مین مطلق اضافہ نہین ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جو کچھ محنت و مشقت ہمکو وہان برداشت کرنا پڑین انکا کوی اثر باقی نہ رہا۔

اسلئے ضرور اس موجودہ خیال مین کچھ غلطی ہے کہ انگلینڈ سے سپاہی ہندوستان گئے اور انھون نے اپنے شجاعت اور ذہنی تفوق کی بدولت سارے ملک کو فتح کیا۔ ۱۸۱۸ء مین مرہٹون سے جو بڑی لڑائی ہوی اس مین ہمارے ایک لاکھ سے زیادہ سپاہی تھے لیکن یہ کسقدر حیرت کا مقام ہے یہی وہ زمانہ ہے جب جنگ نپولین کے بعد ہماری بے سروسامانی اور بے بضاعتی حد درجہ المناک تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ جنگ واٹرلو کے تین ہی سال بعد ہم ہندوستان مین اتنے بڑے پیمانہ پر جنگ مین مصروف ہوتے اور ہمارے پاس اتنے سپاہی ہوتے جتنے لارڈ ولنگٹن کے پاس اسپین مین بھی نہ تھے۔ پھر اس وقت بھی ہندوستان مین ہماری فوجی قوت صرف ۲ لاکھ نفوس ہے صرف دو لاکھ سپاہی! درانحالیکہ ہماری سلطنت بھی فوجی سلطنت نہین ہے!!

درحقیقت مین جس بات کی طرف اشارہ کررہا ہون تم اُسکو سمجھ رہے ہو۔ ہم سب جانتے ہین کہ یہ ہندوستانی فوج خالص انگریزی نہین ہے بلکہ اسمین غالب عنصر دیسی فوج کا ہے۔ ۲ لاکھ مین سے صرف ۶۵۰۰۰ یعنی ایک تہائی سے بھی کم اسمین انگریز سپاہی ہین اور یہ تناسب غدر کے بعد سے قائم کیا گیا جب سے کہ انگریزی سپاہ مین اضافہ اور دیسی فوج مین تخفیف کی پالیسی شروع ہوئی۔ اسطرح غدر کے وقت انگریزی سپاہ کی تعداد صرف ۴۵۰۰۰ تھی اور اُسکے مقابلہ مین دیسی سپاہ ۲۳۵۰۰۰ تھی یعنی انگریزی سپاہ ہندوستانی سپاہ کے بقدر ۱/۵ تھی پھر ۱۸۰۸ء مین دیکھتا ہون کہ انگریزی سپاہ ۲۵۰۰۰ تھی اور دیسی سپاہ ۱۳۰۰۰۰ یعنی ۱/۵ سے بھی کم۔ یہی تناسب ۱۷۷۳ء مین بھی تھا جسوقت برطانوی ہند اور ریگولیٹنگ ایکٹ وجود مین آئے۔ اسوقت کمپنی کی فوجی قوت ۹۰۰۰ یورپین اور ۴۵۰۰۰ دیسی سپاہ پر مشتمل تھی۔ اس سے قبل یوروپین سپاہ کا تناسب مین اس سے بھی کم پاتا ہون یعنی صرف ۱/۷ اگر اسی طرح ہم پیچھے ہٹتے جائین تو دیکھین گے کہ شروع شروع مین ہندستانی فوج کلیتہً دیسی ہی تھی، یوروپین سپاہ کا اسمین نام بھی نہین تھا۔ کرنیل جسنے (Col. Chesney) اس کے متعلق تاریخی نقطۂ نگاہ سے یون لکھتا ہے،،

"کمپنی کی ہندوستانی فوج ۱۷۴۸ء مین وجود مین آئی جب فرانسیسیون کی دیکھا دیکھی اپنے تحفظ کے لئے اُسنے مدراس مین ایک مختصر دستہ سپاہ کا مرتب کیا۔ ٹھیک اُسی وقت یوروپین سپاہ کا ایک دستہ بھی مرتب ہوا۔ جسمین وہ ملاح شامل تھے جو جہاز کے کام سے فاضل بچتے تھے یا وہ لوگ ہوتے تھے جنکو کمپنی کے جہاز ران انگلینڈ سے پھنسا کر لاتے تھے۔"

کمپنی کی ابتدائی لڑائیون مین، جنکی بدولت اسکو استحکام نصیب ہوا، ہر موقع پر، محاصرہ ارکاٹ محاصرہ پلاسی، اور بکسر مین، اسکے دیسی سپاہیون کی تعداد یوروپینون سے زیادہ تھی۔ یہان پر ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ ہمارا یہ خیال نہین ہے کہ دیسی سپاہ لڑتے مین نالائق تھی یا میدان جنگ مین سارا بوجھ یوروپینون ہی پر پڑتا تھا جس شخص کا ایسا طفلانہ خیال ہو۔ ایسا خیال عام طور سے مورخین اپنے غرور قومیت مین ظاہر کرتے ہین۔ اسکو یہ سنکر ہرگز متعجب نہین ہونا چاہئیے کہ انگریز مصنفین دیسی سپاہ کی حقیقت کا اندازہ کرنے مین بالکل قاصر تھے۔ میکولے نے کلایو پر جو مضمون لکھا ہے اسکو پڑھو۔ تم اسمین ایسے تعریفی کلمات بھرے پاؤگے، "شاہی قوم"، "سمندر کی بہادر اولاد"، "کلایو اور اُسکے ہمقوم انگریزون سے کوئی مقابلہ نہین کر سکتا تھا"، لیکن اگر ایک مرتبہ تسلیم کر لیا جائے کہ دیسی سپاہ ہمیشہ انگریزون سے تعداد مین زیادہ تھی اور ہر موقع پر جنگی لیاقت مین انگریزون کے ہم پلہ تھی تو ہماری کامیابی کا سارا دعوی جسکی بنا ہماری غیر محدود فطری شجاعت کی برتری پر ہے، متزلزل ہو جائیگا۔ جن لڑائیون مین ہماری فوج دشمن کے مقابلہ مین "ایک اور دس" کی نسبت رکھتی تھی اگر ہم کہین کہ ایک انگریز دس دیسی کے برابر تھا تو یہی بات ایک دیسی سپاہی کے لئے بھی صادق آسکتی ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ دونون سپاہ مین فرق تھا لیکن یہ فرق قومیت کا نہین تھا بلکہ ڈسپلن اور فن جنگ کا اور اکثر اوقات بلاشبہ سپہ سالاری کا تھا۔

تم دیکھوگے کہ مِل (Mill) نے "فتح ہند" کی جو سرسری تفصیل لکھی ہے اسمین انگریزون کی اس فطری برتری کا کہین ذکر نہین ہے۔ وہ لکھتا ہے "ہندوستان کی فتح دو اہم باتون کے دریافت پر منحصر تھی، پہلی یہ کہ دیسی فوج یورپین فوج کے مقابلہ مین بے قاعدہ ہوتی ہے، دوسری یہ کہ یورپین ملازمت مین رہنے والی دیسی سپاہ کو فوجی قواعد سکھانا آسان ہوتا ہے۔ یہ دونون باتین فرانسیسیون نے دریافت کی تھین۔"

اگر ہم تسلیم بھی کر لین کہ انگریزی سپاہ لڑنے مین دیسی سپاہ سے عمدہ تھی اور مشترکہ فتوحات مین اول الذکر کا حصہ زیادہ تھا تو بھی یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ انگریزی قوم نے ہندوستانی قوم کو فتح کیا۔ .... ہندوستانی قومون کو اس فوج نے زیر کیا جسمین صرف ۱/۵ حصہ انگریزی عنصر تھا ہم ان کامیابیون مین نہ صرف اپنی کارگذاری کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرتے ہین بلکہ شروع سے ان کی حقیقت ہی کو غلط سمجھتے اور غلط بیان کرتے ہین۔ بھلا فوج کا ۴/۵ حصہ کس قوم کی سپاہ سے تھا۔ دیسی ہندوستانیون سے۔ لہذا یہ کہنا کہ ہندوستان کو غیر ملکیون نے فتح کیا مشکل سے صحیح ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کو خود ہندوستانیون نے فتح کیا۔ اگر ہم ہندوستان کو فرانس یا انگلینڈ کی طرح متحد القوم سمجھنے مین برسرحق ہوتے، حالانکہ ہم نہین ہین، تو کبھی نہ کہتے کہ وہ غیر ملکی دشمنون سے دب کر چور چور ہو رہا تھا۔ بلکہ ہمکو کہنا چاہئے کہ اُسنے فتنہ و فساد اور طوائف الملوکی سے نجات حاصل کرنے کے لئے صرف ایک حکومت کے آگے گردن جھکا دی اگرچہ وہ حکومت غیرون ہی کی تھی۔

ہندوستان کی یہ تعریف یا اُسکے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ سیاسی اعتبار سے متحد تھا قطعی غلط اور مبالغہ آمیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو سیاسی اعتبار سے اور نہ کسی دوسرے صحیح مفہوم مین ہندوستان تھا۔ یہ لفظ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے یہی وجہ تھی کہ ہندوستان اس آسانی کیساتھ فتح ہوگیا۔ بالکل یہی حالت اطالیہ اور جرمنی کی تھی جو نپولین کے پنجہ مین آگئے تھے۔ کیونکہ دراصل اطالیہ اور جرمنی کا وجود حقیقی معنون مین تھا ہی نہین انہین قومیت کا جذبہ بالکل مفقود تھا۔ نپولین جرمنی کی ایک ریاست کو دوسری ریاست کے مقابلہ مین کھڑا کردیتا یا جب وہ اسٹریا یا پروشیا سے برسرپیکار ہوتا تو اسکی حلیف بویریا اور ورٹمبرگ کی ریاستین ہوتین جس طرح نپولین نے دیکھا کہ وسط یورپ مین فتوحات حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہایت کامیاب ہے اُسی طرح ڈوپلے نے شروع شروع ہندوستان مین بھی قیام سلطنت کے اس طریقہ کو موثر پایا بشرطیکہ وہان کسی یورپین حکومت کے مستحکم کارخانجات ہون۔ اُسنے دیکھا کہ یہان ہر ایک ریاست دوسری ریاست سے خانہ جنگی مین مبتلا ہے اگر انکی باہمی لڑائیون مین کوئی غیر ملکی دخل دیدے تو بلاشبہہ انکی قوت متوازن کرنیکی کنجی اسی کے ہاتھ مین ہوگی۔ ڈوپلے نے اس تجویز پر عمل کیا۔ چنانچہ ہندوستان مین اہل یورپ کی سلطنت کی ابتدا اُسوقت ہوئی جب فرانسیسیون نے حیدرآباد کی اُس لڑائی مین دخل دیا جو نظام الملک اعظم کی جانشینی کے سوال پر سنہ ۱۷۴۸ء مین ہوئی تھی۔

اسلئے حقیقت امر یہ ہے کہ ہندوستان کو اجنبیون سے مغائرت ہی نہین تھی جسکی وجہ یہ تھی کہ وہان قومی اتحاد مفقود تھا۔ اور صحیح معنی مین نہ ہندوستانی ہندوستانی تھے اور نہ غیر ملکی غیر ملکی اس حد تک، جیسا کہ مین نے اشارہ کیا ہے، یورپ مین بھی اسکی مثال موجود ہے۔ جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہین کہ ہندوستان کو انگریزون نے دیسی سپاہ کی مدد سے فتح کیا تو ہمکو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہان قومیت کا احساس اس سے کہین زیادہ مردہ ہوچکا تھا جتنا کہ اٹھارھوین صدی مین جرمنی مین تھا۔ نپولین نے بویریا کو آسٹریا کے خلاف یا دونوں کو پروشیا کے خلاف لڑادیا، لیکن اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ بویریا، آسٹریا یا پروشیا کو آپس میں لڑادے کیونکہ ان میں کچھ نہ کچھ احساس قومیت کا موجود تھا۔ . . . . نپولین ایک معاہدہ کی رو سے بویریا کے صدر سے آسٹریا پر حملہ کیوقت ایک فوج حاصل کرتا ہے لیکن وہ محض روپیہ کی بدولت جرمنون کی فوج مرتب کرکے خود جرمنی کو نہین فتح کرتا ہے، لیکن ہندوستان مین ایسا ہی ہوا۔ یورپ کے اندر اگر تم اسکی مثال سمجھنا چاہو کہ ہندوستان کو ایسی فوج نے فتح کیا جسمین ⅘ دیسی سپاہ تھی اور صرف ⅕ انگریزی تو تم فرض کرو کہ انگلینڈ نے فرانس پر حملہ کیا اور فرانسیسیون کو معقول تنخواہ دیکر اسقدر کافی فوج بھرتی کرلی کہ فرانس فتح ہوگیا۔ اُف یہ خیال ہی کسقدر ہیبتناک ہے! تم متعجب ہوگے کہ فرانسیسی فوج اور چپ چاپ فرانس پر حملہ کرے۔ تاہم اگر تم غور کرو تو محسوس کروگے کہ ایسا ہونا ممکن تھا بشرطیکہ فرانس کی گذشتہ تاریخ مختلف ہوتی۔ ہم خیال کرسکتے ہین کہ فرانس مین قومیت کا جذبہ کبھی پیدا ہی نہین ہوا اور یہ بہت آسان ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہین کہ بارھوین صدی شاہ پیرس اور شاہ رُون (Rouen) کی خانہ جنگیون سے بھری ہوئی ہے۔ ہم اپنے سلسلہ خیال کو آگے بڑھائین تو دیکھینگے کہ فرانس کے مختلف حصون مین جو حکومتین قائم تھین اُنہین کی بیشتر غیر ملکی تھین یعنی ملک پہلے ہی سے غیر ملکی حکمرانون کے جوے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ایسے ملک مین اگر خارجی اثرات سے ایسی ابتری رونما ہوجائے کہ کرایہ پر لڑنا ایک منفعت بخش پیشہ سمجھا جانے لگے تو ملک زرپرست اور پیشہ ور سپاہیون سے بھر جائیگا۔ ایسے سپاہی ہر حکومت سے لڑنے کے لئے تیار ہوجائینگے چاہے وہ ملکی ہو یا غیر ملکی۔

ہندوستان کی حالت بالکل ایسی ہی تھی۔ انگریزون نے وہان غیر ملکی غلبہ کی بنا نہین ڈالی کیونکہ وہ پہلے ہی سے موجود تھا

اس موضوع کے متعلق ہم نے ایک مخصوص غلط فہمی پیدا کردی ہے۔ یورپین قوم سے مراد وہ قوم ہے جو ایک خاص حصۂ ملک پر قابض ہو۔ ہمارے نزدیک ایسی قومیت معمولی شے ہے حالانکہ یہ نہایت غیر معمولی ہے۔ اسی قومیت کے تخیل پر ہماری حب لوطنی اور تمام قومی خصائل حمیدہ کی بنا ہے ہندوستان مین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کا مفہوم بالکل پراگندہ ہے، یہی نہین کہ گیارھوین صدی سے ملک اسلامی حملون سے محصور تھا بلکہ اگر ہم اس سے اور پہلے نظر کرین تو دیکھینگے کہ مختلف قومین ایک دوسرے سے مل جل گئی ہین، ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ کئے ہوئے ہے۔ وہ سنسکرت بولنے والی آرین قوم جو برہمنیت کی خالق ہے جو ہندوستان مین نام نہاد اتحاد قائم کرنے کی دعویدار ہے خود ایک حملہ آور قوم ہے اور بحیثیت حملہ آور ہونے کے اپنے اندر قدیم اقوام کو جذب کرنے سے قاصر رہی۔ یورپ مین قدیم قوم بالکل غائب ہوچکی ہے یہان تک کہ یورپین زبانون مین اُسکے وجود کا کوئی نشان نہین باقی ہے برخلاف اسکے ہندوستان مین قدیم اقوام ہر جگہ ظاہر ہین، وہان کی مروجہ زبانین سنسکرت کی مسخ شدہ شکلیں نہین ہین بلکہ سنسکرت اور قدیم زبانون کی آمیزش کا نتیجہ ہین۔ جنوبی ہند مین تو ان زبانون مین سنسکرت کی بُو بھی نہین ہے، برہمنیت جو بادی النظر مین عالمگیر معلوم ہوتی ہے نظر غائر سے مطالعہ کرنے پر محض چند اصول فلسفہ کے مبہم مجموعہ کا نام رہ جاتی ہے۔ جسنے متضاد اور بے جوڑ اوہام یگانگت کی جھلک پیدا کردی ہے۔ لہذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندوستان مین وہ بنیادی دعوی ہی مفقود ہے جسپر مغرب کے اصول سیاست کی بنیاد ہے، وہان وہ قومیت ہی نہین جسپر قومی حکومت ممکن ہو۔ اسکے ثبوت کے لئے ہمکو بہت پیچھے جانے کی ضرورت نہین ہے بس اتنا دیکھنا کافی ہے کہ محمود غزنی کے زمانہ سے ہندوستان مین اسلامی حملہ کا ایک مستقل سیلاب آتا رہا مغلون کی آمد سولھوین صدی مین تھی اور اس سے بہت پیشتر وہان کی اکثر حکومتین اسلامی تھین۔ اس لئے اُسی وقت سے ہندوستان کی اکثر ریاستون مین قومیت کا شیرازہ منتشر ہوچکا تھا۔ حکومتون کی بنیاد اب عدل و انصاف پر نہین تھی۔ انکو اب حق نہین باقی رہا کہ وہ قومیت اور حب لوطنی کے نام پر اپیل کرین۔

ان حالات کے اندر ہندوستان کی فتح کی تشریح ہندوستانیون کو دوسری قومون سے فروتر سمجھے بغیر ممکن ہے۔ بنا برآن کوئی وجہ نہین کہ ہم خواہ مخواہ انگریزون کو دوسری قومون سے اعلی خیال کرین۔ ہمارے نزدیک انسان کا اپنے ملک کی خاطر غیر ملکیون سے لڑنا ایک فرض ہے لیکن لیکن سوال یہ ہے کہ اُسکا ملک کیا ہے؟ جب ہم اس خیال کا تجزیہ کرتے ہین تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ انسان ایک ایسی قوم مین پیدا ہوکر پرورش پائے جو بطور ایک بڑے خاندان کے سمجھی جاتی ہو اور وہ فطری طور پر ملک کو بمنزلہ اپنی مان کے سمجھتا ہو لیکن اگر قوم کی ترکیب ایسی نہین ہے بلکہ اس مین دو یا تین قومون کی آمیزش ہو جو آپس مین ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہون اور زیادہ سے زیادہ اپنے گانون کو گھر سمجھتی ہون تو ایسی صورت مین وہان کے باشندون کا کوئی قصور نہین اگر انمین بجائے حب لوطنی کے گانون کی محبت ہو۔ پہلے پہل غیر ملکی جوے کو اپنے کندھے پر رکھنا اور چیز ہے اور ایک غیر ملکی جوے کو ہٹا کر دوسرا غیر ملکی جوا رکھنا بالکل دوسری چیز ہے۔

ہندوستان کی فتح کا تعجب خیز پہلو یہ نہین ہے کہ وہ انگریزون کو نصیب ہوئی بلکہ یہ ہے کہ انگلینڈ کو اس کے لئے کوئی محنت یا کوشش نہین کرنا پڑی، ہم اتنی بڑی آبادی فتح کرنے مین مصروف تھے جو یورپ کی آبادی کے برابر تھی لیکن انگریزون نے نہ تو کوئی ٹیکس دیا، نہ انگریزی حکومت نے قرضہ لیا نہ کبھی جبری فوجی بھرتی ہوئی، نہ کبھی آدمیون کی قلت محسوس ہوئی اور نہ ہمکو دوسری جنگون کے جاری رکھنے مین کوئی دقت ہی محسوس ہوئی۔ بظاہر یہ صورت ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے لیکن مین نے اسکی وجہ بیان کردی ہے جہان تک ان لڑائیون کی مالی حالت

کا تعلق ہے وہ عام اصول جنگ کے مطابق تھی۔ فتح ہمیشہ اپنا خرچ آپ برداشت کرتی ہے۔ نپولین کو کبھی مالی پریشانی نہین ہوی کیونکہ وہ ہمیشہ انھین کے صرفہ پر رہتا تھا جنکو مغلوب کرتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان بھی ہندوستان ہی کے روپیہ سے فتح ہوا۔ اب صرف یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آخر فوج کس طرح فراہم ہو سکتی تھی۔ اور یہ مشکل بھی رفع ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہین کہ اس فوج کا بڑا حصہ ہمیشہ دیسی سپاہ پر مشتمل ہوتا تھا

اگر ہم بغور دیکھین تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان پر حصول سیادت کے لئے لفظ "فتح" کا استعمال صرف ناموزون ہی نہین بلکہ قطعی مغالطہ آمیز ہے۔ کیونکہ اس طرح ہم ہر واقعہ کو ایسی صورت مین تقسیم کرنے کے مرتکب ہونگے جس سے وہ دراصل مشابہ نہین ہے بلاشبہہ اس سے قبل مین نے اچھی طرح بیان کر دیا ہے کہ جب کبھی یہ لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے کہین زیادہ جامع تعریف کا متقاضی ہوتا ہے جتنی عام طور سے لوگ اسکی کرتے ہین نیز یہ کہ اسکے بہت سے دوسرے معنی بھی ہوتے ہین۔ یقیناً یہ لفظ اسی موقع پر استعمال ہوتا ہے کہ جب ایک سلطنت دوسری سلطنت کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتی ہے، دو سلطنتون مین جنگ ہوتی ہے ایک حکومت کی فوج دوسرے کی فوج پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسکو درہم برہم کر دیتی ہے یا ایسی ذلیل صلح پر مجبور کرتی ہے جو اُسکی آزادی سلب کرنیوالی ہوتی ہے۔ اسی کا نام صحیح معنون مین فتح ہے۔ اب چونکہ ہم کہتے ہین کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح کیا تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ ان دونون ملکون کے درمیان اس قسم کا کوی واقعہ ہوا۔ سکندر اعظم نے جب مملکت فارس کو فتح کیا تو حکومت مقدونیہ اور حکومت فارس کے درمیان جنگ ہوی تھی جسکا نتیجہ فارس کی شکست مین ظاہر ہوا۔ جب سیزر نے گال (Gaul) فتح کیا تو وہ جمہوریت روم کی طرف سے ایک عہدہ پر ممتاز تھا۔ وہان کی سنیٹ نے اسکو سلطنت رومہ کی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ لیکن ہندوستان مین اس قسم کا کوئی واقعہ نہین ہوا۔ شاہ انگلینڈ نے نہ تو مغل بادشاہ سے اور نہ کسی راجہ یا نواب ہی سے اعلان جنگ کیا۔ سلطنت انگلینڈ کو ہندوستان کی فتح سے کبھی کوئی تعلق نہ ہوتا اگر اول الذکر کو فرانسیسون سے پانچ مرتبہ جنگ کی نوبت نہ پڑی ہوتی۔ جب فرانسیسی قبضہ ہندوستان مین اچھی طرح جم گیا تو انگریزون کو اُنسے لڑنے کی ضرورت لاحق ہوی۔ اور چونکہ انکی بعض لڑائیان ہندوستان مین ہوئین اسلئے قدرتاً ایک حد تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیسی ریاستون سے بھی انکا تعلق ہو گیا۔ اگر ہم اس واقعہ کی ماہیت کو واضح طور پر سمجھنا چاہتے ہین تو چاہئے کہ صورت حالات کو جو بالکل اتفاقی تھی نظرانداز کر کے غور کرین۔ اُسوقت ہم دیکھینگے کہ ہندوستان مین درحقیقت کوئی ایسی بات نہین ہوئی جسکو فتح سے تعبیر کیا جا سکے حقیقت یون ہے کہ چند سوداگر ہندوستان کے ساحلی شہرون مین آباد ہو گئے۔ جب سلطنت مغلیہ کو زوال شروع ہوا اور بدامنی رونما ہوی تو انھون نے مجبوراً اپنی فوجی تنظیم کی اور کچھ فوج بھی ملازم رکھ لی۔ ان فوجون کی مدد سے انھون نے رفتہ رفتہ سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا حسن اتفاق سے یہ سوداگر انگریز تھے جنکی ملازمت مین کچھ انگریزی سپاہ بھی تھی۔

اب اسکو غیر ملکی "فتح" نہین کہہ سکتے البتہ اندرونی انقلاب کہہ سکتے ہین۔ کسی ملک مین جب حکومت کو زوال ہوتا ہے اور بدامنی کا دارودورہ شروع ہو جاتا ہے تو عام قاعدہ یہی ہو کہ ملک کی باقی ماندہ منظم قوتون مین زور آزمائی شروع ہو جاتی ہے اور جو سب سے زیادہ زبردست ثابت ہوتی ہے وہ اپنی حکومت قائم کر لینے مین کامیاب ہو جاتی ہے۔ مثلاً فرانس مین جب مجلس باربن (Bourbon) کو

زوال ہوا تو پیرس کی میونسپلٹی نے جو برسرِ اقتدار تھی سلطنت کی عنان اپنے ہاتھ مین لے لی۔ اور پھر تھوڑے ہی دنون بعد جب اُسکو زوال ہوا تو بوناپارٹ نے اپنی فوجی حکومت قائم کرلی۔ ہندوستان بھی ۱۷۵۰ء مین سلطنت مغلیہ کے انحطاط کیوجہ سے بدامنی مین مبتلا تھا۔ یہ انحطاط ۱۷۰۷ء مین اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے شروع ہوا۔ ہر جگہ چھوٹے چھوٹے صاحب اثر سردارون نے منظم ہوکر برسرِ اقتدار ہونا چاہا۔ یہ طاقتین عام طور سے جیسا کہ ہندوستان کا دستور تھا، کرایہ کے سپاہیون پر مشتمل تھین جو یا تو کسی مغلیہ صوبہ کے گورنر کی ماتحتی مین ہوتین یا کسی صاحب اختیار اور دلیر لیڈر کی سرکردگی مین یا کسی مقامی قوت کی زیرِ قیادت جو مغلون کے استیلاء سے قبل موجود تھی اور جسنے کبھی پوری طرح انکی سیادت کو تسلیم نہین کیا مین ہر قوت کی ایک ایک مثال دونگا، مثلاً حیدرآباد کی ریاست، اسکو نظام نے قائم کیا جو شاہان مغلیہ کا ایک صوبہ دار تھا۔ ریاست میسور، اسکی بنا حیدر علی نے ڈالی جو ایک بہادر مسلمان سپاہی تھا۔ مرہٹون کی طاقت کا بانی پیشوا تھا، یہ ایک برہمنی طاقت تھی اور قدیم ہندوستان کی حالت کو پیش کرتی تھی۔ لیکن یہ سب کی سب طاقتین کرایہ کے سپاہیون پر بھروسہ کرتی تھین، ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتین لوٹ وغارتگری کرتی پھرتین۔ شاید یورپ نے کبھی یہ صورت نہین دیکھی۔ البتہ کارولنگین امپائر (Caro-lingian Empire -) کی شکست کے موقع پر ایسی ابتری رونما ہوگئی تھی۔

نئی طاقتون کے عروج کے لئے یہ صورت حالات البتہ خاص طور سے معاون تھی۔ دوسری صورتون مین فتح کیلئے ضروری ہے جیسا کہ مین نے کہا ہے، کہ ایک زبردست قوت اپنے ہاتھ مین ہو۔ کوئی شخص تاوقتیکہ اسکے پاس منظم حکومت اور فوج نہ ہو فتح کا منصوبہ نہین کرسکتا۔ لیکن چونکہ یہان حالات مختلف تھے لہذا اُنکے اسباب بھی مختلف ہوگئے۔ حیدر علی کے پاس سوائے اُسکے دل و دماغ اور قوت بازو کے کچھ نہ تھا مگر وہ سلطان میسور ہوگیا۔ کرایہ کے سپاہی ہر جگہ تھے اور جو شخص انکا منہ روپیون سے بھر دیتا یا اپنے رعب طاقت سے اپنا طرفدار کرلیتا وہ انکی ملازمت مین آجاتے۔ اور جس کسی کے پاس ایسی فوج ہوتی وہ ہندوستان کے زبردست سے زبردست صاحبِ اختیار کا ہمسر بن جاتا کیونکہ حکومت کی شکست کے وقت صرف فوجی قوت ہی ایک قوت باقی رہ جاتی ہے۔

اب ان مختلف مقامی طاقتون مین اگر کوئی طاقت تھی جو ایسے مخصوص حالات مین سلطنت قائم کرنے مین کامیاب ہوسکتی تھی تو وہ ان سوداگرون کی تھی جنکی ساحلی شہرون مین کوٹھیان تھین۔ بلاشبہہ وہ غیر ملکی تھے، لیکن، جیسا کہ مین نے بیان کیا ہے، غیر ملکی ہونا ہندوستان مین کوئی مضائقہ نہین تھا۔ ہندوستان کی بیشتر سلطنتین غیر ملکی تھین شاہان مغلیہ خود غیر ملکی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس حیرت انگیز خوش نصیبی کی بڑی توصیف کیجاتی ہے۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی خوش نصیبی کی گذشتہ مثال نہین ملتی اور اسی وجہ سے اسکے امکان کے متعلق پیشین گوئی کا کسی کو خیال نہین ہوسکتا تھا۔ لیکن چونکہ اسکی توجیہ دشوار نہین ہے اور اسکے اسباب بالکل ظاہر ہین اسلئے اسکو معجزہ نہین کہہ سکتے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس واقعی کچھ سرمایہ تھا، اسکے قبضہ مین دولت تھی، سمندر تھا، اُسکے پاس دو تین قلعے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک کمپنی تھی جسکے لڑائی مین مارے جانے یا کسی بیماری سے مرنے کا مطلق اندیشہ نہین تھا۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک معمولی حیثیت کا شخص اٹھتا ہے اور بڑی بھاری سلطنت کا مالک بن جاتا ہے لیکن ہمکو تعجب نہین ہوتا کیون، اسلئے کہ اکثر ایسا ہوا کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اُس سے زیادہ قابل تعجب ہے۔ کارسیکا (Corsica) کا ایک غریب نواب تھا اُسکے چھوٹے لڑکے نے صرف استبدادی قوت کی مدد سے یورپ کے غالب حصے کو

اپنے قابو مین رکھا۔ کیا یہ واقعہ ایسٹ انڈ کمپنی کے ہندوستان فتح کرنے سے زیادہ حیرت خیز نہین ہے؟ بونا پارٹ تے بغیر کسی رفیق اور بغیر ایک پیسہ کے سلطنت قائم کر لی۔ لیکن ۲۰ سال سے کم کی مدت مین اسکو کھو بھی دیا۔ اسی طرح حیدر علی سندھیا یا ہلکر کا عروج زیادہ تعجب خیز تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے زیادہ انکو اپنے عروج کیلئے قسمت کا مرہون منت ہونا پڑا۔ مین چاہتا ہون کہ تم اس واقعہ کو بالکل الگ ایک مخصوص حیثیت سے دیکھو۔ یہ ایک ریاست کی دوسری ریاست پر فتح نہین تھی۔ اسمین دو ملکوں مین کم از کم براہ راست متعلق نہین تھین اور نہ ہی اس کا رشتہ کسی غیر ملکی کے ہاتھ مین تھا۔ یہ ہندوستان کی سوسائٹی مین ایک اندرونی انقلاب تھا اور اسکو اُن ناگہانی حکمت عملیون یا تغلب و تصرف سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کسی جماعت کی اندرونی بے چینی کو ختم کر دے۔ آؤ ایک لمحہ کے لئے ہم فرض کر لین کہ سوداگر جو صاحب اثر و نفوذ بن بیٹھے اجنبی نہین تھے۔ اس سے واقعہ کی نوعیت مین کوی فرق نہین آئیگا۔ فرض کرلو کہ بمبئی مین کچھ پارسی سوداگر تھے جب انھون نے اپنی تجارت کو بدامنی سے نقصان پہونچتے دیکھا تو یک جہت ہو کر کچھ قلعے بنا لئے اور فوجین بھی فراہم کر لین اور بعد ازان خوش قسمتی سے انھون نے اچھے اچھے جنرل بھی مقرر کر لئے۔ اس صورت مین اُنکے ساتھ بھی رہی بکسر اور پلاسی کا معاملہ پیش آتا اور وہ بھی شاہان مغلیہ سے کسی صوبہ کی دیوانی حاصل کرنے مین کامیاب ہو جاتے جو اُنکی سلطنت کی بنیاد ہوتی اور ایک وقت مین سارے ہندوستان پر پھیل جاتی۔ لہذا اس صورت مین بھی واقعہ مادی طور سے وہی ہوتا لیکن اُسوقت وہ اپنی اصلی روشنی مین دکھائی دیتا اور ہم اسکو اندرونی انقلاب سے تعبیر کرتے کیونکہ عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک جماعت اپنے وجود کو معرض خطر مین دیکھکر بدامنی فرو کرنیکی کوشش کرتی ہے۔

اگر ایسا ہوا ہوتا تو کوئی تعجب نہ ہوتا۔ پھر اس لحاظ سے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج بہت ہی کم قابل تعجب ہونا چاہئے کیونکہ کمپنی مذکور کا قریبی تعلق یورپ سے تھا جہان سے وہ بوقت ضرورت فوجی امداد طلب کر سکتی تھی جو ظاہر تھا کہ ہندوستانی فوج سے زیادہ لائق اور قواعد دان تھی۔ ڈوپلے نے جسنے ہندوستان کی فتح کا ایسا صاف اصول دریافت کیا محسوس کر لیا کہ ہندوستانی فوج یورپین فوج کے سامنے ایک لمحہ نہین ٹھہر سکتی لیکن اُسنے یہ بھی اندازہ کر لیا کہ ہندوستانیون مین یورپین ڈسپلن قبول کرنے اور یورپین قابلیت کیساتھ جنگ کرنیکی پوری استعداد موجود ہے بشرطیکہ انکو تعلیم دی جائے۔ یہ تھی وہ کنجی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ مین تھی جسکی بدولت اُسنے ہندوستان کی مختلف طاقتون مین نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھا بلکہ ان پر غلبہ بھی حاصل کیا۔ یہ غلبہ کسی ناقابل انتقال جسمانی یا اخلاقی برتری کے سبب نہین تھا، جیسا کہ ہم خیال کرتے ہین، بلکہ فوجی تنظیم و تربیت کے سبب سے تھا اور یہ باتین ہندوستانیون مین بھی پیدا کی جا سکتی تھین۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے ایک بڑی سہولت اور بھی تھی۔ یہ تو یقینی ہے کہ وہ سلطنت انگلیشیہ کی نمائندہ نہین تھی، لیکن انگلینڈ کے ساتھ اسکا تعلق اُسکے حق مین بہت کار آمد تھا بیشک روپیہ اور آدمیون کی فراہمی جنکی بدولت ہندوستان فتح ہوا، خاص کمپنی کے ذمہ تھی۔ لیکن چونکہ شاہی فرمان کی رو سے وہ ہندوستان اور چین کی تجارت کی واحد اجارہ دار تھی اسلئے سلطنت انگلشیہ اور پارلیمنٹ کو اس کیساتھ دلچسپی کا ہونا قدرتی تھا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ انگریزی قوم نے ان معرکہ آرائیون کو انگلینڈ اور فرانس کی باہمی جنگ کی حیثیت سے دیکھا اور بڑی خوشی سے ان مین امداد بھی کی۔ یہ واقعہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن اکثر اس پر کافی غور نہین کیا جاتا ہندوستان مین انگریزی فتح کی ابتدا کمپنی اور کسی دیسی طاقت کی باہمی آویزش سے نہین ہوی بلکہ فرانسیسیون کی اُس خوفناک کوشش سے جو دکن پر

غلبہ حاصل کرنے کیلئے کی گئی۔ اُنھون نے حیدرآباد کی جانشینی کے معاملہ مین دخل انداز ہوکر کوشش کی کہ بمبئی اور مدراس سے انگریزونکا قدم اکھاڑ دین۔ مشرق مین ہماری پہلی پیش قدمی فرانسیسی حملہ کی مدافعت مین تھی۔ اس وقت سے ستر سال تک یعنی جب نپولین سے ہماری لڑائیان ختم ہوگئین، ہندوستان مین ہماری لڑائیان کم وبیش فرانسیسیون سے مدافعت کی شکل مین ہوتی رہین۔ اگرچہ یہ جنگین سلطنت انگلشیہ کے نام یا بوتے پر نہین ہوئین لیکن انجام کار انکی شکل ایک حد تک قومی جنگون کی ہوگئی۔ اور ان سے انگلینڈ کو نہایت گہری دلچسپی تھی۔ اسی لئے کمپنی کی فوج کو بڑی حد تک شاہی فوج سے مدد دی جاتی تھی اور ۱۷۸۵ء سے جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوکر ایک لائق مدبر کی حیثیت سے سیاسی اور فوجی معاملات کی نگہداشت کے لئے بھیجا گیا تو پارلیمنٹ مین کمپنی پر حملے، لارڈ کلایو کے خلاف تحریک ملامت، ہسٹنگز کے خلاف تعزیری کارروائی، کمپنی کے معاملات سلجھانے کیلئے پے بہ پے کوششین جن سے ایک مرتبہ ۱۷۸۳ء مین انگلینڈ کی سیاسی دنیا مین ہلچل ہی مچ گئی تھی، اور اسی طرح کی دیگر کارروائیون نے ہماری ہندوستانی معرکہ آرائیون کو قومی جنگ کی شکل دیدی۔ ان انھین وجوہ سے کمپنی کو بمنزلہ انگریزی قوم کے سمجھا جانے لگا۔ اس طریقہ سے کمپنی کو عملی طور پر یورپ کی ایک اول درجہ کی سلطنت کے اعتماد وشہرت سے تقویت پہونچ رہی تھی اگرچہ اس سلطنت نے کمپنی کی امداد ان لڑائیون مین قطعی نہین کی جنکی بدولت ہندوستان فتح ہوا۔

مہتم بالشان تاریخی واقعات کے لئے اکثر "حیرت انگیز" یا "عجیب"، کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جس آزادی کیساتھ انکا استعمال ہماری فتح ہندوستان کیلئے کیا جاتا ہے اُس آزادی کیساتھ کسی دوسرے واقعہ کیلئے نہین۔ ایک واقعہ حیرت انگیز یا عجیب ہو سکتا ہے لیکن یہ بالکل ضروری نہین ہے کہ اُسکی توجیہہ بھی دشوار ہو۔ ہندوستان کی فتح اس معنی مین البتہ نہایت حیرت انگیز ہے کہ اسکی نظیر گذشتہ زمانہ مین نہین ملتی، اسلئے اسکی توقع اُن لوگون کو نہین تھی جنھون نے ڈیڑھ صدی تک ہندوستان مین کمپنی کے معاملات کا انصرام کیا۔ بلاشبہ Pitt یا josia child, job charnock گورنر مدراس کو (جو لارڈ چیتھم کا دادا تھا) کبھی خواب مین بھی خیال نہ ہوا ہوگا کہ ایک دن ہم پیشوا اور خود مغل شہنشاہ کے اختیارات کو سلب کرلینگے۔ لیکن یہ واقعہ اس معنی مین بالکل حیرت انگیز نہین ہے کہ اسکے حقیقی اسباب کا دریافت کرنا مشکل ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جب ہندوستان مین کوئی صاحب اختیار مرکزی حیثیت کا باقی نہین رہ گیا تھا جسکا جی چاہتا صاحب اختیار بن جاتا، جو چاہتا اپنی حکومت قائم کر بیٹھتا، اگر اسوقت ایک تجارتی کمپنی نے جسکے پاس کرایہ کی فوج رکھنے کیلئے کافی روپیہ تھا ان سورماؤن کا مقابلہ کیا اور اُنکو مغلوب کیا تو کون سا تعجب کا مقام ہے خصوصًا اس صورت مین کہ اُسکے پاس یورپین باقاعدہ فوج اور سپہ سالار تھے، اسکی پشت پر انگلینڈ کی ساری قوت تھی اور اُسکے مشیر انگریز مدبر تھے۔

مین نے جو کچھ بیان کیا اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کی فتح عام معنی مین فتح نہین تھی۔ اسلئے کہ یہ کسی سلطنت کا فعل نہین تھا، اسکو کسی سلطنت کی فوج یا روپیہ نے نہین حاصل کیا۔ مین نے یہ بات اس لئے ظاہر کردی ہے تاکہ اس بیان سے کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح کیا جو الجھن پیدا ہو وہ رفع ہوجائے۔ ہندوستان انگلینڈ سے ہزارون میل دور ہے، اسکی آبادی یورپ کے برابر ہے پھر بھی یہ فتح اس صورت مین ہوئی کہ انگلینڈ کوئی فوجی سلطنت نہین تھی اور نہ اس عظیم الشان فتح مین اُسنے کوئی تکلیف اور محنت برداشت کی نہ ایک پیسہ خرچ کیا۔ اس لئے اس کے معنے یہی ہو سکے کہ انگلینڈ نے ہندوستان کو فتح کیا ہی نہین،

بلکہ یہ چند انگریزون کی خوش نصیبی تھی جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت حسن اتفاق سے ہندوستان مین سکونت پذیر تھے اور حیدر علی یا رنجیت سنگھ کی طرح عالی اقتدار ہو گئے۔

تاہم عملی نتیجہ کے لحاظ سے یہ واقعہ ہندوستان پر انگلینڈ کی فتح ہی ثابت ہوا۔ اسلئے کہ اب جب یہ تمام عمل مکمل ہو چکا ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی غائب ہو چکی ہے ہم دیکھتے ہین کہ ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند ہین اور ایک سکریٹری جو انگریزی کابینہ کا ممبر ہے اور انگریزی پارلیمنٹ مین بیٹھتا ہے ہندوستان کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہے انگلینڈ نے بحیثیت ایک سلطنت کے ہندوستان کو حاصل نہین کیا پھر بھی اب یہ اُسکے سر پڑ گیا ہے۔ یہ ایک مثال تھی اُس عام اصول توسیع کی جو اہل یورپ کے ان تمام بیرونی مقبوضات مین کارفرما ہے جو کولمبس کے زمانہ سے برابر حاصل ہوتے رہے ہین اہل یورپ کتنے ہی دور دراز ممالک مین گھومتے، اُنکی کامیابی کتنی ہی حیرت انگیز اور عجیب ہوتی لیکن وہ کبھی یورپین شہریت کو ترک نہین کر سکتے تھے۔ کارٹیز (Cortez) اور پزارو (Pizarro) نے امریکہ کی ایک ایک ریاست کو اپنے قدمون سے روند ڈالا، جہان گئے بغیر سعی و محنت کے عالی اقتدار بن گئے، اگرچہ میکسکو مین وہ مونٹیزوما (Montezuma) کی حکومت کو ذرہ برابر خاطر مین نہین لاے، لیکن چارلس پنجم کی سیادت سے سرتابی کرنا تو کجا اسکا خیال تک کرنیکی جرأت نہ کر سکے۔ حالانکہ چارلس پنجم بحر لاٹنک کے اُس پار تھا، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو فتوحات وہ اپنی ذاتی شجاعت سے بلا امداد غیرے حاصل کرتے اسپین قدرتی طور پر انھین ضبط کر لیتا یہی حال انگریزون کا ہندوستان مین ہوا۔ ۱۷۶۵ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی سلطنت مغلیہ مین ایک نام نہاد علی عہدہ پر فائز تھی۔ لیکن انگریزی پارلیمنٹ دعویدار تھی کہ جو مقبوضات کمپنی حاصل کریگی وہ پارلیمنٹ کے ماتحت ہونگے۔ پارلیمنٹ کی بحثون مین مغل بادشاہون کا نام شاید ہی آتا تھا اور غالباً یہ سوال کبھی زیر بحث نہین آیا کہ آیا وہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبون کا انتظام ایک غیر ملکی حکومت کے ہاتھ مین دینا پسند کریگی۔ کمپنی بہ یک ساعت دو سلطنتون کا جز و تھی، ایک طرف تو شاہ انگلستان کے فرمان کی رو سے وہ کمپنی تھی اور دوسری طرف مغل بادشاہ کی ماتحت ایک دیوان۔ لیکن جس طرح کارٹیز نے مونٹزوما کو نیست و نابود کر دیا اُسی طرح کمپنی مذکور نے مغل شہنشاہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا، اور پھر چپ چاپ اپنے غیر محدود مقبوضات کو انگلینڈ کے سپرد کر دیا انجام کار جنگ پلاسی کے ایک صدی بعد کمپنی شکست ہو گئی اور خود بھی ہندوستان سے سلطنت انگلشیہ کے حق مین دست بردار ہو گئی۔

(باقی)

عبد القیوم رسا

شہاب کی سرگزشت

جناب نیاز فتحپوری کا وہ معرکۃ الآرا افسانہ جو سیرۃ نگاری، نفسیاتی تحلیل، بلندی خیال، زور تحریر، ندرت بیان، نزاکت تخیل اور قوت انشاء کے لحاظ سے ادب اردو مین ایک بالکل نئی اور نادر چیز ہے، پہلی بار اسکا مطالعہ انسان کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے، دوسری بار اسکا مطالعہ حقیقت سے قریب کر دیتا ہے اور تیسری مرتبہ کے مطالعہ کے بعد انسان اسکے لذات مین بالکل غرق ہو جاتا ہے۔ اگر پسند نہ ہو تو مطالعہ کے بعد واپس کر دیجئے اور اپنی قیمت لیجئے۔ معہ محصول ڈاک (۱۲؍) مین ملیگا۔

"مینجر نگار" لکھنؤ

انارکسٹ

"اور یہ"، ماہر جراثیم نے شیشہ کے ملے ہوئے ٹکڑوں کو خردبین کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ مشہور و معروف مرض، ہیضہ کے زہریلے جراثیم ہیں، آپ سمجھے —— کالرا کے جراثیم!!"

اجنبی خردبین میں بغور دیکھنے لگا، وہ یقیناً اس وضع کی باتوں کا عادی نہیں معلوم ہوتا تھا اسلئے کہ اُسنے بالکل گنوار کی طرح دوسری آنکھ کو اپنے ہاتھ سے ڈھک لیا اور کہنے لگا —— "کچھ یونہی سا دکھائی دے رہا ہے"

"اس پیچ کو گھماؤ"، ماہر جراثیم نے کہا "غالباً خردبین تمہارے لئے صحیح فوکس پر نہیں ہے، نگاہ میں بھی اختلاف ہوتا ہے، بس —— ہاں ...... ایک خفیف سی گردش، ادھر یا اُدھر —— اب تو صاف نظر آتا ہے؟"

"ہاں بیشک، اب صاف ہے"، اجنبی نے کہا "کچھ زیادہ چیزیں نہیں ہیں، پانچ سات چھوٹے چھوٹے گلابی اور نیلے دھاگے کے سے ٹکڑے، پناہ بخدا! اور یہی حقیر ٹکڑے، یہی بے وجود ذرات مجتمع ہو کر ایک مکمل شہر کو برباد کرتے ہیں —— کسقدر حیرت انگیز بات ہے!!"

وہ کھڑا ہو گیا اور شیشہ کے ٹکڑے کو خردبین کے نیچے سے نکالکر اپنے ہاتھ کو کھڑکی کی روشنی میں بڑھا دیا۔

"کچھ نظر نہیں آتا"، اُسنے شیشہ کو بغور دیکھتے ہوئے ذرا تامل سے کہا "کیا یہ زندہ ہیں اور اب بھی خطرناک ہیں؟"

"جی نہیں، انھیں تجربہ کیلئے ہلاک کر دیا گیا ہے۔ خدا کرے ہم اسی طرح دُنیا کے تمام جراثیم کو ہلاک کر سکتے!"

"میرے خیال میں تو شاید آپ اپنے گھر میں ایسی چیزیں زندہ اور اصلی حالت میں بھی رکھنے کے عادی ہونگے اور مطلق خوف نہ کرتے ہونگے"، اجنبی نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔

"بلکہ یوں کہئے کہ ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں، مثلاً یہاں"، وہ ایک الماری کی طرف بڑھا اور سر بمہر نلکیوں کی ایک قطار میں سے ایک نلکی اُٹھا کر کہنے لگا،

"یہ زندہ چیز موجود ہے، مرض کالرا کے اصلی زندہ اور متحرک جراثیم! —— یعنی سربند خطرناک مرض ہیضہ! کیا سمجھے؟"

"جی! ہیضہ!!"، اجنبی نے جسم میں ایک کپکپی محسوس کرتے ہوئے نلکی کو دیکھ کر کہا "خدا کی پناہ، پروفیسر صاحب آپ نہایت خطرناک ہیں!!"

ماہر جراثیم نے نو وارد کے چہرہ کے تغیرات کو غور سے مطالعہ کیا، یہ شخص اُسکے ایک نہایت ہی گہرے دوست کا تعارفی رقعہ لیکر تجربہ گاہ دیکھنے کی غرض سے آیا تھا۔ اُسکی پھٹی پھٹی آنکھیں، سیاہ اور بے ترتیب بال، گھبرائی ہوئی صورت، پریشان انداز، خود ساختہ حیرت، بناوٹی خوف —— یہ وہ تمام باتیں تھیں جنکو ماہر جراثیم شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اُسکے دوست نے اجنبی کو سائنس کا محض مبتدی طالبعلم ظاہر کیا تھا۔ جس خوفناک موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی اُسکے لحاظ سے ہر اجنبی غیر معمولی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر اجنبی کی

حیرت سے ایک قسم کا اطمینان ظاہر ہو رہا تھا اور یہی بات مشتبہ تھی۔

یکایک ماہر جراثیم نے نلکی کو اپنی نگاہون کے سامنے کرتے ہوئے کہا "بیشک! انسانی تباہی اور بربادی اس نلکی مین بند ہے۔ اس چھوٹی سی نلکی کو صرف شہر کے مرکزی آبیار مین توڑ دیجئے اور ان حقیر، غیر محسوس، زندہ جراثیم سے جو آلۂ خوردبین کی پوری قوت سے محض ذرات نظر آتے ہین، اور جنھین نہ شامہ محسوس کرتا ہے نہ ذائقہ اتنا کہدیجئے —— "جاؤ، بڑھو، پھیلو، اور ہر پانی پر اپنی حکومت قائم کرلو" —— آپ دیکھینگے کہ موت، پُر اسرار، نامعلوم موت!! نامحسوس، بلائے بے درمان موت!! خونخوار کرب افزا موت!! تمام شہر پر مسلط ہو جائیگی، اور ہر ممکن نا ممکن گوشہ تک اُسکی رسائی ہو جائیگی۔ کہین وہ خاوند کو بیوی سے اور بچہ کو مان سے جُدا کر دیگی، کہین مدبر کو اُسکے فرض سے اور مزدور کو اُسکے مصائب سے چھڑا دیگی۔ وہ پانی کے نالون سے گذریگی، سڑکون پر چھاپے ماریگی، گھرون مین بے تکان گھُس جائیگی اور ہر اُس شخص کی زندگی اُسکا ٹیکس ادا کریگی جو اُبلا ہوا پانی پینے کا عادی نہین ہے۔ وہ کنوؤن مین پہونچ جائیگی، ترکاریون مین سرایت کر جائیگی، اور برف مین منجمد ہو جائیگی

وہ مویشیون کے حوضون مین، پارک کے چشمون مین، جابجا صرف جاندارون کے حلق تک پہونچنے کا انتظار کرتی ہوگی۔ یا زمین مین جذب ہو کر صدہا ایسے چشمون اور کنوؤن مین نمودار ہو جائیگی، جہان اسکی موجودگی کا کسی طرح قیاس بھی نہین کیا جا سکتا —— غرض صرف ایک مرتبہ اُسے شہر کے آبیار تک پہونچا دیجئے، پھر قبل اسکے کہ دوبارہ اُسے گرفتار کیا جا سکے وہ اس دُنیا کے سب سے بڑے شہر کو آبادی سے بے نیاز کر دیگی"

وہ یکایک رُک گیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی کہنے لگا "لیکن یہان یہ بالکل مقید ہے، قطعاً بے بس، عضو معطل، آپ سمجھے —— ہم بالکل محفوظ ہین"، اجنبی نے سر کی جنبش سے اقرار کیا، اُسکی آنکھون مین ایک قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ لیکن صرف کھانس کر رہ گیا۔

"یہ انارکسٹ، بدمعاش —— بالکل بیوقوف ہین، قطعاً اندھے ہین جو اس قسم کی چیزین موجود ہونیکے باوجود بم استعمال کرتے ہین میرے خیال مین تو ...."

زنجیر چھوٹنے کی ایک ہلکی سی جھنکار، اور دروازہ کھُلنے کی ایک خفیف سی آواز کمرے کے مشرقی گوشہ مین پیدا ہوئی، ماہر جراثیم نے پلٹ کر دیکھا۔ "صرف ایک منٹ کیلئے ہو جاؤ!" اسکی نوعمر بیوی نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

جب وہ دوبارہ اپنی تجربہ گاہ مین داخل ہوا تو اجنبی اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا، مجھے مطلق خیال نہ رہا اور مینے آپکا ایک گھنٹہ ضائع کر دیا۔ چار بجنے مین صرف بارہ منٹ باقی ہین۔ مجھے ساڑھے تین بجے روانہ ہو جانا چاہئے تھا، لیکن آپکے دلچسپ لیکچر مین محو ہو گیا، اب اجازت دیجئے، وقت مین بالکل گنجائش نہین ہے، مجھے چار بجے ایک دوست سے ملنا ضروری ہے"

اجنبی شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے گذر گیا، ماہر جراثیم دروازہ تک اُسے پہونچا کر خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے مین واپس آگیا، وہ اپنے ذہن مین نووارد کی ظاہری شکل و شباہت پر تبصرہ کر رہا تھا۔

«عجیب آدمی تھا» اُسنے زیر لب کہا «یقیناً خطرناک! وہ زہریلے جراثیم کا بیان کتنی دلچسپی سے سُن رہا تھا اور شیشی کو کیسی للچائی ہوئی نگاہون سے دیکھ رہا تھا» کسی بیچین خیال کے ماتحت وہ یکایک اُٹھا۔ دود کش کے پاس بنچ پر جھک کر کچھ دیکھا، تیزی سے جھپٹ کر اپنی میز پر کچھ ڈھونڈا، جیبون مین ہاتھ ڈال کچھ ٹٹولا اور بھاگ کر دروازہ پر آگیا۔

«غالباً مینے اُسے بڑے کمرے کی میز پر رکھ دیا ہے» اُسنے ذرا اونچی آواز سے کہا «منی!» ——— «جی!» کہین دور سے ایک زنانی آواز آئی۔

«مین ابھی جب تمسے بات کرنے آیا تھا، تمنے میرے ہاتھ مین کوئی چیز تو نہین دیکھی؟ سچ بتا دو پیاری منی! جلدی بتا دو!!»

«کچھ نہین، پیارے جان! خیریت تو ہے؟»

«تباہی! بربادی!!» ماہر جراثیم نے کہا اور بدحواسی کے ساتھ دروازہ کی طرف دوڑا، ایک لمحہ بعد وہ شارع عام پر تھا۔ منی نے دروازہ کھُلنے کی آواز سُنی اور کسی نامعلوم خطرے کے خیال سے بھاگ کر کھڑکی مین سے جھانکنے لگی۔ سڑک پر ایک نحیف الجثہ، بدوضع سا آدمی ایک کرایہ کی گاڑی مین سوار ہو رہا تھا۔ اُسکا خاوند ننگے سر، سلیپر پہنے ہوئے مجمع کو چیرتا ہوا بدحواسی سے گاڑی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ ایک سلیپر اُسکے پیر سے نکل کر سڑک پر رہ گئی تھی مگر اُسے مطلق پرواہ نہ تھی۔

«خداوندا! یہ دیوانہ تو نہین ہو گیا ہے، سائنس نے اُسکا دماغ تو خراب نہین کر دیا ہے» منی دل ہی دلمین کہہ رہی تھی۔

وہ کھڑکی کھول کر اُسے پکارنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اجنبی نے اپنے چارون طرف نگاہ ڈالی، اور بالکل اُسی قسم کی دماغی خرابی کا اثر اُسکی صورت سے ظاہر ہوتے لگا جسمین اُسکا خاوند مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ اُسنے ایک لایعنی سا اشارہ ماہر جراثیم کی طرف کیا اور گاڑی والے کے کان مین کچھ کہا۔ گاڑی کا دروازہ بند ہوا چابک مارنے کی مسلسل آواز سُنائی دی، گھوڑے کی ٹاپ سڑک پر گونجی اور ایک لمحہ بھر مین گاڑی آگے آگے اور ماہر جراثیم دیوانون کی طرح ننگے سر ننگے پاؤن پیچھے پیچھے دوڑتے ہوئے سڑک پر دکھائی دئیے اور موڑ پر پہونچکر دونون نگاہ سے غائب ہو گئے ———

منی تقریباً ایک منٹ تک کھڑکی سے جھانکتی رہی اور پھر کمرے مین واپس آگئی وہ بیحد متحیر تھی۔

«جان حد سے زیادہ مذاق پسند ہے!» اُسنے دل ہی دلمین سوچا «مگر اس زمانہ مین، دن دہاڑے ایک شریف آدمی کا ننگے سر ننگے پاؤن لندن کی شارع عام پر دوڑ لگانا! کتنی شرمناک حرکت ہے!؟»

ایک وحشی خیال اُسکے دماغ سے گذرا! اُسنے تیزی سے اپنی ٹوپی اوڑھی، خاوند کے جوتے لئے، ہال مین آئی اور کھونٹیون پر سے اُسکا ہیٹ اور کوٹ اُتارا۔ دروازہ پر پہونچی اور ایک گاڑی کو جو خالی سڑک پر سے گذر رہی تھی کرایہ کر لیا۔

«سیدھے سامنے والے راستہ پر چلو وہان سے ہیولاک کریسنٹ پر موڑ لو اور راستہ مین ایسے شخص پر نگاہ رکھو جو ہاف کوٹ پہنے ہوئے ننگے سر ننگے پیر بھاگ رہا ہو!»

«ہاف کوٹ پہنے ہوئے ننگے سر ننگے پیر؟ ـ بہتر ہے، معزز خاتون! ابھی لو» یہ کہکر کوچبان نے گھوڑے کو چابک لگایا اور کچھ اس اطمینان سے گاڑی بڑھائی گویا تمام زندگی اسی پتہ پر گاڑی ہانکنے مین بسر ہوئی ہے۔ چند منٹ بعد تانگہ والون اور آوارہ لوگون کے ایک مجمع نے جو ہیورسٹاک ہل کے

اڈے پر جمع رہتے ہین بڑے تعجب سے ایک گاڑی کو گذرتے دیکھا جسکی طوفانی رفتار میونسپلٹی کے قانون سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی
جب تک گاڑی گذری سب خاموش رہے، اُسکے بعد ایک بیفکرے نے کہا "ابے یار دیکھا تمنے ہکو کو، کس شان سے ہانک رہا تھا"
"ترا تر چابک مار رہا ہے مرا یار، .... وہ مڑ گیا!" دوسرے نے کہا "اور لو، ایک اور پاگل آرہا ہے! ــــ یہ اُس سے بھی تیز ہے" تیسرے نے کہا ارــــ! "یہ تو چچا جان سچ ہیں، تو نے ٹھیک کہا یار، یہ ضرور کسی کو پاگل خانہ لئے جارہا ہے!" چوتھے نے کہا۔
"میرے خیال مین تو یہ ہکو کا پیچھا کر رہا ہے" پہلے نے کہا
یہ خیال آتے ہی اڈے کے تمام تانگے والے بے ترتیبی سے چلانے لگے:۔
"سرپٹ چھوڑ دے ہکو" ــــ "بھاگ چچا، بھاگ!!" "گردن پہ مار گردن پہ!!" ــــ "آج اسی دوڑ پہ فیصلہ ہے!" ــــ "پکڑے رہ گیا ہے تھوڑی سی دور!!"
"یہ لو، اور آمد!!" ایک نے پیچھے مڑکر کہا
"سمجھ مین نہین آتا یار، آج کیا ہیمسٹیڈ مین سارے گاڑی والے پاگل ہو گئے ہین یا انکی کوئی شرط ہوئی ہے؟" دوسرا بولا
"ابکی دفعہ سبزے والے کی باری ہے" تیسرا بولا
"اسمین تو کوئی عورت ہے! ــــ ہان ہم سمجھ گئے اگلا آدمی بہت خوش قسمت ہے اور اسکے ہاتھ مین یہ کیا ہے یار؟" پانچوان بولا
بھگوڑے عاشق کی ٹوپی!" پہلے نے جواب دیا
"کتنی شوخ تیزی ہے!! ــــ چچا جان سچ سچ تو ٹھیک ایک اور تین کی نسبت ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا ــــ ہا ہا ہا!!"
منی جسوقت اس مجمع کے پاس سے گذری تو متفقہ طور پر اُسکے گھوڑے کو سراہا گیا اور عام طور پر تالیان بجائی گئین۔ اُسے بہت ناگوار گذرا لیکن اپنے فرض سے مجبور تھی۔ وہ ایک طوفانی رفتار سے ہیور اسٹاک ہل، سی۔ ٹی، ہائی اسٹریٹ وغیرہ سے گذر گئی۔ اُس کی آنکھین بوڑھے جارج کی پشت پر لگی ہوئی تھین جو اُسکے خاوند کو اپنی صبا رفتار گاڑی مین اُڑائے لئے جا رہا تھا
سب سے اگلی گاڑی مین جو شخص بیٹھا تھا وہی سب سے زیادہ مضطرب نظر آرہا تھا۔ اُسکے دونون ہاتھون کی مٹھیان بند تھین جنمین سے ایک کے اندر جراثیم کی تباہ کُن نلکی تھی۔ اُسکے چہرہ پر خوف اور پریشانی کی علامتین نمودار تھین بالخصوص وہ اسوجہ سے زیادہ پریشان تھا کہ اپنا کام کرنے سے پہلے کہین گرفتار نہ ہو جائے۔ اسی پریشانی کے ساتھ اُسے خوف بھی تھا اور وہ صرف اپنے سنگین، وحشیانہ اور ہولناک جرم کے خیال سے۔
"کوئی انار کسٹ مجھ سے قبل اس عجیب و غریب طریقہ کار کو معلوم نہین کر سکا کسی کے سر ایسی شاندار فتح کا سہرا نہین بندھ سکا" وہ اپنے ذہن مین سوچ رہا تھا "راؤ کل، ادیلانٹ اور تمام مشہور و معروف ہستیان جو انار کی مین شہرۂ آفاق ہو چکی ہین اُسکی نگاہون مین حقیر معلوم ہوتی تھین، صرف شہر کے مرکزی آبپار کو معلوم کرنا اور اُسمین شیشہ کی نلکی کو توڑنا شرط تھا، پھر کیا تھا، پھر تو وہ تمام تراجیون کا متفقہ بادشاہ تھا۔

اُسنے جس ذہانت کے ساتھ سازش کو مرتب کیا تھا وہ یقیناً قابلِ داد تھی۔

تعارف کیلئے جعلی خط بنانا، تجربہ گاہ مین داخل ہونا، ماہر جراثیم کو دھوکہ مین ڈالنا، اور معہ نلکی کے تجربہ گاہ سے نکل آنا:۔

«اب دُنیا یقیناً میرا نام سنیگی» اُسنے ایک کامیابی کی سانس لیتے ہوئے کہا «یہ تمام لوگ جو مجھسے نفرت کرتے رہے ہین، مُجھے پس پشت ڈالتے رہے ہین، دوسرون کو ترجیح دیتے رہے ہین، میری محبت کو بار سمجھتے رہے ہین، بالآخر میری اہمیت کا اندازہ کرینگے، موت! موت!! صرف موت!!! —— اُنھون نے ہمیشہ مجھے فضول اور بیکار آدمی سمجھا ہے، تمام دُنیا مجھے پس پشت ڈالنے کے لئے سازباز کر رہی تھی۔ اب مین بتادونگا کہ ایک شخص کو تنہا چھوڑ دینا، اُسکی قدر نہ کرنا کیا مصیبت لا سکتا ہے!»

«یہ کونسی سڑک ہے؟ —— سینٹ اینڈریو...... بیشک اِدوڑ کا کیا نتیجہ رہا؟» اُسنے کھڑکی سے سر نکالکر پشت کی طرف دیکھا، ماہر جراثیم مشکل سے پچاس گز پیچھے تھا۔ «یہ بُرا ہوا، افسوس! اب مین پکڑا جاؤنگا اور ساری اُمیدون پر پانی پھر جائیگا» اُسنے اپنی جیب ٹٹولی اور نصف گنی کا ایک سکہ نکالکر ڈرائیور کی مُٹھی مین دیدیا۔ «اور انعام ملیگا۔ بھگائے چلو اور صرف پچھلی گاڑی کے گھوڑے کو تھکا دو!!» اُسنے چلّا کر کہا

«بہت اچھا حضور!» ڈرائیور نے گنی کو جیب مین ڈالتے ہوئے دو تین چابک لگائے

کھڑکی کا کھُلا ہوا کواڑ کسی چیز سے ٹکرایا، گاڑی ڈگمگائی اور انارکسٹ نے تختہ پکڑنے کے لئے بیساختہ وہ ہاتھ بڑھا دیا جس مین جراثیم کی نلکی تھی۔

نلکی ٹوٹ گئی، شیشی کا آدھا حصہ گاڑی کے تختون پر اُسکے پیر کے برابر آگیا۔ انارکسٹ کے مُنہ سے بیساختہ آہ نکلی اور اپنی جگہ پر ساکت رہ گیا، اب وہ ایک ایسی مایوسانہ نگاہ سے جسمین بے بسی جھلک رہی ہو سیال مادہ کے اُن دو تین قطرون کو جو گاڑی کے تختہ پر بکھر گئے تھے دیکھ رہا تھا۔

«خیر!» کچھ دیر بعد اُسنے کانپتے ہوئے کہا «پہلا شکار مین ہی سہی، کچھ پرواہ نہین، بہر حال شہید ہونا بھی ایک عزت ہے، تاہم.....

......یہ نہایت ہی بے موقعہ موت رہی، خدا معلوم یہ چیز اسی قدر مہلک ہے یا نہین جسقدر بتلایا جاتا ہے»

اُسے ایک فوری خیال آیا اور اپنے پیرون کے درمیان کوئی چیز ٹٹولنے لگا، ایک چھوٹا سا قطرہ اب بھی ٹوٹی ہوئی نلکی مین باقی تھا وہ اُسے بلا تامل پی گیا «اب جسقدر میری موت یقینی ہے اُس قدر جراثیم کا پھیلنا بھی لازمی ہے» اُسنے دل ہی دل مین کہا اور ماہر جراثیم کا خیال آیا جس سے بچنا زائد از ضرورت معلوم ہوتا تھا، چنانچہ ولنگٹن اسٹریٹ مین اُسنے ڈرائیور سے گاڑی رُکوالی اور اُتر پڑا

زمین پر اُسکا پیر پڑتے ہوئے ڈگمگا رہا تھا اور سر چکرایا جاتا تھا۔ اُسنے گاڑی والے کو رخصت کر دیا اور سینہ پر دونون ہاتھ رکھ کر ماہر جراثیم کے انتظار مین سڑک پر کھڑا ہوگیا، اُسکے چہرے سے جلال اور آنکھون سے شاہانہ رُعب ٹپک رہا تھا، فوری موت کے خیال نے اُسے ہر نوع شاندار بنا دیا تھا۔

«زندہ باد۔ مزاج!!»

"دوست تمھاری آمد بعد از وقت ہے میں اُسے پی گیا ——— ہیضہ پھیل چکا ہے!" ماہر جراثیم نے اپنا چشمہ درست کر کے تعجب سے اُسے دیکھا ——— "پی گئے!

اچھا کیا۔ تم انارکسٹ تھے، مجھے اب معلوم ہوا" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر کہتے کہتے رک گیا اور تبسم اُسکے ہونٹوں کے نقطہ اتصال پر کھیلنے لگا اُسنے اپنی گاڑی کا دروازہ اُترنے کے لئے کھولنا چاہا مگر انارکسٹ نے ڈراما کے مخصوص انداز میں اشارے سے "الوداع" کہا اور پشت پھیر کر آہستہ آہستہ واٹرلو برج کی طرف چل دیا۔ مرض پھیلانے کیلئے وہ اپنا جسم سڑک سے گذرنیوالے ہر آدمی سے قصداً مس کرتا ہوا جا رہا تھا ماہر جراثیم اُسکے خیال میں اس قدر منہمک تھا۔ کہ منّی کے یکایک سامنے آجانے پر اُسنے مطلق اظہار تعجب نہ کیا وہ پیار کے لہجہ میں اُس سے کہنے لگا "پیاری منّی تمنے بہت اچھا کیا کہ میرے جوتے اور ٹوپی لیتی آئیں" اور بدستور انارکسٹ کو دور سڑک پر جاتے ہوئے دیکھتا رہا

"تم بیٹھ جاؤ!" اُسنے اُسی طرح سڑک کی طرف تکتے ہوئے کہا۔ منّی کو اب یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اُسکا خاوند حواس خمسہ کھو چکا ہے چنانچہ اُسنے گاڑی میں بیٹھ کر مایوسی کے لہجہ میں ڈرائیور کو گاڑی ہانکنے کا حکم دیا۔

"میرے جوتے! پیاری منّی!" پروفیسر نے اپنی بیوی سے دریافت کیا گاڑی مُڑ گئی اور دُور سڑک پر سیاہ چیز جو رفتہ رفتہ آدمیوں کے ہجوم میں غائب ہوتی جا رہی تھی گھوڑے کی آڑ میں آگئی ——— پروفیسر بے ساختہ قہقہے لگانے لگا۔

"یہ ایک ہی ہوئی ——— حالانکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

"منّی تمھیں معلوم ہے کیا ہوا؟ سُنو! یہ آدمی آج تیسرے پہر مجھ سے ملنے کیلئے آیا، جانتی ہو کون ہے؟ انارکسٹ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چیخنے چلانے کا کام نہیں، خاموشی سے سُنے جاؤ! ورنہ اسطرح میں باقی ماندہ قصہ نہیں کہہ سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سمجھ گئیں۔ میں اُسے متحیر کرنا چاہتا تھا، یا یوں کہو کہ بیوقوف بنانا چاہتا تھا، مگر مجھے مطلق علم نہ تھا کہ یہ انارکسٹ ہے۔ بالکل اطمینان سے مینے جراثیم کی وہ نلکی اُسے دکھائی جس کے بارے میں مینے تمسے تذکرہ کیا تھا کہ بندروں کے جسم پر نیلے دھبّے ڈال دیتی ہے اور وہ آپس میں خوب لڑتے ہیں مگر مینے اُسے بالکل بیوقوف بناتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ اس میں ایشیائی ہیضہ کے زندہ جراثیم بند ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُسے لیکر لندن کے تمام پانی میں زہر ملانے کی غرض سے بھاگ گیا مینے اُسکا پیچھا اس لئے کیا کہ اس میں دو تین اجزا نہایت کمیاب ہیں اور تیل کے ساتھ ملکر انتہائی زہریلے جراثیم بنا دیتے ہیں۔ بہر حال وہ اُس مادہ کو پانی میں ملا کر بھی کم از کم اس مہذب شہر کی تمام زندہ چیزوں کو نیلا ضرور بنا دیتا۔ مگر اچھا ہوا کہ وہ خود ہی اُسے پی گیا معلوم نہیں اب کیا ہوگا لیکن تمھیں یاد ہے اس سے وہ کُتیا نیلی ہو گئی تھی، اُسکے بچوں پر نیلے داغ پڑ گئے تھے اور چڑیا کے گہرے آسمانی پر نکل آئے تھے۔ یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مشکل یہ ہے کہ اب مجھے دوبارہ اسے تیار کرنے کی زحمت اُٹھانی پڑیگی۔

اور ہاں، تم یہ گرم کوٹ کیوں لائی ہو؟ کیا میں اسے پہنوں؟ ——— کیوں؟ اسلئے کہ راستہ میں مسز جیبر نہ مل جائیں ——— پیاری منّی! مسز جیبر ایسی نہیں ہیں لیکن پھر بھی کیا مجھے مسز جیبر کے ڈر سے کوٹ پہننا ——— اچھا لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(ایچ - جی - ویلس)

طالب باغپتی

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(بہ سلسلۂ سابق)

ڈاکٹر ابر کرامبی[1] اور اسکے نظریات خواب

عالم رویا مین دماغی کیفیت کو دو مفصلۂ ذیل حصون مین تقسیم کر سکتے ہین،

(۱) وہ خیالات جو دماغ مین ظاہر ہوتے ہین، اپنے وجود حقیقی ہونے کا یقین دلاتے ہین، اور عالم بیداری کی طرح جب ہملوگ اپنے خیال کو اشیائے موجود فی الخارج سے مقابلہ کرتے ہین تو یہ یقین صحیح نہین ہوتا،

اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم رویا مین جو صورتین ظاہر ہوتی ہین وہ حقیقی معلوم ہوتی ہین، مثلاً خواب مین ہملوگ کوہ و دشت، چٹیل میدان، سر بفلک عمارات، اور بڑے بڑے سمندر دیکھتے ہین، تو معلوم ہوتا ہے، انکا وجود حقیقی ہے خیالی نہین، جسطرح بیداری مین کوئی منظر وجود حقیقی کا احساس پیدا کرتا ہے، خواب مین بھی یہی ایقانی کیفیت ہوتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ عالم بیداری مین ہملوگ جب اپنے خیال کو ان مناظر سے مقابل کرتے ہین، تو انہین موجود فی الخارج پاتے ہین اور عالم رویا مین جو مناظر ہمارے پیش نظر ہوتے ہین انہین صرف ذہن ہی سے تعلق رہتا ہے، خارج عن الذہن ان کا وجود نہین پایا جاتا

(۲) خیالات اور تصورات ایک ایسے قانون ائتلاف کے ماتحت دماغ مین مربوط ہو جاتے ہین جس پر انسانی تصرف نہین ہوتا ہملوگ خیالات اور تصورات کے سلسلہ مین تغیر نہین کر سکتے، اور نہ انہین اپنے ارادہ سے وقفہ دے سکتے ہین،

قانون ائتلاف (ASSOCIATION) فلسفہ کی ایک اصطلاح ہے، ڈاکٹر صاحب کے قانون کی تفصیل یہ ہے کہ خیالات اور تصورات مستلزم ہوتے ہین یعنی جب ایک خیال پیدا ہوتا ہے، تو اسی قسم کا دوسرا خیال پیدا ہو جاتا ہے، اکثر حفاظ کو دیکھا ہوگا جہان پڑھتے پڑھتے رک گئے پھر وہان سے نہین بڑھتے' اور جہان بتا یا گیا (خواہ وہ ایک ہی لفظ ہو) پھر سلسلہ شروع ہو گیا، یہ اسی قانون کا نتیجہ ہے، ڈاکٹر موصوف کہتے ہین کہ جس طرح کسی خیال کے عناصر پر انکے باہم مربوط ہوتے وقت عالم بیداری مین ہمارا تصرف رہتا ہے، ویسا عالم رویا مین نہین، مثال کے طور پر جذبہ شہوت کو لے لیجئے، خیالات شہوانیہ کے اندر جب مرابطہ پیدا ہونے لگے، تو عالم بیداری مین ہملوگ مذہب اور ہیئت اجتماعی کے خوف سے ان عناصر خیال کو باہم مربوط ہی نہ ہونے دینگے، اور بالفرض یہ خیال ہو بھی تو اسے عملی جامہ نہین پہنا سکتے اسکے برخلاف

---

[1] ڈاکٹر ابر کرامبی انگلستان کا ایک مشہور عالم گذرا ہے اسنے ایک کتاب لکھی جو ایک ہی جلد مین دو حصون کے اندر پائی جاتی ہے، اسکا نام "قوائے عقلیہ، و احساسات اخلاقیہ" ہے پہلے حصہ مین ایک سکشن کے اندر اسنے خواب کے متعلق مبسوط مباحث کئے ہین، سنہ ۱۹۲۵ء مین خاکسار نے اسکا ترجمہ کیا تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب مین تعلیم سے فارغ ہی ہوا تھا اور نظر ثانی نہ کر سکتا تھا' اب مین نے پھر اس کو دیکھا اور ضروری حذف و اضافہ کے بعد اس بحث کے سلسلہ مین پیش کر رہا ہون ۱۲

عالم رویا میں ان عناصر کے باہم مربوط، اور منتظم ہو کر عملی صورت اختیار کر لینے پر ہمارا دست تصرف نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے زہاد و صوفیا، علما اور صلحا خواب کے اندر ایسے مناظر سے مقابل ہوتے ہیں، جنکے متعلق عالم بیداری میں انہیں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، عالم بیداری میں ہرگز ایسا فعل ان سے سرزد نہ ہوتا، جو عالم رویا میں ان سے ہو جاتا ہے اسکی توجیہہ ڈاکٹر صاحب کے اس قانون سے ہوتی ہے

ڈاکٹر موصوف نے تکوین خواب کی چار علتیں قرار دی ہیں اور ہر ایک کے ضمن میں انہوں نے تاریخی اور ذاتی تجربات درج کئے ہیں، یہاں پر تفصیلات کی توگنجایش نہیں لہذا، ڈاکٹر صاحب کے صرف چاروں عنوان بیان کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے، موقعہ ہوا تو خواب کے متعلق عضویات اور نفسیات کی حیثیت سے بحث کیجاویگی اور ڈاکٹر ابرکرامبی کی تمام تفصیلات پیش کیجاد ینگی۔

(۱) جدید حادثات، اور جدید دماغی جذبات سے جو باہم مخلوط ہو کر ایک مسلسل سلسلہ میں مربوط ہو جاتے ہیں یا قدیم و جدید واقعات، کی مخالطت سے کسی احساس کے ذریعے جو ان میں سے ہر ایک کیساتھ کم و بیش متحد رہتا ہے گو دوسری حیثیت سے ان جدید حادثات و دماغی جذبات یا جدید و قدیم واقعات کی کڑی باہم ملی نہو، اور انمیں انتشار و تشتت ہو، ایک خواب کی تکوین ہوتی ہے

(۲) تصورات کے وہ سلسلے جنھیں تاثرات جسمی کے باعث قانون ائتلاف وجود میں لاتا ہے۔

(۳) انسان بعض ایسے خواب دیکھتا ہے جنمیں ان معاملات یا اشیا کے متعلق جو دماغ سے غائب یا فراموش ہو گئے ہیں قدیم ائتلافات کی معاودت ہوتی ہے

ڈاکٹر صاحب اس کلیہ کے متعلق لکھتے ہیں، کہ ایسے خواب کی علت دریافت کرنا ناممکن ہے، اور انمیں بعض ایسے ہیں، جنھیں ان کلیات میں سے جن سے فی الحال ہم لوگ واقف ہیں کسی کلیہ کے ماتحت نہیں رکھ سکتے

(۴) عادات کا میلان (یا شوق) یا ایک دماغی جذبہ خواب کی شکل میں متشکل ہو جاتا ہے، اور وہ کسی فطری واقعہ کی بدولت عملی صورت اختیار کر لیتا ہے

خواب کے متعلق جدید تجربات میرے ایک نہایت ہی مخلص دوست ہیں جنکی روایت میرے خیال میں ایسی ہے جسطرح میرے نزدیک خود اپنی روایت، وہ اکثر خواب دیکھا کرتے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے سوانح زندگی میں جستہ جستہ نقل بھی کر دیا ہے، گو انکی موجودہ زندگی نے ایک دنیادارانہ صورت اختیار کر لی ہے، لیکن اپنی ابتدائی زندگی کا خواب جیسے وہ مجھ سے بیان کرنے لگے، تو میں نہایت متاثر ہوا، چونکہ میں انکی ابتدائی زندگی سے واقف ہوں اسلئے وہ میرے نزدیک ایک ثقہ راوی ہیں، پہلے وہ ایک غریب طالب العلم تھے، خموشی اور کنارہ کشی انھیں زیادہ محبوب تھی، تلاوت قرآن اور نماز انکا مشغلہ عزلت تھا، وہ کہتے تھے کہ حیات کے اس دور میں برابر یہی خواب دیکھا کرتا تھا، کہ مسجد یا کسی دوسری جگہ پر قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہوں، اور بعض آیات پر فرط رقت میں زار زار رو رہا ہوں اور اسی حالت میں میری نیند کھل جاتی تھی، خواب کے اندر فارسی کے بعض اشعار پڑھتے پڑھتے جنمیں ترک دنیا، بے ثباتی عالم، حب الہی اور درد محبت کے جذبات، پائے جاتے ہیں، ان پر اکثر وجد انگیز کیفیات طاری ہو جاتی تھیں اور روتے روتے انکی نیند کھل جاتی تھی ایکدن خواب میں انھوں نے دیکھا کہ ایک سائبان میں صف باندھے ادس بارہ اشخاص بیٹھے ہیں، انکی وضع قطع بالکل صوفیانہ تھی، نیچا جبہ، عمامہ،

لانبی داڑھی، مقدس اور بارعب چہرہ دیکھکر میرے دوست پر نہایت کیفیت طاری ہوئی، اور وہ ایک بزرگ کے نزدیک جو دائین جانب شروع صف مین تشریف فرماتھے پہونچکر اظہار عقیدت کے جذبہ بے اختیار مین، انکا دست مبارک چومنے لگے، انھون نے میرے دوست کی گردن جھکائی اور انکی پشت پر ہات پھیر کر فرمایا "یہ خوب پڑھیگا" میرے دوست ایک غریب اور نا پرسان حال انسان تھے علوم وفنون سے انھین چندان دلچسپی نہ تھی، لیکن انکی بعد کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھون نے یقیناً یہ خواب دیکھا ہوگا، اور وہ بزرگ ایک "سروش غیبی" تھے، میرے دوست نے اپنے سوانح زندگی مین ایک اور پر لطف خواب لکھا ہے، جسے مین انہین کے الفاظ مین لکھدیتا ہون،

ابا کا خط

۱۹ راکتوبر ۱۹۲۵ء دوشنبہ

ابا آج سے چودہ سال بیشتر راحت ابدی کی نیند سوچکے دنیا کے کس پردہ مین ڈھونڈھنے سے بھی آپکا پتہ نہین مل سکتا، ہان آپکی مقدس اور خدا پرست صورت نے اتفاقاً خواب مین آکر دلکو البتہ مغموم و پریشان کیا ہے، ۱۹ راکتوبر کو بوقت شب آخر مین نے والد ماجد کا ایک خط پایا، اس خط کی نوعیت اور تحریر عجیب دلکش تھی، مضمون سے لاڈ و پیار اور شوق ملاقات مترشح تھا، نیند کھلی تو خط کا مضمون میںنے یاد کرلیا، یہ خط کا خلاصہ نہین بلکہ حقیقی الفاظ ہین جو نظام غیبی کے ماتحت میرے محبوب اور چہیتے والد مرحوم کے قلم سے نکلکر عالم رویا مین مجھ تک پہونچے، مینے دیکھا...... مسجد کے نزدیک چوک پر مین کھڑا ہون، دفعتہً ڈاکیہ نے ایک خط لاکر دیا، یہ پوسٹ کارڈ تھا اسکے ساتھ ایک زرد رنگ کا پرچہ چسپان تھا جو اکثر رجسٹری شدہ خطوط مین رہا کرتا ہے۔

مضمون خط

"...... کے دو مضامین مجھے موصول ہوئے جن سے علم دہتر ٹپکتا ہے...... میرالڑکا ہے جسکی خبر، (جسکا مفہوم میرے ذہن مین اسوقت یہ آیا ۱۹۱۷ء اور طرز مضمون سے یہی معلوم ہوتا تھا صرف کتابت کی غلطی تھی) کے بعد سے مجھے کچھ معلوم نہین جب سے میںنے مضامین پائے ہین، کھانا پینا گانا بجانا ملنا جلنا سب ترک ہو گیا ہے"

باپ کی محبت اور انکے خط کے مطالعہ نے مجھے کچھ ایسا وارفتہ اور غریق بحر فنا بنا دیا، کہ مین ہمہ تن چشم بنکر خط کا مرقومہ بالا مضمون پڑھتا رہا نیند کھلی تو ایک پژمردگی اور یاس کا عالم تھا، والد کے فراق کا غم تازہ ہوگیا اور اس سن و سال مین بھی آنسو ٹپک پڑے۔

میرے دوست ایک اور خواب کا تذکرہ کررہے تھے جو بالکل امام غزالی کے رویائے آلہی سے ملتا ہوا ہے، چونکہ میرا قلب اس قسم کے احساسات کے سمجھنے سے عاری ہے، اسلئے مین اسکی صحیح اہمیت ذہن نشین نہین کرسکتا لیکن ایک ثقہ راوی کی روایت نظر انداز کرنے کو جی نہین چاہتا، وہ کہتے تھے ایک دن مین سفر مین تھا، مغرب کی نماز مین کچھ دیر ہوگئی ایک مسجد مین جاکر فوراً نماز پڑھی، انہین قرآن مجید کا کچھ حصہ یاد تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہونیکے بعد وہ وہین بیٹھ رہے، اور سورہ جن سے لیکر ۲۹ پارہ کے اخیر تک زبانی تلاوت کی، اور عشا کی نماز پڑھکر اپنی منزل پر لوٹ آئے وہ اپنے بال بچون سے ملنے جارہے تھے، لہذا دل کسی اور شوق کا گرفتار تھا، لیکن تعجب ہے کہ انھون نے خواب مین دیکھا کہ مین وطن کی ایک سڑک پر ہون، جسکے ارد گرد شیشم کے بڑے بڑے درخت ہین ایسا سمان بندھا ہوا ہے، جیسے موسم بہار مین بدلی چھائی ہو، اور

بوندین گرنے ہی کو ہون، ایسے سنسان، مگر دلکش مقام مین عالم پر کامل سکوت طاری تھا نہ وہان کسی انسان کا گذر تھا، نہ کوئی آواز سنائی دیتی تھی اسوقت انھون نے دیکھا کہ مین رامائن کے لہجہ مین ہندی کی ایک غزل پڑھ رہا ہون، (حالانکہ وہ ہندی غزلیات سے واقف نہین) انکی آواز مین نہ معلوم اسوقت کہان سے ایسا سوز وگداز پیدا ہو گیا تھا، کہ وہ خود حیران تھے معلوم ہوتا تھا ترنم کی دلکش لَے اور لہجہ کا پردرد سوز انکے بازؤن مین پر لگا دینگے اور وہ اڑ کر عالم بالا مین پہونچ جاوینگے، انکی آنکھون کے سامنے سے معلوم ہوتا تھا پردے اُٹھ رہے ہین اور گویا انکے سامنے تو ایس آلہیہ کے جلوے موجود ہین، ہرچند اس جلوہ گاہ مین انہون نے، نہ کوئی صورت دیکھی نہ کوئی آواز سنی، لیکن انکے وجدان کو یہ احساس ہوا، کہ گویا انکے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہین

امام غزالی اور انکی صوفیانہ زندگی

سنہ ۱۰۹۵ء سے امام غزالی کے عہد تصوف کی ابتدا ہوتی ہے، اسکے بعد آپکی زندگی کا کچھ حصہ تو ایک صوفی کی طرح بادیہ پیمائی مین گذرا، اور کچھ صوفیانہ عقاید کی تعلیم وتلقین مین، آپنے سنہ ۱۱۱۱ء مین وفات پائی، اور اپنے تمام تجربات صوفیانہ آپنے خود اپنی زندگی مین قلم بند کئے ہین، جو عربی مین اپنی لطافت اور کمال اظہار کے اعتبار سے فقید المثال کتاب ہے، امام موصوف اپنے صوفیانہ رجحان کو مفصلہ ذیل الفاظ مین بیان کرتے ہین

میری توجہ طریقت صوفیہ کی طرف مبذول ہوئی، مین جانتا تھا کہ انکے جادہ طریقت پر رہروی کیلئے اصول اور عمل دونون ذرایع ضروری ہین، اسکا اصول یہ ہے، کہ انسان اپنے نفس سے تمام صفات وخصوصیات خبیثہ دور کردے، یہانتک کہ انسان کا دماغ صرف ناموس الہیہ کے جلوہ سے معمور ہو جائے، میرے طریقت صوفیہ کا اصول اسکے علمی اوراد و وظائف کی بہ نسبت زیادہ سہل تھا، اسلئے مینے اسے جاننے کیلئے انکی کتابونکا مطالعہ شروع کیا، (یہان امام غزالی نے تصوف کی چند کتابونکے نام لکھے ہین) مینے انکے اصولی فکر وعقاید پر عبور حاصل کرلیا، اور انکی طریقت کے متعلق مجھے وہ تمام معلومات حاصل ہو گئے، جو مطالعہ یا سماعت سے حاصل ہو سکتے ہین

مجھ پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ مطالعہ کے ذریعہ سے طریقت کے خصایص کا علم حاصل نہین ہو سکتا، اسکے لئے ذوق سلیم کی ضرورت ہے اسکے بعد امام غزالی نے ایک خطیبانہ انداز مین بیان کیا ہے کہ اسمین جو حفظان صحت کے اصول وقوانین سے واقف ہے، اور جو خود صحیح اور تندرست ہو کسقدر فرق ہے، ایک وہ شخص جو صرف شرب اور بانگ نوشانوش کی تعریف جانتا ہو، اس شخص سے جو لذت شرب سے پرکیف اور "گاہے مے شبانہ وگہ بادۂ صبوح" کی نشاط آفرینیون سے سرشار ہو کسقدر ممتاز حیثیت رکھتا ہے، "بادہ پیمائی" جسکا "وظیفہ صبح" اور "ورد شام" ہو وہ بادہ پیمائی کی تعریف اور لذت خمار کے علمی لطائف ناواقف ہوتا ہے، اسے ایک وارفتہ کرنے والی مستی ہوتی ہے وہ لذت خمار سے ایک نشاط انگیز حاصل کرتا ہے، اور بس، ایک سنجیدہ اور زاہد منش انسان تعریف خمار تو جانتا ہے بادہ پیمائی کے متعلق اسے علمی اور طبی اصول سے تو واقفیت ہوتی ہے، لیکن وہ لذت شرب سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے، اسی طرح جب ایک طبیب بیمار ہوتا ہے حفظان صحت کے اصول، اسباب مرض اور دفعیہ کے اسرار سے تو واقف رہتا ہے، لیکن صحت اس سے مفقود رہتی ہے، ماہرین تصوف اور رہروان طریقت کے درمیان یہی فرق ہے

مجھے اسکا یقین ہو گیا، کہ صوفیہ کے نزدیک "احوال" اہمیت رکھتے ہین نہ کہ تعریفات اور یہ کہ جو کچھ علمی ونظری مباحث کے

ذریعہ ممکن تھا، مجھے حاصل ہوگیا، بقیہ معلومات مطالعہ وسماعت کے ذریعہ نہین حاصل ہوسکتے بلکہ انکے لئے "ذوق" کی ضرورت ہے، اور ایک مانہ معینہ تک عملی اوراد و وظایف کی،

ان علوم کے ذریعہ جو مینے پڑھے تھے، اوران طریقون کی وساطت سے جو مینے اقسام علوم (عقلی ونقلی) کی جستجو مین اختیار کئے تھے، میرا عقیدۂ توحید، رسالت اور آخرت کے متعلق راسخ ہوگیا تھا، ایمان کے یہ بنیادی عقاید میرے نفس مین اثبات کامل کے ذریعہ نہین جاگزین ہوتے تھے، بلکہ سلسلۂ ایتلاف، اور تجربات کے ذریعہ حاصل ہوتے تھے یہ بات مجھ پر ظاہر ہوگئی، کہ مجھے نجات اخروی کی امید صرف اتقا اور نفس کو مطلوبات شہوانیہ سے محفوظ رکھنے سے ہی ہوسکتی ہے، اور یہ کہ اسکی ابتدا یہ ہے، کہ قلب کو عالم مادی کے تعلقات سے منقطع کردیا جائے۔

ان خیالات کے پیدا ہونے سے مین سمجھنے لگا کہ مین زندگی کے ایک نہایت اہم دور سے گزر رہا ہون، آخرکار ایک دن مینے ارادہ راسخ کرلیا، کہ بغداد سے ہجرت کرکے حیات کی تمام کامرانیون سے دست بردار ہوجاؤنگا لیکن ابھی تک مین پس وپیش مین تھا صبح کو مین ترک دنیا کا ارادہ کرتا تھا، توشام کو اسمین انقلاب رونما ہوجاتا میرے ارادہ مین استقلال نہ تھا مطلوبات شہوانیہ "دامن دل" پکڑ کر کہتے تھے کہ "دوجا اینجاست"، اور ایمان کا ایک سروش غیبی "بربند یدمحملہا"، کا مبہم پیام سنا رہا تھا،

اسی طریقہ سے چھ ماہ گزر گئے، اور مین کبھی توعالم مادی کے جذب وکشش سے متاثر ہوتا تھا، اور کبھی آخرت کی پکار سے، یہ ماہ رجب کا مہینہ تھا، اسوقت معاملہ میری مرضی اور خواہش سے بالاتر ہوگیا، مجھے مجبوری لاحق ہونے لگی، خدا نے میری زبان بند کردی، میری گویائی ایسی سلب ہوگئی، کہ مین تعلیم وتلقین کرنے سے بھی عاجز ہوگیا، ایک دن مینے دیا ڈھڈالگر چاہا بھی کہ بعض حضرات کے اطمینان خاطر کیلئے مین کچھ تعلیم کرون، لیکن میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، اب زبان کی اس بندش اور نطق کے فقدان کے باعث مین سخت مغموم رہنے لگا میری قوت ہاضمہ مین فرق آگیا، نہ کھانے کی خواہش رہی، نہ پانی کی طلب، نہ مین ایک قطرہ آب جذب کرسکتا تھا نہ ایک لقمہ ہضم، میری قوت زائل ہونے لگی، اور اطبا نے بھی شفا سے مایوسی ظاہر کی، انھون نے تشخیص کی کہ کسی دماغی تکلیف نے نظام جسمیہ پر اثر ڈال رکھا ہے، اور اسکا علاج یہی ہے، کہ وہ فکر وتردد دماغ سے دور ہوجائے تب مینے ضعف ونقاہت کا احساس کرتے ہوئے، اور اپنے ارادہ کی طلب وادعا، سے دست بردار ہوکر مینے اس شخص کی طرح جس کا وقت ضرورت کوئی حاجت روانہ ہو، خدا کی طرف رجوع کیا

صدائے غیبی آئی، اور میرے لئے آسان ہوگیا، کہ مین جاہ وحشم کی تمنا، دولت کی فراوانی، اور کینہ ورفقا کے تعلقات سے سبکدوش ہوجاؤن۔

اسکے بعد امام غزالی فرماتے ہین کہ کس طرح مینے بغداد کے دربار خلافت سے رخصت حاصل کی، آپنے ظاہر کیا کہ حج بیت اللہ کا ارادہ ہے، حالانکہ آپکا اصل مقصد یہ تھا، کہ شام کا سفر کرین، اور وہین صوفیہ کی طرح ترک دنیا، اور مراقبہ کے اشتغال مین مستغرق رہین، امام غزالی اب ایک بادیہ پیما راہب ہوگئے، آپ ملک شام مین پہونچے، اور وہان دوسال تک کنج عزلت مین بسر کی آپنے صوفیانہ ریاضت کی منزلین طے کین، تزکیہ دماغ اور تصفیہ قلب فرماتے رہے، اور ہمیشہ خیال الٰہی مین مستغرق رہے، اسکے بعد آپکے

قلب مین پہ حج بیت اللہ کی خواہش پیدا ہوئی آپ نے مناسک حج ادا کئے، اور دس سال تک آپکی زندگی، دو حصون مین منقسم رہی، خود اپنا تزکیہ نفس، اور دنیا کے دوسرے ارباب کا خیال، تعلقات دنیا کے افکار، زندگی کی ضروریات اور اولاد کی منت وسماجت کبھی انہین اپنی طرف متوجہ کر لیتی، اور کبھی صوفیہ کی «جمعیت» اور «علاقہ الٰہی» کی طلب، کنج عزلت مین بٹھا دیتی، (باقی)

عبدالمالک آروی

ایک ادبی و علمی دعوت

جنوری ۱۹۲۸ء کی اشاعت نگار کو مومن کے لئے مخصوص کر کے مین نے اپنے آپکو گویا پابند بنا لیا ہے کہ ہر سال کسی نہ کسی ایسے شاعر کی یاد کو تازہ کیا جائے جس کے مٹانے مین زمانہ نے اپنی پوری قوت صرف کر دی ہے۔

چنانچہ ارادہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۰ء کا «نگار» ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے لئے مخصوص کر دیا جائے اور کم از کم دو سو صفحات کو محیط ہو۔ اس سلسلہ مین جو عنوانات قایم کئے ہین، یہ ہین :-

(۱) ظفر کی سیرت اور اس کے عہد کے تاریخی خصوصیات (۲) عہد ظفر کے سیاسیات (۳) ظفر کی شاعری اور اسکی خصوصیات (۴) عہد ظفر مین دہلی کی شاعری (۵) ظفر کی شاعری پر سیاسیات وقت کا اثر (۶) دربار ظفر اور عہد ظفر کے شعراء (۷) ظفر کے عہد مین دہلی کی علمی و ادبی فضا (۸) ظفر رنگون مین (۹) حالی و آزاد کی رائے ظفر کی شاعری کے متعلق اور اسپر محاکمہ (۱۰) انتخاب کلام ظفر

امید ہی کہ مُلک کے ارباب علم و ادب

عنوانات بالا مین سے کسی عنوان پر یا ایک ہی مضمون کے سلسلہ مین ان تمام یا چند عنوانات پر اپنی تحقیقات و معلومات بھیجکر ممنون فرمائینگے۔ انتخاب کلام ظفر کی خدمت ادارۂ نگار نے اپنے ذمہ لی ہے اسلئے اسپر کسی کو وقت صرف کرنیکی ضرورت نہین۔

اسی سلسلہ مین غالباً یہ عرض کر دینا بے محل نہوگا کہ بہترین مضمون کے لئے نگار کی طرف سے ایک حقیر ہدیہ **سو روپیہ کا پیش کیا جانا** قرار پایا ہے۔ جو کامیاب مضمون نگار کی خدمت مین ۲۵ جنوری ۱۹۳۰ء کو روانہ کر دیا جائیگا۔ زیادہ سے زیادہ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۹ء تک مضامین کا دفتر نگار مین پہونچ جانا ضروری ہے۔

نیاز فتحپوری (ایڈیٹر نگار) لکھنؤ

چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ

دنیا میں "سانپ" اور "مولوی" دو چیزیں ایسی ہیں جنکی قسموں کی انتہا نہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور موخر الذکر کا یہ حال ہے کہ:

ہر کرا جامہ مولوی بینی

در دمش صد ہزار مار انگار

مسجد کے ملا سے لیکر محراب و منبر کے واعظ تک، نماز جنازہ پڑھانے والے مولوی سے لے کر اس "مولانا" تک جو بیضاوی و بخاری کا درس دیتا ہے، ایک چیز (الا ما شاء اللہ) سب میں مشترک پائی جاتی ہے اور وہ انکے ظاہر و باطن کا تضاد ہے۔ یعنے جس مولوی کا ظاہر جتنا زیادہ خوشنما ہے اتنا ہی زیادہ اسکا بطون مکروہ ہے۔

ایک مولوی کی "ہیئت وضعی" جس میں اسکا بے تکا عمامہ، الجھی ہوئی زلف (کہ ہے تا دوش و گاہے تا بنا گوش) لانبی پریشان ڈاڑھی، زمین دوز بروت، سیاہ داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتہ، نیم ساقی پاجامہ اور غیر دباغت شدہ متعفن چمڑے کا جوتا مع تسبیح و جریب رومال اور "تاسدانی" کے سب کچھ شامل ہے۔ ایک ایسی واضح، صریح، اختراع مسجل (Patent) ہے جس کو دیکھنے کے بعد گویا ہر شخص کا فطری فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس وضع والے کو مولوی سمجھے اور بحیثیت مولوی ہونے کے اس وضع کا اختیار کرنے والا تو گویا من جانب اللہ اسپر مامور ہی ہوا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں قورمہ اور مرغ پلاؤ مہیا ہو سکتا ہے وہاں اپنا سلسلۂ ارشاد و ہدایت دراز کرے۔ اس میں بھلا کسی کو اعتراض کی کیا گنجایش ہے۔

مولوی کی اولین قسم جو ارتقاء مولویت کی سب سے پہلی کڑی تھی اور جو مکتبوں کے بوریوں پر نظر آتی تھی اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے، مگر ان کے کارنامے مولویت کی تاریخ لکھنے والے کے لئے ہمیشہ اہمیت رکھیں گے۔ کیونکہ "موجودہ مولوی" اسی "گذشتہ مولوی" کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور وہ شخص جو "نفسیات مولویت" (Psychology of molvyism) سے بحث کرنا چاہیگا، اس کیلئے لازم ہوگا کہ وہ اس قوم کی ابتدا ظہور سے آغاز کرے۔ علمی اصولی حیثیت سے آپ اسپر غور کرنیکی اہمیت کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں:۔

مثلاً ——— میرے محلہ میں بہت زمانہ ہوا ایک مولوی کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر محلہ کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کی ایک مولویائن تھیں اور چند در چند بچے جن کو اگر برابر برابر کھڑا کر دیا جاتا تو اچھا خاصہ زینہ بنجاتا۔ رئیس کے یہاں ان کو صرف پانچ روپیہ ماہوار اور کھانا ملتا تھا، لیکن انکی دیگر فتوحات کی صورتیں مختلف تھیں۔ عید، بقر عید، شبرات میں عیدیاں، بقر عیدیاں، اور "شبراتیاں" بپاس خاطر عزیز سلمہٗ لکھ کر انعام وصول کرنا تو خیر ایک جائز معمول تھا ہی، لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی مختلف ترکیبوں سے کام لیتے تھے اور اس باب میں وہ

ایک مخترع و موجد کی حیثیت سے بالکل اڈیسن کا مرتبہ رکھتے تھے۔ مثلاً ان کے موٹے لانبے کرتے میں آگے پیچھے، نیچے اوپر تقریباً ایک درجن جیبیں تھیں۔ یہ جیبیں مختلف وسعت کی تھیں اور ان کا رنگ بھی مختلف تھا، کوئی سرخ تھی اور کوئی زرد، کوئی سفید تھی اور کوئی سبزی مایل، ہر لڑکے کو خفیہ ہدایت کردی گئی تھی کہ جب وہ گھر سے آئے کوئی نہ کوئی چیز لیتا آئے، پھر اگر کوئی مرچ لایا تو سرخ جیب میں ڈالدی، کسی نے ہلدی کی گرہ پیش کی تو زرد رنگ کی جیب میں رکھ لی، کوئی آٹا لایا تو سفید جیب کی نذر ہوگیا، اور سبز ترکاریاں سبز جیب میں چلی گئیں۔ ایک جیب چمڑے کی بھی تھی، جس کا راز ایک دن اتفاق سے یوں کھل گیا کہ ایک مسلمان تیلی کا لڑکا کچھ تیل کٹورے میں لایا اور انہوں نے آنکھ بچاکر اسی جیب میں تیل کو انڈیل لیا۔ الغرض شام کو جب وہ گھر جاتے تھے تو مولویائن اور "ملا نہ لوؤں" کے لئے بقال کی اچھی خاصی دوکان بنکر جاتے تھے۔

ایک معمولی شخص کے لئے بظاہر یہ واقعہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، لیکن ایک ماہر نفسیات غور کریگا کہ ایسے معلم کے شاگردوں میں کیا ذہنیت پیدا ہوسکتی ہے اور وہ آگے چلکر کس قسم کے "افراد قوم" بننے کی اہلیت رکھ سکتے ہیں۔

بہر حال اللہ کی یہ مخلوق تو اب مفقود (Extinct) ہوگئی ہے، لیکن اسی کی اولاد و احفاد یا تلامذہ کے سلسلہ میں جو مولوی پائے جاتے ہیں، انکی تین بڑی تقسیمیں ہوسکتی ہیں۔ ایک وہ جو عربی مدارس میں لڑکوں کو پڑھاتے ہیں، دوسرے وہ جو وعظ و تبلیغ کے ساتھ لوگوں کو مرید بھی کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد مسلمانوں کے قاید و رہنما بن گئے ہیں۔

اول الذکر قسم بظاہر گوشہ نشین اور بے ضرر قسم معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی خلوت نشینی حقیقتاً "ایک مستقل ہنگامۂ محفل" ہوتی ہے جس میں ایک شمع کی حیثیت رکھتا ہے اور طلبہ پتنگوں کی، رہی بے ضرری سو اسکا حال اس سے عیاں ہے کہ اگر درسگاہ اس قسم کی ہے جس کے طلبہ مسجدوں میں رہ کر محلہ والوں کی خیرات اور سویم کی روٹیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں تو اخلاقی تربیت اور علوم ملکی معلوم اور اگر کوئی قومی مدرسہ ہے جسمیں دار الاقامہ کے اصول پر طلبہ کے رہنے کا انتظام ہے تو وہاں کا نصاب ہی فرسودہ و قدیم ہے جو انسان کو آگے بڑھانے کی جگہ پیچھے ڈھکیل دیتا ہے اور جس کی تکمیل کے بعد سوائے اذان دینے، نماز پڑھا دینے یا "مسئلۃ البر محیط" سمجھا دینے کے اور کچھ نہیں کرسکتا، اور وہاں کے اساتذہ روشن خیال نہیں ہیں اور غریب طالب العلموں میں کوئی ولولۂ عمل اور نشاط روح پیدا ہونے نہیں دیتے

اول الذکر قسم کے مولویوں میں سے جو افراد زیادہ ذہین ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر دوسری قسم میں منتقل ہوجاتے ہیں اور وعظ و تبلیغ شروع کرکے "مشایخانہ" حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔ یہ طبقہ زیادہ مالدار، زیادہ خوشحال، زیادہ کامیاب و رنگین ہے۔ ایسا مولوی سب سے پہلے بنگال و برما کے جاہل قریوں میں اپنی "مشق سخن" شروع کرتا ہے اور جاہل مسلمانوں کو جھوٹی روایتیں، گڑھے ہوئے کاذب افسانے مذہب وہابی مذہب کے متعلق سناکر اول اول علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا وعظ کہتا ہے، اور جب اپنی حیثیت بہ لحاظ ایک عالم ہونے کے "یکے از انبیاء بنی اسرائیل" کی طرح قایم کرلیتا ہے تو سراً و علاناً مرشد و ہادی بنکر اپنے ارادتمندوں اور مریدوں کی رجسٹر کھولدیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح کم از کم ۲۰۰ مرید اسکو حاصل ہوجائیں تاکہ اگر ایک روپیہ سالانہ بھی وصول کیا جائے (جو بہت معمولی بات ہے) تو دو روپیہ روز کا اوسط پڑ جائے۔ یہ طبقہ نہایت "خوش خور" و "خوش پوشاک" ہوتا ہے، اگر یہ کسی ایسے قریہ میں پہونچ جاتا ہے جہاں تمام ضروری چیزیں اسکے "ذوق شکم" کو پورا کرنیوالی ملسکتی ہیں تو پھر اس کے دسترخوان کا پروگرام یہ ہوتا ہے:—

صبح کا نسخہ:- نماز کے بعد ہی کشمیری چائے، سیر بھر دودھ اوٹا ہوا، پاؤ بھر مسکہ، ایک چھٹانک پسے ہوئے بادام، آدھ پاؤ قند، دو پراٹھے، تین ابلے ہوئے انڈے، چار کباب اور بس۔

دوپہر کا کھانا:- مرغ کا قورمہ، مرغ پلاؤ، بورانی، پسندے، باقرخانی، مزعفر، بالائی۔

سہ پہر:- سادہ چائے، اور تازہ پھل۔

شب کا کھانا:- وہی جو دوپہر کو تھا مگر شامی کباب اور بھنی ہوئی مچھلی کے اضافہ کے ساتھ۔

اگر مولانا کسی ایسے مقام میں پہونچ گئے ہیں جہاں یہ اشیاء فراہم نہیں ہو سکتیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ صرف دال ترکاری پر بسر کرنا ہوگی تو پھر وہ کہہ دیتے ہیں کہ آج کل کسی جلالی عمل کا چلہ کھینچ رکھا ہے اسلئے سوائے دودھ بالائی کے کچھ نہیں کھا سکتا۔

مولانا کی پوشاک بھی ہمیشہ دورہ ہی کے زمانہ میں تیار ہوتی ہے، عماموں کی تو خیر کمی نہیں کیونکہ ہر نیا مرید جب کچھ نذر نقد اور مٹھائی لاتا ہے تو وہ ایک نیا عمامہ بھی پیش کرتا ہے (جو بعد کو گھر پہونچکر مولویائن کے دوپٹے اور صاحبزادوں کے کرتوں کے کام آتا ہے) لیکن یوں بھی قمیص اچکن، تہمد اور ازار کے لئے طرح طرح سوتی اور ریشمی کپڑے تحفۃً آتے رہتے ہیں اور جو مولوی زیادہ ہوشیار ہیں وہ صرف اسی غرض سے جولاہوں اور کپڑے کے تجارت کرنے والوں کو مرید بناتے ہیں۔ مولانا کے وعظ و تلقین کا جہاں تک تعلق ہے یکسر خدا کی شان جلالی سے وابستہ ہوتی ہے۔ خدا ایسا قہار ہے، ایسا جبار ہے، اس نے جہنم اتنا وسیع بنایا ہے، وہ یوں اژدھوں سے ڈسواتا ہے، اس طرح آگ میں جلاتا ہے، مگر ہاں وہ جس کی شفاعت رسول اللہ کردیں یا کوئی پیر گویا خدا کا قہرانی وجود اپنے وقت کا چنگیز یا ہلاکو ہے اور مولینا اس کے وزیر با تدبیر ان کی ملفوظات کا بڑا حصہ خود اپنے ہی کرامات وخوارق عادات سے متعلق ہوتا ہے۔ کہ فلاں مقام پر اس طرح ایک مرتے ہوئے شخص کو اچھا کردیا، امساک باراں میں یوں پانی برسا دیا، فلاں کے دل کا حال اس طرح بتادیا، جن کے بادشاہ کو طلب کرکے فلاں کے سر سے آسیب کو یوں دور کرادیا وغیرہ وغیرہ۔

اگر مولانا کو ذوقِ موسیقی بھی ہے تو شب کے اول حصہ میں قوالی اور اس کے ساتھ حال قال کی چند مجذوبانہ حرکات بھی دکھائی جاتی ہیں، ورنہ شام ہوتے ہی، مولانا کا جائے قیام مردوں کے لئے "ممنوع الدخول" ہوجاتا ہے، اور صرف عورتوں کی ہدایت کے لئے وقف سمجھا جاتا ہے، پیر صاحب نرم قالین پر نرم تکیوں کے سہارے دراز ہوجاتے ہیں، عورتیں ڈرتی ہوئی، سہمی ہوئی شرمائی ہوئی سامنے آتی ہیں اور مولانا کا وہ جسم جو مقوی اور قیمتی غذا سے خوب نرم اور پرگوشت بنا ہوا ہے دابنے لگتی ہیں۔ مولانا تھوڑی دیر اس لذت و لطف سے سرشار ہونے کے بعد دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور وہاں علیحدہ علیحدہ ہر ایک تعلیم و تلقین خصوصی کے لئے طلب فرماتے ہیں، پھر چونکہ وہ مقام بلند ہے جو پیر صاحب کی اصطلاح میں "قاب قوسین او ادنیٰ" سے کم نہیں، اس لئے یہاں کے راز اول تو بہت کم ظاہر ہوتے ہیں اور جو کبھی ہوگئے تو فوراً "کل یوم ھو فی الشان" اور "اللہ جمیل و یحب الجمال" کا وعظ شروع ہوجاتا ہے اور جاہل مرید خوشی کے ساتھ اپنی عورتوں لڑکیوں کو آلۂ تفریح بنانے کے لئے راضی ہوجاتے ہیں۔

تیسری قسم مولوی کی وہ مولانا ہے جو ملک کے اونچے اور تعلیمیافتہ طبقہ میں اپنی کارگاہ قایم کرتا ہے تاکہ ملک کا سیاسی قاید و رہنما تسلیم کیا جائے۔ جہاں تک اصلاح ملک و قوم کا تعلق ہے میرا تجربہ بالکل صفحۂ سادہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن جس حد تک تخریب و فساد متعلق ہے اس طبقہ کا

وجود اس درجہ خطرناک ہے کہ شاید ہی ہم ابھی کماحقہٗ اس کی اہمیت کو پوری طرح ظاہر کر سکیں۔

یہ مولانا، کھدر پوش ہوتا ہے، دیسی چیزوں کا عاشق، ولایتی اشیاء سے متنفر، حریت و آزادی کا علمبردار، غلامی و استبداد کا عدو، ترقی کا حامی، تنزل کا دشمن اور

”یتیموں کا والی غریبوں کا ملجا“

سبھی کچھ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس کے کھدر پوش سینہ کے اندر اتنا موٹا اور مکروہ قسم کا نفس ہوتا ہے کہ شاید ہی غریب فرعون کو نصیب ہوا ہو۔ اس کے تمام مقالات حریت، اسکی تمام شعلہ بیانیاں، اسکی جملہ سوراج پرستیاں، صرف حب جاہ سے متعلق ہوتی ہیں اور اسکا مقصود ان تمام نمائشوں سے سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ریل کے اونچے سے اونچے درجہ میں سفر کرے، وداع کے وقت لوگوں کا ہجوم اس کو اسٹیشن تک پہونچانے جائے، جہاں پہونچے وہاں رسم مشایعت کے لئے ایک جماعت موجود ہو، گلے میں ہار ڈالے جائیں، اسکی موٹر کو نوجوانان ہند دھکیل کر لیجائیں، جلوس کے ساتھ جب وہ بازاروں کیطرف سے نکلے تو ایک غرور نما انکسار کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کا سلام قبول کرتا جائے، اور جائے قیام پر ہر وقت زایرین کی آمد و شد سے میلہ سا لگا رہے

یہ اپنے آپ کو سیاسیات کا ماہر، نظام عالم کا ”استن حنانہ“ اور گردش ارضی کا محور سمجھتا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو نظم دنیا درہم برہم ہو جائے، مشرق مغرب سے، شمال و جنوب سے ملجائے اور قومیت کا بیڑا غرق۔ اس قسم کا مولینا بہت کم خطرہ میں پڑتا ہے اور اگر کبھی پڑ جاتا ہے تو صرف تجارتی اصول کی بنا پر کہ آیندہ اس کے کاروبار کی رونق اس سے زیادہ بڑھ جائیگی۔ یہ سوائے اپنے کسی کی رائے کو پسند نہیں کرتا، یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں خدا نے صرف اسی کو ذی عقل و ہوش بنایا ہے اور خلیفۃ اللہ فی الارض اسی کی ذات سے عبارت ہے۔ وہ جلسوں میں ہمیشہ دیر کر کے پہونچتا ہے تاکہ جس وقت وہ پہونچے تو سارا مجمع جو اسکا انتظار کر رہا ہے، گردن اٹھا اٹھا کر اسکو دیکھنے لگے وہ چوکڑیوں پر سوار ہو کر جاتا ہے، اونچی جگہ مسندوں اور زر کار کرسیوں پر اپنا دامن عبا دراز کرتا ہے۔ وہ دوران جلسہ میں سرگوشیاں کرتا ہے، کاغذ کے پرزوں پر پنسل سے کچھ لکھ کر لوگوں کو ہدایات فرماتا ہے، گویا کہ وہ اس ساری جماعت کا ایک قاید اعظم ہے، اس مشین کا پہیوت یا گورنر اسپرنگ ہے جسپر پرزوں کی ...... باضابطہ گردش قایم ہے۔ مولانا، مولانا کی آوازوں سے اسکا سیروں خون بڑھتا ہے، دست بوسی سے اس کے جذبات قیادت میں برقی رو دوڑ جاتی ہے اور جس وقت وہ اسٹیج پر جاکر تالیوں کی آواز سنتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ خدا عبارت ہے صرف اسی کی ذات سے، یہ حال ہے اسکی پبلک زندگی کا، لیکن اپنے گھر کے اندر وہ کیا ہے؟ اپنے متعلقین کے ساتھ اسکا کیا برتاؤ ہے۔ لوگوں کے حقوق وہ کیونکر ادا کرتا ہے، اس کا حال اسکی غریب بیوی سے پوچھیے جو ایک کنیز سے بدتر حیثیت رکھتی ہے، بچوں، خادموں اور اس کے اعزہ سے دریافت کیجیے کہ یہ اپنے آپ کو ”خدا کا بیٹا“ کہنے والا، کس طرح کا باپ کس قسم کا آقا اور کس انداز کا انسان ہے۔

اس کا مذہب ہے صرف خود پرستی، اس کا دین و ایمان سراسر کبر و غرور، اور اس کی ذات از سر تا پا یادگار ہے ان فراعنہ و نماردہ کی جنکا حال تو کتابوں میں ہمکو نظر آجاتا ہے، لیکن صورت اب تک کبھی نہیں دیکھی تھی۔

میں نہیں کہتا کہ اس جماعت میں کوئی مستثنے نہیں ہے، لیکن اگر کوئی ہے تو اسکا عدم وجود برابر ہے اور اس کو یہ مرتبہ حاصل نہیں۔

اسقدر تمہید کے بعد مجکو اصل مدعا کی طرف آنا چاہیے جو عنوان سے ظاہر ہے۔ میرے تجربات مولویوں کے متعلق اسقدر وسیع ہیں کہ اگر چاہوں تو برسوں تک اس سلسلہ کو قایم رکھ سکتا ہوں، لیکن اس وقت میں اپنا بالکل حال کا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں، جو ادبی حیثیت سے بھی کم پر لطف نہیں ہے:۔

۴۔ جولائی کو میں ایک ...... جلسہ میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہا تھا۔ پرتاب گڈھ اسٹیشن پر پہونچ کر میں جس درجہ میں داخل ہوا، وہاں پہلے سے ایک ہندو خاتون کونہ میں بیٹھی ہوئی تھی جس سے ایک مرد (جو غالباً اس کا خوش نصیب شوہر ہوگا) باتیں کر رہا تھا۔

یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، بہت قبول صورت، عد درجہ مہذب، اور نہایت خوش ادا چیز تھی اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے آسکر وائلڈ کی زبان میں بالکل ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خد و خال کی کشمیریت، اسکی آنکھوں کی نشیلی کیفیت، اس کے لبوں کی میگونی، اس کے جسم کی لچیلی نزاکت یہ سب باتیں اسکی خوش سلیقگی، متانت و سنجیدگی کے ساتھ ملکر ایک ایسی فضا پیدا کر رہی تھیں کہ ہر شخص کو اس سے متاثر ہونا چاہیے اور غلط ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر کوئی اثر اس کا نہیں ہوا۔ لیکن ایسی صورتوں میں میرا فلسفہ صرف یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کرتا ہوں اور جب اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ میں انسان ہوں اور انسان ہی تک میری ... رسائی ہو سکتی ہے تو پھر اس نوع کی آسمانی مخلوق کی طرف توجہ نہیں کرتا اور اگر توجہ ہوتی بھی ہے تو بالکل نمایش کی حیثیت سے۔ میرے لئے موقعہ تھا کہ میں مقابل کی بنچ پر بالکل اس کے سامنے اور ...... اس کے بہت قریب ہوکر بیٹھ جاتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا صرف احترام نسوانی کے خیال سے کہ ممکن ہے اسے کچھ تکلیف ہو اور وہ آزادی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک مولانا مع اپنی تمام خصوصیات ظاہری کے داہنے ہاتھ میں مٹھائی کی ہانڈی، اور بائیں ہاتھ میں طہارت کا لوٹا لئے ہوئے (جام بدستے و سبوئے بدست) اندر داخل ہوئے اور بیک نگاہ گاڑی کا جائزہ لیکر بلا پس و پیش اپنا محاذ انہوں نے اسی جگہ قایم کر دیا جس کو میں نے قصداً چھوڑ دیا تھا۔

مجھے پہلے ہی ان کی وضع و صورت اور اس ناشایستہ حرکت سے یقین ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی مولانا ہے، لیکن اتفاق سے اسی درجہ میں ایک وکیل صاحب ان کے شناسا اور مل گئے اور انھوں نے مولانا کے لفظ سے خطاب کر کے اور بھی توثیق ثبت کر دی۔

مولانا کی عمر ۶۰ سے متجاوز ہوگی، لیکن صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور مصنوعی دانتوں کی آب و تاب، اور داڑھی کا خضاب جو ہر چند طاؤسی ہو گیا تھا، بتا رہا تھا کہ ہنوز زعم جوانی موجود ہے۔ تمام اعضا صحیح و سالم تھے، البتہ داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا کچھ ٹیڑھا اور مفلوج سا تھا، جو غالباً عمل جراحی کا نتیجہ تھا کیونکہ ہاتھ پر ایک بڑا نشان اسکا پایا جاتا تھا۔

مولانا کو اسقدر اپنے سے قریب دیکھکر اس خاتون نے آنچل کی اوٹ سے نیچے ہی نیچے بہت غور سے دیکھا اور نہایت ہی مخفی تبسم کے ساتھ اس نے شوہر کو اور شوہر نے اسے دیکھا اور دونوں پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

مولانا نے سب سے پہلے اپنی نشست کا انداز اس طرح قایم کیا کہ چہرہ، اسی طرف رہے اور اسکے ماتھے کی سرخ بندی جو بیر بہوٹی کی طرح دہک رہی تھی نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔ جب اپنے نشانہ و ہدف کی طرف سے مطمئن ہو گئے، تو انہوں نے چاہا کہ کسی طرح اس کے شوہر سے بے تکلفی پیدا کر کے

اپنے آپ پر رنگینیِ جمال کو حلال کرلیں، لیکن بدقسمتی سے وکیل صاحب جوان کے شناسا تھے الف لیلہ کے کم گو حجام سے کم باتونی نہ تھے اور انہوں نے جو مولانا سے گفتگو شروع کی تو پھر اس کا موقعہ ہی نہ دیا کہ وہ کسی طرف اور متوجہ ہوتے۔ ہر چند مولانا کی چین پیشانی، بے رخی، چہرہ کی عبوست اور کبھی کبھی اخبار لیکر اس کے مطالعہ کی کوشش کرنا صاف کہہ رہا تھا کہ وہ کسی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور انکی توجہ و مراقبہ کو صدمہ پہونچ رہا ہے لیکن وکیل صاحب جو اپنی پہنائی اور قد و قامت کے لحاظ سے ابوالہول (Sphinx) کی لحد ہوتے تھے، اس غریب مولانا کے آزار کو نہ سمجھ سکے اور برابر انکی یکسوئی خیال و نگاہ میں حارج رہے۔ لیکن باوصف اس کے مولانا نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے ہدف کو فراموش نہیں کیا اور اپنے کسی لمحہ عزیز کو انہوں نے بیکار جانے نہیں دیا۔ وہ باتیں کرتے تھے مگر نگاہ کا سمت بدلتا تھا، وہ وکیل صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے تھے مگر ہر جواب کے دوران میں ”اس سرمایۂ جاں“ کا مطالعہ ضرور کرلیتے تھے۔ وہ کوشش کرکے اپنے ہاتھ کی معیوب و کج انگلیوں کو چھپاتے تھے کہ مبادا وہ خاتون اس عیب کو دیکھ کر ان کو چاہنا چھوڑ دے، وہ آواز میں اک خاص قسم کا مصنوعی لوچ اور لحن پیدا کرکے گفتگو کرتے تھے، وہ اپنے قہقہہ میں ایک سیمیں جھنکار پیدا کرنیکی سعی فرماتے تھے (کانہ درھم رنّان) وہ اپنی خوشدلی، قابلیت، جاہ و ثروت، دولت و امارت کا ثبوت دینے کیلئے کبھی کبھی لطائف بھی کہتے فارسی کے اشعار بھی پڑھتے بڑے بڑے لوگوں کے نام اور ان سے اپنے تعلقات کو بھی ضمناً ظاہر کرتے جاتے تھے اور سب سے زیادہ زور اس پر دے رہے تھے کہ دنیا میں تعصب سے زیادہ بری کوئی چیز نہیں اور بھئی میرا مسلک تو یہ ہے کہ ”با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام“ ”رام رام“ کہہ کر جس وقت مولینا نے اس عورت کو دیکھا تو وہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی اور میں بھی ان دونوں کے دیکھنے دیکھ رہا تھا، اور آخر کار جب تینوں نگاہیں مرکز اجتماع سے ہٹیں تو اس طرح کہ تینوں نے علٰحدہ علٰحدہ ہر ایک کو دیکھا مگر یہ منظر پیدا کرتے ہوئے کہ مولانا اپنی جگہ مست تھے اور وہ خاتون محجوب۔ الغرض مولانا کے تمام لاعبانہ تیور اس کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ انہیں لوگوں میں تھے جو

ایں کار را بہ شیوۂ کار آگہاں کنند

جب مجھے پوری طرح یقین ہوگیا کہ مولانا کی خوش طبعی اپنی انتہائی طور پر بڑھ گئی ہے اور انہیں وثوق کامل ہوگیا کہ سارے درجہ میں صرف انہیں کی ذات ایسی ہے جس پر وہ خاتون مایل ہوسکتی (ہوسکتی کیا ہوہی گئی ہے) تو میں سنبھلا اور میں نے آگے بڑھکر باادب عرض کیا کہ اگر جناب اجازت دیں تو چند مسایل حضور سے دریافت کروں، جو اسی وقت میرے ذہن میں آئے ہیں۔ وہ یہ سنکر دفعۃً چونک پڑے اور بولے ”ہاں ہاں کہئے، ہم لوگ اسی لئے ہیں“ اور یہ کہکر پھر ایک خاص پندار کے ساتھ اس طرف دیکھ لیا۔ میں نے عرض کیا کہ ”مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ جناب تنہا عالم ہی نہیں ہیں بلکہ ادیب و شاعر بھی ہیں جیسا کہ آپکی شعر خوانی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر مجھے یہ دریافت کرنے کی جرأت کرنا چاہئے کہ کیا ”غنا رخانۂ ہمسایہ“ اور ”حسنِ رہگذرے“ سے فایدہ اٹھانے کا مسئلہ محض شاعرانہ ادعا ہے یا واقعی کوئی شرعی حقیقت اس میں پنہاں ہے“۔ یہ سنکر ان کے چہرے پر پہلے اک ہلکی سی سرخی عتاب کی اور پھر زردی حجاب کی نمودار ہوئی اور پہلو بدلکر بولے ”آپ کو مجھ سے مذاق کرنیکا کیا حق حاصل ہے“ میں نے کہا کہ ”بندہ نواز میں آپ سے مذاق کرسکتا ہوں، میں تو واقعی آپ سے سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں کیونکہ بسا اوقات سفر حضر میں ایسا ہوتا ہے کہ نگاہ مجبوراً اٹھ جاتی ہے اور میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے آخر کار کانپ اٹھتا ہوں کہ کہیں آخرت میں بازپرس نہ ہو“۔

مولانا نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے کہ "یہ صورت تو عذاب سے ڈرنے والوں کی نہیں ہوتی، داڑھی منڈی ہوئی، مونچھ بڑھی ہوئی اور پیشانی سجدے کے نشان سے خالی"

میں۔ "بجا ارشاد ہوا، میں اپنی صورت کا سب سے زیادہ شناسا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عذاب سے ڈرنے والی صورت کیسی ہوتی ہیں سامنے ہی موجود ہے، صراحت کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں تو آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں، اور آپ کو اس کا جواب بہ حیثیت عالم دین ہونے کے دینا چاہیے، عام اس سے کہ میری داڑھی منڈی ہوئی ہے یا خضاب سے رنگی ہوئی، میرے منھ میں دانت اصلی ہیں یا مصنوعی، میری انگلیاں سیدھی ہیں یا ٹیڑھی، میری عمر باپ ہونے کی ہے یا شوہر بننے کی"

یہ سننے کے بعد مولانا کا غصہ ضبط سے باہر ہوگیا اور آستینیں چڑھا کر بولے کہ "تم مجھ سے مسخرہ پن کرتے ہو۔ یاد رکھو میں بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش بھی ہوں۔"

میں نے عرض کیا کہ "میں یوں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں" اس تنقید کی تاب وہ کیا لا سکتے تھے۔ بے اختیارانہ طور پر اٹھ کھڑے ہوئے اور میں اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھا رہا، کیونکہ فنون سپہ گری کی رو سے اس وقت بہترین جواب حملے کے بعد ہی ہو سکتا تھا، لیکن وکیل صاحب نے اٹھ کر ان کو پکڑ لیا اور سارا درجہ مخاطب ہو کر ان کو سمجھانے لگا کہ جانے دیجئے آپ بزرگ ہیں اپنی طرف خیال کیجئے اور جنیں جاں" میں نے کھڑکی کی طرف رخ کر لیا اور جب چند منٹ کے بعد سکون ہوگیا تو میں پھر ان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ "مولانا اگر غصہ فرو ہوگیا ہو تو عرض کروں کہ میرے سوال کا جواب مرحمت ہو" یہ سنکر سارے درجہ والے تو خیر ہنس ہی پڑے تھے، وہ خاتون بھی مسکرانے لگی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

مولانا بولے کہ "خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑیئے میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا" میں نے کہا کہ "بات نہ کیجئے تو لکھ کر بتا دیجئے، کیونکہ اس مسئلہ کا جواب تو حسب المراد سوائے آپ کے اور کوئی دے ہی نہیں سکتا"

وکیل صاحب خوش مزاج انسان تھے، انہوں نے کہا کہ "مولانا کیا حرج ہے آپ کیوں نہیں بتا دیتے" مولانا بولے کہ "آپ نہیں سمجھتے یہ مجھے بیوقوف بناتے ہیں، ورنہ کیا یہ خود نہیں سمجھ سکتے کہ جو کچھ یہ پوچھ رہے ہیں محض شاعرانہ بات ہے اور شرع ....."

"نہیں مولانا واللہ ایسا نہیں ہے، مجھے اسوقت تک تو صرف گمان ہی تھا لیکن آج یقین ہوگیا کہ غنائے خانہ ہمسایہ جائز ہو یا ناجائز لیکن "حسن رہگذرے" سے لطف اٹھانا قطعاً جائز ہے"

مولانا۔ "یہ کیونکر آپ کو یقین ہوگیا"

میں۔ "ایک بنی اسرائیل کے نبی کے طرز عمل سے"

مولانا۔ "وہ کون نبی ہے"

میں۔ "آپ تو اس طرح دریافت کرتے ہیں گویا آپ علماء امت سے ہی نہیں اور آپ کا کوئی عمل مجھ ایسے عاصی کے لئے حجت ہو ہی نہیں سکتا"

یہ سنکر مولانا غصہ میں اٹھے اور لوٹا لیکر منھ بناتے ہوئے بیت الخلا چلے گئے۔ ایک اسٹیشن درمیان میں باقی تھا کہ وہ باہر آئے اور جب اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا کہ "تشبہ کسی قوم کے ساتھ ایک شخص کو اسی قوم میں داخل کر دیتا ہے، اس لئے اگر ہمارے ہاں کی عورتیں بھی

خ بیندی کا استعمال کریں تو وہ ہندو ہو جائیں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے"

مولانا "بیشک بیندی کا استعمال ہماری عورتوں کو نہ کرنا چاہیئے"

میں۔ "لیکن مولانا، یہ تو آپ نے دیکھا کہ ہے بڑی پیاری چیز اور خاصکر گورے رنگ پر تو قیامت ہی ہو جاتی ہے"

مولانا "حقیقت یہ ہے کہ تم ہو کوئی بڑے بدمعاش اور تمھیں وہ لوگ ہو جن کے لئے خدا نے عذاب دوام کی وعید نازل کی ہے"

اتنے میں پریاگ اسٹیشن آگیا جہاں مجھے اترنا تھا، مولانا بدستور بیٹھے رہے اور میں اتر پڑا لیکن نیچے پلیٹ فارم پر جاکر میں نے ان سے کہا کہ مولانا خدا کے لئے صرف ایک بات کان میں سن لیجئے۔ مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے کہنا مان لیا اور جب انہوں نے کھڑکی کے پاس آکر اپنے کان قریب کئے تو میں نے عرض کیا کہ "مولینا اس میں شک نہیں کہ مال اچھا ہے لیکن کچھ یاروں کا بھی حصہ ہونا چاہیئے"

یہ سنکر انہوں نے میری گوشمالی کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں الگ ہٹ گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔

اکاڈیمی کا دفتر پریاگ اسٹیشن سے صرف دو تین فرلانگ کا فصل رکھتا ہے، اور اس دس منٹ کے راستہ میں جس خیال نے میرے دماغ کو گھیر رکھا تھا وہ مولانا کا واقعہ نہ تھا بلکہ غالب کا یہ شعر تھا جسے میں گنگناتا جا رہا تھا:—

اگر بدل نہ خلد انچہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

تذکرۂ خندۂ گل

یا

ظریف شاعروں کا تذکرہ

جسمیں ۳۰۰ سو سے زاید اردو۔ فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطائف و ظرائف اور انتخابات کلام درج ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری میں اس کا رہنا ضروری ہے۔ تنہائی میں اس سے بہتر مونس، غمگینی میں اس سے زیادہ کامیاب ذریعۂ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات۔

قیمت مع محصولڈاک للعہ (چار روپیہ)

مینجر "نگار" لکھنؤ

ہماری فسانہ نگاری

اور

فسانۂ عجائب کے اجزائے ترکیبی

(بہ سلسلۂ سابق)

یہ مضمون بھی بہت پامال ہے اور طلسمی قصون مین اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ اسی صورت سے بہار دانش مین ملکزادہ کو مہر بانو کی خلخال مچھلی کے پیٹ سے ملی ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ منزل مقصود پر پہونچا ہے۔ اسطرح مصنف بہار دانش نے ملکزادہ کو ایک ہولناک جنگل مین پہونچا کر دیو ہیل سے کشتی کرائی ہے۔ اور اُسے سرحد عدم مین پہونچا کر پری نژاد کو رہائی دلائی ہے۔ وہان بجائے سفید دیو کے ایک وزیر زادہ کو ملکزادہ کا معین بنایا ہے۔

اسکے بعد انجمن آرا۔ اور جانعالم طوطے بنگئے ہین اور اُڑتے پھرے ہین۔ یہ وہی تبدیل قالب کا جادو ہے اور اس قسم کے واقعات مثنوی گلزار نسیم مین بھی موجود ہین

ملکہ مہر نگار ایک بادشاہ یا کسی رئیس کے قبضے مین پھنسی ہے اور اس سے معاہدہ ہوا ہے کہ برس دن تک اگر کوئی ڈھونڈھنے نہ آئے تو مین تیرے ساتھ شادی کرلون گی۔ یہ معاہدات ایسی سرگشتہ شاہزادیان اکثر کرلیتی تھین اس قسم کی بہت سی کہانیان مشہور ہین جو قریب قریب ہر شخص نے سنی ہونگی

اسکے بعد اُس طوطے کی بدولت جو اوّل مین جانعالم کا رفیق تھا مہر نگار اور انجمن آرا اور جانعالم کی ملاقات ہوئی ہے۔ چنانچہ اسی قسم کی امداد طوطے نے بہار دانش مین کی ہے اور آخر کار وہی ذریعۂ ملاقات باہمی بن گیا ہے۔ نل و دمن کی خط و کتابت بھی طوطے ہی کی بدولت ہوئی ہے

اسکے بعد پورے قصہ مین ایک جگہ سردی کی شدت کا بیان ہے اور ختم ہے۔ رہنوردان عشق کو ایسے جنگل ملتے ہی رہتے ہین جہان وہ امت موسیٰ کی طرح سرگردان اور پریشان پھرا کرتے ہین۔ ان جنگلون مین کہین گرمی زیادہ ہوتی ہے کہین سردی۔ یہ کوئی نئی بات نہین ہے

فسانۂ عجائب کے درمیان مین جو حکایات لائی گئی ہین انکا طرز انوار سہیلی اور بہار دانش دونون سے ملتا ہے۔ مگر اسکو بہار دانش ہی کا صحیح تتبع کیا جاسکتا ہے۔ کوئی خاص جدت نہین ہے۔ غرضکہ یہ لحاظ نفس قصہ اول سے آخر تک کوئی نئی بات نہین ہے

عبارت کے لحاظ سے اُس زمانہ کی کتابون مین فسانۂ عجائب کا ایک خاص درجہ ہے۔ اور بغیر رعایت کہا جاسکتا ہے کہ سرور نے جس رنگ سے اس فسانہ کو تمام کیا اس کا جواب نہین۔ پھر بھی دو تین باتین اس مین ایسی ہین جنسے عبارت کی زیب و زینت کو ایک داغ لگ گیا ہے

(۱) مصنف کو نثر مقفّٰے کرنیکی فکر ہر وقت دامنگیر رہتی ہے اور اسکی وجہ سے قوافی مین رطب یابس سبھی بھر دیتا ہے۔ کوئی بات حسب موقع اور حسب حال ہو یا نہو مگر کبھی کبھی قافیہ کی مجبوری کی وجہ سے لانا پڑتی ہے اور اس سے صاف تصنع اور بناوٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ رنگ فسانۂ عجائب کی عبارت مین اول سے آخر تک ہے مثال کے لیے چند فقرے چنکر پیش کرنا بیکار محض ہے کیونکہ یہ کوئی ایسی بات نہین ہے کہ اس کے لئے چند صفحات کافی ہون اسکے لئے ضرورت ہے کہ کتاب کو اول سے آخر تک پڑھا جائے ہلکی سی نظر فکر کے سامنے یہ سب کرشمے آجاتے ہین

(۲) بتانے والے بتاتے ہین کہ فسانۂ عجائب کی عبارت اُس زبان مین لکھی گئی ہے جو خاص بیگماتی یا شاہی زبان ہے حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ سرور نے گو اسکی کوشش کی ہے۔ مگر وہ متوسط فرقہ کی زبان سے آگے او سکو بڑھا نہین سکے۔ اور بعض جگہ تو اسدرجہ گر گئے ہین کہ اراذل واداني کی زبان کو بھی مات کر دیا ہے مطلق یہ خیال نہین رکھا کہ یہان کیا کہنا چاہیئے اور کیا کہتے ہین۔ وہ دکھاتے ہین کسی شخص کو فرقۂ اعلی مین سے مگر اوسکی گفتگو ایسی بیموقع اور خلاف امید ہوتی ہے کہ کتاب کا درجہ اس سے پست ہو جاتا ہے۔ مثلاً چند فقرے ملاحظہ فرمائیے۔ جانعالم ہزارون تمناؤن لاکھون آرزوؤن کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ وہان سرور اسکی خوبصورتی کے بیان مین رطب اللسان ہین۔ مگر ساتھ ہی ایک ایسے بچہ کے لئے جسے پیدا ہوئے ابھی دو گھنٹے بھی نہین گزرے یہ فقرے بھی لکھ جاتے ہین ”کاسہ سر سراسر شور جوانی زور شباب سے معمور۔ آنکھین جھپکانے والی دیدۂ غزال ختن کی شراب عشق کے نشے سے چکنا چور“ اسی طرح ایک جگہ جہان جادوگرنی بیان کرتی ہے کہ لے جانعالم مین مدتون سے تیری شیدا تھی وہان یہ بھی کہتی ہے کہ ”آج لات ومنات کی مدد سے تو میرے قابو مین آیا“ حالانکہ لات ومنات کو جادو سے کوئی تعلق اور واسطہ نہین۔ یا۔ اسی جادوگرنی سے جب شاہزادہ یہ کہتا ہے کہ مین تیرے پاس رہون تو کیونکر رہون مین محض انجمن آرا کے لئے گھر سے نکلا ہون حکومت کی مجھے پروا نہین ہے وہان شہزادہ کے منہ سے یہ فقرہ نکلا ہے۔ ”اللہ کی عنایت سے گھر کی حکومت چین کرنے کو کافی تھی“ یہ وہ فقرہ ہے کہ شاہزادہ تو شاہزادہ ایک رئیس بلکہ ایک متوسط درجہ کا آدمی بھی نہین کہہ سکتا۔ ایسے ہی جادوگرنی نے جسوقت شاہزادے کو تعویذ دیا ہے تو اُس سے کہا ہے کہ تو یہان اکیلا رہتا ہے ڈرتا ہوگا۔ تو سرور شاہزادے کی شجاعت کے تمام گذشتہ افسانے بھول جاتے ہین اور شہزادے کی زبان سے یہ زنانے چلے کہلا دیتے ہین ”کوئی ہمین مار ڈالے تو دن بھر مفت مٹی خراب رہے“ ایک تو یہ کہنا کہ کوئی ہمین مار ڈالے دوسرے یہ کہ دن بھر مٹی خراب ہے۔ کچھ ایسے ہین جنکی کوئی گنجائش ایسے محل پر نہین

جادوگرنی نے شہزادے کو ایک نقش سلیمانی دیا کہ اسے بازو پر باندھ لو اُسنے باندھ لیا۔ ایک روز جو اتفاق وقت سے اُسکو کھولکر دیکھا تو اُس کا یہ نقشہ تھا ”بست در بست کا نقش۔ ہر خانے مین اسمائے الٰہی معہ ترکیب وتاثیر تحریر تھے۔ دیکھتے دیکھتے خانۂ مطلب مین نظر پڑی۔ لکھا تھا کوئی شخص کسی ساحر کی قید مین اگر یہ اسم پڑھے نجات پاوے“ ہمارے نزدیک یہ بالکل نئی بات ہے کہ نقش مین یہ باتین درج ہون۔ اس طرح سے تو کوئی عمل کی کتاب ہوسکتی ہے نہ کہ نقش کی یہ ایک غلطی ہے۔ اور سخت غلطی ہے۔

ملکہ مہر نگار شاہزادے سے کہتی ہے۔ کہ میرے باپ نے ہرچند مجھسے شادی کو ارشاد کیا مینے بسبب مفارقت انکار کیا۔ اب یہ فقط آفت آسمانی و بلائے ناگہانی مجھپر ٹوٹ پڑی کہ بیک نگاہ عاشق کیا دیوانی ہو گئی“ جہانتک خیال کیا جاتا ہے آخری فقرے ایک شاہزادی اور وہ بھی

ناکتخدا کبھی نہین کہہ سکتی۔ اور پھر وہ بھی ایک ایسے اجنبی شخص سے جو صرف ایک رات رہا ہو

ملکہ مہر نگار اپنے باپ کی تعریف کرتی ہے۔ کہ "ہر چند ظل سبحانی عامل بے بدل ساحر بے مثل ہین علوی سفلی سب کچھ پڑھا لکھا" علوی سفلی کا پڑھنا لکھنا اس بات سے بھی زیادہ عجیب ہے کہ ظل اللہ عامل بھی ہین اور ساحر بھی۔ درویش متشرع مسلم بھی ہین اور جادوگر زندیق اور کافر بھی

جانعالم جب ملکہ مہر نگار سے رخصت ہوتا ہے تو ملکہ وہ فقرے فرماتی ہین جو بزرگ اپنے چھوٹون کے پردیس جانے کے وقت کہتے ہین "جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی صورت اللہ تمھارا مُنھ دکھائے"

جانعالم جب شہر زر نگار مین پہونچا ہے تو وہان کے بازار کی آب وتاب لکھتے ہوئے مصنف یہ مبالغہ آمیز فقرہ لکھتا ہے "کوئی شے کسی طرح کا اسباب ایسا نہ تھا کہ اس بازار مین نہ تھا مغرب مشرق کی اشیائے نادرہ کا ہر جا انبار تھا" یہ لکھکر اشیائے نادرہ کا بیان اس صورت سے کیا جاتا ہے۔ حلوائی۔ نان بائی۔ کنجڑے۔ قصائی۔ سقون کے کٹورون کی جھنکار میوہ فروشون کی پکار۔ دلالون کی بول چال وغیرہ وغیرہ مگر اشیاء نادرہ کا کوئی ذکر نہین ہے

شہزادہ جب انجمن آرا کے چھوڑانے اور جادوگر سے لڑنے کے لئے چلا ہے۔ اور انجمن آرا کی ماں کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ کوئی ایسا حسین شہزادہ انجمن آرا پر عاشق ہو کر آیا تھا اور وہ جادوگر سے لڑنے جاتا ہے۔ تو وہان مصنف لکھتا ہے "انجمن آرا کی ماں دردولت سرا پر چلی آئی" سمجھ مین نہین آتا کہ وہ بیگم کسقدر شریف اور عفت مآب تھی! اسکے بعد مصنف نے یہان وہ سمان دکھایا ہے کہ جیسے ایک "دا ماد کی متمول سسرال مین تواضع ہوتی ہے جسکا بظاہر کوئی محل نہین ہے۔

جادوگر کے قبضے سے چھوڑانے کے بعد انجمن آرا کی پہلی ملاقات جانعالم سے ہوئی۔ یا تو جانعالم وہ شریف اور ضابطہ عاشق تھا کہ فرشتے اُسکے دامن پر نماز پڑھتے تھے یا انجمن آرا کو دیکھتے ہی بالکل بدحواس ہو گیا وہان مصنف لکھتا ہے کہ "ہر چند ضبط کیا نہ ہو سکا۔ تھراتا۔ دم چڑھاتا۔ دوڑ دوڑ کر گرد پھرنے لگا لڑکھڑاہٹ سے گرنے لگا" اسپر طرہ یہ کہ انجمن آرا ایسی شریف۔ بھولی شرمیلی لڑکی جسکا کیرکٹر مصنف نے ہمیشہ بہت ہی شرمیلا دکھایا ہے۔ پہلی ہی ملاقات مین باوجود اس دیوانگی کے جان عالم پر عاشق ہو گئی۔ اسجگہ مجھے بیساختہ نصیبی کا یہ شعر یاد آتا ہے

زندہ در عشق چسان بود نصیبی مجنون ہیش ازین عشق مگر اینہمہ دشوار نبود

(اے خدا کیسے تھے وہ رقیق القلب۔ اور جلد باز عاشق۔ آج تو ایک کا بھی جلوہ نظر نہین آتا) مگر آگے چلکر مصنف کو تنبہ ہو جاتا ہے اور فوراً کہتا ہے کہ انجمن آرا نے یہ حرکتین دیکھکر جانعالم سے شرما کر سر جھکا کر کہا "سنبھلو صاحب کچھ پاس و لحاظ بھی کسی کا نہین" اللہ اکبر کیا عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال کوئی اس سے زیادہ مل سکتی ہے۔ کیا ایک شاہزادی کی یہ گفتگو بیباکانہ نہ تسلیم کیجائیگی

——— اسکے بعد بھی انجمن آرا سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُسنے شاہزادہ کا جو بے ہوش تھا۔ سر اپنے زانوے ناز نین پر رکھ لیا۔ اور جب جانعالم کو ہوش آیا تو اسنے زانو ہٹا لیا۔ مگر اس جگہ جانعالم نے جس رذالت اور شہدے پن کا ثبوت دیا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے یعنی "یہ کہہ کے آنکھین بند کر لین کہ پھر ہمین غش آیا تمنے زانو کیون سرکایا اسپر بی انجمن آرا چڑھ گئین کھسیا گئین۔ اور ایسا جواب دیا کہ

تڑاق سے کہا کیا خوب اتنا اختلاط میری چڑھ ہے۔ مین نے تیری محنت اور مشقت پر نظر کرکے یہ انسانیت کی حرکت کی تھی۔ تم چل نکلے۔ خدا جانے دل مین کیا سمجھے۔ اپنی راہ لیجئے۔ چلتا دہندا کیجئے واہ واہ نیکی برباد گنہ لازم"، انجمن آرا کے یہ بازاری فقرے۔ چل نکلے۔ چلتا دہندا کیجئے اپنی راہ لیجئے وغیرہ۔ ایسے ہین کہ کوئی شریف نوجوان لڑکی نہین کہہ سکتی۔ اسپر حضرت جانعالم کے یہ سوقیانہ جواب اور پھکڑ مذاق اور بھی سہونے مین سہاگے کا عالم دکھاتے ہین "چور کی داڑھی مین تنکا۔ تمھین اپنا عاشق کبھی نہ سمجھون گا۔ نہ معشوقون کے دفتر مین آپ کا چہرہ لکھونگا" خیر اسپر بھی اگر بس کرتے تو خیر۔ مگر سرور مرحوم انجمن آرا سے یہ بیسواؤن کے سے فقرے بھی کہلاتے ہین۔ "واہ چہ خوش بھلا دل تو بہلا لو۔ کچھ ہو یا نہو زبان کا مزا نکالو۔ یہ تو وہی مثل ہوئی "مان نہ مان مین ترا مہمان" عشق اور عاشقی کی باتین میری بلا جانے۔ رمز و کنایہ کسی اور سے جاکے کرو۔ اپنا چوچلا تہ کر رکھو۔ اپنی صورت تو غور سے دیکھو تمنے سنا نہین۔ حلوا خوردن را روے باید" انجمن آرا کی اس تقریر کو پڑھکر یہ معلوم ہوا کہ بھٹیاریان سرائے مین لڑ رہی ہین اسپر میان جانعالم کا یہ ارشاد "سبحان اللہ و بحمدہ۔ کیا کہنا۔ گویا صاف صاف انجمن آرا کی عفت پر حملہ ہے "وہ مین بیچارہ خستہ تن۔ غربت زدہ دور از وطن مہنت پن کہان سے لاؤن کیون کر ویسی صورت بناؤن۔ ایک منہ تا کر ایک دیتا ہے۔ کفر و اسلام مین بڑا فرق ہوتا ہے۔ تمھین ابھی تک موہن بھوگ کا ذائقہ نہین بھولا ہے دم تقریر زبان پر حلوا ہے"

مگر انجمن آرا بھی ایسی ڈہیٹ تھی کہ کسی طرح خاموش نہین ہوتی کہتی ہے "کہا چلو۔ صاحب ہو اقربان کیا تھا۔ اپنی چونچ بند کرو کٹی جلی کی ہنسی اپنے گھر جاکر کرو" یہ وہ باتین ہین جنھین سرور کے قلم نے ایک شاہزادی کے بجائے ایک بیسوا کا کیرکٹر دکھایا ہے اور جانعالم کو بجائے ایک شریف کے اچھا خاصہ لچا غنڈا بدمعاش بنا کر دکھایا

جسوقت انجمن آرا کو مانجھے بٹھایا گیا ہے یا منگنی کی گئی ہے وہان تو سرور کے قلم نے وہ انوکھی باتین لکھی ہین کہ کیا کہا جائے۔ اراذل اور ادانی کے یہان بھی وہ باتین نہین ہوتین۔ اول تو بیگمات مین ان رسوم کا دستور کہان ہے۔ اور اگر ہے تو اسقدر بیحیائی مان کے ملتجیانہ سوال کا ایسا بے باکانہ جواب انجمن آرا ہی کا کام تھا۔ سرور لکھتے ہین "اُسنے پہلے بیٹی کو گلے سے لگایا۔ پیار کیا۔ پھر کہا اسنو پیاری دنیا کے کارخانے مین یہ رسم ہے کہ بادشاہ کے گھر سے فقیر تک بیٹی کسی کی مان باپ پاس ہمیشہ نہین رہتی۔ اور غیرت دار کے گھر مین کی جوان۔ ہروقت رنج کا نشان خفت کا سامان ہے اور خدا و رسول کا حکم بھی یہی ہے۔ کہ جوان کو بٹھا نہ رکھو۔" بھلا خیال تو کیجئے کہ ایک مان اور مان بھی ملکہ۔ کیونکر یہ باتین اپنی بیٹی سے کہہ سکتی ہے۔ یہ باتین تو شریف غریب لوگون مین بھی نہین ہوتین۔ جن فقرون خط کھینچا گیا ہے اونکو بار بار پڑھئے اور سمجھئے

آگے چلکر مان اپنی بیٹی کو جتاتی ہے کہ ایک شخص تجھپر عاشق ہے۔ اور تجھسے زیادہ خوبصورت ہے۔ اسپر انجمن آرا رد کر کہتی ہے کہ صورت شکل کا کیا ذکر ہے" مان بیٹون مین یہ باتین کسقدر فطرت سے دور معلوم ہوتی ہین اور کسقدر بیحیائی ان مین کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔

اسی وقت انجمن آرا اپنی مان سے یہ بھی کہتی ہے "خدا جانے وہ کون ہے کہان سے آیا ہے اپنے منہ سے میان مٹھو شہزادہ بنا یا ہے۔ آپکی لونڈی ہون ہر صورت فرمانبردار ہون اگر کنوئین مین جھونک دو چاہ سے گر پڑون اُف نکرون مگر جو آپ اوسکی شکل پر ریجھ محنت و مشقت کو

سمجھ بوجھ یہ مقدمہ کیا چاہتی ہین تو مین راضی نہین»۔ اس عبارت کا ایک ایک فقرہ انجمن آرا کی بیباکی اور ناہمواری کا پتہ دیتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر آوارہ رہی ہے

اسپر ستم بالائے ستم یہ ہوتا ہے کہ مغلانیان وغیرہ سمجھاتی ہین۔ اونکی بھی فقرے وہی حماقت آمیز و دور از عقل ہوتے ہین جو فقرا ارذل مین رائج ہین ملاحظہ ہون «قربان جاؤن واری ماں باپ کی عدول حکمی خدا اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہے۔ تمھین انکار مناسب نہین۔ اور خدانخواستہ یہ کیا تمھارے دشمن ہین جو راہ چلتے کے حوالے کسی کے کہنے سُننے سے بے دیکھے بھالے کر دینگی»

رسم زمانہ کے موافق سرور نے شب عروسی کا سمان بھی دکھایا ہے مگر وہ حیا سوز منظر ہے کہ صاحبقران اور جان صاحب کے دیوانون مین نظر نہین آتا۔ مین اسپر کوئی تنقید کرنا نہین چاہتا صرف عبارت نقل کرتا ہون اور خط کھینچتا ہون

«خواہش کو اضطرار، حیا مانع کار، شرم برسر تکرار دونون کے دم چڑھ گئے تھے جنگ زرگری کا وزوریان کر رہے تھے۔ شہزادی موقع پر ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ بے بس آجاتی تھی تو چٹکیان لیتی تھی۔ گاہ کہتی تھی اتنا کوئی گھبراتا ہے دیکھو تو کون آتا ہے۔ کبھی خود اُٹھ کے دیکھتی بھالتی تھی کوئی دم یون ٹالتی تھی اسی موقع پر سرور نے فردوسی کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے

چنان پردہ آوردہ آوردہ بُرد — کہ دایہ ز حسرت پس پردہ مُرد

رشک و حسرت سے جگر صدف چاک ہوا دشمن کمبخت در پردہ ہلاک ہوا

تقاضائے سن، الھڑپنے کے دن اُسوقت دونون گھبرائے اور وہ کیفیت سب بھولی جب دامن سب مین چادر پلنگ پر شفق صبح پھولی۔ صبح ہوئی تو دولہا دولھن اُٹھے۔ اوس موقع پر سرور نے نہایت ہی رکیک الفاظ استعمال کئے ہین اور پھر لطف یہ کہ یہ الفاظ نہ صرف رکاکت پر مبنی ہین بلکہ اونمین وہی بازاریت اور متوسط بلکہ ادانی کی زندگی کا نمونہ پایا جاتا ہے

"نمود سحر ہوئی۔ عام شب کی خبر ہوئی۔ دم صبح ایک سرخرو۔ دوسرا ژولیدہ مو۔ حمام مین داخل ہوئی۔ جو جو محرم راز شریک نور دگداز تھین اُنھون نے رات کی باتون کے پتے رمز و کنائے مین دئے۔ سب نے قہقہہ مارا جیب رو برو نیچی اور تنبول آیا شرما کے سر جھکایا۔

آخری فقرے تو بالکل اُس رنگ مین رنگے ہین جو معمولی لوگون کے گھرونمین ہوتا ہے۔

جان عالم جب انجمن آرا کو لیکر رخصت ہوا تو پہلے مہرنگار کے شہر مین پہونچا تمام حشم و خدم۔ فوج و لشکر ساتھ تھی ایک جنگل مین قیام کیا۔ تب ملکہ کو خبر ہوئی۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے فوج کی فوج آئی اور ملکہ کو خبر نہوئی سبحان اللہ۔ پھر معلوم کرنے کے لئے عام عورتون کی طرح تماشا دیکھنے کوٹھے پر چڑھ گئی تب خبر ہوئی۔ کیا جان عالم استقبال نہ تھا۔ کہ خبر کرا دیتا اور مہرنگار کیسی امیرزادی تھی کہ کوٹھے پر سے عام لوگون کی طرح دیکھنے گئی۔ یہان کی عبارت یہ ہے

"بارہ دری سے نیچے اُتری پھر کہا خدا جانے یہ لشکر کہانسے آکر اترا ہے۔ بلکہ ہنسکر بھیلہ سہیر خواصون کے کندھون پر ہاتھ دھر کوٹھے پر چڑھی جان عالم مہرنگار کے مکان پر مع انجمن آرا آیا۔ دونو نوجوان شاہزادیون کی گفتگو ہوئی۔ مگر وہ گفتگو جو بالکل بےموقع ہے اور بازاری عورتون مین بھی شاید ایسی گفتگو نہوتی ہو"

"ملکہ آبدیدہ ہوکر بولی تمنے مجھے محجوب کیا۔ مین فقیر کی بیٹی تم شہزادے ہرچند شاہ وگدا دونون بندہ خدا ہین الا تمھارے قدم آنکھون پر رکھون تو بجا ہے۔ آپ کے آنے سے مجھے بڑا افتخار حاصل ہوا ہے۔ انجمن آرا بولی ہم نے خوب کیا رنڈی یہ جو چلے کی باتین بیگانہ وار نکرتی تو کیا ہوتا اے صاحب ہمارے تمھارے تو رشتہ ہمسری سررشتہ برابری ہے اور حساب کی راہ سے پہلے تو سلامتی سے تمھین ہو سرکار کا اُنس ہمین طلا ہے۔ پہلے مزا آپ نے چکھا ہے۔ جو بن لوٹا ہے"

واضح ہو کہ یہ وہ انجمن آرا ہے جسکا کیرکٹر ہمیشہ مصنف نے نہایت ہی شرمیلا دکھایا ہے اور مہر نگار کے مقابلے مین ہر جگہ اوسکو بھولا بھالا ثابت کیا ہے

ملکہ مہر نگار کا باپ جب بعد نکاح ملکہ کو رخصت کرتا ہے تو شاہزادے سے وہ باتین کرتا ہے جو بالکل چھوٹے لوگون مین ہوتی ہین ایک ایسے بادشاہ سے جو فقیر ہو گیا ہو یہ باتین اچھی نہین معلوم ہوتین۔ وہ کہتا ہے

"فقیر زادی کو کنیز عزیز جان کر نظر الطاف وکرم ہر دم رکھنا۔ یہ بھی خدمتگذاری مین قصور نکریگی اسے تمکو سونپا تمھین حافظ حقیقی کے سپرد کیا۔ لو خدا حافظ"۔

جب وزیرزادہ جانعالم کو تواسے سراپردۂ خاص مین لیگیا۔ اس جگہ مصنف لکھتا ہے۔ "جتنی جلیسین انیسین۔ مہ جبینین دونون شہزادیون کے ہمراہ تھین اسے دکھا فرمایا جس طرف تیری رغبت ہو دلوا دون۔ وہ نطفۂ حرام اور خیال مین تھا غش کرنیلگا"

چونکہ وزیرزادہ شاہزادے کا دخیل صحبت تھا۔ تو دونون شہزادیون نے ان عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ سے شاہزادہ کو سمجھایا۔ "ہر دم ایک شخص غیر اور جوان کو شریک صحبت خلا ملا رکھنا کیا مناسب ہے۔ اور آداب سلطنت سے بھی یہ امر بعید ہے۔ شیطان کو انسان دور نجانے۔ غیر تو غیر اپنے کا کیا اعتبار"۔

جب وزیرزادہ جانعالم کے قالب مین آگیا ہے۔ اور خیمہ مین آنے سے ملکہ کو کچھ شبہہ ہوا ہے تو اُسنے انجمن آرا سے وہ کلمے کہے جو عوام بھی نہین کہتے۔ "خدا خیر کرے آج بہت شگون بد ہوئے تھے صبح سے دہنی آنکھ پھڑکتی تھی راہ مین ہرنی اکیلی رستہ کاٹ میرا منہ تکتی تھی۔ اپنے سایہ سے بھڑکتی تھی خیمے مین اترتے وقت کسی نے چھینکا تھا۔ خواب متوحش نماز کے وقت دیکھا تھا"۔

وزیرزادہ بصورت شہزادہ جب ملکہ کے خیمہ مین پہونچا تو ملکہ نے پوچھا آج کہان آرام کروگے۔ ملکہ نے کہا یہین سو رہو۔ یہ بھی عجیب عامیانہ جملہ ہے جو ملکہ کی زبان سے نہین نکل سکتا۔

جب شاہزادہ جان عالم کو بصورت بوزنہ بادشاہ کے دربار مین لے چلے ہین تو ملکہ مہر نگار جھروکہ سے جھانک رہی تھی۔ اُسوقت ہزارون آدمیون کے مجمع مین وہ اُس جھروکے سے فرماتی ہین "ایکدم ٹھہر جائین اُسکی تقریر کی مشتاق ہون"۔ سوداگر نے ہاتھی روکا ملکہ نے کہا "اے مقرر بے زبان گم کردہ خانمان اگرچہ اب ہم کس لائق ہین۔ مگر تیری داستان ظلم وجور کے شایق ہین"۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا کوئی شاہزادی کوٹھے پر تماشا دیکھنے کے لئے بیٹھ سکتی ہے اور کیا اتنے مجمع مین اُسکو یہ کہنے کی جُرات ہو سکتی ہے۔ اور کیا اُسکی زبان سے یہ لفظ اچھے معلوم ہوتے ہین "کہ اب ہم کس لائق ہین"

جہان شاہزادہ جان عالم کا جسم معہ لشکر کے نصف پتھر کا ہو گیا ہے اور تمام لشکر مصیبت مین مبتلا ہے وہان مصنف کے یہ فقرے کسقدر برمحل معلوم ہوتے ہین "وہ رنڈیون کی زاری انجمن آرا کی بیقراری علی الخصوص ملکہ کے بیان سے زمین و آسمان کا نپتا تھا"

رنڈیون کا لفظ، اور ملکہ کا بین (بیان) کرنا علی الخصوص قابل داد ہین۔

جسوقت لشکر اس رنج و محن مین مبتلا ہوا ہے اتفاقاً ایک شاگرد ملکہ کے باپ کا پہونچا ہے اور وہ ملکہ کے خیمہ کے پاس آیا۔ وہان سرور ملکہ کی زبان سے یہ فقرے ادا کراتے ہین "بھائی اسوقت پردہ کہان کا" یہ فقرے بالکل معمولی لوگون کے ہین

پیر مرد ملکہ مہر نگار کے باپ کا کیرکٹر مصنف نے ہر جگہ یہ دکھایا ہے کہ وہ ایک مرد فقیر مہذب قانع آدمی ہین۔ مگر وہ جب جادوگرنی سے لڑنے گئے تو یہ سوقیانہ گفتگو کرنے لگے۔ ملاحظہ ہو

"اے ننگ فرقہ بنی آدم مردود عالم تجھے جوش شہوت و لولۂ مباشرت نے آمادہ قتل ہزارہا بندگان اللہ بے جرم و گناہ کیا مین مرگ عزیزان دیکھون مرنے سے ڈرون۔ بقول تیرے آج نہ موا کل مر جاؤنگا" ایسے ہی جب وہ جادوگرنی پر فتحیاب ہو چکا تو کہنے لگا۔ کہ "اسکا باپ شہنشاہ جادوان ہے کوئی دم مین ضرور آئے گا بکھیڑا مچ جائیگا" آخری فقرہ بالکل عوام کے رنگ مین رنگا ہوا ہے

اسیطرح اس مرد فقیر نے جادوگرنی کے باپ سے یہ گفتگو کی "جسکا خون زمین پر گرے گا۔ اسکا مظلمہ مواخذہ تیری بیٹی جو فاحشہ تھی اسکی گردن پر ہوگا ہم سمجھے تھے وہی ننگ خاندان تھی اب معلوم ہوا ایسون کے ویسے ہی ہوتے ہین تجھے سفید داڑھی کی شرم نہ آئی کہ وہ مرے تیرا کلنک کا ٹیکا مٹا" جو جو عامیانہ فقرے ہین وہ خود پکار رہے ہین مینے صرف خط کھینچ دیا ہے

جان عالم سیر دریا کے لئے جا رہا ہے۔ اور وہ ملکہ مہر نگار سے کہتا ہے "چلتی ہو" ملکہ کہتی ہے "آپکو اور لڑائی بھڑائی نیا ڈھکوسلا سوجھا" ایک شوہر پرست ملکہ کی شاہزادے سے یہ گفتگو۔ یا شاہزادے کی یہ عامیانہ گفتگو کہ چلتی ہو کسقدر نازیبا ہے

ملکہ مہر نگار ایک شاہزادے کے یہان کشتی شکستہ ہو کر پہونچی ہے اُسنے بہت تواضع اور خاطر کی ہے اور مستدعی ہوا ہے کہ ملکہ اس سے شادی کرے۔ جب بہت مُصر ہوا تو ملکہ نے یہ فقرے کہے۔ جو بیحد عامیانہ ہین۔ اور ہرگز ایک ایسی عقلمند جلیل القدر شاہزادی کی زبان سے اچھے نہین معلوم ہوتے "جو میری خوشی چاہے تو برس روز کی مہلت دے اس عرصہ مین اگر کوئی ڈوبا تر امیرے وارثون کا پتا ملا"

غرضکہ فسانہ عجائب اسی قسم کے۔ ناموزون فقرون۔ اور جملون سے بھری ہوئی ہے مصنف کو ایک جگہ بھی یہ خیال نہین رہتا کہ وہ کہان کا حال لکھ رہا ہے۔ اور کیسے جملے اُسکے قلم سے نکل رہے ہین۔ کن رسوم کا وہ ذکر کرتا ہے۔ اور کیا اُس کو ذکر کرنا چاہئے۔ غیر مہذب جملو نکا طوفان قدم قدم پر امنڈ رہا ہے یہانتک کہ وہ جادوگرنی اور شاہزادے کے حال مین یہ جملے بھی لکھ گئے ہین "یہ کہکے گردن مین ہاتھ ڈالدیا وہ قحبہ تو۔۔۔ بھوکے بیٹھی تھی لپٹ گئی۔ ناچار خاطر افگار اوس تیرہ بخت کا منہ کالا کرکے ہاتھ منہ دہو اُسکے ساتھ سو رہا۔ وہ چڑمرانی بدمست لیٹتے ہی جہنم واصل ہوئی" اسکے بعد ہم تیسرے جزو کی طرف توجہ کرتے ہین۔ جنمین بعض داستانون مین سرور نے نظم کو نثر کا جامہ پہنا دیا ہے اور میر حسن کی محنت کو خاک مین ملا کر خود اُسکے مالک بن بیٹھے ہین۔ چنانچہ جہان بے نظیر کے پیدا ہونے سے پہلے بادشاہ نے نجومیون سے دریافت کیا ہے وہان میر حسن نے یہ سمان دکھایا ہے

یہ سنکر وہ رمال طالع شناس
لگے کھینچنے زایچے بے قیاس
دھری تختی آگے لیا قرعہ ہاتھ
لگا دھیان اولاد کا اُس کے ساتھ
جو پھینکین تو شکلین گئین بیٹھ ہل
کئی شکل سے دل گیا اون کا کھل
جماعت نے رمال کی عرض کی
کہ ہے گھر مین امید کی کچھ خوشی
بیاض اپنی دیکھی جو اس رمل کی
تو ایک یک نقطہ ہے دو دو خوشی
زن و زوج کی شکل مین ہے فرح
بیاں کرنے وصل کا تو قدح
نجومی بھی کہنے لگے در جواب
کہ ہم نے بھی دیکھی ہے اپنی کتاب
نحوست کے دن سب گئے ہین نکل
عمل اپنا سب کرچکا ہے زحل
ستارے نے طالع کے بدلے ہین طور
خوشی کا کوئی دن مین آتا ہے دور
نظر کی جو تسدیس و تثلیث پر
تو دیکھا کہ ہے نیک سب کی نظر

کیا پنڈتون نے جو اپنا بچار
تو کچھ انگلیون پر کیا پھر شمار
جنم پترا شاہ کا دیکھکر
تلا اور برچھک یہ کرکے نظر
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا
چندرمان سا بالک ترے ہوئے گا
نکلتے ہین اب تو خوشی کے بچن
نہ ہو گر خوشی تو نہ ہون برہمن
مہاراج کے ہون گے مقصد شتاب
کہ آیا ہے اب پانچوان آفتاب
نصیبون نے کی آپ کے یاوری
کہ آئی ہے اب پانچوین مشتری
مقرر ترے چاہئے ہو پسر
کہ دیتی ہے یون اپنی پوتھی خبر
ولیکن مقدر مین کچھ اور ہی
کہ ہین اس بھلے مین برے طور بھی
یہ لڑکا تو ہوگا ولے کیا کہین
خطر ہے اسے بارھوین سال مین
نہ آوے یہ خورشید بالائے بام
بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مہ
رہے برج مین یہ مہ چاردہ
کہا سنکے شہ نے یہ اُنکے تئین
کھو جی کا خطرہ تو اسکو نہین
کہا جان کی سب طرح خیر ہے
مگر دشت غربت کی کچھ سیر ہے
کوئی اسپہ عاشق ہو جن و پری
کوئی اُسکی معشوق ہو استری
کچھ ایسا نکلتا ہے پوتھی مین اب
خرابی ہو اسپر کسی کے سبب

سرور نے اسی مین اپنی ضرورت کے موافق تراش خراش اور ردو بدل کرکے جان عالم کے پیدا ہونے کے وقت یون لکھا ہے۔

"نجومی۔ پنڈت۔ جفردان۔ حاضر ہوے بہت سوچ بچار کر برہمنون نے عرض کیا۔ مہاراج کا بول بالا۔ جاہ و حشم۔ مرتبہ دو بالا اعلیٰ رہے ہماری پوتھی کہتی ہے۔ بھگوان کی دیا سے شہزادے کا چندرمان بلی ہے۔ چھٹا سورج ہے جو گرہ ہے سو بھلی ہے دیگ نیگ کا مالک۔ دھرم مورت یہ بالک رہے"

اسی کے بعد جیسا کہ بدرمنیر مین نجومیون نے بینظیر کی آوارگی کا پتہ دیا ہے اسی طرح سرور نے جان عالم کی صحرانوردی کا مذکور کیا ہے "مگر پندرھوین برس مشتری بارھوین آئیگی سنیچر پاؤن پڑے گا" "گسیان کی کرپا سے جان کی کھیر ہے۔ بڑی بڑی ہرنی کی سیر ہے"

اسمین شک نہین کہ سرور نے اس داستان کو بہت بڑھاکر اور اپنے قصہ کیموافق بنا کر لکھا ہے مگر یہ سب خیالات مثنوی میرحسن ہی سے لئے گئے ہین۔ اگرچہ الفاظ مین رد و بدل کردیا گیا ہے۔ اور نثر کی آزادی نے اُن خیالات مین بھی اضافہ کردیا ہے مگر اصل ماخذ سے کسی طرح انکار نہین ہوسکتا۔ سرور لکھتے ہین۔

”ایک سمت درخت گنجان چشمہ ہاے آب روان دیکھکر جا بیٹھا“

میرحسن بھی اسی عالم مین جبکہ شاہزادہ بدرمنیر کے باغ مین پہونچا ہے لکھتے ہین

تھے اک طرف گنجان باہم درخت | کہ بیٹھے ہون جس طرح مشتاق سخت
لگا وان سے چھپ چھپ کے کرنے نظر | درختون سے جون ماہ ہو جلوہ گر

اسکے بعد مین دونون نے اپنے اپنے طرز پر اُس منظر کی الفاظ مین تصویر کھینچی ہے مگر جہان بےنظیر نے بدرمنیر کو۔ اور جان عالم نے ملکہ مہرنگار کو دیکھا ہے اور ایک خاص عالم طاری ہوا ہے اُسکے الفاظ بالکل مل گئے ہین۔ اور یقیناً اُسکے موجد میرحسن ہین۔ ملاحظہ ہو

سرور کہتے ہین ”یہ تو مدتون کا مسافت دیدہ مسافرت کشیدہ تھا۔ وہ زمین خجستہ اُنہین بہت پسند آئی“

میرحسن۔ ملی جنس کی اپنے جو اُسکو بو | لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو

یہ صدا جو اہتمام سواری آگے آگے کرتی تھین اونکے کان مین پڑی اور نگاہ جمال جان عالم سے لڑی

میرحسن کہتے ہین

جو دیکھے تو ہے اک جوان حسین | درختون کی ہے اوٹ مین مہ جبین
یہ چرچا جو پھیلا تو ظاہر ہوا | ہر اک حال سے اُس کے ماہر ہوا

سرور کہتے ہین۔ سب لڑکھڑا کر ٹھٹک گئین۔ کچھ سکتے کے عالم مین سہم کر جھجک گئین۔ کچھ بولین ان درختون سے چاند نے کھیت کیا ہے۔ کوئی بولی نہین ری سورج چھپتا ہے۔ کسی نے کہا غور سے دیکھو ماہ ہے۔ ایک جھانک کر بولی باللہ ہے۔ ایک نے غمزے سے کہا چاند نہین تو تارا ہے۔ دوسری جنکی بولی اچھال چھکا تو بڑی خام پارا ہے۔ ایک بولی سرو ہے یا چمن حسن کا شمشاد ہے۔ دوسری نے کہا تیری جان کی قسم پرستان کا پریزاد ہے۔ کوئی بولی غضب کا دلدار ہے کسی نے کہا دیوانیو چپ رہو خدا جانے کیا اسرار ہے۔ ایک نے خوب جھانک تاک کے کہا خدا جانے تم سب کے دیدون مین چربی کہان کی چھاگئی ہے یہ تو بھلا چنگا ہٹا کٹا مرد وا ہے

اب دیکھئے میرحسن بالکل یہی تصویر دکھاتے ہین اور معلوم ہوتا ہے کہ سوائے چند الفاظ کے سرور بھی کوئی فرق نہ دکھا سکے

یہ سن ایک سے ایک وان سب کی سب | پھرین برگ گل کی طرح غنچہ لب
جو دیکھین تو شعلہ سا روشن ہے کچھ | درختون کا روشن سا آنگن ہے کچھ
کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا | کسی نے کہا چاند ہے یان چھپا
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن | کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
لگی کہنے ماتھا کوئی اپنا کوٹ | ستارا پڑا ہے فلک پر سے ٹوٹ

ہوئی صبح سب اُٹھ گیا یہ حجاب — درختون مین نکلا ہے یہ آفتاب
کسی نے کہا دیکھیو اے بوا — کھڑا ہے کوئی صاف یہ مرد وا
کسی نے کہا یہ تو دلدار ہے — کسی نے کہا کچھ یہ اسرار ہے

اسکے بعد سرور لکھتے ہین

"سواری جو رکی، ملکہ نے پوچھا خیر ہے" سب نے ملکہ کو بتایا اور ملکہ آگے بڑھی۔ اسی کو میر حسن کہتے ہین

گئی بات یہ شاہزادی کے گوش — یہ سنتے ہی جاتا رہا اسکا ہوش
کہا مین تو دیکھون یہ کہکر اُٹھی — گیا سسناجی تو رہ کر اُٹھی
خواصون کے کاندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ — عجب اک ادا سے چلین ساتھ ساتھ
کچھ اک خوف سے ہول کھاتی ہوئی — دھڑک اپنے دل کی مٹاتی ہوئی
کئی ہمدمین تھین جو کچھ وہ بڑاہین — دعائین وہ پڑھ پڑھ کے آگے بڑہین

سرور کہتے ہین "دیکھا ایک جوان رشک مہ پیر کنعان رعنا سرو قامت سہی بالا جز حسن وخوبی کا دریکتا۔ کاسہ سر سے فر شاہی نمایان بادۂ حسن دلفریب سے معمور ہے۔ دماغ مین کشورستانی ہے۔ بھٹتی جوانی ہے" اس تعریف کو سرور نے بھی طول دیا ہے اور میر حسن نے بھی اور ان دونون داستانون مین خیالات کی یکرنگی ہے۔ الفاظ مین فرق ہے مگر بہت زیادہ فرق نہین۔ بلکہ بعض شعر خود فسانہ عجائب مین پورے پورے نقل کر دئے ہین جیسے کہ

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — جوانی کی راتین مرادون کے دن

آگے چلکر جو مہر نگار اور جان عالم کے وصل کا منظر دکھایا ہے وہ بھی قریب قریب ویسا ہی ہے جیسا کہ بینظیر اور بدر منیر کے ملنے کا حال میر حسن نے دکھایا ہے

باغ کی بہار کا عالم۔ اور جان عالم کے جانے کے بعد باغ کی ویرانی تقریباً وہی ہے جو میر حسن کے یہان ہے۔ اور اسی طرح مختلف داستانون (مثلاً بارات وغیرہ) کا حال میر حسن کا کھینچا ہوا نقشہ ہے۔ الغرض یہ ہے فسانہ عجائب کی اصل حقیقت جس نے اُسکو دنیا مین مشہور کر دیا ہے۔

"نقاد"

ایک شاعر کا انجام

مصنفۂ نیاز فتحپوری:۔ ایڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن و عشق جسمین تخئیل کی بلندی، زور تحریر، اسلوب بیان اور ندرت انشاء کے ایسے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہین جو ساحری کی حد تک پہنچتے ہین، جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف مین ظاہر کئے گئے ہین اسکا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ یہ فسانہ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے قیمت مع محصولڈاک ۱۲ر

مینجر نگار لکھنؤ

مشرقی مآثر

فلکیات و ریاضی مین!!

تاریخ عالم کے زرین اوراق اس امر پر شاہد ہین کہ دنیا کی اور قومون کے مقابلہ مین ہمارے اسلاف تجارتی امور مین بہت زیادہ ممتاز تھے، اُنکی تجارت کا سلسلہ تقریبًا دنیا کے ہر گوشہ تک پہونچا ہوا تھا میدان تجارت مین روئے زمین پر کوئی انکا حریف مقابل موجود نہ تھا، اس لئے جب اُنکے تجارتی کاروبار کا دائرہ زیادہ وسیع ہو گیا، تو اونکو اول، اول بہ تقاضائے ضرورت تجارتی حساب کے اصول و قواعد وضع کرنے کا احساس پیدا ہوا چنانچہ انھون نے سب سے پہلے اس فن کے مبادی اور اصول مقرر کئے، پھر رفتہ رفتہ مختلف زمانون مین مختلف ترقیان کین، سندات و دستاویزات، تحاویل مالیہ، شرکات، وصولات، حساب فائدہ وغیرہ قسم قسم کے تجارتی حسابات، قیاسات اور اوزان کے نظام کی تعین، ہندسی طریقون سے آراضی کی پیمائش اعداد لکھنے کی ایک مخصوص نوع کا استنباط گنتی کے ستینی نظام کی ایجاد یہ سب ہمارے اسلاف ہی کے ذہن و عقل، غور و فکر کے زندہ جاوید نتیجے ہین، نظام ستینی کے آثار قدیمہ تنک ہمارے بعض نظامات مین شایع ہین، مثلاً ۶۰ منٹ کا ایک گھنٹہ، ۶۰ سکنڈ کا ایک منٹ، ۳۶۰ درجہ کا ایک دائرہ، ۶۰ دقیقہ کا ایک درجہ، ۶۰ ثانیہ کا ایک دقیقہ، اس کے علاوہ اعداد صحیحہ اور بعض کسور بسیطہ کی وضع بھی انہی کی ذہنی طاقت کا خوشگوار ثمرہ ہے،

یہ تمام حسابات اور یہ تمام طریقہ ان خشتو نمین مدفون پائے گئے ہین جن کا ابھی ابھی مابین النہرین اکتشاف کیا گیا ہے۔ ماہرین حضریات کا بیان ہے کہ ان آثار قدیمہ کی تاریخ ۳۰۰۰ برس ق۔م ہے۔ سنہ ۱۸۹۴ء مین فرانسیسی وفد نے اسی اطراف مین ایک مدرسہ کی بناء کا سراغ لگایا تھا جسکی تاریخ بھی ۳۰۰۰ برس ق م بتائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدامت کے اس زمانہ مین ہمارے اسلاف تعلیم و تعلم کے مہذب طریقے سے بھی واقف تھے

ان خشتون مین غور کرنیکے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہین کہ، مسیح علیہ السلام سے تین ہزار برس قبل ہمارے اسلاف ۱-۶۰ کے مربع اعداد کو اس کے مکعبات، جذر مالی کو اچھی طرح جانتے تھے، اس لئے کہ ان اینٹون مین مربع اعداد مکعبات، اور ضرب تقسیم کی مکمل جداول موجود ہین، نسبت و تناسب، ہندسہ کے سلسلہ متصلہ، اور قوۃ ثانیہ کی طرف کمیۃ ثنائیہ کی ترقی وغیرہ کے اصول و مبادی سے بھی وہ لوگ بخوبی واقف تھے، ہندسہ مین انکی معلومات و معارف کا دائرہ البتہ محض بعض ہندسی اشکال جیسے مربع، مستطیل، مثلث، اور دائرہ تک محدود تھا لیکن ان کے معارف ہندسیہ تمامتر سامی تھے، ان کے ہندسی اور میکانیکی معارف کے متعلق سر ولیم ولکوکس نے تفصیل سے بحث کی ہے لیکن بخوف طوالت ہم اس تفصیل کو قلم انداز کرتے ہین،

علم الفلک مین ہمارے اسلاف کی معرفت کا سلسلہ اعتدال ربیعی کے زمانہ اور اسکی تعیین تک پہونچتا ہے۔ اس لئے کہ انھون نے اعتدال

ربیعی ہی سے اپنا سال شروع کیا، اور پہلے مہینہ کا نام ثور رکھا، اس سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگون نے اسوقت یہ تقویم بنائی تھی جب اعتدال ربیعی کے زمانہ مین آفتاب برج ثور کے اندر تھا یعنی اس تقویم کی تاریخ تقریبًا ... ۵ برس قبل مسیح ہے) اور انھون نے دائرہ بروج کو بارہ برجون پر تقسیم کیا۔ حرکاتِ سیارات کی تحقیقات کی، مختصر یہ کہ انھین نے سب سے پہلے علم الفلک کے مبادی اور اصول وضع کئے، اس کے نطاقِ معرفت کو وسیع کیا، اوقات و تاریخ، سنین و شہور معلوم کرنے کے لئے جنتری ایجاد کی، معرفت اوقات کے لئے دھوپ گھڑی کا استنباط کیا سال کے فصلون کی تحدید کی، نجوم کو مجامیع اور کوکبات پر تقسیم کیا، ان کے اوضاع اور ان کے اوقات طلوع و غروب کو معلوم کیا، الغرض فن ملاحت اور دریائی سفر کی سہولت کیلئے انھون نے اس فن کو غیر معمولی کاوشون سے بہت زیادہ منقح اور مہذب بنایا

ہم کو معلوم ہے کہ مصریون نے سنہ ۴۲۴۱ ق۔م مین ایک تقویم بنائی تھی، جسمین سب سے پہلے انھون نے سال کے بارہ مہینے، اور ہر مہینہ کے ۳۰ دن مقرر کئے تھے، اور پورے سال مین رسمی تہوار دن کیلئے پانچ دن کا اور اضافہ کرکے ۳۶۵ دن کا سال بنایا تھا۔ یہ تمام ایجادات ان کے نظام اعداد، ضبط حساب، دقت ارصاد، اور رسوخ معارف کی غیر معمولی ترقی پر دلالت کرتی ہین، ہمارے اسلاف نے ہندسہ بنا، معارف میکانکی مساحت عملی کے اندر جو کچھ ترقیان کین، وہ محتاج بیان نہین ہین، انھون نے دور دراز مسافتون کو طے کرنے کیلئے مستقیم خطوط بنائے، ارتفاع وانحدار کے فرق کی معرفت کیلئے مستوی سطحون کی دقیق طور پر تعیین کی، قدما کی اس قسم کی سب سے بڑی یادگار ہرم اکبر ہے، موجودہ زمانہ کے ماہرین فن نے اس ہرم کو دیکھا، اور فن کی حیثیت سے دیکھا، تو اسکی جوانب کی تعیین مین زیادہ سے زیادہ ۱ ½ سنٹیمٹر اور زوایا کی تحدید مین زیادہ سے زیادہ قوس دائرہ کے ۱۲ ثانیہ یا ۱/۲۷۰۰۰ زاویہ قائمہ کی غلطی نکال سکے،

الغرض مشرق مین جو کچھ ہونے کو تھا وہ ہوا۔ پھر یہ تمام علوم و فنون یونانیون کی طرف منتقل ہوگئے، اور انھون نے ایک راسخ علمی اصول اور منطقی نظریات پر انکی از سر نو ترتیب دی، اور ان مین بہت سے ایسے رجال اعلام اور فلاسفہ پیدا ہوئے جنکی نظیر قدیم یا جدید دنیا مین ملنی دشوار ہی نہین بلکہ قطعًا ناممکن ہے۔ افلاطون، ارسطوطالیس، ارخمیدس، اور اقلیدس جیسی بے نظیر اور باکمال ہستیان سرزمین یونان سے اٹھین جنھون نے بعض اقسام علوم مین کسی مستزید کیلئے کوئی مجال بحث باقی نہ چھوڑی، منطق و فلسفہ کی مملکت کے تو وہ اکیلے فرمان روا تھے، چنانچہ ان فنون مین وہ امام اول شمار کئے جاتے ہین،

عرب اور اسلام کے مآثر

عرب نے صدر اسلام مین جب میدان ترقی کے اندر قدم رکھا، تو فتح و ظفر ان کے ہم رکاب تھے جدھر وہ جاتے مظفر و منصور واپس آتے، چنانچہ تھوڑے ہی دنون مین اطراف و جوانب کے تمام ملوک و سلاطین ان کے زیر نگین ہوگئے اور دنیا کے بیشتر حصہ پر ان کا پرچم لہرانے لگا۔ فتوحات ملکی کا سلسلہ جب ختم ہوا۔ اور انکو کامل فراغت نصیب ہوئی تب وہ علوم و معارف کی طرف مائل ہوئے، اور فلکیات و ریاضی اور علوم طبیعی مین بہت سی یونانی کتابون کا ترجمہ لکھا، ہنود و اعجام کی بہتیری تصنیفات کے اقتباسات شائع کئے۔

عباسی خلفا نے اپنے زمانہ حکومت مین اس علمی حرکت اور فکری نہضت کی ہر ممکن وسائل سے تشجیع کی مختلف مذاہب اور مختلف اجناس کے فاضل علما کو ترجمہ اور تالیف کی خدمت پر مقرر کیا حتی کہ تھوڑی ہی مدت مین سنسکرت اور یونانی زبان کے تقریبًا تمام علوم کا عربی مین ترجمہ ہوگیا اور عربون نے ہندی رقوم مین جو مناسب اور عمدہ اعداد تھے، انکو مہذب بناکر اپنے رقوم مین داخل کیا۔ یہی وہ واقعات ہین جنکی وجہ سے

مغربیوں میں عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ عربوں نے علوم و فنون کو محض ناقلانہ حیثیت سے نقل کیا ہے۔ خود انکی ایجادات کا اسمیں کوئی سرمایہ نہیں لیکن مستشرقین کی تازہ بحثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے بہت سے جدید امور کا بھی استنباط کیا جو اس سے قبل بالکل غیر معلوم اور مجہول تھے، اس لئے اس موقعہ پر ہم عربوں کے صرف فلکیات اور ریاضی کے مشہور اور عام مآثر کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں، ناظرین غور سے پڑھیں اور اندازہ لگائیں کہ یورپ کے اس زعم باطل میں راستی و صداقت کا عنصر کہانتک مفقود ہے!!

علم الحساب میں، نظریات اعداد کے اندر عربوں نے بہت کم اضافہ کیا۔ موضوعات کی تبویب، اور ہندی رقوم کی تہذیب میں البتہ انہوں نے بہت کچھ کوشش کی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اعداد میں صفر کا اضافہ پہلے عربوں ہی نے کیا، اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے پہلے پہل صفر کو موجودہ غایت کے لئے استعمال کیا۔ فرنگیوں نے بھی اس عربی لفظ کو اس معنے میں اپنی زبان کے اندر نقل کیا ہے ——— اس لئے مرجح بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسر عشری کی علامت فاصلہ کو عربوں ہی نے سب سے پہلے وضع کیا تھا،

علم الجبر کے اصول و قوانین بھی عربوں ہی نے وضع کئے، اور قانونی و نظامی صورتوں سے علامات و اشارات جبریہ کا کام لیا۔ بعض اعداد کا غیر معروف قوانین و ضوابط سے استنباط کیا، علامہ خوارزمی نے سب سے پہلے موجودہ طرز پر معادلہ درجہ ثانیہ کی تحلیل کی، اور اس کے جذر کو مستخرج فرمایا۔ خوارزمی وہ پہلا شخص ہے، جس نے سب سے پہلے اس علم کا نام "علم الجبر و المقابلہ" رکھا، یورپ والوں نے اسی سے اس علم کو نقل کیا ہے۔

عربوں نے سلاسل اعداد یا انکے مجموعات سے بھی بحث کی، جبر و ہندسہ کے طریقوں سے بعض معادلات درجہ ثانیہ کی تحلیل پر بھی قادر ہوئے۔ اور انہی نے معادلات جبریہ کی تحلیل ایک بالکل جدید اور سہل اسلوب پر قایم کی، انہی نے یہ نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ دو مکعب عددوں کا مجموعہ مکعب عدد نہیں ہو سکتا۔ اس نظریہ کو انگریزی میں (Fermat) کہتے ہیں، اور انہی نے سب سے پہلے ہندسہ کے بعض قضایا اور عملیات کی تحلیل میں اسالیب جبریہ سے کام لیا۔ حقیقت میں عربوں کی یہ وہ قیمتی بحثیں ہیں جن پر شہرۂ آفاق ڈیکارٹ نے اپنے مباحث عالیہ کی تعمیر کھڑی کی۔ پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خود یونانیوں نے ہندسہ کا فن اتنا مکمل کر دیا تھا کہ اسمیں مزید حواشی کا اضافہ کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی اس لئے اس فن میں عرب کے مشاغل کا دائرہ محض وضع تمارین، اور بعض مشکل مسائل کی تحلیل تک محدود رہا۔

علم المثلثات اور علم الانساب میں عربوں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس لئے کہ انہی لوگوں نے سب سے پہلے مثلثات کے اکثر قضایا اور قوانین (مثلاً قانون تناسب جیوب، اور قوانین مثلثات کرویہ غیر قائمۃ الزاویہ وغیرہ) کا اکتشاف کیا۔ اور انہی لوگوں نے سب سے پہلے مثلثات کی اس نوع کی تحلیل کیلئے ایک عام قانون بنایا۔ اور انہی لوگوں نے سب سے پہلے قاطع اور اس کے امثال و نظائر کو معلوم کیا، اور انہی لوگوں نے سب سے پہلے مماس اور قاطع وغیرہ کی نظایر کے لئے جدولیں وضع کیں، اور انہیں لوگوں نے سب سے پہلے سطح کرہ پر اصول رسم کی حقیقت کا پتہ لگایا۔

عربوں کے فلکی مباحث بہت مشہور ہیں، انہوں نے چاند، سورج اور سیارات کی گردشوں کی تحقیقات کی، اور انکے اوقات کو ضبط کیا، بطلیموس کے جداول کی تنقیح کی، چاند کی حرکت میں بعض انواع خلل کا اکتشاف کیا۔ اور انہی لوگوں نے خلیفہ مامون کی فرمائش پر سب سے پہلے علمی اور قانونی طریقہ سے خط نصف النہار کے درجہ کا طول معلوم کیا۔ عربوں کی ذہن و عقل، غور و فکر، دانش و بصیرت کی غیر معمولی اہمیت کا اس سے تم کو اور صحیح اندازہ ہو سکیگا کہ تقریباً آٹھ سو برس پہلے جبکہ یورپ کی علمی دنیا پر جہل و نادانی کی کثیف گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، عربوں نے چند جگہ میں

آسمانی حالات کا مطالعہ کرنے کیلئے قائم کین اور ان جداول کی تصحیح کی جو حرکات قمر کے ساتھ مخصوص تھین، گردش زمین کا حال معلوم کیا، متعدد تجربات کے بعد انھی نے سب سے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے مختصر یہ کہ فلکیات مین عرب یونانیون سے زیادہ ممتاز ہین، اس لئے عربون نے اپنی خداداد لیاقت سے اس علم کو ایک استقرائی علم بنا دیا، انھون نے یونانیون کی طرح محض نظریات پر اکتفا نہین کی بلکہ نظریات کے ساتھ ساتھ عقلیات پر بھی کافی عبور حاصل کیا۔

بہر حال! فلکیات و ریاضی مین مشرق نے سب سے پہلے اپنی خدمات جلیلہ پیش کین، زمانہ قدیم مین اسنے سب سے پہلے ان علوم کے اصول و مبادی وضع کئے، اور پھر عصر متوسطہ مین جو ایک مظلم اور تاریک زمانہ گزرا ہے اس نے محض ان اصول و قواعد کے حفظ ہی پر کفایت نہ کی بلکہ اسمین بہت سے اہم ترین حقایق و معارف کا گران ارز اضافہ بھی کیا

ان تمام معروضات کا نتیجہ دوسرے لفظون مین یہ ہے کہ علوم و فنون کسی خاص جماعت یا فرد کی ملک نہین ہین بلکہ وہ، ہر قوم، ہر جماعت اور ہر فرد کی ایک مشترکہ ملکیت ہین، جو شخص اس کے حصول کے لئے جد و جہد سعی و کوشش کرتا ہے وہ اس دولت کو پاتا ہے۔ ہمارا موجودہ تمدن معارف علمیہ کا ایک خوشگوار ثمرہ ہے۔ اور چونکہ یہ معارف مطالب عمران اور مقتضیات حیاۃ پر پورے اترتے ہین، اس لئے اگر ہم غمار عمران مین خوض کرنا چاہتے ہین، تو ہمپر ضروری ہے کہ ہم علمی بحث و تفکیر کے اسالیب پر اپنے ناشتہ جدیدہ کو ضرور سکھین، اس لئے کہ علم ہی درحقیقت ثروۃ کی اصل و اساس ہے، اور امم و شعوب کی ترقی کا اصلی راز، مال اور مال پیدا کرنیوالے رجال ہی مین مضمر ہے،

"بدر اصلاحی"

کلیات و دواوین (اردو)

دیوان میر حسن دہلوی۔ نہایت درد انگیز کلام ہے۔۔۔۔ ۶؍

دیوان مردان صفی تصوف کا رنگ کوٹ کوٹ بھر دیا گیا ہے۔ ۵؍

کلیات مومن۔ معہ تصاویر و مثنویات۔۔۔۔۔۔۔ عہ

کلیات ظفر۔ ہر چہار جلد کامل دو جلد۔۔۔۔۔۔ عہ ۱۲؍

دیوان ناسخ۔ استعارات و تشبیہ مین انکا کلام اپنی آپ نظیر ہے۔۔۔ عہ

کلیات میر تقی میر۔ تعریف فضول ہے کل شعرائے ماضی و حال کے پیشوا مانے جاتے ہین۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عہ

کلیات سودا۔ ہجو گوئی کے بادشاہ اور قصیدہ کے استاد۔۔۔ عہ

کلیات نظیر اکبرآبادی۔ ہر رنگ مین فرد تھے۔۔۔۔ عہ

مسٹر رینالڈز کے انگریزی ناولون کے ترجمے

فسانہ الہ دین و لیلی: مشہور ناول سٹار آف منگریلیا کا ترجمہ رنگین داستانون کے ضمن مین بہشت و دوزخ کی سیر کرائی ہے پڑھکر دل دھڑک جاتا ہے۔ مترجمہ منشی امیر حسین صاحب تحصیلدار کاکوری قیمت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عہ ۱۲؍

فریب حسن۔ ناول فاسٹ کا اردو ترجمہ جس مین قصہ کے پیرایہ مین بدکرداریون کے زبون نتائج دکھائے گئے ہین۔۔۔۔۔۔ عہ ۱۲؍

ناول اسرار نیکرومنیسر کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ جسمین باعصمت اور حسین زمانہ لیڈیون کے دلی جذبات کا خاکہ زمانہ کی حیرت انگیز نیرنگیون اور انقلاب کی حیرت انگیز تصویر۔۔۔۔۔۔ عہ

(مینیجر نگار)

ایک سیّاح کی ڈائری

پہلا ورق

"لکھنؤ و لکھنویات"

سوچ سمجھ کر کام کرنے کا مفہوم ہم لوگوں میں عام طور پر یہی ہے کہ کبھی کوئی کام نہ کیا جائے۔ برخلاف اس کے مجھ پر یہ الزام قایم کیا جاتا ہو کہ پہلے کام شروع کر دیتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ:-

نہ ہو تو کیجئے کیا اور ہو تو کیونکر ہو!

اس زندگی میں سب سے پہلی آزادی تو مجھے اسوقت ملی جب میری بیوی نے انتقال کیا۔ صبح کو وہ رخصت ہوئیں، شام کو تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر سیدھا کلکتہ چلا گیا، اس لئے نہیں کہ انکی جدائی کا غم دور ہو جائے بلکہ اس حقیقت کی بنا پر کہ جب آدمی کے بیوی نہ ہو تو سوائے آوارہ پھرنے کے وہ آخر کر ہی کیا سکتا ہے۔ دوسری آزادی مجھے ایکسال کے بعد ملی جب میری دوسری شادی ہوئی — یہ پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ بعد عقد "وہ" ایام گرما بسر کرنے کو مری چلی جائینگی — اور میرے لئے قلب کی ایک خاص بیماری کی وجہ سے تمام پہاڑ "لن ترانی" ہو کر رہ گئے تھے — الغرض میں نے شمال کا رخ کیا اور سب سے پہلی روانہ ہونے والی گاڑی پر سوار ہو گیا۔ کامل ۱۹ گھنٹہ کے بعد صبح کو جو دفعۃً آنکھ کھلی تو کانپور کا اسٹیشن نظر آیا۔ میں یہاں اتر پڑا منزل مقصود سمجھکر نہیں، بلکہ محض اس خیال سے جسے "دفع دخل" کہتے ہیں۔ دن بھر کانپور کی خاک چھاننے کے بعد جب شام کو اسٹیشن پہونچا تو لکھنؤ جانے والی ریل تیار تھی اور مسافروں کے ہجوم سے تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، معلوم ہوا کہ آج محرم کی ۸ ہے اور یہ سب لوگ وہاں روشنی دیکھنے جا رہے ہیں۔ میں شمسی تاریخوں سے بھی بے خبر رہتا ہوں چہ جائیکہ قمری، اسوقت یہاں "محرم اور لکھنؤ" یہ دو نام سنکر بے اختیارانہ طور پر ایک ڈبہ میں داخل ہو گیا اور شام کو ۷ بجے اس سرزمین میں پہونچ گیا جو اپنی روایات کے لحاظ سے بجا طور پر "کربلائے ہند" کہلائی جا سکتی ہے۔

"یا حسین! واحسینا!!"

قبل اس سے کہ میں قیام لکھنؤ کے حالات قلمبند کروں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ میرے لئے یہاں کی زیارت کا یہ اولین شرف تھا اور میں نے جو خیالی تصویر یہاں کی اپنے دماغ میں کھینچ رکھی تھی اس کا تعلق یکسر "حسن و غنا" سے تھا یعنی میں سمجھتا تھا کہ لکھنؤ کا ذرہ ذرہ "معمورۂ جمال و موسیقی" ہے اور رات کی تاریکی میں یہاں بھی وہی نیرنگ حسن و عشق نظر آتا ہے جو کسی وقت عہد عباسیہ میں بغداد کے لئے مخصوص تھا یہاں کی نزاکت جسم و خیال کے واقعات، یہاں کی البیلی تہذیب معاشرت کی حکایات، میں نہیں کہہ سکتا کہ کب سے اور کیوں میرے دماغ میں گونج

رہے تھے، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ اسقدر کمسن سال ہیں کہ اگر انکی ابتدا "فسانۂ آزاد" کے زمانۂ تصنیف سے قرار دوں جب میں بہت کمسن تھا تو بجا ہوگا، ممکن ہے آج کوئی نقاد سرشار کے متعلق یہ حکم لگائے کہ اس نے اپنی تصانیف سے جو توہین لکھنؤ کے بلند معیار شرافت والوں کی کی ہے وہ غداری کی حد تک پہونچتی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ عنفوان شباب کی دیکھی ہوئی "حسن آرا" سے حریم ناز میں نہ سہی تو "تختۂ باند" پر ملنے کی خواہش ضرور دل میں پیدا ہوتی ہے

مجھے بالطبع موسیقی سے لگاؤ ہے اور جانعالم نے ٹھمری کی ایجاد سے محمد شاہ رنگیلے کے خیال کو جسقدر رنگین بنا دیا اسکا بھی معترف ہوں ہر چند اصول فن کے لحاظ سے لکھنؤ کو کسی نایک کے پیدا کرنیکا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن جو بانکپن یا (لکھنؤ کی زبان میں چوچلا) صرف آواز کے اتار چڑھاو اور "مینڈ مسک" سے انہوں نے پیدا کیا وہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ لکھنؤ کا گانا لکھنؤ سے باہر میں نے بارہا سنا، لیکن یہ تمنا ہمیشہ قائم رہی کہ وہیں کی فضا کی اگر کوئی خنک سی چاندنی رات اس کے لئے میسر آجائے تو کیا کہنا۔ اس لئے جس وقت میں لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہونچا تو میرا خیالی لکھنؤ، میرے دل و دماغ میں کلوروفارم کی طرح بسا ہوا تھا اور ہر چند یہ معلوم کرکے کہ یہاں آج کل محرم ہے تھوڑی سی کلفت ہوئی، مگر پھر اس خیال سے کہ یہاں کا یہ زمانہ بھی خاص چیز ہے میں نے اپنے اوپر سیاحت کی تمام مسرتیں طاری کرکے قیام کا ارادہ کرہی لیا

میں جس حصہ ملک کا رہنے والا ہوں، وہاں محرم کا وجود کوئی معنے نہیں رکھتا، نہ وہاں مجالس مرثیہ کا قیام ہوتا ہے، نہ بزم عزا آراستہ کیجاتی ہے۔ بلکہ کہیں کہیں گھروں میں "ذکر الشہادتین" کے قسم کی کتابیں پڑھکر "یادگار شہدائے کربلا" صرف دلمیں قائم کرلیجاتی ہے، اسلئے میرے لئے لکھنؤ کی شام کا یہ منظر کہ ہر شخص نہایت شوق و مسرت کے عالم میں پوری سج دھج کے ساتھ شاہ نجف چلا جارہا ہے اور وہاں ہزاروں رنگین برقی قمقموں کی روشنی میں اس طرح پر تکلف دعوتیں ہو رہی ہیں جیسے واجد علیشاہ کی سالگرہ منائی جارہی ہو، بالکل ناقابل فہم معمہ تھا۔ شاہ نجف سے لیکر حسین آباد تک تماشائیوں کا ہجوم اور امامباڑہ کا دلہن کیطرح سجا ہوا ہونا لبریز حوض میں فواروں کا جاری ہونا اور انکا ندی کے نکاس سے قوس قزح کی سی کیفیت پیدا کرنا ایک ایسا منظر تھا جس کو دیکھکر ایک شخص بیساختہ کہہ سکتا ہے کہ

این خانہ بدیں خوبی آتشکدہ بایستے

لکھنؤ کے محرم کے لئے یہ میرا پہلا جذبۂ شکرگذاری تھا کہ میں یہاں کی فراوانی مسرت میں گھر اور نئی بیوی کی جدائی کو بھی تھوڑی دیر کیلئے بھول گیا

۹ محرم کا سارا دن میں نے مجالس عزا میں شریک ہوکر بسر کیا یہ امر افسوسناک ہے کہ سوزخوانی کا رواج یہاں سے تقریباً اٹھ گیا ہے یعنی تنہا وہ چیز جو ایک صاحب ذوق کو ان محافل کی شرکت پر مجبور کرسکتی ہے وہی مفقود ہو گئی ہے۔ موجودہ مجالس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن میں صرف مرثیے تحت اللفظ پڑھے جاتے ہیں اور دوسری وہ جنمیں "حدیث خوانی" ہوتی ہے، اول قسم کی محافل کا مقصود زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ مرثیہ گو اپنی شاعری، اپنی مرثیہ گوئی اور اپنی حرکات رقصیہ کی داد لے اور دوسری قسم کی مجلس صرف فن خطابت کی تکمیل کی نمائش ہوتی ہے، لیکن میرے نزدیک دونوں نامکمل ہیں۔ اول الذکر میں شاعری کا جہانتک تعلق ہے وہ ہر چند لکھنوی ذوق کے لحاظ سے بالکل مکمل چیز ہوتی ہے لیکن صحت روایات اور جذبات حماست کے اعتبار سے سارا مرثیہ "غیر معصوم لٹریچر" کی حیثیت رکھتا ہے اور شہادت حسین جس انداز سے اظہار الم کیا جاتا ہے وہ اہل بیت سے تو کسی طرح منسوب نہیں کیا جاسکتا، ممکن ہے کہ جانعالم کے مٹیابرج جاتے ہوئے ان کے پسماندگان نے اس طرح کا شور و شیون کیا ہو۔ رہا پڑھنے کا انداز

سو ممکن ہے کہ وہ کالکادین، بندادین کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص فن کی چیز ہو، لیکن میں نے تو بجائے حرکات شجاعت و تہور کے اک قسم کی "نسائیت" ہی ان میں پائی۔

مجالس حدیث خوانی میں کوئی "مجتہد یا مولانا" جسے یہاں کی اصطلاح میں "قبلہ و کعبہ" کہتے ہیں، ممبر پہ جاکر سب سے پہلے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھواتے ہیں، پھر کلام مجید کی کوئی آیت پڑھکر اس کے رموز و نکات بیان کئے جاتے ہیں، احادیث کی تلاوت کرکے انکا مفہوم بتایا جاتا ہے اور اخیر میں تمام وعظ کو کھینچ تان کر فضیلت حسین و شہادت حسین سے متعلق کرکے زور زور سے رانوں پر ہاتھ مار کر چیختے ہیں، روتے ہیں اور سننے والے بھی آنکھوں پر رومال رکھکر روتے وقت اس طرح بدن کو جنبش دیتے ہیں جیسے کوئی انہیں گدگدا رہا ہے

یہاں کے ایک خاص واعظ کا بیان بھی میں نے سنا، ان کی تاویلات بیجا، انکے دلایل رکیک، انکی توجیہات سخیف، ان کے وساوس روائی اور تحریفات تاریخی کو سنکر حیران رہگیا کہ اہل علم میں یہ بھی ہوا کرتا ہے

دریافت سے معلوم ہوا کہ تقریباً پورا سال یہاں اسی نوع کی مجالس ماتم و گریہ وزاری میں بسر ہوتا ہے، حتیٰ کہ مصیبت دور کرنے اور خوشی طلب کرنے کا بھی یہی ایک طریق ہے۔ نسائی طبقہ میں جو "شبستان ماتم" قایم کی جاتی ہے وہ بیشک ایک لطیف پہلو بھی رکھتی ہے، کیونکہ اول تو یونہی کسی عورت کا "مخل ماتم" بنجانا کم قیامت نہیں ہے، چہ جائیکہ ایک خاص سوگوار لحن سے اشعار پڑھنا اور پھر ساری محفل کا نازک ہاتھوں سے نازک سینوں پر "خانہ برانداز" قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر ایک "آغوش طلب" انداز سے گرجانا ——— حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ایسی صورت میں "شہادت" کو زیادہ وزنی قرار دے یا اس "خوں بہا" کو

دس کی صبح کو چوک سے ضریح مبارک (میرے نزدیک سکار در ترجمہ زری کافی ہے) کا جلوس نکلنے والا تھا۔ صحیح وقت معلوم نہ تھا اسلئے فرط اضطراب نے بیٹھنے نہ دیا اور جلدی وہاں پہونچ گیا۔ لکھنو کا چوک اپنی تنگی، مرطوب فضا اور غیر صالح ماحول کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی معیوب حصہ شہر کیوں نہ ہو، لیکن حقیقی لکھنو اسی حصۂ آبادی کا نام ہے اور قدیم لکھنوی معاشرت کے نمونے صرف یہیں دیکھے جاسکتے ہیں، باوجود سڑک کی تنگی و تاریکی کے یہاں ایک خاص قسم کی عطریت محسوس ہوتی ہے اور نبض میں اک عجیب قسم کا ہیجان پیدا ہوجاتا ہے

یہاں کے اکثر بالاخانے اس مخصوص طبقہ سے آباد ہیں کہ اگر اس عنصر کو انسانی آبادی سے علحدہ کردیا جائے تو دنیا میں سوائے مسجد وں کے اور کچھ نہ رہ جائے۔ معلوم نہیں اڈیٹر ہمت اسے "حسن رہگذر" میں شامل کرتا ہے یا نہیں لیکن چونکہ میں وجوب کا قایل ہوں اس لئے اکبر کے اس فلسفہ پہ کاربند ہوکر کہ

اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

بلا تشبیہ "ارنی گوئے کوہ طور" کی طرح نگاہ شوق سے ان پردوں میں رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوا جو اسوقت بالاخانے پر پڑے تھے، آگے بڑھا اور ایک ایسے مقام پر پہونچ گیا جہاں سے ایک سڑک مغرب کی جانب جاتی ہے۔

میں تھک کر یا ہجوم سے گھبرا کر سڑک کے کنارے کھڑا ہوگیا اور تھوڑی دیر کے بعد جو دفعۃً آنکھ اٹھی تو دیکھتا کیا ہوں کہ غالب کی پوری مثنوی "چراغ دیر" مجسم سامنے موجود ہے

سامنے بالاخانے پر ایک تنی ہوئی سفید چادر کی اوٹ سے دو ساحر مگر حزین و سوگوار آنکھوں نے مجھے ایک بار غلط انداز نظر سے دیکھا اور میرا آسمان و زمین سب کچھ اپنے ساتھ لے گئیں، لکھنؤ کا یہ پہلا اور آخری بدیعۂ جمال تھا جس نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو نظیری کے ساتھ اسکے محبوب نے کیا تھا اور جس پر وہ بے اختیار ہو کر کہہ اٹھا تھا کہ :۔

ازکف نمی دہد دل آساں ربودہ را

دیدیم زور بازوئے ناآزمودہ را

معلوم ہوا کہ باندازۂ جمال و نزاکت وہ غنا و موسیقی کی بھی مالک ہے اور آنکھوں سے زیادہ افسوں اس کی آواز میں ہے۔ اس خبر نے میرے حواس میں اور زیادہ تعطل کی سی کیفیت پیدا کر دی، اور میں کھڑا ہوا اس عالم اضطرار میں سوچ رہا تھا کہ کوئی اہل ملے تو لکھنوی شاعری کے انداز میں اس سے یہ تو پوچھ لوں کہ میرے دل کا مزار کس کی سایۂ دیوار میں بن رہا ہے کہ اتفاق سے ایک ضعیف عورت جس کے ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح بھی تھی، میرے پاس سے گذری اور میری "چشم نگراں" کو دیکھ کر بولی کہ "میاں آج کے دن تو اوپر نہ دیکھو"۔ میں نے بادب عرض کیا کہ بڑی بی اُن سے بھی تو کہو کہ آج کے دن نیچے نہ دیکھیں"۔ اسنے غضب آلود چتون سے مجھے دیکھنا شروع کیا، لیکن زری کے ساتھ جو ہجوم بڑھتا آ رہا تھا اس نے مجھے بچا لیا اور پھر خبر نہیں کہ وہ کہاں غائب ہو گئی

زری کا جلوس کیا تھا؟ اس کا بیان اتنا ہی مہمل ہو گا جتنا اس کا اطناب، چند ہاتھی، چند اونٹ، کچھ جھنڈیاں، متعدد بینڈ، دو چار تعزیے اور ایک گھوڑا مع خون آلود ساز و یراق کے۔ یہ تھی زری اور اسکی جملہ کائنات۔ میں ان چیزوں کے فلسفہ سے واقف نہیں جس کو ضرورت ہو وہ اسی تاریخ کا ہمدم دیکھے جس میں جناب قمی جرنلسٹ نے ناڑہ سے لیکر نگاڑہ (نقارہ) تک ہر ایک بابت حد درجہ بالغ نظری سے کام لے کر تحقیق حد کے دریا بہا دیئے ہیں

یہاں صبح سے دوپہر تک شیعوں کے تعزئے نکلتے ہیں اور دوپہر کے بعد سے سنّیوں کے۔ چونکہ دل و دماغ اک خاص خیال سے متاثر تھا اس لئے زری دیکھنے کے بعد میں نے آج کے تماشہ کو ختم کیا اور کربلا بھی نہ جا سکا، حالانکہ یہاں کا خونین ماتم، یہاں کی واویلا دیکھنے کی چیز ہے۔

اس کے بعد میں نے چند دن یہاں کے اکابر سے ملنے اور یہاں کے مجالس شعر و سخن کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اور قیام کیا۔ میں کس کس سے ملا، ان کو کیسا پایا اور انکی شاعری کے متعلق کیا رائے قایم کی۔ اسکی تفصیل آپ آیندہ ملاحظہ فرمائیں گے

ایک سیّاح

ہمیشہ یاد رکھئے

(۱) خط و کتابت میں نمبر خریداری درج کرنا (۲) جوابی امور کیلئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا (۳) ۲۰ تک پرچہ نہ پہونچے کی اطلاع کرنا (۴) منی آرڈر کے کوپن میں نمبر خریداری درج کرنا۔ (مینیجر نگار لکھنؤ)

منطوقات ناطق

یا

جناب ابو العلاء ناطق لکھنوی کے الہامات شعری

بلکہ

ناطقہ سر بگریبان ہی اسے کیا کہئے

"آپ نے اگست کے ملاحظات مین لکھنوی و غیر لکھنوی نزاع کو محو کرنے کے لئے جو مصلحانہ انداز اختیار کیا ہے وہ آپ کی نیت کے لحاظ سے یقیناً بہت مبارک چیز ہے، لیکن میری سمجھ مین نہین آتا کہ اس طرح آپ اُس احساس کو کیونکر مٹا سکین گے جو اس وقت ساری دنیا مین لکھنوی شاعری کے بے کیف و بے مزہ ہونے کے متعلق قائم ہو گیا ہے اور یہی احساس اصل بنیاد تمام جھگڑون کی ہے

آپ نے جو اشعار بعض شعراء حال لکھنؤ کے درج کئے ہین، وہ یقیناً بُرے نہین ہین لیکن تعجب ہے کہ آپ نے مبصر مین دوسرون کے شایع شدہ اشعار تو انتخاب کر لئے اور خود مدیر مبصر کی غزل کو چھوڑ دیا مین نے ان کی ایک نہایت ہی معرکۃ الآرا غزل پر ہلکی سی تنقید کی ہے جو پیش کرتا ہون۔ اگر آپ کی مصلحانہ روش اجازت دے، تو شایع فرما کر ممنون کیجئے، اس سے مقصود صرف یہ سوال ہے کہ کیا لکھنوی شعراء کوئی ایسی ہی درخشان مثال "حسنِ شاعری" کی غیر لکھنوی شاعرون مین پیش کر سکتے ہین ؟۔ اگر نہین تو پھر اُس فرقِ مراتب کو مٹانے والے آپ کون ہین جسے خود خدا نے تخلیق ذہن و دماغ کے وقت ازل ہی مین پیدا کر دیا تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اسباب اختلاف مین سے اک نہایت ہی ضعیف سبب کو سامنے رکھ کر پند و نصیحت شروع کر دی حالانکہ حضرات لکھنؤ کا کھلوگون سے عناد رکھنا اس بنا پر نہین ہے کہ ہم کیون اُن سے اچھا شعر کہتے ہین بلکہ زیادہ تر اس لئے ہے کہ ہم کیون آپ آپ کو "مومن" کہتے ہین پھر جب ہم ان کی نگاہ مین تو مومن ہی نہین تو آپ کا "کل مومن اخوۃ" کا درس دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ بہر حال مین آپ تنقید پیش کرتا ہون"

ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ دنیا مین شاعر ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی گناہ ممکن نہین لیکن ان کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہ ہوا کہ ایک گناہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص باوجود شاعر نہ ہونے اپنے آپ کو شاعر سمجھے اور بہ جبر اپنے آپکو

شاعر تسلیم کرائے۔

پھر اس جرم کی جبر تناکی اسی جگہ ختم نہین ہوجاتی، بلکہ اس سے آگے اور بڑھتی ہے یعنی یہ کہ ایسا شاعر کبھی کبھی اپنے آپ کو استاد بھی کہتا ہے شاگردونکی ایک جماعت بھی پیدا کرلیتا ہے ادبی تخریب کو اصلاح، اور فساد کو گون کے نام سے موسوم کرکے مشاعرون مین "باندازِ مغانہ" غزلین پڑھتا ہے، اور رسایل مین "بہ شیوۂ حکیمانہ" اُن کی اشاعت بھی چاہتا ہے ——— شیوہ واندازِ اینان را نگر!!

ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی اللہ کا بندہ تمام ایسے متشاعرین کے حالات مرتب کرے، اس لئے مین یہ مضمون ابھی سے بطور بنیاد (تقریباً) رمقدمہ و تمہید تحریر کئے دیتا ہون اور اُس سے بزور سفارش کرتا ہون کہ جب کبھی وہ اس مفید تالیف کی طرف توجہ کرے تو جناب ابوالعلاء الناطق لکھنوی کو نہ بھول جائے، کیونکہ میرے نزدیک جو مرتبہ میر کو شعراء مین حاصل ہے، وہی جناب ناطق کو غیر شاعر شاعرون کی جماعت مین حاصل ہے بلکہ اگر جناب ناطق اجازت دین تو انھین کے اسم گرامی و تخلص سامی سے اس کو معنون کردے

بحمداللہ مجھے جناب ناطق اور ہر ایسے شخص سے جو اپنے آپ کو شاعر کہتا ہے براہ راست ذاتی شناسائی نہین ہے، لیکن چونکہ رسایل و جرائد کے مطالعہ کا مجھے مرض ہے اور اس سلسلہ مین رطب و یابس سبھی کچھ نگاہ سے گزر جاتا ہے اس لئے بغیر کسی سعی و کاوش کے مجھے معلوم ہے کہ جناب ناطق لکھنؤ کے ایک رسالہ مبصر کے مدیر اعزازی ہین اور گاہ گاہے اپنے تبرکات شاعری دوسرے رسالون کو بھی تقسیم فرما دیتے ہین۔ چنانچہ حال ہی مین لکھنؤ کا ایک دوسرا رسالہ "خضر راہ" ناطق صاحب کے عطا کردہ "جرعۂ آب حیات" کو لیکر موصول ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جناب ناطق کے "منطوقات" کی داد دینا اس دنیا کے اندر تو کسی سے ممکن نہین، عالم برزخ مین اس کا امکان ہو تو ہو

غزل مین تغزل سے ایسی صاف بیزاری، کیفیت عشق و محبت سے ایسا مکمل گریز، حلاوت و شیرینی سے ایسا سخت تنفر، اور باوجود بامعنی الفاظ فراہم کرنے کے ہر ہر شعر کو صد گونہ اہمال کی صورت مین پیش کرنا۔ واقعہ یہ ہے کہ

"این سعادت بزور بازو نیست"

لوگ کہتے ہین غزل نام ہے صرف حکایت محبت کا، جذبات عشق کی صحیح ترجمانی کا، سادگی بیان کا بیساختگی کا اور ہر اُس کیفیت کے بیان کا جو مطالعۂ حسن سے پیدا ہوتی ہے حالانکہ اس وقت کا "شاعر اعظم"، "استاذالامم" ادامہ اللہ بالشعر والطب والحکم" اس امر کا اعلان کر رہا ہے کہ غزل نام ہے صرف حکایت تنفر کا، جذبات کراہت کے ترجمانی کا، ژولیدگی بیان کا اور ہر اس کیفیت امتلاء کا جو ایک مکروہ شے کے مطالعہ سے پیدا ہوتی یا ہوسکتی ہے

جناب ناطق کی جس غزل کو دیکھ کر مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون وہ اُن کی نہایت ہی معرکتہ الآرا کہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس وقت الہ آباد کے مشاعرہ مین اس کو پڑھا گیا تو ساری محفل ایک خاموش اضطراب مین مبتلا تھی ممکن ہے کہ جناب ناطق کے بدخواہ اس کو "داد نہ ملنے" سے تعبیر کرین، لیکن ممکن ہے یہ سب کچھ اس "جلوۂ جانانہ" اور "نطق سحرکارانہ" کا نتیجہ رہا ہو جو بعض اوقات "امتلاء معدہ" کے بعد عالم خواب مین ایک خاموش کابوسانہ تشنج بھی پیدا کرسکتا ہے۔

اسقدر تمہید کے بعد یقیناً آپ بے چین ہونگے کہ اس غزل کو سنیں لیکن میں دفعتہً ساری غزل آپ کے سامنے پیش نہیں کرونگا بلکہ ایک ایک شعر سناؤنگا کیونکہ ممکن ہے آپ اس کو دیکھ لینے کے بعد میری تنقید پڑھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کریں اور اس طرح میری محنت اکارت جائے مطلع ملاحظہ ہو۔

قطرے نہیں حباب میں دل ہیں نقاب راز میں چند حقیقت آشنا غرق ہوئے مجاز میں

اس شعر کے سننے کے بعد میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ میں کیا کیفیت پیدا ہوئی، لیکن مجھ پر جو عالم طاری ہوا وہ ضرور مجھے معلوم ہے، یعنی یہ کہ اتنے خوبصورت الفاظ اس سے زیادہ بے معنی طور پر آج تک کوئی مجتمع نہیں کرسکا۔ قطرہ، حباب، نقاب، حقیقت، مجاز، علیحدہ علیحدہ کیسے صاف وپاکیزہ الفاظ ہیں، لیکن شاعر کے کمال کو دیکھئے کہ "بیک گردش قلم"، "نادر ونادری" دونوں کا صفایا کردیا۔ اچھا اب آئیے "بطن شاعر" کو بھی دیکھ لیں شاید کوئی مفہوم وہاں سے دستیاب ہوسکے۔ فرماتے ہیں

حباب کو حباب نہ جانو بلکہ وہ مجموعہ ہے قطروں کا

پہلی تشبیہ نقاب راز میں چھپے رہنے والے "دل" سے دی ہے اور دوسری مجاز میں غرق ہوجانے والے "حقیقت آشناؤں" سے ایک شخص اس کے سننے کے بعد کہہ سکتا ہے کہ اس شعر میں تغزل کی کیا بات ہے، کونسی کیفیت، یا سرشاری محبت اس سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن یہ اعتراض غلط ہے کیونکہ اس شعر میں حکیم صاحب نے صرف حباب کی حقیقت سے بحث کی ہے جس کا تعلق طبیعیات سے ہے نہ کہ عشقیات سے اور اس میں کلام نہیں کہ حباب کی کُنہ وحقیقت دریافت کرنے میں ضرور انھوں نے عالمانہ تفتیش سے کام لیا ہے، کیونکہ دنیا اس وقت تک یہی جانتی تھی کہ حباب تو نیم قطرہ سے بھی کم صرف اک "کیفیت تم" کا نام ہے مگر حکیم صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اس آتشی شیشہ میں بہت سے قطروں کا عرق کشید کیا جارہا ہے حیرت وافسوس ہے کہ اس فاضلانہ انکشاف پر ۱۹۲۹ء کا نوبل پرائز متعلق بہ طبیعیات حکیم صاحب کو نہیں ملا

تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

اب اس شعر کی دوسری معنوی خوبی ملاحظہ ہو

دعویٰ یہ ہے کہ حباب میں قطرے نہیں ہیں۔ پھر کیا ہے؟ خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ نقاب راز میں چھپے ہوئے دل ہیں یا یوں سمجھ لو کہ مجاز میں غرق ہوجانے والے چند حقیقت آشنا ہیں۔ اس جواب کا ثبوت طلب کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جب بدبخت حقیقت آشنا نقاب راز میں چھپنے کے باوجود بھی مجاز میں غرق ہونے والے پائے جاتے ہیں تو اصول طبیعیات سے یہ دعویٰ اقلیدس کے بدیہیات میں داخل ہوکر ویسی ہی تلخ حقیقت بنجاتا ہے، جیسے ریاح یا سوری کے تکاثف سے امعاءِ مستقیم کا تشنج یا صداع صدغین۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

ایک بھی ہم سبق نہیں مدرسۂ نیاز میں زخم ہیں سب کے مختلف شرح نگاہ ناز میں

آپ جی میں کہتے ہونگے کہ ایسے مطلع کے بعد کیا کوئی شعر اس پایہ کا نکل سکے گا، لیکن آپ کو خبر نہیں کہ حکیم صاحب کا دماغ ایک ایسا اعجوبہ زار ہے کہ اگر مدۃ العمر وہ شب وروز سوائے غزلگوئی کے اور کچھ نہ کریں تو بھی ان کے "یہ جواہر ریزیاں" کم نہ ہوں

چنانچہ یہ دوسرا شعر ملاحظہ ہو، کیا مطلع سے کم درجہ رکھتا ہے۔ وہی حکیمانہ تیور، وہی مرشدانہ ٹھاٹ، وہی فلسفیانہ بے کیفی

چندے آفتاب چندے ماہتاب، ایک کو چھپایئے دوسرے کو نکالئے۔ کیا ممکن ہے کہ سامع کی توجہ کسی اور طرف ہٹ جائے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ مطلع مین حکیم صاحب نے طبعیات کے ایک معمہ کو حل کیا تھا اور اس مین ایک وسیع المطالعہ انسان ہونے کی حیثیت سے انھون نے ایک نئی کتاب کے وجود کی خبر دی ہے جس کا نام "نگاہِ ناز" ہے۔ اس کتاب کے موضوع پر حکیم صاحب نے کوئی بحث نہین کی ہے بلکہ صرف اس کے دقیق و دشوار ہونے کا حال اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اس کی شرح و تفسیر جو مدرسۂ نیاز مین پڑھائی جاتی ہے ہر طالب علم اک نیا اثر زخم کی صورتین حاصل کرتا ہے۔ یعنی اگر کسی کا زخم مستطیل ہوتا ہے تو دوسرے کا مربع، کسی کا دایرہ دار ہوتا ہے تو کسی کا مثلثی اور اگر یہ کہا جائے کہ "اختلاف زخم" "اختلاف کیفیت" کے مفہوم مین مستعمل ہوا ہے تو پھر اس کا تصنع یقیناً تنقید سے بے نیاز ہے

تیسرا شعر:-

پردہ کی رسم و راہ ہے اپنے نیاز مند سے — ورنہ حجاب کو کہان دخل حریم ناز مین

اس شعر مین بھی ایک جدید انکشاف ہے اور وہ یہ کہ پردہ حریم ناز مین نہین ہوتا بلکہ "حسن لب بام" کے لئے مخصوص ہے۔ اگر حریم کے لغوی معنی پوشیدہ یا پس پردہ کے ہین تو ہوا کرے، ناطق صاحب کی انشا مین حریم نام ہے "اُس مینا بازار" کا جس مین داخل ہونے کی شرط اولین پردہ و حجاب کا اٹھا دینا ہے۔ مفہوم اور تغزل کے لحاظ سے جو مرتبہ اس شعر کا ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہین

چوتھا شعر:-

حلقۂ زلف کی گرہ کھل ہی گئی اگر تو کیا — قید ہے میری منسلک سلسلۂ دراز مین

یعنی لوگ سمجھتے تھے کہ حکیم صاحب اس کے حلقۂ زلف مین محبوس نہین ورا سکے گرہ کھلنے کے بعد وہان سے نکل بھاگین گے۔ اس خدشہ کو انھون نے رفع کیا ہے کہ ایسا نہین ہو سکتا کیونکہ ان کی قید سلسلۂ دراز سے متعلق ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ سلسلۂ دراز کس چیز کا ہے، سو اس کی صراحت اس لئے نہین کی گئی کہ شعر صاف ہو جاتا اور اس صنعت سے نکل جاتا جو اس غزل مین ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ منسلک کے بعد لفظ مین کا استعمال بھی قابل غور ہے۔ ممکن ہے فصحائے لکھنؤ یونہی بولتے ہون۔

پانچوان شعر

شکل حقیقت اب کے ہو اور کسی کے دل پہ نقش — صورت مستقل نہین آئینۂ مجاز مین

یہ شعر حکیم صاحب کا اس غزل کی جان ہے، اور مخصوص طور پر اس دعویٰ کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ ساری دنیا کے علماء تاویل جمع ہو جائین تو بھی اس کے معنی پیدا نہین کر سکتے۔ اگر آئینۂ مجاز مین کوئی صورت مستقل طور پر مرتسم نہین ہو سکتی تو شکل حقیقت حکیم صاحب کے دل کے بجائے کس اور کے دل پر کیون نقش ہو۔ وہ کیون اس سے خایف ہین کیا انکا دل صرف آئینہ مجاز ہے جس مین شکل حقیقت مستقلاً قائم نہین ہوتی۔ غالباً یہ کوئی خاص لاہوتی یا ناسوتی معمہ ہے جسکو ہم ہی نہین سمجھ سکے، حکیم صاحب غریب کیا سمجھین گے

چھٹا شعر

مسلک دید حل ہو سر در کائنات سے — وہ جو لگی تھی طور پر آکے بجھی حجاز مین

مسلک کا حل ہونا بالکل نئی بات ہے۔ معمہ حل ہوتا ہے، دواؤن مین موتی حل ہوتا ہے، مشک و عنبر حل ہوتا ہے، لیکن، مسلک شاید علم العقاقیر کی کوئی نئی دریافت ہے کہ اس سے قبل کسی کو اس کا حل ہونا معلوم نہین ہو سکا تھا اگر حل ہونا حکیم صاحب نے واضح ہونے کے معنی مین لکھا ہے تو یہ اور ایک معمہ ہے جسے صرف جناب ناطق ہی کے گرہ کشا ناخن حل کر سکتے ہین

ایک اور شعر ملاحظہ ہو

سجدہ مین سر اگر گیا پھر نہ اٹھیگا تا ابد　　قید نہ رکھئے وقت کی میرے لئے نماز مین

اس شعر مین محض یہ خصوصیت قابل داد ہے کہ حکیم صاحب ابھی تک اپنے سجدہ یا نماز متعلق صرف گفت و شنود مین مصروف ہین اور معاملہ ابھی تک طے نہین ہوا۔ اصل جھگڑا یون شروع ہوا کہ حکیم صاحب نے (شاید ناوقت) کہا کہ مین سجدہ کرنا چاہتا ہون، جواب ملا کہ یہ بیوقت کی شہنائی کیسی۔ جو اوقات مقرر ہین ان مین سب کے ساتھ تم بھی سجدہ کر لیا کرو، اسپر حکیم صاحب نے فرمایا کہ مین اگر سجدہ کرنے پر آگیا تو حشر تک سجدہ ہی کرتا چلا جاؤنگا اور حشر تک سر نہ اٹھاؤنگا اسلئے میرے لئے وقت کی تعیین نہ کیجئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، شعر سے ظاہر نہین ہوتا۔ لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ انھین اجازت اس کی نہین ملی، ورنہ ظاہر ہے کہ انھین مصر کے ادارت کی فرصت کہان ملتی اور بجائے سر بہ سجود رہنے کے وہ ہر وقت ''مایل بہ قعود'' کیون رہتے۔

اس شعر کی بنیاد صرف لفظ اگر پر قایم کی گئی ہے اور یقیناً یہ شاعرانہ معجزہ ہے کہ صرف ایک لفظ سے ایسے ایسے غوامض انھون نے اس شعر مین پیدا کر دیئے

اب جو نفس مین ہے خلوص نالہ مین کب اثر یہ تھا　　پردہ کوئی نہین رہا دل کے شکستہ ساز مین

یہ شعر بھی چند در چند عجایب فن اپنے اندر رکھتا ہے، پہلے مصرعہ کی اگر نثر کیجائے تو ہوگا اسکو یون ہونا چاہئے کہ ''اب جو خلوص نفس مین ہے وہ نالہ مین کب تھا'' اسطرح لفظ اثر بالکل بیکار ہو جاتا ہے اور اگر اس کی نثر یون کیجائے:-

''وہ نالہ مین کب یہ اثر تھا جو اب نفس مین ہے'' تو لفظ خلوص زاید قرار پاتا ہے۔ مگر جناب ناطق نے دونون لفظ رکھ کر گویا یہ بات پیدا کی کہ جس لفظ کو جی چاہے نکال کر معنے پیدا کر لیجئے اور یہ پہلی نمایش فن ہے۔ دوسرے مصرعہ مین متعدد مسایل طے کئے گئے ہین۔ ایک یہ کہ ساز ٹوٹ جانے کے بعد اگر صرف پردے رہجائین تو موسیقی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن اس کا اثر نہین ہوتا۔ دوسرے یہ کہ جب شکستہ ساز کے پردے بھی غائب ہو جائین تو موسیقی پھر عود کر آتی ہے اور پوری قوت کے ساتھ

یہان یہ شک وارد ہو سکتا ہے کہ اگر اس شعر مین دل کو واقعی شکستہ ساز سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس مین پردے کس چیز کے ہونگے اور اگر پردہ بہ معنی حجاب لیا گیا ہے تو دل کا ساز ہونا کیا؟ لیکن یہ اعتراض وہی شخص کر سکتا ہے جو اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ اہل لکھنؤ جب ایہام کی شاعری پر آجاتے ہین تو وہ اجتماع ضدین کو بھی حسن شاعری قرار دیتے ہین چہ جائیکہ اہمال

زخم عدو نہ دیکھئے آپ نگاہ ناز سے　　لوگ کہین گے داغ ہے دامن پاکباز مین

یہ شعر بالکل لکھنوی ساخت کا ہے کہ نگاہ مین اس کی وسعت کے لحاظ سے دامن پیدا کیا گیا اور جب اس مین دامن پیدا ہو گیا تو

معمولی کپڑے کے دامن کی طرح اس کو خون عدو سے داغدار بھی کر دیا۔

علاوہ اس کے پہلے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بالکل بیکار ہے۔ اگر ''نگاہ ناز سے'' کو حذف کر دیا جائے تو معنی میں کوئی سقم پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر یہ کہا جائے کہ نگاہ ناز کی تخصیص و تعیین ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے دامن نگاہ کی داغداری ثابت نہیں ہو سکتی، تو پھر سوال یہ ہوگا کہ محبوب کی وہ کونسی نگاہ ہے جس کو عاشق عدو کے لئے گوارا کر سکتا ہے اور جس سے دامن پاکباز آلودہ نہیں ہو سکتا

ناطق سوختہ جگر دل پہ تو ہات رکھ کر ذرا
ایسی ہی کچھ چمک سی تھی نالۂ جانگداز میں

ہر چند اس شعر میں مفہوم پیدا کرنے کے لئے حکیم صاحب نے غیر معمولی مسیحا نفسی سے کام لیا، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اول تو دل پر ہات رکھنے سے چمک کا احساس ہونا کیا معنی، ہات رکھ کر دھڑکن تو ضرور محسوس کیجا سکتی ہے، لیکن چمک دیکھنا تو آنکھ کا کام ہے نہ کہ ہات کا اور اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اگر دل پر ہات رکھنے سے نالۂ جانگداز کی سی چمک محسوس ہوتی ہے (حالانکہ یہ مسئلہ بجائے خود حل طلب ہے کہ نالۂ جانگداز میں چمک کیوں ہو) تو پھر نتیجہ کیا، یعنی اگر ناطق سوختہ جگر کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ دل کی چمک اب اس خطرناک حد تک پہونچ رہی ہے جسے نالۂ جانگداز کہتے ہیں تو سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ زمانہ ماضی کا نالۂ جانگداز کیا سوائے دل کے کسی اور مقام سے نکلا تھا اور اگر یہ نہیں تو پھر دل کی چمک سے خبردار کرنا بیکار ہے

اس غزل میں دو شعر اور ہیں:۔

اس کی جبین پہ اس لئے آکے شکن بگڑ گئی
سجدہ کو ناز کیوں ہوا ناصیۂ نیاز میں

جینے نہ دے اگر جیوں، مرنے نہ دے اگر مروں
مرگ و مسیح دونوں ہیں پیکر چارہ ساز میں

پہلا شعر بے عیب ہونے کی حد تک پھیکا و بے مزہ ہے اس لئے اعتنا نہیں کیا گیا اور دوسرے میں چونکہ لفظ پیکر کی ضرورت استعمال سے زیادہ اور کوئی امر بحث طلب پیدا نہیں ہوتا اس لئے مرگ و مسیح میں سے مرگ ہی کا انتخاب اس کے لئے موزوں سمجھا گیا۔

یہ ہے ایک لکھنوی (استاد) شاعر کی غزلگوئی کا رنگ۔ جس پر اہل لکھنؤ کو ناز ہے اور جس پر اعتماد کر کے وہ دعوائے ''انا و لا غیری'' کا دم بھرتے ہیں۔

''طوشا نجل''

(**نگار**) یہ مضمون جس مقصد کے ساتھ لکھا گیا ہے، اسے لکھنے والے نے خود ہی ابتدائی سطروں میں ظاہر کر دیا ہے اور اگر مجھے اس مسئلہ کو اگست کے ملاحظات ہی کے ساتھ ختم کر دینا ہوتا تو شاید میں اس کی اشاعت مناسب نہ سمجھتا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس باب میں مخالف و موافق دونوں خیالات معلوم کر کے کسی نتیجہ پر پہونچوں اور اس کا ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ نگار کے چند صفحات کچھ دنوں کے لئے اس بحث و نزاع کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں

میں اپنی رائے اس تنقید کے متعلق محفوظ رکھنا مناسب سمجھتا ہوں، لیکن میں تنقید نگار کے اس دعویٰ کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ غیر لکھنوی شاعروں کے کلام میں کوئی ایسی غزل پیش نہیں کیجا سکتی (اگر ناطق صاحب کی یہ غزل واقعی بقول نقاد لغو و مہمل ہے) اور میں اس چیلنج کو نہایت ہی نارواجسارت سے تعبیر کرونگا

دوسرا دعویٰ (ضمناً) یہ کیا گیا ہے کہ ساری دنیا لکھنوی شاعری کی طرف سے بدظن ہے۔ میں اسکے ماننے کیلئے بھی طیار نہیں، بلکہ میں تو علی الرغم یہ کہتا ہوں کہ اب بھی اک بڑی جماعت انھیں لوگوں کی ہے جو "لکھنؤ اسکول" کی شاعری پر سر دھنتے ہیں اور "دہلی اسکول" کو پسند نہیں کرتے۔

تیسری بات اور ہے جو یقیناً زیادہ توجہ کی مستحق ہے یعنی وہی "مومن اور غیر مومن" والا قصہ۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا ذہن بھی اس طرف منتقل نہ ہوا تھا کیونکہ اس خصوص میں میرا جو مشرب ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور میرے نزدیک نوع انسانی میں اس قسم کی تفریقات پیدا ہو جانا انتہائی بدنصیبی ہے۔

بہرحال میں ابھی تک یہ ماننے کے لئے آمادہ نہیں کہ اہل لکھنؤ کی خلش کا یہ سبب ہے اور اگر ہو تو بھی دوسروں کی تنگ نظری کا جواب تنگ نظری سے دینا کب جائز ہے۔

نیاز

علم الکیمیا کا ایک حیرت انگیز معجزہ

کایا پلٹ ہیر آئیل

کہنے کو صرف یہ تیل ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہے۔ یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود دنیا کی کیمیاوی اجزا سے جدید اصول پر تیار کیا گیا ہے اور جسکا تجربہ ایڈیٹر نگار اور ملک کے بعض دیگر حضرات اور ڈاکٹر کر چکے ہیں گھر میں اسکی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کر دینا ہے۔

(۱) اگر جناب کے بال صاف ہو گئے ہیں یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہے۔ یا بال گرنا شروع ہو گئے ہیں الم ہو رہے ہیں یا سفید ہونے لگے ہیں تو اس تیل کا استعمال انکی جڑوں کو فاسد طوبتوں سے صاف کر کے بال کا گرنا موقوف کر دیگا بال بڑھائیگا اور جہاں جہاں کے بال گر گئے ہیں وہاں نئے بال سیاہ پیدا کریگا۔

(۲) جن کو نزلہ درد سر یا شقیقہ دوران سر ضعف دماغ ضعف بصارت بے خوابی اور نسیان وغیرہ کی شکایت رہتی ہے ان کیلئے یہ تیل بڑی نعمت ہے۔ نزلہ کو فوراً روک دیتا ہے اور دماغ و بصارت کو قوی کر کے عجیب قسم کا سکون پیدا کر دیتا ہے اور عینک کے استعمال کو بھی غیر ضروری کر دیتا ہے۔

(۳) شدت تپ کی حالت میں اسکی مالش فوراً ہذیانی حالت کو دور کر کے پسینہ لاتی ہے اور بخار کو کم کر دیتی ہے۔

(۴) ایسے مہلک امراض سے جیسے کنٹھمالا سل و دق اسکا استعمال کرنیوالا محفوظ رہتا ہے اور تمام اثرات نزلہ کو خواہ سر میں ہو یا دانتوں یا مسوڑھوں میں بکمال دور کر دیتا ہے۔

(۵) سر اور جسم کے پھوڑیاں پھنسیاں، گرمی دانے خارش اور ہر طرح کے جلدی امراض اسکے مالش سے کافور ہو جاتے ہیں۔ ایک تازہ سرٹیفکیٹ ملاحظہ ہو۔

مکرمی تسلیم۔ آپکا عنایت کردہ تیل بہت مفید ثابت ہوا ابھی ایک شیشی ختم نہیں ہوئی ہے اور سر کی خشکی جاتی رہی بال گرنا بند اور نئے بال نکلنے شروع ہو گئے۔ براہ کرم حکم دیدیجئے کہ ایک شیشی اور بھیجی جائے اور آئندہ بغیر میری استدعا کے ہر مہینے کے شروع میں ایک شیشی بذریعہ وی پی روانہ ہوا کرے والسلام۔

نیازمند جعفر علی خان (ڈپٹی کلکٹر) رائے بریلی۔

جوابی امور کے واسطے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

قیمت معہ محصول .... (۳ روپے)

مینجر کایا پلٹ ہیر آئیل۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

غالب کی شاعری

(زبیدہ خاتون - رحمت باغ حیدرآباد دکن)

"مین نہایت ادب کے ساتھ جناب کی خدمت مین حسب ذیل استفسارات پیش کرنیکی جراءت کرتی ہون - اگر جناب کو زحمت نہو تو اپنے زرین خیالات سے مجھے مستفید فرمائیے -

(۱) شعر کی خصوصیات کیا ہین ؟ اور کیا ان مین فلسفہ داخل ہے غالب کی فلسفیانہ شاعری کے متعلق ڈاکٹر عبد الرحمان صاحب مرحوم بجنوری کی رائے سے آپ کس حد تک اتفاق فرماتے ہین ؟

(۲) ہندوستان کے شعرا مین غالب کا کیا درجہ ہے اور کن خصوصیات کی بنا پر ؟"

(**نگار**) شعر کی خصوصیات کیا ہین ؟ یعنی کس شعر کو صحیح معنی مین شعر کہہ سکتے ہین ؟ یہ سوال اسقدر قدیم ہے کہ اگر ہم چاہین تو کہہ سکتے ہین کہ تنقید کے اولین احساس کے ساتھ ہی یہ بھی وجود مین آیا تھا، اور اس لئے آپ جس زمانہ اور ملک کے لٹریچر کو اٹھا کر دیکھین گی تو اس موضوع پر آپ کو کافی سرمایۂ تحقیق نظر آئے گا۔ مجھ سے سوال کر کے آپ کیون اُس فرسودہ و پامال مبحث کو زندہ کرنا چاہتی ہین، جس مین اب کوئی جدت و ندرت باقی نہین رہی۔ پھر یون بھی نگار کے گزشتہ مجلدات مین اس مسئلہ پر ایک سے زاید مرتبہ اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہون اور اس لئے اب انکا اعادہ کوئی لطف کی بات نہین۔ مگر ہان یہ کہنے سے باز نہین رہ سکتا کہ جس طرح حسن و جمال کے لئے کوئی خاص مادی معیار اس وقت تک قائم نہین ہو سکا اسی طرح فن یا اصول فن کے لحاظ سے شعر کی خوبی کا اندازہ دشوار ہے۔ البتہ جس حد تک ذوق و وجدان کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسن و شعر کی خوبی منحصر ہے صرف ناظر و سامع کے تاثر و تکیف پر جو بالکل ذاتی و انفرادی چیز ہے اور اس پر کسی کا اعتراض کرنا بالکل خلاف محل ہے۔ جس طرح ایک حبشی کی محبوبہ یورپ مین قبیح ترین چیز سمجھی جاتی ہے اس طرح حبش مین پیمبران فرانس کو مبروص سمجھکر اُن کی طرف سے منہ پھیر لیا جاتا ہے، اور یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ لکھنؤ اسکول کی شاعری قابل ترجیح ہے یا دہلی اسکول کی" ایک شخص جس کا دل کیفیت عشق و محبت سے خالی ہے اس کے نزدیک میر و درد کی شاعری لایعنی ہذیان سرائی ہے، اور دوسرا جو صرف حکایات محبت ہی سننا چاہتا ہے، وہ اسیر و ناسخ کے دواوین کو مجموعۂ مزخرفات جانتا ہے مین نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہین جو میر کا یہ شعر سنکر۔

اک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تئین — اور مین بیچارہ تو اے مہربان مارا گیا

گھنٹون کے لئے بیکار ہو گئے اور وہ ملکوتی نفوس بھی میری نگاہ سے گزر چکے ہین جن کے نزدیک "مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجران کا"

شاعری کا بہترین معیار ہے۔

بہرحال تنقید شعر کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ جس کو سنکر ہر شخص سر تسلیم خم کرلے، نہ آجتک ہوسکا ہے نہ آیندہ اس کا امکان ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ اگر کوئی شخص صحت عقل و فکر سے کام لیکر محض فطری اصول اور علمی مسلمات پر بنیاد رکھ کر ایک شعر کی حقیقت کو سمجھنا چاہے تو وہ ایسے حدود معین کرسکتا ہے جو ”خالص“ و ”عیار“ کے تمیز مین مدد دے سکتے ہین اور اسی لئے نہ صرف شعر بلکہ ادب انشاء کے تمام اقسام کے لئے اولین اصول جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے یہ قرار دے لیا گیا ہے کہ

انچہ از دل خیزد بر دل ریزد

پھر چونکہ شاعری مین زیادہ تر واردات قلب، ہی سے بحث کیجاتی ہے، اس لئے وہان اس کلیہ کی قوت اور زیادہ نمایان نظر آتی ہے اور ”بر دل ریزد“ ہی کو دیکھ کر ”از دل خیزد“ پر حکم لگایا جاتا ہے

ہوسکتا ہے کہ ایک واقعہ میرے لئے اسدرجہ باعث تاثر نہ ہو جتنا آپ کے لئے، لیکن واقعہ کی نوعیت کو دیکھ کر بہ آسانی یہ فیصلہ ہوسکتا ہے کہ اصولاً اس کا اثر کسقدر اور کیسا ہونا چاہئے اور یہین سے وہ اصول مترتب ہوتا ہے جسے ایک شعر کی تنقید مین حقیقت مسلمہ کا درجہ حاصل ہے۔

شاعری مین حکمت و فلسفہ کے تمام شعبے داخل ہین یا نہین، میرے نزدیک لایعنی سی بحث ہے کیونکہ ممکن ہے فلسفہ شعر مین آکر بلند ہو جائے لیکن شعر فلسفہ کے حدود مین جاکر کوئی خاص امتیازی مرتبہ حاصل نہین کرسکتا۔ شعر حقیقتاً نام ہے اُس شعور حقوی کا جس کا تعلق صرف انسان کے جذبات دقیقہ سے ہے یا اگر آپ سکو زیادہ بلند کرنا چاہین تو کہہ سکتے ہین کہ جس کا تعلق روحانیت سے ہے اس لئے میرے نزدیک ایک شعر کا تعلق ”اخلاقیات“ سے تو ہوسکتا ہے لیکن ”حکمیات غیر اخلاقی“ سے متعلق کرنا خواہ مخواہ کی جسارت ہے۔ اس مین شک نہین کہ فلسفہ و حکمت نہایت وسیع چیز ہے یعنی اس کی وسعت یہانتک ہے کہ ”جرم و معصیت“ بھی اس مین داخل ہوسکتی ہے، چنانچہ ہمارے ایک عزیز دوست جو ”سود ہضم“ کی حد تک فلسفہ واقع ہوئے ہین دنیا کے بعض قبیح ترین و شنیع ترین حرکات کو بھی نہ صرف فطری بلکہ الوہیت سے ماورا ([illegible]) قرار دیتے ہین۔ لیکن شعر کی نزاکت اسقدر بھیانک وسعت کی متحمل نہین ہوسکتی اور وہ کبھی ”داعیات فطرت صحیحہ“ سے منحرف ہوکر کامیاب نہین ہوسکتا۔ اس سلسلہ مین اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جس کو فطرت صحیحہ کہا جاتا ہے وہی ایک اعتباری و فرضی چیز ہے تو بیشک میرے پاس اسکا کوئی جواب نہ ہوگا اور میرے لئے اس صورت مین سپر ڈالدینا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔

بہرحال چونکہ شعر کی پوری قوت کا اندازہ صرف اسی احساس و تاثر کے عالم مین ہوسکتا ہے جس کو مادیات یا منجر بہ مادیات سے کوئی تعلق نہین ہے اسی لئے آپ دیکھین گے کہ شرق و غرب ہر جگہ جس صنف سخن کی ترقی ہوئی یا جس کی قدر کی گئی وہ وہی ہے جسے تغزل یا غرامی (Amatory or Erotic) شاعری کہتے ہین اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز اس کا وہی غیر اکتسابی اور بالکل فطرت کے مطابق ہوتا ہے، چنانچہ آپ دیکھین گے کہ جس شعر مین عہد وحشت کی سی سادگی پائی جاتی ہے وہی بہت زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ ہرچند اس اصول کی بناء پر تغزل یا غرامی شاعری کے لئے یہ ضرور نہین کہ وہ ”تعلق جنسین“ ہی مین محدود ہو، بلکہ وہ مذہب، اخلاق، مناظر فطرت، قوم و ملک ہر ایک سے وابستہ ہوسکتی ہے، لیکن یہ تمام ”انشعابات“ عہد ترقی اور دور تمدن کی چیزین ہین حقیقی اور اصلی شاعری تو وہی ہے

جس کا درس عورت کی نگاہ اولین نے دیا تھا و لسعد ورما قال

نخستین بادہ کاندر جام کردند　　　ز چشم مست ساقی وام کردند

اس لئے میرا مسلک اس باب مین بہت کچھ قدامت پسند (واقع ہوا ہے) اور مین ایک شعر مین حکمت و فلسفہ کے بجائے، بیان درد و حکایت محبت کی جستجو کرتا ہون اور اس مین کسی قسم کے تصنع کو پسند نہین کرتا

ڈاکٹر بجنوری مرحوم جس زمانہ مین دیوان غالب کا مقدمہ لکھ رہے تھے، مین بھی بھوپال ہی مین تھا اور بارہا میرے اُن کے درمیان "غالب کی شاعری" موضوع بحث قرار پائی۔ اس مین شک نہین کہ وہ بہت پاکیزہ ذوق سخن رکھتے تھے، نہایت ذہین شخص تھے اور پوری قوت نقد اُن مین موجود تھی، لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اُس وقت تک سن وقوف کو نہ پہونچے تھے اور اُن کا ذوق شعر و تنقید پختگی کو نہ پہونچا تھا۔ مین نے ہمیشہ اُن سے یہی کہا کہ آپ نے اس کام کو کم از کم ۱۵ سال قبل از وقت شروع کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو غالب کی مدح سرائی کی وہ صورت جو ایک ذم کا پہلو لئے ہوئے ہے، کبھی اختیار نہ کرتے۔

غالب کے شاعر ہونے مین کس کو گفتگو ہو سکتی ہے، لیکن اس کے محاسن شاعری کا صرف اس لئے قایل ہونا کہ اسنے حکمت و فلسفہ کے تمام نکات حل کر دیے ہین نہ صرف خلاف حقیقت و واقعہ ہے بلکہ میرے نزدیک غالب کی شاعری کی توہین بھی ہے۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی نگاہ عقیدت نے حکمت و فلسفہ کے تمام رموز بستہ کا حل کلام غالب مین پا لیا ہو لیکن مین تو ڈرتا ہون کہ کہین یہ غالب پر اتہام نہ ہو اور نتیجہ ہو صرف ڈاکٹر بجنوری کی شاعری کا۔ مجھے افسوس ہے کہ انھون نے دیوان غالب مین غالب کا مطالعہ نہین کیا بلکہ خود اپنا مطالعہ کرنا چاہا، اور وہ یقیناً شاعری کے اس منزل مین تھے جس مین

بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آسان ہے

تو قلم سے نکل سکتا ہے لیکن یہ نہین کہا جا سکتا کہ

مرے دل مین ہے یارب شوق وصل و شکوۂ ہجران　　　خدا وہ دن کرے جب اُس سے مین یہ بھی کہون وہ بھی

چونکہ ڈاکٹر بجنوری خود بہت دقت پسند دشکل آفرین طبیعت رکھتے تھے اور زمانہ نے اُن کو کوئی درس ایسا نہ دیا تھا جو انسان سے خیال محال، ترک کرا کے "واقعیت امکانی" مین مبتلا کر دیتا ہے، اس لئے انھون نے غالب کو شاعری کے اُن حدود مین ڈھونڈھا جہان وہ صرف اسد تھا اور بجنوری صرف ڈاکٹر۔ اگر اُن کی عمر وفا کرتی اور کسی بیوفا، سے واسطہ پڑتا تو اُن کے مقدمہ کا یہ رنگ نہ ہوتا اور پھر انھین معلوم ہوتا کہ غالب کی شاعری کا وہی حصہ بیکار ہے جسے وہ فلسفہ طرازی سے تعبیر کرتے ہین۔

ڈاکٹر بجنوری کا، دیوان غالب کو الہامی کتاب کہنا بالکل درست ہے کیونکہ ہر حقیقی شاعر کا حقیقی شعر الہام ہی ہوا کرتا ہے اور علاوہ غالب کے ہندوستان مین اور بھی شعراء ایسے ہین جو اس حیثیت سے، پیغمبری کا درجہ رکھتے ہین، لیکن بجنوری مرحوم نے الہامات، کی تعیین کرتے ہوئے جس چیز پر زور دیا ہے وہ یہ ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت مین ہے دریا لیکن　　　ہمکو تقلید تنک ظرفی منصور نہین

حالانکہ الہام حقیقتاً یہ ہے:-

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل مین کسی رنگ سے معذور نہین

اور یہی وہ خصوصیت شعری ہے جس کی بنا پر مومن کو غالب پر ترجیح دیجا سکتی ہے، کیونکہ مومن کی فلسفہ طرازی بھی اس رنگ کو چھین نہین سکی اور غالب تغزل سے ہٹکر کہین کہین اس حد تک پہونچ جاتے ہین کہ:-

ترے بیمار پہ ہین فریادی　　　وہ جو کاغذ مین دوا باندھتے ہین

آپ کے سوال کا دوسرا حصہ کہ "ہندوستان کے شعرا مین غالب کا کیا درجہ ہے اور کن خصوصیات کی بنا پر" بہت زیادہ تفصیل کا محتاج ہے اور باب الاستفسار مین پوری طرح اسپر بحث نہین کیجا سکتی، تاہم مختصراً اسقدر ضرور عرض کرونگا کہ قبول و شہرت کا جہانتک تعلق ہے غالب کی ہستی بالکل منفرد ہے (گو مجھے اس مین کلام ہے کہ محض قبول و شہرت دلیل کسی کی خوبی کی ہوسکتی ہے یا نہین) لیکن نفس شاعری کے لحاظ سے اور وہ بھی اُردو مین، غالب کا مرتبہ نہ اسقدر بلند ہے جتنا بجنوری مرحوم نے سمجھا اور نہ اتنا گرا ہوا جتنا آپ کے حیدر آبادی پروفیسر ڈاکٹر عبد اللطیف نے سمجھایا۔ بلکہ اُس کا درجہ اس افراط تفریط کے درمیان ایک معتدل نقطہ پر قایم ہے۔

غالب کے کلام مین تین جداگانہ رنگ نظر آتے ہین، ایک وہ جسے غیر معتدل فارسی تخیل کہنا چاہیئے مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا　　　تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

دوسرا رنگ وہ جس مین تخیل تو فارسی ہے لیکن بہت معتدل جیسے:-

دہر مین نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا　　　گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا　　　یا
تغافلہائے تمکین آزما کیا　　　غم آوارگیہائے صبا کیا

تیسرا رنگ وہ ہے جس مین صرف سادگی نے حسن کلام پیدا کیا ہے۔ مثلاً

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالین گے　　　بے نیازی تری عادت ہی سہی
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو　　　کاشکے تم مرے لئے ہوتے　　　وغیرہ وغیرہ

پہلے رنگ کا ذکر بالکل بیکار سی بات ہے، کیونکہ خود غالب ہی نے اس کو نظری کر دیا تھا اور اس کو سامنے رکھ کر غالب کی شاعری پر حکم لگانا مناسب نہین۔ رہ گئے باقی دو رنگ سو اس مین کلام نہین کہ یہ دونون اپنی اپنی جگہ نہایت پاکیزہ ہین لیکن ان کو غالب سے مخصوص سمجھنا درست نہین اُس وقت جتنے کامیاب شعرا تھے، سب کے یہان کم و بیش یہی دونون رنگ پائے جاتے تھے علی الخصوص مومن کہ اگر اس کے کلیات کا استقصا کیا جائے تو باندک تفاوت کئی دیوان غالب نکل سکتے ہین۔ لیکن باایں ہمہ یہ نہین کہا جاسکتا کہ غالب کی شاعری یک اتباعی و تقلیدی رنگ رکھتی ہے اس کی معنی آفرینی، خلق مضامین، ندرت بیان، نوائے ترکیب، جدت تخیل، ہر چیز اپنی اپنی جگہ اس کے غیر معمولی ذہانت و طباعی کے ثبوت مین پیش کیجا سکتی ہے اور اگر آپ اس کے اُردو کے کلام کو نظر انداز کردین (جسے وہ اپنا "مجموعۂ بے رنگ" کہتا ہے) تو پھر فارسی مین اس کی انفرادیت

کو بھی ایک حد تک تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب خود بھی اس کو محسوس کرتا تھا کہ ریختہ اس کے وسعت بیان کا متحمل نہین ہو سکتا اور اس لئے اس نے زیادہ توجہ فارسی شاعری کی طرف کی۔

اس مین کلام نہین کہ غالب کی وقت پسند طبیعت نے سب سے پہلے میرزا عبدالقادر بیدل کا رنگ اپنے ریختہ اور فارسی مین پیدا کرنا چاہا، لیکن چونکہ بیدل کا رنگ الفاظ و تراکیب سے بالکل علیحدہ محض وجدان و کیف سے پیدا ہونے والی چیز ہے جو غالب مین مفقود تھا اس لئے ان کو آخر کار سپر ڈالدینا پڑی اور اعتراف ناکامی کے بعد عرفی و نظیری کو پیش نظر رکھکر شاعری شروع کی۔ جہانتک فارسی زبان اور شوخی و حلاوت کا تعلق ہے، یقیناً غالب کو عرفی اور نظیری ہی کے صف مین جگہ دیجائے گی بلکہ جوش و خروش کی حیثیت سے اس کا مرتبہ بلند نظر آئیگا لیکن اثر و تاثر کی دنیا مین غالب ان دونون سے فروتر نظر آتا ہے۔ آپ غالب کا پورا کلیات چھان ڈالئے مگر عرفی کے اس شعر کا جواب آپ کو کہین نہین ملیگا:۔

امروز نگاہِ من و عرفی بہم افتاد
باہم نگرستیم و گرستیم و گزشتیم

غالب نظیری کی تقلید مین اپنی سرشاری کا اظہار کرتے ہوئے سیر نہین ہوتا۔ چنانچہ متعدد جگہ لکھا ہے:۔

(۱) غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید
سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم

(۲) غالب از من شیوۂ نطق ظہوری زندہ گشت
از نوا جان در تن سازِ بیانش کردہ ام

(۳) جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب
خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

اور اس مین شک نہین کہ ان دونون کے کلام مین اس درجہ اتحاد و یکرنگی ہے کہ مشکل سے امتیاز ہو سکتا ہے، لیکن پھر بھی نظیری کے اس نوع کے اشعار کا جواب اس سے نہ ہو سکا:۔

درمحبت دل و دین باختن اول قدم ست
ما نظیری ز تو خورسند بانیہا نہ شویم

مثال لب دریا و حال مستسقی ست
دہند شوق و مے رخصت نظر ندہند

تو مپندار کہ این قصہ بخود می گویم
گوش نزدیک لبم آر اکہ آوازے ہست

الغرض تغزل مین معاملات محاکات، رشک و حسد، طعن و تشنیع، شوق وصل و شکوۂ ہجران وغیرہ تمام وہ جذبات جو پندارِ عشق کے ساتھ پیدا ہوتے ہین غالب کے یہان نہایت خوبی و اہتمام سے پائے جاتے ہین، لیکن جہانتک جذبات استسلام (Passive feelings) کا تعلق ہے، غالب کی شاعری کوئی خاص امتیاز نہین رکھتی۔ یہی سبب ہے کہ غالب کے قصاید اُس کی غزلون سے اور مثنویان قصاید سے بہتر ہین۔ کیونکہ قصاید مین رنگ تغزل ضروری نہین اور مثنوی مین وسعت بیان کے لئے کافی میدان موجود ہوتا ہے جسمین غالب ایسا محاکات نویس و معاملہ نگار پورا زورِ طبیعت صرف کر سکتا ہے۔

"نیاز"

سالومی — آسکر وائلڈ کے نہایت مشہور ڈرامہ کا ترجمہ جسے جناب مجنون گورکھپوری نے اپنی قوت بیان اور سلاست کے ساتھ کیا ہے جو آسکر وائلڈ کے خصوصیات انشاء مین داخل ہین اس مین ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے جسمین اس ڈرامہ کی تاریخ و دیگر خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲ر

مینیجر "نگار" لکھنؤ

ہوا کا ترانہ

نہ ہے رہبر کوئی میرا نہ ہے رہزن میرا کہین منزل ہے مری اور نہ مسکن میرا
مست پرواز سدا رہتا ہے توسن میرا کبھی اُلجھا نہ کسی خار سے دامن میرا
آ رہی ہون مین کہان سے یہ مجھے یاد نہین
کوئی دنیا مین مری طرح بھی آزاد نہین

گام پیما ہون مین خاموش بیابانون مین میرے ہنگامے تڑپتے ہین گلستانون مین
دشت مین، وادی کہسار مین، ویرانون مین بزم آرا ہون مین دنیا کے شبستانون مین
وہ فضا کون سی ہے مجھ سے جو آباد نہین
کون سا لب ہے وہ جس پر مری روداد نہین

ابر ہین سبزۂ گردون پہ خرامان مجھ سے قلزم آب مین موجین ہین غزلخوان مجھ سے
صحن گلزار ہے فردوس بہ دامان مجھ سے رقص پیما ہین شرر ہائے گلستان مجھ سے
عکس آرائے گلگون ہے مرے سینے مین
زندگی جلوہ نما ہے اسی آئینے مین

ہر طرف پھیلی ہے اس باغ مین نکہت میری نہین دیکھی ہے کسی نے کبھی صورت میری
ایک حالت پہ نہین رہتی ہے فطرت میری ہر طرف مجھ کو لئے پھرتی ہے وحشت میری
نقش ہوتے نہین جنبش سے نمایان میری
جادہ رفتار سے رہتا ہے گریزان میری

مین اُڑا لاتی ہون پھولون کی بہار رنگین مین الٹ دیتی ہون سے کدہ دیار رنگین
توڑ لیتی ہون مین گلہائے شرار رنگین مین چرا لاتی ہون نغمون کے نگار رنگین
آہ و فریاد کے پوشیدہ ہین پارے مجھ مین
سو رہے ہین غم و عشرت کے شرارے مجھ مین

کشمکش سے مرے ہوتے ہین ترنم پیدا میرے جلوون سے ہے کلیون مین تبسم پیدا
پتیون مین مرے دم سے ہے تکلم پیدا مین نے سبزہ پہ کئے صبح دم انجم پیدا

سن کے میرے نفس مست سے اعجاز بہار
لب ساحل پہ بجا کرتے ہین موجون کے ستار

قصر گل توڑ کے نکہت کو چراتی ہون مین — دشت و کہسار کو پھولون مین بساتی ہون مین
لے کے گہوارہ مین کلیون کو کھلاتی ہون مین — برگ خوابیدہ کو نغمون سے جگاتی ہون مین

صبح دم باغ مین شاخون کو سنوار آتی ہون
گل کے افسردہ چراغون کو اُتار آتی ہون

آہ کرتی ہون مین جا کر کبھی ویرانون مین — کبھی گاتی ہون ترانے مین شبستانون مین
پھول چنتی ہون کبھی آکے گلستانون مین — اور اڑاتی ہون کبھی خاک بیابانون مین

جام شبنم کبھی پھولون کو پلا دیتی ہون
ان کی محفل سے کبھی ان کو اُٹھا دیتی ہون

بال سنبل کے کبھی کھینچ لیا کرتی ہون — دامن گل پہ کبھی رقص کیا کرتی ہون
کبھی دوشیزۂ نرگس سے حیا کرتی ہون — چوم کر لب کبھی پھولون کے چھپا کرتی ہون

فرش سبزہ پہ کبھی ناز سے اٹھلاتی ہون
تھام کر دامن نکہت کبھی اتراتی ہون

چادرِ گرد اڑا لاتی ہون صحراؤن سے — گوہر آب چرا لاتی ہون دریاؤن سے
شاہدِ مے کو بھگا لاتی ہون میناؤن سے — نکہت گل کو جگا لاتی ہون ایماؤن سے

توڑ لیتی ہون گل شمع شبستانون مین
جام شبنم کو پٹک دیتی ہون ویرانون مین

تنگ آجاتی ہون جب گھوم کے صحرا و چمن — آکے دریا مین بناتی ہون مین آبی مسکن
اُس مین بُنتی ہون شعاعون سے انوکھا دامن — یاد آتے ہین مگر جب گلِ صحرائے وطن

دم مین بس توڑ کے اس خیمۂ آبی کی رسن
برق مضطر کی طرح اڑتی ہون بے رنج و محن

تاب خورشید سے جب کانپنے لگتی ہے فضا — جسم کو پیرہن خاک مین لیتی ہون چھپا
نئے کے دامن مین بھر اپنے خس و خاشاک بلا — رقص کرتی ہوئی اٹھتی ہون مین منارِ نما

اک بلندی پہ بناتی ہون نشیمن اپنا
پھر اُتر آتی ہون مین پھاڑ کے دامن اپنا

لب جو آئینہ پھولون کو دکھاتی ہون کبھی　　اور گہوارہ مین موجون کے کھلاتی ہون کبھی
وصل و ہجران کے مزے دم مین چکھاتی ہون کبھی　　مین ملاتی ہون کبھی اُن کو ہٹاتی ہون کبھی

دشت و کہسار مین نکہت کو بھرایا مین نے
عالمِ خواب مین غنچون کو ہنسایا مین نے

آکے سنتی ہون کبھی نغمۂ مرغانِ بہار　　کبھی پھولون کا لگاتی ہون چمن مین انبار
ناچتی ہون کبھی دامن مین لئے اپنے شرار　　کھیلتی ہون کبھی چشمون کو بنا کر گلزار

چھیڑ کر موج کو اک زمزمہ سنتی ہون کبھی
آستین پیرہنِ آب کی چنتی ہون کبھی

چاند جب کھول کے دروازۂ زرین اپنا　　کہتا ہے تارون سے افسانۂ غمگین اپنا
جوش مستی مین لئے بربطِ پرِ دین اپنا　　آکے مین چھیڑتی ہون نغمۂ رنگین اپنا

رقص کرتے ہین مرے سامنے گلہائے چمن
چومتی ہون مین لبِ نکہت فردوس وطن

جامِ مہتاب سے جب ہو کے ستارے مدہوش　　سنتے ہین شاہدِ فطرت کی نوائے خاموش
چادر ابر سمن بار سے پیرایہ بدوش　　آکے ہوتی ہون مین اس بزم مین افسانہ نیوش

کبھی چھپ جاتی ہون لیکر گلِ انجم کی بہار
اور ہنستی ہون بنا کر یہی پھر نقش و نگار

چاند کو توڑ کے موجون پہ بہاتی ہون کبھی　　اور ٹوٹے ہوئے ٹکڑون کو ملاتی ہون کبھی
گل سوسن کی طرح اُس کو ہنساتی ہون کبھی　　چھین دامن مین اُسے اپنے چراتی ہون کبھی

اُس کو آغوش مین لے کر کبھی سو جاتی ہون
ظلمتِ شب کی طرح نور مین کھو جاتی ہون

چادرِ ابر پہ لے کر کبھی مستی مین قلم　　مین بناتی ہون کہین شہر کہین بزم صنم
کہین مینار، کہین قصر، کہین رقص علم　　کہین چشمے، کہین کہسار، کہین باغ ارم

دم مین یہ نقش بنا کر مین مٹا دیتی ہون
آئینہ شاہدِ ہستی کو دکھا دیتی ہون

شور کرتی ہون مین آکر کبھی ویرانون مین　　خیمہ بردوش کبھی پھرتی ہون میدانون مین
کبھی پردون کو الٹ دیتی ہون ایوانون مین　　کھیلتی ہون کبھی شمعون سے شبستانون مین

حسن گلزار کو کرتی ہون مین مستی مین خراب
آکے موجون پر تڑپتی ہون مین ہو کر بے تاب

لے کے گرداب مین کشتی کو مچلتی ہون کبھی — بادبان چیر کے جون برق نکلتی ہون کبھی
مین اُگلتی ہون کبھی اُس کو نگلتی ہون کبھی — منہ مین مچھلی کی طرح لے کے اچھلتی ہون کبھی
پھینک دیتی ہون کبھی دشت کو دریاؤن مین
کبھی دریا کو الٹ دیتی ہون صحراؤن مین

ابر کی فوج کو میدان مین لاتی ہون مین — شور کر کے دہل رعد بجاتی ہون مین
آگے آگے علم برق ہلاتی ہون مین — لشکر مہر کو حملون سے بھگاتی ہون مین
ہنس کے پھر بادشہ نور کو شرماتی ہون
چادرِ قوس قزح اوڑھ کے سو جاتی ہون

میرے آغوش مین سوتے ہین ہزارون طوفان — ہین ہزارون میرے دامن پہ بہارین قربان
قہر مین کرتی ہون سیلاب پہ دنیا کو روان — اور خوشی مین اُسے کر دیتی ہون فردوس نشان
رقص کرتے ہین ہر اک رنگ کے جوہر مجھ مین
مین ہون عالم مین نہان عالم محشر مجھ مین

یاسمن روکتی ہے ناز سے توسن میرا — ہنس کے گل کھینچتے ہین گوشۂ دامن میرا
ہاتھ ہی ہاتھ لئے شاہ سوسن میرا — کہتی ہے ناز سے آ دیکھ نشیمن میرا
کوئی پہناتا ہے پیراہن نکہت مجھ کو
اور سناتا ہے کوئی نغمۂ عشرت مجھ کو

نگرانِ عشوہ گردن سے مین چھڑا کر دامن — موج دریا کی طرح دیکھتی صحرا و چمن
جوشِ وحشت مین گزر جاتی ہون بے رنج و محن — کیا ہو مجھ پہ اثر جادوِ نسرین و سمن
میری رفتار مین مضمر ہے نشیمن میرا
میرے دامن کی فضاؤن مین ہے گلشن میرا

تھی مین گلبانگ جہان خیز ازل پر رقصان — حضرت نوح کے طوفان مین ہر سو تھی روان
مین ہون دیکھے ہوئے جمشید کی محفل کا سمان — یون ہی گاؤن گی سدا دیکھ کے نیرنگ جہان
ہے ہوا نام میرا کام روانی میرا
سب کو سیراب کئے رہتا ہے پانی میرا

طفیل احمد شمیمی بی۔اے

سیر کہسار

کھنچ چکا تھا پردۂ شب مطلعِ کہسار سے
چھن رہی تھی روشنی قطراتِ گوہر بار سے

کس طرح کھلنے سے رہتا غنچہ مرجھایا ہوا
ایک رنگِ قرمزی تھا چرخ پر چھایا ہوا

تھی فضا خاموش مثلِ پیکرِ "تصویرِ شوق"
اور قرطاسِ زمین پر پھول تھے "تحریرِ شوق"

پتی پتی سے نمایان شانِ محجوبی ہوئی
ٹھنڈی ٹھنڈی تھی ہوا بھی اوس مین ڈوبی ہوئی

ایک غفلت تھی مسلط وادیِ کہسار پر
چھا رہی تھی بیخودی "یا فطرتِ سرشار پر

یا نیازِ شوق مین ساری فضا مسجود تھی
قدرتِ تقویم گویا شاہدِ مقصود تھی

ناگہان اک نازپرور نازگستر نازنین
ماہ طلعت، ماہ رفعت، ماہ پیکر مہ جبین

ساتھ اپنے ہمنشین کے سیر کرنے آ گئی
بیخودی سی اور کچھ ساری فضا پر چھا گئی

زلف اُس کی غیرتِ ظلمات یا مشکین کمند
یا "طنابِ عنبرین"، یا رشتۂ حسن بلند

فرق، رشکِ برقِ کوہِ طور یا خطِ شہاب
یا افق پر پر جلوہ گر تار شعاعِ آفتاب

طاقِ ابرو سے عیان تھا حل کرے گا "ملکدہ"
سرخ ٹیکا بیچ مین تھا یا سوادِ "گل کدہ"

تھی وہ چلمن یا مژہ تھی مے فروشی پر تلی
یا دوکان تھی ساقیِ غارتگرِ دین کی کھلی

پتلے پتلے ہونٹھ تھے یا تھے خط جام شراب
انگبین ان سے چکان تھا یا روانِ رنگِ شہاب

نور کا فوارہ تھا یا گردنِ بلور تھی
یا صراحی نور کی یا برقِ کوہِ طور تھی

سینۂ شفاف گویا تختۂ کافور تھا
شانۂ سیمین جلائے غیرتِ بلور تھا

فطرتِ معصوم یا ناظورۂ مدہوش تھی
مختصر یہ ہے سراپا محشرِ خاموش تھی

اپنے پہلو مین لئے مصروفِ گلچینی تھا وہ
چشمِ شوق آرزو سے محوِ رنگینی تھا وہ

جب بکھرتی زلفِ شبگون اسکو سلجھاتا کبھی
جب پلٹتی چشمِ میگون، لڑکھڑا جاتا کبھی

جب تبسم کی جھلک دیتی پیامِ بیخودی
کروٹین لیکر بدل جاتا نظامِ بیخودی

جب غضب آلودہ تیور سے برستین بجلیان
وہ لرز جاتا مثالِ "طائرِ بے آشیان"

مختصر یہ ہے کہ دونون "ہمنوائے عشق تھے"
واقعاتِ عاشقی تھے "ماجرائے عشق" تھے

عشق مین حس ہے اگر تو حسن بے پروا نہین
جس مین بدمستی نہو ایسی کوئی صہبا نہین

لازم و ملزوم ہین سر چشمہائے زندگی ... باعثِ تنظیمِ دل ہین نغمہائے زندگی

چند ایسے شوخ لمحے ہین مآلِ زندگی!

ربطِ حسن و عشق حافظ ہے جمالِ زندگی!!

حافظ غازیپوری

جنوری سنہ ۳۰ء سے

دار الاشاعت نگار سے ایک نئے رسالہ کا اجراء

اس رسالہ کا نام جِنّ ہوگا۔ جِنّ کے لغوی معنی ہین ہر وہ چیز جو حواس ظاہری سے پوشیدہ ہو، اس لئے اس رسالہ مین تمام اُن امور، و واقعات سے بحث ہوگی جن کا تعلق "ماوراء عالم حواس" سے ہے اور جس مین جنات، ارواح خبیثہ مابعد الطبیعیات، روحانیات، وغیرہ سب شامل ہین۔ اس مین نہ صرف جنات وغیرہ کے معتبر واقعات وحکایات ہونگے، بلکہ ان پر تنقید بھی ہوگی، عالم ارواح و روحانیت کے متعلق جدید ترین تحقیقات و معلومات بھی ہونگی اور "حیات بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک جو کچھ دریافت ہو چکا ہے اور ہوتا جا رہا ہے وہ بھی درج ہوتا رہیگا۔

اس رسالہ کی تقطیع ۲۰×۲۶ ہوگی اور ۲۵ سطر کے مسطر پر دو کالم مین باریک خط سے لکھا جائیگا۔ حجم فی الحال دو جزو ہوگا جس مین ۸ صفحات مستقلاً علمی تحقیقات کے لئے وقف ہونگے۔ اس رسالے مین ارواح خبیثہ اور جنات کے جتنے واقعات درج ہونگے ان سب کو مصور پیش کیا جائیگا جس کے لئے ایک آرٹسٹ کی خدمات مستقلاً حاصل کی گئی ہین۔ رسالہ کی سالانہ قیمت ؎ تجویز کی گئی ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے چندہ قبول نہ کیا جائیگا۔

جن حضرات کو اس دنیا سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم اپنا پتہ بھیجدین تاکہ بعد اشاعت رسالہ کا نمونہ اُن کے پاس روانہ کیا جائے۔

اس کے ساتھ یہ استدعا بھی ہے کہ اگر کسی شخص پر اُس کی زندگی مین کوئی واقعہ ایسا گزرا ہے جسے وہ جنات یا بھوت پریت سے منسوب کرتا ہے تو براہ کرم اس کو قلمبند کر کے روانہ کردے زبان و تحریر کی پرواہ نہ کیجائے۔ یہان اس کو درست کر لیا جائے گا اور واقعہ کے مطابق تصاویر طیار کرالی جائینگی۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ صرف اپنا تجربہ و مشاہدہ پیش کیا جائے دوسرون سے نقل کی ہوئی روایت نہ ہو۔

پہلا پرچہ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کے نگار کے ساتھ ہی ساتھ شایع ہو جائے گا۔

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

تربیت اطفال

ذرہ دہر مین ہے نورِ قمر جلوہ فگن
سینۂ تخم مین ہے عکس شجر جلوہ فگن

صاعقہ پاش ہے گو موج روان دریا مین
دیکھنے والا مگر کوئی نہین دنیا مین

صحنِ گلشن سے اگر شاخ نہوتی رو پوش
ہوتے کچھ غنچۂ خوشرنگ وہان جلوہ فروش

قطرے نیسان کے صدف سے جو نہ باہر گرتے
ایسے دُر بنتے کہ پھر نظرون سے گوہر گرتے

آہ اطفالِ وطن آج جو آوارہ ہین
ماہ بے نور ہین، آئینۂ ناکارہ ہین

صیقل علم سے گر انکو جلا دی جاتی
انکے سینون ہی سے پھر کسبِ ضیا کی جاتی

(محمود - اسرائیلی)

تحریصِ عمل

تو ہی بلبلِ چمن ہے ہمہ سوز و ساز ہوجا
تو ہی شمعِ انجمن ہے ہمہ تن گداز ہوجا

یہ ترا سکون پیہم ہے حریفِ زندگانی
اسے سونپ کر خدا کو تو خرام ناز ہوجا

تری ہر ادا مین مضمر ہے جہان سرفرازی
ابھی اسکو آزمالے۔ ابھی سرفراز ہوجا

تری بندگی کی خو نے نہ تجھے کہین کا رکھا
دلِ غزنوی بگڑ کر نگہ ایاز ہوجا

ہے ترے عمل کی دنیا جسے خواب کہہ رہا ہے
جو شعورِ زندگی ہے تو عمل نواز ہوجا

تری "بزمِ آرزو" کا ہے جنون "دعا" کو
تری "شمع جستجو" کی ہے تلاش ارتقا کو

ابن حزین

غزلیات

اختر شیرانی :-

دل و دماغ کو رو لونگا، آہ کر لونگا
تمھارے عشق مین سب کچھ تباہ کر لونگا!

جو تم سے کر دیا محروم، آسمان نے مجھے
مین اپنی عمر کو صرفِ گناہ کر لون گا!

ثواب کے لئے ہو جو گنہ وہ عینِ ثواب!
خدا کے نام پہ بھی اک گناہ کر لون گا!

حریمِ حضرتِ سلمیٰ کی سمت جاتا ہون
ہوا نہ ضبط تو چپکے سے آہ کر لون گا!

مجھے جو دیر و حرم مین کہین جگہ نہ ملی
ترے خیال ہی کو سجدہ گاہ کر لون گا!

یہ نوبہار، یہ ابر، یہ ہوا، یہ رنگِ شراب!
چلو جو ہو سو ہو، اب تو گناہ کرون گا

کسی حسین کے معصوم عشق مین اختر
جوانی کیا ہے مین سب کچھ تباہ کر لونگا!

دل شاہجہانپوری :-

بے نیازی ہے اُسکی عجز نواز
وقف سجدہ رہے جبینِ نیاز

اپنے نغمون کو چھیڑ اے بلبل
ہر گلِ تر ہے گوش بر آواز

کھینچ رہی ہین دلِ حزین کی رگین
ہم نفس اُٹھ رہا ہے پردۂ راز

شمع گریان ہون بزمِ ہستی مین
ہر نفس عشق مین ہے روح گداز

چھیڑتی ہے عبث ہوائے چمن
اب کہان ہم مین ہمتِ پرواز

زینتِ حسن بے حقیقت ہے
ہو نہ آلودۂ فریبِ مجاز

صورتِ شمع جل خموشی سے
ہے تقاضائے عشق سوز و گداز

شب غم اے دلِ فراق نصیب
ہے مصیبت خیالِ زلفِ دراز

کوچۂ عشق مین جنابِ دل
ہے عبث شکوۂ نشیب و فراز

افسر صدیقی امروہوی :-

رازِ ہستی کس سے پوچھین کون آشنا ہوش ہے
آئینہ خانے مین ایک ایک آئینہ خاموش ہے

حشر کیون برپا کرتا ہے اپنی فتنہ سامانی پہ ناز
میرے پہلو مین بھی اک ہنگامۂ خاموش ہے

شمع اپنی بتاتی ہے جلتا ہے پروانہ اگر
عشق تو دیوانہ ٹھہرا حسن کو کیون جوش ہے

ہنستے دیکھو کیون ڈالتے ہو روئے روشن پر نقاب
دیکھئے جلوہ تمھارا کس کو اتنا ہوش ہے

کان مین آتی نہین اب لن ترانی کی صدا!
ایک مدت ہو گئی دنیائے دل خاموش ہے

صبح خندان کی طرح افسر مرا دل ہے نہال
شام فرقت مین نہ جانے کون ہم آغوش ہے

نظیر لودھیانوی :-

تجھے دلبری کا مذاق ہے تو ہجوم سرو و سمن مین آ
بہ ہزار جلوۂ دمِ سحر تو نکل کے گھر سے چمن مین آ

تجھے ربط تیر و کمان سے کیا تجھے کام تیغ و سنان سے کیا
تو نہالِ حسن و جمال ہے تو بہار بن کے چمن مین آ

ذرہ کرم کبھی اے صبا یہ پیام میرا اُسے سنا
کہ جلو مین عالمِ نو لئے شبِ ماہ دہر کہن مین آ

نہ ہے یہ ریاضِ فرنگ مین نوائے جلوۂ گنگ مین
جو تلاشِ لیلیٰ آرزو ہے تجھے تو نجد کے بن مین آ

تو ہر ایک طرح کا ظلم سہ تو رضائے دوست مین مست رہ
تو صراطِ عشق مین گام اُٹھا تو دیارِ دار و رسن مین آ

جو اضطرابِ فنا نہین کبھی زندگی کا مزا نہین
جو نہین ہے شغلِ رباب و مے تو حریمِ اہلِ سخن مین آ

یہ کہا ہے خضر نے سمجھ کے تو نہ بے خبر ہو مآل سے
یہ نشاطِ عمر ہے یک نفس تو فریبِ چرخِ کہن مین آ

جو چڑھے تھے رنگ اُتر گئے کئی ماہ و سال گذر گئے
ہے پرانے دیس کا ذوق کیون تو نظیر اپنے وطن مین آ

معلومات

کانچ اور فولاد کا شہر اسوقت یوروپ کے مسائل تمدن مین سے ایک بڑا مسئلہ مکانون کی تعمیر کا ہے۔ آبادی کی کثرت سے جگہ مین تو اضافہ ہوتا نہین اور ہر آدمی کے لئے ہر نوع ایک معین جگہ زمین پر سانس لینے اور رہنے کے لئے ضروری ہے، چنانچہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہان کے موجودہ مکانات آبادی کے لحاظ سے بہت تنگ اور اصول صحت کے اعتبار سے ناقابل سکونت ہین نہ خاک سے پوری طرح حفاظت ہوتی ہے نہ ہوا اور روشنی کافی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ گنجان آبادی مین سڑک کے دونون جانب بلند عمارتون کا سلسلہ، نہ ہوا کو آزادی کے ساتھ آنے دیتا ہے نہ روشنی کو، اور ہر چند وہان کمرون کے اندر ہوا اور مصنوعی روشنی پہونچانے کا انتظام بہت پُر پیچ طریقون سے کیا جاتا ہے لیکن خاطر خواہ اس مین کامیابی نہین ہوتی۔

لندن کے ایک مشہور ماہر تعمیرات سنڈے اکسپرس مین اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہین کہ یہ مشکل صرف اس طرح حل ہو سکتی ہے کہ تعمیر نہایت سادہ ہو نیز علمی طور پر تعمیر ہی کا ایک جزو قرار دیا جائے اور بجائے اینٹ پتھر کے صرف فولاد اور کانچ کی عمارتین بنائی جائین۔ چنانچہ یوروپ و امریکہ کے ماہرین فن نے عمارتون کے بالکل نئے نقشے طیار کرنا شروع کر دیئے ہین اور بڑی حد تک تمام دقتون کو دور کر کے مستقبل کی تعمیرات پر علمی حیثیت سے کوششون کا آغاز ہو گیا ہے

تجویز یہ ہے کہ بجائے بنیاد کھودنے کے جس مین رطوبت، گندگی اور وقت سبھی کچھ پیدا ہوتی ہے، عمارتین صرف ستونون پر قایم کی جائین تاکہ سڑک بھی وسیع رہے، لوگون کی آمد و رفت مین بھی سہولت پیدا ہو اور دوکانون کو بھی کافی جگہ ملجائے۔ جدید عمارتین فولاد، کانچ اور کنکریٹ کی ہونگی جن کے نیچے باغ مصنوعی جھیلین، پیرنے کے حوض، تفریح گاہین وغیرہ سب بن سکین گی اور اس طرح یہ تمام اسباب صحت و تفریح شہر کے اندر ہی ہر جگہ مہیا ہو سکین گے۔

لوگون کا خیال ہوگا کہ کانچ ایسی نازک چیز کے مکانات بہت کمزور ہونگے لیکن یہ صحیح نہین کیونکہ اگر کانچ بہت دبیز استعمال کیا جائے تو اس سے زیادہ مضبوط کوئی چیز نہین اور اس کی دیوارین چھتین، دروازے، اور ستون بغیر کسی خطرہ کے بنائے جا سکتے ہین، اسی کے ساتھ سب سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ شیشہ پر نقاشی، رنگسازی وغیرہ بھی بہت آسانی سے ہو سکتی ہے اور اُسے جس طرح چاہین ڈھال سکتے ہین اور حسین سے حسین چیز اس کی طیار کر سکتے ہین، پھر چونکہ وہ صاف رہنے والی چیز ہے، تم کو قبول نہین کرتی، اس پر خاک نہین جمتی اس لئے صحت کے لئے بھی بہت مفید ہے اور ارزانی اسکی ظاہر ہے۔

شیشہ کی عمارتون مین مصنوعی روشنی کا سوال بھی بالکل اُٹھ جائیگا کیونکہ یہ عمارتین ایسی بنائی جائین گی کہ از خود روشن ہو جائین اور اس طرح گویا کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے مکانات روشنی کے بنے ہوئے ہونگے

اہرام مصری کا راز اہرام مصری کے متعلق ایک نہایت عجیب و غریب نظریہ حال ہی مین یہ قایم کیا گیا ہے کہ مصر قدیم کے کاہن اس سے دھوپ گھڑی کا کام لیتے تھے اور موسم کی پیمایش کرتے تھے۔ مسٹر کاٹسورتھ نے جو اس قیاس کا موجد ہے، حکومت مصر کو لکھا ہے کہ سب سے بڑے مینار کی چوٹی کا منہدم حصہ بنانے کی اجازت دیجائے تاکہ اس کا تجربہ ہو سکے۔

اس کا خیال ہے کہ مینار کا شمالی حصہ بجائے ڈایل یا سایہ دیکھنے کی جگہ کے استعمال ہوتا تھا اور اس کا تجربہ کرنے کے لئے مینار کی چوٹی کی تعمیر ضروری ہوگی۔

اس وقت تک جو عام طور پر یہ خیال قایم کیا جاتا ہے کہ اہرام مصری صرف فراعنہ کی لاشون کو محفوظ رکھنے کے لئے بنائے گئے تھے، مسٹر کاسٹورتھ کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدیم اہل مصر بڑے عملی لوگ تھے اور اہرام مصر صرف اس غرض سے بنائے گئے تھے کہ مصر کے کاہن اس کی مدد سے موسمون کی تعیین کر سکین، چنانچہ اہل مصر اس مدد سے اپنے ایک خاص غلہ کی تین تین فصلین کاشت کر لیتے تھے۔ تیسری مرتبہ کاشت کرنے کے لئے اگر دو چار دن کی بھی دیر ہو جاتی تو فصل خراب ہو جاتی تھی لیکن اہرام مصری کی مدد سے ایک دن کیا بلکہ ایک گھنٹہ کی بھی دیر نہ ہوتی تھی اور وقت کاشت کی بالکل صحیح تعیین ہو جاتی تھی،

اہرام مصر گویا کاہنین مصر کی پوشیدہ جنتری تھی جس کی مدد سے وہ مصر کے کاشتکارون کو احکام صادر کرتے رہتے تھے اور اس کے راز کو وہ کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔ چونکہ مصر کی ساری آبادی کاشتکاری پیشہ تھی اور خود ان کو وقت و موسم کے تعیین کا طریقہ معلوم نہ تھا، اس لئے وہ کاہنون کو نہایت ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کا بڑا اثر سارے ملک پر قایم تھا۔ وہان کے کاہن ہر ماہ کے دسوین، بیسوین اور تیسوین دن ہر عشرہ کا پروگرام بتا دیا کرتے تھے کہ آیندہ دس دن مین کیا کرنا چاہئے اور موسم کی کیا حالت ہوگی مثلاً:- خزان شروع ہو گئی ہے۔ دریائے نیل پوری طغیانی پر ہوگا نہرون کے دہانے کھولدو، لونگ چقندر اور شلغم کی کاشت شروع کر دو، بھیڑون کو مینڈھون سے علیحدہ کردو، زیتون اور روئی چن لو، پھلون کو جمع کر لو۔

اور یہ تمام پیشین گوئیان وہ اہرام مصری کی مدد سے کیا کرتے تھے اگر مسٹر کاسٹورتھ کا یہ قیاس صحیح نکلا اور حکومت مصر نے اس کو مزید تفتیش کی اجازت دیدی تو یقیناً یہ انکشاف نہایت ہی دلچسپ انکشاف ہوگا۔

زمین اور شہاب ثاقب | ڈاکٹر چارلس پی اولیور نے جو جامعہ پنسلوینیا کے رصد خانہ کے مہتمم ہین حال ہی مین فلکیات کی ایک مجلس مین تقریر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسوقت روزانہ کروڑ شہاب ثاقب زمین تک پہونچنے والے وہ ہین، جو ہمکو نظر آتے ہین ورنہ جو دوربین سے دیکھے جاتے ہین ان کی تعداد کا علم کسی کو نہین۔ پھر حیرت ہے کہ ان سے زمین کو کیون نقصان نہین پہونچا اس کا سبب یہ ہے کہ جب وہ آسمان سے ۳۰ سے لیکر ۳۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے چلتے ہین، تو فضا کی گرمی ان کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اور جب وہ زمین پر پہونچتے ہین تو راکھ کا ڈھیر ہوتے ہین، دوسرے انکی ضخامت بھی کم ہوتی ہے،

امریکہ کی عورت کا اسراف | دنیا کی تمام عورتین اپنے اسباب آرائش مین فضول خرچی کے لئے بدنام ہین، لیکن اس حیثیت سے نیویارک کی عورتین سب سے آگے ہین، چنانچہ امریکہ کے اخبارات کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۲۷ء مین عورتون اور لڑکیون نے صرف کپڑون پر (جواب اس قدر کم ہوگئے ہین کہ انکی سرحد تقریباً عریانی سے جا کر مل گئی ہے) جو رقم صرف کی ہے وہ ۱۹۲۵ء کی رقم سے ۱۳۷...... ڈالر یعنی تقریباً ۵۴ کروڑ روپیہ زیادہ ہے اور غریب مرد کو اسی اعتبار سے اپنے کپڑون مین کمی کرنا پڑی اور اس کمی کی مقدار ۱۹...... ڈالر ہے۔

بسم اللہ

نگار

فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء

ملاحظات ——— ۲
ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مشابہت۔ محمد نعیم الرحمن ایم اے ۹
بازگشت (افسانہ) —— مجنون گورکھپوری ۱۶
تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر —— عبدالمالک آروی ۲۷
لکھنؤ کے عہد شباب کی ایک شاعرہ ——— ۳۵
حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز —— عبدالقیوم رسا ۳۹
ازدواج مکرر ——— ۴۸
مرقع چغتائی (یعنی) دیوان غالب کا مصور اڈیشن —— ۵۳
مومن و کلام مومن —— کیفی چریاکوٹی ۶۱
مرد اور عورت —— بدر اصلاحی ۷۲
سیاح کی ڈائری ——— ۷۶
اظہار تمنا —— عزیز احمد ۸۱
باب الاستفسار ——— ۸۲
الہام شعر —— سید علی اختر اختر ۸۵
مشاہدات —— جوش ملیح آبادی ۸۶
شالامار باغ —— محمود علی خان محمود ۸۸
یاد محبوب —— ثاقب جالندھری ۸۹
غزلیات ——— ۹۰
معلومات —— قیسی ۹۳
مطبوعات موصولہ ——— ۹۶

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶)	اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء	شمارہ (۴)

ملاحظات

گذشتہ ماہ کے رسالہ کو کسی نے "سنان ونشتر" سے تعبیر کیا اور کسی نے "تیغ وتفنگ" سے اور جسقدر "جراحت پذیری" کی اہلیت کا تعلق ہے، اس کے اور نام بھی "مراتب تاثر" کے لحاظ سے رکھے جا سکتے ہیں لیکن مجھے اگر مسرت ہے تو صرف اس خیال سے کہ اگر ایک طرف یہ "تپش مذبوحی" ، جراحت ناکام کا پتہ دے رہی ہے تو دوسری طرف بحمد اللہ "بر بنیاد زکشتگان آواز" کا منظر بھی دل بڑھانے کے لئے موجود ہے۔ اور اگر تماشائیوں کے "آفرین مرحبا" کو بھی اسی میں شامل کر لیا جائے تو پھر "دیت وخونبہا" کا سوال اُس "عشوۂ و تبسّم" سے آگے نہیں بڑھتا جسے ظہوری فخر کے ساتھ سرمایۂ تحمید و تقدیس کی صورت پیش کرتا ہے

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب بعض حضرات میری تحریروں سے عصبیت مذہب کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ میری تنقیدیں خواہ وہ مذہب ومعاشرت سے متعلق ہوں، یا علم وادب سے اس خلوص نیت کا نتیجہ ہوتی ہیں جس کی اگر کوئی دنیاوی تعبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ

شکایتے ست نہ گنجد بدل زبسیاری

میں اس سے قبل بھی بارہا عرض کرچکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ تشیع و تسنن تو خیر نہایت ہی معمولی بات ہے میں نے تو اصطلاحی کفر و اسلام کا پردۂ امتیاز بھی نوچ کے پھینک دیا ہے اور میں اُس دعوے کے ساتھ نہ جس کے لئے تصدیق کی ضرورت ہوتی ہے نہ تردید کا اندیشہ ''بصور سرافیل'' اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر جنّت نام ہے صرف سکون روح و طمانیت قلب کا اور اگر یہ جنّت ایک امرشب زندہ دار صرف تقشّف ہی سے حاصل کرسکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ

فردوس را بدام نگہ می کنم شکار

میں اس چیز سے واقف ہوں، جس کی جستجو دیر و حرم میں کیجا رہی ہے، میں اس مقصود کو جانتا ہوں کہ جس کو مساجد و کنایس میں ڈھونڈھا جا رہا ہے، اور میں اس حقیقت سے بھی بےخبر نہیں ہوں کہ یہ محراب و منبر پر پیشانیاں رگڑ رگڑ کر نوشتۂ تقدیر کو مٹا دینے کی کوشش کرنے والے آجتک یہی نہیں سمجھ سکے کہ وہ کیا چیز ہے جو سجدہائے نیاز کا مسجود ہوسکتی ہے اور وہ کونسا پردہ ہے جس کے اٹھنے کے بعد یہ تمام اعتبارات سطحی یہ جملہ ممیزات قشری محو ہو کر

چشم وا کردن زمین تا آسمان آغوش داشت

بنجاتے ہیں۔ پھر اس سے قبل خدا معلوم کتنی زریں صبحیں، کتنی رنگین شامیں، کتنی خنک راتیں میں نے صرف اس غور و تامل میں صرف کردیں کہ کیا منصور کا انا الحق کہکر دار و رسن کی منزل سے گزر جانا واقعی شاہد مقصود کے چہرہ سے حجاب کا اٹھا دینا تھا اور کیا میں بھی اگر ایسا دعوی کروں تو بیجا ہوگا، لیکن میں ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہونچا کہ اول تو وہ منزل جسے

''مرا کردہ اند آشکارا بمن''

کہتے ہیں خود کوئی ایسی بلند منزل نہیں جس کو ہر شخص بادنیٰ تامل نہ پاسکتا ہو چہ جائیکہ اس میں بھی ناصبوری سے کام لیا جائے۔ اس لئے میں بے نیازانہ انداز سے آگے بڑھا اور میں نے اپنی فطری ودیعتوں میں سے ایک نہایت ہی ابتدائی منزل کی ودیعت کو بے نقاب کرنا چاہا لیکن حیرت ہے کہ دنیا اس کے بھی سمجھنے کے لئے تیار نہیں اور جسوقت میں یہ دعوی کرتا ہوں کہ

''یک مے ز آبگینہ و ساغر بر آورم''

تو وہ مجھ سے منھ پھیر لیتی ہے، مجھے کافر کہتی ہے دہریہ اور ملحد کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے جہل سے میرے علم کو مغلوب کرنا چاہتی ہے، حالانکہ یہاں یہ عالم ہے کہ ''گرانی محمل'' کا احساس جسقدر قوی ہوتا جاتا ہے، اسی اعتبار سے

ہر پردہ را بو لولہ سنجم ہزار بار

اس لئے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب و مسلک کے متبع ہوں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے شاہد مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں، یہ جملہ اضافات وہی حقیقت رکھتی ہیں جو ''پارۂ کتاں'' چاند کے سامنے، اور بحمد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس ''نا استواری نسیج'' کا تماشہ دیکھنے کے لئے ایک لمحہ کے بھی اپنی نگاہ پستی کی طرف مائل کروں۔ ——— دنیا اگر اپنی صحرا نوردیوں میں خضر کو راہبر بنانا چاہتی ہے تو بنائے اور جبتک جی چاہے سکندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اُس جستجو میں دعوتِ شرکت نہ دے کہ۔

سیلاب را بہ بادیہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایک طرف یہ عزم استوار ہے کہ تنقید خواہ وہ معاشرت و اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب و سیاسیات سے ، ہمیشہ بلند نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے، تو دوسری طرف میں اپنی فطرت کی اس کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی اور اس لئے جب مجھے اس کا علم ہوجاتا ہے کہ میری تحریر یا نگار کے کسی مضمون سے کسی کو صدمہ پہونچ گیا ہے، تو میں بہت ملول ہوجاتا ہوں۔ بنا براں اگر گذشتہ ماہ کے نگار سے کسی خاص شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہونچی ہے تو میں اسکی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہوجاتی ہے تو صرف اس لئے کہ

مستم چناں کہ گل نشناسم ز نوک خار

اس سلسلہ میں مجھ کو برا کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو انتقام لینے کے لئے صرف اپنے اہرمن سے چارہ سازی چاہتے ہیں اور گالیوں کی آزار رسانی کے سوا ان کے پاس کوئی آلۂ حرب نہیں ہوتا۔ اور دوسرے وہ جو میری تحریر میں بے حجابی، عریانی، فحاشی وغیرہ کے نقائص نکالکر اپنے پندار میں مجھے ذلیل و خفیف کرنا چاہتے ہیں۔ سو اول الذکر جماعت سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس طرح انکا اہرمن ان کے ساتھ ہے اسی طرح میرا یزداں میرے ساتھ ہے۔ اور اس لئے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اور موخر الذکر جماعت کے حضور میں اپنے ذوق ادب دانشا کی طرف سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں عرض کرسکتا کہ

نظارۂ خوبان و مے و نغمہ حرام است
دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا

میرے پاس وہ مطبوعہ اعلان آیا ہے جسے کلکتہ میں قائم ہونے والی "لیگ اگینسٹ ملاازم" نے اپنے مقصد کی تبلیغ کے لئے شایع کیا ہے۔ اس لیگ کے روح رواں اور صدر مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں اور سید محمد عثمان فاضل نائب صدر۔ اس لیگ کے قیام کا مدعا اُس ذہنیت کی مخالفت ہے جو تنگ نظری، تنگ دلی، تقلید و جمود، تعصب و عدم رواداری کو مذہب کے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ اس ذہنیت کا اصطلاحی نام اس انجمن نے ملاازم اور اس ذہنیت والوں کا ملا رکھا ہے۔ اس اعلان کے آخری صفحہ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انجمن الحاد و دہریت کی حامی نہیں ہے اور نہ ہر عالم دین کی مخالف ہے بلکہ وہ صرف ان نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے خلاف ہے جن میں یہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔

جس حد تک الفاظ اعلان کا تعلق ہے اس انجمن کے مقاصد نہایت ہی پاکیزہ اور قابل قبول معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن عملی حیثیت سے مجھے اس کے اندر چند در چند کمزوریاں محسوس ہوتی ہیں۔ جس وقت پبلک کے سامنے یہ دعوائے پیش کیا جائے گا کہ ملاؤں کی جماعت تنگ نظر ہے متعصب ہے، تقلید کی پابند ہے تو لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان کی تنگ نظری تعصب اور تقلید مذہب کے اندر ہے یا اس سے باہر ظاہر ہے کہ اس سے باہر نہیں ہوسکتی اور ہو تو بھی کون مانتا ہے۔ اس لئے وہ مذہب ہی سے متعلق ہوگی اور جس وقت آپ مذہبی مناظرہ

کریں گے تو ایک غیر متناہی سلسلہ "قال، اقول" کا پیدا ہو جائے گا اور آخر کار وہ مقصد حاصل نہ ہوگا جس کے لئے یہ لیگ قایم کی گئی ہے

اگر یہ لیگ مذہب کے ساتھ ساتھ ملاؤں کی مخالفت کرنا چاہتی ہے تو کوئی توقع کامیابی کی نہیں ہو سکتی اور نہ مذہب کی موجودہ مراسم کی حمایت کرتے ہوئے ملاؤں کے خلاف کوئی کامیاب پروپیگنڈا ہو سکتا ہے لیکن اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ جو اسلام اس جماعت نے پیش کیا ہے، وہی شروع سے غلط ہے اور ان میں سے ایک بھی بلا استثنار مذہب اسلام کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا تو بیشک یہ لیگ کچھ اہمیت اختیار کر سکتی ہے اور اصلاح کی بھی اس سے توقع ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل خلاف اصول ہے کہ اس جماعت میں سے بعض کو علحدہ کر دیا جائے اور بعض کو لے لیا جائے، بلکہ ایک سرے سے ان سب کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہئے اور لوگوں کو اسلام کی حقیقت ذہن نشین کر کے بتانا چاہئے کہ اسلام نام ہے صرف ترک مذہب کا، نسخ ادیان کا، تفریق قومی کے مٹانے کا اور جامعۂ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا، جس کا نام اخلاق اور صرف اخلاق ہے۔ اسلام مسجد و مندر کی تفریق سے بے نیاز ہے، زنار و تسبیح کے امتیاز سے بالاتر ہے نہ ناقوس و اذان کی تمیز اس کا نصب العین ہے نہ بیکرماں اور طواف کا فرق اس کا مطمح نظر۔ وہ تمام عالم کو، ساری کائنات کو، جملہ نوع بشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کر کے صرف ایک نقطہ پر لانا چاہتا ہے اور وہ اس مساوات کا مبلغ ہے جس سے زیادہ وسیع مساوات دنیا میں کسی ہادی و رہنما کسی نبی و رسول نے اس سے قبل پیش نہیں کی۔

وہ نہ کسی کے نام کو دیکھتا ہے، نہ وضع و صورت کو، نہ وہ نسب کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے نہ حسب کو، نہ دولت اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے نہ جاہ و ثروت۔ وہ دیکھتا ہے صرف رواداری کو، جذبۂ ایثار و فدویت کو، اور محض اس اضطراب کو جو بنی نوع انسانی کے ہر فرد میں دوسرے فرد کی اعانت کے لئے پیدا ہونا چاہئے۔

پھر آج اسلام کا صحیح مفہوم بتانے کے لئے سب سے پہلے ضرورت ہے اُس عنصر کو محو کر دینے کی جو اسلام کو اصطلاحی لفظ قرار دیکر اس کو اخوت عامہ کے مقصد سے علحدہ کر رہا ہے اور موجودہ ضروریات تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصول معاشرت و حیات پر نظر ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرہ کو نہایت بدنما صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اگر زمانہ کے ساتھ لوگوں کے امیال و عواطف اور عقول و افکار میں تغیر ہونا ضروری ہے تو پھر یقیناً وہی مذہب حقیقی معنی میں خدائی مذہب کہلائے گا جو عہد و زمانہ کے لحاظ سے تمام عقول و اذہان کی رہبری کر سکے اور اپنے اندر اس تغیر کو روا رکھے جس کے بغیر "اخوت عامہ" کا مقصد عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔

پھر آج اگر منزل تک پہونچنے کا کوئی صحیح راستہ ہو سکتا ہے تو وہ نہ وہ ہے جسے تمام علماء دین زمانہ سے صدیوں پیچھے ہٹ کر متعین کر رہے ہیں اور نہ اس کی وہ تدبیر ہے جو کلکتہ کی اس لیگ نے بتائی ہے۔

اس لئے جس ایثار و قربانی، جس رسوخ و استواری کی ضرورت ہے وہ ہم میں سے سرمد و منصور کی طلبگار ہے سقراط و حسین کی متجسس ہے، اور اُن مردان خدا کی منتظر ہے جو ممبر پر نہیں بلکہ دار پر اس راز کا اعلان کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں

پھر اگر آج بعض نفوس مقدسہ اس قربانی کے لئے آمادہ ہو جائیں خدمت اسلام کے لئے اپنے تمام مصالح ذاتی کو پس پشت ڈالنے کے لئے طیار ہو جائیں، تو بغیر کسی لیگ کے قائم کئے ہوئے حقیقی مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور دنیا از خود ان مولویوں، ان ملاؤں، ان عالمان دین، ان پیران طریقت، ان تصوف پیشگان جم مرتبت کے بتوں کو ٹھکرا دینے کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے

مین اس لیگ کے ارباب کار کو بتانا چاہتا ہون کہ مین جس منزل مین ہون وہ ان کے لیگ کے مقاصد سے بہت بلند ہے اور میرے نزدیک اس نوع کی جماعتون یا انجمنون کا قیام ایک طفلانہ نمائش تو ضرور ہے لیکن سنجیدہ و موثر تدابیر سے اس کو کوئی علاقہ نہین ہو سکتا اگر اس لیگ کو کچھ کرنا ہے تو مین مشورہ دونگا کہ

بیفشان دامن و آزادہ برخیز

ورنہ اسے فنا ہو جانا چاہئے کیونکہ جو "پاے نبرد" نہ ہو اس کو "عشق نبرد پیشہ" کی دعوت پر لبیک کہنے کا کوئی حق حاصل نہین ہے

داس کا حکومت کے طرز عمل کے خلاف احتجاجاً فاقہ کی تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنے والی صعوبتون کو برداشت کرکے اس دنیا سے گزر جانا، گو بظاہر نہایت معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھین گے تو معلوم ہوگا کہ زمانہ ایسے "مردان خدا" چند سے زیادہ نہین پیدا کر سکا

اس وقت یقیناً یہ سوال ہے صرف ایک شخص، ایک معمولی انسان کے جان دیدینے کا، لیکن عاقبت بین نگاہین دیکھ سکتی ہین کہ یہ موت "احیا" ہے ایک قوم کا، نجات ہے ایک ملک کی

داس نہین مرا، بلکہ زندگی کا راز ہم کو بتا گیا، اس کے جنازہ پر پھول نہین برسائے گئے، بلکہ آزادی کی دیوی لئے تخت و تاج کو آراستہ کیا گیا اور اگر فطرت نے اپنے اصول نہین بدلے ہین تو ہم کہہ سکتے ہین کہ داس نے انتظار کی مدت کو بقدر نصف صدی کم کر دیا ہے اور وہ وقت دور نہین جب ارتھی پر سوگ کے پھول چڑھانے والے ہات، "ملکۂ حریت" کے جلوس مین مسرت کی گلباریان کرتے ہوئے نظر آئین گے

موت نام ہے دنیا سے محو ہو جانے کا - پھر کون ہے جو داس کو مردہ کہہ سکتا ہے - الا ان اولیاء اللہ لا یموتون - یقیناً داس اللہ کے اولیا مین سے ایک ولی تھا اور اگر مسلمان مجھے اس اظہار خیال پر اسلام سے خارج کرنا چاہین تو کر دین، مجھے پروا نہین

منت کش حسنیم کہ حقیقت نگر آمد

اور اگر وہ ولایت خداوندی کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص جانتے ہین تو کم از کم مجھے یقین نہ دلائین کہ میرے اوپر تو اس کے خیال سے بھی موت کا سا جمود طاری ہونے لگتا ہے اور نہ اپنی قربانیون کا ذکر کرین کہ

دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تگ و دو مین اس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکنا ہندو مسلم تفریق کی وجہ سے ہے اور یہ بھی غلط نہین کہ اس تفریق کے قیام مین ہندوؤن کی تنگ نظری اور عصبیت بہت معاون ہو رہی ہے لیکن کیا مسلمان اس باب مین بالکل معصوم ہین کیا وہ ہندوستان کی مسئلۂ آزادی کو واقعی بہت اہم سمجھتے ہین اور کیا وہ اپنی پوری توجہ اس طرف

صرف کر رہے ہین؟ ممکن ہے بعض نفوس اس دعوی کر سکین، لیکن عام طور پر مسلمانون کی ذہنیت اس درجہ انتشار و پراگندگی رکھتی ہے کہ اس وقت تک یہی نہین معلوم ہو سکا کہ انکا مقصود کیا ہے۔ کبھی وہ مسئلۂ تبلیغ کی کامیابی کو اپنے مرض کا علاج سمجھکر اس طرف متوجہ ہو جاتے ہین، کبھی "خدمت کعبہ" کو وہ اساس تہذیب و اخلاق جانکر اپنے آپ کو "خدام کعبہ" کہنے اور کہلوانے پر اصرار کرتے ہین کبھی "زوال خلافت" پر مجلس عزا مرتب کرکے اس کا نام "خلافت کمیٹی" رکھتے ہین اور اب خیر سے فلسطین کے معاملہ نے ایک اور نئی چیز "فلسطین کمیٹی" کی بنیاد کا مواد فراہم کر دیا ہے۔ گویا ہندوستان کے مسلمان ساری دنیا کے ذمہ دار ہین اور جب تک یہ ہندوستان مین بیٹھکر کوئی رزولیوشن پاس نہ کر دینگے اس وقت تک عالم اسلامی کی کوئی مشکل حل ہو ہی نہین سکتی۔ لیکن اس "خاک بسر" قوم سے کوئی پوچھے کہ۔ اس وقت تک ان تمام مذہبی، سیاسی اور اخلاقی انجمنون نے کیا کارہائے نمایان انجام دئے اور ان تحریکات مین حصہ لینے کے بعد دوسرون کو کیا فایدہ پہونچا یا اور خود کیا فایدہ حاصل کیا۔ خلافت ختم ہونے کے بعد خلافت کمیٹی قایم ہوئی اور دولت بے اندازہ ہندوستان کے غریب مسلمانون سے جمع کی گئی، لیکن کیا حکومت حجاز نے ارض مقدسہ سے یہود و نصاری کے اثرات محو کرنے مین کوئی مدد ان کی، کیا وہ اس سلسلہ مین اپنی کسی حقیر سے حقیر آرزو کو بھی پورا دیکھنے مین کامیاب ہو سکے۔ اسی طرح خدام کعبہ کی حیثیت سے وہ مسئول ہو سکتے ہین کہ اس باب مین ان کے خدمات کیا ہین۔ کیا حاجیون کی جماعت کو بمبئی مین ٹکٹ خرید کرکے لا دینا، مسافرخانون مین لاکر ان کو ٹھیرا دینا اور جہاز پر سوار کرا دینا اتنا بڑا کام ہے کہ اس سے زیادہ کوئی اور ذریعۂ نجات ہو ہی نہین ہو سکتا۔ جمعیۃ العلماء اور ان کی تبلیغ کا ذکر فضول ہے کیونکہ اب اس جماعت اور اس کے اس مقصد کی لغویت روز روشن کی طرح عیان ہے

اب اس ذہنیت کے ماتحت فلسطین کے مسئلہ مین ہنگامۂ گدایانہ برپا کیا جا رہا ہے، اور کیا عجب ہے کہ اس کے لئے بھی کوئی فہرست فراہمی چندہ کی کھولدی جائے۔ لیکن اس کا نتیجہ بھی جو کچھ ہونے والا ہے، کسی سے مخفی نہین۔ یہان کے مسلمان یہ نہین سمجھتے کہ جب تک وہ خود اپنی ملکی و مقامی حیثیت کو مستحکم و بلند نہ کرینگے اُن کے "طنین پشہ" کو کون سنیگا اور اُن کے شور و شغب سے دنیا کے یہ اصول کیونکر بدل سکتے ہین کہ پہاڑ سے سر ٹکرانا خود اپنے سر کو مجروح کرنا ہے۔ اگر مسلمان چاہتے ہین کہ واقعی ان کی آواز کو کوئی اہمیت دیجائے تو انکا فرض یہ ہونا چاہئے کہ پہلے اندرونی ملکی سیاسیات مین اپنے اندر ایک جماعت صالح کی سی اہمیت پیدا کرین اور جب خود اپنے گھر کو محفوظ کرلین تو دوسرون کے گھرون کی آگ بجھانے کی کوشش کرین۔ کیا ہندوستان کے مسلمانون کے باب مین، ترکی، ایران، افغانستان، مصر، فلسطین، حجاز کسی جگہ سے کوئی آواز بلند کیجاتی ہے، کیا کبھی سنا گیا ہے کہ وہان کی کسی انجمن نے کوئی تجویز اپنی حکومت کے ذریعہ سے حکومت برطانیہ کے پاس بھیجی ہو، پھر جب اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر قوم و جماعت اپنے ہی تحفظ کی منزل سے نہین گزری، تو ہندوستان کے مسلمانون کی یہ "انجمن آرائیان" اور "رزولیوشن فرمائیان" کیا اہمیت رکھ سکتی ہین

مین دیکھتا ہون کہ مسلمانون کی ایک جماعت اور غالباً بڑی جماعت سارو ابل کی منظوری سے چین بہ جبین نظر آتی ہے یہانتک کہ اسمبلی کے بعض مسلمان ممبر احتجاجاً ہال سے اٹھکر باہر چلے گئے۔ ہم نے مانا کہ صغر سنی کی شادیان ہندؤن مین زیادہ ہوتی ہین اور

یہ قانون انھون نے اپنے ہی معاشرت کی اصلاح کے لئے نافذ کرایا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب اصولاً مسلمان بھی اس کے مفاد کے منکر نہین ہین تو وہ کیون مخالفت کرتے ہین۔ رہا شریعت اسلامی کا سوال، سو مین پوچھتا ہون کہ کیا ہندوستان مین زنا کے جرم مین کسی کو سنگسار کیا جاتا ہے، کیا سرقہ کے ارتکاب پر کسی کے ہات قطع کئے جاتے ہین، کیا تہمت پر یہان حد قذف جاری ہوتی ہے، کیا شراب خواری پر دُرّے لگائے جاتے ہین، پھر جب مسلمان ان تمام تعزیرات کو جو شریعت اسلامی کے خلاف ہین گوارا کئے ہوئے ہین تو کوئی وجہ نہین کہ وہ سارداابل پر چراغ پا ہون علی الخصوص اُس وقت جبکہ مسلمانون مین بھی ہندؤن کے ساتھ میل جول رکھنے کی وجہ سے صغر سنی کی شادی کا رواج کچھ کم نہین ہے

صغر سنی کی شادی کو روکنے والا قانون باوجود اس کے کہ مسلمانون کی ایک جماعت نے مخالفت کی، منظور ہو گیا اور ۱۹۳۰ء سے اس کا نفاذ بھی ہو جائے گا، جہانتک عورتون کی صحت کا تعلق ہے یہ قانون بہت مفید ہے اور معاشری حالت کی درستی مین بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک قانون اس سے بہت زیادہ اہم تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہین کی اور جس کا نفاذ بقائے عقل وحواس اور تحفظ انسانیت واخلاق کے لئے ازبس ضروری ہے

اس وقت تمام اکناف ہند مین ایک کثیر جماعت ان لوگون کی دیکھی جاتی ہے جو اپنے آپ کو عالم دین کہتے ہین، صوفی راہ طریقت بتاتے ہین، مجالس وعظ مین سخت تباہ کن اور دشمن عقل وانصاف روایات بیان کرتے ہین صرف اس لئے کہ روپیہ کمائین، جاہلون اور احمقون کو اپنے کاذب کشف ومراقبہ سے دھوکا دیکر اپنا گرویدہ بناتے ہین تاکہ زندگی کے تمام نعایم ولذائذ اپنے لئے مخصوص کر لین درانحالیکہ انھون نے کوئی محنت نہین کی، کسی جفاکشی اور عرقریزی سے کام نہین لیا

اگر قانون تعزیرات ہند دغا مین ان کو گرفتار نہین کر سکتا، اگر ضابطہ فوجداری آوارہ گردی کے سلسلہ مین ان کو نیک چلنی کا پابند کا نہین بنا سکتا، اگر امتناع گداگری کا قانون اُن پر نافذ نہین ہو سکتا، تو کوئی وجہ نہین کہ ان کی تباہکاریون سے بچانے کے لئے، ایک علیحدہ قانون نہ مرتب کیا جائے اور ان معزز گداگرون، ان پڑھے لکھے بھکاریون کو جو "یسئلون الناس الحافا" کی ایک مخفی مگر نہایت ہی سخت لعنت مین مبتلا ہین وعظ بیشگی اور پیری مریدی سے نہ باز رکھا جائے۔ نہ ان کے پاس کوئی جائداد ہے نہ ریاست نہ یہ کہین ملازمت کرتے ہین، نہ تجارت لیکن دولت ہے کہ ان کے قدمون پر نثار کیجا رہی ہے، اور عیش ونشاط کی دیوی ہے کہ ہر وقت ان کے پہلو سے وابستہ نظر آتی ہے۔ مین نہین سمجھ سکتا کہ غریب اہل ہند کی وہ کمائی جو پسینہ مین ڈوب کر حاصل ہوتی ہے، کیون بلا کسی محنت واستحقاق مُزد کے ان مولویون، پیرون، سیدون پنڈتون، جوتشیون اور برہمنون کو دیدیجائے جو ایک متعدی مرض کے جراثیم کی طرح صرف وبا اور ہلاکت پھیلانے کے لئے رونما ہوئے ہین

کیا اسمبلی کے کسی ہندو یا مسلمان ممبر مین یہ جرأت ہے کہ وہ اس مسئلہ کو پیش کر کے تکمیل کی حد تک پہونچائے؟

نیاز

ہندی اور بابلی علم الاصنام کی مشابہت

(بہ سلسلہ ماسبق)

۷ - بھیم

گلگمیش اور ایع بانی قدیم بابل کے دو بڑے بڑے ہیرو تھے - اہل بابل کی متھیا مین ان دونون (اور خصوصاً گلگمیش) کا وُہی رتبہ تھا جو یونان مین ہرقل کا اور ہمارے ملک مین بھیم کا تھا بابل کے یہ دونون ہیرو ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست تھے - ایک ہفتخوان کو طے کرنے کے دوران مین ایع بانی کو موت کے دیوتا نے گرفتار کر کے زمین کے نیچے کے طبقہ مین مُردون کی سرزمین کو روانہ کر دیا (یعنی ایع بانی مر گیا) اور گلگمیش بھی بیماری مین مبتلا ہو گیا، تو مؤخر الذکر نے تہیہ کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے جد بزرگ پیر نپشتیم سے (جو زمین کے نیچے کی دنیا مین سمندر مین رہتا تھا) مل کر مدد لیگا اور اپنی اس پریشانی کو دور کریگا - چنانچہ وہ اس ارادہ سے نکلا، اور بڑے بڑے سر فلک پہاڑون اور اُن کی دشوار گزار گھاٹیون سے گزرتا، قدم قدم پر خونخوار شیرون سے لڑتا اور اُنھین قتل کرتا ہوا مشی پہاڑ کی ایک تنگ و تاریک سرنگ پر پہنچا جس کے دروازہ پر ایک بڑے سے بچھو کی شکل کے دیو اور اُس کی دیونی سے سابقہ ہوا - گلگمیش اُنھین دیکھتے ہی غش کھا کے گر پڑا - مگر چونکہ وہ جانتے تھے کہ گلگمیش دیوتا کا بچہ ہے اور دیوتاؤن کا سا جسم رکھتا ہے اس لئے اُنھون نے اُسے کچھ ایذا نہین دی - ہوش مین آیا تو دیو نے اس کے سفر کا مقصد دریافت کیا، اور معلوم کرنے پر اُسے بڑے پیار سے اور تمام دشواریون سے آگاہ کر کے اُن پر قابو پانے اور زندہ سلامت منزل مقصود تک پہنچ جانے کا طریقہ بتایا - چنانچہ گلگمیش ان ہدایتون پر عمل کرتا اور طرح طرح کی دشواریون، خصوصاً "موت کے سمندر" کی آفتون سے بچتا ہوا آخر پیر نپشتیم کے پاس پہنچ گیا وہ پیر کو جوان اور مضبوط چاق چوبند دیکھ کر بہت حیران ہوا - اس سے نہ رہا گیا اور پیر سے سوال کیا کہ "آپ باوجود اتنے سن رسیدہ ہونے کے اب تک کیونکر ایسے مضبوط اور جوان ہین؟" اس سوال کے جواب مین پیر نے اُسے طوفان کا قصہ سنایا (جو ادھر بیان ہو چکا ہے) - اس کے بعد گلگمیش نے اپنی ساری رام کہانی سنائی کہ کس طرح ایع بانی جیسے ہمدم وہمراز کا ساتھ چھوٹا اور وہ خود کیسی کیسی بیماریون مین مبتلا رہا اور کیا کیا آفتین جھیل کر وہان تک پہنچا - چونکہ بہت تھک چکا تھا، سو گیا پیر کی بیوی کو اُس پر ترس آیا، اور اُس نے اپنے شوہر سے کہا کہ "وہ اس لڑکے کو اپنے ہاتھ سے چھو دیجئے تاکہ اس کی سب بیماریان دُور ہو جائین اور اسے جادو کا کھانا کھلائیے تاکہ وہ پھر صحت اور سلامتی کے ساتھ اپنے گھر واپس پہنچ جائے"، چنانچہ ابھی گلگمیش سو ہی رہا تھا کہ پیر نے اُسے چھوا، اور پیر کی بیوی نے جادو سے تیار کی ہوئی غذا بھی اُسی حالت مین کھلا دی - گلگمیش جاگا تو اپنے اندر ایک نئی طاقت نئی روح محسوس کرتا تھا لیکن بوڑھے پیر کو اس پر بھی صبر نہ ہوا اور اُس نے گلگمیش کو "آب حیات" کے چشمے پر غسل کرنے کو بھیج دیا - اس غسل سے اُس کے جسم کی تمام بیماریان دور ہو گئین اور وہ پہلے سے بھی زیادہ تندرست اور توانا ہو گیا -

مہابھارت (بان پرب) مین بھیم کے متعلق بھی اسی قسم کی روایت درج ہے - بھیم نے بھی گلگمیش کی طرح کُبیر کے چشمے کی تلاش مین

جہان اُسے معلوم ہوا تھا کہ ایسے ایسے سُندر کنول پھول ہوتے ہین کہ دھرتی والون نے کبھی سُپنے مین بھی نہ دیکھے ہون اور اُن کو دیکھنے اور چھُونے سے ساری تھکن دُور ہو کر نیا زور اور بل پیدا ہوجاتا ہے۔ دیولوک تک پہنچنے کے لئے اُتر پورب کی طرف سفر کیا جس طرح گلگمیش کو پیرنپشتیم نے طوفان کا قصہ سنایا تھا اُسی طرح بھیم کو ہنومان جی مل گئے تھے اور اُنھون نے اُسے دنیا کی عمر کا حال بتایا تھا اور طوفان کی کہانی سنائی تھی جس نے اُس وقت سے پہلے کی سب نسلون کا ستیاناس کر دیا تھا۔ بھیم بھی کبیر تال پر پہنچ کر دیوون سے لڑا تھا، اور گلگمیش کی طرح اُسے بھی کبیر مین نہانے اور اُس کے امرت کے پینے سے ایک نیا بل نیا زور مل گیا تھا اور اُس کے جسم کے سارے گھاؤ اچھے ہوگئے تھے

بابلی متھیا مین گلگمیش کے سرنگ کو پار کرنے کی جو کہانی ہے (جس کا اوپر مختصر سا ذکر ہوا ہے) وہ ہندی متھیا کی اس کہانی سے بہت مشابہ ہے جس مین لنکا کا راجا راون سیتا جی کو اُٹھا کرلے گیا تھا اور ہنومان جی سیتا جی کی تلاش مین ایک بڑے لمبے سے غار کو پار کرکے ایک جوگن کے محل پر پہنچے تھے۔ ہنومان جی نے سری رام چندر جی سے کہا تھا کہ "مہاراج" مین نے راجا جنک کی بیٹی کو دیکھا ہے۔ جب ہم دکھن کے پہاڑون غارون اور جنگلون مین گھومتے گھومتے تھک گئے تو ہمین ایک بڑا سا غار دکھائی دیا۔ ہم اُس غار مین گھُس گئے۔ اندر پہنچ کے معلوم ہوا کہ غار بہت گہرا ہے۔ چارون طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ہر طرف بڑے بڑے درخت تھے، اور زمین پر بھانت بھانت کے بھیانک کیڑے مکوڑے رینگتے پھرتے تھے۔ بڑی بڑی آفتون کا سامنا کرکے ہم نے اُس غار کو پار کیا، دور تک نکل جانے کے بعد ہمین سورج کی روشنی دکھائی دی اور ایک بڑی سی گڑھی نظر پڑی۔ یہ مایا دیوی کی گڑھی تھی۔ اُس مین پربھاوتی نام ایک جوگن اپنی تپسیا مین مشغول تھی۔ اُس نے ہمین طرح طرح کھانے پینے کی چیزین دین۔ جب ہم کھا پی چکے اور تازہ دم ہوگئے تو جوگن کے بتائے ہوئے راستے پر چل کھڑے ہوئے۔ جب ہم اُس غار سے نکلے تو ہمین ایک سمندر نظر آیا جس کے کنارے پر تین پہاڑ تھے۔ ہم نے اُن مین سے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر دیکھا تو سامنے ایک بہت بڑا سا سمندر دکھائی دیا۔ تب تو ہم لوگ اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے اور ہمین کسی طرح کی امید نہین رہ گئی کہ اب ہم اپنے گھر واپس پہنچ سکینگے..... وغیرہ وغیرہ۔ اُسی جگہ ہنومان جی اور اُن کے ساتھیون کو ایک بڑا سا عقاب ملا، جس نے انھین بتایا کہ ہو نہ ہو سیتا جی کو راون ہی لے گیا ہوگا۔ مگر ان مین اس سمندر کو پار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ آخر ہنومان جی نے ایک تدبیر سوچی، اور کسی طرح ہوا کے دیوتا وائی کی مدد سے سمندر کے اوپر سے اُڑتے اور راستے مین سب بھوت پریت اور دیو وی کو مارتے ہوئے لنکا پہنچے اور سیتا جی کا پتہ لگا لیا

اب اس کے مقابلے مین گلگمیش اس سرنگ کے بچھو نما چوکیدار اور اُس کی بیوی کی ہدایت پر آگے بڑھا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ پہاڑی سرنگ بارہ میل لمبی تھی اور ہر طرف سوا گھپ اندھیرے کے اور کچھ نہ تھا۔ مگر گلگمیش نے کمر ہمت چست کی اور اُس سرنگ کو کسی نہ کسی طرح پار کرنے کی ٹھان لی۔ وہ آگے بڑھا اور اُس اندھیرے غار مین گھس گیا۔ پورے چوبیس گھنٹے تک طرح طرح کی مصیبتین جھیلنے کے بعد اُسے کچھ روشنی دکھائی دی جسے دیکھتے ہی وہ بے تحاشا بھاگا اور اس سرنگ مین سے نکل گیا۔ اور پھر دن کی روشنی مین پہنچ گیا۔ وہان پہنچ کر اُسے ایک خوشنما اور دلکشا باغ نظر آیا جس کے بیچون بیچ ایک بہت ہی خوبصورت اور بابرکت درخت لگا ہوا تھا۔ اُس کی شاخین طرح طرح کے بیش بہا پتھرون کے گچھون سے لدی ہوئی تھین اور پتے جواہرات کے تھے۔ گلگمیش یہ نظارہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ کچھ دیر اسی طرح حیرت سے اُسے دیکھتا رہا، آگے بڑھا تو اُسی قسم کے اور بہت سے درخت اُسے نظر آئے۔ مگر وہ ان سب کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھا، اور چلتے

چلتے ایک سمندر کے کنارے پر پہنچا یہ "موت کا سمندر" تھا جس ملک مین وہ سمندر تھا جب اُس کی رانی نے اُسے آتے ہوئے دیکھا تو وہ جلدی سے اپنے محل مین گھس گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ گلگمیش نے بڑی خوشامدون اور دھمکیون سے دروازہ کھلوایا اور رانی سے آگے کا راستہ دریافت کیا۔ رانی نے کہا کہ "اس بھیانک سمندر کو آج تک کوئی پار نہین کر سکا۔ تم مین اتنی طاقت کہان سے آئی کہ تم موت کی موجون کا مقابلہ کر سکو!" لیکن بہادر سیاح اس پر بھی مایوس نہین ہوا، اور آخر کار رانی کو بتانا ہی پڑا کہ ارد ارتیع نامی ملاح کی مدد سے اُس سمندر کو پار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ارد کو بلایا اور اُسے اپنے ہمراہ کشتی مین بٹھلا کے لے چلا۔ یہان پھر اُسے سخت سے سخت آفتین جھیلنی پڑین۔ لیکن وہ اپنے ارادے مین کامیاب ہوا اور پیر نپشتیم سے ملاقات ہو گئی! پیر نے اُسے طوفان کا قصہ سنایا (جو اوپر بیان ہو چکا ہے) ...... وغیرہ وغیرہ

۸۔ گرُڑ

گرُڑ ہندی متھیا مین نہ صرف پرندون کا بادشاہ اور وشنو جی کی سواری ہے، بلکہ اُسے ایک دیوتا کا رتبہ بھی حاصل ہے۔ گرُڑ کی مان کو سانپ (جو گرُڑ کے سخت دشمن تھے) اُٹھا کے لے گئے تھے اور اُس بیچاری کو اپنی باندی بنا کر طرح طرح کی ایذائین دیتے تھے۔ گرُڑ نے ہزار جتن کئے، مگر اپنی مان کو ان ظالمون کے پنجے سے نہ چھڑا سکا۔ آخر اُس نے یہ تدبیر نکالی کہ دیوتاؤن کا امرت (آب حیات جس سے دیوتاؤن کو دوامی زندگی حاصل تھی) چُرا کرے گیا اور سانپون کی نذر کیا۔ تب کہین جا کے اُس کی مان کو خلاصی نصیب ہوئی۔ جب اندر دیوتا کو معلوم ہوا کہ امرت چوری گیا، تو اُس نے گرج گرج کر گرُڑ پر بجلیان برسانی شروع کین۔ مگر ایک بھی کارگر نہ ہوئی۔ صرف اتنا ہوا کہ گرُڑ کا ایک پر زخمی ہو کر گر گیا، اور بس۔ آخر لاکھ دشواریون کے بعد اندر کو وہ "چاند کا پیالہ" ہاتھ لگا جس مین امرت رکھا رہتا تھا، اور وہ اسی کو لے کر دیولوک کو واپس چلا گیا امرت نہ ملا نہ سہی، غنیمت ہوا کہ پیالہ ہی ہاتھ آ گیا!

قریب قریب یہی حال بابل کی متھیا مین زُو پرندے کا ہے، جو آجکل گھوڑا (سپت مکھ اشو) اور بیل (برشب ثور) کے نام سے موسوم ہے۔ وہ لوگ اُسے "بدکار" اور "بدی کا سر اُٹھانے والا" کہتے تھے۔ ایک مرتبہ اُس کے جی مین آئی کہ کسی طرح دیوتاؤن پر حکومت کرنا اور اُن پر زور چلانا چاہئے۔ اس غرض سے اُس نے خداؤن کے خُدا (مہادیو؟) نبِل کے گھر مین سے "لوح تقدیر" کو (جس کے ذریعہ وہ سب دنیاداروں کی قسمتون اور تقدیرون کو اپنے دست قدرت مین رکھتا تھا) چُرا کرے بھاگا، اور سیدھا عرب پہنچ کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر دم لیا۔ اَنُو دیوتا نے گرجنے والے دیوتا رمّن (ہندی اندر) سے درخواست کی کہ وہ زُو پر حملہ کر کے اُسے تباہ کر دے۔ لیکن رمن ڈر کے ہچک گیا اور حملہ نہ کر سکا۔ اسی طرح اور سب دیوتا بھی کانون پر ہاتھ دھر کے الگ ہو گئے اور کسی کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ زُو پر حملہ کر کے "لوح تقدیر" اُس سے چھین لیتا۔ آخر جب کسی سے کچھ نہ ہو سکا تو چاند کا دیوتا عرب جا کر زُو سے لوح کو چھین لانے کے ارادہ سے روانہ ہوا .... (افسوس کہ قدیم روایات سے یہ پتہ نہین چلتا کہ اس کے بعد چاند دیوتا اور زو کا کیا حشر ہوا)

بابل کی متھیا مین دو بڑے پیر (بلکہ انھین مہا پیر اور راج پیر کہنا زیادہ مناسب ہوگا) گلگمیش اور اینکی تھے ان دونون کے

بارے مین کہا جاتا ہے کہ بادشاہ تھے"، اور دونون نیچے والی دُنیا (پاتال؟) کے سفر کو گئے تھے۔ ایتن وہان سے "پیدائش کا پودا" لانے کے لئے گیا تھا اور گلگمیش "زندگی کا پودا" لانے کی نیت سے۔ ایتن نے ایک بڑے سے دیوتما عقاب سے مدد لی، جو ہمارے ہندی گرڑ کی طرح سانپون کا دشمن تھا۔ اور جس طرح ہندوستان مین وشنوجی مہاراج گرڑ کی پیٹھ پر سوار ہوتے تھے اُسی طرح ایتن بھی اس بابلی عقاب پر سوار ہو کر گیا تھا۔ ایک اور موقع پر جب ایتین نے سب سے اوپر کے آسمان (عرش!) کا سفر کرنا چاہا تھا، تب بھی اُس نے اسی عقاب سے مدد مانگی تھی۔ اس استمداد پر عقاب نے کہا کہ "ہان دوست، مین بڑی خوشی سے تمھین سب سے اوپر کے آسمان تک لے چلونگا۔ اپنے سینے کو میرے سینے پر اور اپنے بازوؤن کو میرے پرون پر رکھ دو اور اپنے جسم کو میرے جسم سے ملا کر بالکل ایک کر دو، اور چلے چلو!" چنانچہ ایتن نے ایسا ہی کیا، اور عقاب اُسے اپنے شہپرون پر اس طرح چسپان کئے ہوئے اوپر کو اڑا، دو گھنٹے تک اُڑتے رہنے کے بعد عقاب نے ایتن سے کہا کہ "ذرا نیچے دیکھو" ایتن نے دیکھا کہ سمندر زمین کو چارون طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ عقاب اور بلند ہوا، اور دو گھنٹے کے بعد اُس نے ایتن سے پھر کہا کہ نیچے دیکھو، اب کے اُس مہابیر نے دیکھا کہ سمندر زمین کو بالکل ایک پٹی کی طرح گھیرے ہوئے ہے۔ عقاب اور اونچا اڑا، اور پھر دو گھنٹے کے بعد ایتن نے دیکھا کہ سارا سمندر ایک چھوٹے سے تالاب کے برابر رہ گیا ہے۔ اتنی دیر (چھ گھنٹے) مین وہ دونون انو، بعل اور ایا کے آسمان پر پہنچ گئے، جہان ایتن کو آرام اور سایہ کی جگہ مل گئی۔ کچھ سستانے کے بعد عقاب پھر ایتن کو لے کر اڑا، اور سیدھا آسمان کی ملکہ (اور سب سے بڑی دیوی) اشتر کے آسمان کی طرف چلا۔ اس اثنا مین اُس نے پھر دو دو گھنٹے کے بعد ایتن سے نیچے دیکھنے کو کہا اور ایتن برابر دیکھتا رہا کہ زمین کس طرح جلدی جلدی سکڑ رہی ہے! اس کے بعد کچھ حادثہ پیش آیا، اور عقاب بجائے اُونچا ہونے کے نیچے کو گرنے لگا۔ اور گرتے گرتے دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ عقاب کے تو پرخچے اڑ گئے، لیکن ایتن (غالباً) زندہ سلامت بچ گیا

ہمارے گرڑ کے ساتھ ایسا حادثہ تو نہین ہوا، لیکن دو واقعات اُس سے منسوب کئے جاتے ہین۔ (۱) ایک دفعہ وشنوجی مہاراج اُس پر سوار چلے جا رہے تھے۔ راستے مین ایک جگہ انھون نے اپنے داہنے بازو سے (جو تمام کائنات سے زیادہ وزنی تھا!) اُسے دبایا تو اس بوجھ سے اُس کے کچھ پر جھڑ گئے۔ (۲) رامائن شریف مین گرڑ کے دو بیٹون کا ذکر آتا ہے۔ اُن مین سے ایک کو تو راون نے زخمی کر کے مار ڈالا تھا، اور دوسرا سری رام چندر جی مہاراج کو زخمی بلکہ نیم مردہ حالت مین پڑا ہوا ملا تھا۔ اُس نے آنجناب سے بیان کیا تھا کہ "ایک دفعہ ہم دونون بھائی ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی شرط بد کے سورج کی طرف اُڑے۔ سورج کے قریب پہنچ کر میرے تو پر جل گئے[۱]۔ مگر میرے بھائی کے پر بچ گئے۔ مین یہان اس پہاڑ پر گر پڑا، اور اب تک ان برے حالون مین یہان پڑا ہون!"

اس ضمن مین اسی نوع کی دو اور دلچسپ روایتین بیان کرنا بیجا نہ ہوگا جو عرب کے (مسلم!) باشندون مین عام طور پر رائج تھین (اور غالباً اب بھی ہین)۔ ایک تو بابل کے بادشاہ نمرود کے متعلق ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اُسے ایک خدا کی عبادت کرنے کی دعوت دی تو اُس نے ایک بہت بلند مینار بنوایا تاکہ اُس پر چڑھ کر "ابراہیم کے خدا" کو دیکھ سکے۔ لیکن جب خدا کی قدرت سے یہ مینار بننے کے بعد گر گیا، تو وہ ایک صندوق مین بیٹھ کر اڑا جسے چار بڑے بڑے دیو صفت پرندے اڑا کر اوپر لے گئے۔ دور کی بلندی تک پہنچنے کے بعد

[۱] اگر یک سرِ موی برتر پرم ..... فروغ تجلی بسوزد پرم!

وہ اس زور سے ایک پہاڑ پر گرا کہ پہاڑ بھی ہل گیا! ——— دوسری روایت سکندر ذوالقرنین کی ہے کہ اُس نے "ملک ظلمات" مین عقاب سے بھی زیادہ بڑے بڑے پرندے پال رکھے تھے۔ ایک مرتبہ اُس نے اپنے چار سپاہیون کو حکم دیا کہ ان پرندون پر بیٹھ کر اڑین اور آسمان کی خبر لائین۔ چنانچہ وہ اڑے، اور اوپر سے "زندہ لوگون کے ملک" کی خبرین لائے۔ اسی طرح سکندر کے متعلق جتنی روایتون مین ایک روایت یہ بھی ہے کہ اُسے زمین کی لمبائی چوڑائی کا پورا حال معلوم تھا، اور اس علم کے حاصل کرنے کی تدبیر اُس نے یہ نکالی تھی کہ اُس نے اپنے آپ کو بہت ہی چھوٹا سا بنا لیا اور ایک عقاب کی پیٹھ پر سوار ہو کر اڑا اور آسمانون کی سب سے اونچی بلندیون تک پہنچ کر وہان کے سب حالات کی تحقیق کر کے واپس آ گیا!

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، گرڑ وشنو جی کی برق پا سواری تھی۔ وشنو جی کی اس سواری کے عالم کی جو مورتیان ہین اُن مین وشنو جی کے ہاتھ مین ایک چکر نظر آتا ہے جو ایک آتشین چکر ہے اور ہر وقت بڑی تیزی سے گھومتا رہتا ہے۔ مہابھارت (آدی پرب) مین لکھا ہے کہ وشنو جی مہاراج نے گرڑ کو اپنی رتھ پر جھنڈے کی چوب پر بٹھا لیا اور فرمایا "اب تم اسی طرح میرے اوپر بیٹھے رہا کرو گے" یہی حال بابل کے دیوتا شمش (سورج دیوتا)، مہادیوی اشتر اور چند اور دیوتاؤن کا ہی ہے۔ اُن کے ہاتھون مین بھی چکر ہوتے ہین، جو حیات جاوید کا نشان ہوتے ہین۔ خاص کر شمس دیوتا کی مورتی اس طرح بنائی جاتی تھی کہ وہ ستون دار محل مین اپنے تخت پر بیٹھا ہے اور اُس کے سامنے سورج کا چکر ہے۔ اس چکر (یا پہیے) کے آرے لہردار ہوتے تھے اور ہر لہر یا تین تین خطون سے بنایا جاتا تھا

اسی طرح ایران کے قدیم کتبون مین وہان کے بادشاہون کے سرون کے اوپر ہرمزد خدا ایک پر دار پہیے یا چکر کے اندر منڈلاتا ہوا نظر آتا ہے!

۹ - کرن

ہماری مہابھارت کا زبردست بیر اور سورما کرن رانی پرتھا کا بیٹا تھا۔ اتفاق سے سورج دیوتا کی نظر رانی جی پر جا پڑی تھی اور وہ ہزار جان سے اُن پر عاشق ہو گیا تھا۔ جب اس عشق کا نتیجہ کرن کی صورت مین نمودار ہوا تو رانی نے ایک ٹوکری کی ناؤ بنائی اور اس معصوم کو اُس ٹوکری مین رکھ کر ندی کے سپرد کر دیا۔ وہ اُسے بہا کر گنگا مائی کے پاس لے گئی اور اُن کے حوالہ کر دیا۔ گنگا جی نے اُسے انگ راج تک پہونچا دیا، جہان ایک عورت نے اُسے اُٹھا لیا اور اپنے شوہر کے پاس لے گئی۔ کرن اپنے ان نئے مان باپ کی شفقت کے سایہ مین پل کر پروان چڑھا، اور ایک زبردست جنگجو سپاہی اور سپہ سالار ہو کر آخر کار انگ راج کا راجا ہو گیا

قدیم اسیریا مین بھی ایک لڑکی دیوداسی بنا کر سورج دیوتا شمش کے نام پر مندر مین بٹھا دی گئی تھی۔ اُسے بھی سورج دیوتا نے سرغون نام ایک بیٹا عطا کیا تھا۔ اس شرم کی ماری مان نے بھی اپنے لال کو ایک چھوٹی سی ناؤ مین رکھ کر دریا کے سپرد کر دیا تھا۔ خدا جانے کتنی دور نکل جانے پر کسی غریب کسان نے اُسے اُٹھا لیا اور بیٹا بنا کر پالا۔ جیسے کرن کو گنگا مائی نے برکت دی تھی، اسی طرح اشتر دیوی نے سرغون کی مدد کی، اور وہ جوان ہو کر نہ صرف ایک بے باک اور دلاور سپاہی ہو گیا بلکہ بہت جلد اپنے قوت بازو سے اسیریا کا بادشاہ بن گیا۔ اُس زمانہ کی تاریخ (جیسی کچھ بھی ہم تک پہنچی ہے) گواہ ہے کہ وہ اسیریا کے نہایت زبردست اور جلیل القدر حکمرانون

مین سے تھا[ف]

۱۰۔ لکشمی

اہل بابل کے ہان اشتر دیوی زرخیزی اور پیداوار کے دیوتا کی مان تھی۔ ہمارے ملک مین لکشمی جی نے پہلے وشنوجی مہاراج سے، پھر سرسوتی دیوی کے نام سے برہما جی سے، بیاہ کیا تھا اور (پُران کے ایک بیان کے مطابق) دنیا کی مان تھین (ہین!) اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ سلامت رہینگی

۱۱۔ شکنتلا

قدیم ہندوستان کی حسن و عشق کی روایتون مین شکنتلا کو جو رتبہ حاصل ہے اُس سے ہندوستان کا ہر شخص واقف ہے، وہ مینکا نام ایک اپسرا کے بطن سے ایک بڑے رشی وشوامتر کی بیٹی تھی اور مالنی ندی کے کنارے کسی مقام پر پیدا ہوئی تھی۔ مینکا اُسے ندی کے کنارے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ایسے ہو کے مقام مین جہان ہر وقت شیرون اور بھیون کا خطرہ رہتا تھا، خدا نے اُس کی حفاظت کے لئے بہت سے گدھ بھیج دیئے تھے جو ہر وقت اُس کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے رہتے تھے اور اُس کی نگہبانی کرتے تھے۔ کئی دن کے بعد ایک خدا ترس بزرگ کا وہان گزر ہوا۔ وہ اُسے اُٹھا کے اپنے گھر لے گیا اور بڑے جاؤ چوچلے سے اُس کی پرورش کی..... وغیرہ وغیرہ

بابل کی ملکہ سیمی رامس کا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اُس کی مان بھی اس زمین کی رہنے والی نہ تھی، بلکہ آسمان ہی سے نازل ہوئی تھی۔ وہ بھی اپنی اس بچی کو پیدائش کے بعد ایک درخت کے نیچے ڈال کے چلی گئی تھی۔ خدا نے اُس کی نگہداشت کا سامان یون پیدا کیا کہ بہت سی فاختائین ہر وقت اُس کے گرد جمع اور قسم قسم کے نازک پھلون اور پھولون سے اُس کی غذا اور تفریح کا سامان کئے رہتی تھین۔ کئی دن تک اسی طرح فاختاؤن کی حفاظت مین گزر گئے۔ ایک دن اتفاق سے شاہی چرواہا اُدھر جا نکلا اُس نے اُسے وہان پڑا ہوا پاکر اٹھا لیا اور اپنے گھر لے جاکر بیٹی بنا کر پالا

جس طرح شکنت (پرندہ) کی وجہ سے ہندی لڑکی کا نام شکنتلا رکھا گیا تھا ویسے ہی (غالباً اس سے پہلے) سُمّت (فاختہ) کے سبب سے بابلی لڑکی کا نام بھی سُمّو رَمّت ہو گیا تھا، پھر سم رمت سے بگڑ کر یہ نام سیمی رامس ہو گیا

دونون اپنے اپنے ملکون مین حسن کی دیویان خیال کی جاتی ہین۔ شکنتلا راجا دشینت سے بیاہی گئی اور رانی کھلائی۔ سیمی رامس نینوا کے حاکم اور سپہ سالار اُون کے بیاہ مین آئی۔ وہان کا بادشاہ نین اُس پر عاشق ہو گیا اور اُسے اون سے طلب کیا۔ پہلے تو اُون سے انکار کرتا رہا، لیکن جب دیکھا کہ اُسے نین کے حوالے کر دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہین ہے تو خود پھانسی لے کر مر گیا اور سیمی رامس نین کی بیوی بن کر ملکہ ہو گئی۔

۱۲۔ سیتلا

جس طرح ہندوستان مین سیتلا (ماتا، مائی، مہارانی، دیوی) چیچک کی دیوی ہے، اور اس مرض کو دفع کرنے کے لئے اس کی

[ف] آپ کو یاد ہو گا کہ یہودیون کے ہان بھی ایک مہابیر اسی طرح ٹوکری کی نیا مین رکھ کے چھوڑ دیا تھا، اور گو وہ راجا نہین ہوا مگر راجپوت ضرور ہو گیا تھا، اور اپنی قوم کا سردار اور سپہ سالار بھی تھا۔ ممکن ہے اللہ کے اُس بندے کی کہانی بھی کبھی بیان کر سکون ۱۲

پوجا کی جاتی ہے، بالکل اسی طرح قدیم بابل مین بھی مختلف امراض سے محفوظ رہنے کے لئے لوگ ان امراض کے دیوتاؤن اور دیویون کی پوجا کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کے ہان کی ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ وبا کے ایک دیوتے (جس کا نام اُورا تھا) تمام جاندارون کو مار ڈالنے کا قصد کیا، اور قریب تھا کہ وہ اپنا ارادہ پورا کر ڈالتا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اس پر رضامند ہو گیا کہ وہ ان لوگون کو ایذا نہ پہنچائیگا جو اُس کی بہادری اور جبروت کی تعریف مین گیت اور بھجن گائینگے اور اُس کے نام کا جاپ کرینگے۔ چنانچہ بابلیون کے ہان کچھ خاص خاص منتر تھے جن کا جاپ کر لینے سے وہ لوگ اُورا کے شر سے محفوظ رہتے تھے۔

جیسا کہ شروع مین عرض کیا جا چکا ہے اور ان صفحات سے بھی ظاہر ہے، یہ چند مثالین ایسی ہین جن مین قدیم بابل اور قدیم ہندوستان کی دماغی اور اخلاقی کیفیت کی مشابہت نظر آتی ہے۔ اسی نوع کے اور بے شمار قصے اور روایتین ہین جن مین سے ہر ایک مین نہ صرف دو ملک یا دو قومین بلکہ کئی کئی ملک اور کئی کئی قومین برابر برابر شریک نظر آتی ہین۔ مین نے ان مندرجہ بالا صورتون مین کہین دو چار جگہ ایرانیون اور یہودیون کا اشارہ کے طور پر ذکر کیا ہے، ورنہ ان روایات مین نہ صرف ایشیائی۔ ہندی، ایرانی، اسیری، بابلی، یہودی، مصری، زنگی — قومون کا بلکہ یورپ کی۔ یونانی، انگریزی، جرمن، آئرلینڈی وغیرہ — اقوام کا بھی حصہ ہے۔ ان واقعات کا ایک یا قریب قریب ایک ہونا بنی نوع انسان کے ایک ہونے پر ضرور دلالت کرتا ہے۔ اس مین شک نہین کہ ان تمام خرافات کو پڑھ کر اور سن کر ہم کو ہنسی آتی ہے، مگر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جن دنون کی یہ سب باتین ہین ان دنون انسان بالکل بچہ تھا۔ ہان البتہ افسوس اس امر کا ہونا چاہئے کہ انسان بوڑھا ہو کر بھی عقل نہ پکڑے اور باوجود عقل کا دعوی کرنے کے ان ہی بچپن اور بے شعوری کی باتون پر یقین رکھے۔ یہ بھی انسان کی رنگین طبیعت کی نیرنگیان ہین!

محمد نعیم الرحمن (ام۔اے)

ایک شاعر کا انجام
مصنفۂ نیاز فتحپوری

ایڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن و عشق، جسمین تخئیل کی بلندی، زور تحریر، اسلوب بیان اور ندرت انشاء کے ایسے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہین جو ساحری کی حد تک پہونچتے ہین۔ جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف مین ظاہر کئے گئے ہین اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ فسانہ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے

قیمت مع محصولڈاک .... ۱۲ر "منیجر نگار۔ لکھنو"

بازگشت

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۱۴)

بیساکھ کے دن تھے۔ دیہاتون مین بیکاری اور تعطل کا زمانہ تھا۔ ادریس کی آنکھین صحتیاب ہوگئی تھین اگرچہ اُنمین اگلی سی بینائی پھر نہ آسکی۔ گذشتہ تین چار مہینے ادریس نے بالکل بیکار گذارے تھے۔ مدرسہ برائے نام قائم رکھا گیا تھا۔ دکان بیٹھ گئی اور غلہ کے کاروبار مین بھی ممتاز کی تنہا جانفشانیون کے باوجود بڑا خسارہ ہوگیا تھا اور ادریس کے دلمین رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ وہ اپنے گناہون کی سزا بھگت رہا ہے۔ وہ فطرتاً واہمہ پرست تھا۔ اور مقدر کا قائل تھا۔ اسکی واہمہ پرستی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اب وہ مریم کو ایک "خوبصورت بلا" سمجھنے لگا تھا جس کے ہاتھون اسکو غارت ہونا ہے۔ اسکو یقین ہوگیا تھا کہ اسکی "سرنوشت" مین سوا "روزِ سیاہ کے" کچھ ہے نہین

ادریس بے انتہا چڑچڑا ہوگیا تھا۔ اب شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ مریم کا خدا سید ھا رہتا ہو اور ادریس اس سے نہ لڑتا ہو جھگڑے کی بنا عموماً سکینہ کا ذکر ہوتا تھا۔ ادریس روز بروز ماں سے معافی مانگنے کے لئے زیادہ بیتاب ہورہا تھا۔ اب سے پہلے مریم ادریس کی ہمدردی کیا کرتی تھی اور اسکا غم غلط کرنیکی ہر ممکن کوشش کرتی تھی مگر اب جب کبھی ادریس ماں کا نام لیتا تو مریم کے سارے بدن مین آگ لگ جاتی اور ادریس کو طعنے دینے لگتی "آخر یہ ساری محبت آپ ہی کی طرف سے ہے یا آپکی ماں کو بھی آپکی کچھ پروا ہے؟" اس درمیان مین وہ کئی بار ادریس کو جتا چکی تھی "مین نے پہلے ہی کہدیا تھا کہ آپ میرے ساتھ خوش وخرم نہ رہ سکین گے۔ آپ نے میرا کہنا نہین مانا۔ آپ نے وقتی جوش مین اندھے ہورہے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھکو اندیشہ تھا۔ آپ نے خوانخواہ میری زندگی کو بھی مصیبت کا پہاڑ بنا کر رکھ دیا" مریم کی المناکیان فی الحقیقت حد بیان سے باہر ہوچلی تھین۔ اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسکے جذبات وہی تھے جو شاعر نے اس شعر مین بیان کرنیکی کوشش کی ہے

آہ وہ کون تھا خدا مارا — جس نے اس سے مجھے لگا مارا

ادریس اسدن مریم سے خوب لڑا اور پھر دو دن تک اس سے بولا نہین۔ ایکدن ادریس صبح کی گاڑی سے بستی گیا۔ غرض یہ تھی کہ بستی کے اسکول مین ملازمت کے لئے کوشش کرے۔ ادریس کی بےچین طبیعت کو اس تھوڑے عرصہ مین بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا جس زندگی کو اُسنے سراپا سکون و راحت سمجھکر اختیار کیا تھا اُسنے اسکو اور بھی بےچین اور پراگندہ کر رکھا تھا۔ وہ اب کاہلی اور مجہولیت مین اپنے دن گذارنا نہین چاہتا تھا۔ ادریس نے مریم کو نہین بتایا تھا کہ وہ بستی کیون جارہا ہے۔ چلتے چلتے خوانخواہ دونون مین تکرار ہوگئی۔ مریم کی زبان سے بےشعوری مین نکل گیا "آج اگر آپ کسی شہر مین برسرکار ہوتے تو شاید اتنا پریشان نہ رہا کرتے" ادریس خود بھی دلمین یہی چور لئے ہوئے تھا۔ وہ اس طعنہ کو برداشت نہ کرسکا اور مریم پر آنکھین نکال کر بولا "مین گھسیارا ہوکر رہونگا مجھے اسی مین چین ملیگا۔ تمکو اگر میرا ساتھ نہین دینا ہے تو مجھے مداخلت کرنے کا بھی کوئی حق نہین ہے" یہ کہکر وہ بستی چلا گیا اور کہہ گیا کہ "دوسرے دن صبح کو واپس آؤنگا"

مریم دن بھر غمناک رہی۔ اسکی آنکھوں مین آنسو اُمڈے چلے آرہے تھے اور وہ کئی دفعہ جی کھول کر رو چکی تھی۔ شام کے وقت ہوا کے ٹھنڈے جھونکون کے ساتھ اسکے دلمین خود بخود ایک انبساطی کیفیت پیدا ہوئی اور اسنے اپنے دل کو یہ کہتے ہوئے محسوس کیا "کچھ نہین کیسا غم اور کہان کی افسردگی دنیا کے آلام کو اگر بھولنا ہے تو ہوا کے جھونکون سے دریا کی لہرون سے جنگل کے جانورون اور درختون سے چاند سورج اور ستارون سے اپنا جی بہلاؤ" بظاہر مریم ایک بار پھر وہی مریم ہوگئی تھی جسکو ادریس نے کبھی "غنچۂ سحر" کہا تھا۔ اُسنے اپنے بال درست کئے۔ کپڑے بدلے اور جنگل اور ندی کی بہار دیکھنے نکل گئی

مریم نے لاکھ چاہا کہ اپنی ناکامیون اور تلخیون کو قدرت کے دلفریب مناظر مین بھول جائے لیکن اسکو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ یہ مناظر اب اسکے لئے دلفریب نہین رہے۔ اسکے دل کی آواز درصل دھوکہ کی آواز تھی۔ جو لمحے ایک بار گذر گئے وہ پھر نہین آتے۔ جو زندگی ایک بار بسر ہوگئی اسکا اعادہ ناممکن ہے۔ یونان کے "رھنے والے فلسفی" کا قول ہے کہ "ایک ہی ندی مین کوئی دو بار نہین نہا سکتا" جس دریا مین آپ نے ابھی غسل کیا ہے وہ دوسرے لمحے مین بالکل ایک دوسرا دریا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بات فوراً محسوس نہین ہوتی۔ زندگی کے بہاؤ مین کسی ایک حالت کو اپنی جگہ قرار نہین ہے۔ حدوث لازمۂ زندگی ہے۔ جس چیز کو آپ ایکدفعہ کھو چکے اُسکی بازیافت محال ہے۔ جو بات ایک بار ہو چکی اُسکی "بازگشت" قانون قدرت کے منافی ہے۔ ہان یہ اور بات ہے کہ آپ "رنج نومیدی" کی تاب نہ لاسکین اور عمر بھر "کف افسوس" مل مل کر "تجدید تمنا" کا عہد کرتے رہین

مریم آج تڑپ رہی تھی کہ صرف چند لمحون کے لئے اسکے دلمین وہی ذوق وہی صلاحیت پیدا ہو جائے جسکی بدولت شادی سے پہلے اسکے اوقات اسقدر طربناک تھے۔ مگر اب نہ وہ مریم تھی نہ وہ مریم کا دل۔ اسکو زمین و آسمان بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ جنگل کے ایک ایک پتہ۔ دریا کی ایک ایک لہر۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی ایک ایک کرن مین وہ ایک پژمردہ کر دینے والی تاثیر محسوس کر رہی تھی۔ شام کی تاریکی کے ساتھ ساتھ یہ تاثیر بھی بڑھ رہی تھی۔ اب مریم محسوس کر رہی تھی کہ ستارون کی چمک مین اک طنز ہے اور چاند اسکی بدبختی پر مسکرا رہا ہے اسی عالم مین اسکی نظر اس ٹیلہ پر پڑی جہان پہلے پہل اُسنے ادریس کا "ہدیۂ نیاز" حاصل کیا تھا۔ مریم کے منہ سے ایک دلدوز کراہ نکل گئی اور وہ ٹیلہ کی طرف چلی۔ وہان تک پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ رؤف نے اسکو پکارا۔ مریم ٹھٹک گئی۔

ہر چند کہ مریم جسوقت اپنے مکان سے نکلی تھی اسکو ایک بار رؤف کا خیال ضرور آیا تھا لیکن یہ کہنا صریحاً ظلم ہوگا کہ وہ رؤف سے ملنے کی اُمید مین یہان آئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسوقت یہ دیکھکر کہ رؤف اسکے قریب ہے مریم کا دم اور بھی گھٹنے لگا تھا

رؤف مریم کے پاس آیا اور کہنے لگا "مین تمکو ایک جھلک دیکھنے کی حسرت مین روز یہان آتا ہون۔ مجھے اب بھی تم سے وہی گہری محبت ہے۔ بلکہ یقین اب میری محبت اور بھی گہری ہوگئی ہے کیونکہ اب تمھاری صورت پر ایک یاس اور بیکسی برسنے لگی ہے جسنے تمھارے حسن کو چار چاند لگا دئے ہین۔" مریم نے اسکا کوئی جواب نہ دیا اور ایک دھیمی سی آہ کر کے رہگئی۔ دن ہوتا تو رؤف دیکھ لیتا کہ مریم کی جادو بھری آنکھون مین آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ رؤف نے پھر کہا "مریم مین نے سنا ہے کہ ادریس کا برتاؤ تمھارے ساتھ کچھ خوشگوار نہین ہے اور تمھارا چہرہ بھی گواہ ہے کہ تم مضمحل اور آزردہ رہتی ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو قسمت نے تم پر بڑا ظلم کیا"

مریم سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ رؤف نے اسکے دل کے نازک ترین حصہ کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ زار زار رونے لگی۔ رؤف سے نہ رہا گیا۔ اُسنے بڑی جرأت کی اور مریم کو اپنے حلقۂ آغوش مین لے کر اسکے بالون مین ہاتھ پھیرنے لگا۔ مریم نے اپنے کو رؤف کی گود سے الگ نہین کیا۔ اسکو رؤف کے نرم وگداز بدن سے راحت مل رہی تھی۔ اسکے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے۔ رؤف نے تسلی دینے کی لاکھ کوشش کی مگر سب بیکار۔ مریم کی حالت واقعی عبرتناک تھی جس مریم کو یہ غرہ تھا کہ رؤف نے اسکے جسم کو ہاتھ نہین لگایا ہے آج وہی مریم رؤف کی گود مین اس بےبسی اور بیپردگی کے ساتھ بڑی سسکیان لے رہی تھی۔ گویا غالب نے یہ شعر اسی کے لئے کہا تھا:۔

آنکو بہ خلوت با خدا ہرگز نکردے التجا
نالان بہ پیش ہر کسے از جور افلاکش نگر

مریم کوئی پینتالیس منٹ تک اس حالت مین رہی ہوگی کہ جنگل کے پتے کھڑکھڑائے۔ رؤف نے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص دھوتی پہنے ہوئے اُلٹے پاؤن جنگل مین گھسا جا رہا تھا۔ مریم اسکو نہ پہچان سکی مگر رؤف نے چاند کی روشنی مین پہچان لیا۔ اُسنے مریم کو الگ کرکے کہا۔
"ممتاز میان ہین۔ دنیا مین اگر واقعی کسی سے جلتا ہون تو وہ ممتاز ہین"

یہ سنکر مریم کے حواس بجا ہوگئے اور وہ جلدی سے وہان سے یہ کہتی ہوئی بھاگی "دیکھیے اب کیا نئی آفت آتی ہے۔ اگر ممتاز میان نے مجھکو اس حالت مین دیکھ لیا ہے تو مین بلا کسی بدنیتی کے بدنام ہوجاؤنگی اور میری شامت بڑھ جائیگی" رؤف نے شرمندہ ہوکر کہا "مریم اتنا نہ ڈرو۔ جب تک سانس مین سانس ہے مین تمکو ہر آزار سے بچانیکی کوشش کرونگا"

مریم راستہ بھر یہ سوچتی رہی کہ اب کیا کرے۔ یہ ممکن نہین کہ ممتاز نے اسکو رؤف کی آغوش مین نہ دیکھا ہو۔ ورنہ اس تیزی کے ساتھ وہ جنگل بھر کیون گھس جاتا۔ پھر ممتاز کو ادریس کے ساتھ جو تعلق خاطر ہے اسکی بنا پر ممتاز ادریس کو حقیقت حال سے خبردار کردینا اپنا فرض سمجھے گا۔ یہ سوچ کر مریم کا دل بیٹھنے لگا۔ مگر پھر وہ ممتاز کی طبیعت پر غور کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ ممتاز بڑا نیک دل اور معاف کردینے والا آدمی ہے۔ اُسنے آج تک کسی کو اپنی ذات سے کوئی تکلیف نہین پہنچائی پھر کیا وجہ ہے کہ آج بھی وہ اپنی فطری خطاپوشی سے کام نہ لے اور "فتنہ انگیز" راستبازی پر "مصلحت آمیز" سکوت کو ترجیح نہ دے اسکے لئے تو جھوٹ بولنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی مریم کو اس خیال سے بڑی ڈھارس ہوئی۔ اُسنے یہ بھی طے کرلیا کہ موقع پاکر ممتاز سے اپنی لغزش پر معافی مانگ لیگی۔ اسی اُدھیڑبن مین مریم اپنی جائے پناہ مین داخل ہوگئی۔ اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب اُسنے دیکھا ادریس خلاف توقع گھر پر موجود ہے۔ ادریس نے مریم پر ایک نظر ڈالی اور پھر منہ پھیر لیا اسکا چہرہ غیر معمولی پریشانیون کا اظہار کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی دن کے اندر اُسنے اپنی عمر کے کئی برس گذار کردئے ہین۔ مریم نے دبی زبان سے پوچھا "آج ہی کیون واپس چلے آئے؟" ادریس نے اسی طرح منہ پھیرے ہوئے جواب دیا "جس کام کے لئے گیا تھا وہ ہو چکا" اور پھر چپ ہو رہا۔ اسکا سکوت کہہ رہا تھا کہ اب اس سے آگے وہ کسی سوال کا متحمل نہ ہوگا۔ مریم نے سمجھا کہ صبح کا غبار ابھی باقی ہے۔ اس لئے وہ بھی چپ ہو رہی

(۱۵)

بستی مین مدرسی کی جگہ خالی ضرور تھی لیکن وہان شامت اعمال سے ادریس کا نام پہلے پہنچ چکا تھا۔ کارکنان مدرسہ ادریس کی

زندگی کے واقعات سے اچھی طرح آگاہ تھے انکی رائے مین ادریس بدکردار تھا۔ بچون کی تعلیم و تربیت کو ایسے آدمی کے سپرد کرنا در اصل آیندہ ہئیت اجتماعی مین خرابیان پیدا کرنا ہے۔ اس دوراندیشی کی بنا پر مدرسہ کی مجلس انتظامیہ مین جب ادریس کی درخواست پیش ہوئی تو ارکین نے علی الاعلان اسکو نامنظور تو نہین کیا مگر ادریس سے یہ بہانہ کر دیا کہ اسکی درخواست سے پہلے ایک شخص کا تقرر ہو چکا ہے۔ دن بھر مین یہ ساری کارروائی ختم ہوگئی ادریس کو صحیح حالات مدرسہ کے منشی سے معلوم ہوئے جو اسکو پہلے سے جانتے تھے۔ ادریس کو دھکا لگا۔ جو ادریس ہیڈماسٹری کر چکا تھا آج وہ ایک معمولی مدرسی کیلئے چند ایسے ارکین کا محتاج تھا جو یہ بھی نہین جانتے کہ تعلیم درحقیقت کسکو کہتے ہین۔ اسکی غرض و غایت کیا ہے اور اسکا نظام کیا ہونا چاہئے۔ ادریس کے اضمحلال کی انتہا نہ تھی جس دوست کے وہان وہ بستی مین جاکر ٹھیرا تھا اُسنے بڑا اصرار کیا کہ وہ رات بھر قیام کرے۔ مگر ادریس نے بڑی خوشامدون سے اپنے دوست کو راضی کر لیا اور شام ہی گاڑی سے چل کھڑا ہوا

خلیل آباد مین ممتاز مل گیا۔ ادریس نے اسکو ساتھ لے لیا راستہ بھر زندگی کے اہم مسائل پر جرح و تعدیل کرتے ہوئے دونون بیر میتیا کے اندر پہنچ گئے۔ ادریس نے کہا "چلو دریا کی سمت چلین۔ شاید دل کی جلن کو کچھ تسکین ہو" جنگل سے باہر قدم بھی نہ پڑے تھے کہ ممتاز کو جو آگے آگے تھا ادریس نے پکڑ کر پھر جنگل کے اندر کھینچ لیا۔ ممتاز جواس باختہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اور اسکی نگاہ اس منظر پر پڑ گئی جسکی وجہ سے ادریس نے اسکو اپنے ساتھ درختون کے آڑ مین کر لیا تھا۔ ممتاز کو کسی طرح اپنی آنکھون پر اعتبار نہ آتا تھا۔ اسکو یہ اندیشہ ضرور تھا کہ ادریس مریم کے ہاتھون تباہ ہونیوالا ہے مگر یہ وہم بھی نہ تھا کہ وہ تباہی یون ہو گی۔ مریم رؤف کی آغوش مین تھی ممتاز کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ادریس کے سہارے کے لئے دنیا مین اب کوئی چیز نہین رہی۔ اُسنے ادریس کی طرف دیکھا۔ ادریس نے مسکرا کر کہا "کیا دیکھتے ہو؟ این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔ ٹھیرو آج بہت ممکن ہے قسمت کا فیصلہ ہو جائے"

مگر قسمت کا فیصلہ یون آسانی سے نہین ہوا کرتا۔ رؤف نے ممتاز کو دیکھ لیا تھا اور مریم اس سے الگ ہو کر گھر کا راستہ لے چکی تھی ادریس نے کہا "ممتاز یہ کھٹک میرے دل سے کبھی نہین گئی تھی۔ دیکھنے مین مین مطمئن ضرور تھا مگر دل مین یہ چور موجود تھا۔ تمنے مجھے اس آسمانی بلا سے بچانا چاہا تھا۔ اور میری مان نے بھی مجھے بچانیکی بڑی کوشش کی لیکن جو خود نہ بچنا چاہے اسکو کون بچائے۔ مان سے معافی مانگنے کی آرزو میرے دل مین ہے اب مین کس منہ سے معافی مانگون۔ مگر خیر۔ مجھے اب اپنی تباہی کا غم بھی نہین مین مٹ جانے کے قابل ہون اور مٹ جانے پر تلا ہوا ہون مین تو اب اس منزل پر پہنچ گیا ہون جہان زمانہ لاکھ دکھ پہنچائے مگر اسکو "کم آزار" ہی سمجھا جاتا ہے"

ادریس کے تیور سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسنے اپنے کو حوادث روزگار کے حوالہ کر دیا ہے اور اب اپنی زندگی کو بدلنے کی سست سے سست تدبیر اختیار کرنیکی زحمت گوارا نہ کرے گا

ادریس تیزی کے ساتھ مکان کی طرف چلا اور مریم سے پہلے پہنچ گیا۔ اُسنے مریم سے ایک حرف نہین کہا اور ارادہ کر لیا کہ کبھی اس سے کچھ نہ پوچھیگا۔ وہ جانتا تھا کہ مریم اپنی بریت کیلئے کچھ نہ کچھ ضرور کہیگی اور ادریس اسکو بری کرنیکے لئے تیار نہ تھا۔ وہ اپنی حرمان نصیبی پر اندر ہی اندر اپنا دل خون کر رہا تھا لیکن اسکی تاب نہ لا سکتا تھا کہ مریم اسکے سامنے اپنے حرکات و سکنات کی جا یا بیجا توجیہ کرے۔ وہ مریم کو ایک "چھٹی روگ" سمجھنے لگا تھا جس سے جہانتک ہو سکے پناہ پانیکی کوشش کرنا چاہئے۔ اب ادریس نے مریم کے ساتھ سیر و تفریح کیلئے

جانا بھی ترک کر دیا۔ واقعات سے بے خبر مریم نے سمجھا کہ اسکی شامت میں بلا وجہ یہ اور اضافہ ہوا۔ اُسنے بھی اپنے دل کو پتھر کی طرح بے حس بنا لیا۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ اسکو کوئی سوگ نہ تھا مگر وہ اپنی زندگی سے بیزار اتنا ہو چکی تھی کہ اسکو ادریس کی خوشی ناخوشی کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ اب صرف اسوقت تفریح کیلئے نکلتی تھی جبکہ ادریس گھر پر نہ ہوتا۔ اور جب وہ تفریح کیلئے نکلتی تو رؤف سے ضرور ملاقات ہو جاتی اور مریم کو اسکی آغوشِ پناہ میں رو رو کر دل کی کلفت نکالنے کا بہانہ مل جاتا

ادریس کا دماغ اب صرف اس سوچ میں مبتلا تھا کہ ماں کی شفقت پھر کیونکر حاصل کرے۔ مریم کو اُسنے ایک حرفِ غلط سمجھ لیا تھا اور بڑی جد و جہد کے بعد اسکی طرف سے اپنے کو خالی الذہن کر لیا تھا

(۱۶)

اساڑھ کا مہینہ تھا۔ عید کا دن تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ دیہاتوں میں یہ موسم یوں بھی حرکت و نشاط کا موسم ہوتا ہے۔ اسپر طرہ عید کا ہر شخص کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ محروم سے محروم اور نادار سے نادار اپنے کو آج بامراد تصور کر رہا تھا۔ محتاج و غنی آج ایک صف میں تھے۔ تاج والے "کلاہِ نمد" والوں سے ہم بزم تھے

لیکن زمانہ کی بیدردی دیکھئے۔ ادریس کو یہ بھی موقع نہ ملا کہ آج وہ جھوٹی ہی خوشی منا لیتا۔ اسکو دو روز پہلے سے شدید بخار تھا اور اسکا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ مریم اسکی تیمارداری میں پوری تندہی کے ساتھ مصروف تھی۔ ادریس کو یہ ناگوار تھا مگر وہ چپ تھا اور مریم کی طرف متوجہ نہ تھا۔ دن کے دس بج چکے تھے۔ ادریس کھڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ عید گاہ سے لوگ گلے ملتے ہوئے اپنے اپنے گھر واپس آ رہے ہیں اتنے میں اسکی نظر انھیں راہیوں میں ممتاز پر پڑی جو اسی کے مکان کی طرف آ رہا تھا۔ اُسنے مریم سے بے کیف لہجے میں کہا "دروازہ کھول دو۔ ممتاز آ رہا ہے"

ممتاز داخل ہوا اور ایک نظر مریم پر ڈالکر ادریس سے پوچھا "کیوں؟ خیریت تو ہے؟" ادریس نے ایک تلخ مسکراہٹ سے جواب دیا "اب تو سر پر جو پڑے اسکو خیریت ہی سمجھنا چاہئے۔ آج ساری دنیا جھولوں میں مصروف اور میں اس کال کوٹھری میں بیٹھا ہوا اپنے لئے ایک عید نامہ موزون کر رہا تھا۔ پورا تو ہو نہیں سکا چند اشعار سُن لو

نہیں معلوم تمکو کیا ہے عید! — مجھکو تو قہر ہے بلا ہے عید!
عید کیا عید کی خوشی کیسی! — نہ رہا دل تو خوشدلی کیسی!
تم ہو مصروف ساغر و مینا — مجھکو دن رات خون دل پینا
روز و شب آنسوؤں سے کام مجھے — دیدۂ خونچکان ہے جام مجھے

ممتاز دیر تک ادریس کی حسرتناک صورت کو دیکھتا رہا اسکے بعد وہاں سے اُٹھا اور سکینہ کے پاس پہنچا

سکینہ کی حالت ادریس سے کچھ کم قابل رحم نہ تھی۔ آج صبح سویرے سے وہ ایک کونہ میں پڑی رو رہی تھی۔ اور کسی طرح طبیعت ہلکی نہ ہوتی تھی۔ پچھلی عید اسکو بیطرح یاد آ رہی تھی جو اسکی زندگی میں غالباً سب سے زیادہ پر مسرت عید تھی۔ ادریس گھر تھا اور کاروبار میں ترقی کر رہا تھا۔ سکینہ کیلئے یہ بجائے خود ایک عید تھی۔ اور ایک عید اس سال کی تھی کہ سکینہ کو سال بھر کے بعد بھی بیٹے کی صورت دیکھنا میسر نہ ہوا۔

سکینہ اپنے کو ملامت کر رہی تھی کہ نہ وہ اسقدر سخت گیر ہوتی نہ اسکی یہ مصیبت اتنا طول کھینچتی۔ اُسنے غور کرنا شروع کیا تو اسکو معلوم ہوا کہ مریم جہانتک کہ خود سکینہ کو اسکا تجربہ تھا ہرگز ایسی چیز نہ تھی جس سے نفرت کی جائے۔ سکینہ کا رنج و غصہ امتداد زمانہ کے ساتھ زائل ہو چکا تھا۔ اب اسکو مریم مین بہت سی خوبیان نظر آرہی تھین اور اسدن مریم کے ساتھ جو جارحانہ برتاؤ کیا تھا اسپر وہ دل سے پشیمان تھی

اس اثناء مین ممتاز پہنچ گیا اور اُسنے ادریس کی علالت کا حال کماحقہ بیان کر کے کہا "بہتر یہ ہے کہ اب آپ اُنکو معاف کر دین۔ وہ ایک بار مجھ سے اس آرزو کا اظہار بھی کر چکے ہین" سکینہ نے یہ کہکر ممتاز کو رخصت کر دیا "مین کل سوچ کر بتاؤنگی کہ مجھکو کیا کرنا چاہیے" لیکن چار بجتے بجتے وہ ادریس کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہو گئی اُس نے گلشن نامے گاؤن کی ایک عورت کو بلا کر کہا "مین ادریس سے تیواری پور جا کر ملنا چاہتی ہون۔ مین چادر سر سے لپیٹ لون گی۔ تم میرے ساتھ چلو اور جنگل کے اندر سے چلو تاکہ مردون کی نگاہون سے جہانتک ہو سکے بچ کر نکل جائین گلشن راضی ہو گئی اور سکینہ کو ساتھ لیکر تیواری پور روانہ ہوئی

سکینہ نے ادریس کے گھر کے پاس پہنچ کر چادر اُتار دی۔ مریم ادریس کے کسی کام سے باہر آئی ہوئی تھی۔ اسکی آنکھین سکینہ سے لڑین اور تھوڑی دیر کیلیئے اسکو سکتہ سا ہو گیا۔ لیکن وہ دیر کرنیوالی عورتون مین سے نہ تھی۔ اُسنے آناً فاناً طے کر لیا کہ اسکو کیا کرنا ہے۔ سکینہ مشکل سے دس قدم کے فاصلہ پر رہی ہو گی کہ مریم گھر مین گھس گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ دنیا اسکو چاہے کتنا ہی وحشیانہ سلوک کیون نہ سمجھے لیکن اب وہ کسی طرح اسکو گوارا نہ کر سکتی تھی کہ مان بیٹے آپس مین ملکر اپنا اپنا دل ٹھنڈا کرین ایسی حالت مین کہ وہ خود اندر اندر جھلس رہی ہو

گلشن نے چاہا کہ دروازہ کھٹکھٹائے لیکن سکینہ نے روک دیا۔ مریم کے قرینہ سے اسکو معلوم ہو گیا کہ اس مکان مین اسکو کس قسم کے آؤ بھگت کی اُمید کرنا چاہئے۔ اب ادریس سے ملنے کی بجز اسکے اور کوئی سبیل نہ تھی کہ ادریس خود رام نگر آئے۔ سکینہ ادریس کی جان کی خیر مناتی ہوئی اُلٹے پاؤن واپس گئی۔ گلشن نے اسکو بہتیرا سمجھایا لیکن سکینہ کے آنسوؤن کا تار کسی طرح نہ ٹوٹتا تھا

(۱۷)

رات کے کوئی آٹھ بجے ہونگے۔ ادریس کا بخار ہلکا تھا اگرچہ اسکی رگ رگ ابھی تک اسی طرح بیچین تھی۔ اسکو کسی طرح نیند نہین آرہی تھی۔ مریم اسکی پٹی کے پاس بیٹھی تھی لیکن اپنی جگہ پہلو پر پہلو وہ بھی بدل رہی تھی۔ شام کے واردات ابھی اسکے پیش نظر تھے اور اب اسکی سمجھ مین نہ آتا تھا کہ اُسنے اچھا کیا یا برا کیا جو سکینہ کی پذیرائی نہ کی۔ سب سے بڑا سوہان اسکے لئے یہ تھا کہ اگر ادریس کو تمام باتون کا علم ہو گیا تو آیندہ وہ مریم کی صورت بھی کبھی نہ دیکھیگا۔ مگر ہونیوالی بات ہو چکی تھی اور اسکا تدارک ناممکن تھا۔

سارے گھر پر ایک ماتمی سکوت چھایا ہوا تھا۔ ادریس کو دفعتاً ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور اسکا نام لیکر پکار رہا ہے۔ اُسنے ایک بار اور کان لگا کر سنا اور مریم سے کہا "دروازہ کھولدو۔ ممتاز ہین" مریم کا جی سن سے ہو گیا اور اس کا سارا جسم کانپنے لگا

ممتاز نے آتے ہی ادریس کو اس طرح مخاطب کیا جس طرح ایک نبی اپنی مردود قوم کو جسکی اصلاح امکان سے باہر ہو گئی ہو "ادریس ابتک تمنے جو کیا اسکو مین ایک معمولی لغزش سمجھتا تھا جو ہر انسان سے سرزد ہو سکتی ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ تم سفاک ہو

خبیث ہو۔ جہنمی ہو۔۔۔۔"

ادریس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "کہین میرے بخار کا ہذیان تم پر تو نہین طاری ہوگیا؟ آخر بات کیا ہے؟ ہوا کیا؟"

"ہوا کیا؟ جو ہونا تھا وہ ہوا اور جو تم چاہتے تھے وہ ہوا۔ تمنے ماں پر اس طرح دروازہ بند کرلیا کہ کوئی کُتّے بلی کیلئے روا نہین رکھ سکتا۔ وہ تم دونوں کو لینے آئی تھین۔ وہ تمھاری خطاؤن کو معاف کرنے آئی تھین اور تمنے اُنکے ساتھ یہ سلوک کیا، تم پر لعنت ہے۔ اب سر پر ہاتھ رکھکر تمام عمر روتے رہو تو بھی تمکو ماں کا سایہ نہین نصیب ہو سکتا۔ وہ یہاں سے لوٹی جارہی تھین جنگل مین سانپ نے ڈس لیا اور وہ چند گھڑیون کی مہمان ہین"

ادریس کود کر بستر سے زمین پر آرہا۔ اسکو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اسکا خون جسم کے اندر جمتا چلا جارہا ہے۔ پہلے تو اسکی سمجھ مین کچھ نہ آیا کہ ممتاز کیا بک گیا جب اُسنے ممتاز کے چہرہ کو اچھی طرح دیکھ لیا اور حقیقت کا احساس ہوا تو کہا "یہ مین کیا سُن رہا ہون اور تم کیا کہہ رہے ہو؟ مین سنے؟ مین نے ماں پر اپنا دروازہ بند کرلیا۔ یہ کب کی بات ہے؟ مجھے تو کچھ یاد نہین آتا۔ وہ یہاں کب آئی تھین؟" ادریس کی حالت دیکھتے دیکھتے ایسی ہوگئی کہ دیکھنے والے سے دیکھی نہین جاتی تھی۔ ممتاز کو بھی ترس آگیا مریم سے بھی نہ رہا گیا۔ اُسنے جرأت کی اور ادریس کے قدمون پر گر کر بولی "یہ سب کچھ میرا کیا دھرا ہے۔ مین یہ نہین کہہ سکتی کہ مجھے معاف کیجئے۔ نہین مجھے جو سزا چاہئے دیجئے"

ادریس اپنے ہوش مین نہ تھا۔ اُسنے مریم کو اس زور سے ٹھکرایا کہ اگر ممتاز سنبھال نہ لیتا تو وہ سیدھی دیوار سے جاکر ٹکر کھاتی۔ ادریس نے دوڑ کر پھر مریم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "بدبخت مجھے معلوم تھا کہ تو موت اور غارتگری کی دیوی ہے۔ تو مجسم "بہت" تھی۔ مین نے تجھکو اپنے دل مین جگہ دی۔ اسکی سزا پا گیا۔ اب مین تیرا سایہ بھی دیکھنا نہین چاہتا۔ جا اور اب رؤف کا خون چوس جسکی گود اسدن ٹھنڈی ہورہی تھی" ادریس نے ایک بار مریم کا سر اٹھا کر حقارت کے ساتھ دیکھا اور ممتاز کے ساتھ رام نگر چلا گیا۔ مریم کی آنکھون مین دنیا تیرہ و تار تھی۔ وہ سارے گھر مین "ہائے ہائے" کرتی پھر رہی تھی۔ بڈھا رسول شاہ بھی لڑکھڑاتا ہوا اسکے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور اسکو سمجھا رہا تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ مریم کے کانون مین آواز ہی نہین جاتی۔ وہ اسی طرح اپنے بال نوچتی رہی اور کپڑے پھاڑتی رہی

رؤف شام سے جنگل مین مریم سے ملاقات کی اُمید مین گھوم رہا تھا اسکو ایک آدمی سے سارے واقعات معلوم ہوچکے تھے۔ ادریس کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہوا ہوگا کہ رؤف مضطر و بیتاب رسول شاہ کے گھر مین داخل ہوا اور بے خوف و خطر مریم کو گود مین لیکر کہنے لگا "مریم! مین جبتک زندہ ہون تمکو اس حال مین نہین دیکھ سکتا۔ مین دنیا و عقبےٰ دونون تم پر نچھاور کردون گا۔ اور تمھاری زندگی کو از سر نو خوش و خرم بنانیکی ہر ممکن تدبیر کرونگا۔ تم صرف اتنا کہدو کہ تم میرے ساتھ رہنا گوارا کروگی۔ پھر جہان کہو تم کو لیکر چلا چلوں یقین مانو اگر سات سمندر پار بھی تمکو چین ملے تو مین وہان بھی چلنے کے لئے تیار ہون۔ لیکن مریم! میری شہزادی! - للہ یون جان نہ کھو!"

مریم تھوڑی دیر تک پاگلون کی طرح ٹکٹکی باندھے ہوئے رؤف کو دیکھتی رہی۔ اور پھر اس سے لپٹ کر کہنے لگی "ہاں رؤف میاں مجھے لے چلو۔ یہاں سے دور اگر جہنم مین بھی لے چلو تو اب مین چلونگی۔ ابھی چلو مین چلنے کیلئے تیار ہون۔ آہ! مین پاپن ایسا جلی نہ کوئلا بھئی نہ راکھ!"

رؤف نے بیتابانہ مریم کا منہ چوم کر کہا "اس طرح بدحواس نہ ہو مین تمھارا ہون۔ میری دولت تمھاری ہے۔ تم جو چاہو مجھ سے کرالو۔ آج بھور کے وقت تم تیار رہنا۔ مین تمھارے ساتھ یہان سے نکل چلونگا۔ تین بجے صبح کو گھر سے ایک گاڑی لکھنؤ کو جاتی ہے۔ ہملوگ فی الحال لکھنؤ کا ٹکٹ

لین گے'' مریم نے کہا ''اچھا اب جاؤ اور جلد سے جلد اپنا سامان درست کرلو''

(۱۸)

رؤف کو رخصت کرکے مریم نے تمام واقعات پر بیٹھکر تبصرہ کرنا شروع کیا۔ وہ بیکار اتنا تڑپ چکی تھی کہ اب اسمین زیادہ تڑپنے کی تاب نہ تھی۔ ناچار اُس نے سوچنا شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ اسکے حواس درست ہونے لگے اور اُسکی عقل کام کرنے لگی۔ اب رؤف اسکو ایک بہکانیوالا شیطان معلوم ہو رہا تھا جو اسکو کمزور پاکر اپنی اس ہوس کو آسودہ کرنا چاہتا تھا جسکو ایک مدت سے اپنے دلمین پرورش دے رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی مریم پھر وہی سرکش مریم تھی۔ نہین وہ ہرگز رؤف کو اپنے اوپر قابو نہین دے سکتی۔ لیکن آخر پھر کیا کرے۔ مریم کا دماغ تیزی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ دفعتًا وہ مسکرائی جیسے کوئی بڑی مہم سر کرلی ہو۔ وہ اُس جگہ گئی جہان ادریس کے لکھنے پڑھنے کا سامان تھا اور بیٹھکر ادریس کو یہ خط لکھا

''پیارے۔ تم کہہ گئے ہو کہ مین تمکو اپنا سایہ بھی نہ دکھاؤن۔ اسکا مین نے معقول انتظام کرلیا ہے جسکے بتانیکی ضرورت نہین۔ بس آئندہ تم میری منحوس صورت نہ دیکھو گے چلتے چلتے بعض ایسے واقعات سے صحیح طور پر تمکو اطلاع دیدینا چاہتی ہون جن سے ابتک تم بے خبر ہو۔ مین نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم میرے ساتھ شادی کرکے خوش نہ ہوگے اور وہی ہوا۔ تمنے خوامخواہ ماں سے بگاڑ کیا۔ مین منع کرتی رہی۔ بعد کو مین نے بہت چاہا کہ تم اپنا غم بھول جاؤ لیکن تم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تم خود اس کوفت مین اور نہ جانے کس کس کوفت مین گھلتے رہے اور بے وجہ مجھے بھی گھلاتے رہے۔ آخر کار مین نے سوچا کہ کسی طرح تم اپنی ماں سے ملجاؤ۔ اسکے لئے ایک دن تم سے چھپکر رام نگر گئی اور تمھاری ماں سے ملی۔ مین نے جس عاجزی کے ساتھ تمھاری ماں سے خوشامدین کین شاید تم سے بھی نہ کرتی لیکن مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ بڑی بیدرد ہین۔ اُنھون نے مجھے کتے بلی سے بدتر سمجھکر نکالدیا۔ مین نے تم سے اسکا ذکر اسلئے نہین کیا کہ خوامخواہ تمھارا ملال بڑھیگا۔ مگر مین بھی انسان ہون اور اپنی عزت آپ کرتی ہون۔ مین نے قسم کھالی کہ اب جہانتک ہوسکیگا تمکو ماں سے کبھی نہ ملنے دونگی۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ جہان تم ماں سے ملے کہ میری زندگی اور بھی تلخ ہوجائیگی۔ چنانچہ جب مین نے اُنکو ایک عورت کے ساتھ اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ تمکو لینے آرہی ہین اور تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہوجاؤ گے۔ مین اسکو گوارا نہ کرسکتی تھی اسلئے مین نے دروازہ بند کرلیا۔ میرے فرشتون کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ ہم دونون کو لینے آئی ہین۔ اور مین تمھاری ماں کی قاتل نہین ٹھیرائی جاسکتی۔ اب ایک بات اور رہگئی ہے جس مین مجھے اپنی صفائی کرنا ہے اور وہ رؤف سے میرے تعلقات ہین۔ تم یقین کرو یا نہ کرو۔ مجھے اب اسکی پروا نہین رہی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے رؤف سے کوئی سروکار نہ تھا جیسا کہ پہلے بھی تم سے کہہ چکی ہون۔ اُسدن تمنے یا تمھارے دوست نے مجھے رؤف کی گود مین دیکھا۔ یہ مین اقرار کرتی ہون مجھے اس حالت مین نہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر اسوقت مین اپنے ہوش مین نہ تھی۔ مجھے کسی بات کا احساس نہ تھا۔ تم مجھ سے لڑکر بستی چلے گئے تھے۔ مین اپنی قسمت کو کوسنے ندی کے کنارے چلی گئی تھی اور اس ٹیلہ تک پہنچی جہان پہلے پہل تمنے اپنی بے بنیاد محبت کا اظہار کیا۔ رؤف نے مجھ سے ہمدردیان شروع کین مجھے کوئی حس نہ تھا کہ مین کہاں ہون اور کیا کررہی ہون۔ لیکن مجھے رؤف کے ساتھ ایک وقتی راحت ضرور ملی۔ گنہگار در اصل مین بس اسقدر ہون۔ ہاں اس سے پہلے دو ایک بار یہ خیال ضرور آچکا تھا کہ اگر آج تمھاری جگہ رؤف ہوتا تو شاید میری یہ گت نہ ہوتی۔ سو یہ ایک انسانی کمزوری تھی جسکی بنا پر مجھے کوئی سزا نہین دیجاسکتی۔ بس مجھے اسی قدر کہنا تھا۔ اب اگر میرے خدا نے چاہا تو نہ تم مجھے دیکھو گے اور نہ مجھ سے کچھ سنو گے۔ ہاں یہ پہلا اتفاق ہے کہ مین تمکو ''تم'' کہہ کر پکار رہی ہون۔ اسکی وجہ یہ ہے

کہ آج مین اپنے کو ساری دنیا سے اور خاصکر تم سے بہت بلند چیز سمجھ رہی ہون۔ اسکی وجہ خود میری سمجھ مین نہین آتی۔ آخر مین یہ بھی کہدینی ہون کہ اگر مین اب بھی کسی کو چاہتی ہون تو وہ تم ہو اور میری آخری دعائین تمھاری جان کے ساتھ ہین"

"تمھاری مریم"

بارہ بجے کا وقت تھا۔ رات اندھیری تھی۔ مریم نے خط ختم کیا اور یوسف پور جاکر نور محمد کو دیا۔ نور محمد اندیشہ ناک ہو کر اسکی صورت دیکھنے لگا۔ مریم نے اسکی نگاہون سے تجاہل کر کے کہا "مین اب جاتی ہون۔ تم آدھے گھنٹے کے بعد اس خط کو جاکر ادریس میان کو دیدینا"

(۱۹)

ادریس کو جسوقت مریم کا خط ملا ہے اسوقت سکینہ کی تجہیز و تکفین کا سامان ہو رہا تھا۔ گاؤن والے جمع تھے اور "نوحۂ غم" سے "گھر کی رونق" بڑھی ہوئی تھی۔ مریم کا خط پڑھکر ادریس کچھ دیر کیلئے دم بخود ہو گیا اور پھر اسپر ردعمل کا دورہ شروع ہو گیا۔ اسکے دل مین طرح طرح کے خطرات پیدا ہونے لگے۔ مجبوراً اسنے ممتاز کو ہمراز بنا کر کہا "نہ جانے وہ کیا کرنیوالی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم میرے ساتھ فوراً تیواری پور چلو" ممتاز تیار ہو گیا

تھوڑی دیر مین دونون اس راستہ پر تھے جو آمی اور پریتیا کے درمیان مین ہے۔ آدھا راستہ طے ہو چکا تھا اور وہ ٹیلہ قریب تھا جو ادریس کی محبت کا گہوارہ بھی تھا اور تربت بھی۔ اس سے گذر کر ادریس نے دیکھا کہ ایک عورت بھاگی ہوئی چلی آرہی ہے اور اسکے پیچھے پیچھے ایک مرد دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ عورت کہہ رہی تھی "نہین میرا پیچھا نہ کرو۔ میری کمزوری سے فائدہ اُٹھانیکی کوشش نہ کرو۔ مین نے تم سے جو وعدہ کیا وہ ہوش و حواس کی حالت مین نہ تھا" ادریس نے مریم کی آواز کو پہچان لیا اور اسکی طرف لپکا۔ مریم نے اسکو دیکھ لیا حسرت بھرے لہجے مین کہا "آہ! مین چاہتی تھی کہ ایک بار اس ٹیلہ پر اور بیٹھ لون مگر میری قسمت مین اتنا بھی نہین" یہ کہکر وہ ندی مین کود پڑی۔ اسی کے ساتھ رؤف بھی کودا جو اب مریم سے صرف چند قدمون کے فاصلہ پر رہگیا تھا

ادریس دیکھ رہا تھا کہ رؤف اور مریم باہم گتھے ہوئے غوطے کھا رہے ہین لیکن وہ سر تھامے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے اسکے اعصاب مفلوج ہو گئے ہون اور آنکھین پتھرا گئی ہون۔ ممتاز کھڑا غور سے دیکھ رہا تھا۔ رؤف ایسا تیراک نہ تھا جو ایک ڈوبتے ہوئے کو بچا سکے۔ چند منٹ مین مریم اور رؤف دونون تہ نشین ہونے لگے۔ یہ دیکھکر ممتاز بھی ندی مین کودا لیکن موقع تک پہنچنے مین اسکو دیر ہو گئی۔ رؤف اور مریم کی یادگار مین سطح آب پر صرف چند بلبلے رہگئے تھے

صبح ہوتے ہوتے رام نگر سے تین جنازے نکلے۔ ماتم دارونکی آمد و رفت جاری تھی لیکن ان مین ادریس کا کہین پتہ نہ تھا۔ ممتاز کی پریشانی کی کوئی حد نہ تھی۔ اسکو ایک طرف رابعہ اور اُسکے والدین کو سنبھالنا تھا اور دوسری طرف ادریس کو ڈھونڈ کر نکالنا تھا۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہ ادریس کے کھوج مین نکلا۔ ادریس آمی کے کنارے اسی ٹیلہ کے پاس بیٹھا ہوا ملا۔ اس کا دماغ مختل تھا اور وہ کسی بات کا جواب نہ دیتا تھا۔ بڑی مشکل سے ممتاز اسکو رام نگر لے آسکا

(۲۰)

ان سانحات کو قریب قریب نو مہینے ہو چکے ہین - اس عرصہ مین ادریس کا دماغ اپنی اصلی حالت پر آگیا - اسکی اس بیچینی اور پراگندگی کا کہین پتہ نہین ہے جو اسکی فطرت ثانی ہو کر رہگئی تھی - وہ اب اسطرح مطمئن تھا گویا جو کچھ ہونا تھا وہ سب ہو چکا ہے اور وہ زمین و آسمان کی آفتون سے بالکل مامون ہے - ادریس کو اب جو دیکھتا تھا وہ اسکو ایک نئی ہستی پاتا تھا - وہ ابھی تک رام نگر مین تھا - ممتاز بھی اسکے ساتھ رہتا تھا - ادریس صبح سے شام تک خاموش رہتا تھا اور صرف شام کے وقت اس ٹیلہ کی زیارت کر آتا تھا جو اسکے لئے دنیا کی بہترین اور عزیز ترین عبادت گاہ ہو گئی تھی - مختصر یہ کہ وہ اس شعر کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھا

چندانکہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم ساکن شدم میانۂ دریا قرار شد

ادریس کی اندرونی کیفیت کو سمجھنے والے صرف دو تھے - ایک تو ممتاز دوسری رابعہ - رابعہ کا باپ ایک ماہ پہلے ہیضہ کی وبا مین مر چکا تھا - پے بہ پے مصیبتون نے رابعہ کے دل مین ایک خستگی ایک گداز ایک گھلاوٹ پیدا کر دی تھی اور اب وہ اپنے اور ادریس کے درمیان ایک مشترک عنصر محسوس کر رہی تھی - وہ ادریس سے ملنے کے لئے بیتاب تھی - اُسنے کئی بار ادریس کو بلا بھیجا مگر ادریس اپنی خیالی دنیا مین کچھ ایسا محو تھا کہ اُسنے رابعہ کی طرف توجہ بھی نہ کی - ایک دن ۱۲ بجے رات کو جبکہ سارے رام نگر پر ایک سکوتِ خواب مسلط تھا رابعہ خود ادریس کے پاس پہنچی - ممتاز سو گیا تھا - مگر ادریس اپنے بستر پر بیٹھا تکیہ زانوؤن پر دھرے کچھ سوچ رہا تھا - رابعہ کو دیکھکر اسکی پیشانی پر بل پڑ گئے اُسنے کہا

" تم کس لئے یہان آئی ہو؟ اب تمکو مجھ سے کیا کام ہے؟ "

رابعہ نے اسکے تیور کی پروا نہ کی اور ہاتھ جوڑ کر بولی " ادریس اس مین شک نہین کہ میرا منہ ہرگز اس قابل نہین رہا کہ تم سے ملون یا کچھ کہون لیکن مین انسان ہون اور انسان خطاؤن کا پتلا ہے - خطاؤن کو معاف کرنا صفاتِ خداوندی مین سے ہے - تم فیاض ہو - دریا دل ہو - تمھاری اپنی مصیبتون نے تمکو اس قابل بنا دیا ہے کہ دوسرون کی مصیبت کو سمجھو - مجھے اس سے انکار نہین کہ تم کو برباد کرنے والی در اصل مین تھی لیکن میرے اچھے ادریس تم مجھکو معاف کر دو اور مجھے اپنی لونڈی بنا کر رکھ لو - مجھکو معلوم ہو چکا ہے کہ اگر تمنے اپنے دامن مین پناہ نہ دی تو مجھے دنیا مین کہین پناہ نہ ملیگی - ادریس مین تمکو اپنا معبود سمجھکر پوجونگی مجھے معاف کر دو " !

رابعہ کا لہجہ درد بھرا تھا - ادریس متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا - اُسنے رابعہ کو بستر پر بٹھا کر کہا " ہر چند نہ مین خدا ہون اور نہ ہونا چاہتا تاہم تمھاری کلفتون کو محسوس کرتا ہون - اگر تم اس سے پہلے معافی مانگتین تو مین ہرگز معاف نہ کرتا لیکن اب مین اس درجہ کو پہنچ چکا ہون جہان کسی کو کسی سے شکایت نہین ہوتی - مین زندگی کی اصلیت سمجھ چکا ہون - اور تمنے جو کچھ کیا اسکو مین گناہ نہین سمجھتا - پھر تمھین کہو مین معاف کس چیز کو کرون - رہگیا یہ سوال کہ مین تمکو اپنی پناہ مین لے سکتا ہون یا نہین سو اسکے متعلق مجھے ایک بات کہنا ہے - اگر تم غور سے سننے کے لئے اور سوچ سمجھکر اسپر عمل کرنیکے لئے تیار ہو تو کہون "

رابعہ سراپا گوش بنگئی - ادریس نے ممتاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " مین تمکو چاہنے اور تم سے چاہے جانیکا اس بدنصیب کو اپنے سے زیادہ مستحق سمجھتا ہون اور میرا ایمان یہ ہے کہ تم کو اگر چین نصیب ہو سکتا ہے تو میرے دامن مین نہین بلکہ اسی کے دامن مین - تم اسکو نہین سمجھو گی -

مگر میں خوب سمجھتا ہون۔ تمنے اسکو کبھی نظر بھر کر دیکھا بھی نہین مگر یہ تمکو اسی طرح چاہتا رہا۔ ذرا سوچو تو وہ تم کو اس حالت مین بھی چاہتا رہا جبکہ مجھکو تم سے شدید ترین نفرت تھی۔ اسلئے میری صلاح یہ ہے کہ تم ممتاز کو اپنا سرتاج بنالو۔ راحت پاؤگی۔ اس سے زیادہ نہ مین کچھ کہہ سکتا ہون اور نہ تمھارے کام آسکتا ہون۔ اگر کسی کے کام آسکتا تو سب سے پہلے اپنے کام آتا اور مریم کو یون نہ کھو دیتا۔ اگر محبت واقعی کوئی چیز ہے اور اگر مین نے کسی کی محبت کی تو وہ تمھاری نہین بلکہ مریم کی۔ اسکا یہ حشر ہوا۔ تمنے مجھکو مٹایا۔ مین نے مریم کو۔ ذرا دیکھنا کس کا انتقام کس سے لیا گیا۔ نہ جانے اب میرا انجام کیا ہونیوالا ہے" یہ کہکر ادریس نے آنکھون مین آنسو بھر کر یہ شعر پڑھا

طالع بخت مرا ہیچ منجم نہ شناخت
یارب از مادر گیتی بچہ طالع زادم!

رابعہ ساکت و صامت ادریس کا منہ تکتی رہی۔ ادریس نے کہا "اب جاؤ مین کل تمھاری مان سے آکر اس معاملہ پر گفتگو کرونگا لیکن اگر تمنے میرا مشورہ نہ مانا تو مجھے تم سے پھر نفرت ہوجائیگی" ادریس نے رابعہ کا ماتھا چومکر اسکو رخصت کر دیا اور تھوڑی دیر بعد ممتاز کو جگا کر اس سے پورا واقعہ بیان کر دیا

ممتاز نے کہا "تمنے بڑی غلطی کی۔ سکون کی مجھ سے زیادہ تمکو ضرورت ہے۔ اور بہت ممکن تھا خدا تمکو اسی بہانہ سکون دیتا ادریس محبت سے زیادہ سکون بخش چیز دنیا مین کوئی نہین"

ادریس نے مسکرا کر کہا "مین نے اس معاملہ پر کافی غور کر لیا ہے۔ سکون و اطمینان ہر شخص کے حصہ کی چیز نہین۔ یہ اپنا اپنا کردار ہوتا ہے اور اپنا اپنا بچپن جو انسان کی زندگی کو بناتا بگاڑتا ہے۔ چنانچہ یہ میرا ہی کردار تھا جسنے مجھے برباد کیا اور میرے ساتھ دو معصوم اور بےگناہ عورتون کو خاک مین ملادیا۔ خدا کی بحث میرے سامنے نہ نکالو۔ جس چیز کو تم خدا کہتے ہو مین اسکو ایک اندھی قوت سمجھتا ہون جو ایک فاتر العقل بچے کی طرح حسین چیزون کے ساتھ پہلے تو کھیلتی ہے اور پھر انکو توڑ پھوڑ کر رکھدیتی ہے۔ رہگئی محبت سو میرا خیال ہے کہ اس دنیا کے حوادث مین اسکا وجود نہین۔ اس دنیا کی محبت کے متعلق اثر نے سچ کہا ہے

واقعی کون کس کو چاہے ہے
ہر کوئی وہم مین بنا ہے ہے

ممتاز تمھارے معتقدات کچھ اور ہین۔ تمھارا مزاج تمھاری طبیعت کچھ اور ہے اسلئے تم رابعہ کے ساتھ آسودگی ضرور پا سکتے ہو مجھے چھوڑو۔ مین نے اپنی آئندہ زندگی کا نقشہ بنالیا ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب مریم کی راہ مین خیرات کر دونگا اور خود تیواری پور کی اسی جھونپڑی مین رسول شاہ کے ساتھ رہکر کھیتی پر بسر اوقات کرونگا"

مجنون گورکھپوری

ہمیشہ یاد رکھئے

(۱) خط و کتابت مین نمبر خریداری درج کرنا (۲) جوابی امور کے لئے ٹکٹ جوابی کارڈ بھیجنا (۳) بیس تک پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع کرنا (۴) منی آرڈر کے کوپن مین نمبر خریداری درج کرنا

(مینجر نگار لکھنؤ)

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

امام غزالی کے صوفیانہ تجارب امام غزالی فرماتے ہین اس دور عزلت نشینی مین مجھ پر ایسی ایسی چیزین منکشف ہوئین کہ انھین شمار نہین کر سکتے، دوسرونکے فائدہ کے لئے اتنا بتا دینا چاہتا ہون، کہ مجھے علم یقینی ہو گیا ہے، کہ صرف صوفیہ ہی سلوک الہیہ کے رہرو ہین، اور اور یہ کہ انکے آئین وضوابط سب سے عمدہ انکا طریقہ سب سے یقینی، اور انکے صفات سب سے پاک اور ستودہ ہین، اگر عالم کے عقلا اپنے ذہن فضلا اپنی عقل، اور قانون الہیہ کے ماہرین اسرار، اپنے علم ومعرفت کیساتھ، مجتمع ہو کر چاہین، کہ مسلک تصوف کے کسی آئین مین تغیر وتبدل یا ترمیم کرین، تو انہین اسکا موقع نہین، صوفیہ نے تمام عملیات خواہ وہ حرکت سے متعلق ہون یا سکون سے، خارجی ہون یا دخلی، شمع وحی کی روشنی سے مستفاد ہین، اور روئے زمین پر انوار وحی کے سوا، کوئی دوسری شے ایسی نہین جس سے استفادہ نورانی کیا جائے مختصر یہ کہ انکے پاک مسلک کے متعلق، جو کچھ کہا گیا، وہ یہی ہے، مسلک تصوف کی پہلی تلقین یہ ہے، کہ دماغ کو غیر خدا سے بالکل پاک وصاف کر دیا جائے، اسلئے داخلہ کی کنجی اذان نماز کی طرح (جسکا مقصد یہ ہے کہ اب نماز کے سوا، تمام اعمال ناجائز ہین) یہ ہے کہ دماغ کو سراپا خدا کی یاد مین مستغرق رکھا جائے،

استدراً ایک رہرو طریق، کی نظرون سے حجابات (مادیہ) دور ہو جاتے ہین، اور اس کیلئے اروحانی علم وعرفان کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، طریقت کا وہ رہرو، عالم بیداری ہی مین ملائکہ اور ارواح انبیا کا مشاہدہ کرتا ہے، انکی آوازین سنتا ہے، اور ان سے کسب فیضان کرتا ہے، اسکے بعد اسکی روحانی حالت ایسی ارفع ہونے لگتی ہے، کہ صور وامثال کے حجابات دور ہو جاتے ہین، اور وہ ایک ایسے نشیمن لاہوتیہ مین جاگزین ہوتا ہے، جسکا صحیح مرقع الفاظ مین نہین پیش کر سکتے، قرب الہیہ کی وہ منزل اسکے سامنے ہوتی ہے، جیسے بعضون نے "حلول" سے موسوم کیا، بعضون نے "اتحاد" اور "وصول" سے لیکن یہ تمام تعبیرات ناقص ہین، جو اس عالم شہود کی صحیح ترجمانی نہین کر سکتین،

عالم "شہود" اور کیفیت "حال" صوفیہ کا خیال ہے کہ رہرو طریقت کو یہ لذت شہود عالم "حال" مین میسر ہوتی ہے "حال" کے متعلق میکڈونلڈ لکھتا ہے، کہ اس سے وہ نفسیاتی حالت مراد ہے، جسکی تکوین نہ تو کسی سعی کا نتیجہ ہے، اور نہ کوئی ظاہری علت اسکے حدوث کا سبب ہے، یہ ایک احساس ہے، جو قوت ادراک کے مخالف ہے، یہ ایک قریبی شعور ہے، جسے مشتقات علمیہ سے تعبیر نہین کر سکتے، صوفیہ نے لفظ "احوال" کو حسرت وغم، علو وحضیض سے بھی تعبیر کیا ہے، جو عابد کے قلب مین نازل ہوتا ہے، یہ اصطلاح اپنی آخری ترقی یافتہ صورت مین وہ اعلیٰ معنی ظاہر کرتی ہے، جسے بیخودی (Ecstasy) کہتے ہین، جسوقت صوفی احساس خودی سے گزر جاتا ہے، اسے عالم مادی کا شعور باقی نہین رہتا، اسوقت اسے صرف خدا ہی کا شعور ہوتا ہے، یہ کیفیات اسکے ارادہ سے حاصل نہین ہو سکتین بلکہ اس وقت روح آتی اور روانہ ہوتی ہے

ملاشاہ اور مراقبہ ذات

میکڈ ونلڈ لکھتا ہے، کہ صوفیانہ زندگی کی دوسری مثال ہملوگون کو ہندوستان کے اس دور کی طرف متوجہ کرتی کرتی ہے، جب اکبر، جہانگیر، شاہجہان، اور اورنگ زیب سریرآرائے حکومت تھے، اس عہد مین ایک نہایت مشہور صوفی گزرے ہین، جو کچھ دنون بلخ مین رہے، کاشمیر مین آئے، اور پھر لاہور مین اقامت کرلی، فرانس کے مشہور مستشرق، دان کریمر کی بدولت آپکی زندگی، اور آپکے اقوال منصہ شہود پر آئے فاضل مستشرق نے یہ روایات بسند متصل حاصل کئے ہین جنھین آپکے ایک مقرب مرید نے ایک کتاب مین جمع کر دیا تھا، یہ جامع روایات (خسرو دہلوی کی طرح) صوفیانہ زندگی گزار رہا تھا، اور دربار مغلیہ مین بھی ایک معزز عہدہ پر فائز تھا، وہ بزرگ حضرت ملاشاہ تھے، جو ۱۵۸۵ء مین بمقام بدخشان پیدا ہوئے، بلخ اور لاہور مین تعلیم پائی اور سلسلہ قادریہ مین بیعت کرلی، آپ وحدت فی الکثرت کا ذوق صوفیانہ رکھتے تھے، اور لوگونکی ناراضگی اور دل آزاری کے خیال سے اسلام کے ظاہری طریقہ پر بھی عامل تھے، آپکا حلقہ اثر اسقدر مقناطیسی پہلو رکھتا تھا کہ مریدین کا ہجوم لگا رہتا تھا، آپ کے متعلق کفر والحاد کا فتوی بھی جاری ہوا، لیکن آپ نے اورنگ زیب جیسے ظاہر بین، اور سخت گیر مسلمان کو مانوف رکھا، اور ایک پاک اور مقدس زندگی گزار کر، ۱۶۶۱ء مین بمقام لاہور انتقال کیا،

آپکے مرید اور مولف زندگی کا نام توکل بیگ تھا، جسے آپنے ابتدائے شباب ہی مین صوفیانہ زندگی سے آشنا کیا، توکل بیگ کمالات صوفیانہ کے اس نقطہ پر پہونچا، جہان اس نے نور باطن کا مشاہدہ کیا، اور جہان اسے ہر شے مین وحدت کی جلوہ گری معلوم ہوتی تھی، اور جہان وہ اپنی انفرادی ہستی کو بھی فانی اور ہستی واحد مین جذب ہو کر، باقی تصور کرنے لگا تھا،

توکل بیگ خود اپنی صوفیانہ ریاضت کے متعلق لکھتا ہے، جسے دان کریمر نے فارسی سے فرنچ مین ترجمہ کیا میکڈ ونلڈ نے فرنچ ہی کا انگریزی ترجمہ کیا تھا، جسے اردو مین پیش کیا جاتا ہے، توکل بیگ لکھتا ہے:-

مینے تمام رات بغیر آنکھ جھپکائے گزار دی، اور ایک لاکھ مرتبہ قرآن مجید کی ایکسو بارہوین سورۃ (سورۃ اخلاص) تلاوت کرنے مین مشغول ہوگیا، یہ عمل مینے چند دنون مین ختم کیا، مشہور ہے کہ اس سورہ مین اسم اعظم ہے، جو شخص اسے ایک لاکھ مرتبہ پڑھ لیگا، اسکے اثر سے اسکی تمام مرادین برآوینگی، اسلئے مینے حضرت ملاشاہ کی نظر محبت حاصل کرنے کی غرض سے یہ عمل شروع کر دیا، اور مین عقیدہ راسخ رکھتا تھا، کہ اس ذریعہ سے میری مراد برآویگی مینے جسوقت لاکھون مرتبہ یہ سورت پڑھی، میرے مرشد کے دل مین میری ہمدردی پیدا ہوئی، اور آپنے اسوقت سنگھین محمد اپنے خلیفہ کو بھیجکر مجھے اپنے حضور مین طلب کیا، تمام رات آپنے مجھ پر " توجہ " مبذول کی اور مین خود اپنے قلب کی طرف توجہ کرتا رہا، مگر میرے قلب کی عقدہ کشائی نہ ہوسکی،

اس طرح تین راتین گزر گئین، حضرت ملاشاہ اپنی روحانی توجہ صرف فرماتے رہے، لیکن کوئی اثر مرتب نہوا، چوتھی رات ملاشاہ نے کہا کہ سنگھین محمد اور صالح بیگ جو جذبہ "حال" رکھتے تھے، اپنی توجہ کرینگے، انہون نے اس حکم کی پیروی کی، اور مین تمام رات قبلہ رخ ہو کر بیٹھا رہا، اور اپنی تمام قوتین اپنے قلب کی طرف مبذول رکھین، صبح کے وقت کسی قدر نور اور صفائی میرے قلب مین جلوہ گر ہوئی، لیکن مین رنگ یا صورت کی تمیز نہین کر سکتا تھا،

نماز صبح کے بعد مین ان دو متذکرہ بالا آدمیون کے ساتھ اپنے پیر کے پاس گیا، انھون نے مجھے سلام کیا اور ان دونون آدمیون سے

دریافت کیا کہ میرے لئے انھون نے کیا کیا، تب وہ میری طرف مخاطب ہوئے، اور مجھ سے میرے تجارب کے متعلق سوال کیا، مینے کہا کہ مین قلب کے اندر ایک قسم کی صفائی محسوس کرتا ہون، اسپر شیخ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا، اور مجھ سے کہا کہ تمھارا قلب مجموعہ محاسن ہونیکے باوجود اس قدر تاریک ہوگیا ہے کہ سمندر ناپیدا کنار کے دو گھونٹ بھی اسمین نہ تو چمک پیدا کر سکے نہ جلا، اب وقت آگیا ہے کہ مین خود دکھاؤن کہ یہ کیونکر پاک و صاف ہوجاتا ہے،

اسکے بعد انھون نے مجھے اپنے نزدیک بٹھایا، میرے حواس کا یہ حال تھا کہ جیسے مین مست ہون، میرے مرشد نے مجھے حکم دیا کہ مین آپکی صورت قلب مین متعین کرون، آپنے میری آنکھون پر پٹی باندھ دی، اور کہا کہ مین اپنی تمام دماغی قوتین اپنے قلب پر مجتمع رکھون، مینے ایسا ہی کیا، اور ایک آن مین خدا کی عنایت، اور شیخ کے فیضان باطنی سے میرا قلب منکشف ہوگیا، مینے دیکھا کہ میرے اندر الٹے ہوئے پیالہ کی طرح کوئی چیز رکھی تھی، وہ سیدھی ہوگئی، اس سے مجھ مین بے انتہا مسرت پیدا ہوئی، مینے مرشد سے کہا کہ اس حجرہ کی طرح جسمین مین آپکے نزدیک بیٹھا ہوا ہون، ایک دوسرا حجرہ خود اپنے اندر دیکھ رہا ہون، اور مجھے ایسا نظر آرہا ہے، جیسے کوئی دوسرا توکل بیگ کسی دوسرے ملاشاہ کے نزدیک بیٹھا ہوا ہے،

تب انھون نے حکم دیا کہ مین آنکھین کھول دون، مینے اپنی ظاہری آنکھون سے انھین اپنے نزدیک بیٹھا ہوا دیکھا اسکے بعد پھر انھون نے میری آنکھون پر پٹی باندھ دی، اور مینے اپنی روحانی آنکھون سے انھین اسی طرح بیٹھا ہوا دیکھا حیرت مین آکر مین پکار اٹھا، یا مرشد! خواہ مین اپنی جسمانی آنکھون سے دیکھون یا روحانی آنکھون سے صرف آپ ہی آپ نظر آتے ہین،

اسکے بعد مینے دیکھا کوئی ترمراتی ہوئی شکل میری طرف چلی آرہی ہے، جب مینے مرشد سے اسکا تذکرہ کیا تو انھون نے مجھسے کہا کہ اس صورت سے نام دریافت کرنا، مینے اپنے دماغ ہی مین یہ سوال کیا، اور اس صورت نے قلب سے جواب دیا، میرا نام عبدالقادر جیلانی ہے، [1] مینے اپنے گوش روحانی سے یہ آواز سنی، تب میرے مرشد نے مجھے تلقین کی کہ مین ولی موصوف سے، روحانی استمداد، اور فیض باطنی کی درخواست کرون، جب مینے یہ درخواست کی تو روح نے جواب دیا کہ مین تمھین اپنی امداد تفویض کرچکا ہون، اور یہی وجہ ہے کہ تمھارے قلب کی عقدہ کشائی ہوئی ہے، جذبہ تشکر سے سرشار ہوکر مینے ولی موصوف کی طرف سے ہر جمعہ کی رات کو کامل قرآن ختم کرلینا لازم کرلیا، اور کامل دو سال تک یہ عمل مینے کیا کبھی ناغہ نہ کیا میرے مرشد ملاشاہ نے کہا، عالم روحانی اپنے کمال حسن کے ساتھ تمھین دکھایا گیا اب بیخودی کو کامل طور سے اس عالم غائب کے مشاہدہ عجائب مین مٹاتے رہو مین سختی کے ساتھ اپنے مرشد کے ہدایات پر عمل پیرا رہتا تھا، اور روز بروز عالم روحانی کا علم مجھے زیادہ ہوتا جاتا تھا، اسکے بعد مینے ایک دن آنحضرت صلعم اور آپکے مخصوص صحابیون کی صورت دیکھی اور ملائکہ اور اولیاء اللہ کی جماعتین میری نظر باطن سے گزرتی تھین اسی صورت سے تین ماہ گزر گئے، اور مین ارتقائے روحانی کے اس نقطہ پر پہونچا، جہان رنگ مٹ جاتا ہے، اسوقت یہ تمام صورتین غائب ہوگئین، اس دور مین

---

[1] Proceedings of the Psychical research society مین اس قسم کے اکثر واقعات پائے جاتے ہین، یورپ اور امریکہ مین روحانیات کی ترقی نے اس قسم کے بہتیرے صوفیانہ خیالات کی تصدیق کر دی ہے، آجکل میرے ماموں جناب مخدومی سید مظہر الحق صاحب بیرسٹر کو روحانیات کے مطالعہ کا خاص شغف ہے مطبوعات امریکہ و یورپ کی قدیم و جدید تقریباً پانچسو جلدین آپکے کتب خانہ مین اس فن کی کتابین موجود ہین فرماتے تھے کہ ایک ماہر روحانیات خود اپنا مشاہدہ لکھتا ہے، کہ اسنے امام غزالی کی روح سے ملاقات کی، اور انہین زمرد کا ہار پہنے دیکھا، دماغ ہی مین سوال کرنا اور قلب مین جواب پالینا موجودہ (قرأۃ افکار) Telepathy نے ثابت کردیا ہے،

میرے مرشد نے کبھی وصل الٰہی اور "باطن" صوفیانہ کی توضیح کرنی ترک نہین کی، لیکن انھون نے مجھے حقیقت کاملہ دکھانا پسند نہین کیا، البتہ ایک برس کے بعد علم حقیقت اور یہ کہ اس سے میری اصلی ہستی کو کیا تعلق ہے، مجھ پر منکشف ہوا، اسوقت میرے قلب مین مفصلہ ذیل اشعار کا الہام ہوا، اور یہان سے غیر شعوری طور پر یہ اشعار میری زبان پر جاری ہوگئے

(میکڈونلڈ نے انگریزی اشعار لکھے ہین جو وان کریمر کے فرانسیسی کا ترجمہ ہے، توکل بیگ کے اشعار ملہمانہ فارسی مین تھے، انگریزی کا خلاصہ ترجمہ حسب ذیل ہے،

مجھے یہ خبر نہ تھی کہ یہ برباد ہوجانے والا جسم صرف آب وخاک کا ایک تودہ ہے، مجھے پتہ نہ تھا کہ قلب، روح، اور جسم مین کیسی کیسی قوتین مجتمع ہین، مین بہت متاسف ہون، کہ میری زندگی کا اس قدر حصہ تیرے (خدا؟) بغیر گزر گیا، مین "تم" تھا اور مجھے اسکا علم نہ تھا، جب مینے ملاشاہ سے اس شاعرانہ الہام کا تذکرہ کیا، تو وہ خوش ہوئے کہ اب "اتحاد الہیہ" کا خیال میرے دلمین ظاہر ہوا، اور اپنے احباب کو مخاطب کرکے انھون نے کہا، "توکل بیگ نے میرے منہ سے اتحاد الٰہی کی باتین سنین اور وہ کبھی اسکے رموز کی تکذیب نہین کرینگے، انکی نظر باطن منکشف ہوگئی انکے سامنے رنگ وروپ کا میدان آیا اور وہ اسکی اس منزل پر بھی پہونچے جہان الوان وصور مٹ جاتے ہین، اس شخص کو جو اتحاد الہیہ کے ان وادیون سے گزرجاتا ہے، کامل حقیقت کا علم ہوجاتا ہے، پھر نہ تو وہ اپنے شکوک سے گمراہ ہوتا ہے، نہ منکرین کی اغواسے،

اسکے بعد میکڈونلڈ نے ملاشاہ کے دو شاہی مریدون داراشکوہ اور اسکی بہن فاطمہ کے متعلق توکل بیگ کے بیان کا ترجمہ کیا ہے، فاطمہ نے مشاہدات باطنی، صوفیانہ تجارب، اور علوی روحانی تفصیل سے لکھے ہین ارباب ذوق چاہین تو "رلجس ایٹیچیوڈ اینڈ لائف ان اسلام" کا مطالعہ کرین،

مثال نفس کشی، "ذکر" اور اسکے اسرار ایڈورڈ ولیم لین اپنی اقامت قاہرہ کے زمانہ کی مفصلہ ذیل روایت اپنے ترجمہ الف لیلیٰ کے نوٹ مین لکھتا ہے،

ابوالقاسم گیلانی قاہرہ مین میرے ایک دوست تھے، انھون نے درجۂ ولایت کے حاصل کرنے کیلئے جو نفس کشی اور دوسرے ذرایع اختیار کئے تھے، انکا تذکرہ مجھ سے کر رہے تھے، یہ عمل، جبر نفسیہ، اور کامل توکل علی اللہ سے تعلق تھا، انہون نے تلاش مرشد مین اپنا گھر چھوڑ دیا، اور فارس اور اسکے آس پاس کے ممالک مین (اور اگر ضرورت ہوئی تو دور دراز مقامات مین) سیر وسفر کرنے کے لئے نکلے، بہت دنون تک وہ انسانی آبادی سے علیحدہ علیحدہ رہے، صبح سے شام تک روزہ رکھتے، اور کسی قدر گھانس یا جنگلی پھل سے افطار کرلیتے، یہانتک کہ بتدریج وہ اکل وشرب کے تکلفات سے بھی سبکدوش ہوگئے، پہلے انکے پاؤن مین آبلے پڑگئے، سخت پتھرون سے جگہ بہ جگہ زخمی ہوئے، اور بالکل صلب ہوگئے، مگر غذا کی کمی کے اعتبار سے اصول فطرت کے خلاف انکا جسم اور توانا ہوگیا، اور خواہشات بڑھ گئین، آفتاب کی حدت، اور شانہ پر کالے کالے بال لٹکائے رہتے، اور عریانی جسم سے انکی صورت بھیانک اور دہشتناک معلوم ہوتی تھی، پہلے پہل جب ایک قصبہ مین انکا گزر ہوا، تو لڑکون نے انھین گھیر لیا، اور پتھر برسانے لگے، اسلئے وہ آبادی سے علیحدہ ہوگئے، اور ہمارے قدیم الایام اجداد کی طرح ایک حد تک جسم کو پتون سے چھپایا، اور قبل اسکے کہ پتے سوکھ کر جسم سے علیحدہ ہون وہ شہر چھوڑ دیتے تھے، عموماً انسانی رہگزر سے الگ رہتے، اگر کسی ریگستان مین گزر ہوتا

(جہان نہ جنگلی میوے دستیاب ہو سکتے تھے، نہ پتے) تو آبادی طرف رخ کرتے، اور ایک ٹکڑہ روٹی اور ایک گلاس پانی کسی سخی آدمی سے لیتے، ایک چیز جس سے خصوصیت کے ساتھ وہ خوف کرتے تھے، یہ تھی کہ کہین، کہ کسی فاسق یا شیطان سے (جو انسانی شکل مین ہو) مدد نہ پہونچے ایک مرتبہ ایک تپتے ہوئے ویران مقام مین انکا گزر ہوا، تین دن تک انھین کچھ کھانے کو نہ ملا، نہ گھانس کی ایک پتی ملی نہ پانی کا کوئی چشمہ، تشنگی کا سخت غلبہ تھا، انھون نے دعا کی کہ خدا کسی شخص کو ایک گھڑا پانی لیکر روانہ کرے لیکن ساتھ یہ شرط بھی کی کہ پانی بغدادی گھڑے مین ہو تاکہ مین جان لون کہ یہ تیری طرف سے ہے، شیطان کی طرف سے نہین ہے، اور جب مین اس سے پینے کے لئے مانگون، تو وہ اسے میرے سر پر ڈال دے تاکہ مین اپنے نفس امارہ کو زیادہ آسودہ نہ کر سکون، مینے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ایک آدمی سبز بغدادی گھڑے مین پانی لئے ہوئے آرہا تھا مینے جب اس سے پینے کیلئے مانگا تو اس نے میرے سر پر بہادیا، اور روانہ ہو گیا، اللہ کی قسم ایسا ہوا، اس معجزانہ کرامت کو انھون نے درجات ولایت کا ایک حصہ سمجھا، پانی سے وہ تازہ دم ہو گئے اور منازل ریگستان طے کرنا شروع کئے، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر تشنگی کا غلبہ ہوا، اور انہین ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب وہ بیہوش ہو جاوینگے، کہ سامنے ایک پہاڑی نظر آئی، اور اسکے دامن مین ایک جھرنا جاری تھا، انھون نے نفس کشی کی غرض سے پانی پینے کے قبل پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کا ارادہ کیا، جہان وہ بڑی دقت سے تمام دن کی محنت کے بعد پہونچے، وہ قلہ کوہ پر کھڑے تھے کہ انہون نے سوارونکی ایک جماعت دیکھی جو دامن کوہ کے نزدیک آکر ٹھہر گئی، انکا سردار جو آگے آگے تھا، انکا نام لیکر بولا، اے ابوالقاسم اے گیلانی نیچے آؤ، اور پانی پیو، لیکن میرے دوست نے اس خیال سے کہ وہ ابلیس ہے، اور اسکے رفقا اسکی اولاد ہین، انھون نے خواہش رد کی یہانتک کہ یہ فریبی اپنی جماعت کے ساتھ روانہ ہوا، اور نظر سے غائب ہو گیا، آفتاب غروب ہو گیا، اور انکی تشنگی مین بھی کچھ کمی ہو گئی تھی، پھر بھی انھون نے پانی کے چند قطرے پئے، دشت پیمائی کرتے کرتے انکا گزر ایک سنگلاخ مین ہوا، جہان انہون نے ایک ضعیف العمر شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا، انکی داڑھی لانبی اور سفید تھی، بزرگ نے انھین مخاطب کر کے دریافت کیا، کہ کس چیز کی تلاش ہے، انہون نے کہا کہ مین ایک روحانی مرشد کی تلاش مین ہون، اور میرا دل کہہ رہا ہے، مجھے جنکی تلاش ہے، وہ آپ ہی ہین، بزرگ نے کہا میرے بچے، تم سامنے ایک بزرگ کا مقبرہ دیکھ رہے ہو، یہ وہ جگہ ہے، جہان دعا کا جواب ملتا ہے، وہان جاؤ اور مقبرہ کے اندر بیٹھو، نہ کھاؤ نہ پیو اور نہ استراحت کرو، بلکہ رات دن آہستہ آہستہ لا الہ الا اللہ کا ورد رکھو دیکھو، ذی روح مخلوق تمھاری جنبش لب دیکھ نہ سکے، کیونکہ اس وظیفہ کے مخصوص صفات مین ایک یہ ہے کہ ورد مین لب کو کوئی جنبش نہ ہو، جاؤ تم پر سلامتی ہو" میرے دوست کہتے تھے حسب ارشاد مین وہان گیا تو دیکھا ایک چھوٹی سی مربع عمارت ہے، جس مین ایک گنبد ہے، اور دروازہ کھلا ہوا ہے، مین اندر جاکر بیٹھ گیا اور طاق اور مخروطی شکل کی عمارت کی طرف جو قبر پر بنی ہوئی تھی اپنا رخ کر لیا،

یہ شام کا وقت تھا، مینے توحید کے یہ خموش مشاغل جس طرح میرے مرشد نے ہدایت کی تھی، شروع کر دئے مینے دیکھا کہ ایک دھندلے رنگ کی کوئی صورت میرے پہلو مین بیٹھی ہے، اور مجھے میری ریاضت عابدانہ مین مدد دے رہی ہے مینے اسے مس کرنے کے لئے اپنے ہاتھ پھیلائے، لیکن مجھے معلوم ہوا، کہ یہ کوئی مادی ذات نہین باایمہ وہ صورت وہان موجود تھی، مینے اچھی طرح دیکھا، اس نظارہ سے مجھے ترغیب ہوئی، اور مین اپنے عمل مین بلاوقفہ شبانہ روز مشغول رہا، نہ مین کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا، پھر بھی میری روحانی طاقت روز افزون تھی، تیسرے دن

مین مقبرہ کی سفید دیوارون، زمین اور ہوا مین، اور جس طرف مین نظر اوٹھا کر دیکھتا تھا لا الٰہ الا اللہ لکھا ہوا پاتا، اور جب کبھی ایک مکھی مقبرہ مین داخل ہوتی، تھی تو وہ بھی اپنے رقص پرواز سے یہی کلمہ لکھ دیتی تھی، خدا کی قسم ایسا ہوا اب میرا مقصد کامل طور سے حاصل ہو گیا مینے دیکھا کہ مجھے علم مابعد الطبیعہ حاصل ہو گیا ہے، احباب اور ارباب تعارف کے خیالات مجھے ستاتے نہ تھے لیکن ہر دوست جو فارس، ہند، عرب و ترکستان مین تھا، اور جو کچھ وہ کر رہا تھا میرے پیش نظر معلوم ہوتا تھا مجھے ایک ناقابل بیان مسرت حاصل ہوئی .... یہ حالت چند سال تک باقی رہی، لیکن آخر کار مین دنیاوی اغراض کے فریب مین مبتلا ہو گیا، مین اس ملک مین آیا ایک خطاط کی حیثیت سے میری شہرت ہوئی، اور حکومت نے مجھے ایک منصب بھی عطا کیا، اب دیکھو یہ شال ہے، یہ الماس کی بنی ہوئی چیز میرے سینہ پر ہے مین ضعیف ہو گیا اب خوف ہوتا ہے کہ مجھے نفس کشی سکے ان مصائب کی برداشت نہ ہو گی، جن سے بہت حقیقی حاصل ہو، گو مینے ارادہ کر لیا ہے، کہ مین ایک بار کوشش کرونگا"

لین کہتا ہے، اس گفتگو کے تھوڑے ہی دن کے بعد میرے دوست منصب سے برطرف کر دئے گئے، انھین طاعون ہو گیا اور اسی مین انہون نے انتقال کیا، لین نے اسکے بعد تنقید کی ہے، اور وہ کہتا ہے، کہ میرے دوست سچ مچ کچھ عرصہ تک ایک بادیہ پیما عابد کی طرح زندگی گزار رہے تھے، اور چونکہ انہون نے نفس کشی کی تکلیفین جھیلین، جسکے ساتھ جوش عقیدت کا تلازم تھا، تو بہت ممکن ہے، انکی قوت مصورہ مین بدنظمی ہو گئی ہو، اور انہون نے سچ مچ یہ عجیب و غریب مناظر دیکھے ہون، کیونکہ جب وہ بیان کر رہے تھے تو لہجہ و ادا مین ایک خاص قسم کی آرزو، اور اخلاص پایا جاتا تھا، جسے ایک کاذب عمداً انہین برت سکتا، لین ایک یورو بین تھا، جسکے لئے مادہ نوازی امر ناگزیر ہے، تخیلات کے عجائب اور مابعد الطبیعہ کی تو کھا ہین اسکے نزدیک نہ تو قابل اعتماد ہے، نہ لائق تسلیم اس نے ابو القاسم گیلانی کے تجربات کو اختلال مصورہ کا نتیجہ بتایا، ہر چند اسے اپنے دوست کی حق گوئی اور راستبازی کا اعتراف ہے، اہل مذاق واقعہ کی اہمیت سمجھ لین،

طریقت کی منزل افتتاحیہ میکڈونلڈ نے صوفی لٹریچر کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس بحث عنوان کی ایسی جامع تلخیص کی ہے، کہ موجودہ دور کے انگریز مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے بھی جنکا مذاق صوفیانہ اور مطالعہ تصوف عقیدت اور پرستش کی حد تک پہونچ گیا ہے، اپنی مایہ ناز کتاب "صوفیائے اسلام" کے باب اول مین میکڈونلڈ کی اس فاضلانہ تحریر کا اقتباس دیدیا ہے، میکڈونلڈ لکھتا ہے،

رہرو طریقت کو چاہئے کہ تعلقات دنیا ترک کر دے، اور اپنا دل ان سے خالی رکھے، اسے نہ کنبہ کا تردد ہو نہ دولت کی فکر، نہ بچون کا خیال ہو نہ گھر کا غم، یہانتک کہ علم ظاہری کی طلب، حکومت کی تمنا، اور حوصلہ مندیونکی شورش بھی مفقود ہو جائے، اسے قلب مین ایسی کیفیت پیدا کر لینی چاہئے، کہ اسکے نزدیک کسی شے کا وجود و عدم دونو یکسان معلوم ہون، اسکے بعد اسے ایک گوشہ مین بیٹھنا چاہئے، اور اپنا مذہبی عمل صرف فرائض تک محدود رکھنا چاہئے، اسوقت اسے نہ تو قرآن مجید کی تلاوت کرنی چاہئے، نہ اسکے معانی و مطالب پر غور و فکر، نہ احادیث کا مطالعہ کرنا چاہئے، نہ اس قسم کی دوسری کتابون کا، اسے جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ اللہ جل شانہ کے سوا کوئی دوسری شے اسکے دماغ مین داخل نہو، اور ایک گوشہ عزلت مین بیٹھکر مسلسل "اللہ اللہ" کا ورد رکھنا چاہئے، خیال اسی پر جمع رہے، عاقبت الامر اسپر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گی، جیسے اسکے زبان کی حرکت بند ہو گئی ہے، اور اسے معلوم ہوگا گویا یہ لفظ اسکی زبان سے ...... گیا اسے اسمین استقلال رکھنا چاہئے، یہانتک کہ کامل طور سے زبان کی حرکت مفقود ہو جائے، اسمین بھی اسے مستقل رہنا چاہئے، یہان تک کہ لفظ کی شکل، اسکے حروف

اور ہیئت قلب سے نکل جائین اور صرف ایک خیال رہجائے اسے ایسا معلوم ہونے لگے، جیسے اسکے قلب مین چسپان ہے، اور اس سے علحدہ نہین ہوسکتا، اس قدر عمل رہرو طریق کے ارادہ اور مرضی پر موقوف ہے، اس کیفیت کا قایم رکھنا، اور اغوائے شیطانیہ کو مسترد کرنا، اسکے زیر تصرف ہوتا ہے لیکن رحم ایزدی کا ایصال اسکے ارادہ یا مرضی سے بالاتر ہے، اب اسے صرف ایک امیدوارانہ انتظار رکھنا چاہئے، کہ خدا اسکے قلب مین کیا کشف کرتا ہے، جیساکہ خدانے اس طور سے انبیا اور اولیا کے ساتھ سلوک کیا ہے، اگر ایک رہرو طریقت مفصلہ بالا عمل پورا کرے تو اسے امیدوار رہنا چاہئے کہ اسکے قلب مین لمعان حقیقت کی ضیا باریان ہونگی، پہلے پہل یہ نور حقیقت نا استوار ہوتا ہے، برق کی چمک کی طرح یہ پیدا ہوکر غائب ہوجاتا ہے، گو بعض اوقات یہ قیام پذیر بھی ہوتا ہے . . . . ، اور جب یہ واپس آتا ہے، تو اسکی واپسی کبھی دیرپا ہوتی ہے کبھی گریزپا، جس طرح سے اولیاء اللہ کے عادات وخصائل مختلف ہین اسی طرح انکا حصول کمالات بھی مختلف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نکلسن نے بھی اس ضمن مین علامہ ہجویری کی کتاب "کشف المحجوب" سے مفصلہ ذیل بحث اپنی کتاب صوفیائے اسلام مین نقل کی ہے، علامہ ہجویری کہتے ہین،

طریقت صوفیہ مین جب کوئی شخص داخل ہونا چاہتا ہے، تو شیوخ اسے تین سال تک تعلیم روحانی دیا کرتے ہین، اگر وہ انکے ارشادات تربیت پر کاربند ہوتا ہے، تو بہتر، ورنہ وہ سلسلہ طریقت مین نہین داخل کرتے پہلا سال مخلوق کی خدمت مین بسر ہوتا ہے، دوسرا سال عبادت الٰہی مین، اور تیسرا سال خود اپنے جائزہ قلب مین رہرو طریق اسوقت مخلوق کی خدمت کرسکتا ہے، جب وہ خود کو ایک خادم اور تمام خلایق کو مخدوم تصور کرے، اسے بلا استثناء یہ خیال رکھنا چاہئے، کہ تمام افراد اس سے بہتر ہین، اور اسے اپنا فرض سمجھکر تمام لوگونکی یکسان خدمت کرنی چاہئے، اور وہ خدا کی عبادت اسی وقت کرسکتا ہے، جب اسکے تمام اغراض خواہ وہ موجودہ زندگی سے متعلق ہون، یا آخرت سے، مٹ جائین اور اسے چاہئے کہ خدا کی عبادت صرف خدا کیلئے کرے، چونکہ جو شخص کسی شے کیلئے خدا کی عبادت کرتا ہے، وہ خود اپنی عبادت کرتا ہے، نہ کہ خدا کی کوئی شخص اپنے قلب کا جائزہ اسی وقت لے سکتا ہے، جب اسکے خیالات مجتمع ہون، اور تمام ترددات فنا ہوجائین، اسلئے وہ اس قابل ہوجائے کہ قرب الٰہیہ مین اپنے قلب کو بے توجہی کی یورشون سے محفوظ رکھ سکے، جب مبتدی یہ صفات پیدا کرلیتا ہے، تو اسے حق ہے کہ نقال کی طرح نہین بلکہ ایک سچے صوفی کی طرح مرقع پہنے،

حضرت شبلیؒ اور جنید بغدادیؒ کا مکالمہ

"صوفیائے اسلام" مین حضرت شبلی اور جنید بغدادی کا ایک مکالمہ بھی پایا جاتا ہے حضرت شبلی، حضرت جنیدؒ کے پاس آئے، اور کہا کہ مینے سنا ہے کہ آپکے پاس علم الٰہی کی موتیان ہین، خواہ آپ مجھے عطا کیجئے یا فروخت کیجئے، حضرت جنید نے جواب دیا، کہ مین اسے فروخت نہین کرسکتا، چونکہ تمھارے پاس اسقدر متاع ہی نہین کہ قیمت ادا کرسکو اور اگر مین تمھین یونہین دیدون تو مفت کی چیز سمجھکر تم اسکی قدر نہ کروگے جاؤ میری ہی طرح اس بحر زخار مین سر کے بل شناوری کرو، یہانتک کہ تمھین صبر واستقامت کی مدت گزارنے کے بعد وہ موتی حاصل ہوجائے حضرت شبلی نے کہا تو مجھے کیا کرنا چاہئے، کہا جاؤ ایک سال تک گندھک فروخت کرو ایک سال کے اختتام پر حضرت جنیدؒ نے کہا اس تجارت نے تمھین مشہور کردیا ہے جاؤ اب درویشی اختیار کرو، اور صرف گداگری کرتے رہو، ایک سال تک حضرت شبلیؒ بغداد کی گلیون مین مارے مارے پھرتے رہے، راہگیرون سے بھیک مانگتے، لیکن انکی طرف

کوئی تحفہ ہوتا، اسکے بعد وہ اپنے مرشد حضرت جنید کے پاس آئے، وہ بول اوٹھے، اب دیکھو اہل دنیا کی نظر مین تمھاری کیا وقعت کیا ہے، تم اپنا دماغ انکی طرف متوجہ نہ کرو، اور نہ انکی باتو نکا کچھ خیال رکھو، تم چیمبر لین تھے، اور ایک عامل (گورنر) کی حیثیت سے صوبہ پر حکمرانی کی اس ملک مین جاؤ اور جن جن لوگون کے ساتھ تمنے خطا کی ہے، ان سے معافی چاہو، حضرت شبلیؒ نے چار برس تک دروازہ دروازہ جاکر سب سے معافی مانگی، صرف انھین ایک آدمی کا پتہ نہ معلوم نہ ہوسکا، مراجعت کی، تو حضرت جنید نے کہا، ابھی تک تمھارے دل مین شہرت و عزت، کا خیال ہے، جاؤ، ایک سال تک بھیک مانگو، حضرت شبلیؒ تمام دن بھیک مانگتے، اور اسے اپنے مرشد کے پاس لاتے، وہ اسے فقرا اور مساکین مین تقسیم کردیتے، اور شبلی کو دوسری صبح تک بھوکا رکھتے، جب اس طرح ایک سال گزر گیا، تو حضرت جنید بغدادی نے انہین اپنا مرید بنایا اور یہ شرط کی کہ ایک خادم کی طرح انہین مخلوق کی خدمت انجام دینی ہوگی، ایک سال کی خدمت کے بعد حضرت جنیدؒ نے ان سے پوچھا، "اب تم، خود کو کیا خیال کرتے ہو؟" شبلی نے جواب دیا "مین اب خدا کی تمام مخلوقات مین اپنے کو سب سے ذلیل سمجھتا ہون، مرشد نے کہا "اب تمھارا ایمان راسخ ہوگیا"

طریقت کے عملیات لازمہ | صاحب کتاب اللمع لکھتے ہین کہ طریقت مین سات "مقامات" ہین، توبہ، پرہیز انقطاع، افلاس، صبر، توکل، قناعت یہ تو تصوف کے زاہدانہ اور اخلاقی تعلیم کے متعلق ہین "احوال" اسی طرح کا ایک نفسیاتی سلسلہ ہے جس مین مراقبہ، قرب (الہی) عشق، خوف، امید، خواہش، رفاقت، اطمینان، تصور، اور یقین داخل ہین "مقامات" اور "احوال" مین یہ فرق ہے، کہ سابق الذکر کا حصول سعی انسانی پر موقوف ہے، اور آخر الذکر روحانی احساسات اور اخلاق ہین جن پر انسان متصرف نہین ہوسکتا انکا ورود قلب پر خدا کی طرف سے ہوتا ہے، جب انکا نزول ہوتا ہے، تو انسان انہین مسترد نہین کرسکتا، اور جب وہ جاتے ہین تو انسان انہین روک نہین سکتا، طریقت صوفیہ اسوقت ختم نہین ہوسکتی، جب تک ایک رہرو طریق ان تمام مقامات کو طے نہ کرلے، اور جب تک ہر مقام مین کامل نہو جلئے، خدا بھی اسے اس دور مین لذت "احوال" سے علی قدر مراتب مستفیض کرتا ہے، ان تمام مراحل کے طے کرلینے کے بعد صوفی، حیات شاعرہ کی اس سطح عالی پر پہونچ جاتا ہے، جسے معرفت و حقیقت سے تعبیر کرتے ہین، جہان طالب ایک عارف کی شکل مین منتقل ہوتا ہے، اور اسے محسوس ہوتا ہے، کہ عرفان، عارف اور معروف (معلوم) ایک ہی شے کی مختلف تعبیرات مجازی ہین، (باقی)

سید عبد المالک آروی

تصویر زیب النسا بیگم

جو دربار عالمگیری کی ایک بے مثل مصورہ کے قلمکا رہے اور بعد تحقیق و تنقید بسیار اس کی صحت کی توثیق ہو چکی ہے یہ تصویر تین خوشنما رنگ سے طیار کی گئی ہے اور ۱۹۲۲ء کے نگار مین شایع ہو چکی ہے قیمت معہ محصول .... (۸/)

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور نقاش و مصور فرمدار کی ایک بہترین تصویر جو حضرت نیاز کے مشہور مضمون رقاصہ کے گجراتی ترجمہ کے ساتھ کلکتہ کے مشہور گجراتی رسالہ نوجیتن مین شایع ہوئی تھی۔

قیمت (۴/)۔

"مینجر نگار"

لکھنؤ کے عہد شباب کی ایک شاعرہ

نواب بیگم حجاب

جن حضرات نے تاریخ اودھ کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ ہونگے کہ نواب شجاع الدولہ سے لیکر جانعالم واجد علی شاہ تک زمانہ کیسا رنگین و عیش کوش گزرا ہے

یوں تو برہان الملک نواب سعادت علی خان ہی کے زمانہ سے صوبہ اودھ پر سلطنت دہلی کا کوئی خاص اقتدار قایم نہ رہا تھا، لیکن شجاع الدولہ نے تو کھلم کھلا اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور وہ تمام آزادیاں جو ایک مطلق العنان فرمانروا کی طرف سے ظاہر ہوسکتی ہیں اوسکی طرف سے ظاہر ہونے لگیں۔ اس مین شک نہیں کہ شجاع الدولہ کا زمانہ بدامنی و برہمی کا زمانہ تھا اور کوئی صورت اطمینان و سکون کی ایسی ظاہر نہ ہوئی تھی کہ وہ پوری طرح داد عیش دے سکتا، لیکن اس اضطراب و بے چینی کے عالم مین بھی جب اس کو موقعہ ملا نہین چوکا اور اپنے بعد آنے والون کے لئے اس منزل کی راہ متعین کر گیا جس سے پورا لطف حاصل کرنا قدرت نے واجد علی شاہ کی قسمت مین لکھدیا تھا

بہرحال خدا معلوم سلطنت اودھ کی بنیاد کس ساعت مین ہوئی تھی کہ اس کا ایک فرمانروا بھی جذبۂ عشرت و نشاط سے معرا نظر نہین آتا اور جس وقت اسی سلسلہ مین ہم جانعالم واجد علی شاہ کے عہد پر پہونچتے ہین تو وہ تمام کہانیاں جو راجہ اندر سے منسوب کیجاتی ہین ایک تاریخی حقیقت ہو کر رہجاتی ہین

یہ مسئلہ حقایق مسلمہ سے ہے کہ فرمانروا کے ذوق و مشاغل کا اثر رعایا پر بہت پڑتا ہے، اس لئے اگر واجد علی شاہ کے عہد مین سارا لکھنؤ ایک بلدۂ شعر و موسیقی، اک شہر حسن و محبت نظر آتا تھا تو جائے حیرت نہین کیونکہ خود جانعالم کی زندگی کا کوئی لمحہ اس نشۂ جان بخش سے خالی نہ گزرتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس عہد کی شاعری بھی اس سے پوری طرح متاثر ہوئی اور اس کا معیار جلوۂ کوہ طور سے اتر کر نظارۂ لب بام تک آگیا۔ اور بجائے کیفیات حقیقت خروش کے جذبات معصیت کوش نظر آنے لگے

واجد علی شاہ نہ صرف اچھے مغنی اور بے مثل رقاص تھے بلکہ قادر الکلام شاعر بھی تھے اور اپنے جذبات و خیالات کو بغیر کسی اخفا کے نظم کرنے مین قدرت کاملہ رکھتے تھے، انھون نے اپنے واقعات شباب و سرخوشی کو نہ صرف پوری عریانی کے ساتھ نظم کیا بلکہ انکی اشاعت بھی چاہی جس کو جرأت اخلاق بھی کہہ سکتے ہین اور بے غیرتی و بے حیائی بھی۔ بہرحال اُس وقت واجد علی شاہ نے ایک ایسی عجیب و غریب فضا لکھنؤ مین پیدا کر دی تھی جسے روما کے صناعی دور سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور کوئی گھر ایسا نہ تھا جو اس احساس سے خالی رہا ہو

کہ دور شاہ شجاع ست مے دلیر بنوش

گھر گھر مجالس لطف و نشاط کا قیام، گوشہ گوشہ مین رندان بادہ کوش کا اژدہام، ہر ہر بام سے حسن دلنواز کی جلوہ فروشی

بعض اشعار اور قابل داد ہین مثلاً

مین نے تو کوئی بات نہین ایسی کہی تھی
غیرون سے بھرا تھا کہ جو وہ بندہ پہ برسا

تم سے بتلائین کیا کہ فرقت مین
صدمے دل پر گزرتے ہین کیا کیا

بُت کو خوفِ خدا حجاب نہین
ہم صنم سے بھی ڈرتے ہین کیا کیا

اے حجاب آج تو سوتا ہے وہ غافل کیسا
بخت جاگے ہین ذرا یار کو دیکھا ہوتا

دامن محبوب تک پہونچا نہ جب دست جنون
بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریبان کی طرف

مہینون ہو گئے صاحب کہانتک آزماؤ گے
گلے لگ جاؤ کیا ہر روز کا جھگڑا نکالا ہے

گل پھولے ہین اس شوخ نے مہندی جو ملی ہے
جو پور ہے اونگلی مین وہ لالہ کی کلی ہے

اس زمین کا یہ شعر خصوصیت کے ساتھ قابل تحسین ہے:۔

کچھ خوف خدا کیجئے اس طرح نہ چلئے
سو بار تو اس چال پہ تلوار چلی ہے

تذکرون مین اس کا صرف ایک یہ شعر نظر آتا ہے:۔

بنکے تصویر حجاب اس کو سراپا دیکھو
منہ سے بولو نہ کچھ آنکھون سے تماشہ دیکھو

نیاز

شہاب کی سرگزشت

جناب نیاز فتحپوری کا وہ معرکۃ الآرا افسانہ جو سیرۃ نگاری، نفسیاتی تحلیل، بلندی خیال، زورِ تحریر، ندرت بیان، نزاکت تخییل اور قوتِ انشاء کے لحاظ سے ادبِ اردو مین ایک بالکل نئی اور نادر چیز ہے! اول بار اسکا مطالعہ انسان کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے، دوسری بار اسکا مطالعہ حقیقت سے قریب کر دیتا ہے اور تیسری مرتبہ کے مطالعہ کے بعد انسان اسکے لذات مین بالکل غرق ہو جاتا ہے۔ اگر پسند نہ ہو تو مطالعہ کے بعد واپس کر دیجئے اور اپنی قیمت لے لیجئے معہ محصول ڈاک (عہ) مین ملیگا۔

"مینیجر نگار" لکھنؤ

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

اور

قبضۂ ہندوستان کی دلچسپ داستان

(بہ سلسلہ ماسبق)

ہم ہندوستان پر کس طرح حکومت کرتے ہین

مین نے اس تعلق کی نوعیت پر جو ہندوستان کو انگلینڈ کے ساتھ حاصل ہے غور کیا ہے اور یہ ظاہر کر چکا ہون کہ کیونکر بغیر معجزہ کے ایسا تعلق پیدا ہونا ممکن تھا۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہین اور اس مسئلہ پر غور کرتے ہین کہ آیا یہ تعلق اُسی طرح قائم رہیگا یا یہ کہ ہندوستان مین انگریزون کی حکومت کو ہم ایک سیاسی شعبدہ سمجھین جو اپنے زمانۂ قیام تک تو ہمارے لئے موجب حیرت ضرور ہے لیکن اسکا قیام پائدار نہین۔ سب سے بڑی دشواری ہندوستانی معاملات کے مطالعہ مین ایک طالب علم کو یہ پیش آتی ہے کہ وہ اس قدر عجیب اتنے بعید اور ایسے وسیع واقعات کے چکاچوند کردینے والے اثر سے متاثر ہوکر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہندوستان مین معمولی اسباب کی بنا پر واقعات کا رونما ہونا ممکن ہی نہین ہے، بلکہ اس خطہ مین جو کچھ ہے سراسر معجزہ ہے۔ تاریخ نویسی کا ادیبانہ انداز تحریر اس فریب کو اور مزید تقویت پہونچاتا ہے کیونکہ سلطنت ہند کے حیرت انگیز اور عجیب خط وخال کی نمائش کا شوق مورخین کو بہت زیادہ ہوتا ہے جس سے نتائج تک پہونچنا اور زیادہ دشوار ہوجاتا ہے۔

چنانچہ اسی مغالطہ کی بنا پر ہم خیال کرنے لگے ہین کہ ہندوستان پر ہمارا تسلط عام قواعد سے مستثنیٰ بالکل ایک سیاسی معجزہ ہے جس کا فخر انگریزی قوم کی دلیرانہ خصوصیات اور اسکی فطری قابلیت حکمرانی کو حاصل ہوتا ہے۔ جب تک ہمارا خیال یہ رہیگا ہم اُسکے قیام کی مدت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر رہین گے۔ جو چیز ابتدا مین معجزہ تھی یقیناً آخر تک معجزہ رہیگی۔ اگر عام اصول اس معاملہ مین معطل تھے تو کون کہہ سکتا ہے یہ تعطل کب تک باقی رہیگا۔ مین نے سلطنت کے آغاز پر متانت کیساتھ غور کرنیکی کوشش کی ہے۔ مین نے فتح ہندوستان کے مسئلہ پر بہت غور کیا ہے، اور اس مین شک نہین کہ فتح اس معنی مین ضرور حیرت انگیز تھی کہ ہمارا تجربہ ایسی کوئی بڑی نظیر پیش نہین کرتا۔ کیونکہ ایشیائی سوسائٹی کا انقلاب قدرتاً یورپ سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن اس معنی مین ہرگز حیرت انگیز نہین ہے کہ اُسکے اسباب ناقابل فہم ہین یا انکا پتہ لگانا مشکل ہے۔ اب مین دریافت کرونگا کہ ہندوستان مین ہماری سلطنت آیا اس معنی مین حیرت انگیز ہے یا نہین

اگر ہم یہ تصور کرلین کہ ہندوستان محض ایک مفتوح ملک ہے اور انگریز اُسکے فاتح ہین تو بظاہر یہ خیال صحیح معلوم ہوگا۔ مگر کون نہین جانتا کہ ایک مفتوح قوم کے جذبۂ بے اطمینانی کو دبانا کس قدر دشوار ہوتا ہے۔ اگرچہ فاتح قوم کی فوج بلحاظ تعداد وعمدگی مفتوح قوم سے بہتر ہی کیون نہ ہو لیکن نتیجہ کے لحاظ سے بارہا اس کو ناکامی ہوئی ہے اہل اسپین بڑے بہادر سپاہی تھے اور حکومت اسپین اُس وقت کی ساری

عیسائی سلطنتون سے زبردست تھی تاہم ([illegible]) مین ناکامی رہی - اس کی وجہ یہی ہے کہ جب قومیت کا جذبہ یا غیر مذہب ہونے کا احساس کسی قوم کے تمام افراد مین ساری ہو جاتا ہے اور صرف لڑنے وا[illegible] تک محدود نہین رہتا تو شجاعت اور عسکریت دونون سے کہین زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے، آئے اب ہم ہندوستان کی حالت کا اٹلی سے مقابلہ کرین جس جگہ یورپ کے نقشہ مین اٹلی واقع ہے، اُسی جگہ ایشیا کے نقشہ مین ہندوستان پایا جاتا ہے یہ بھی ہندوستان ہی کی طرح براعظم کے جنوب مین ایک جزیرہ نما ہے جس کے اوپر سر بفلک پہاڑون کا سلسلہ ہے اور نیچے مغرب سے مشرق کی جانب ایک بحر ذخار موجین لیتا ہے - حالات کے لحاظ سے یہ اور بھی ہندوستان سے مشابہ ہے کیونکہ یہ بھی صدیون تک غیر ملکی حملہ آورون کا شکار بنا رہا - ابھی زیادہ زمانہ نہین گزرا کہ اٹلی اسٹریا کے زیر حکومت تھا - اس کے باشندے اور فوجین اسٹریا سے بہت ہی کم جنگجو اور تربیت یافتہ تھین - حالانکہ آسٹریا بالکل ملحق ہے - اگرچہ اٹلی کا پلہ لڑائی مین ہمیشہ ہلکا رہتا تھا پھر بھی آج وہ آزاد ہے - اٹلی لڑائیون مین عموماً شکست ہی کھایا کرتا تھا لیکن قومیت کا جذبہ ملک کے اندر اتنا زبردست تھا اور اسکی وجہ سے غیرون کی اتنی قوی ہمدردی اُسکے ساتھ تھی کہ آخر الامر وہ کامیاب رہا اور اجنبیون نے اسکو اپنے حال پر چھوڑ دیا - ہر نقطہ نظر سے ہندوستان کا محل وقوع اُسکے لئے اٹلی سے زیادہ مفید ہے - اسکی آبادی انگلینڈ سے تقریباً ۸ گنا زیادہ ہے، وہ کرۂ زمین کے دوسرے سرے پر واقع ہے - علاوہ ازین انگلینڈ کوئی فوجی سلطنت ہونیکی مدعی نہین ہے، باوجود اس کے ہندوستان اُسکی غلامی کا جوا اپنے کندھے پر رکھے ہوے ہے - ہم وہان پر بغاوت کی کوئی خبر نہین سنتے - سلطنت ہند کے انتظام مین ہمکو دقتین پیش آتی ہین لیکن خاصکر مالی یا اقتصادی وقت جو اسٹریا کو اٹلی مین پیش آئی ہمارے سامنے نہین ہے یعنی ہمکو ایک مفتوح قوم کے جذبہ مخالف کو دبانا نہین ہے - واقعی کیا یہ ایک معجزہ نہین ہے؟! کیا اس معاملہ مین عام اصول بالکل بے اثر نہین معلوم ہوتے - یا اس سے ہم یہ سمجھین کہ یا تو ہندوستانیون کی اطاعت شعاری کی انتہا نہین ہے یا پھر انگریزون کی قابلیت حکمرانی کی -

اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستانی مین قومیت ہے یا نہین اور یہ کہ اس قومیت کو انگلینڈ نے مفتوح کر لیا ہے یا نہین -

سوال کے جزو اول کا جواب اثبات مین دینا سخت غلطی ہے، ہم یورپ کے باشندے دیکھتے ہین کہ یورپ کا نقشہ مختلف ملکون مین تقسیم ہے - ہر ملک کی ایک خاص قومیت اور ایک خاص زبان ہے - چونکہ ہم ان باتون کے خوگر ہین اسوجہ سے ایسی زبردست غلط فہمی مین مبتلا ہین - ہمارا خیال ہے کہ ہر ملک خواہ وہ یورپ کے اندر ہو یا باہر اگر اسکا کوئی نام ہے تو ضرور اپنی قومیت رکھتا ہوگا - لیکن اسی کے ساتھ ہم قومیت کا صحیح مفہوم سمجھنے اور اسکی تعریف بیان کرنیکی زحمت نہین گوارا کرتے جس طرح ہم یہ کہکر اپنی تشفی کر لیتے ہین کہ اہل انگلینڈ فرانسیسیون کی محکومی سے اور اہل فرانس جرمنون کی محکومی سے کبھی خوش نہین ہو سکتے اُسی طرح ہمارا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی انگریزون کی محکومی کو سخت ذلت محسوس کرتے ہونگے لیکن یہ داستان نہین ہے بلکہ بدیہی امر ہے کہ ہر آبادی کی ایک قومیت نہین ہوتی، انگریز اور فرانسیسی محض ایک آبادی سے عبارت نہین ہین بلکہ خاص طریقہ اور خاص قوتون سے متحد ہین - اس لئے دیکھنا چاہئے کہ وہی قوت ہندوستانی آبادی مین بھی کارفرما ہے یا نہین

پہلی قوت متحد النسل ہونا ہے جب نسلی اتحاد وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے تو لسانی اتحاد پیدا ہوتا ہے - انگریزون سے مراد وہ قوم ہے جو انگریزی زبان بولتی ہے اور فرانسیسیون سے وہ جو فرانسیسی زبان بولتی ہے - کیا ہندوستان کے باشندے بھی ایک زبان بولتے ہین؟! اسکا جواب نفی مین ہے -

جس طرح یورپ کے تمام باشندے ایک زبان نہیں بولتے اسی طرح ہندوستان کے باشندے بھی ایک زبان نہیں بولتے. علماے علم السنہ نے سنسکرت اور دیگر زبانون کے ساتھ اُسکے قریبی تعلق کے بارہ مین بہت زور تحریر دکھلایا ہے لیکن مین یہ کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ لسانی اتحاد کیلئے جو شرط سب سے مقدم ہے وہ زبانون کا قابل فہم ہونا ہے نہ کہ انکا باہمی پوشیدہ تعلق - چنانچہ اہل اٹلی اسٹریا والون کو اجنبی ہی سمجھتے تھے کیونکہ وہ جرمن زبان نہین سمجھ سکتے تھے انکو اس سے کوئی بحث نہین تھی کہ جرمن اور اطالوی زبانین انڈو یورپین زبانین ہین جس طرح یورپ کی مختلف زبانون مین قریبی تعلق ہے اُسی طرح ہندوستان کی متعدد زبانون مین بھی ہے - ہندی زبانون کو یورپ کی (Romance) زبانون سے تشبیہ دیجا سکتی ہے کیونکہ یہ زبانین ایک ہی اصل سے نکلی ہین - لیکن بنگالی مرہٹی اور گجراتی زبانون کا قریبی تعلق اُنکے بولنے والون کو ایک قوم نہین بنا سکتا - "ہندوستانی" زبان مسلمانون کی فتح کی وجہ سے پیدا ہوئی - مسلمان حملہ آورون کی فارسی زبان ہندوستانیون کی ہندی زبان سے گڈمڈ ہو کر ایک نئی زبان ہندوستانی پیدا ہو گئی - لیکن جنوب مین ہم ایسا لسانی اختلاف پاتے ہین جسکی مثال یورپ مین بھی نہین ملتی - کیونکہ وہان کی بڑی بڑی زبانین تامل تیلگو کناری انڈو - یورپین (Indo - European) زبانین نہین ہین - اور اُنکے بولنے والون کی تعداد یورپ کی اُن اقوام سے بہت زیادہ ہے جو انڈو یورپین زبانین نہین بولتی ہین

صرف یہی اس بات کی کافی وجہ ہے کہ ہندوستان کو فرانس یا انگلینڈ کی طرح نہین شمار کرنا چاہیے کیونکہ یہ دو قومیتون کے نام ہین - ہندوستان کی مثال یورپ سے دیجا سکتی ہے جسکے اندر بہت سی قومین آباد ہین اگرچہ کسی طبعی تقسیم سے ان قومیون کا ایک مشترک نام پڑ گیا ہے - یورپ کی طرح یہ بھی ایک جغرافی اصطلاح ہے لیکن کبھی اس مفہوم مین اسکا استعمال نہین ہوا ہے - یورپ کا لفظ اس معنی مین ہیروڈوٹس (Herodotus) کے زمانہ سے مستعمل ہوتا آرہا ہے لیکن ہندوستان سے جو مفہوم ہم اس وقت سمجھتے ہین بہت قدیم نہین ہے چونکہ سارا ملک کوہ ہمالیہ اور کوہ سلیمان کے سلسلون سے بقیہ ایشیا سے علیحدہ ہے اسلئے قدرتی طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک نام ہو - لیکن ہمیشہ سے یہی خیال نہین رہا ہے - چنانچہ یونانیون کا اس ملک کے متعلق بہت مبہم خیال تھا، وہ عرصہ تک یہی سمجھتے تھے کہ انڈیا سے صرف انڈس (Indus) کا صوبہ مراد ہے کیونکہ وہ اسی سے مشتق ہے - جب وہ کہتے ہین کہ سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس سے انکی مراد صوبہ پنجاب سے ہوتی ہے - کچھ زمانہ کے بعد اُنکو گنگا کے دوآبہ کے حالات معلوم ہوے لیکن دکن کے متعلق انکو کچھ علم نہ تھا - خود ہندوستانیون کو سارے ملک کے لئے ایک نام استعمال کرنا اتنا قدرتی نہین معلوم ہوتا جتنا ہمکو کیونکہ اسکے شمالی اور جنوبی حصون مین بہت نمایان فرق ہے - آرین قوم جو سنسکرت بولتی تھی اور جسنے برہمنیت کی بنیاد ڈالی خاص کر پنجاب مین وہ گنگا کی وادی مین آباد ہوی ابتدائً زیادہ جنوب کی سمت نہین پھیلی - اسلئے لفظ ہندوستان صحیح طور سے اُسی شمالی خطہ کا نام ہے - جنوب مین یعنی جزیرہ نماے ہند مین دوسری قومین آباد ہین جنکی زبان غیر آرین ہے (اگرچہ اب برہمنیت وہان بھی پھیل گئی ہے) سلطنت مغلیہ اپنے عروج کے زمانہ مین بھی اس خطہ مین زیادہ دور تک نہین پھیل سکی تھی

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کوئی سیاسی نام نہین بلکہ یورپ یا افریقہ کی طرح ایک جغرافی اصطلاح ہے اُسے کسی خاص قوم اور زبان کا ملک نہین سمجھا جاتا بلکہ بہت سی قومون اور زبانون کا - یہ ہے اساسی فرق ہندوستان اور دوسرے ممالک مین

قومیت ایک سے زیادہ عناصر سے مرکب ہوتی ہے جس کا ایک عنصر ہم خون ہونے کا احساس ہے اور دوسرا عنصر اشتراک مفاد کا احساس اور ایک سیاسی جمعیت قائم کرنیکی صلاحیت ہے۔ یہ عنصر اگرچہ ہندوستان مین کلیتہً مفقود نہین تھا لیکن کمزور ضرور تھا۔ ملک کے طول و عرض کو دیکھکر اس عنصر کا موجود ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن وہ حد فاصل جو ہندوستان کو باقی دنیا سے علیحدہ کرتی ہے اتنی مضبوط ہے کہ باوجود داخلی تقسیم کے اُسکے ایک 'کُل' ہونے کا مفہوم بہت قدیم سے چلا آرہا ہے۔ محمود غزنی سے پہلے کی جو تاریخ ہے اسمین اکثر لکھا ہے کہ فلان بادشاہ سارے ہندوستان کا مالک تھا، فلان بادشاہ کے قبضہ مین کل ہندوستان تھا، اس کے اسلامی حکومت کے دور اول مین اور سلطنت مغلیہ کے عہد مین سارے ہندوستان کا قبضہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ حالانکہ سلطنت مغلیہ کی وسعت کے متعلق بھی یہ خیال مبالغہ سے تہین چہ جائیکہ اس کے پیشتر۔ غور کرو کہ سلطنت مغلیہ کی مدت کتنی مختصر تھی، اسکی ابتدا ۱۵۲۶ء سے قبل نہین کہی جاسکتی یہ وہ سنہ ہے جب بابر نے لاہور پر قبضہ کیا۔ بالفاظ دیگر سلطنت مغلیہ کی ابتدا ہنری ہشتم کے عہد حکومت سے ہوی۔ واسکوڈی گاما نے جب ہندوستان مین قدم رکھا سلطنت مغلیہ کا وجود بھی نہین تھا۔ اور اُسکے اندر نمایان اور سریع انحطاط ۱۵۵۸ء یعنی ملکہ این کے عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ ان دونون تاریخون مین دو صدی سے بھی کم کا زمانہ ہوتا ہے پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان مین بابر کے داخل ہوتے ہی سلطنت مغلیہ نہین شروع ہو گئی۔ بلکہ اسوقت جب مغلون کے حدود سلطنت مین ترقی ہوئی ۱۵۵۹ء مین جب اکبر تخت نشین ہوا یعنی ملکہ الزبتھ کی تخت نشینی کے دوسرے سال سلطنت مغلیہ کے اندر صرف پنجاب، دہلی اور آگرہ کے صوبے تھے۔ اکبر ۱۵۷۶ء سے قبل بنگال نہین فتح کرسکا سندھ اور گجرات کے صوبے ۱۵۹۱ء اور ۱۵۹۲ء کے درمیان فتح ہوئے اسوقت البتہ اکبر کی سلطنت وسیع پیمانہ پر تھی اگر ہم بجائے ۱۵۲۶ء کے ۱۵۹۲ء کو سلطنت مغلیہ کے آغاز کی تاریخ قرار دین تو اسکی مدت ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ ہوتی ہے۔

اب پھر یہ امر قابل غور ہے کہ اس عروج کے زمانہ مین بھی سلطنت مغلیہ کے اندر ہندوستان کے تمام علاقے نہین شامل تھے، اگر ہم اسکے برعکس خیال کرتے ہین تو ہندوستان اور انڈیا (India) کے دو الگ الگ مفہوم خلط ملط ہو جاتے ہین۔ ۱۵۹۵ء مین اکبر کی سلطنت دریائے نربدا تک پہونچی تھی یعنی اس نے ابھی دکن مین قدم نہین رکھا تھا۔ اسلئے وہ ہندوستان کا شہنشاہ تھا انڈیا کا نہین اکبر نے اپنی حکومت کے آخری سالون مین دکن پر حملہ کیا، اس زمانہ سے نصف جنوبی ہند مین مغلون کی چالبازیان شروع ہوئین۔ لیکن اورنگ زیب کی مہم دکن سے قبل (۱۶۸۳ء) یہ کہنا کہ دکن فتح ہو چکا تھا کسی طرح درست نہین ہے۔ اس وقت سے البتہ ہم کہہ سکتے ہین کہ دکن سلطنت مغلیہ مین داخل تھا یعنی کل ہندوستان صحیح معنون مین ایک حکومت کے ماتحت تھا ہر چند دکن کی فتح محض برائے نام تھی کیونکہ مرہٹے برابر زور پکڑتے جارہے تھے۔

فتح دکن کے بعد سلطنت کی حیات صرف چند ساعت کی تھی، مغلون نے اس توسیع کے بدلے اپنی ساری سلطنت کی تباہی مول لی صرف ۲۴ سال کے اندر اسکا زوال نمایان ہونے لگا اور جیسا کہ میرا خیال ہے یہ تباہی سی اولوالعزمانہ مہم کا نتیجہ تھی سلطنت مغلیہ کو ہمیشہ ایک استوار بنیاد اور قومی مرکز کی ضرورت تھی، اُسکے قومی کے اضمحلال کی وجہ اسکی توسیع کی احمقانہ کوشش تھی

مختصر یہ کہ انڈیا سوائے انگریزون کے کسی کے زمانہ مین ایک حکومت کے ماتحت نہین تھا۔ اور انگریزون نے بھی یہ کام لارڈ ڈلہوزی کی گورنر جنرلی سے قبل تک، جسکو ۸۰ سال ہوئے، مکمل نہین کیا تھا۔ اسلئے کہ لارڈ موصوف ہی کے عہد مین پنجاب، اودھ اور ناگپور کے صوبے برٹش گورنمنٹ سے ملحق ہوئے

قومیت کا دوسرا امتیاز عنصر اتحاد مذہب ہے۔ یہ عنصر یقیناً ہندوستان مین کلیۃً مفقود نہین ہے برہمنیت (ہندو مذہب) سارے ہندوستان مین پھیلی ہوی ہے لیکن یہان صرف یہی ایک مذہب نہین ہے۔ ہندوستان مین ۵ کروڑ سے کم مسلمان نہین ہین، یہ تعداد حکومت ترکی کے مسلمانون سے بھی زیادہ ہے۔ کچھ سکھ مذہب کے لوگ ہین یہ مذہب ہندویت اور اسلام کی آمیزش سے پیدا ہوا ہے! تھوڑے سے عیسائی بھی آباد ہین۔ سیلون اور نیپال مین بودھ مت کے لوگ ہین لیکن برہمنیت غالب آبادی کا مذہب ہے۔ اسکی بنیاد نہایت مضبوط ہے کیونکہ متعدد بار اسکو خطرناک حملون کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ دنیا کے تبلیغی مذاہب مین بودھ مذہب کا بڑا درجہ ہے۔ یہ ہندوستان ہی مین پیدا ہوا لیکن دور دور تک پھیلا۔ ہمارے پاس اسکا ثبوت موجود ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح مین یہ مذہب ہندوستان مین بڑے عروج پر تھا اور یہ عروج ساتوین صدی عیسوی تک باقی رہا۔ لیکن برہمنیت نے اسکو مغلوب کر لیا اور آج یہ مذہب ایشیا کے باقی حصون مین بہ نسبت اس ملک کے کہین زیادہ سرسبز ہے جسنے اسکو پیدا کیا تھا۔ اسکے بعد برہمنیت کو ایک دوسرے طاقتور اور جابر مذہب سے مقابلہ کرنا پڑا جسکے آگے زردتشت نے سپر ڈالدی اور جسکے مقابل مشرق مین عیسائیت کو چند قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ مذہب اسلام تھا۔ اس موقع پر بھی برہمنیت اپنی جگہ قائم رہی اسلامی حکومت سارے ہندوستان مین پھیل گئی لیکن یہان کے باشندون کو مسلمان نہ بنا سکی

اب میرے خیال مین مذہب ہی سب سے قوی اور اہم عنصر قومیت کی تشکیل مین ہے۔ اور یہ عنصر ہندوستان مین موجود ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ ہندوستان بمقابلہ فرانس یا انگلینڈ یورپ سے زیادہ مشابہ ہے تو ہمکو فراموش نہین کرنا چاہئے کہ یورپ بلحاظ عیسائی مذہب ہونے کے اپنے اندر ہمیشہ سے ایک قسم کا اتحاد رکھتا آیا ہے۔ جو خطرہ کے وقت فوراً اور واضح طور پر رونما ہو گیا۔ چنانچہ قرون وسطی مین جب یورپ کو ایک خونخوار اور لامذہب دشمن کا خطرہ لاحق رہتا تھا اس اتحاد کا اظہار ہو جایا کرتا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ برہمنیت مین ایسے جراثیم ہین جن سے جلد یا بدیر قومیت پیدا ہو سکتی ہے شاید ایسا ہو لیکن اس صورت مین تو اس قومیت کو بہت پہلے پیدا ہو جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ اسلامی حملون کے اندر جو پیہم صدیون تک جاری رہے، ان جراثیم کی نشو و نما کے لئے کافی مواد تھا۔ اسلام کے مقابلہ مین برہمنیت کیون اپنی جگہ قائم رہی کیون متحد نہین ہوی؟ اسلئے کہ اُسنے کبھی اِسکی اہمیت نہین دکھلائی اور نہ کبھی ایسا کیا۔ برہمنیت کو ہندوستان مین فروغ ہو چکا ہے۔ سیواجی سترھوین صدی کے وسط مین پیدا ہوا۔ وہ ایک سردار تھا، اُسنے بمبئی کے عقب مین دو ایک پہاڑی قلعون پر قبضہ کر کے مرہٹہ سلطنت قائم کر لی۔ یہ ایک خالص ہندو تحریک تھی اور جون جون اسکی قوت بڑھتی گئی اسمین برہمنون کا اثر و نفوذ ترقی کرتا گیا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال سے اس جمعیت کو بڑی قوت پہونچتی گئی یہان تک کہ اٹھارھوین صدی کے وسط مین اِسنے قریب قریب سارے ہندوستان کو ڈھک لیا اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس جمعیت کے اندر وہ تخم موجود ہے جس سے ہندوستانی قومیت کا پودا اُگے گا اور برہمنیت ہندوؤن کیلئے وہ کام کریگی جو دوسرے مذاہب نے اپنے پیروؤن کیلئے کی ہے۔ لیکن یہ کچھ نہوا اور اسنے حب الوطنی کا جذبہ تک نہ پیدا کیا اس کا سبب یہ ہے کہ بوجہ جامعیت کے کمزور ہونیکے برہمنیت دراصل مذہب نہین ہے بلکہ کئی مذاہب کے درمیان ایک ضعیف سی مفاہمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُسکے اندر اجتماعی اصول کمزور ہے۔ بہرکیف مرہٹون کی تحریک مین کوئی ایسی خصوصیت نہین تھی جسکی وجہ سے ہم اسے ایک اعلیٰ اور قومی تحریک کہہ سکین۔ یہ شروع سے آخر تک غارت گری اور لوٹ مار تھی

الغرض ہندوستان مین قومیت نہین ہے اگرچہ اسکے اندر ایسے جراثیم موجود ہین جنسے ہندوستانی قومیت پیدا ہوسکتی ہے۔ یہی ہے وہ حقیقی سبب جسکے باعث ہندوستان مین ہماری سلطنت قائم ہے ورنہ انگریزی قوم کو کوئی ایسی اعلیٰ فوقیت حاصل نہین ہے۔ اگر ہندستان مین اٹلی کی طرح قومی تحریک پیدا ہوجاے تو انگریزی حکومت اسکا آنا بھی مقابلہ نہ کرسکے جتنا آسٹریا نے اٹلی مین کیا تھا۔ بلکہ فوراً اس کے سامنے فنا ہوجائے، کیونکہ انگلینڈ کے پاس، جو فوجی سلطنت بھی نہین ہے، کون ایسا سامان ہے جس سے ۲۰ کروڑ رعایا کی بغاوت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جس طرح ہمنے انکو پہلے فتح کیا تھا اُسی طرح پھر فتح کرلین گے۔ لیکن مین بیان کرچکا ہون کہ تم نے انکو فتح نہین کیا ہے۔ مین بتلا چکا ہون کہ جس فوج نے انکو مفتوح کیا اسکا ⅘ حصہ دیسی سپاہ پر مشتمل تھا۔ چونکہ ہندوستان مین قومیت نہین تھی اسلئے ہمکو کرایہ پر سپاہی وہان دستیاب ہوگئے۔ اب اگر قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہوجاے اور اگرچہ اُنکے اندر اجنبیون کو ملک سے نکال باہر کرنے کی پُرزور خواہش نہ بھی پیدا ہوجائے تو بھی تمام رعایا کے دل مین یہ خیال پیدا ہونا ناگزیر ہے کہ اپنے ملک پر حکومت کرنے مین غیرون کی امداد کرنا نہایت شرمناک ہے۔ جون ہی یہ خیال پیدا ہوا ہماری حکومت کا خاتمہ ہے۔ کیونکہ وہ فوج جو ہمکی پشت پناہ ہے ⅘ دیسی سپاہ پر مشتمل ہے تم سوچو اگر حکومت آسٹریا اٹلی پر، اطالوی فوج کی مدد سے قابض ہوتی تو اہل اٹلی کیلئے اسکو اپنے ملک سے خارج کردینا کتنا آسان ہوتا۔ اب فرض کرو کہ ہندوستان مین دیسی سپاہ کی بھرتی ناممکن ہوجائے، تو ایک ہی لمحہ مین ہندوستان پر قابض رہنے کی حقیقت کھل جائیگی۔ ہمارا قبضہ قطعی ناممکن ہوجائیگا۔ ہندوستان مین ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُسپر بغیر محنت کے قابض رہا جاسکتا ہے۔ جس طرح انگریزی قوم نے بغیر خاص کوشش کے اسکو فتح کیا اُسی طرح وہ اسپر متصرف بھی رہیگی۔ ہم اسکو برقرار رکھنے کے لئے کروڑون روپیہ اور بے شمار فوج نہین قربان کرسکتے اور نہ اسکے لئے تیار ہی ہین۔ جس وقت ہندوستان حقیقی طور سے اپنے کو مفتوح سمجھنے لگے گا، جیسا کہ ہم ابھی تک لاپروائی سے سمجھ رہے ہین، اُس وقت ہمکو معلوم ہوجائیگا کہ اسکا قبضہ مین رکھنا ممکن نہین ہے۔

الغرض نظر غور کے سامنے حیرت و اعجاز کا وہ طلسمی سراب جو اس سلطنت کے گرد نظر آتا ہے فوراً غائب ہوجاتا ہے علی الخصوص اُس وقت جب ہم یہ محسوس کرتے ہین کہ باوجودیکہ ہم غیر ملکی حکمران ہین لیکن ایسے فاتح نہین ہین جسکا انحصار اعلیٰ طاقت پر ہو اور چونکہ ہم ہندوستان کے باشندون کی مرضی کے مطابق حکومت نہین کرتے اسلئے لازماً انکی مرضی کے خلاف حکومت کرینگے۔ آزادی کی محبت کے لئے پہلی شرط سیاسی بیداری ہے جس ملک مین یہ نہین ہوگی وہان کے باشندون مین غیر ملکی حکومت کا احساس نہین ہوگا اور حکومت عرصہ تک بغیر جانفشانی و تدبر کے سرسبز رہیگی جو ملک اکثر مفتوح و مغلوب ہوتا رہا ہے اسکے اندر یہی مجہول احساس جڑ پکڑ لیتا ہے۔ بسا اوقات مستبد سے مستبد حکومتین جن کے پاس بغاوت کے مقابلہ کا کوئی ذریعہ نہین تھا صدیون تک قائم رہی ہین محض اس وجہ سے کہ انھون نے رعایا کی عادات مین دخل نہین دیا، کیونکہ رعایا طبعاً اطاعت پسند تھی۔ روس کی سولھوین صدی کی تاریخ پڑھو۔ ایک بڑی آبادی نے زار کے مظالم اور تشدد کو کیون چپ چاپ برداشت کرلیا۔ اسکا جواب بالکل سادہ ہے۔ اہل روس دو صدی تک برابر تاتاریون کے پاؤن تلے روندے جاتے رہے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی طبیعتین اطاعت مجہول کی خوگر ہوگئین

اسی طرح ہندوستان کی پوری تاریخ مین کہین احساس آزادی کا پتہ نہین چلتا۔ اہل اٹلی اپنی گزشتہ تاریخ مین جمہوریت روما کو

دیکھتے تھے۔ رنیزی (Rienzi) نے صرف لیوی (Livy) سنا سنا کر انھین بغاوت پر آمادہ کر دیا ہندوستانی لیڈر کے پاس کوی ایسی کتاب نہین جسے وہ اپنی قوم کو سُنائے۔ ہندوستان مین انگریزون کی آمد سے قبل سات سو برس تک صرف ظالم ہی نہین بلکہ غیر ملکی مستبد حکمران بادشاہت کر چکے تھے۔ البتہ ایسے ملک کے لئے تعجب انگیز بات یہ ہوگی کہ وہان اس امر کا احساس پیدا ہو جائے کہ حکومت کا قیام و انحصار رعایا پر ہے، اور حکومت پر نکتہ چینی کرتے، اُسکے استیصال کے ذرائع سوچنے یا اُسکی مخالفت مین تنظیم پیدا کرنیکی عادت پیدا ہو جاے

ہندوستان مین ہماری حکومت دو صورتون مین معجزہ کہی جاسکتی - اول تو اس صورت مین کہ ہندو اپنے ہی ہم ملکون کی حکومت کے عادی اور حکومت سے مقابلہ کرنیکے خیال سے آشنا ہوتے۔ لیکن ہندوُن مین یہ بات نہین چنانچہ وہ غیر ملکیون کی اطاعت کرتے ہین۔ تاریخ مین ہوتا آیا ہے کہ وسیع آبادیون نے ایسی حکومتون کی اطاعت قبول کر لی جنکو وہ چاہتیں تو بآسانی جڑ سے اُکھاڑ پھینکتین۔ چین آج بھی ایک تاتاری حکومت کا مطیع ہے، خود ہندوُن نے انگریزون کی آمد سے قبل مغلون کی حکومت کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ بیشک ہندوُن پر مغلون کے تسلط سے یہ بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اُن پر ہمارے غلبہ کے لئے ضروری نہین ہے کہ ہمارے اندر سیاست کی غیر فطری لیاقت ہو۔ کیونکہ مغلون کی تاریخ پڑھکر ہر شخص کو وہی بات کھٹکے گی جو حکومت انگریزی کی تاریخ مین کھٹکتی ہے۔ یعنی یہ کہ مغلون نے بھی قریب قریب بغیر ظاہری وسائل کے ہندوستان فتح کیا۔ سلطنت مغلیہ کا بانی بابر جب ہندوستان آیا تو اُسکی پشت پر کوئی زبردست قوم نہین تھی، اور نہ اسکو کسی طاقتور ریاست کی تنظیم پر بھروسہ تھا۔ وسط ایشیا مین ایک چھوٹی سی تاتاری ریاست اُسکو وراثت مین ملی لیکن وہ بھی اُزبک حملہ آورون کی نذر ہو گئی، کچھ دنون تک وہ ادھر اُدھر گھومتا رہا پھر افغانستان مین ایک چھوٹی سی ریاست پر قابض ہو گیا۔ سلطنت کا یہ ابتدائی تخم سب سے زیادہ بے حقیقت تھا۔ اس تاتاری نے کابل مین افغانون پر حکومت کرتے ہوے ایک ایسی سلطنت قائم کر لی جو تقریباً ۲ سال مین نصف ہندوستان پر پھیل گئی، اور ایک صدی مین قریب قریب کل ہندوستان پر (اگرچہ برائے نام ہی سہی) مین یہ نہین کہتا کہ وسعت و استحکام کے اعتبار سے سلطنت مغلیہ ہماری حکومت کی مقابل تھی لیکن وہ بھی ہماری ہی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ خود بخود قائم ہوی۔ کمپنی کے پاس کم از کم انگریزی روپیہ، انگریزی فوجی فنون اور ایک غیر فانی کارپوریشن تو تھی بابر اور اُسکے جانشینون کے پاس کیا تھا۔ وہ کون اسباب تھے جنکی بدولت اُنکی سلطنت معرض وجود مین آئی البتہ ہم صرف اتنا جانتے ہین کہ وسط ایشیا مین ایسی بے خانمان قومین بھری تھین جو فطرتاً کرایہ پر جنگ کرنا جانتی تھین۔ اسلئے روپیہ اور مال غنیمت کے لالچ مین وہ بآسانی والی کابل کی ملازمت مین داخل ہو گئین

دوسری صورت ہماری حکومت کے معجزہ ہونیکی یہ ہوگی کہ کل کے کل ۲۰ کروڑ ہندوُن مین تنہا ایک قوم کی طرح ایک ساتھ سوچنے کی عادت ہوتی لیکن چونکہ ایسا نہین ہے اس لئے ہماری حکومت کوئی معجزہ نہین ہے۔ ایک ایسی جماعت کو جسکے اندر اشتراک مفاد کا احساس نہو مغلوب کر لینا بالکل آسان ہے۔ کیونکہ ایسی حالت مین ایک فرد کو دوسرے کے خلاف عمل کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ مین بتا چکا ہون کہ ہندوُن کے درمیان رشتہ اتحاد کس قدر ناکافی اور کمزور ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہتے ہو کہ اس داخلی اتحاد کی عدم موجودگی نے ہماری حکومت کو کسقدر

تقویت پہونچائی تو تم صرف غدر کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ مین بتا چکا ہون کہ ہماری دیسی فوج مین معمولی سی بغاوت بھی ہماری سلطنت کے لئے نہایت مہلک ہو گی۔ اُسوقت تمھارے دل مین خیال گذرا ہو گا کہ باوجود ۱۸۵۷ء کے غدر کے ہماری سلطنت ابتک اسی طرح فروغ پر ہے۔ لیکن غور کرو مین نے ایسی بغاوت کا ذکر کیا تھا جو تحریک قومیت سے عام رعایا مین پیدا ہو کر فوج مین پھیل گئی ہو۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اس قسم کی نہین تھی، کیونکہ یہ فوج مین پیدا ہوی، قوم نے اس مین کوی حصہ نہین لیا۔ اسکے رونما ہونے کے اسباب مخصوص فوجی شکایات تھین، حکومت غیر ملکی کے خلاف جذبات قومیت کو اس سے کوی سروکار نہین تھا۔ اب مین دریافت کرتا ہون کہ یہ بغاوت رونما ہونے کے بعد کس طرح فرو کی گئی؟ مجھے اندیشہ ہے انگلینڈ مین عام خیال یہی ہے کہ انگریزون نے اپنی غیر معمولی شجاعت اور ہندوؤن پر اپنی ناقابل قیاس برتری کی بدولت اسکو کچل دیا۔ اب مین تمھارے سامنے کرنل چسنی (Col. Chesney) کی کتاب Indian Polity (دستور سلطنت ہند) سے اسی کے الفاظ مین اس واقعہ کی حقیقت پیش کرتا ہون۔ کرنل موصوف لکھتا ہے ”بے ادبی، اپنے آقا کے خلاف جذبات منافرت اور اپنی قوت پر اس حد تک یقین کرنے مین کہ وہ انگریزونکا تختہ الٹ دینگے، ہندو اور مسلمان مین کوئی فرق نہین تھا“ آگے چلکر وہ بیان کرتا ہے کہ ”خوش قسمتی سے نام نہاد احاطہ بنگال مین تمام تر باقاعدہ فوج متعین نہیں تھی۔ چار بٹالین گورکھا فوج جو اس جماعتی جذبہ سے محفوظ تھی باستثنا، ایک بٹالین خیر خواہ رہی۔ ان مین سے ایک بٹالین نے برطانیہ کی خاطر جس نمایان بہادری اور اطاعت شعاری کا اظہار کیا اسکا اعتراف اُنکے انگریزی رفیقون نے بھی کیا ہے۔ وہ دو زائد رجمنٹین بھی جو پنجاب اور ہمسایہ اضلاع سے بھرتی ہوئین ثابت قدم رہین۔ لیکن زیادہ مدد پنجاب کی بے قاعدہ فوج سے ملی۔ اگرچہ اسکا نام بے قاعدہ تھا لیکن اُسکی ترتیب، تنظیم اور تعلیم ویسی ہی با اصول اور مضبوط بنیاد پر تھی جیسی باقاعدہ فوج کی ہوتی ہے۔ اس فوج مین ۶ رجمنٹ پیدل اور ۵ رجمنٹ سوارونکی شامل تھین۔ علاوہ ازین انکے اندر ہم مقامی سکھ رجمنٹین بھی تھین جو عموماً پنجاب ہی مین متعین رہا کرتی تھین۔ یہ فوجین براہ راست اُسی صوبہ کی حکومت کے ماتحت تھین، مرکزی حکومت کے ماتحت نہین کیونکہ باقاعدہ فوج کی ڈسپلن بگاڑنے مین مرکزی حکومت کا بھی حصہ تھا۔ انھین فوجون نے اُن تھوڑے سے یورپین سپاہیون کیساتھ جو بالائی ہند مین متعین تھے پہلے پہل باغیون کا مقابلہ کیا۔ اسی اثنا مین صوبہ پنجاب کے باشندون کی ہمدردی انکے حکمرانون نے حاصل کین۔ چونکہ یہ لوگ ابھی حال مین مفتوح ہوے تھے اور اپنی فوج کے شکست ہو جانیکے باعث اپنے طبعی پیشہ سے محروم ہو گئے تھے اسلئے اُن ہندوستانی فوجون کو جو انکے ملک مین متعین تھین پسندیدہ نظرون سے نہین دیکھتے تھے، چنانچہ جب اُنسے اُنکے موروثی دشمنون کا تختہ الٹ دینے کی اپیل کی گئی تو بڑی مستعدی سے انھون نے اس اپیل کا خیر مقدم کیا۔ جس قدر آدمیون کی ضرورت ہوتی فوراً مہیا ہو جاتے اور جس قدر جلد ممکن ہوتا سامان اور قواعد سے آراستہ کرنے کے بعد مقام جنگ پر بھیج دئے جاتے۔ چنانچہ جب فوج بنگال کی دوبارہ تنظیم ہوی تو اُسکے اندر اس فوج کا بہت بڑا حصہ تھا“

تم دیکھ سکتے ہو کہ ہندوستانی قومون ہی کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا دینے کی وجہ سے بڑی حد تک بغاوت فرو ہوی۔ جب تک ایسا ممکن ہے، جب تک وہان کے باشندون مین حکومت پر، خواہ کیسی ہی حکومت کیون نہ ہو، نکتہ چینی کرنے اور اُس سے بغاوت کرنیکی عادت نہین پیدا ہو گی، ہندوستان پر انگلینڈ کی حکومت ممکن رہیگی اور اس مین کوی حیرت و استعجاب کی بات نہین ہے۔ لیکن جیسا کہ مین نے کہا ہے، اگر موجودہ صورت حالات مین تبدیلی پیدا ہو جاے، اور کسی ذریعہ سے ہندوستان کے باشندے ایک قومیت کے رشتہ مین منسلک ہو جائین اگر انکے اور ہمارے

باہمی رشتہ کو آسٹریا اور اٹلی کے تعلق سے دور کی بھی مشابہت ہو جائے، تو میرے نزدیک ہمین اپنی سلطنت سے بغیر کسی اندیشہ کے فوراً مایوس ہو جانا چاہئے۔ میرے خیال مین ہمین عالمگیر بغاوت کے خطرہ سے ڈرنا نہین چاہئے۔ بعض خوفناک رسالون مین جیسے مسٹر الیٹ کی کتاب ہے ہندوستان کی غریب رعایا کی مفلوک الحالی اور تباہی کا ہولناک نقشہ کھینچنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان کا انجام یقیناً عام بے اطمینانی کی شکل مین رونما ہوگا اور ہم وہان سے نکال باہر کر دیے جائینگے۔ آیا یہ نقشہ صحیح ہے یا نہین، اسکی تحقیق کا یہ موقع نہین ہے لیکن اگر بنظر بحث فرض کر لیا جائے کہ یہ صحیح ہے تو مجھے تاریخ مین کوئی ایسی نظیر نہین ملتی جسمین ان اسباب کی بنا پر کبھی انقلاب رونما ہوا ہو۔ مین نے بڑی بڑی آبادیون کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت ذلیل افلاس مین صدیون تک چپ چاپ پڑی رہین لیکن کبھی بغاوت نہین کی بلکہ اگر وہ اس افلاس و نکبت کو برداشت نہین کر سکتی تھین تو فنا ہو جاتین یا جون تون کر کے زندگی کے دن کاٹ دیتی۔ انکے احساس مردہ ہو جاتے، انکی خواہشات تنگدستی سے دب کر مرجاتے آبادی وہی بغاوت کر سکتی ہے جو بلند حوصلہ ہو، جسکے اندر جذبہ امید ہو جسکو اپنی طاقت کا احساس ہو اگر اس قسم کی بیداری ہندوستان مین پیدا ہوئی تو تاوقتیکہ دیسی فوج ہندوؤن کو اپنا بھائی اور انگریز افسرون کو غیر ملکی سمجھنا نہ سیکھے گی ہم اسی فوج سے اس تحریک کا گلا گھونٹ دینگے۔ برخلاف اسکے اگر ایسا احساس پیدا ہو جائے اور تمام ہندوستان اپنے کو ایک قوم سمجھنے لگے (ہمارا دور حکومت شاید تمام سابق حکومتون سے زیادہ اسکے امکان مین معین ہے)۔ تو اسوقت اسکی ضرورت نہین ہوگی کہ سارے ملک مین خوفناک بے اطمینانی کی لہر دوڑ جائے، کیونکہ اس حالت مین دیسی فوج اس جذبہ سے متاثر ہو جائیگی جس پر ہمارا بھروسہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر اگرچہ خوفناک تھا لیکن اُسکے فرو کرنے مین ہم کامیاب ہو گئے، کیونکہ بغاوت فوج کی صرف ایک حصہ تک محدود تھی، رعایا نے اسکا ساتھ نہین دیا، بلکہ الٹے ہماری امداد کی لیکن اب جب بغاوت ہوگی تو یہ صرف بغاوت نہین ہوگی بلکہ عالمگیر جذبۂ قومیت کا اعلان ہوگا، اسوقت ہماری سلطنت کی سلامتی کی تمام امیدون کا خاتمہ ہو جائیگا اور قدرتاً ہونا ہی چاہئے۔ کیونکہ درحقیقت ہم ہندوستان کے فاتح نہین ہین اور نہ بحیثیت فاتح ہم اسپر حکومت کر سکتے ہین۔ اگر ہم ایسا ارادہ کرینگے تو ہمارا کامیاب ہونا قطعی غیر یقینی ہوگا

(مترجم)

عبدالقیوم رسا

سالومی

آسکر وائلڈ کے نہایت مشہور ڈرامہ کا ترجمہ جسے جناب مجنون گورکھپوری نے اُسی قوتِ بیان اور سلاست کے ساتھ کیا ہے جو آسکر وائلڈ کے خصوصیات انشا مین داخل ہین اس مین ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے جس مین اُس ڈرامہ کی تاریخ و دیگر خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲ار

مینیجر "نگار" لکھنؤ

ازدواج مکرر

مسٹر ذکی کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب انھین بعض ذرایع سے معلوم ہوا کہ صفیہ نہ صرف تعلیم یافتہ بالکل ادیب بھی ہے ایک زمانہ سے ذکی کی شادی صرف اسی بنا پر ملتوی ہوتی آرہی تھی کہ اُن کے ذوق کے مطابق کوئی تعلیم یافتہ عورت نہ ملتی تھی، اور اس بات کا وہ عہد کر چکے تھے کہ جب تک کوئی خاتون اُن کے جذبات شعر وادب کی سمجھنے والی اور اسی زبان مین جواب دینے والی نہ ملیگی وہ عقد نہ کرینگے۔ چونکہ آدمی دولتمند اور معزز گھرانے کے تھے اس لئے پیام تو بہت جگہ سے آتے تھے لیکن کوئی ان کے مرضی کے موافق نہ ہوتا تھا، وہ نہ دولت چاہتے تھے نہ جاہ و ثروت، وہ نہ حُسن کے طلبگار تھے نہ کسی اور صفت کے۔ بلکہ وہ مختصراً یون سمجھ لیجئے کہ ایک مسلمان "سروجنی نائڈو" چاہتے تھے، جو ادب وانشا کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتی ہو، اچھا شعر کہنے اور سمجھنے کی اہل ہو مضمون نگاری فسانہ نویسی، کر سکتی ہو اور زنانہ کلب یا کسی اور نسوانی جلسہ مین صدر بننے اور برمحل تقریر کرنے کی اہلیت رکھتی ہو

ان کے بعض احباب نے سمجھایا کہ کسی کمسن نوجوان لڑکی کا یہ تمام صفات اپنے ساتھ لانا ناممکن ہے مگر ہان یہ ہو سکتا ہے کہ بعد کو رفتہ رفتہ اس مین یہ تمام باتین پیدا ہو جائین، اس لئے اگر کوئی اچھی تعلیم یافتہ لڑکی مل جائے تو شادی کر لینا چاہئے اور پھر اس کی تربیت اپنے ذوق کے لحاظ سے خود اپنا فعل ہے۔ لیکن ذکی اس پر راضی نہ ہوا۔ اس مین کلام نہین کہ وہ خود نہایت اچھا شاعر پاکیزہ ذوق ادب رکھنے والا انسان تھا، اس کی تحریر و تقریر مین ایک خاص دلکشی، ندرت اور بلندی خیال ہوتی تھی، وہ جو چیز لکھتا تھا اس مین خاص جدت ہوتی تھی اور ملک کے رسایل و جراید اس کے مضامین کے متمنی رہتے تھے، لیکن ایک حد تک وہ ضدی تھا اور اس کے قیام مین اسکی دولت و خوشحالی نے اور زیادہ مدد کی

اس لئے جب ان کے ایک بہی خواہ مولوی مظہر نے صفیہ کیساتھ ان کے عقد کا مسئلہ پیش کیا تو انھون نے وہی سوال کیا کہ تعلیمی حالت کیا ہے۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ شاعرہ وادیب بھی ہے تو انھون نے فرط مسرت مین بلا کسی تحقیق و تفتیش کے اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور شادی ہو گئی

(۲)

صفیہ ایک متوسط الحال خاندان کی لڑکی تھی لیکن وہ تمام صفات جو ایک شریف گھرانے کی لڑکی مین ہونا چاہئے اور جو ایک گھر کی ملکہ بننے کے لئے ضروری ہین اس مین موجود تھین صورت شکل کے لحاظ سے بھی بُری نہ تھی اور اُردو لکھ پڑھ لینے کی بھی کافی مشق تھی، مگر اس کو شاعرہ یا ادیب کہنا بالکل غلط تھا۔ یہ صرف مولوی مظہر کی شاعری اور مبالغہ تھا یا مصلحت اندیشی کہ انھون نے صفیہ کو اس رنگ مین پیش کر کے ذکی کو شادی کے لئے راضی کر لیا

اوّل اوّل جب ذکی نے اپنی بیوی کو دیکھا تو خاص شاعرانہ نگاہ سے اور یہ معلوم کر کے واقعی اُس کو بڑی مسرت ہوئی کہ اس کا نقشہ

اس کے خد و خال اور اس کی ادائین بہت معشوقانہ یقین اور وہ اسکو اپنی غزلگوئی کا موضوع بنا سکتا تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے ادبی ذوق اور شاعری کے امتحان کا وقت آیا تو وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ آیا جو خبر ان کو ملی تھی وہ صحیح نہ تھی یا یہ کہ شرم و حجاب بھی کھل کھیلنے کے لئے مانع ہے۔

ذکی کے نزدیک ایک عورت کے تعلیم یافتہ ہونے کا معیار صرف یہ تھا کہ وہ غالب کے دقیق سے دقیق شعر کو پورے لطف و ذوق کے ساتھ سمجھ سکے۔ درد و میر کے جذبات تغزل پر سر دھنے اور جب اس موضوع پر گفتگو کرے تو ایک ماہر و محقق کی حیثیت سے اور صفیہ کے متعلق اسے ابھی تک یقین نہ ہوا تھا کہ وہ اس معنی مین تعلیم یافتہ ہے یا نہین

شادی کے دوسرے دن صبح کو بالاخانہ پر چاء سے فارغ ہونے کے بعد ذکی جھولے کی کرسی پر آہستہ آہستہ جھول رہا تھا اور صفیہ چوکی پر تکیہ کے سہارے بیٹھی ہوئی چھالیا کتر رہی تھی اسوقت تک ذکی کو صفیہ کی گفتگو سے صرف اسقدر علم حاصل ہوا تھا کہ وہ صاف و سلیس اور اسی کے ساتھ بہت صحیح اردو بول سکتی ہے، دوسرے کی گفتگو سمجھنے، کسی نتیجہ پر پہونچنے اور جواب دینے مین بہت ذہین اور حاضر طبیعت رکھتی ہے لیکن خالص ادبیات کے متعلق اس کے معلومات یا ذوق کا کوئی علم اُسے حاصل نہ ہوا تھا

ذکی نے جھولتے جھولتے غالب کا یہ شعر گنگناتے ہوئے پڑھا

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے   بہ جلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع

اور پھر کنکھیون سے اپنی بیوی کو دیکھا کہ اُدھر کیا اثر ہوا اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت غریب صفیہ کے پیٹھ پر ایک چیونٹی چڑھ گئی اور بدن مین پھریری سی پیدا ہونے لگی۔ ذکی سمجھے کہ یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے، غالب کا شعر سنکر ریس پھر گیا تھا، قیامت آگئی صبر و ضبط بات سے جاتا رہا، جذبات پر قابو نہ رہا اور بے اختیار ہو کر کہہ اٹھا "مین سمجھتا تھا کہ تمھارا ذوق شعری یقیناً پاکیزہ ہوگا اور اس وقت تک تم نے محض شرم کی وجہ سے اس کا اظہار نہین کیا، مگر جبلی طبیعت کہین رکتی ہے، غالب کا یہ شعر سنکر آخر کار تم بیتاب ہو ہی گئین۔ اچھا ایمان سے بتاؤ کہ عرفی کے بعد ایسی پیاری قسمین کسی نے کھائی ہین جیسی غالب نے اس شعر مین پہلے جلوہ ریزی باد کی قسم کھانا اور پھر پرفشانی شمع کی جو نتیجہ ہے اول کا اور پھر سارے مصرعہ کو مشبہ بہ کی صورت مین پیش کرنا اور اول مصرعہ کو مشبہ قرار دینا حقیقت یہ ہے کہ اس انداز بیان کی مثالین اگر کہین ملتی ہین تو صرف بیدل کے ہان، بیدل کا یہ شعر تم نے سنا ہوگا لیکن مین تو تمھاری صورت مین ہر وقت اس شعر کو دیکھتا رہتا ہون۔ اُف،

تجدید ناز آشفتۂ رنگ لباس آرائیت   بے پردگی دیوانۂ طرح نقاب افگندنت

کیا دنیائے شاعری مین حسن بیان، رنگ تغزل اور توازن مصرعین کی کوئی اور ایسی مثال آسانی سے ملسکتی ہے، شاعری کا الہامی چیز ہونا اسی نوع کے کلام سے ثابت ہوتا ہے"

ذکی اپنے جوش ادبیت مین غالب، بیدل، عرفی، نظیری، حافظ وغیرہ خدا جانے کن کن شعراء کے کلام پر ہلکی ہلکی ادبی تنقید کرتا ہوا جا رہا تھا اور صفیہ جس نے اس کے کسی ایک فقرہ کا بھی صحیح مفہوم نہین سمجھا، حیران تھی کہ "میرے متعلق جو یہ حسن ظن ان کو قایم ہوگیا ہے، اسے کیونکر گوارا کرے" اور کچھ وہ اس خیال سے خایف تھی کہ مبادا حقیقت کا علم ہوجانے کے بعد احتراز کی کیفیت ان مین پیدا ہوجائے

وہ دیر تک ایک خاص کیفیت شرم و اضطراب کے ساتھ ذکی کی باتون کو سنتی رہی اور غالباً سنتی رہتی اگر وہ اسی سلسلہ مین

یہ سوال نہ کر بیٹھتا کہ

"مومن کی شاعری کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے" جب تک وہ صرف سننے پر مجبور تھی، سنتی رہی، لیکن جب اس سے سوال کیا گیا اور جواب دینا اس کے لئے ناگزیر ہو گیا تو وہ بہت گھبرائی اور اس کی سمجھ مین نہ آیا کہ وہ کیا کہے

نظم کی کتابون مین اسنے سوائے مسدس حالی اور مناجات بیوہ کے کسی اور کتاب کو نہ دیکھا تھا اور وہ مطلق اس سے بیخبر تھی کہ مومن کون کافر ہے

وہ خاموش رہی، سر کو نیچا کئے ہوئے بدستور چھالیہ کترتی رہی اور ایک ہلکے سے رعشہ بدن کے ساتھ سوچتی رہی کہ اُسے کیا جواب دینا چاہئے ذکی نے پھر اصرار کیا اور یہ اصرار زیادہ التماس محبت لئے ہوئے تھا، لیکن حسن اتفاق سے باہر سے اطلاع آئی کہ ذکی کے دوست اختر آئے ہین اور اس لئے ذکی کو اپنے سوال کا جواب حاصل کئے بغیر باہر چلا جانا پڑا۔ اور دوسرے روز صفیہ کا بھائی آکر اسے گھر لے گیا۔

(۳)

صفیہ کو گھر گئے ہوئے پانچ دن ہو گئے ہین اور ذکی حد درجہ بے چینی کے ساتھ اس کے خط کا انتظار کر رہا ہے اسنے چلتے وقت تاکید کر دی تھی کہ ایک خط روزانہ مفصل روانہ کیا جائے اور اسی طرح روز ایک خط کی توقع کیجائے، چنانچہ وہ پانچوین دن کا پانچوان خط جو یکسر شاعری و ادب سے لبریز تھا اور جس مین بقول غالب "شوق وصل" "و شکوۂ ہجران" دونون کی غیر معمولی شرح و تفسیر کی گئی تھی، لکھ کر روانہ ہی کر چکا تھا کہ دوپہر کی ڈاک سے صفیہ کا خط اُسے ملا۔ چونکہ یہ صفیہ کی بالکل پہلی تحریر تھی اس لئے اسنے نہایت بیتابی سے اُسے کھولا کہ خدا جانے کیا کیا اور کیسے کیسے بدیعہ ہائے ادب و انشاء ہات آئین گے، لیکن جب وہ اسے ختم کر چکا تو اسپر ایک ایسی کیفیت طاری تھی جس کو صرف دم گھٹنے سے تعبیر کر سکتے ہین۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

> "ایک تو مین یہان آکر بیمار ہو گئی، دوسرے اس فکر مین پڑ گئی کہ آپ کی قابلانہ تحریرون کا جواب کیا دون جبکہ مین انھین سمجھ بھی نہین سکتی حقیقتاً یہ غم میرے لئے اب ناقابل برداشت ہوتا جاتا ہے کہ آپ نے جس صفیہ کو اپنی معیت کی عزت بخشی ہے، وہ غالباً وہ صفیہ نہین ہے، جو آپ کے ذہن مین تھی۔ سب سے آخری صحبت مین جو گفتگو آپ نے مجھ سے کی تھی اور جس سوال کو چھوڑ کر آپ باہر تشریف لے گئے تھے اس کا جواب اب مین تحریر کے ذریعہ سے دینا چاہتی ہون، کیونکہ میرے لئے غالباً یہ زیادہ آسان ہے کہ آپ کو اپنے سے ابتدا ہی مین متنفر کر دون بجائے اس کے کہ آپ کو عرصہ تک فریب مین مبتلا رہنے دون۔
>
> مین نہین کہہ سکتی کہ آپ کو کس نے اور کیون یہ یقین دلا دیا کہ میری تعلیمی حالت بہت بلند ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کی سوائے چند معمولی کتابون کے مین نے آجتک کسی شاعر کا دیوان دیکھا تک نہین بلکہ سچ پوچھئے تو مین شعر موزون بھی نہین پڑھ سکتی اس کی خوبیون کا سمجھنا تو خیر بڑی بات ہے
>
> مجھکو جو تعلیم و تربیت دی گئی ہے وہ اس سے زیادہ نہین ہے کہ شوہر کی اطاعت کرون، اس کے آرام و آسایش کا خیال رکھون اور گھر کو ایسی صورت سے اس کے سامنے پیش کرون کہ جب وہ دنیا کی کشمکش سے خستہ ہو کر واپس آئے تو

اُس کی تمام کلفتین دور ہو جائین اور وہ محسوس کرے کہ اس دنیا مین اگر خلوص و صداقت کی آغوش کا سکون کہین دستیاب ہو سکتا ہے تو صرف گھر مین۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی سکھایا گیا تھا کہ شوہر کی مزاج شناسی کو مقدم سمجھون اور اُس کی پسندیدگی کا لحاظ ہر ممکن قربانی کی حد تک کرون۔ لیکن میری کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ آپ کے علمی و ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے (جو آپ کی زندگی کی تنہا مسرت معلوم ہوتا ہے) مین اپنے آپ کو اسدرجہ ناکام و پست پاتی ہون کہ آپ کو خوش رکھنے کے خیال سے میرے جسم پر رعشہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ اور مین اپنے مستقبل کی تاریکی کو دیکھ دیکھ کر کانپ اُٹھتی ہون

مجھے شعر و شاعری سے اتنا ہی بُعد ہے جتنا آپ کو اُس سے قُرب، اس لئے سخت پریشان ہون کہ مین آپ کو کس طرح خوش رکھ سکتی ہون اور آپ کو مجھ سے کیا آرام و سکون میسر آسکتا ہے۔ بہرحال نتیجہ جو کچھ ہو مین اس حقیقت کو ظاہر کئے بغیر نہین رہسکتی اور بے چینی کے ساتھ نتیجہ کی منتظر ہون کہ آپ نے میری نسبت کیا فیصلہ کیا۔ آخر مین مجھے یہ بھی ظاہر کر دینا چاہیئے کہ یہ خط نہ مین نے اپنے قلم سے لکھا ہے اور نہ مضمون میرا ہے۔ چونکہ مین بہت بدخط ہون اور اپنے جذبات کو مناسب الفاظ مین ظاہر بھی نہین کر سکتی، اس لئے عزیزہ سے لکھوا رہی ہون "

اس وقت ذکی کی حالت بالکل اُس قیدی کی سی تھی جسے صبح پھانسی دیجانے والی ہو اور رات کو اپنی آزادی و رہائی کا خواب دیکھتے ہوئے دفعتہً اُسے چونکا دیا گیا ہو

دنیا مین امید و یقین کے خلاف کسی امر کا ظہور اسقدر تکلف دہ امر ہے کہ بعض اوقات جنون و دیوانگی کی سرحد یہین سے شروع ہو جاتی ہے، اس لئے ذکی کے کرب و اضطراب کا اندازہ آسان نہین۔ وہ دیر تک سر پکڑ کر بیٹھا رہا، اور پھر اُٹھ کر سراسیمگی کے عالم مین ٹہلتا رہا۔ اس کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا، اس کے ہات پانون مین تشنج کی سی کیفیت پیدا تھی اور اگر اُس کے آنسو نہ جاری ہو جاتے تو نہین کہا جا سکتا کہ اسکے یہ جذبات کیسی خطرناک صورت اختیار کر لیتے

ذکی اپنی فطرت کے لحاظ سے نہایت نیک نفس اور سلجھا ہوا شخص تھا، اس لئے جب جوش الم کم ہوا تو وہ تمام واقعات پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہونچا کہ۔ صفیہ یقیناً بیگناہ ہے اور اگر گناہگار ہو تو بھی اس اعتراف کے بعد اس کو قابل الزام قرار دینا خود بدترین گناہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ مولوی مظفر نے کیون غلط بیانی سے کام لیا، ممکن ہے انھین خود اطلاع صحیح نہ ملی ہو یا میرا فائدہ سمجھ کر قصداً غلط بیانی سے کام لیا گیا ہو۔ بہرحال اب ان سے بھی اس کی بازپرس بیکار ہے۔ ظاہر ہے کہ صفیہ کو مین چھوڑ نہین سکتا، نہ اس لئے کہ اس مین بدنامی ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ واقعی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے قابل قدر ہے، رہی تعلیم سو ممکن ہے کہ مین اس کی کمی کو پورا کر سکون اور چند سال مین وہ اس منزل پر پہونچ جائے جہان مین اسے دیکھنا چاہتا ہون۔ عورت یون بھی قدرتاً بہت ذہین ہوتی ہے اور صفیہ تو خصوصیت کے ساتھ غیر معمولی طور پر ذکی...... لفظ ذکی پر پہونچتے ہی (کیونکہ یہی اسکا نام بھی تھا) اس کے دماغ مین دفعتہً ادبی میلان پیدا ہو گیا اور اس خیال سے کہ اگر صفیہ کا نام ہی صفیہ ذکی رکھدیا جائے تو کسقدر موزون ہوگا، اس کے چہرہ پر تبسم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور اب وہ صفیہ نہین بلکہ

صفیہ ذکی کے مستقبل اور اس کی علمی وادبی شہرت کے متعلق ایک خیالی کارگاہ قایم کرنے مین مصروف ہو گیا یہانتک کہ کامل دو گھنٹے اسی محویت مین صرف ہو گئے اور پھر دفعتہً کسی غیر معمولی تدبیر کے ذہن مین آجانے سے وہ اچھل پڑا اور انتہائی مسرت کے عالم مین اسنے فوراً صفیہ کو تار دیدیا کہ فوراً آجائے۔ مین بے چینی کے ساتھ منتظر ہون۔ (باقی)

نیاز

جنوری ۱۹۳۰ء سے

دارالاشاعت نگار سے ایک نئے رسالہ کا اجراء

اس رسالہ کا نام جن ہوگا۔ جن کے لغوی معنی ہین ہر اُس چیز کے جو حواس ظاہری سے پوشیدہ ہو، اس لئے اس رسالہ مین تمام اُن امور و واقعات سے بحث ہو گی جن کا تعلق "ماورا عالم حواس" سے ہے اور جس مین جنات ارواح خبیثہ مابعد الطبیعیات، روحانیات، وغیرہ سب شامل ہین۔ اس مین نہ صرف جنات وغیرہ کے معتبر واقعات وحکایات ہونگے، بلکہ ان پر تنقید بھی ہوگی، عالم ارواح و روحانیت کے متعلق جدید ترین تحقیقات ومعلومات بھی ہونگی، اور "حیات بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک جو کچھ دریافت ہو چکا ہے اور ہوتا جارہا ہے وہ بھی درج ہوتا رہیگا

اس رسالہ کی تقطیع ۲۰×۲۶ہوگی اور ۲۵ سطر کے مسطر پر دو کالم مین باریک خط سے لکھا جائیگا۔ حجم فی الحال دو جزو ہوگا جسمین ۸ صفحات مستقلاً علمی تحقیقات کے لئے وقف ہونگے۔ اس رسالے مین ارواح خبیثہ اور جنات کے جتنے واقعات درج ہونگے ان سب کو مصور پیش کیا جائیگا جس کے لئے ایک آرٹسٹ کی خدمات مستقلاً حاصل کی گئی ہین۔ رسالہ کی سالانہ قیمت ؏ تجویز کی گئی ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے چندہ قبول نہ کیا جائیگا۔

جن حضرات کو اس دنیا سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم اپنا پتہ بھیجدین تاکہ بعد اشاعت رسالہ کا نمونہ اُن کے پاس روانہ کیا جائے اس کے ساتھ یہ استدعا بھی ہے کہ اگر کسی شخص پر اُس کی زندگی مین کوئی واقعہ ایسا گزرا ہے جسے وہ جنات یا بھوت پریت سے منسوب کرتا ہے تو براہ کرم اس کو قلمبند کرکے روانہ کردے زبان وتحریر کی پرواہ نہ کیجائے یہان اس کو درست کر لیا جائے گا اور واقعہ کے مطابق تصاویر طیار کرلی جائینگی۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ صرف اپنا تجربہ ومشاہدہ پیش کیا جائے، دوسرون سے نقل کی ہوئی روایت نہ ہو۔

پہلا پرچہ جنوری ۱۹۳۰ء کے نگار کے ساتھ ہی ساتھ شایع ہو جائے گا

منیجر نگار۔ لکھنؤ

مرقع چغتائی

یعنی

دیوان غالب کا مصور اڈیشن

غالب کی موجودہ شہرت، روا ہو یا ناروا اس سے بحث نہین لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے اُردو شاعرون مین جو آوازۂ قبول غالب کو نصیب ہوا، وہ اس وقت تک کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہین ہو سکا مشرق مین عام طور پر کسی کتاب یا تصنیف کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ صرف اس سے کیا جاتا ہے کہ کتنے اڈیشن اس کے شایع ہوئے اور کتنی زبانون پر اس کا نام جاری ہے۔ مغرب مین بھی اعتراف کی یہ صورت جزو مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن چونکہ وہان دولت ہے، علم ہے، ذوق ہے اور فنون کی ترقی اوج کمال کو پہونچ گئی ہے، اس لئے وہان تنقید کی نوعیتین بھی متعدد ہین اور اعتراف کمال کی صورتین بھی مختلف۔ ہم اگر کسی چیز کو پسند کرتے ہین تو اس کے حصول کی خواہش بھی قوۃ سے فعل مین نہین آتی اور وہان اس کے حاصل کرنے کے لئے بازار مسابقت قایم ہو جاتا ہے، جس مین دولت و زر کی نمایش سے زیادہ تفوق ذوق کا مظاہرہ مقصود ہوتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ اسی جگہ ختم نہین ہو جاتا بلکہ اس جوش کو متلاطم رکھنے کے لئے اور اپنے احساسِ اعتراف کو نمایان کرنے کے لئے ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے شمول سے اس مین نئی نئی روح پھونکنا چاہتا ہے، یہانتک کہ اگر آپ لے ہر شخص کے نقطۂ خیال سے جدا جدا طور پر دیکھین گے تو اس کے مختلف مناظر آپ کے سامنے آئین گے اور ہر منظر آپ کو بجائے خود اک مستقل چیز معلوم ہوگا، گویا وہ فانوس خیال ہے کہ ایک ہی شمع کو آغوش مین لئے ہوئے اپنی گردش سے ہر پہلو کو ایک جدید نقش کی صورت مین پیش کر رہا ہے۔ یہان کسی شاعر کے حُسنِ کلام کا انتہائی اعتراف وہ ہے جسے ہم زیادہ سے زیادہ "سر دُھننا" سے تعبیر کرتے ہین لیکن وہان کے اعتراف کی حقیر ترین صورت بھی "ہلچل مچا دینے" سے کم نہین ہوتی۔ ہم اگر کسی اچھے شاعر کے دیوان کو دیکھین گے تو زیادہ سے زیادہ دس پانچ مرتبہ سر کو جنبش دے کر رہجائین گے لیکن وہان ایک شعر مختلف مجلسون مین پہونچکر مختلف صورتین اختیار کر لیتا ہے۔ مغنی اُسے گاتا ہے، رقاص اس پر رقص کرتا ہے، نقاش اسے نقش کرتا ہے اور اس طرح گویا ایک داستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ٹکڑے کو ایک مستقل داستان بنا دیتے ہین، مثلاً خیام ہی کو لے لیجئے ہر چند حافظ نے یہ شعر اپنے ہی لئے کہا تھا کہ

> زشعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند ۔ سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

مگر وہ صادق آتا ہے خیام اور اہل مغرب پر جہان خیام کا اعتراف "می گویند و می رقصند" کے منزل سے بھی آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے قصہ مختصر یون سمجھئے کہ ہمارا اعتراف حسن و کمال صرف "آہ" ہے اور اُنکا "واہ" اور یہ فرق قدرتی طور پر اک متشائم (Pessimistic) اور متفاول (Optimistic) قوم کے درمیان ہونا چاہئے۔

اس مین شک نہین کہ مغربی تعلیم اور مغربی اصول تنقید کے سلسلہ مین اس کمی کا احساس یہان کے لوگون مین بھی پیدا ہو گیا ہے، لیکن کوئی علمی تحریک ابھی تک اس نوع کے پیدا نہین ہوئی تھی جسے ہم بجا طور پر نشاۃ نہضت (Renaissance) کہہ سکین۔ اس لئے چغتائی کا یہ فخر کبھی ان سے نہین چھینا جا سکتا کہ سب سے پہلے انھون نے اس طرف توجہ کی اور "تقدیم اقدام" کا امتیاز انھون نے اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ غالب کے دیوان کو ایک فلسفی نے دیکھا اور اسے الہامی کتاب کہدیا ہر چند یہ طفلانہ جسارت سے زیادہ حیثیت نہین رکھتا تاہم ایک فلسفہ طراز کی جانب سے اعتراف کی صورت یہی ہو سکتی تھی، ایک صوفی نے اس کا مطالعہ کیا اور "مطالب غالب" کو فصوص الحکم کا ہم پایہ قرار دیا۔ یقیناً یہ "تقلید تنگ ظرفی منصور" سے زیادہ اہمیت نہین رکھتا، تاہم ایک متصوف اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے اخیر مین پنجاب کا ایک نوجوان نقاش اُٹھا اور اس نے حقیقی معنی مین صرف اپنے موقلم سے "سخنہائے گفتنی" کی تشریح اور اپنی اعتراف خلوص کو بعض خطوط و نقوش کی صورت مین پیش کیا۔ اور اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ اگر شاعری اور نقاشی کا امتزاج صحیح کسی وقت ہو جائے تو پھر اس کی داد دینا حیرت و سکوت کے بس مین بھی نہین۔ تو کیا چغتائی کا مرقع واقعی یہی حیثیت رکھتا ہے، کیا حقیقتاً اُسے چغتائی کی "انتہائی تمنا" اور "اور بلند ترین آرزو" کہہ سکتے ہین؟ اس صحبت مین مجھے اسی موضوع پر لکھنا ہے اور اسی حقیقت سے بحث کرنا

مرقع چغتائی یعنی دیوان غالب کا مصور اڈیشن یون تو تنقید کے لئے مختلف حیثیتین رکھتا ہے لیکن گفتگو مین آسانی پیدا کرنے کے لئے مین صرف دو تقسیمین کرونگا، ایک متعلق بہ دیوان اور دوسری متعلق بہ نقاشی۔ امر اول کی نسبت مجھے زیادہ نہین کہنا سوائے اس کے کہ نفیس کاغذ پر نفیس جدول و حاشیہ کے ساتھ بلاک سے چھاپا گیا ہے جس کو طباعت کی پاکیزہ ترین صورت کہا جاتا ہے۔ اخیر مین نسخہ حمیدیہ کو دیکھ کر بعض ان اشعار کو بھی بصورت انتخاب درج کر دیا ہے جو عام مطبوعہ دیوانون مین نہین پائے جاتے، میری رائے مین جناب چغتائی اس امر مین اپنے حدود سے آگے بڑھ گئے ہین اور اس کو مین اگر غیر شاعرانہ نہین تو "غیر نقاشانہ" جسارت سے ضرور کہونگا۔ ابتدا مین ڈاکٹر جیمس کزنس اور ڈاکٹر اقبال کی مختصر تمہید و تقریب انگریزی زبان مین ہے۔ ڈاکٹر کزنس نے جو نقاشی کے ماہر سمجھے جاتے ہین مختصراً چغتائی کے فن نقاشی پر روشنی ڈالی ہے اور ڈاکٹر اقبال نے ایک خاص دلکش انداز مین مجملاً شاعری و نقش کے ارتباط کو فلسفیانہ مگر سرسری انداز سے سمجھانے کی سعی فرمائی ہے۔

خود جناب چغتائی نے بھی "سخنہائے گفتنی" کے عنوان سے چند خیالات پریشان (astray thoughts) (جو کہین کہین "بکھرے ہوئے موتیون" سے کم دلچسپ نہین ہین) ظاہر کئے ہین اور اس سلسلہ مین انھون نے مشرق و مغرب کی نقاشی کا جو فرق بتایا ہے وہ بہ لحاظ انشا و خیال بہت لطیف اور بہ لحاظ حقیقت نہایت مستحکم ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس ایثری (Ethereal) قسم کی انشا کو "اُتروانا"، "کیچڑ" اور "لتھڑا رہنے والے" وغیرہ ایسے الفاظ سے پاک رکھا جاتا۔ جمیل ترین چہرہ مین حقیر ترین بدنمائی بھی اچھی نہین معلوم ہوتی

اب مین اس حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہون جسے صحیح معنی مین مرقع چغتائی کہا جا سکتا ہے اس مجموعہ مین کل ۴۴ تصویرین ہین ۱۲ تصویرین چار رنگون کی ہین باقی ایک رنگ کی ہین یا صرف پنسل کا خاکہ یا محض رنگین خطوط کا مجموعہ

قبل اس کے کہ مین ان نقوش پر تنقید کرون مختصراً یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہون کہ چغتائی کس اسکول کے نقاش ہین چغتائی ایرانی اسکول کے نقاش ہین اور ایرانی اسکول کی وہ خصوصیت جسے "رومانیت نقش" کہنا بہ نسبت "نقش رومانیت" کے زیادہ موزون ہے

ان کے موقلم مین تکمیل کے ساتھ ودیعت ہوئی ہے۔ ایک نقش کے عناصر بالعموم تین ہوا کرتے ہین، ایک وہ جسے بیک گرونڈ (فضائے بعید) کہتے ہین دوسرے تصویر کا اندرونی ماحولی منظر اور تیسرے خود اصل تصویر جسے مرکز یا نقطۂ انشعاب کہنا زیادہ مناسب ہے پھر چونکہ نقش بجائے خود کوئی چیز نہین ہے بلکہ وہ محض نقاش کے دماغ کی اپج ہے، یا یون سمجھئے کہ ایک خیال ہے جو خطوط کی صورت مین نمایان ہوتا ہے اس لئے ایک تصویر کی خوبی یہی ہے کہ نقش کا کوئی خط، کوئی نقطہ "واقعیت" خیال کے حدود سے آگے نہ بڑھے "واقعیت خیال" سے مراد وہ فطری حدود ہین جن کی پابندی سے آزادترین تخیل کو بھی چارہ نہین۔ یعنی جس طرح شعر مین حد سے زیادہ مبالغہ شعر کے لطف کو غارت کردیتا ہے اسی طرح نقش مین "واقعیت خیال" سے آگے بڑھجانا ذوق کے منافی ہے۔ پھر جس طرح شعر کے مختلف اقسام ہین اسی طرح نقش کی بھی کئی قسمین ہوسکتی ہین، اور اس لحاظ سے ان کے محاسن کی جانچ ہوتی ہے۔ اگر شعر مین آپ محاکات، معاملہ بندی، اور جذبات نگاری وغیرہ وغیرہ کی علٰحدہ علٰحدہ تعیین کرسکتے ہین تو نقش مین بھی اسیطرح واقعیت، تخیل، رومان، اور احساسات کی جستجو ہوسکتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ نقش کا تعلق بہ نسبت شعر کے مادیت سے بہت کم ہے اور وہ نقاش جو صرف تنوع مادیت کے اظہار کو اپنا مقصود قرار دیتا ہے اُسے بجائے نقاش کے صناع کہنا زیادہ موزون ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک حسین عورت کا نقش طیار کرنا ہے تو وہ نقاش جو مادہ کی حدود سے آگے نہین بڑھتا، صرف یہی کریگا کہ اسکی صورت، اس کے خدوخال، اس کے اعضا اور اس کے ملبوس کو نہایت جمیل و دلکش بنادیگا، لیکن وہ نقاش جو رومان و احساس کا پرستار ہے، اس کی صورت سے زیادہ اعتنا نہ کریگا بلکہ خود اپنے جذبات و تاثرات کو تصویر کے ماحول اور فضا مین اس طرح بھردیگا کہ حسن سے زیادہ عشق نمودار ہوجائے اور مرکز انشعاب نے ماحول مین اس طرح تحلیل ہوجائے کہ حسن و عشق کے حدود کی تعیین و تمیز آسان نہ رہے۔ اگر نقاش صرف نقال ہے تو وہ مادیت سے آگے نہین بڑھتا اور اگر خلاق ہے تو مادہ سے گزر کر روحانیت مین پہونچ جاتا ہے، وہ مادہ کا پابند رہتا ہے اور یہ مادہ کو اپنا پابند بنالیتا ہے، اس کا موقلم منظر کے تغیر کے ساتھ ساتھ جنبش کرتا ہے اور یہان منظر مصوّر اس کے جنبش قلم کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتا ہے، وہ محکوم و تابع ہوکر کاغذ مین رنگ بھرتا ہے اور یہ اک حاکمانہ اقتدار کے ساتھ اپنے رنگ مین موضوع (Theme) کو رنگ دیتا ہے۔ اس لئے آپ دیکھین گے کہ جتنے نقاش جمالیاتی تخلیق کے لئے مشہور ہوئے ہین ان کے ہان ایک نقش کے عناصر سہ گانہ مین سے مرکز انشعاب یا موضوع نقش اسقدر نمایان نہین ہوتا جتنا ماحول اور فضا ایسے نقوش مین دیکھنے والے کی نگاہ، مرکز سے فضا کی طرف نہین جاتی بلکہ فضا سے مرکز کی طرف آتی ہے۔ چغتائی کی نقاشی بھی چونکہ زیادہ تر روحانی یا احساسی قسم کی ہے اس لئے وہ لوگ جو حقیقت سے ناواقف ہین ان کی تصویر کے مرکزی حصہ مین نقص محسوس کرتے ہین اور وہ اس حقیقت سے بیگانہ ہین کہ وہ تمثیل (Symbol) سے ہیولیٰ (chaos) نہین پیدا کرتا بلکہ ہیولیٰ سے تمثیل کو نمایان کرتا ہے۔

لوگ کہتے ہین کہ چغتائی کی تصویرون کی آنکھ، ناک، اونگلیان بدنما، خلاف اصل، اور مضحک ہوتی ہین، لیکن یہ وہی لوگ ہین جو چغتائی کے نقش کی اصل رُوح سے واقف نہین اور جن کی پسندیدگی مادی نقاشی سے آگے نہین بڑھتی

چغتائی نے غالب کے جن اشعار یا مصرعون کو نقش کیا ہے وہ یہ ہین:-

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

چونکہ غالب کے اس شعر سے دیوان شروع ہوتا ہے اس لئے چغتائی نے بھی اس سے ابتدا کی ہے، چغتائی کا یہ نقش بالکل کارچوبی (Japanese) قسم کا ہے اور اس لئے فضا کے لحاظ سے بالکل سادہ اور ماحول کی حیثیت سے معمولی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یون کہئے کہ جیسا شعر غالب کا ہے ویسا ہی اس کا نقش ہے۔ نہ شعر سے کسی خاص لطیف جذبہ مین تحریک پیدا ہوتی ہے اور نہ تصویر مین کوئی پاکیزگی پائی جاتی ہے

(۲)۔ اس کے بعد　　"مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے"　　کا نقش ہے۔ افسوس ہے کہ یہ مصرعہ بھی مادی حدود سے آگے خیال کی رہبری نہین کرتا اس لئے چغتائی کو بھی زیادہ گنجائش نہ تھی، تاہم وہ مصرعہ کے پہلے ٹکڑے کو کسی حد تک اور دوسرے ٹکڑے کو بڑی حد تک نمایاں کر سکے ہیں، لیکن دونوں مین امتزاج کامل نہین ہے۔ مطرب (مطربہ؟) ساز لئے ہوئے ہی لیکن اس سے فارغ نغمہ کا مفہوم صرف اسکے ہاتھون اور انگلیون سے پیدا کیا گیا ہے جس سے تالی اور چٹکی بجانے کا رنگ پوری طرح تصویر سے نمایان ہو گیا ہے۔ دوسرے ٹکڑے کو صرف فضا کے اثر سے ظاہر کیا گیا ہے اور نسبتاً زیادہ تکمیل کے ساتھ

(۳)　　ہان مہ نو سنین ہم اس کا نام　　جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس کا نقش نئی چیز نہین بلکہ اس سے قبل ہلال عید کے عنوان سے پنجاب کے بعض رسایل مین شایع ہو چکا ہے اس تصویر کو اس شعر کا نقش قرار دینا میرے نزدیک بالکل ذوق کے خلاف ہے۔ جہانتک ہلال عید کا تعلق ہے یہ تصویر یقیناً اچھی ہے لیکن اس شعر سے متعلق کرنے کے بعد اس کی تمام خوبیان زایل ہو جاتی ہین۔ چاند کو دیکھ کر ایک ضعیفہ بیٹھی ہوئی ہات اٹھائے دعا مانگ رہی ہے، ایک چھوٹا بچہ اس کی گردن مین ہات ڈالے ہوئے چاند کو دیکھ رہا ہے اور خود بھی اس معانقہ کی حالت مین تقلیداً ہات دعا کے لئے کھول دیتا ہے پیچھے ایک نوجوان دوشیزہ انتہائی معصومیت کے ساتھ دعا مانگ رہی ہے افق کے شفقی روشنی مین ہلال نظر آ رہا ہے اور دور مسجد کے گنبد و مینار بھی نمایان ہین تصویر بہ حیثیت مجموعی اس تمام معصومیت و تقدس کو لئے ہوئے ہے جو ہلال عید کے دیکھنے کے بعد ایک مسلمان گھرانے کے افراد مین پیدا ہو سکتی ہے لیکن غالب کے شعر سے اسے کوئی لگاؤ نہین ہے

(۴)　　غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ مین جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ شعر نقاشی کا اچھا موضوع ہو سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ چغتائی نے اس خیال کو بغیر کسی فضائے بعید کے پیدا کئے ہوئے نہایت خوبی سے "منقوش" کیا ہے۔ اس تصویر مین اگر ایک طرف غالب کا تکلم بالنفس (Soliloquy) ظاہر ہے تو دوسری طرف مصرعہ ثانی کو بھی پوری قوت کے ساتھ نمایان کیا گیا ہے اور مین کہہ سکتا ہون کہ اس شعر کا کوئی لفظ ایسا نہین ہے جس سے چغتائی نے کام نہ لیا ہو یا تصویر سے پیدا نہ کیا گیا ہو

ایک مرد ضعیف (جو یقیناً غالب ہے) طاق مین رکھے ہوئے چراغ کے پاس ایک خاص انداز حسرت و اندوہ سے کھڑا ہوا دیکھ رہا ہے اور چراغ کا تیل جو ٹپک ٹپک کر دیوار کو داغدار بنا چکا ہے اب بھی نہایت ہی ہلکا سا شعلہ قایم کئے ہوئے ہے منظر کی تاریکی بتا رہی ہے کہ ابھی

سحر قریب نہیں ہے اور اس طرح نقش کو دیکھ کر "غم ہستی" "جز مرگ" "علاج" اور جلتی ہے سحر ہونے تک" سب کا سماں انفرادی اور مجموعی دونون طور پر بیک وقت سامنے آجاتا ہے اور یہ نقاش کی معمولی کامیابی نہیں ہے

(۵) سب کہاں کچھ لالہ و گل مین نمایاں ہوگئیں خاک مین کیا صورتین ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

اس نقش کا تعلق بیشک فضائے بعید سے ہے اور اس مین کلام نہیں کہ چغتائی نے شعر کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے جو فضا پیدا کی ہے وہ بہت مناسب ہے، لیکن اس نقش مین ایک غیر ضروری جز شامل کرکے اس کے اثر کی قوت کو ضعیف کر دیا ہے۔ لالہ و گل کے پاس کسی انسانی ہستی کو دکھانے کی ضرورت نہ تھی، اگر وہ اس تصویر کے دو حصے کرکے ایک مین ایک مصرعہ کو اور دوسرے مین دوسرے مصرعہ کو بغیر کسی جاندار چیز کے شمول کے ظاہر کر دیتے تو اس تصویر کی رمزی (Symbolic) قوت بہت زیادہ ہو جاتی

(۶) چاہے ہے پھر کسی کو مقابل مین آرزو سرمہ سے تیز دشنۂ مژگان کئے ہوئے

نہ غالب کا یہ شعر درخورِ نقش ہونے کا اہل تھا اور نہ چغتائی اس مین کامیاب ہوئے ہین۔ یہ نقش، صنعت کے حدود مین آگیا ہے اور بجائے نقاش کے کسی صناع کے دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے

(۷) با وجود یک جہان ہنگامہ پیدائی نہین ہین چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

چغتائی نے ہر چند اس شعر کو صرف یک رنگ خطوط مین نقش کیا ہے، لیکن مین نہین سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ تکمیل کے ساتھ یہ شعر منقوش ہو سکتا ہے۔ غالب نے پہلے مصرعہ کا جیسا زبردست ثبوت دوسرے مصرعہ مین دیا ہے وہ نہایت ہی بلند و عمیق نقاشی کا مقتضی تھا اور واقعہ یہ ہے کہ چغتائی نے پوری داد اس خیال کی دی ہے۔ چراغ کے دھوین کے پیچ و تاب سے "شبستانِ دلِ پروانہ" قایم کرنا اور پھر اس مین پروانون کی سوختگی و برشتگی کے ساتھ ان کی "نیمۂ داغ و نیمہ خاکستر" حالت کو، چراغان کی صورت سے دکھانا، ایسی زبردست تخلیق فنی ہے کہ مشکل سے دوسری نظیر اس کی مل سکتی ہے

(۸) وہ فراق اور وہ وصال کہان وہ شب و روز و ماہ و سال کہان

مین حیران ہون کہ چغتائی نے اس شعر کا انتخاب کیون کیا۔ اگر یہ تصویر اُن کی پہلی تصویرون مین سے ہے اور محض مرقع مین داخل کرنے کے لئے غالب کے کسی موزون شعر کی جستجو ہوئی تھی تو کوئی دوسرا شعر تلاش کرتے۔ تصویر بُری نہین ہے لیکن اس شعر نے اس کو بہت گرا دیا ہے

(۹) نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہین انتظار ساغر کھینچ

اس نقش مین سوائے اس کے کہ ایک خاتون کی حالت منتظرہ دکھا دی ہے اور کوئی غایر جذبہ ایسا پیدا نہین ہوتا جو غالب کے اس شعر کے مطابق ہو سکے

(۱۰) رَو مین ہے رخشِ عمر کہان دیکھئے تھمے نے ہات باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب مین

یہ نقش بھی منجملہ اُن چند نقوش کے ہے جن پر چغتائی کیا دنیا کے بہتر سے بہتر نقاش کو ناز ہو سکتا ہے۔ غالب نے دوسرے مصرعہ سے

پہلے مصرعہ کے مفہوم کو جسقدر وسیع مستحکم کردیا ہے، وہ نقش کے لئے بھی ویسی ہی عمیق و بالغ نگاہ چاہتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جو جلال (Sublimity) اس نقش میں پیدا کیا گیا ہے وہ اپنے مرکز، فضا اور ماحول کے لحاظ سے خیال کو اُس لانہایت (Infinity) تک لیجاتا ہے جو مشکل ہی سے غالب کے شعر سے سامنے آسکتا ہے۔ چغتائی کا یہ نقش ایک ایسا زائیدۂ خیال ہے کہ اگر اسے اُن کے عہد نقاشی کا سرمایۂ حیات قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا

(۱۱) - اس کے بعد ایک غیر متعلق تصویر "ملکۂ صحرا" کے عنوان سے دی گئی ہے، جو رنگین خطوط کے دوایر، زوایا اور انحنا خطوط کا ایک پاکیزہ مجموعہ ہے۔ صحرا میں جس کی فضائے بعید مشرقی وضع کی گنبد دار عمارتوں سے ہلکے طور پر آباد نظر آتی ہے، ایک خاتون خاص انداز سے سہمی ہوئی بیٹھی ہے اس کی پشت پر ایک نہایت ہی حسین اونٹ گردن اُٹھائے کسی دور کی چیز کو دیکھ رہا ہے، محمل کی آرایش اور حریری زیبایش اس کو ملکۂ صحرا ثابت کرنے میں پوری طرح مدد دے رہے ہیں۔ تصویر صحراے نجد کی شہرۂ آفاق داستان لیلے ومجنون کو پوری تازگی کے ساتھ سامنے لے آتی ہے۔ اگر خاتون کا بائیں ہاتھ (جو ضرورت سے زیادہ سکڑا ہوا معلوم ہوتا ہے) بڑھا کر محمل کے پردہ تک لیجایا جاتا اور اس لحاظ سے اس کی انداز نشست میں تغیر کردیا جاتا، تو یہ تصویر بہت زیادہ رومانی ہوجاتی

(۱۲) ساقی بجلوہ، دشمن ایمان و آگہی

یہ مصرعہ نقش کے لئے انتخاب کے قابل نہ تھا اور اس لئے نقش میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے چونکہ چغتائی صرف احساسی نقاش ہیں اس لئے وہ مادی قسم کی تصاویر میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے

(۱۳) آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

میرے نزدیک چغتائی کا یہ نقش ان کے بدترین نقوش میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اور اس قدر سطحی طور پر اس کی تکمیل کی گئی ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے انھوں نے مرقع میں اسے کیوں شامل کیا۔ اس میں ناکام رہنے کا وہی سبب ہے جو ابھی عرض کیا گیا

(۱۴) قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

غالب کا یہ شعر بہت مشکل سے نقش پذیر ہوسکتا تھا، لیکن چغتائی اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ اس شعر کے چار ٹکڑے ہیں قطرہ میں دجلہ۔ جزو میں کل۔ کھیل لڑکوں کا۔ دیدۂ بینا۔ اور یہ چاروں حصے نہایت تکمیل کے ساتھ دکھائے ہیں بچہ بُلبلے بنا بنا کے اڑا رہا ہے، اس کے ارد گرد کچھ کھلونے پڑے ہوئے ہیں، ماں سامنے آنکھیں بند کئے ہوئے دیدۂ بینا کی تصویر بنی ہوئی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس تصویر کی فضا، ماحول اور مرکز سب اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں اور سب کا امتزاج بھی ایک عجیب متاملانہ کیفیت پیدا کردیتا ہے جو اصل روح ہے اس شعر کی

(۱۵) شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

اس شعر کو بھی پوری تکمیل کے ساتھ نقش کیا گیا ہے "بجھتی ہوئی شمع" اور "میرے بعد" ان دونوں خیال کو ملا کر قبر سے ظاہر کرنا نہایت ہی مکمل تعبیر ہے۔ اسی طرح شعلۂ عشق کے سیہ پوش ہونیکے لئے سوگوار بیوہ کو قبر کے پائیں متالم حالت میں دو زانو دکھانا

اور پھر تمام فضا مین ایک حزین والم آگین تاریکی پیدا کر کے اس خیال کو اور زیادہ گہرا کر دینا، اسقدر عمیق خیال ہے کہ شاید ہی اس مین کوئی اور اضافہ ہو سکے

(۱۶) نہ گل نغمہ ہون نہ پردۂ ساز — مین ہون اپنی شکست کی آواز
ہے جہان فکر گنبد نہائے نقش روئے یار — ماہتاب ہالہ پیرا گردۂ تصویر ہے

دونون نقش بہت معمولی ہین اور کوئی قابل ذکر لمس مو قلم کا ان مین نہین پایا جاتا

(۱۷) دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

اچھا نقش ہے اور شعر کی تمام کیفیات کا حامل ہے۔ ایک مرد ضعیف چند بچون سے مخاطب ہے۔ ایک طرف بچون کا تمام لاعبانہ کیفیات کے ساتھ گردنین اُٹھا اُٹھا کر پیر مرد کو دیکھنا اور دوسری طرف پیری و اضمحلال کے تمام آثار و علائم کے ساتھ خمیدہ کمر لئے ہوئے بچون سے گفتگو کرنا خاص اثر پیدا کرتا ہے، اس تصویر کی بیک گرونڈ اور رنگ کے انتخاب مین نہایت ماہرانہ ذوق سے کام کیا گیا ہے اور انھین دونون نے اس نقش مین جان ڈالی ہے

(۱۸) دیکھو اے ساکنان خطۂ پاک — اس کو کہتے ہین عالم آرائی
کہ زمین ہو گئی ہے سر تا سر — روکش سطح چرخ مینائی

اس نقش مین بھی کوئی قابل التفات بات نہین پائی جاتی

(۱۹) داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

چغتائی کا یہ نقش بھی غیر فانی ہے اور اسقدر زبردست رمزی (Symbolic) تصویر ہے کہ اس کی خوبی الفاظ سے ادا نہین ہو سکتی

(۲۰) جوش قدح سے بزم چراغان کئے ہوئے — (۲۱) بلبل کے کاروبار پہ ہین خندہ ہائے گل
(۲۲) چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا
(۲۳) گو ہات مین جنبش نہین آنکھون مین تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سہ رنگی تصویرون مین قابل ذکر نہین

(۲۴) مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس — زلف سیاہ رخ پہ پریشان کئے ہوئے
(۲۵) سا یک ذرہ نہین فیض چمن سے بیکار — سایۂ لالۂ بیداغ سویدائے بہار

یک رنگی تصویرون مین معمولی چیزین ہین اور قابل ذکر نہین

(۲۶) یک نظر بیش نہین فرصت ہستی غافل — گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
(۲۷) گلفشانیہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

یک رنگی تصاویر مین یہ دونون نہایت دلکش چیزین ہین۔ پہلے مین رقص شرر کی تعبیر اور دوسری تصویر مین خاک پر لالکاری کا رمز (Symbol) بہت عجیب و غریب ہے

غیر متعلق یک رنگی تصویرون مین (Soliloquy) (تکلم بالنفس) بھی نہایت ہی مکمل نقش ہے

اس مرقع کی ابتدا مین ایک صفحہ پر "الاعمال بالنیات" بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چغتائی اپنے ان نقوش پر "باز پرس محشر" سے خایف ہین اور "دفع دخل" کے طور پر پہلے ہی سے اس "حدیث" کو اپنا وکیل بنا کر پیش کئے دیتے ہین - اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو چغتائی کے نقوش مین کہین کہین خامی و لغزش کا پایا جانا بے وجہ نہین اور جب تک وہ اس کو نیایش و عبادت سمجھکر اختیار نہ کرینگے کبھی کمال کی حد تک نہین پہونچ سکتے۔ یہ ہے نتیجہ اُس تربیت کا جو ہمیشہ مذہب کو فنون لطیفہ کا دشمن بناتی ہے اور ایک فطری نقاش کو بھی اپنے فریب مین مبتلا کرکے "صراط مستقیم" سے ہٹا دیتی ہے

مین اپنی تفصیلی رائے مرقع چغتائی کے متعلق ظاہر کر چکا اور اس مین شک نہین کہ بہ حیثیت مجموعی وہ بہت قابل قدر چیز ہے، لیکن اسی سلسلہ مین مجھے اس حقیقت کے اظہار سے باز نہ رہنا چاہئے کہ چغتائی اگر چاہتے تو موضوع نقش کے لئے ان سے بہتر اشعار غالب کے ان کو ملسکتے تھے اور مین ان کو مخلصانہ مشورہ دونگا کہ آیندہ وہ اس مسئلہ کو نظر انداز نہ کرین۔ مثالاً مین چند اشعار غالب کے ایسے پیش کرتا ہون جو چغتائی کے مخصوص ذوق نقاشی کے لئے بہت موزون ہو سکتے ہین

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہین تصور جانان کئے ہوئے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کرین کوہ طور کی

ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز
تو وہ نہین کہ تجھ کو تماشہ کرے کوئی

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ہان کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہین کہ ہے، نہین ہے

ہر قدم دوری منزل ہے نمایان مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیابان مجھ سے

آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

جبکہ تجھ بن نہین کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ
تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

الغرض اس قسم کے بہت سے اشعار ملسکتے ہین جن کو خارجی و ذہنی (Subjective, objective) یا مادی و روحانی دونون قسم کی نقاشی کا موضوع زیادہ تکمیل و وضاحت کے ساتھ بنایا جا سکتا ہے مین نے جس اڈیشن کو دیکھ کر یہ تنقید کی ہے وہ سستی قیمت کا ہے، پہلا اڈیشن ایک سو دس روپیہ کی قیمت کا بھی مین نے دیکھا ہے اور ان دونون مین کوئی زیادہ فرق نہین پایا جاتا۔

اخیر مین مجھے یہ بھی کہنا چاہئے کہ باوجود اس اہتمام کے بھی کہین کہین کتابت کی غلطیان باقی رہگئی ہین اگر ممکن ہو تو آیندہ اس نقص کو بھی دور کر دینا چاہئے۔

نیاز

مومن وکلام مومن

تمہید جس طرح شہرت "دلیل کمال نہین، اسی طرح "گمنامی" نقص کا ثبوت نہیں بن سکتی شہرت کے کئی اسباب ہوتے ہین

۱- طالب شہرت ایسے ذرایع اور تدابیر اختیار کرے کہ وہ مشہور ہوجاتا ہے حقیقت موئد شہرت ہو یا نہ ہو جیسا کہ آجکل عام طور پر ہو رہا ہے۔

۲- "حلقۂ شہرت" کے نزدیک وجہ شہرت فضل وکمال نہ ہو بلکہ روایات اور پروپگنڈا ہون، اس کے افراد مین نقد وتنقید کی صلاحیت نہ ہو۔ انہین کے لئے "العوام کالانعام" کا حکم ہے

۳- کسی کی شہرت یا گمنامی کسی خاص خیال اور غرض کے تحت مین ہو

۴- فضل وکمال کی بنیاد پر "شہرت" ہو، یہ اسوقت ممکن ہے جب "حلقۂ شہرت" مین فرق اور امتیاز جانچنے کا مادہ ہو

یہ جس طرح آج مفقود ہے، زمانہ سابق مین بھی کمیاب تھا فرق صرف اسقدر ہے کہ آج بیشتر وہ لوگ مشہور ہین جو پہلی اور دوسری دفعہ مین آتے ہین، پہلے اہل فضل وکمال بھی مشہور ہوتے تھے لیکن کم ایک زمانہ ایسا بھی ماننا پڑیگا جو صرف اہل فضل وکمال کا موئد تھا۔ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شہرت اور گمنامی کی بنیاد اگر حقیقت پر نہ ہو تو اس کا وزن کہانتک قابل ذکر ہے؟ مبصرین اور عقلا کے نزدیک اسکی کچھ حقیقت نہین

اس مین شبہہ نہین کہ ۲ و ۳ صورتون نے بہترین فضل وکمال کا گلا گھونٹ کر ان لوگون کو روشناس کیا ہے جنکی چمک باکے ذرون سے نہیں ایسے مواقع کے لئے کہا گیا ہے (All that glitters is not gold) ہر چمکنے والی چیز سونا نہین ہوتی جب کبھی قوم یا کسی ملک مین خیرہ نظری کی یہ صورت رونما ہوجائے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا، چاندی، اور جواہرات سے تعبیر ہو تو سمجھنا چاہیے کہ اس کے دن اچھے نہین زمانے نے جن لوگون کو باوجود "فضل وکمال" ابھرنے نہ دیا ان مین حکیم مومن خان "مومن" بھی ہین حکیم مومن خان کو علوم وفنون کے ساتھ شاعری مین جس درجہ کمال تھا اسی قدر وہ محروم شہرت تھے اسباب گمنامی پر تذکرہ نویسون اور نقادون نے جسقدر تحقیق کی ہے بیشتر ناتمام اور تشنہ رہگئی ہے اسوقت تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

جس طرح "آفتاب بہت دنون تک بادل مین نہین رہتا اسی طرح "کمال" پردے مین رہنے کی تاب نہین لاتا ملک مین ایسی ہستیان بھی پیدا ہوگئین جو غالب اور ذوق کے نقارخانۂ شہرت مین مومن کے کمال کے لئے آواز طوطی بنگئیں۔

عرصہ سے مجھ کو خیال تھا کہ مومن کے کمال کو روشناس کرنا اُردو شاعری پر بہت بڑا احسان ہے، مجھ کو اپنے اس خیال کی تائید حسرت موہانی سے ہوی کہ دنیائے شاعری مین "مومن" آفتاب تھے مین نے نواب عمادالملک مرحوم کی فرمایش اور محترم جناب مولوی

محمد عثمان صاحب فاروق وکیل کی تائید اور اصرار سے انتخاب کلام مومن کی شرح رسالہ العلم مین لکھنا شروع کی اس کے بعد بحیان مین افسوس ہے کہ تکملہ سے پہلے دونون رسالے بند ہوگئے اس اثنا مین "مومن" کے موئدین کی تعداد ملک مین بڑھتی گئی یہانتک کہ نیاز فتحپوری نے اپنے رسالہ نگار اور مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ اُردو مین مومن کی شاعری پر مبسوط مضامین لکھوائے، ان دونون رسالون مین اکثر غیر مشہور واقعات اور ضروری مواد یکجا ہوگئے، نیاز صاحب کے رسالے مین دادِ تحقیق یقیناً "زیادہ دیگئی - مومن کا کلام ابتک جو محروم شہرت رہا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مومن اور اکثر شعرا کی طرح علام وفنون سے بے بہرہ نتھے بلکہ اہل فضل وکمال شعرا مین ان کا درجہ اکثر سے بلند ہے انھون نے شاعری کی جامہ مین علوم وفنون، کو اس طرح بھر دیا کہ دیکھنے اور سمجھنے والے چیستان سمجھنے لگے مثلاً کہین نجوم ہے، کہین جفر، کہین ریاضی ہے کہین فلسفہ، معانی وبیان کے اکثر مسائل کا ان کی غزلین مرقع ہین اس طرح کہ اگر ان کے اشعار ترتیب کے ساتھ یکجا کئے جائین تو یہ تمام مسائل مسلسل منضبط نظر آئین، معانی وبیان کے اعتبار سے ان کے کلام مین جو جواہر ہین ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے اور "مومن" کے فضل وکمال اور اعجاز شاعری کو تسلیم کیجئے

تفصیل وتشریح

مثلاً کہتے ہین؟

۱- ہر جا ہے تیرا جلوہ لیکن دیکھا تو کہین نظر نہ آیا
تو واحد وبے نظیر وہمتا تو حاکم وخالقِ برایا
تجھ کو بھی نہ کہہ سکین ترا مثل یان تک نقش دوئی مٹایا

پہلے دو شعر علم معانی کے مسئلہ "اسناد حقیقی عقلی" کے حامل ہین، اسناد حقیقی عقلی کی چار قسمین ہوتی ہین ان مین سے ایک وہ ہے جو واقعہ اور اعتقاد دونون کے مطابق ہو، اوصاف مذکورہ پر اسلامی نقطۂ خیال سے اعتقاد بھی ہے اور انکی حقیقت بھی ہے تیسرے شعر مین علم کلام کا مسلم مسئلہ بیان کیا ہے کہ خدا کا مثل نہین "قل ہو اللہ" کی اس آیت کی طرف تلمیح ہے وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ (اس کا کوئی مثل نہین)، اس مسئلہ خشک کو غزل کی رنگینی مین بیان کرنا "مومن" کا کمال ہے

اسکو بھی سمجھ لینا چاہئے، کہ مومن کٹر مسلمان تھے

۲- مسندالیہ کی تعریف علمیت کے ساتھ اس طرح کہ اظہار تعظیم کے لئے نظر ہو

تری غلامی کی دولت سے خاک پائے ہلال سفیدۂ رخ فغفور چین وقیصر روس

یہ شعر نعت مین ہے، انصاف کیجئے نعت کا یہ مضمون آقائے دوعالم کے غلام کی شان کہان پہونچاتا ہے

۳- اظہار علمیت سے علم کا کنایہ اصلی معنی کی طرف بھی ہوتا ہے:-

آج ہوتا کمال تو کہتا اب تخلص مرا ہے نقصانی

کمال شاعر ایرانی کا تخلص ہے یہان اصلی معنی مین استعمال ہوا

گر ترے کوچہ سے دی کعبہ کو نسبت کیا گناہ
مومن آخر تھے کبھی اے بندۂ اسلام ہم

اس قسم کی رعایت "مومن" کے اکثر مقطعون مین ہے

تیسرا شعر دیکھئے۔

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دین
مومن نہ ہون جو ربط رکھین بدعتی سے ہم

اکثر جگہ مومن نے ایک ایک شعر مین مختلف اور متعدد مسائل بیان کئے ہین، معانی دبیان بھی، فلسفہ وکلام بھی، لفظی رعایت بھی معنوی خوبی بھی پھر لطف یہ کہ روانی اور تغزل کو ہاتھ سے جانے نہین دیا

۴۔ کبھی علم کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ سامع کے دل مین رحم آجائے۔

کہ ترے صدقے مری جان مومن
جانِ مومن ترے قربان مومن

دوسرا شعر ہے۔

مومن زار کہ تھا گرم بیان
سوزش سینہ سے تھا شعلہ فشان

۵۔ مسند الیہ کی تعریف موصول بنا کر ہو اس کے ایک قسم مین اشارہ ہوتا ہے کہ فلان خبر ایسی ہوگی۔

وہ جو ہم مین تم مین قرار تھا تمھین یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمھین یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۶۔ مسند الیہ نکرہ ہوتا ہے اور تنکیر سے تجدید مقصود ہوتی ہے۔

کوئی کہتا ہے حاشا ہے یہ گرمی غب خالص کی
اسی جانسوز شعلے نے دھوان دل کا اُڑایا ہے

کوئی کہتا ہے ترکیب اور غالب خلط بلغم ہے
رطوبت گر نہین تو کیون پسینے مین نہایا ہے

پہلے شعر مین بیان مسئلہ کے ساتھ الفاظ کی نشست اور معنوی تناسب کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیا ہے، دوسرے شعر مین طب کا معرکۃ الآرا مسئلہ بیان کرکے تشریح مزاج انسانی بھی کی ہے

۷۔ مسند الیہ موصوف ہوتا ہے اور صفت اس کی توضیح کرتی ہے۔

اُڑتے ہی رنگ رخ مرا نظرون سے تھا نہان
اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

مرغ کی صفت پر شکستہ اس لئے ذکر کی ہے کہ بیان پرواز مین ندرت ہو۔

۸۔ مسند الیہ کے عطف سے حصر پیدا ہوتا ہے، کوئی دوسرا تیسرا سمجھا نہین جاتا۔

عشق کے دیکھے ہین ہم نے عالم
عشق جانے ہمین اور عشق کو ہم

۹۔ معطوف اور معطوف علیہ مین التزام ہوتا ہے۔

بعد یک چندے گر خدا چاہے
مین ہون اور تیرے در کی دربانی

۱۰- مسند الیہ کے عطف سے تعجب اور حیرت کا اظہار ہوتا ہے ۔

مومن اور عشق بتان اے پیر و مرشد خیر ہے ۔ یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

دوسرا شعر دیکھیے ۔

در بتخانہ و عشق بتان اور آپ اے مومن ۔ یہ حضرت آگئی اکبارہ کیا طبعِ مقدس مین

۱۱- مسند الیہ پر اس لئے عطف کیا جاتا ہے کہ مخاطب راہِ خطا سے صواب کی طرف پھیر اجاے ۔

قابلِ زرک تھی خوے ستم آرا نہ کہ مین ۔ لائقِ سہو تھی یہ رنجش بیجا نہ کہ مین

۱۲- متکلم شک مین ہوتا ہے اس وجہ سے عطف کیا جاتا ہے کہ مخاطب کو شک ہو جائے ۔

نکتہ سنجون سے جی مین ہے پوچھون ۔ کہ مین شہری ہون یا بیابانی

۱۳- صنعتِ التفات مین تکلم سے خطاب کی طرف التفات عام طور پر اور شعرا نے بھی استعمال کیا ہے لیکن مومن کا رنگ بالکل جداگانہ ہے، یہ صنعت قرآن پاک مین بہت ہے ۔

رکھے مجھکو جیسا مین اس کو عزیز ۔ نہ معشوق و عاشق مین ہووے تمیز

نہین اب چپ کہ مومن دعا ہو چکی ۔ بہت زاری و التجا ہو چکی

مثنوی کے اشعار ہین

۱۴- خطاب سے غیبت کی طرف التفات -

مومن اب ختم کر دعا پہ سخن ۔ تا کجا لافہاے طولانی

۱۵- ایک غزل مین خطاب، تکلم، غیبت اور تکلم دونون ۔

غیر کو سینہ کہے سے سیم بر دکھلا دیا ۔ تمنے کیا کچھ کس کو آتنی بات پر دکھلا دیا

زرد منہ دکھلا دیا غم کا اثر دکھلا دیا ۔ آج ہم نے اس کو اپنا زور و زر دکھلا دیا

صبح سے تعریف ہے صبر و سکونِ غیر کی ۔ کس نے شب مجھکو تڑپتے بیش در دکھلا دیا

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر ۔ جو ندیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

پہلے شعر مین خطاب دوسرے تیسرے مین تکلم ہے چوتھے مین تکلم اور غیبت دونون

۱۶- اضمار قبل ذکر کبھی ناپسندیدگی اور کراہیت کی بنیاد پر ہوتا ہے:۔

وہ ہے خالی تو یہ خالی یہ بھرے تو وہ بھرے ۔ کاسۂ عمر عدو حلقۂ آغوش ہوا

۱۷- تقیید مسند فعلی باشرط، کبھی تجاہل عارفانہ کے ساتھ ہوتی ہے ۔

نچوڑ ینگے ہم اپنا دامنِ تر ۔ جہنم مین ہے اے واعظ اگر آگ

۱۸- مخاطب کے اعتقاد کے مطابق کلام کیا جاتا ہے

گردیتی ہون اس مین دم مین تجھکو ہو تیغِ علی کی مار مجھکو +

مومن کی مثنوی کا شعر ہے

۱۹- ماضی وحال کے ساتھ اگر مسند فعلی کی تقیید شرط کے ساتھ ہو تو اس سے یقین مراد ہوتا ہے

جب سے گئے وہ ادھر نہین یاد کیا پوچھی نہین کچھ خبر نہین یاد کیا

۲۰- نکتۂ بدیعی کی وجہ سے شرط کے بعد جزا مین صیغۂ ماضی استعمال کیا جاتا ہے۔

بالطبع گر کرم ہو تو مفلس بھی ہے کریم ہوتا ہے سائے کو شجر بے ثمر سے فیض

۲۱- ذکر شرط سے تفاول منظور ہوتا ہے ؎

ہو حق وفا ادا قضا نے چاہا کعبے کا سفر بخت رسانے چاہا ہے ترک علاج ان بتوں کا مومن دیکھو جا ہین گے گر خدا نے چاہا

ایک مسلمان کو ہر دم انشاءاللہ کہنا چاہئے، مومن نے اس مسئلہ کا بھی ذکر کر دیا ہے

۲۲- مقام تعظیم مین مسند کا صرف ؎

اللہ رے تیری بے نیازی یعقوب کو مدتون رُلایا

۲۳- تنکیر مسند مین مقصود بالتمثیل سائل ہوتا ہے مگر سائل کا حصر مسند الیہ پر منظور نہین ہوتا اور نہ سائل کا تعین مقصود ہوتا اسکی صورت یہ ہوتی ہے ؎

کب تلک چشم سے خون ہو جاری کب تلک درد کرے دلداری

۲۴- کبھی تفخیم کا فائدہ ہوتا ہے ؎

سچ ہے کہ یہ ایک بیوفا ہین جتنے ہین حسین بری بلا ہین

۲۵- تقدیم مسند اہمیت کی وجہ سے ؎

بیٹھین نہ اسے یہ کھول کر بال روو ین نہ یہ منہ پہ دھر کے رومال

۲۶- کبھی اس لئے تقدیم ہوتی ہے کہ بُرائی کے اظہار مین عجلت ہو

کوئی اس دور مین جیے کیونکر ملک الموت ہے ہر ایک بشر

۲۷- متعلقات فعل مین مفعول کی شان کا اہتمام اس طرح مدنظر ہوتا ہے

تجھ کو بھی نہ کہہ سکین ترا مثل یان تک نقش دوئی مٹایا

یہ شعر ایک جگہ اور دوسری خصوصیات کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے

۲۸- موصوف پر صفت کا قصد ؎

مفتری فتنہ بلا ہے وہ نہ ہین　　لائق جور و جفا ہے وہ نہ ہین

۲۹- قصر کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ اس سے اعتقاد باطل ہو جائے تو

نہ وہ رازق ہے مگر قاسم رزقِ مقسوم　　نہ وہ خالق ہے مگر ہے اثر باعث خلق

اس صفت مین انکار سے اقرار کا ثبوت ہوتا ہے

۳۰- قصر کے لئے الفاظ معین ہین ان مین ایک "تنہا" بھی ہے

تھا مین اس گھات مین کہ گر اک آن　　ملے تنہا وہ راحت دل و جان

بیان انشا

۳۱- انشا مین ایک چیز تمنا ہوتی ہے تمنا چاہے ممکن الحصول شے کی ہو یا محال عقلی کی:-

کاش ہوتے چشم نرگس دیدۂ بادام ہم　　گر پہونچتے وان تو اس پردہ نشین کو دیکھتے

۳۲- استفہام کے لئے الفاظ "کیون" "کس لئے" بھی آتے ہین

یہ کیون؟ کس واسطے؟ ہم ایسے تیرے ہوگئے بس مین　　کہون گر غیر سے مت مل تو کہوے طعن سے رک کر

۳۳- استفہام سے تعین زمانہ اس طرح ہوتا ہے۔

اپنے مرنے کی آرزو کب تک　　عمر رفتہ کی جستجو کب تک

۳۴- استفہام سے تعریف و تحسین مطلوب ہوتی ہے ؎　　کیا تن تہ خاک اللہ اللہ　　کیا صورت پاک اللہ اللہ

۳۵- استفہام سے تفصیل مطلوب ہوتی ہے ؎　　کیا کرون اللہ سب ہین بے اثر　　ورد کیا نالہ کیا فریاد کیا

۳۶- استفہام سے حسرت و افسوس مراد ہوتا ہے ؎

ہزارون سال ہوے سیکڑون برس گزرے　　کہان وہ ربط بتان اب کہ اس کو تو مومن

۳۷- صیغہ امر دعا کے لئے ؎

لبون پر دم بلا ہے جوش خون شوق شہادت کا　　خدایا لشکر اسلام تک پہونچا کہ آ پہونچا

۳۸- فصل و وصل کے سلسلے مین معطوف اور معطوف علیہ کی صورت

چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا　　نالہ اک دم مین اڑا دے دھوین

۳۹- کمال اتصال ہو ؎

کہا مین کیا کرون مرضی خدا کی　　کہا اس بت سے، جب، مرتا ہے مومن

۴۰- جملہ حالیہ مین ایک جملہ مین ثبوت اور دوسرے مین تجدد مقصود

اور سوے دشت بھاگتے ہین کچھ ابھی سے ہم　　کب گل کھلے گا دیکھئے ہے فصل گل سے دور

ایجاز و اطناب

۴۱۔ مساوات ؎ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

۴۲۔ تطویل ؎ نہ جاؤنگا کبھی جنت مین مین نہ جاؤنگا | اگر نہوے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

۴۳۔ اطناب بہ شکل اعتراض تہدید کے لئے ؎

ہم نکالین گے سُن اے موج ہوا بل تیرا | اس کی زلفون کے اگر بال پریشان ہونگے

علم بیان

۴۴۔ مشبہ اور مشبہ بہ حسی جس کا تعلق حس سامعہ سے ہے

دمِ مصاف ترے دشمنون کے لشکر مین | صدائے نوحہ و شیون ہے شورِ غلغل کوس

۴۵۔ مشبہ اور مشبہ بہ حس ذائقہ کے متعلق ؎

جھوٹی شراب اپنی مجھے مرتے دم تو دے | یہ آب تلخ شربت قند و نبات ہے

۴۶۔ مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی

بات کرنے مین رقیبون سے ابھی ٹوٹ گیا | دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیمان ہوگا

۴۷۔ مشبہ عقلی اور مشبہ بہ حسی

رنگینی بزم کا بندھا دھیان | جون بوے گل اُڑ گئے سب اوسان

۴۸۔ وجہ شبہ واحد حسی ؎ بادہ کش ایسی تلخ کام کہ ہے | کفِ مارِ سیہ مئے احمر

۴۹۔ مشبہ اور مشبہ بہ عقلی ؎ رکھے مجھ کو جیسا ہی اسکو عزیز | نہ معشوق و عاشق مین ہو ے تمیز

دوسرا شعر عیش وطن اندوہِ غریبان | دستِ جنون سے چاک گریبان

۵۰۔ وجہ شبہ متعدد ؎ بار انداز ہوا روزِ سفید | نکلی وہ گھر سے کہ نکلا خورشید

۵۱۔ غرض تشبیہ اک داغ سیاہ خال سا تھا | یہ لطفِ فغان شعلہ زا تھا

۵۲۔ غرض تشبیہ سے لاغری مقصود ہے۔ | یہ حالتِ قامتِ خمیدہ | جیسے شجرِ خزان رسیدہ

۵۳۔ شبیہ سے غرض ہجو نفس اجل تصویر د باتھی | صورتِ فتنہ شکل بلا تھی

بات مین وہ آواز مسلسل | صور کا جیسے نفخہٴ اول

۵۴۔ تشبیہ سے مشبہ بہ کی شان ظاہر کیجاتی ہے اسکو اظہار مطلوب کہتے ہین

صورت وہی عظمت وہی گردش وہی گیتی | حیران ہے کہ یہ چرخ ہے یا آبلہ اپنا

۵۵۔ حرف تشبیہ "جون" سے مشبہ اور مشبہ بہ ایک دوسرے کے عین سمجھے جاتے ہین

گاہ آوازِ خوش سنا دینا　جون سحر گاہ مسکرا دینا

۵۶- تشبیہ قریب　لبریز بہار صد جنون تھا　ہر سنگ وہان کا بے ستون تھا

۵۷- تشبیہ مفصل　دُرد شراب وسختی قاتل　تلخ سخن مانند ہلاہل

۵۸- تشبیہ مجمل　داغ اس کے زبس مثال گل تھے　تھے ہاتھ کہان نہالِ گل تھے

۵۹- وجہ شبہ پوشیدہ　ہے رگِ خواب سے غفلت محسوس　ہو گئی طرزِ تجاہل کا بوس

۶۰- صرف وصفِ مشبہ مذکور ہو۔　تھی پشت خمیدہ یا کمان تھی　تھا تیر کہ آہ خونچکان تھی

۶۱- تشبیہ کفایہ　ابر رحمت تبِ عذاب الیم　سایہ نادر احتراق جحیم

استعارہ

۶۲- استعارہ غیر متعارف　دشمن مومن رہے ہے بت سدا　مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

۶۳- وجہ جامع

در نایاب تو کیا خاک سے بھی منہ نہ بھرے　جس کے در پر مین کردن لو لوے شاداب نثار

۶۴- طرفین (استعار اور مستعار لہ کا حسی ہونا　ہے مجھے بھی خیال طوف حرم　خضر رہ گر ہو فضل رحمانی

۶۵- مستعار لہ اور مستعار منہ حسی

اے غارتِ جان و جانِ مومن　اے آفت خان ومانِ مومن

۶۶- شبہ فعل مین استعارہ

خندہ زن کس کا ہوا زخم درون　شدتِ گریہ مرِ نہان کیون ہے

۶۷- کبھی مضاف الیہ سے استعارے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے　ساقیا زہر پلا دے مجھ کو　شربتِ مرگ چکھا دے مجھ کو

۶۸- اقرار ہے صاف آپ کے انکار سے ظاہر　ہے مستی شب نرگس میخوار سے ظاہر

آنکھ کا استعارہ نرگس سے کرکے آنکھ کے مناسب مستی اور بیخودی کا ذکر کیا ہے

۶۹- استعارہ بالکنایہ

لطف سے اس کے زمین غیرت باغ فردوس　خلق سے اس کے زمان رشکِ دکانِ عطار

۷۰- استعارہ تخئیلیہ

ہان جوشِ تپش چھیڑ چلی جاے کہ پر تو　جھڑ جائینگے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

۷۱- مجازِ مرسل مین جو لفظ سبب کے واسطے موضوع ہو اس کو سبب پر استعمال کرین۔

ساقیا دے جام آب آتش رنگ　گرم وسردِ زمانہ سے ہون تنگ

۷۲- کنایہ کی تصریح ؎

چاک پردہ سے یہ غمزے ہین تو اے پردہ نشین | ایک مین کیا کہ سبھی چاک گریبان ہون گے

۷۳- خون کے میرے ارادہ سے ہوا ذابح سعد | قتل پر میرے کمر باندھے بہ شکل جبّار

سعد ذابح سے قمر کی بائیسوین منزل مراد ہے ؎

۷۴- وہ قہرمان فلک توسن و نجوم حشم | کہ ترکِ چرخ غلام اس کا مرحبا کر ہے

بترکِ چرخ مریخ سے کنایہ ہے۔

۷۵- کنایہ قریب ؎

موسفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن | نیند آتی ہے بہ آرام مگر آخر شب

۷۶- تعریض ؎

مین ہی تو رہا ہون کہین شب سرخوش و خرم | مین نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم

۷۷- رمز ؎ بیٹھین لبِ آب جو بہ اکدم | پہونچائین سبو سبو بہ اکدم

علمِ بدیع

۷۸- تجنیس تام مماثل ؎

یوسف سے عزیز کو کئی سال | زندانِ عزیز مین پھنسایا

۷۹- تجنیس مرکب مفروق ؎

وان سے جواب صاف ہی لائی | بات بنائی پر نہ بن آئی

۸۰- تجنیس زائد و ناقص ؎

ہم نکالین گے سُن اے موجِ ہوا بل تیرا | اسکی زلفون کے اگر بال پریشان ہونگے

۸۱- تجنیس مضارع ؎

بن ترے بزم سور مین ہین یہ قیامتین کہ ہے | نغمۂ صور کا اثر نغمۂ نے نواز مین

صور اور سور مین تجنیس مضارع ہے

۸۲- تجنیس لاحق ؎

سرمۂ تسخیر سے ہم خود مسخر کیون نہ ہون | آنکھ کی پتلی جو تھی جادو کا پتلا بن گیا

۸۳- صنعت شبہ اشتقاق ؎

کیا کیا جلی ہے بزم مین تجھ بن نہ جب پھرے | پروانے شمع شعلہ شمائل کے آس پاس

۸۴- ردالعجز علی الصدا مع تکرار ؎

دل ایک بار ہوا ایسی بے جگہ مائل | کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رکھے کا دل

۸۵- ردالعجز علی الحشو مع الاشتقاق

ہے طبع مین ہر روز فزون رنج فزائی | اپنے مین سماتے نہین کیا دل مین سمائی

۸۶- صنعت سیاق الاعداد ؎

جز نہ سپھر ہین۔ مرے دشمن تو اور بھی | لیکن بڑے غضب یہی دو تین چار ہین

۸۷- صنعت معما ؎

کیفیت وصال بس اب کچھ نہین رہی | کیونکر نہ ہون ملول میں شب کچھ نہین رہی

شب کے معنے رات کے ہین عربی مین لیل کہتے ہین، الفاظ ملول مین سے لیل نکالا مومن رہگیا۔

۸۸- صنعت لغز ؎

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بولائے | نہ لفظ اور معنی سمجھ مین کچھ آئے | شب و روز غوغا مچایا کرے | اسی طرح سے مار کھایا کرے

اس لغز یا پہیلی سے گھڑیال مراد ہے

صنائع معنوی

۸۹- طباق ایجابی ؎

جب تلک باعثِ نشاط و ملال | ہے وصال و فراق جانانی

۹۰- طباق سلبی ؎ | بات اپنی وہان نہ جمنے دی | اپنے نقشے جمائے لوگون نے

۹۱- صنعت تشابہ الاطراف ؎

زبان گنگ ہے عشق مین گوش کرے | برا سنتے سنتے بھلا کہتے کہتے

۹۲- صنعتِ ارصاد ؎

غیر بیمروت ہے آنکھ وہ دکھا دیکھین | زہرِ چشم دکھلائین پھر ذرا مزا دیکھین
کچھ نظر نہین آتا آنکھ لگتے ہی ناصح | گر یقین نہین حضرت آپ بھی لگا دیکھین

۹۳- صنعت تجرید ؎ | سوزِ غضب سے ہے گرہ تار سینے مین | اک مشتِ خاک اور یہ کین اے فلک دریغ

۹۴- صنعت مقابلہ ؎ | ہون مین سیہ روز کہ وہ شمع رو | شام کو آیا تھا سحر کر گیا

۹۵- صنعت تجاہل عارفانہ ؎

تارے آنکھین جھپک رہے تھے | تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

۹۶- صنعت جمع وتفریق ؎ آئینہ ہے صفاے دل میرا کیا ہوا اگر نہین ہے حیرانی
دوست کرتے ہین ملامت غیر کرتے ہین گلہ کیا قیامت ہے مجھی کوسب بُرا کہنے کو ہین

۹۷- صنعت رجوع ؎ خنجر تھا آہ تھی یا زبان تھی خنجر سے زیادہ تر روان تھی

۹۸- حسن التعلیل ؎ خیدہ کس لئے نوآسمان تھے بھلا نہ تھا ازل سے جو مدنظر ترا پابوس

۹۹- احتجاج بدلیل ؎ شبہ کیا عصمتِ لختِ جگر احمد مین جب مسلم ہے کہ معصوم ہے جزو معصوم

۱۰۰- صنعتِ ادماج ؎ تیرا اقبال روز افزون ہو جیسے مومن پہ فضلِ رحمانی

۱۰۱- تبلیغ ؎ دمِ مصاف ترے دشمنو کے لشکر مین صداے نوحہ وشیون ہے شورِ غلغلِ کوس

۱۰۲- رعزق- (مبالغہ قریب لعقل لعبید العادت کا نام ہے) ؎ گرگ نے دورِ عدل مین اس کے سیکھلی راہ ورسمِ چوپانی

۱۰۳- صنعتِ تعجب ؎
زخم کھایا زہر کھایا تو بھی کچھ ہوتا نہین دیر گزری مرگ کو کیا جانئے کیا ہو گیا

۱۰۴- صنعت تلمیح ؎ ہر آہ کہ لب پہ ہے شررریز دیپک کا ہے نغمۂ جنون خیز

اس تفصیلی بیان کے سلسلے مین یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ "مومن" نے اُن صنایع وبدایع لفظی ومعنوی کو لیا ہے جو فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے مستحسن اور پسندیدہ ہین اور غیر پسندیدہ صنایع سے سخت احتراز کیا ہے۔ یہ صنائع اور بدایع وہ ہین جو روانی کلام میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں

باقی "کیفی چریاکوٹی"

کلیات ودواوین (اُردو)

دیوان میر حسن دہلوی - نہایت دردانگیز کلام ہے ——— ۸ر
دیوان مردان صفی - تصوف کا رنگ کوٹ کوٹ بھر دیا گیا ہے - ۵ر
کلیات مومن - معہ قصادید و مثنویات ——— عہ ر
کلیات ظفر - ہر چہار جلد کامل دو جلد ——— ۶ر ۱۲
دیوان ناسخ - استعارات وتشبیہ مین انکا کلام اپنی آپ نظیر ہے ——— عہ ر

مسٹر رینالڈز کے انگریزی ناولون کے ترجمے

فسانہ الہ دین ولیلی: مشہور ناول اسٹار آف منگریلیا کا ترجمہ رنگین داستانون کے ضمن مین بہشت دوزخ کی سیر کرائی ہے پڑھکر دل دہڑک جاتا ہے۔ مترجمہ منشی امیر حسین صاحب تحصیلدار کاکوری قیمت ——— عہ ۱۲ر
فریب حسن: ناول فاسٹ کا اردو ترجمہ جس مین قصہ کے پیرایہ مین بدکردارون کے زبون نتائج دکھائے گئے ہین۔ عہ ۱۲ر (مینیجر نگار)

مرد اور عورت!

اتبکار و تقلید مین!!

کیا فریقین قوائے عقلی مین برابر ہین؟

اپنی رفیقۂ حیات یا اپنی عزیز محبوبہ کسی سے بھی فریقین کی حقیقت کے متعلق مباحثہ کرو تو وہ اس امر کا اعتراف کرینگی کہ مستورات مردون کے مقابلہ مین عموماً قد کی چھوٹی، وزن مین ہلکی، عضلات کی کمزور، اور مصیبت کے وقت بے صبر ہوتی ہین، لیکن اگر ان سے تم اس امر کا اعتراف کرانا چاہو کہ وہ فہم و ذکا، کے میدان مین بھی مردون سے پیچھے ہوتی ہین - تو یہ ان کے لئے ایک ناقابل تسلیم حقیقت ہوگی

عورتون کے مقابلہ مین مردونکے تفوق عقلی پر زمانہ قدیم سے سب کا اتفاق چلا آتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے لوگون نے جنس لطیف کو ناقص العقل کہنا شروع کر دیا لیکن حقیقت مین اسوقت مستورات کا جو طبقہ قیود ماضی کی بیڑیون سے آزاد ہو چکا ہے - اور واقعی معنو مین زندگی کے تمام شعبون مین مکمل طور سے آزاد ہے، اس کے حیرت انگیز کارنامے، مردون کے تفوق عقلی کے اس خیالی دعوی کی بنیاد کو بہت کچھ کمزور بنا رہے ہین

پھر اصل معاملہ کی واقعی حقیقت کیا ہے؟ کیا مرد و عورت دونون قوائے عقلی مین ایک ہی طبقہ کے دو مساوی فرد ہین؟ جرمن کا مشہور فلسفی کانٹ کیزرلنگ آخری دنون مین جب امریکہ کی زیارت کے لئے گیا، تو اُسنے وہان تحول اجتماعی کے جو روح پرور مناظر دیکھے، انکو اپنے لفظون مین اس طرح بیان کرتا ہے - "مین نے امریکہ مین جہان دیکھا، جن جن شعبون مین دیکھا اکثریۃ اور غلبہ جنس لطیف ہی کو حاصل تھا"

جرمن فلسفی کی یہ رائے حقیقت مین مشاہدہ پر مبنی ہے - اور یہ ضروری نہین کہ ہر مشاہدہ حقیقت کے مطابق ہو - کبھی مشاہدہ واقعی بھی ہوتا ہے اور کبھی حقیقت و امتحان اسکی تائید نہین کرتے، علاّمہ پاپنر پروفیسر جامعۂ کورنل (امریکہ) نے البتہ اس موضوع پر ایک علمی بحث کی ہے - جو نفس مسئلہ پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہے - پاپنر نے ہلین گارڈنز مشہور زعیمۂ نسوان کے دماغ کی علمی طریقہ پر باریک تحقیقات کی تو انکو ثابت ہوا کہ عورت کا دماغ رتبہ اور مرتبہ مین مرد کے دماغ سے نہ چھوٹا ہوتا ہے نہ کمزور، چنانچہ مسز گارڈنز کے دماغ کا مسٹر ویلڈر موسس جامعہ کورنل کے دماغ سے موازنہ کیا گیا تو دونون پلڑے برابر رہے، حالانکہ ان دونون دماغون کا وزن صرف ۱۱۵۰ گرام تھا جو عام دماغون کے توسط وزن سے بھی کم ہے - اکابر رجال کے دماغ کا وزن عموماً ۱۳۰۰ یا ۱۴۰۰ گرام ہوتا ہے - تاریخ مین صرف تین شخص ہین، جن کے دماغ کا وزن ۲۰۰۰ گرام تھا - انمین سب سے زیادہ مشہور روس کا نامور قصہ گو تورجینو ہے

جامعۂ کورنل (امریکہ) مین دماغی مسائل کی تحقیقات کے لئے مشاہیر حکماء کی کھوپڑیان نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھی

جاتی ہین - امریکہ کا یہ خاص طریقہ ہے کہ مشہور ہستیان اپنی حیات مین وصیت کر جاتی ہین کہ مرنیکے بعد ہمارے دماغ اس یونیورسٹی کے سپرد کر دے جائین، چنانچہ یہ مبارک رسم ابتک جاری ہے - اور اسی رسم کے مطابق مسز گارڈنر نے بھی اپنے دماغ کو اسی مجموعہ مین شامل کرنے کی حاتمانہ وصیت کی تھی،

پابنر نے جب مسز موصوفہ کے دماغ کی نوعی تحلیل کی تو انکو ثابت ہوا کہ اس قسم کے دماغون مین مادۂ سنجابیہ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے لیکن کسی شخص کے سر کی بڑائی یا چھوٹائی سے اس شخص کے فہم و ذکاء کو قیاس کرنا ایک نا قابل توجہ بات ہے۔ حجم سر سے یا دماغ کے وزن سے مرد کی ذکاوت کا صحیح اندازہ لگانا ہماری استطاعت اور بس کے حدود سے باہر ہے

تاریخی حیثیت سے جامعہ کولمبیا کے مشہور پروفیسر استاذ کیٹل ماہر فلسفۂ عقلیات نے ایک ہزار مشہور تاریخی نوابغ کے سیر و حالات جمع کئے تو انکو معلوم ہوا کہ ان نوابغ کی صف مین اکتیس ۳۱ خواتین بھی مردون کے دوش بدوش موجود ہین، ڈاکٹر کیٹل کی فہرست نوابغات مین گیارہ فرمانروا شاہزادیان ہین جنکو سلطنت و جہانبانی وراثۃً ملی تھی، اور ۸، حسن و جمال، خوبی و شمائل کی پاک دیویان ہین ۱۰، ادب و لٹریچر کی ماہرہ ہین، دو باقیات الصالحات پر ایک یونان کی مشہور شاعرہ سافو اور دوسری جان ڈارک فرانس کی بطلۂ مقدسہ ہے،

خواتین شہیرات کے سوانح حیات مین غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے مختلف لائنون مین مردون کے مقابلہ نمایان کامیابی حاصل کی ہے، اس تاریخی شہادت سے یہ پتا چلتا ہے کہ انسانی عقل و فکر کی ترقی کے میدان مین مستورات نے مردون کے ساتھ چلنے کی کوشش ہی نہین کی، ورنہ اس میدان مین مردون کے بھدّے پانوُن، عورتون کے ہلکے قدمون سے بازی نہ لیجاتے

لیکن پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ کیون مستورات مین نبوغ بہت کم پایا جاتا ہے؟ بعض مرد اس کا یہ جواب دیتے ہین کہ "اسلئے اور صرف اسلئے کہ فہم و ذکاء مین مستورات مردون سے کمزور ہوتی ہین" لیکن مردون کا یہ جواب حقیقت مین عبارت سے خالی نہین، جنس لطیف اسکا یون رد کر سکتی ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر مردون نے یہ کیسے ثابت کیا کہ مدارس مین طالبات کی ذکاوت کا درجہ طلباء سے کہین زیادہ بلند ہوتا ہے - اور جنسین مین بلندی و پستی کا یہ انداز سن مراہقت تک باقی رہتا ہے - مراہقت کے بعد البتہ مرد عورت سے آگے نکل جاتے ہین - باقی بلوغ کے پہلے اور اس کے بعد فریقین کے فہم و ذکا کا اوسط کم از کم متقارب ہوتا ہے،

ماہرین فن نے جنسین کی طالب علمانہ زندگی پر غور کیا تو انکو ثابت ہوا کہ جن دروس و اسباق مین تفکیر و تحلیل، اور ابتکار کی زیادہ ضرورت نہین ہوتی، انمین مستورات زیادہ تیز ہوتی ہین - وہ ضروری باتین بلا کسی تردد یا حیرت کے اپنے حافظے کے اعتماد پر فوراً یاد کر لیتی ہین انکو اسباب و علل کے اختلافات سے کچھ سروکار نہین ہوتا - درجات مدارس کے حصول مین ان کے غیر معمولی تفوق کا یہی اصلی راز ہے - اور نوجوان طلبہ چونکہ ہر چیز کی علت اور اسباب ڈھونڈھتے پھرتے ہین - اسی لئے وہ ہمیشہ متحیر اور متسائل نظر آتے ہین - اور یہی وجہ ہے کہ جن اسباق مین بحث و مقارنہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے (جیسے طبیعیات، تاریخ، اور کیمیا وغیرہ) انمین یہ زیادہ ممتاز ہوتے ہین - مختصر یہ کہ مرد کی امتیازی خصوصیت صرف اعمال قدیمہ کو علمی جامہ پہنانے کیلئے وسائل جدیدہ کا ابتکار ہے - اس بنا پر یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی عقل ٹھیک اسی طرح محاکاۃ و تقلید کی طرف زیادہ مائل ہے، جس طرح مرد کی عقل ابتکار و اقدام کی طرف!!

لیکن صنفِ نازک ان اقوال کی یون تردید کرتی ہے کہ چونکہ عورتون کو فرصت اس قسم کا موقعہ نہین دیتی، کہ وہ اپنے معلومات اور نبوغ، جوہر اور فکر کو مبرہن کر سکین، اسی لئے وہ ابتکار و اقدام مین مردون سے پیچھے نظر آتی ہین، جب کام کا وقت آتا ہے، اور مرد، مکتشفات کا اکتشاف، مستنبطات کا استنباط آرا، و مذاہب کا ابتکار کرتے ہین، اور متین و پائدار بنیادون پر حضارۃ و عمران کی بنا رڈالتے ہین۔ تو اسوقت وہ اپنی عائلانہ زندگی مین نوابغ کو دودہ پلاتی ہوتی ہے

اس جواب مین اگرچہ صحت و صداقت کا ایک بڑا حصہ موجود ہے، لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مردون کے اعمال مین انکو شرکت کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ تو وہ زنانہ اعمال (فرش بیوت، زنانہ لباس، فلسفۂ اطفال کے ابتکار وغیرہ) مین کیون خالق نہ ہوئین؟ حالانکہ جن نوابغ نے عالمگیر شہرت اور جہانگیر عظمت حاصل کی اُنھون نے بھی یہ مراتب علیہ و مقس اور حریر پر چلکر نہین پالئے، بلکہ بارہا اس راہ مین انکو بھی الم و عذاب، فشل و اعراض، تکلیف و مصیبت، درد و غم کے خونخوار عفاریت سے مقابلہ کرنا پڑا، تاریخ کے صفحات اس قسم کے واقعات سے لبریز ہین۔ اگر انکو تفصیل سے عرض کیا جائے تو وہ بجائے خود ایک لمبی داستان ہوگے اسلئے ہم اسکو نظرانداز کرتے ہین۔ غرض یہ کہ تاریخ کے مشہور ترین نوابغ نے جو جو مصیبتین جھیلی ہین ان مصاعب عظیمہ کے مقابلہ مین عورتون کی عائلانہ زندگی کے بکھیڑے بہت ہی معمولی اور غیر اہم ہین

علامہ لوبا جامعۂ برن کے مشہور پروفیسر فلسفۂ عقلیات کا خیال ہے کہ دنیا مین سینکڑون ایسے عمدہ کام کرنیوالے افراد موجود ہین۔ جنکو ترقی اور تفوق کی طرف صرف انکے شعور اور احساس نے برانگیختہ کیا، ذکاوت کو اس کامیابی مین کوئی دخل نہین ہے،

عورتون کے مقابلہ مین مردون کے تفوق کی ایک یہ وجہ بھی بتائی جاتی ہے کہ: مرد چونکہ فہم و ذکا کے استعمال مین زیادہ روشن ہوتے ہین، اور عورتون مین روشنی کا یہ جوہر نہین پایا جاتا۔ اس لئے عورتون مین نبوغ کم ہوتا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذکا مین عورت و مرد دونون مساوی ہین، فرق ہے تو صرف طریقۂ استعمال کا فرق ہے۔ اور حقیقت مین مردون کی اس شرف و مزیت کا اصلی سبب صرف اُنکی جسمانی طاقت کی زیادتی ہے کسی بیوی جاننے والے سے اس حقیقت کے متعلق سوال کرو تو وہ تمکو بتائے گا کہ اس کا اصلی راز غدد صمّا ہین، یہی غدود ہین، جو اپنے قدرتی اثر سے جسم کے حجم کو بڑا، عضلات کو مضبوط اور عزم و ارادہ کو روشن بناتے ہین۔ چنانچہ جب کسی سبب سے یہ غدود بیکار ہو جاتے ہین تو مرد اپنے ممتاز ترین صفاتِ رجولیہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، بعض ماہرین فن نے مرغ کے انھی غدود کو نکال کر مرغی کے جسم مین لگا دئے تو کچھ ہی دنون مین خود مرغی کے اندر مرغ کی صفتین ظاہر ہو گئین

بہرحال! نبوغ کیا چیز ہے؟ کیا نبوغ صرف انھی اعمال عظمہ کا نام ہے۔ جو تاریخی صفحات مین جگہ پاتے والے اور بظاہر نظر فریب ہین (مثلاً کسی حیرت انگیز آلہ کا استنباط، یا کسی طبیعی حقیقۃ کا اکتشاف، کسی مملکتہ کی تدویخ یا کسی مجسمہ اور تمثال کی صورت، کسی بہترین صورت کی تصویر، یا کوئی مفید اور دلچسپ نظم وغیرہ) اور کیا یہ صحیح نہین کہ لفظ نبوغ کا اطلاق ان اعمال پر بھی کیا جائے جو گھرون کے گوشے مین، مکانون کے کونے مین بلا کسی اعلان اور شور کے پورے ہوتے ہین؟ اور جن کا ترقی عمران مین ایک مخصوص اثر بھی ہوتا ہے؟

اگر یہ صحیح ہے تو پھر اسی سلسلہ مین اب ہمین ان عورتون کو بھی شمار کرنا ضروری ہوگا جو اپنی محبت و دوستی، عطف و مواساۃ،

حسن انتظام اور خوش سلیقگی مین خود مردون سے بھی خراج تحسین وصول کئے بغیر نہین رہتین،

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا تاریخ سے لیکر آج تک طبقہ مستورات مین جو مخفی عامل کارفرما رہے۔ وہ انکو صرف محبت و وداد، الفت و دوستی، زوجیۃ وامومۃ مالکہ، مکان اور مربی بیت کی حیثیت سے ممتاز کرتے رہے۔ چنانچہ وہ ان فضائل مین اپنی نظیر آپ ہین اور ان کے اس عظیم الشان تفوق کا کوئی دانشمند انسان انکار نہین کر سکتا

غرض یہ کہ جہانتک مین نے غور کیا عورتون مین قلت نوابغ کا سبب اساسی صرف یہ سمجھ مین آتا ہے کہ مستورات خود نوابغ ہونا ہی نہین چاہتین، بلکہ وہ صرف "عورت" بننا چاہتی ہین اور "عورت" ہی ہونے کو اپنا بہت بڑا فخر سمجھتی ہین، ورنہ اگر وہ اس میدان مین اُترین تو یقیناً مردون سے کسی طرح پیچھے نہین رہ سکتی ہین،

« بدر اصلاحی »

تصانیف علیاحضرت بیگم صاحبہ بھوپال دام ظلہا

ان بیش بہا تصانیف کا ہر تعلیم یافتہ گھر مین ہونا لازمی ہے

کتاب	موضوع	قیمت
بچون کی پرورش	زچہ وبچہ کی ضروریات، ولادت کی احتیاط۔ زمانہ طفولیت کی بیماریان اور علاج وغیرہ۔	عہ/
تندرستی	اصول حفظان صحت اور امراض متعدی سے بچنے کے طریقے بیان کئے گئے ہین۔	عہ/
تربیت الاطفال	بچون کی تعلیم وتربیت اور اُن مین تہذیب وشائستگی و دیگر اوصاف حسنہ پیدا کرنیکے نہایت مفید	۸/
حفظ صحت	روزمرہ کے وہ تمام اصول جو عورتون کی صحت جسمانی قائم رکھنے کیلئے ضروری ہین۔	۱۳/
سلطانیہ سلسلہ (۴ حصے)	لڑکیونکو نہایت دلکش بیان مین امور خانہ داری کی تعلیم دینے والی کتاب۔	[illegible]
انتظام خانہ داری (۲ حصے)	یہ مختصر رسالہ امور خانہ داری کی تعلیم کیلئے بہترین اُستاد ہے	عہ/
مسیح کنگ جارج	انگریزی کھانون اور مٹھائیون اچار چٹنی وغیرہ کی مفصل ترکیبین۔	[illegible]

کتاب	موضوع	قیمت
تہذیب النسوان	امور خانہ داری تدبیر منزل کے ساتھ ساتھ مذہبی احکام مین	[illegible]
ہندوستانی گھر وتیمارداری	تیمارداری اور مختلف اعضاء جسم پر پٹیان باندھنے کے طریقے مع تصاویر	[illegible]
منتک (۲ حصے)	موزہ بنیائن اور بیلین بُننے کی ترکیبین مع تصاویر	[illegible]
فرائض مادری	بچونکی تعلیم وتربیت اور حفظان صحت کے متعلق بہترین ہدایتین	۱۲/
ہدیۃ الزوجین	زوجین کے شرعی وقانونی حقوق واختیارات	۱۰/
خطوط شبلی موسومہ محترمہ زہرا بیگم فیضی وعطیہ بیگم فیضی صاحبہ	یہ مجموعہ علامہ شبلی مرحوم کی ادبی سحر طرازی اور لطیف انشا پردازی کی آخری یادگار ہے اس مجموعہ کا ہر خط اور ہر خط کی ایک سطر جواہر مین تولنے کے قابل ہے۔ کوئی خط ایسا نہین جسمین فصاحت اور ادبی لطافتون کے ساتھ ساتھ دل آویزی اور دلکشی نہ ہو۔ کتاب کے شروع مین مولانا کی تصویر خط کا فوٹو۔ اور مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو کا عالمانہ دلچسپ اور پر لطف مقدمہ بھی شامل ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔	

منیجر رابعہ بک ایجنسی نظر گنج۔ بھوپال

ایک سیاح کی ڈائری

(سیاحت نامۂ لکھنؤ کی دوسری قسط)

لکھنؤ کے محرم کا ہنگامہ "مسرت" ختم ہونے کے بعد میرا خیال تھا کہ شاید کوئی غیر معمولی "سوگ" یہان کی فضا مین پیدا ہو جائیگا اور مجھے اس "ماتمکدہ" کو جلد چھوڑ دینا پڑیگا، لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ یہان کی آبادی خواہ کسی قدر اپنے سینون کو فگار دکھانے کی کوشش کرے، لیکن دلون کے اندر ابھی تک وہی "نشاط غیر معصوم" (مگر فطری) موجزن ہے جس کی ابتداء، اولین فرمانروائے اودھ کے عہد مین ہوئی اور جس کی انتہا آخری شاہ اودھ کی اُس سیرت پر جو قیصر باغ کے ایک ایک حوض سے عریان ہو کر نکلنے والی دوشیزہ کو "موج کوثر و تسنیم" مین ڈوبی ہوئی حور سمجھکر "مالِ یغما" نہین بلکہ "حصۂ مومن" کی حیثیت سے قابض ہو جاتی تھی۔ اُس "فراموشکارِ فردا" عہد کے "ذرات مبثوثہ" یہان کے فضا مین اب بھی بالکل اسی طرح نظر آتے ہین جیسے کسی رقاصہ کی محفل سے اُٹھ جانے کے بعد اس کے زر کار ملبوس مین سے ٹوٹے ہوئے "بادلہ کے ریزے" کہین کہین فرش پر چمکتے ہوے مل جائین

یہان کی آبادی کا دولت و جاہ والا عنصر وہ ہے جس کا اصطلاحی نام "تعلقہ داران اودھ" ہے اور جن مین ہندو مسلمان دونون افراد شامل ہین۔ ان کی کوٹھیان، ان کے قصر، ان کے مکانات لکھنؤ کے مختلف حصون مین منتشر ہین اور جب وہ اپنی دیہی زندگی کے بے آب و رنگ مشاغل سے تھک جاتے ہین تو یہان کی متمدن فضا مین آکر قیام کرتے ہین اور تمام وہ "لوازم نشاط" جو دولت سے حاصل کئے جا سکتے ہین ان کی دسترس سے باہر نہین رہتے، ہر چند ان کی اقتصادی حالت قابل تعریف نہین، لیکن جس حد تک حکومت کے ساتھ وفادارانہ تعلق رکھنے کے بعد "آزادی اخلاق" کا استحقاق پیدا ہو سکتا ہے وہ سب انہین حاصل ہے اور اس کے لئے زر و مال کی کمی کی شکایت انھین کبھی پیدا نہین ہوئی۔ صوبۂ اودھ مین اس جماعت کو وہی درجہ حاصل ہے جو روے زیبا پر مصنوعی خال کا ہوا کرتا ہے کہ بعض کے نزدیک وہ یکسر تصنع ناروا ہے اور بعض کے نزدیک "افزایش حسن" ——— مین نے بھی رات کے وقت ان "کاشانہائے حسن و جمال" کو برقی روشنی مین جگمگاتے دیکھا اور خیال کی ایک مکمل "کارگاہِ معصیت" مین اپنے آپ کو مرکزی حیثیت دیکھکر پورا لطف تصور بھی اُٹھایا ہے۔ حیران ہون کہ جن پر عیش و مسرت کی گھڑیان اس انداز سے ہمیشہ گزرتی رہتی ہین وہ زندہ کیونکر رہتے ہین کیا سرمایہ و عمل کی جنگ یا اشتراکیت و اجتماعیت کا اصول اسی نوع کے انتہائی غیر عادلانہ تقسیم فطرت کو دیکھ کر تو پیدا نہین ہوا؟

یہان کا دوسرا مخصوص طبقہ جو اپنے "سقوط راس" اور "ذرۂ آفتاب تابانیم" دونون حیثیتون سے خالص لکھنوی ہے وثیقہ دارون کا ہے، جن مین بعض وہ ہستیان بھی ہین جو لاکھون کی مالک ہین اور بعض وہ متوکل نفوس بھی ہین جن کے اخلاق کا ارتقاء گداگری پر ختم ہوتا ہے، متوسطین کی حالت گداگرون سے بدتر ہے کہ ان کے پاس حصول معاش کا یہ ذریعہ بھی نہین اور وثیقہ کی تنگی

انہین جی کھولکر "افیون بیاری" کی بھی اجازت نہین دیتی۔ ان کا ایک ایک بال قرض مین بندھا ہوا ہے، غالب کی تنخواہ مین ہوکر سا ہوکار صرف تہائی کا شریک ہوا تھا مگر وہ دلی کی باتین ہین اور دور کی، یہان لکھنؤ مین ساہوکار تین چوتھائی سے زیادہ کا شریک ہے اور باقی چوتھا حصہ "چنیا بیگم" کے لئے بھی کافی نہین ہوتا، "قدر کفاف" اور "سدرمق" کا کیا ذکر ہے اس جماعت کی اخلاقی و معاشری حالت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دولت "مزد" کی حیثیت سے ہٹکر صرف "دستِ غیب" "باترکہ" کی صورت مین ملتی ہے تو اس مین کسقدر "عفونت و گندگی" پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ بہو بیگم کی تعریف کرتے ہین کہ لاکھون کا وثیقہ ان کی ذات سے لوگون کو ملا۔ مین کہتا ہون کہ وہ اس سے زیادہ ظلم اہل لکھنؤ پر کوئی اور کر ہی نہ سکتی تھین کہ اتنی بڑی جماعت کو بیکار و بے دست و پا بنا کے رکھدیا اہل لکھنؤ کی پست ذہنیت کا بڑا سبب یہی "غلط بخشی" ہے اور یہ جو لکھنؤ سے باہر ہر جگہ یہان کا زنانہ پن بدنام ہے، اس کی علت بھی اسی کو قرار دے سکتے ہین جس نے قواء عمل کو بیکار کرکے عورتون کی طرح مجہول زندگی کا عادی بنا دیا۔

مین یہان کے ایک بڑے وثیقہ دار سے ملنے گیا جنکی آمدنی گانون اور وثیقہ کی ملا کر ایک ہزار سے کم نہین ہے، آباء و اجداد کا چھوڑا ہوا ایک عالیشان قصر بھی ہے موٹر بھی رکھتے ہین، حاجب و دربان بھی موجود ہین، لیکن حالت یہ ہے کہ ان کے مکان کی فضا وہان کا ماحول اور ایک ایک چیز پر ادبار کا گہرا سوگ برس رہا ہے اور وہان پہونچتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید خون کی روانی رگون کے اندر کم ہو گئی ہے۔ اور غنودگی سی روح پر طاری ہو رہی ہے۔ ان کے یہان کی محافل اس مین شک نہین کہ بڑی حد تک ان کے اسلاف کی یادگار ہین، وہی کبوتر و بٹیر کی لت وہی فسانۂ آزاد کے صف شکن خان بٹیر کی تعریف کرنے والے مصاحبون کا گروہ، وہی ارباب نشاط کا ہجوم اور وہی ذوقِ رقص و موسیقی، لیکن چونکہ حقیقتاً روح نشاط سے خالی ہے، اس لئے یہ تمام سامان بجائے مسرور کرنے کے میرے دل کو دُکھا رہا تھا اور حیران تھا کہ یہ لوگ جنھون نے تمام عمر ایک دن بھی اپنے جسم و دماغ کو محنت سے تھکا کر تفریح کے لئے آمادہ نہین کیا وہ کس طرح اس سے لطف حاصل کر سکتے ہین اور کیون نہین وہ ان تمام اسباب عیش و تفریح سے بیزار ہو کر خودکشی کر لیتے۔ اس مختصر سی صحبت مین کبوترون کے عجیب و غریب نام، ان کے سیکڑون اقسام، فن کبوتر بازی کی اصطلاحین، بٹیر بازی کے بہت سے رموز و نکات، موسیقی کے متعدد دل تڑپا دینے والے ٹکڑے، مصاحبون کی خالص لکھنوی ذہنیت کا پتہ دینے والی لکھنوی ٹکسالی زبان سبھی کچھ مین نے دیکھا اور سُنا، لیکن بالکل سرمایۂ اعتبار و بصیرت سمجھ کر اور پھر مجھ مین ہمت نہین ہوئی کہ دوبارہ اس المناک مسرت کا اذیت کوش لطف حاصل کرون

یہان کے وثیقہ دارون کی جماعت خواہ وہ ایک ہزار کا وثیقہ یاب ہو یا ایک روپیہ کا یکسان طور پر ایک ہی نسبت سے مقروض ہے۔ اور شب و روز ڈگریون کے خوف سے مکان کے اندر مقفل رہنا اس طبقہ کی مشہور خصوصیت ہے، صبح کو بالائی اور باقرخانی کا ناشتہ کرنا اور شام کو تھیٹر جانا (اگر بدقسمتی سے کوئی تھیٹر موجود ہو) خواہ بیگم کا کلی دار پاجامہ ہی کیون نہ علحدہ کرنا پڑے مشاہدات روزانہ مین داخل ہے جہانتک غذا کا تعلق ہے فصلی چیزون کے باب مین ان کی نزاکت "سوءِ ہضم" کے حدود تک پہونچ جاتی ہے اور یہان کا نازک سے نازک تن نواب بھی جس کے متعلق مشہور ہے کہ مولی کا پتہ بھی پانون کے نیچے آکر زکام زکام کا باعث ہو جاتا ہے،

جس وقت گاجر، سنگھاڑا، شکر قند کھانے پر آجاتا ہے تو محکمۂ حفظان صحت کے ملازمون کے لئے ایسا ناکافی ڈھیر چھلکون کا نہین چھوڑ جاتا کہ ان کی طرف سے تن آسانی کی شکایت پیدا ہو سکے، لباس یہان کی تمام لکھنوی آبادی کا تقریباً ایک ہی سا ہے، دو پلی سفید ٹوپی جس سے مقصود صرف مانگ کا چھپانا ہے، فیلبان سے لیکر فیل نشین تک ایک کے سر پر نظر آتی ہے، اچکن کا رواج بھی کثرت سے ہے لیکن ہرے پائنچے اب کم نظر آتے ہین اس کی جگہ چوڑیدار پاجامے نے لیلی ہے، بہ حیثیت مجموعی ان کی وضع سے ایک نوع کی نسائیت ضرور ظاہر ہوتی ہے، علی الخصوص اس وقت جب وہ فرط نزاکت سے "زیر قدمت ہزار جانست" کے قسم کی چال دکھانے پر آجائین - یہان سلام کرنیکا بھی مخصوص انداز ہے، سر و گردن کے ایک ایسے خم کے ساتھ جو پشت تک موثر ہوتا ہے، داہنے ہات کو سینہ کے محاذ مین لاکر ہتیلی اور انگلیون کو پورا پھیلا کر نانگر، کلائی کے جوڑ کو ڈھیلا کرکے مسلسل کئی بار جلدی جلدی جنبش دیتے ہین اور اس طرح سارے ہات مین تھرتھری پیدا کرتے کو رسم سلام سے تعبیر کیا جاتا ہے - مین نے غور کیا کہ کہین میرزا مظہر جانجانان نے اسی " ادائے کورنش " کا ذکر تو اس شعر مین نہین کیا

دل ازین تیغ بُردن آسان نیست آہ، مظہر خمِ سلام کسے

لیکن مین مطمئن نہ ہوسکا کہ لکھنوی اندازِ سلام واقعی اسی حد تک دلربا ہے۔

ہات جوڑ کر صد درجہ اظہار عجز و انکسار کے ساتھ بات بات مین قبلہ، حضور کے الفاظ سے خطاب کرنا یہان آداب گفتگو کی خصوصیت مین داخل ہے اور اس مین شک نہین کہ بڑی حد تک مُردم فریب بھی ہے، لیکن تجربہ کرنے کے بعد وہ ایک غیر حقیقی نمائش سے زیادہ کوئی چیز نظر نہین آتی۔

یون تو ہر جگہ ایک انسان کی اندرونی اور بیرونی اخلاق و معاشرت مین فرق ہوتا ہے، لیکن لکھنؤ مین یہ فرق حد سے متجاوز ہے آپ ایک شخص کو دیکھتے ہین کہ نہایت صاف ستھرے کپڑے پہنے چوک سے گزر رہا ہے اور آپ اس کی صفائی سے بہت متاثر ہوتے ہین، لیکن اس کا گھر کسی طرح مزبلہ سے کم نہ ہوگا اور وہان کی ایک ایک چیز سے آپ کو اس کی گندگی و عفونت کا ثبوت ملیگا - آپ دوسرے شخص کو دیکھتے ہین کہ نہایت ہی انکسار سے ہات جوڑ کر گفتگو کر رہا ہے، لیکن اس کے معنی صرف یہ ہین کہ وہ ایک لفظ بھی صحیح معنی مین استعمال نہین کرتا اور آپ سے جدا ہونے کے بعد اتنی ہی گالیان دیگا جتنی تعریف آپ کے سامنے کر گیا ہے - یہان کی معاشرت مین کذب و دروغ، مکر و فریب اس درجہ سرایت کر گیا ہے کہ اس کے معیوب ہونے کا احساس ہی محو ہوگیا ہے اور وہ اس طرح کام نکال لینے کو فراست و ہوشیاری سے تعبیر کرتے ہین یہان کے معمولی سودا بیچنے والون کا یہ حال ہے کہ جس چیز کی قیمت وہ پانچ روپیہ کہہ رہے ہین، اس کو وہ نہایت آسانی سے ایک روپیہ بلکہ اس سے بھی کم مین دیدینگے - چنانچہ یہان کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک اجنبی نخاس گئے وہان ایک آدمی ٹوپی کا پلّا بیچ رہا تھا - وہ ان کی وضع و صورت دیکھ کر بھانپ گیا کہ اجنبی (یا لکھنوی زبان مین گنوار) ہین - انھون نے پلّے کی قیمت دریافت کی، اسنے اپنی تمام دلفریب اداؤن کے ساتھ کہا کہ "حضور یہ پلّا ہے تو نہایت قیمتی - بابر کے محمد علی خان کے ہات کا کشید کیا ہوا اور انھین کے صاحبزادے میان احمد علیخان کے ہات کا کڑھا ہوا ہے - حضور شاید واقف ہونگے کہ یہ محمد علیخان وہی ہین جن کے کشید کئے ہوئے اور کاڑھے ہوئے

رومال ولایت جاکر ہزارون مین بکتے ہین ۔ وقت پڑ گیا ہے اس لئے جدا کر رہا ہون، ورنہ اسی قسم کے پتّے کل ہی منولال بزاز نے ایک رئیس کے ہات دس دس روپیہ مین بیچے ہین ۔ آپ سے مین صرف پانچروپیہ لیلونگا ۔ زرا حضور ملاحظہ تو فرمائین کہ کیا چیز ہے، ایک ایک پتی منھ سے بول رہی ہے، پلا گیا ہے چمن کھلا ہوا ہے" وہ غریب ایک نگاہ دیکھنے کے بعد چلے گئے کچھ دور چلے ہونگے کہ اسنے پھر آواز دی کہ "اے حضور کیا آپ خفا ہو گئے، اچھا تو یارون کی چھوٹ بھی دیکھتے جائے ۔ اور آٹھ ہی آنے دلوائے" وہ حیران رہگیا کہ یہ کیا تماشہ ہے اور لوٹ کر قیمت ادا کی اور پلا لے لیا ۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے ہنسکر کہا کہ "آپ زیادہ افسوس نہ کرین، اس تم مین بھی چار آنے یارون کے کہین نہین گئے"

یہ قصہ غلط ہو یا صحیح لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہان کے ذہنیت کیا ہے اور اہل لکھنؤ سے معاملہ کرنا کسقدر خطرناک امر ہے

لکھنؤ کے دو حصے ہین ایک مشرقی جو امین آباد سے شروع ہو کر حضرت گنج بلکہ صدر تک چلا گیا ہے اور دوسرا مغربی حصہ جو رکابگنج کے بعد سے شروع ہو کر قریب قریب سعادت گنج تک چلا گیا ہے ۔ پہلا حصہ وہ ہے جسے اہل لکھنؤ، لکھنؤ سے علٰحدہ سمجھتے ہین اور یہان کی آبادی کو گھسیارون، خانساماؤن، کی آبادی کہتے ہین ۔ مغربی حصہ خالص لکھنؤ کہلاتا ہے اور نوابون، وثیقہ دارون، طبیبون، شاعرون، افیونیون اور دستکارون کی آبادی اس حصہ مین زیادہ ہے اور بہت سے لکھنوی تجربات یہین کی گلیون مین پھرنے سے حاصل ہوتے ہین ۔ اس حصہ مین امام باڑے اور عزاخانے بھی ہین یہین بٹیرون کی پالیان قایم ہوتی ہین اسی جگہ کنکوے لڑتے ہین اور یہین شیعہ سنی علماء کا مخزن ہے

ہر چند مجھے اس حصہ کے مطالعہ کا کم وقت ملا، لیکن اس قلیل فرصت مین بھی یہ نتیجہ نکالنا میرے لئے دشوار نہ تھا کہ وہ جرائم جو نوابان اودھ کے عہد مین پیدا ہو گئے تھے وہ ہنوز مختلف صورتون مین یہان پائے جاتے ہین اور تاوقتیکہ یہ سارا حصہ برابر نہ کر دیا جائے بقول آتش "زمین کے نشیب و فراز کا دھبہ مٹنا" بالکل محال ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ اگر زندگی کا صرف لاعبانہ پہلو پیش نظر ہو تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے

اہل لکھنؤ کی گفتگو یقیناً اہل دہلی سے زیادہ شایستہ، شگفتہ نرم اور دلچسپ ہوتی ہے، دہلی پنجاب کے لب و لہجہ سے متاثر ہو کر اپنی خصوصیات زبان کو کھو چکی ہے اور لکھنؤ باوجود اس کے کہ بڑا حصہ یہان کی آبادی کا دہقانیون اور پوربیون پر مشتمل ہے، ابھی تک اپنی خصوصیات زبان کو سنبھالے ہوے ہے لیکن غلطی ہو گی اگر اس زبان کو کوئی علمی درجہ دیا جائے یا اس کو شعر و شاعری مین استادانہ پیش کیا جائے کیونکہ ہر ملک کی علمی زبان بازاری یا کاروباری زبان سے علٰحدہ ہوتی ہے اور شاعری کی لطافت خیال بھی ایک مخصوص انداز بیان کی محتاج ہے جس کو روزمرہ یا کسی مختصر المقام محاورہ سے صرف اس حد تک سروکار ہو سکتا ہے کہ وہ شعر خود کوئی ٹکنکل یا اصطلاحی حیثیت نہ اختیار کرے

مین ہرچند شاعر نہین ہون لیکن "عالم بالا" سے زیادہ "شعر فہمی" کا مدعی ضرور ہون اور اس بنا پر اگر لکھنؤ آنے کے بعد میرے اندر یہان کے محافل شعر وادب، یہان کے اکابر شعراء سے ملنے کا ولولہ پیدا ہوا تو بیجا نہ تھا یونتو رسایل کے ذریعہ سے مین یہان کے بعض شعراء اور اڈیٹرون سے واقف ہوچکا تھا لیکن جی چاہتا تھا اور بالکل بے اختیارانہ طور پر کہ ان سے خود ملون، اور ان کی باتین سنون اور ان کا مطالعہ زیادہ قریب سے کرکے کسی نتیجہ پر پہونچون - اجنبی ہونے کی حیثیت سے مجھے اس کی تکمیل مین ضرور کچھ نہ کچھ دشواریان اٹھانا پڑین، لیکن نہ اسقدر کہ انکا ذکر ضروری ہو

شام کا وقت تھا، امین آباد پارک کے سبزہ پر تنہا بیٹھا ہوا صبح آیندہ کا پروگرام مرتب کر رہا تھا کہ دو صاحب جن مین سے ایک دُہرے بدن کے اوسط قد والے اور دوسرے اکہرے جسم کے پستہ قامت شخص تھے مجھ سے کچھ دُور آکر بیٹھ گئے اور گفتگو کرنے لگے انکی گفتگو کا موضوع یکسر ادبی تھا اور وہ کسی غزل پر تنقید کر رہے تھے - مین جسارت کرکے اٹھا اور قریب جاکر عرض کیا کہ "اگر دو شاعرون کے درمیان کسی غیر شاعر وجود کو برداشت کیا جاسکتا ہے تو براہ کرم مجھے اجازت دیجئے کہ قریب سے آپ حضرات کی گفتگو سنون اور نووارد سیاح ہونے کی حیثیت سے آپ کی اعانت چاہون" اس کا جواب وہی ملا جو ملنا چاہئے لیکن بجائے اس کے کہ وہ اپنے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے، انھون نے خود میرے حال کی تحقیق شروع کردی - مین نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "میرا نام لیخ ہدر ہے، کرۂ مریخ کے ایک شہر منہنعکاز کا رہنے والا ہون، آج ہی صبح بغرض سیاحت مافوق النبفسجی شاعون پر سوار ہوکر یہان آیا، تمام دن اس کوشش مین صرف ہوگیا کہ انسان بنکر باہر نکلون کرۂ زمین کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے تفریح کرون لیکن پہلے تو گھنٹون یہی فیصلہ نہ کرسکا کہ یہان کی بہترین معیاری صورتِ انسانی کیا ہوتی ہے - کبھی ضرورت سے زیادہ ناک لمبی ہوگئی کبھی دہانہ ایک کان سے دوسرے کان تک پھٹ کر رہگیا، کبھی ابرو آنکھ کے نیچے نکلی اور کبھی ہونٹون کے اوپر، الغرض بڑا وقت تو اسی تعمیری کام مین خراب ہوا آخر کار مین نے یہ فیصلہ کیا کہ آنکھ بند کرکے بیٹھ جاؤ اور پھر آنکھ کھولنے کے بعد جو شخص سب سے پہلے نظر آجائے اس کا نمونہ طیار کرو - ہرچند میرا یہ فیصلہ درست نہ تھا کیونکہ جس وقت مین نے اسپر عمل کرکے اپنے آپ کو انسان بنایا اور سڑک پر نکلا تو کسی نے پشت سے آواز دی کہ "جالب صاحب، جالب صاحب" اور اب مین سمجھا کہ کسی دوسرے کی صورت بننا بہت ذمہ داری کا کام ہے اس لئے مین گھبرا کر ایک گلی مین ہوگیا اور خود ہی اپنی ذہانت سے کام لیکر دوسری فرضی صورت اختیار کرکے یہان بیٹھا ہی تھا کہ آپ حضرات تشریف لے آئے"

مین نے یہ گفتگو صرف اس لئے کی تھی کہ تمام منازل تکلف دفعۃً دُور ہوجائین اور مین جلد سے جلد ان کی آزاد صحبت و گفتگو مین شریک ہوسکون - چنانچہ مین اس مین کامیاب ہوا اور اسی وقت شام کو ان مین سے ایک صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے اور دیر تک ان سے گفتگو ہونے کے بعد یہان کے شعراء سے ملنے کا پروگرام مین نے طیار کیا -

(باقی)

اظہارِ تمنّا

(ایک افسانہ)

ولنگٹن، پطرووچ پریدرکن نے، جو ایک قبول صورت نوجوان تھا، شام کا لباس پہنکر، اپنے نفیس، نوکدار جوتے پہنے اور طرحدار، شاعرانہ ٹوپی سے آراستہ ہوکر، بدقتِ تمام اپنے جذبات کو قابو مین رکھتے ہوئے، شہزادی ویرا ژیکانا کے گھر کا راستہ لیا

ناظرین! اگر آپ شہزادی ویرا کو نہین جانتے تو بڑے افسوس کی بات ہے ——— اُس لبریز لطافت، اور سحر طرازی کو جو نیلین آنکھون اور ریشمین زلفون کی مالک ہے سمندر کی موجین ساحل سے ٹکرا کر پلٹ جاتی ہین لیکن اُسکی زلفون کی موجین، سخت سے سخت تھر کو پانی کر دیتین. اُسکے دلآویز تبسم، اور چھوٹے، خندان چہرے کے حسن سے متاثر ہوکر بے قابو نہ ہونا، مردہ دلی، اور بے حسی کی نشانی ہے جو اسکو بات کرتے، ہنستے، اور اُسکے سفید دانتوں کو چمکتے دیکھ کر اپنے آپکو فلکِ ہفتمین تصور نہ کرے وہ ایک مجسمہ چینی ہے اور بس

وہ شہزادی کے مقابل بیٹھا، اور جذبات سے بے قابو ہو کر کہنے لگا ——— "شہزادی! کیا تم میری گفتگو سننا گوارا کرو گی؟" "ہان ہان!"

"شہزادی ——— معاف کرنا سمجھ مین نہین آتا، کیونکر ابتدا کرون ——— تمھین اچنبھا ہوگا............ اِس طرح دفعتاً.......

...... خفا تو نہ ہو گی؟" ——— اُس نے اپنی جیب سے رومال نکالا، ورنہ پونچھا. شہزادی مسکرا رہی تھی، اور مستفسر نظرون سے اُسکی طرف دیکھ رہی تھی

"شہزادی" اُسنے سلسلۂ سخن جاری رکھا "جب سے مین نے تمکو پہلی بار دیکھا، میری روح ایک غیر مفتوح تمنّا کا شکار ہے.........

یہ تمنّا مجھے رات دن چین نہین لینے دیتی............ اور اگر یہ پوری نہ ہو تو مجھے........ مجھے سخت تکلیف ہوگی"

شہزادی نے متفکرانہ انداز سے آنکھین نیچی کر لین

"تمکو فی الحقیقت تعجب ہوگا....... شہزادی، تم مادی اشیا سے بہت بلند ہو لیکن....... میرے لئے تم بہت مناسب......" خاموشی

"خصوصاً اِس وجہ سے کہ میری جائداد تمھاری زمین سے متّصل ہے........ مین بھی کافی دولتمند ہون اور......"

"مگر یہ سب کس لئے؟" شہزادی نے آہستگی سے سوال کیا

"یہ سب اِس لئے ہے، شہزادی" پریدرکن نے بے قابو ہوکر اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "مین التجا کرتا ہون کہ انکار نہ کرنا.....

..... اپنے انکار سے میری تمام تدابیر پر پانی نہ پھیر دینا......... عزیزِ من! مین صرف یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہون کہ........"

ولنگٹن پطرووچ پھر جلدی سے بیٹھ گیا- اور شاہزادی کی طرف جھک کر سرگوشی کرنے لگا

"صرف یہ تجویز........ تجویز بہت نافع ہے کہ. ہم کو اپنی ملحقہ زمینون مین، اون کی ایک باقاعدہ، مشترکہ محدود کمپنی قائم کرنا چاہئے......... اس طرح ہم سال بھر مین ایک لاکھ گٹھے اون کے بہ آسانی بیچ سکین گے....... ہے نا؟"

شہزادی نے لمحہ بھر سوچ کر جواب دیا........ "بالکل ٹھیک بات ہے. اور مین اسپر راضی ہون"

عزیز احمد

باب الاستفسار

کس زبان کی شاعری ہے

جناب محمد سجاد صاحب - امیراکدل - سرینگر

یہان کشمیر مین ایک نہایت ہی معمر شخص ہین جو ہین تو ایرانی النسل لیکن اب ایک زمانہ سے یہین رہتے ہین اور مصاحبانہ خوش باش زندگی بسر کرتے ہین - ان کو فارسی، کشمیری، عربی زبان کے ہزارون شعر یاد ہین اور جس وقت وہ اپنے ترنگ مین ہوتے ہین تو ان کو ایک خاص لحن سے پڑھا کرتے ہین، بعض مرتبہ وہ ایسے شعر پڑھتے ہین جو بظاہر فارسی کے معلوم ہوتے ہین لیکن انکا مفہوم کچھ نہین ہوتا - ان سے پوچھئے تو ہنسنے لگتے ہین اور کوئی جواب نہین دیتے - منجملہ اُن کے ایک شعر یہ بھی ہے

جو از عمت بدر مرا ہرخ کہ شو مرا یک شو بیا بردم تا بینیم چتو مرا

کیا آپ بتا سکتے ہین کہ یہ کیا بلا ہے ؟

نگار :- آپ کے معمر دوست سبزواری معلوم ہوتے ہین یا یہ کہ انھون نے اس زبان کا مطالعہ کرکے اس زبان کے اشعار یاد کر لئے ہین - رایل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل مین مسٹر آدنو نے اپنی تفتیش و تحقیق کی بنا پر ایک مقالہ سبزواری زبان کی شاعری پر کئی سال ہوئے شایع کرایا تھا اور اس مین سبزوار کی دہقانی زبان کی شاعری پر بھی بحث کی تھی - اس سلسلہ مین انھون نے نیتر اور فیاض دو سبزواری شاعرون کا نمونۂ کلام بھی دیا تھا - آپ کے دوست کا یہ شعر فیاض سبزواری کا کلام ہے اور انتخاب مین درج ہے

پروفیسر براؤن نے بھی ایک درجن سے زیادہ ایسے ایرانی شاعرون کا نمونۂ کلام دیا ہے جو نیچے طبقہ کی دہقانی و مختص المقام زبان مین شاعری کرتے تھے - اسی طرح بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ مین ہفت اقلیم مین امین رازی نے اور ریاض الشعراء مین والہ داغستانی نے بعض ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے - انھین مین سے ایک ایک دانی بھی تھا - دانہ ایک گانون ہے نیشاپور کے قریب یہین کا رہنے والا تھا اور کاشتکاری کا پیشہ کرتا تھا لیکن اس پیشہ کو چھوڑ کر اسنے شاعری اختیار کی اور عہد اکبری مین ہندوستان آیا - امین رازی اور بدایونی نے عہد اکبری کے شعراء مین اس کا بھی ذکر کیا اور نمونۂ کلام دیا ہے - اس کے بعض اشعار (جنھین مشکل سے شعر کہا جا سکتا ہے) اکبر کی مدح کے یہ ہین اور مسٹر آدنو نے بھی انھین ان تذکرون سے نقل کیا ہے

قلم آنشوخ خرد کک مکنہ جان فدائش کہ خوش ملک مکنہ
شہ جلال الدین محمد غازی کہ دعائش بر فلک ملک مکنہ

صلۂ شعر شاعران گذر　　　یک لک و دو لک و سہ لک مکنہ
مجہ تا لم ز احمد و محمود　　　ہر چہ مکنہ بمن فلک مکنہ

(خردلک - خُرد کی تصغیر مکرر ہے۔ یعنی بہت ہی چھوٹا۔ مکنہ = میکنند۔ گذر = دگر۔ مجہ = من چہ

مسٹر اوانو نے لکھا ہے کہ ایک شاعر اور حُسینا تھا جو خالص دہقانی زبان مین شعر کہتا تھا۔ اس کی رباعیان اضلاع سبزوار نیشاپور اور ترشیز وغیرہ مین اب بھی گائی جاتی ہین۔ اسی طرح ایک شخص ملا صبوحی برجندی تھا جو اب سے ایک صدی قبل پایا جاتا تھا۔ ایران کے اور صوبون مین بھی اس قسم کے شاعر پائے جاتے تھے۔ دالہ داغستانی نے ان مین سے عبدالحیٔ اصفہانی کا ذکر کیا ہے اور ایک دوسرے شاعر لطیف کا۔ لطیف اچھا شاعر تھا لیکن چونکہ جاہل تھا، اس لئے وہ مخفف محاورات بھی استعمال کر جاتا تھا اور وزن و تقطیع کا بھی لحاظ نہ رکھتا تھا۔ ایک اور طہرانی شاعر ملا سحری تھا جو طہران کی بازاری زبان مین شعر کہتا تھا۔ یہ تینون سترھوین صدی عیسوی کے اخیر مین پائے جاتے تھے

اصفہان کے ایک اور شاعر درویش عباس المتخلص بہ جزی تھا پروفیسر ژکوسکی نے اس کی بعض نظمین مرتب کر کے شایع کی ہین۔ ایران کے جنوبی مغربی حصہ مین فایز، بجمہ، دفتری، محمد تقی خان، حیدر خان اسی رنگ کے شاعر گزرے ہین اور ایزدی و علی اصغر خان نہاوندی کی یاد تو اب تک وہان کے لوگون مین تازہ ہے۔ وسط ایران مین مشہور شاعر یغما جندقی کے علاوہ اس کا ہمعصر و رقیب نعیمہ سمنانی بھی قابل ذکر شاعر تھا۔

مسٹر اوانو نے نیر و فیاض کا نمونۂ کلام دیتے ہوئے لکھا ہے کہ فیاض سبزوار کے قریب ایک گانون مغیثہ کا معمولی زمیندار تھا یہ عمال و امراء عصر کی تعریف مین شعر کہا کرتا تھا۔ نیر کا اتنا حال بھی نہین معلوم ہوسکا۔ فیاض اور نیر دونون معمولی قسم کے شاعر تھے جو دیہ و شہر کے ملی جلی زبان مین شعر کہتے تھے۔ لیکن نیر زیادہ ذہین معلوم ہوتا ہے

آپ نے جو شعر لکھا ہے وہ فیاض کا ہے۔ مین اس کو یہان مکرر درج کر کے اس کی اصلی ہئیت بھی پیش کرتا ہون تاکہ سمجھنے مین مدد ملے

جو از غمت بدرمرہ ہر صح کہ شو مرہ　　(یعنی)　　جان از غمت بدر میرود ہر وقت کہ شب میشود
یک شو بیا بردم تد ببینم چیتو مرہ　　　　یک شب بیا برم تا ببینم چہ طور می شود

اسی غزل کے اور شعر مسٹر اوانو نے یہ درج کئے ہین:-

{ گر بندو زم نگا بگلزار رخسار رش　　　　گر بیند ازم نگاہ بگلزار رخسار ش
{ چو نی طبق زدیک ہی چشموم گلو مرہ　　(یعنی)　　جو نی طبق ز دیک دو چشم گلاب میرود
{ گر پرسمت رقیب بردہ بگو کہ ہو　　　　گر پرسمت رقیب مُرد بگو کہ بلی۔
{ ور گوی کہ نے دلم از قصہ آو مرد　　(یعنی)　　ور گوی کہ نے دلم از غصہ آب میشود

نیر کی شاعری کا بھی نمونہ ملاحظہ فرمایئے:-

به پهلئی رخ یاقیت رنگش رخ سودائی (یعنی) به پهلوئے رُخِ یاقوت رنگش ریخت سودائے
به نزدیک آوجیوتش حیر چه لبه به نزدیک آب حیاتش حور چولای ست

اس غزل میں یہ تین شعر بہت فحش لکھے ہیں:-

بشیخ شیخی نظر کردم میون جفتہ ستش | بدیدوم بلبلیش از خشک تمبوش منویہ
کہ ناگہ ملیم ور جس رفت توقال سیمنیش | چو قوشی کہ زبندش سر دہی رقال بلویہ
کہ ناگہ بیشکا فوم در درش رفت تا نافش | زجا ور جس ور سرزہ کہ کے زیہ دکے گیہ

ان کے معنی اس لئے نہیں لکھتا کہ ان کی عریانیاں عام نہ ہو جائیں

آپ اپنے دوست کو یہ اشعار سنائے ممکن ہے اس کے بعد کچھ اور کلام آپ کو سنائیں اگر ایسا ہو تو میرے پاس یہ تمام اشعار ضبط کرکے بھیجدیجئے

اگر میں مسٹر اوانو کے مضمون کو اس سے قبل نہ دیکھ چکا ہوتا تو میں قطعاً کوئی جواب آپ کے استفسار کا نہ دیسکتا تھا۔ آپ کا استفسار پڑھتے ہی میرے ذہن نے یہ مرتسمات پیش کردئے جو آپ تک پہونچاتا ہوں

نیاز

عملِ کیمیا کا رنگ

کایا پلٹ ہیر آئیل

حیرت انگیز معجزہ

کہنے کو صرف یہ تیل ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہے۔ یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود نباتاتی و کیمیاوی اجزائے سے جدید اصول پر طیار کیا گیا ہے جس کی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانوں نے کی ہے اس کے فوائد کی تفصیل مختصر اشتہار میں ناممکن ہے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ گھر میں اس کی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کر دیتا ہے۔

اگر - سر یا چندیا کے بال گر گئے ہیں یا گر رہے ہیں۔ یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہے

اگر - نزلہ دردسر یا شقیقہ، دوران سر، ضعف دماغ و ضعف بصر، بے خوابی یا نسیان کی شکایت ہے

اگر - سر اور جسم کی پھوڑیاں، پھنسیاں، گرمی دانے، خارش یا دیگر امراض جلدی کا دفع کرنا مقصود ہے

اگر - کنٹھ مالا، سل اور دق وغیرہ سے محفوظ رہنا ہے ——— **تو**

ان سب کا واحد علاج **کایا پلٹ ہیر آئیل ہے**

جو نہ صرف خوشبو بلکہ اپنی مقدار و وزن کے لحاظ سے بھی بازار کے تمام خوشبودار تیلوں سے اچھا اور ارزان ہے۔

ڈاکٹر بیج بہادر سیر والہ آباد سے اپنی تحریر میں تصدیق فرماتے ہیں کہ اس تیل کے فوائد اشتہار کے مطابق پائے گئے ہیں اور مرزا جعفر علی خانصاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی نے دوامی آرڈر ہر ماہ ایک شیشی کا دیدیا ہے۔ اور بھی متعدد سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔

جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضروری ہے
قیمت مع محصول ...... (عہ)

منیجر کایا پلٹ ہیر آئیل - لکھنؤ

الہامِ شعر

جب شب کی سکون پرور تاریکی دنیا پر چھا جاتی ہے
تارون کے فسون موسیقی سے ہوتی ہے، مسحور فضا
خاموش ہوائین، بیخود موجین، صحرا گم، خوابیدہ چمن
غفلت کی پریشان جمعیت ہوتی ہے یہانتک ضبط شکن
ہر چیز رہین خواب گران، ہر سمت سکوت و بیخبری
اس وقت مین اپنی خلوت مین، اک پیکر حسرت ہوتا ہون
کیا تجھکو بتاؤن مین ہمدم، کیا دل پہ گذرتی ہے میرے
سینہ مین تلاطم ہوتا ہے دل کی اُبھر آتی ہین چوٹین
ہر چیز پہ گردو پیش مرے ہوتی ہے خموشی چھائی ہوی
ناگاہ بجھا دیتی ہے اسے بھی موج سبک رفتار صبا
اس تلخ دھندلکے مین کچھ یون دم گھٹنے لگتا ہے میرا
اک چشم زدن مین لیکن پھر اس طرح بدلتا ہے یہ سمان
ہوتا ہے مجھے محسوس کچھ ایسا گویا میرے ہر جانب
ہو جاتی ہین خیرہ میری نگاہین اور اُدھر تاریکی مین
رہتا ہے یہ منظر کچھ لمحے، ایک بار درونِ خلوتِ دل
ہوتا ہے حریم ہوش و خرد پر پردۂ کیفِ بیخبری
کچھ نغمۂ شیرین دھیمے سرون مین جس سے پیہم اُٹھتے مین

سرشار ہوا کی ہر جنبش راحت کے ترانے گاتی ہے
جان بخش مئے آسائش بے تخصیص پلائی جاتی ہے
کچھ غور مین اس دنیا کی ہر شے محو سی پائی جاتی ہے
احساس عمل کی بیداری، خود تاج ظفر پہناتی ہے
اک نقطۂ ساکن پر کھنچکر، بےچین فضا آ جاتی ہے
تصویر نشاط عہد تمنا آنکھون مین پھر جاتی ہے
آلام کی آتش افروزی کن شعلون کو بھڑکاتی ہے
ہر موج صبا اک تازہ پیام حسرت و عبرت لاتی ہے
دھندلی سی فقط اک شمع مری حالت پر اشک بہاتی ہے
مین اور انیس غم میری اب تاریکی رہجاتی ہے
جس طرح سے قید جسم مین روح حیوانی گھبراتی ہے
مین غرق تحیر ہو جاتا ہون جنبش دل تھم جاتی ہے
ہلکی سی نظر افروز تجلی حلقہ کرتی جاتی ہے
یہ موج ضیا بڑھتے بڑھتے تا حد نظر چھا جاتی ہے
خوابیدہ حسین کروٹ لیتی ہین، روح مین قوت آتی ہے
اور پیش نگاہ صرف تحیر، برق ہی اک لہراتی ہے
وہ جن کی لطافت رگ رگ مین اک لہر نئی دوڑاتی ہے

جو مجھکو بتایا جاتا ہے پیغام وہی مین دیتا ہون
سنتا ہون جو کچھ اس عالم مین کاغذ پہ اسے لکھ لیتا ہون

سید علی اختر۔ اختر

مشاہدات

(۱)

حوض مین مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح
کائی مین پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار
حافظے پر یون ہین اک بیدار کن گہری خراش
ڈال دیتی ہے شبِ مہ مین پپیہے کی پکار!

(۲)

مسکرایا خواب مین اس طرح اک طفلِ صبیح
ہو گیا دل دیکھنے والون کا شاد و باغ باغ
اور اس نرمی سے جیسے تبکدے کے طاق مین
جھٹپٹا ہوتے ہی روشن کر دیا جائے چراغ!

(۳)

شاد و فرحان ہین نئے احباب تیرے لطف سے
سرد مہری سے قدیم احباب کا رُخ زرد ہے
یہ تری سیرت ہے ایسے تیز موٹر کی طرح
جسکے آگے روشنی ہے، اور پیچھے گرد ہے!

(۴)

رکھے ہوے سونے کا طبق ناز سے سر پر
کہرے مین نظر آتی ہے یون صبحِ درخشان
ہو جاتی ہے جس طرح کہ انسان کی شرافت
ہنگامۂ افلاس مین کچھ اور نمایان!

(۵)

سر سے نزدیک ہو کے اک طائر
یون اُڑا صبح نیند جیسے آئے
نصف لمحے کے واسطے مجھکو
نغمے اس طرح شہپرون کے سنائے
ذہن سے جس طرح کہ بات کوئی
یاد آتے ہی محو ہو جائے!

(۶)

شب کو اکثر کھلی تاریکیان میدان کی
روح پر کرتی ہین طاری اس طرح خوابِ گران
دل سمجھتا ہے کہ ہے غم کی گھٹا چھائی ہوی
جس طرح کہرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گمان!

(۷)

خاکِ گلشن پہ دُھندلکے کی المناکی مین
یون ہین پامال شگوفون پہ نقوشِ بیداد
عید کے چاند کی ہلکی سی چمک سی جس طرح
دل مین معصوم یتیمون کے ہو مان باپ کی یاد!

(۸)

سب سے پہلے عشق کی شب مین دلِ عشاق کو
چٹکیون مین یون مسلتا ہے خیالِ روئے یار
صبح کچی نیند سے جس طرح چونک اُٹھنے کے بعد
کمسنی کی بھول سی آنکھون مین چبھتا ہے خمار!

(۹)

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث
تری "نگاہ" ہے "یادہ" خیالِ دل افروز"
بدل رہا ہے جو پہلو ضمیرِ شاعر مین
اور آب و تاب سے موزون نہین ہوا ہے ہنوز!

(۱۰)

کیا بتاؤن کہ وہ دمِ گلگشت
کس طرح سے قدم اُٹھاتی ہے
جیسے کلیون پہ رشحۂ شبنم
جیسے آنکھون مین نیند آتی ہے

جوش

حجابات

عصمتِ جذبۂ تقدیس کی تصویر ہون مین
عشق اک خواب ہے - اور خواب کی تعبیر ہون مین
مست ہو جاؤن تو تقدیر ہے پابند مری
ہوش مین آؤن - تو وابستۂ تقدیر ہون مین
خلشِ عشق کبھی دل سے یہ کہ اٹھتی ہے
تو مجھے درد سمجھتا ہے مگر تیر ہون مین
عیشِ امروز ہے پیغامبرِ آزادی
غمِ فردا کا اشارہ ہے کہ زنجیر ہون مین
یہ محبت کی لطافت ہے تو شاید اک دن!
مری تصویر ہو تو - اور تری تصویر ہون مین
حسن اور عشق نے ترتیب دیا تھا جس کو
اسی "افسانۂ معصوم" کی تفسیر ہون مین
یون تو دل - تیری محبت مین رہا ہے معصوم
تو اگر چاہے تو ہان --- قابلِ تعزیر ہون مین
ابتدا تھی مری تخلیقِ نظامِ ہستی
انتہا میری کہ شرمندۂ تدبیر ہون مین
صبر آجائے مجھے بے اثری پر اپنی!
اے خداوند! نہ منت کشِ تاثیر ہون مین
اے روش! "جلوہ گہ حسن" ہے دنیا میری
میری قسمت کہ "محبت کا جہانگیر" ہون مین

روش صدیقی

شالامار باغ

جسے خواہش ہو بزم عشق کے آثار کو دیکھے
یہان کشمیر مین آکر وہ شالامار کو دیکھے

چمن مین ساغر گل سے مئے عشرت چھلکتی ہے
جدھر جاؤ اسی جانب کلی دل کی مہکتی ہے

خوشی کا دور ہے مسرور ہین سب صحن گلشن مین
طرب کی روح پھیلی ہے ہر اک دل کے نشیمن مین

نہ ہون کیون روح کے سادہ ورق رنگین ہونے کو
کہ آمادہ ہے دل اب داغِ ناکامی کے دھونے کو

عیان حسن مجازی ہے یہان وحدت سے کثرت مین
ہزارون حسن کے جلوے ہین رقصان بزم الفت مین

نئے انداز سے چلنا روش پر مہ جبینون کا
گلون کے بیچ مین مستانہ وہ اٹھکھیلیان کرنا

مہک وہ بھینی بھینی اور وہ منظر خیابان کا
وہ ٹھنڈی چاندنی راتون مین اک عالم گلستان کا

چمن کے سینۂ رنگین سے بوئے یاسمن نکلی
نقاب اُلٹے ہوے گویا کوئی تازہ دلھن نکلی

جو سر سے کوہ کے وہ برف رہ رہ کر پگھلتی ہے
وہی آغوش مین گلشن کے آ کر مچلتی ہے

دکھائی ہے نئی ترکیب صناعون نے پانی کی
عجب ترتیب ہے کچھ آبشارون کی روانی کی

کسی مین شکل بنتی ہے گھنے پھولون کے چادر کی
کنارے پر دُورویہ بیلین بنتی ہین برابر کی

کسی کے چہرے پر زرتار ساری بنتی جاتی ہے
ہر اک پہلو مین پھولون کی کیاری بنتی جاتی ہے

چمن کے وسط مین اک خوشنما رنگین عمارت ہے
اور اسکے پاس چارون سمت فوارون کی کثرت ہے

اکھٹے تین سو اسی کبھی جب رقص کرتے ہین
جدھر دیکھو اسی جانب ہزارون گل بکھرتے ہین

اُسی کے آگے ہی اک خوشنما دیوار اُٹھی ہے
جو اُونچی چار گز ہے۔ اور صدہا گز وہ لمبی ہے

چڑھی ہین اُس پہ دُورویہ کئی بیلین برابر سے
ڈھکی ہے سر سے پاؤن تک گھنے پھولون کی چادر سے

جدھر دیکھو اسی جانب برابر پھول پھولے ہین
جڑون سے پتیون تک ہر جگہ پر پھول پھولے ہین

ہویدا اصناف ہر سو ہے ہر اک کی چشم حیران سے
ہزارون پھول کھنچ کر آگئے صدہا گلستان سے

عُروسِ نو سنوارا ہو جسے قدرت کے ہاتھون نے
جسے آغوش مین پالا جہان کی ٹھنڈی راتون نے

بیان ہو کس طرح سے اسکے چہرے کی صباحت کا
ملا ہو حسن کی دیوی نے جب غازہ ملاحت کا

مہک دوشیزگیِ گلشنِ فطرت کی پھیلی تھی
فضا وہ تھی کہ میری رُوح تک پرواز کرتی تھی

محمود الہ آبادی

یادِ محبوب

شاہدِ دوراں کی زلفِ عنبریں برہم سی ہے — چاک ہے گل کا گریبان چشمِ شبنم نم سی ہے
کشتئ امید کچھ ساحل سے نامحرم سی ہے — جنبش امواج مین اک شورشِ پیہم سی ہے

اضطراب دل مرا ہنگامہ در آغوش ہے
ضبط کہتے ہین جسے اک نالۂ خاموش ہے

شانہ سینہ چاک ہے زلفِ معنبر کے لئے — آئینہ حیرت مین ہے اِک روئے انور کے لئے
پس گیا سرمہ کسی چشم فسون گر کے لئے — ہاتھ ملتی ہے حنا پا بوسِ دلبر کے لئے

جس کو شانہ کی ضرورت تھی وہ گیسو ہی نہین
سرمہ کیسا اب وہ چشم رشکِ آہو ہی نہین

بار تھا طبعِ سبک پر گیسوئے پرفن کا بوجھ — اُٹھ نہ سکتا تھا کمر سے جنبشِ دامن کا بوجھ
اف وہ نازک جسم اور خاکِ سرِ مدفن کا بوجھ — وائے قسمت بوجھ اور وہ بھی ہزارون من کا بوجھ

زیب جس کے جسم پر دیتا تھا رنگین پیرہن
آج سر سے پاؤن تک پہنے ہے اِک سادہ کفن

اب وہ آنکھین بند ہین سوتی تھین جن مین بجلیان — ہین وہ لب پژمردہ جن پر کھیلتی تھین شوخیان
کل کھلی تھی جو کلی وہ ہو گئی نذرِ خزان — ہائے رنگ بوستان لے وائے رنگ بوستان

اڑ گئی یک لخت رنگینی جو رخسارون مین تھی
پڑ گئے سرد آتش افروزی جن انگارون مین تھی

ثاقب جالندھری

غزلیات

اثر رحمانی رام پوری

دل کا مقابلہ ہی کیا تیرِ نگاہِ ناز سے
کیسے بچاتے ہم اسے عشق کے ترکتاز سے

قابلِ احترام ہے ہمتِ اہلِ عشق بھی
گھس گیا سنگِ آستان ناصیۂ نیاز سے

اتنے حواس تھے کہ مین خود تو وہان سے آسکا
دل کو مگر نہ لا سکا اُن کے حریم ناز سے

غیرتِ عشق کے سبب آگے نہ بڑھ سکا قدم
بچ کے زرا چلا تھا مین جادۂ امتیاز سے

افسر صدیقی امروہوی

شمع کے زیرِ قدم لاش ہے پروانے کی
انتہا خوب ہوئی عشق کے افسانے کی

کوہ و صحرا نے دیا نعرۂ وحشت کا جواب
گئین خالی نہ صدائین ترے دیوانے کی

اے جنون کون سے عالم مین گنون آپکو مین
نام گھر کا ہے مگر شکل ہے ویرانے کی

صُوَرِ عالمِ فانی کو نہ دے دل مین جگہ
دیکھ پڑ جائیگی بنیاد صنم خانے کی

عالم ہوش مین آجاؤن اگر مین افسر
جوشِ وحشت کی قضا موت ہے ویرانے کی

عشق رامپوری

غلط کہ الفتِ بیداد گر نہین ہے مجھے
مگر یہ بھی کہ اپنی خبر نہین ہے مجھے

کسی کی دید کا خواہان ہون کیا قیامت ہے
یہ جانتا ہون کہ تاب نظر نہین ہے مجھے

تمھارے ظلم سے تعبیر لطف کرتا ہون
یہ اور کیا ہے محبت اگر نہین ہے مجھے

نہ پوچھ دل کی مصیبت کا حال کچھ مجھسے
یہی خبر ہے کہ کچھ بھی خبر نہین ہے مجھے

وفائے عہد و قول و قسم غلط نہ سہی
سکون قلب میسر مگر نہین ہے مجھے

فراق گورکھپوری

قتل یون ہونے محبت کے گنہگار آئے … ہین یہ تیور کہ انھین نیند سے دار آئے

ہین یہی اے نگہ ناز ترے قدر شناس … بید لون پر تجھے اللہ کرے پیار آئے

بادِ صرصر بھی تھمی آبلہ پا بھی ٹھہرے … دشت غربت مین نظر شام کے آثار آئے

یا تو یہ ہو کہ مین اُس شوخ کو دیکھون ہی نہین … یا جو دیکھون بھی تو اتنا نہ مجھے پیار آئے

اے فراق آؤ کرین کھوئے ہوئے دل کی تلاش … بعد مدت کے سرِ کوچۂ دلدار آئے

ناطق جیلانی

جنھین ذوقِ شورِ وجود تھا وہ اسی ہوس مین فنا ہوئے … جو اُٹھے تو اُٹھ کے کہین نہ تھے یہ ہوا کہ بانگِ درا ہوئے

جو تمھین ادھر ہو تمھین اُدھر تو کہان گئے مرے ہم نظر … دمِ جلوہ تمنے یہ کیا کیا وہ جو دیکھتے تھے وہ کیا ہوئے

یہ بنائے دیر نگاہ کر یہ نہین حقیقتِ بندگی … جو بیانِ اہل مجاز ہے تو ہمین بتون کے خدا ہوئے

یہ مآلِ اہل حسد ہوا کہ وبال جان ہوئی زندگی … یہ حریف ایسے تھے نا سزا کہ جو آپ اپنی سزا ہوئے

ہمین ہمسفر سے خلش رہی یہ رہِ طلب کی روش رہی … نہ کسی کو راہ نما کیا نہ کسی کے راہ نما ہوئے

یہ نمازِ اہل نیاز ہے کہ کبھی پڑھین نہ قضا کرین … انھین فکرِ قیدِ رسوم کیا جو بذوقِ ناز فنا ہوئے

وہ ہمارے گھر جو نہ آئین گے تو ابوالحسن ہمین جائین گے … کوئی ہم تو اُن سے خفا نہین وہ ہوا کرین جو خفا ہوئے

طرزِ زندگی

مصنفہ سید محمد نسیم نہٹوری مدیر کہکشاں

اپنی خوبیوں کے لحاظ سے عدیم النظیر تصنیف

یہ کتاب نصیحت اور عبرت کا مرقع ہے۔ اور پھر خوبی یہ کہ ایک بار پڑھ کر آپ مکرر و سکرر پڑھنے کے لئے مجبور ہون گے۔ زن و شوہر کے تعلقات خوشگوار رہنے کے اصول نہایت ہی سادہ پیرایہ مین اس عنوان سے بیان کئے گئے ہین کہ دل پر نقش ہو جاتے ہین۔

یہ تصنیف عورتون مردون اور بچون کے لئے یکسان مفید ہے۔ پہلے اڈیشن کا اختتام ہو رہا ہے آپ آج ہی اپنی فرمائش روانہ کر دین۔ قیمت - - - - - - - - - - عمر

منیجر نگار لکھنؤ

ثاقب جالندھری

یہ پست و بلندِ عالم ہے یہ نازو نیازِ ہستی ہے
لوگ اس کو بلندی سمجھے ہین جو حق مین ہمارے پستی ہے

بس ٹوٹ گیا بس ٹوٹ گیا ہر تارِ نفس مین ساز جو تھا
اب کس کو سناتے نغمہ ہو اب کونسی ایسی ہستی ہے

ہم عشق کرین وہ ہم سے کھنچین یہ دہر مین ہوتا آیا ہے
آباد انہی دو چیزون سے تو عالم کی یہ بستی ہے

آباد کبھی وہ دل بھی تھا برباد جسے اب دیکھتے ہو
سنسان نظر جو آتی ہے وہ ایک پرانی بستی ہے

ہے حسنِ ازل ہر ایک جگہ خالی نہین اس سے کوئی فضا
کیون دیر و حرم کے گوشون تک محدود تلاشِ ہستی ہے

جرعاتِ محبت پیتے ہی ثاقب یہ ہمارا عالم ہے
ہر وقت ہے پیشِ چشم کوئی آنکھون مین ہمیشہ مستی ہے

نوٹس

ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے مطبوعات

ازمنۂ وسطیٰ مین ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات ———
از علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ ایم۔ سی۔ جی۔ ای ———

مجلد	عہ
غیر مجلد	عہ

زیر طبع

(۱) مغلون سے پہلے عرب و ہندوستان کے تعلقات۔ (از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانون کے تمدن پر ہندوؤن کا اثر۔ (از مولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنۂ وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن۔ (از رائے بہادر مہامہوپادھیا گوری شنکر ہیراچند صاحب اوجھا)

(۴) ہندی شاعری۔ (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سکریٹری ہندوستانی اکاڈمی۔ الہ آباد

معلومات

سرزمین عجائبات

دنیا مین چار نزہت گاہین سب سے زیادہ مشہور ہین۔ شعب بوّان صغد ثمرقند، نہر اُبلہ، اور غوطۂ دمشق۔ مگر یہ کل دلکش مقامات بطور "سینی ٹوریم" (تفریح گاہ) کے ہین ان مین بجز سبزۂ زار، آب روان اور میوہ دار درختون کے کوئی عجیب وغریب بات نہین۔ ذیل مین ہم ایک ایسے عجیب وغریب خطہ کا ذکر کرتے ہین جو اپنے محیّر القول عجائبات کے باعث (Wonder Land) مشہور ہے

دی یلو اسٹون پارک (The Yellow Stone Park) (اس مقام کا نام ہے) یہ پہلے ریاست ڈیومینگ کے قبضہ مین تھا۔ مگر ۱۸۷۲ء سے امریکہ کے قبضہ مین آگیا ہے یہ پارک عام تفریح گاہ کے طور پر استعمال نہین کیا جاتا نہ اس پارک سے وہ پرلطف باغ مراد ہین جو شہرون مین ہوتے ہین۔ اسکا کل رقبہ ۳۳۰۰ مربع میل ہے اور غالباً دنیا مین کوئی اسقدر مختصر خطہ اتنے زیادہ عجائبات کا حامل نہوگا

ہم اس مین شمالی راہ سے داخل ہوتے ہین اور تقریباً پانچ میل پہاڑی راستہ کو طے کرکے گرم چشمون کے قریب پہنچتے ہین۔ یہان سے ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہان کا بوقلمون منظر! سبحان اللہ! اس نظارہ کو دیکھکر آنکھین کھلی کی کھلی رہجاتی ہین۔ کٹورے کی طرح تالاب بھرے ہوئے ہین جن پر کہر کا لطیف سائبان ہر وقت معلق رہتا ہے۔ جب ان پر نگاہ گزرتی ہے تو صدہا دلاویز مختلف رنگ نظر آنے لگتے ہین۔ تالاب کے خوشنما کنارون پر گرم گرم پانی کی بلوّرین موجین آکر لگتی ہین تو سفید سفید کف جمع ہوجاتا ہے۔ "سطح آب کا یہ سحرکار منظر ایک قسم کے خوشنما پودون کا رہین منت ہے جو اسکے اندر اُگے ہوئے ہین" ان الفاظ سے رہبر سیاح کی حیرت کو رفع کرتا ہے۔

چشمون سے آگے بڑھکر ایک عجیب سرزمین نظر آتی ہے جسکو (Goblin Land) یا ارض شیاطین کہتے ہین۔ اسکے متعلق روایت ہے کہ پہاڑ کی ایک جانب سے شیطان اور دوسری جانب سے اسکی بیوی کے پھسل پڑنے سے اس مقام کی ایسی ہیئت ہوگئی ہے اور اسی مناسبت سے یہ مشہور ہے۔ واقعی یہ عجیب سرزمین ہے اور پر بلند پہاڑ ہے جس کے دامن مین بڑے گہرے غار ہین۔ گورنمنٹ امریکہ نے ارض شیاطین مین سے سڑک نکالنی چاہی تھی مگر غارون کی وجہ سے کامیابی نہوئی

گرم چشمون سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہم ایک سڑک پر سے گزرتے ہین جو ٹھوس شیشے کی بنی ہوئی ہے اسکے ایک سمت بیور جھیل کا نیلا پانی جھلکتا نظر آتا ہے اور محاذ مین پہاڑی حصار ہے۔ سڑک کے دوسری طرف شیشے کا ایک ٹھوس پہاڑ کھڑا ہے جسکی سیاہ سطح چکنی اور نہایت چمکدار نظر آتی ہے اس پہاڑ کے دامن مین سڑک بنانا بھی بہت دشوار امر تھا کیونکہ سیاہ کانچ کے بڑے بڑے تودے ہر طرف کھڑے تھے جنکو نہ بارود سے اڑایا جاسکتا تھا نہ اوزارون سے توڑا جاسکتا تھا۔ چنانچہ یہ ترکیب کیگئی کہ انکو پہلے خوب گرم کردیا گیا اسکے بعد ان پر پانی ڈالدیا جس سے پاش پاش ہوکر رہگئے

اسکے بعد ہم (Geysers) دیکھنے بڑھتے ہین "جیسر یا گیسر" کی حقیقت سمجھنے کے لئے اسکو "چشمہ آتش فشان" ...

کہنا چاہئے۔ زمین کے اعماق مین پانی جمع ہوجاتا ہے اور وہان حرارت سے بھاپ بنکر نہایت شدت سے اُبل پڑتا ہے۔ "جیسرز" گرم پانی کے بڑے بڑے تالاب ہین۔ جسوقت اُن مین اشتعال آتا ہے تو پانی کے علاوہ کیچڑ تک کا پتہ نہین چلتا۔ یہ کیفیت ہمیشہ نہین رہتی ہے مگر اسکا بھی کسی کو علم نہین کہ کب دفعتہً پانی مین آگ لگ جائے۔ اِن چشمہ ہائے آتش فشان مین (Norris) بڑا ہے جسکا کھولتا ہوا نیلا پانی دور سے نظر آتا ہے۔ اس سے تھوڑی سی دور دوسرا چشمہ ہے جسکا نام (Monarch) ہے جو اِن تمام چشمون کا بادشاہ معلوم دیتا ہے۔ اسکی وسیع سطح گرد و نواح مین خوشنما پہاڑون کا منظر پھر پانی کھولنے کی ترنم ریز آواز۔ بخارات کے لطیف بادل عجیب دلکش سینری پیش کرتے ہین اسکے اشتعال کا بھی کوئی وقت مقرر نہین جب چاہتا ہے اپنے دہانۂ آبی سے آگ اُگل دیتا ہے

یہان سے سیر کرتے ہوئے ہم ایک عجیب دہشتناک مقام پر پہنچتے ہین جسکا نام (Hell) یا سقر ہے واقعی یہ سرزمین نمونۂ سقر ہے۔ یہان کے وحشت خیز مناظر اور بھیانک چیزون کو دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ یہ جن یا شیاطین کا مسکن ہے۔ کہر اور بھاپ کے دل یا دل ہمارے سرون پر معلق ہوجاتے ہین۔ تمام فضا "گوگردی" بُو سے پُر ہے جسمین سانس لینا سخت دشوار ہے۔ دم گھٹنے لگتا ہے اور ضیق کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے پھیپھڑون مین خراش و سوزش ہونے لگتی ہے۔ ہر طرف چھن چھن کی آوازین اس طرح آتی ہین گویا کسی گرم گرم بڑے برتن پر پانی پڑ رہا ہے۔ خود زمین اسقدر گرم رہتی ہے کہ پیر جھُلس جاتے ہین الغرض سقر کی تمام صعوبتین یہان آکر محسوس ہونے لگتی ہین

یہان سے چلکر (Excelsior) کے پاس پہنچتے ہین جو دنیا مین سب سے بڑا چشمۂ آتش فشان ہے۔ وہ عرصہ سے خاموش پڑا ہوا ہے۔ اسوقت اسکے اندر نیلا کھولتا ہوا پانی بھرا ہوا ہے جس کے کنارون پر سفید کف کا حاشیہ بہت بھلا معلوم دیتا ہے۔ اسکے قریب ہی ایک اور چشمہ ہے جسکا نام (Fountain) ہے۔ اسکا پانی اسقدر صاف و شفاف ہے کہ ۱۵-۱۶ فیٹ تک گہرائی مین نظر پہنچ جاتی ہے۔ اسکی تہ مین سے پانی کے بڑے بڑے بلبلے اس طرح سطح پر آکر پھوٹتے ہین گویا دیگ مین پانی کھول رہا ہے

(Morning glory) "یا چشمۂ نور سحر" ان تمام چشمون مین دلفریب ہے۔ پانی کا ایک صاف چشمہ ہے جہان صبح کے آثار اُس کی بلورین لہرون مین جذب ہوکر مختلف رنگون مین رونما ہوتے ہین بوقلمونی رنگ کی آبی تہ، جسمین سے آفتاب کی پہلی شعاع گزر کر سینکڑون قوس و قزح کے مناظر پیدا کردیتی ہے ایسا دلاویز نظارہ ہے کہ طبیعت پھڑک اٹھتی ہے۔ جب سطح ساکن ہوتی ہے تو یہ معلوم دیتا ہے گویا تمام تالاب مین نقرہ یا منجمد پارہ بھرا ہوا ہے! اسکے ساتھ ہی یہ تمام فریب کار منظر، یہ نقرئی سطح نہایت خطرناک بھی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہی کھولتا ہوا پانی اور اُٹھتی ہوئی بھاپ کے گرم گرم بھبکے پھر موجود ہین۔ فطرت کی یہ فریب کاری معصوم جانورون کی جان بھی لے لیتی ہے بھولی بھالی چڑیان، اِس دلفریب منظر کی شیدائی، کلیلین کرتی ہوئی اس گرم چشمے مین غسل کرنے آتی ہین اور مر کر نکلتی ہین۔ کئی آدمی بھی ان چشمون مین گر کر بھُن گئے۔ یہ تمام سرزمین اس قسم کے چشمون سے بھری پڑی ہے، اِن تمام کی سیر کرنے کو ایک عرصہ چاہئے۔ ان مین ([illegible]) بھی بہت مشہور ہے۔ ایک شخص اُسکے اشتعال کا چشم دید

حال ان الفاظ مین بیان کرتا ہے

"جسوقت یہ قریب وہ ساکن سطح دفعتہً متلاطم ہوئی اور ساتھ ہی غضبناک ہوکر پانی اُبلا تو ایسا معلوم دیتا تھا گویا ہزارون جن اور دیو بڑے بڑے برتنون مین پانی بھر بھر کر آسمان کی طرف پھینک رہے ہین۔ پہلے تو ایکدم زمین لرزی اسکے بعد سطح آب سے بلبلے جنمین دھوان اور بھاپ بھری ہوئی تھی اُٹھنے شروع ہوئے پھر ایک مقام پر سے پانی فوارہ کی طرح بہت بلند ہوکر گرنے لگا۔ اسکے بعد تمام آبی وسعت مین سخت تلاطم پیدا ہوگیا اور کھولتا ہوا پانی نہایت غیظ وغضب کے ساتھ آس پاس کی خاموش فضا مین گونج اور شور پیدا کرتا ہوا اڑنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا گرم گرم پانی مین کئی اہرمن تہلکہ مچاتے ہوئے دوڑتے پھر رہے ہین دفعتہً اشتعال بہت شدید ہوگیا اور ایک ایسی سُرعت کے ساتھ کہ میرا خیال بھی اسکے پیچھے رہگیا تمام سطح آب ایکدم بلند ہوئی اور ہوا مین اڑ گئی۔ پانی ہوا مین بلند ہوتا جاتا تھا یہانتک کہ آسمان کے نیچے ایک عظیم الشان دریا بہتا ہوا نظر آرہا تھا۔ گرج اور آواز بدستور ہو رہی تھی بھاپ کے بادل جنگل کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے اور چشمے کی تہ مین سے پھر پانی کی موٹی موٹی دھارین اُبل رہی تھین۔ عجیب سین تھا اسکی خوفناکی لفظون مین بیان ہونا ناقابل بیان ہے"

جب ہم اس خوفناک چشمے سے دور مقام پر کھڑے ہوتے ہین تو وہان بھی پانی کے کھولنے کی صاف آواز آتی ہے اور ہوا کے جھونکون کے ساتھ بھاپ کے بھپکے ہمارے کپڑے اور چہرے کو تر کرتے ہوئے نکل جاتے ہین۔ ان تمام چشمون کو چھوڑ کر اب ہم پھر "یلو سٹون پارک" کے دوسری طرف آتے ہین۔ اس جگہ ایک آبشار نظر آتا ہے جو (مموضہ ۸۷) نیاگرا کے آبشار سے بلند ہے۔ آفتاب غروب ہوتے وقت یہانکا منظر قابل دید ہوتا ہے۔ پانی کی چادر پر بیشمار قوس قزح نظر آنے لگتے ہین۔ پہاڑی پر سے یہ سمان عجیب و دلکش معلوم دیتا ہے۔ میلون تک آبشار کا شفاف پانی بہتا ہوا چلا گیا ہے یہان تک کہ ایک سبزہ زار کے مخملی پردون مین گم ہو جاتا ہے

اس پارک مین اور بھی بیشمار عجائبات ہین۔ کوہستانی سلسلہ کے درمیان مین بہت سی چمکتی ہوئی چھوٹی جھیلین ہین۔ کئی دلدل ہین جنکے اندر صدیون سے قد آور درخت پتھر کا کوئلہ بنے پڑے ہین۔ کئی سدا بہار دلکش صحرا اور جنگل ہین جنکی بیخزان بہار ہر وقت تھکے ماندے دلونکو بشاش کرنے کو تیار رہتی ہے۔ اس پارک مین ایک عجیب وغریب بات یہ ہے کہ یہ بہت سے جنگلی جانورون کا مسکن بھی ہے۔ یہان شکار کی ممانعت ہے۔ صدہا قسم کی جنگلی بکریان۔ ہرن بھینسے قدرتی سبزہ زار کو روندتے پھرتے ہین۔ وہ انسانون سے نہین ڈرتے کیونکہ انکو معلوم ہے کہ وہ مارے نہین جا سکتے۔ چیتے بھیڑیے ریچھ وغیرہ بھی انسان سے اسقدر مانوس ہو رہے ہین کہ بلا ستائے کسی پر حملہ نہین کرتے۔

الغرض یہ پارک بہشت کا نمونہ ہے اور جہنم کا بھی۔ اگر ایک ایک جگہ کی سیر کی جائے تو بہت وقت کی ضرورت ہے

قیسی

مطبوعات موصولہ

نظم و نثر افسوس ہے کہ نہ مین مطبوعات موصولہ کو اس وقت تک دیکھ سکا اور نہ ان پر تبصرہ کرنے کے لئے اس ماہ مین جگہ نکال سکا۔ غالباً ماہ آیندہ کی اشاعت مین اس کی تلافی ہو سکے۔ لیکن مین ایک کتاب کا ذکر مختصراً اس مہینے مین ضروری سمجھتا ہون اور وہ **تاریخ ادب اردو** ہے

اصل کتاب مسٹر رام بابو سکسینا نے انگریزی مین تحریر کی تھی اور اب اسکو نولکشور پریس نے اُردو زبان مین منتقل کرا کے شایع کیا ہے۔ اس کتاب کے ترجمہ کی خدمت ہمارے فاضل دوست مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے کے سپرد کی گئی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انھون نے اس خوبی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے کہ اگر بجائے مترجم کے ہم انھین مُرتب کہین تو بیجا نہین۔

اصل کتاب مین جہان کہین تسامحُ پایا جاتا تھا اس کو ترجمہ مین دور کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسقدر مزید حواشی و اضافے اس مین کر دیئے گئے ہین کہ اصل کتاب انگریزی سے بہت زیادہ جامع حیثیت اس نے اختیار کر لی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسوقت تک اس موضوع پر کوئی کتاب ایسی بسیط نہین لکھی گئی اور دنیائے ادب کو جناب عسکری صاحب کے ذوق علم کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھون نے ایسی مفید خدمت زبان کی انجام دی۔ اس کتاب کے دو حصہ ہین۔ ایک نثر سے متعلق ہے دوسرا نظم سے۔ متعدد تصاویر بھی دی گئی ہین اور کتابت و طباعت مین بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور تقریباً ..۸ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت للعہ اور ملنے کا پتہ۔ نولکشور پریس لکھنؤ

عود ہندی اور اردوئے معلی کا عطر

یعنی

ادبی خطوط غالب

جنکو

مرزا محمد عسکری صاحب بی اے لکھنوی نے نہایت محنت اور عرقریزی سے کتب مذکورہ بالا سے اخذ کر کے باضافہ ایک بسیط اور مفید مقدمہ اور مرزا غالب کے اکثر مکتوب الیہم کے دلچسپ حالات اور نمونہ کلام کے مرتب کیا ہے

حجم ۳۶۸ صفحات تقطیع ۲۰/۲۲ قیمت مع تصویر غالب ۔ ۔ ۔ ۔ (عہ)

تذکرہ خندہ گل

یا

ظریف شاعرون کا تذکرہ

مکمل ہو کر شایع ہو گیا ہے اور ان حضرات کے نام روانگی ہو چکی ہے جنکی پیشگی رعایتی رقم وصول ہو چکی تھی۔ رعایتی میعاد خریداری چونکہ ختم ہو گئی اسلئے اب جو صاحب طلب کرین گے انسے معہ محصول للعہ لئے جائینگے۔ یہ تذکرہ اُردو زبان مین بالکل نئی چیز ہے جسمین ۳۰ سے زاید ظریف شاعرونکے حالات، انکے لطایف اور کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب تنہائی کی بہترین مونس، غمزدہ دل کیلئے باعث تفریح اور ایک محقق کیلئے نادر خزینہ ہے

حجم معہ فہرست و سرورق ۴۹۲ صفحات

مینجر نگار۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ

بسم اللہ

صفحہ و صفحہ ۲۷ کے اعلانات غور سے پڑھئے

نگار

فہرست مضامین نومبر ۱۹۲۹ء

ملاحظات	۲	آرٹ ۔ اثر لکھنوی	۶۷
مومن و کلام مومن ۔ کیفی چریاکوٹی	۹	باب المراسلۃ والمناظرہ	۷۳
جھوٹ ۔ طالب باغپتی	۳۱	باب الاستفسار	۸۵
تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر ۔ عبدالمالک آروی	۳۲	مرغ شب آہنگ ۔ سید علی اختر، اختر	۸۸
سیاح کی ڈائری	۴۲	اسرار ۔ روش صدیقی	۹۰
حکومت برطانیہ کی وسعت کار از عبدالقیوم رہنما	۵۰	غزلیات	۹۱
ازدواج مکرر	۶۱	معلومات	۹۴

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد (۱٦)	نومبر ۱۹۲۹ء	شمار (۵)

ملاحظات

آہ زعمرے کہ گزشت اینچنین!

چند دن سے میں جس کیفیت میں مبتلا ہوں اس کو اگر کسی ایک فقرہ سے ظاہر کر سکتا ہوں تو عنوان کے مصرعہ کو ملاحظہ فرمائیے ـــ آہ زعمرے کہ گزشت اینچنین!

ماضی کی ہر یاد خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہو حال کی شیرینیوں سے زیادہ پُرکیف ہوتی ہے اور مستقبل کی ہر تمنا خواہ کتنی ہی عسیر الحصول کیوں نہ ہو، حاصلات حاضرہ سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی انسان نام ہے ایک طرف خواہش استرداد کا اس کیلئے جو گزر گیا اور دوسری طرف دست امید بڑھانے کا اس کیلئے جو ہنوز عدم میں ہے۔ پھر چونکہ حیات انسانی کا ہر لمحہ حال ہی ہو کر گزرتا ہے اسلئے اُنکا کارآمد ہونا معلوم! لیکن میری حالت اس سے بالکل علیحدہ ہے، ماضی کے استرداد کی تمنا نہیں اور حال کی کیفیت یہ ہے کہ

برمن آں می رود امروز کہ گوئی فرد است

کہتے ہیں کہ جہل کا علم، علم کی پہلی منزل ہے، لیکن شاید یقین کی نہیں! معلوم نہیں علم کو جہل سمجھنے والے اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کا پیدا ہونا ہی دماغ انسانی کی پہلی بدعت ہے جسے فطرت تو برداشت کر لیتی ہے، لیکن رُوح کی

نزاکت اس کی متحمل نہیں۔ پھر کتنے ہیں جنکی روحیں اس کشمکش کی سوگوار نہیں اور کہاں ہیں وہ نفوس جو احساس کی اس بے اعتدالی سے واشدار نہیں۔ جہل و علم سے زیادہ اہم و ضروری یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا نقص اپنی تکمیل کا طلبگار ہے یا نہیں اور جو امکان کے ذرات کس مرکز کی طرف پہونچنے کے لئے بیتاب ہیں

انسان کا وجود اپنی تخلیق کے لحاظ سے سراپا جستجو ہے، روح خواہ وہ مادہ سے مجرد ہو یا وابستہ یکسر اضطراب تمنا ہے۔ صبح کا جلوۂ زریں، شام کا نقاب رنگیں، آفتاب کی زرپاشیاں، چاند کی نور بیزیاں، شاہد مقصود کے مختلف مظاہر و آثار Phenomena ہیں جو ہمکو عین ذات (Noumenon) کی طرف بلاتے ہیں، خزاں کی سوگواری، بہار کا نشاط، دریا کی روانی، پہاڑ کی استقامت اور ان کو بھی جانے دیجئے، خود مساعی انسانی کے تمام نتائج جو سربفلک عمارتوں، محیر العقول ایجادوں، اور زر و سیم کے انبار کی صورت میں ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہ سب دعوتیں ہیں اصل منزل تک سعی کرنے کی، اُس آغوش رحمت تک پہونچ جانے کی، جس کا نام مذہبی کاروبار والوں نے فردوس رکھا ہے اور میں اس کو "دار الصحو والمنام" کہتا ہوں۔ جہاں روح اپنی جستجو کو ختم کرکے شیریں خواب میں محو ہو جاتی ہے، جہاں تمام تفریقات جسم و رنگ مٹ کر صرف ایک احساس امن و سکون میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

آج علم و حکمت کی ترقیاں اس حد تک پہونچ گئی ہیں کہ زمان و مکان، سمت و جہت کا مفہوم بدلگیا ہے اور تمام محالات، ایک ایک کرکے مکان و توعی کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں، لیکن کیا انسان بایں ہمہ اقتدار و اختیار روح میں کوئی شائبۂ سکون محسوس کرتا ہے؟

آج زر و دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ تمام وہ تمنائیں اور خواہشیں جو انسان کے گوشت و خون سے متعلق ہو سکتی ہیں، "شئے حاصل" کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، لیکن، سوال یہ ہے کہ کیا رُوح کی گرسنگی میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس کیجاتی ہے؟

انسان آگے بڑھ رہا ہے۔ انسانیت پیچھے ہٹ رہی ہے — دماغ ترقی کر رہا ہے — روح تنزل کر رہی ہے — اسوقت کا انسان ایک ایسا مستسقی ہے جس کے سامنے دریا جاری ہے اور وہ خود پانی پینے کیلئے آزاد۔ لیکن اس کی روح جس کیلئے بیتاب ہے اسکا یہ عالم ہے کہ

دہند شوق و دے رخصت نظر نہ دہند

دنیا کے تمام مذاہب اسی "فردوس گم گشتہ" کو ڈھونڈھ نکالنے کے لئے آئے، انبیاء و رُسل، اولیاء و اکابر کی ہستیاں رُوح کی اسی فریاد کی مختلف صورتیں تھیں، جو ابراہیم و اسمٰعیل، سلیمان و داؤد، یوسف و موسیٰ، عیسیٰ و محمد، زردشت و کرشن، بودھ و کنفوشس کے نام سے ظاہر ہوئیں اور آیندہ مختلف ناموں اور صورتوں سے ظاہر ہوتی رہینگی، لیکن ان ہستیوں کے اُٹھ جانے کے بعد انسان نے جو کچھ یاد رکھا وہ صرف یہ تھا کہ فلاں آتش پرست ہے اور فلاں گوسالہ پرست، یہ صلیب کا پرستار ہے اور وہ کعبہ کا، یہ ناقوس پھونکتا ہے اور وہ اذان دیتا ہے، یہ صورت کفر کی ہے اور وہ اسلام کی، حالانکہ یہ تمام تفریقات صوری، یہ جملہ تمیزات ظاہری، نوع انسانی کی اس رُوح کا تجزیہ نہیں کر سکتے جسکا درد و درمان ایک، جس کی راحت و اذیت ایک، جس کا اوج و حضیض ایک اور جس کی فنا و بقا ایک ہے

خدا ایک ہے اور اس کا پیغام بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، وہ پیغام ہمیشہ سے ایک صدق بسیط ایک حقیقت مستدام، ایک صداقت لازوال، ایک قطعیت غیر فانی رہا ہے اور ایسا ہی رہیگا خواہ اسکے پہونچانیوالے کسی ملک و قوم اور کسی رنگ و نسل کے ہوں۔ پھر آج دنیا کی سوگواریوں کا سبب نہ خدا کی دوئی ہے، نہ اسکے پیام کا تنوع، بلکہ صرف یہ جستجو کہ پیامبر کا وطن کہاں تھا، اس کا نام کیا تھا، اسکی صورت کیسی تھی، اس کا ملبوس کس طرح کا تھا اور وہ کیا کھاتا تھا کیا پیتا تھا۔ خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ اپنی روح ہم تک پہونچائے، مگر ہم نے اس کو جسم سمجھکر اپنے حواس کے تلذذ کو اس کے عرفان کا معیار قرار دیا، وہ چاہتا تھا کہ اپنی نکہت سے صرف ہمارے دماغ کو متاثر کرے، لیکن ہم نے پھول کو اصل چیز سمجھکر اس کے رنگ، اس کی صورت سے اپنے ذوق و پسندیدگی کو وابستہ کیا، پھر جب وہ پھول مرجھا کر فنا ہو گیا تو نکہت سے وہ ہلکا سا تعلق بھی جاتا رہا اور ہماری روحیں پھر تڑپنے لگیں

آج دنیا کو امن کی جستجو ہے، سکون کی تلاش ہے، پھول کی چادروں سے چنگاری کی سوزش، زرکار ملبوس سے شعلوں کی تپش اور زر و سیم کے انبار سے آگ کی لپٹ آرہی ہے۔ بنارس کا مرتاض برہمن "قشقہ بر جبین" ہاتھ میں سمرن لئے ہوئے اٹھتا ہے اور کہتا ہے "میرے مندر میں آؤ، صدائے ناقوس سنو اور مورتی کے سامنے جھک جاؤ تاکہ یہ جلن دور ہو"۔ دیوبند اور فرنگی محل کا عبا پوش مولوی، جریب و تسبیح لئے ہوئے رونما ہوتا ہے اور کہتا ہے "میری مسجد میں آؤ، اذان کی آواز سنو، قبلہ کی طرف منہ کرکے سجدہ میں گر جاؤ تاکہ یہ سوزش دفع ہو" ——— ایک راہب کہن سال پیدا ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے "میرے عالیشان کلیسہ میں آؤ۔ گھنٹے کی صدا پر متوجہ ہو، پیمبر مصلوب کی شبیہ سے التجا کرو، تاکہ یہ بے چینی دور ہو"۔ جاتریوں کا گروہ جوق در جوق مندروں سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن اُن کے قشقہ کا صندل بھی خشک نہیں ہو چکتا کہ اُن کے سر جنگ و جدل سے رنگین نظر آنے لگتے ہیں ——— جماعت کی جماعت مسجدوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر ان کی پیشانی سے سجدہ کا نشانِ خاک بھی محو نہیں ہو چکتا کہ ایک دوسرے پر کثافت اچھالتا ہوا نظر آتا ہے ——— گروہ کا گروہ کلیسہ سے باہر آتا ہے اور ابھی عود و عنبر کے بخور کی خوشبو بھی ان کے لباس سے جدا نہیں ہوتی کہ معصیت کی پُر عفونت آغوش اُن کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک رند لاابالی، ایک مرد ژولیدہ مو، جو نہ کبھی کسی مندر میں گیا، نہ مسجد میں نہ جس نے کبھی دیر میں سر جھکایا نہ کلیسہ میں انسانی زندگی کی اس بیچارگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اُس قوت کے سامنے جس کو اس نے ہمیشہ تمام علایق مذاہب و مسالک سے بے نیاز ہو کر پہچانا، متحیرانہ و مستفسرانہ کھڑا ہو جاتا ہے ——— آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا غائب ہو جاتا ہے اور یہ بھی اپنی راہ لے لیتا ہے۔ صبح کو قدسیوں کی جماعت اس کو خاک بسر، گرد آلود حالت میں دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہے کہ یہ کوئی شرابی ہے۔ یقیناً وہ شرابی ہے، وہ مست ہے۔ لیکن اس طرح کہ

مستیش را نبود نغمہ و صہبا ساماں

دوسرا گروہ آتا ہے کہتا ہے کہ یہ تو فاسق و فاجر ہے، ملحد و بیدین ہے۔ بیشک وہ سب کچھ ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ

نازد بکفر خود کہ بہ ایمان برابرست

اسکے مجروح جسم، اسکے داغدار سر و سینہ کو دیکھ کر لوگ نفرت کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں مگر جس وقت وہ بیتاب ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ

در دیست در دلم کہ بدرماں برابر ست

تو اس کا سننے والا کوئی نہیں ہوتا

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ تاثرات کب سے مجھے بیتاب بنائے ہوئے ہیں اور ٹھیک اس وقت جبکہ میں چیخ چیخ اُٹھنے کیلئے مجبور تھا کس کس طرح "تاب گفتگو" مجھ سے چھین لی گئی، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اب "اشارات" کا رُخ بدل گیا ہے، "ایاد ربانی" کچھ اور ہے، ظلمت کی شدت اب اس حد تک پہونچگئی ہے کہ اسکے بعد روشنی کا نمودار ہونا لازم ہے۔ اسلئے مجھے بلا پس و پیش اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہئے کہ وہ جو اپنے کو اکابر دین کہتے ہیں ان کو گروہ طاغوت سمجھو، وہ جو خانقاہوں میں ہاتھوں کو رسم دست بوسی کے لئے پھیلائے ہوئے پڑے ہیں، ان کو دشمن روحانیت جانو، وہ جو اپنے آگے تمھیں جھکنے پر مجبور کرتے ہیں ان کو غول صحرائی سے زیادہ وقعت نہ دو۔ وہ وقت گزر گیا جب خدا، مسجد و مندر میں ملتا تھا، کہ اب نہ وہ مسجد و مندر ہیں نہ وہ مسجد و مندر تک پہونچانے والے۔ اب خدا ملتا ہے، نفس کی آزادی میں، ترک تقلید میں، قلب کے اُس انبساط میں جو صرف اپنے ہی تدبر و تفکر سے حاصل ہوتا ہے اور رُوح کی اُس حریت میں جو اخلاق، صرف اخلاق ہی کی پاکیزگی سے میسر آتی ہے۔ مذاہب کو ترک کرو، کہ اب انسے صرف فساد و "سفک دما" کا کام لیا جاتا ہے، مدعیان مذہب کو ٹھکرا دو، کہ نوع انسانی کی تفریق کا ذمہ دار گروہ تنہا یہی ہے۔ تمام انسان ایک ہیں، اور صرف انسانیت ہی کے رشتہ کو اپنا مذہب قرار دو اگر مذہب کا لفظ تمھارے لئے ضروری ہے۔ ناموں کی تفریق مٹا دو، لباس کی تمیز اُٹھا دو، رنگ و نسل کا امتیاز محو کر دو۔ آسمانی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، مگر اسوقت جب ہماری نگاہوں کے زاویے بدلجائیں۔ پھر اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا میں حقیقی امن و سکون قائم ہو، تمھاری روح کی بے چینیاں دور ہوں تو اپنی نگاہوں کا مرکز ایک ہی قرار دو اور حسب و نسب کے تفاخر، دولت و جاہ کے تفوق، حسن و جمال کی تعلی، اور علم و فضل کے پندار کو یکسر محو کر دو کہ خدا کی بارگاہ میں شریف و رذیل، شاہ و گدا، عالم و جاہل سب ایک ہیں اور وہاں اگر کسی چیز کو امتیاز حاصل ہے تو تمھاری اُس خوئے عجز کو جسنے بندگان خدا میں کبھی تفریق نہیں کی اور سب کو اپنی ہی ہستی کا ایک جزو قرار دیا

میں جیسا کہ میرے ایک عزیز دوست نے اندیشہ ظاہر کیا ہے، مہدویت کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہ میں کبھی نبوت و رسالت کا مدعی ہو سکتا ہوں، کیونکہ نہ اب کسی مہدی کی ضرورت ہے نہ رسول کی لیکن یہ ضرور عرض کرونگا کہ اگر کبھی رات کی تنہائی میں، صبح کی خلوت میں طبیعت سکون کی طرف مایل ہو تو جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو سامنے رکھئے اور پھر مجھ سے نہیں بلکہ

زخود بجوے کہ ماراچہ در دل افتاد ست

دسمبر ۳۸ء کے نگار میں، مینے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو مشورہ دیا تھا کہ سالانہ تقریب میں بجائے مشاعروں کے کوئی اور سنجیدہ و مفید مشغلہ تلاش کرنا چاہئے اور میں نے اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ بزم شعر خوانی کے ساتھ طلبہ کا اسقدر شغف نتیجہ ہے

اُس ادنیٰ قسم کی ذہنیت کا جو موجودہ نصاب تعلیم اور اصول تربیت کے ماتحت اس وقت ہندوستان کی بڑی سی بڑی درس گاہ میں پائی جاتی ہے میں سمجھتا تھا اور غالباً اپنے خلوص نیت کی بنا پر صحیح سمجھتا تھا کہ میرا یہ کہنا کسی کو گراں نہ گزرا ہوگا، لیکن اُسوقت یہ امر میرے ذہن میں بھی نہ آیا کہ ہندوستان کا گروہ شعراء ہنوز جناب احسن مارہروی ایسی ذہنیت رکھنے والے شاعروں سے خالی نہیں ہے جو اپنی اہمیت کو صرف اپنی شاعری ہی سے ثابت کرنا چاہتے ہیں درآنحالیکہ سچ پوچھئے تو وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اسوقت تک جناب احسن کو ایک لمحہ کے لئے بھی صحیح معنی میں شاعر سمجھنے کی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا تھا اور میں ہمیشہ ان کو غیر شاعر ہونے ہی کی حیثیت سے ایک اچھا انسان جانتا تھا، لیکن اب انٹر کالج میگزین کے جون تغایتہ ستمبر نمبر کے ملاحظہ سے (جو غزلوں کے ایک گلدستہ کی صورت میں جناب احسن کے مقالۂ افتتاحیہ کے ساتھ شایع ہوا ہے) ثابت ہوتا ہے کہ اگر انھیں اپنے شاعر نہیں تو کم از کم شاعروں کے نقیب ہونے پر ضرور اصرار ہے اور وہ میرے اُس خیال سے اسقدر برہم ہیں کہ مجھ سے اس کا انتقام لینے کے لئے ان کو ایک سے زاید تیر اپنے ترکش طعن و تشنیع سے نکال کر استعمال کرنا پڑے

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

جناب احسن مارہروی نے میرے مصلح اُردو ہونے کی حقیقت، میری اصابت رائے کی نازش، میری اعلیٰ ذہنیت کی مفروضیت اور "بادہواہی" خیالی رفعت کو بھی بے نقاب کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ لیکن بالکل حسبتہً للہ کیونکہ مبادا طلبہ کی ناتجربہ کار طبیعتیں اس سے مرعوب ہوجاتیں اور وہ شاعری کا مشغلہ ترک کرنے کے بعد فلاح دارین سے محروم ہوجاتے۔ پھر اے میرے محترم بزرگ اور طلبۂ علیگڈھ کے نقطۂ نظر سے، لے آبروئے خلوت والے فخر انجمن، میرے پاس تو کافی الفاظ بھی نہیں کہ آپ کے اس خلوص نیت، اس استاذانہ شفقت وکرم، اس مصلحانہ انداز وشمایل اور اس بزرگانہ حزم وتگہداشت کی داد دے سکوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی جزاء خیر آپ کو داور حشر کی طرف سے نہ ملی تو سب سا پہلا وہ شخص جو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا، استناداً و برہاناً آپ کے اس گلدستہ کو پیش کریگا، وہ میں ہونگا، خواہ وہ کالائے بد کہ کز بجائے آپ کے میرے ہی مُنہ پر کیوں نہ پھینک دیا جائے

سچ ہے اگر کالج کے طلبہ کو شروع ہی سے یہ درس نہ دیا جائے گا کہ محبت کے رموز کیا ہیں، معشوق سے کیونکر باتیں کیجاتی ہیں، ہجر ووصل کے شدایدو لذاید کیا ہیں، تو پھر قیس و فرہاد کی نسل کیونکر قایم رہیگی اور احسن صاحب اپنے "عشق پیرانہ سری" کے جوش مین کس پر یہ غمزۂ محبت صرف کرینگے کہ:-

قسم اپنی، ستم اپنا، مری خواہش، مرا نام   یہی دو چار رہیں باتیں جو انھیں یاد نہیں

مجھے نہیں معلوم کہ وہاں جناب احسن کے سپرد کونسی خدمت ہے، لیکن مین انسے درخواست کرونگا کہ اگر کبھی اس کا موقعہ بات آجائے تو اپنے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے طلبہ کو کم از کم یہ ضرور بتادین کہ آپ کے محبوب نے کیا قسم کھائی تھی جو یاد نہیں رہی اور آپ کی وہ کونسی خواہش تھی جو پوری نہیں کی گئی۔

یہ ہے وہ شاعری جسکو الشعراء تلامیذ الرحمان اور ان من الشعر لحکمتہ وان من البیان لسحرا کی آڑ بگڑ کر جناب احسن

کالج میں رواج دینا چاہتے ہیں۔ ملاغنیمت کا

بمکتب می رود طفل پریزاد　　مبارکباد مرگ نو باستاد

کہنا آجتک بدنام ہے لیکن کس کے منہ میں زبان ہے جو جناب احسن مارہروی سے یہ بازپرس کرے کہ کالج کے حدود میں کمسن طلبہ کے سامنے اپنے محبوب کی قسم اور اپنی خواہش کی داستان دُہرانے کا اُن کو کیا حق حاصل ہے۔ کیا لوگ بچے بچوں کو اسی یقین کے ساتھ وہاں بھیجتے ہیں کہ وہاں کا مہتم مشاعرہ سال میں دو چار مرتبہ ایسے پست و دنی مشاغل ایسے ذلیل درد ی جذبات ضرور ان میں رائج کریگا

میں نے اسی دسمبر ۲۸ء کے رسالہ میں یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ "غریب بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے والے نوجوان (طلبہ) کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا شاعر کسقدر عجیب و غریب چیز ہے اور اس کے اخلاق، نفسیات کے کتنے ناحل شدہ مسایل اپنے اندر پنہان رکھتے ہیں"۔ ہمارے احسن صاحب بانی محفل مشاعرہ علیگڈھ کو یہ فقرہ بھی بہت ناگوار ہوا اور وہ سمجھے کہ شاید میں نے اسی سلسلہ میں ان کے اخلاق پر بھی حملہ کیا ہے۔ حالانکہ جو شخص شوق سندیلوی کی کتاب اصلاح سخن کا مطالعہ کر چکا ہے، وہ جانتا ہے کہ جناب احسن مارہروی کے خطوط (جو اس میں درج ہیں) ایسی معمولی دستاویزی شہادتیں نہیں ہیں، جن کے ہوتے ہوئے مجھے ان کے اخلاق پر روشنی ڈالنے کی یا اُن کو اپنے اخلاق سے روشنی ہٹانے کی جراٗت ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب احسن مارہروی کی یہ عبارت اس شخص کو بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں ڈالدینے والی ہے جو "بکف چراغ دارد" کے نام سے بدنام ہے

رہا مجھے آیندہ مشاعرہ کے لئے "مع ساز و سامان" کے شرکت کی دعوت دینا سو میں ان کے اس نوید کا ہر ممکن احترام ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں کہ اگر علیگڈھ کا ہجوم مشاعرہ، فردوس ہو تو بھی میرا وہاں کیا کام جب آپ ایسے رضواں نے پہلے ہی سے وہاں کی فضا کو داغدار و آلودہ بنا رکھا ہے

معاف فرمائیے میں آپ کی لغزش مستانہ سے اپنے ارتعاش لب ناکام کا تبادلہ کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا

تو و طوبیٰ و ما و قامت دوست　　فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

جناب احسن مارہروی نے یہ بھی مشورہ مخلصانہ دیا ہے کہ جب کبھی میں علیگڈھ آؤں تو خسرو کے یہ دو شعر ضرور سُن لوں کہ

نظم را علمے تصور کن بذات خود تمام　　کان نہ محتاج اصول و صوت خنیا گر بود

در کند مطرب بسے ہاں ہاں و ہوں ہوں سرود　　چون سخن نبود ہمہ بے معنی و ابتر بود

ہر چند میں شاعر نہیں لیکن چونکہ مشورہ صائب ہے اسلئے میں نگار کے ذریعہ سے تمام خنیا گر قسم کے شاعروں کو پہونچائے دیتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ میرا بھی ایک مشورہ احسن صاحب کے حضور میں ہے؛ ور اگر برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ جب وہ طلبہ کو درس شاعری دینے کے بعد فارغ ہو جایا کریں تو سعدی کے یہ دو شعر وہ خود بھی ضرور پڑھ لیا کریں

کریما بہ بخشائے بر حال ما　　کہ ہستم اسیر کمند ہوا

نداریم غیر از تو فریاد رس　　توئی شاعران را خطا بخش و بس

افسوس ہے کہ اس مہینہ مین زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن ماہ آیندہ میں اس گلدستہ کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد بتاؤنگا کہ آپ حدود وکالج مین تلامیذ الرحمان قسم کے شاعر پیدا کررہے ہین یا تبسم الغادن نوعیت کے اور پھر آپ کے " آبگینہ حصار " مین آپ کی "ابلہانہ گریز" کا تماشہ دیکھونگا، مین جانتا ہون کہ یونیورسٹی کے ہر ملازم کو ارباب یونیورسٹی کی نگاہ مین اپنے تئین فرد مفید ثابت کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں اور جناب احسن حقیقتاً اس سے زیادہ کچھ نہین کرسکتے کہ ہر سال مشاعرہ کا ایک لغو وبے معنی ہنگامہ پیدا کرکے اپنے خداوندان رزق کے سامنے اپنے وجود کی اہمیت کو ثابت کرتے رہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اُن کی اس " کارگاہ معاش فریب " کو دنیا کیون برداشت کرے اور اُن کے مصالح ذاتی پر فرزندان ملک کے اخلاق کی قربانی کیون چڑہائی جائے۔ اگر جناب احسن سوائے مشاعرہ سازی کے کسی اور خدمت کے اہل نہیں ہیں، تو اس کے یہ معنی تو نہین ہوسکتے کہ نوخیز طلبہ مین احسن صاحب کی اہلیت کے لحاظ سے مخصوص ذہینت پیدا کیجائے۔ اور اس طرح نسل کی نسل کو تباہ وبرباد کیا جائے

گزشتہ ماہ کے نگار میں بسلسلہ " سیاح کی ڈائری " میرزا مظہر جانجانان کا ایک شعر درج ہوا ہے جس کے پہلے مصرعہ میں بجائے سر کے دل درج ہوگیا ہے۔ اصل مصرعہ یون ہے:۔

سر ازین تیغ بُردن آسان نیست

نیاز

جن حضرات کا چندہ نومبر و دسمبر ۱۹۲۹ء مین ختم ہو رہا ہے

وہ ذہن نشین کرلین کہ آیندہ نگار کی خریداری جاری رکھنے میں اُن کو کتنا فایدہ ہے:۔

(۱) کتاب سائنس کے عجائب ان کو مفت ملیگی

(۲) جنوری ۳۰ء کا رسالہ ۱۶۰ صفحات کا بغیر کسی اضافۂ قیمت کے حاصل ہوسکے گا۔

(۳) بعض ایسے ایسے نادر و دلچسپ مضامین مطالعہ میں آئین گے جو مشکل ہی سے کہین اور نظر آسکتے ہیں

(۴) شہاب کی سرگزشت قیمتی (عہ/)، فراست الید قیمتی عہ/، شاعر کا انجام قیمتی ۱۲/ ار جذبات بھاشہ قیمتی ۱۲/ ار ہر ایک کتاب نصف قیمت میں مل سکے گی۔

) تذکرہ خندۂ گل جس کی قیمت چار روپیہ ہے معہ محصول صرف دو روپیہ میں ملسکیگا۔

نوٹ:۔ جدید خریدار بھی ان تمام رعایتوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہین

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

مومن و کلام مومن

(بسلسلہ سابق)

پیدائش اور خاندان مومن خان ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء مین، محلہ کوچہ چیلان دہلی مین پیدا ہوے، ان کے والد کا نام غلام نبی خان تھا جو مشہور طبیب تھے، حکیم غلام نبی خان کے والد نامدار خان کشمیر کے رہنے والے تھے، قسمت آزمائی کے لئے ترکِ وطن کرکے دہلی آئے یہ زمانہ "شاہ عالم" کی حکومت کا تھا، طالع نے یاوری کی شاہی طبیبون مین داخل ہو گئے خدمات طبابت کے صلے مین بادشاہ کی طرف سے پرگنہ نارنول کے کچھ مواضعات بطور جاگیر عطا ہوے

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خان کو دی تو اس مین پرگنہ نارنول بھی تھا نواب صاحب نے نامدار خان کے ورثا کو ایکہزار روپیہ سالانہ پنشن دی اس مین حکیم مومن خان بھی شامل تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی مومن کو ۲۵ روپیہ ماہوار وظیفہ دیا تھا مومن کے والد حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے معتقد تھے اس لئے جب مومن پیدا ہوے تو شاہ صاحب نے ان کے کانون مین اذان دی، اور "مومن" نام رکھا جو نگین شہرت بنا

تعلیم و تربیت مومن نے اول اول گھر پر تعلیم اور تربیت پائی، اس کے بعد حضرت شاہ عبد القادر اور حضرت شاہ عبد العزیز ایسے جید علماء سے فیض حاصل کیا، درسیات ختم کرکے اپنے خاندان مین طب کی تکمیل کی، وہین عرصہ تک نسخہ نویسی بھی کرتے رہے

علم طب کو شاعری سے براہ راست بظاہر کوئی تعلق اور مناسبت نہین لیکن "مومن" نے ان کو دونون کا ڈانڈا ملادیا ہے اکثر غزلون کے اشعار مین اس کے مسائل اس طرح بیان کئے ہین کہ شعر مین لطف پیدا ہو گیا ہے

جذبات شاعری کے ساتھ علم الابدان، اور تشریح اعضا مزاج انسانی کا پیوند ایسا ملایا ہے کہ ان کی شاعری کے لئے ایک میدان نکل آیا۔

طبابت کے علاوہ نجوم، اور جفر مین بھی ایسی مہارت حاصل کی کہ اس فن کے ماہرین ان کو استاد تسلیم کرتے تھے، شطرنج مین بڑے بڑے شاطر ان کے کمال کے معترف تھے، "مومن" نے ان علوم کو بیکار رہنے نہ دیا بلکہ اپنی شاعری مین اس طرح ممزوج کیا کہ اگر کوئی ماہر چاہے تو ان کی شاعری سے ان علوم کے اکثر مسائل کا پتا لگا سکتا ہے۔ اس کمال اور جدت مین "مومن" نہ صرف اردو شعرا مین یگانہ و یکتا ہین بلکہ فارسی شاعری مین بھی انکی طبیعت کے شاعر مشکل سے ملین گے

لباس اور حلیہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے رسالہ اردو اورنگ آباد مین "۱۲۶۱ھ مین دہلی کا ایک مشاعرہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے اس مین حکیم مومن خان کا حلیہ اور لباس، وجاہت، خوش پوشاکی کا نقشہ

ان الفاظ مین کھینچا ہے

"حکیم مومن خان کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، کشیدہ قامت، سرخ وسفید رنگ تھا جس مین سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھین، لمبی لمبی پلکین، کھینچی ہوی بھوین لمبی ستوان ناک، پتلے پتلے ہونٹھ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت ہلکی ہلکی مونچھین، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ لمبی انگلیان، گھونگروالے بال لمبے لمبے کاکلون کی شکل مین کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھون پر پڑے ہوے، بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا لیکن اس کے نیچے کرتا ندارد، جسم کا کچھ حصّہ انگرکھے کے پردے سے دکھائی دیتا تھا، گلے مین سیاہ رنگ کا فیتہ، اس مین چھوٹا سا سنہرا تعویز، کاکریزی رنگ کے ڈوپٹے کو بن دیکر کمر مین لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونون کونے سامنے پڑے ہوے تھے، ہاتھ مین پتلا سا خار پشت، پاؤن مین سرخ گلبدن کا پاجامہ مہریون سے تنگ اوپر ڈھیلا، پاجامے کا کپڑا ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا، چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئی مین، کبھی لٹکتی رہتی تھین، کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی، اس کے کنارے پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی کہ سر پر منڈھ کر آگئی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصّہ اور بال صاف جھلکتے تھے"

جس زمانے کی یہ وضع اور لباس تھا اسوقت اس مین تکلف اور شوقینی کی انتہا ہو گئی تھی، مومن، کی متانت اور سنجیدگی مزاج، خودداری، تہذیب اس کے گواہ ہین کہ یہ وضع شرفا کی تھی، اب اگر اس وضع مین کوئی شخص رہے تو تماشہ بننے کے علاوہ غنڈون مین شمار ہو، ہر ملک را ہر رسمے کے سوا "ہر قرنے را ہر رنگے" بھی صحیح اور درست ہے

اسی اُردو نے "مومن" کی جو تصویر شایع کی ہے (اور جو نگار مین بھی نکل چکی ہے) اس سے "مومن" کی ذہانت، غور و خوض، فکر اور تعمق کا پورا پتا چلتا ہے، علم الابدان اور علم قیافہ کو جہانتک دخل ہے اس سے واضح ہے کہ مومن کے ایسے حلیہ کا آدمی کبھی معمولی اور عامی نہین ہوتا

حالات وسوانح

"مومن" رنگین مزاج ضرور تھے لیکن اوباش فطرت نہ تھے، طبیعت مین درد، سوز و گداز، عاشقانہ ادائین موجود تھین لیکن غیر محتاط نہ تھے جن تذکرہ نویسون نے ان کی ظاہری شکل وصورت، وضع ولباس پر انکی وارستہ مزاجی، آزادی (بقول بعض) اوباشی قیاس کی ہے وہ مع الفارق ہے یہ ثابت ہے کہ "مومن" نے ابتداے جوانی مین شاہ سید احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور آخر وقت تک اس بیعت کو نبھایا

رسالہ "نگار" جنوری ۲۶ء صفحہ ۱۳ پر یہ عبارت ہے کہ:۔

"مومن کی شاعری پر شاہ سید احمد کی تعلیمات کا اثر تھا"

شاہ سید احمد صوفی اور درویش کامل تھے، ان کی تعلیم مقامات تصوف ہمہ اوست، فنا وبقا، دنیا کا عالم مثال ہونا، وحدت وجود وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے جس کے لوازم طبیعت کا گداز، خودداری، توکل، عاشقانہ رنگ، "آہ سرد و رنگ زرد و چشم تر" ہین

"مومن" کے کلام مین شروع سے اخیر تک تصوف موجود ہے اس کی تفصیل آتی ہے اس جگہ اصولی طور پر ایک امر ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ "عشق مجازی" کے جو لوازم ہین وہ عشق حقیقی کا عکس ہین، اگر مومن کی شاعری اور غزلیات مین عشق، درد، جذبات سوز و گداز موجود ہے تو رموزِ تصوف سے انکار نہین کیا جاسکتا، درآنحالیکہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ "مومن" ایک پیر طریقت کے مرید اور خمخانۂ تصوف کے میکش اور سرشار تھے۔ "مومن" پر جس قسم کے اتہامات لگائے گئے ہین انکی شکل ان الزامات سے ملتی جلتی ہے جو شیخ سعدی، ایسے بزرگ پر تراشے گئے ہین

شیخ سعدی اور مومن

"شیخ سعدی" کے جذبات تغزل کا بعض واقعات رسمی کی بنیاد پر "امرد پرستی" سے منسوب کرنا بالکل بے اصل اور بے حقیقت ہے اس سلسلے مین اس کا اجمالی بیان نامناسب نہ ہوگا

فارسی تغزل کی بنیاد "امرد پرستی" ظاہر کی جاتی ہے شیخ سعدی فارسی "تغزل" کے امام یا موجد تھے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ جدت، اور اس مین رنگِ تغزل کی بلندی بالکل نئی چیز تھی اس لئے شیخ، کا دامن "امرد پرستی" کے واقعات خود ساختہ سے ملوث کیا گیا

یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے لغو الزامات شیخ سعدی کے زمانے مین ایران کے اندر ان کے ہم منزلون اور ہمچیا لون کی طرف سے عائد نہین کئے گئے بلکہ اغیار کی طرف سے ان کے وطن سے باہر ان کے زمانے کے بہت بعد لگائے گئے ہین، اس لئے حقیقت ظاہر ہے

شیخ کے متعلق ایک واقعہ گلستان کی ایک حکایت کے بیان کے مطابق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "انھون نے ایک نوعمر، سبزہ آغاز شخص کے بوسے لئے تھے" استغفر اللہ کجا شیخ سعدی کجا یہ الزام "صورت حقیقت یہ ہے کہ ایران مین یہ رواج پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے کہ رخصت ہونے یا رخصت کرنے کے وقت فریقین ایک دوسرے کے سر اور پیشانی چومتے تھے، کبھی ایک ہی فریق کی طرف سے یہ اظہار گرمجوشی ہوتا تھا اس مین عمر اور قد کی کوئی قید نہین، الزام دینے والون نے صرف اس رسم کو سامنے رکھ کر الزام کا پہاڑ بنا لیا

شیخ سعدی عالم متبحر، متورع، پارسا، ابو الفرح ابن جوزی ایسے سخت متشرع پیر کے مرید تھے جن کے نزدیک "سماع" تک احتیاط کے خلاف تھا شیخ سعدی ان کے پیرو تھے، تہجد گزار، متعدد حج پا پیادہ کئے تھے، ان کے نسبت اس قسم کا خیال صرف راویون کی "اُپج" ہے یا تعصب اس کے سوا کچھ نہین

جذبات تغزل کی بنیاد پر اس الزام کی صورت اس لطیفے سے ملتی جلتی ہے کہ "کسی نے کسی سے پوچھا کہ مجاہد کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جس کے لمبی داڑھی ہو"

"مومن" غریب پر بھی یہ الزام بالکل یہی نوعیت رکھتا ہے" جس طرح شیخ سعدی کی غزلین واقعات امرد پرستی بن گئین اسی طرح مومن کی مثنوی، واسوخت، ان کی آزادی، وراستہ مزاجی اوباشی کا خط و خال بنگئین۔ ان اصناف پر آیندہ گفتگو ہوگی

مومن کی طرف سے جن الزامات کی تردید کی گئی ہے اس پر مزید برہان اور حجت کی ضرورت ہو تو ان کے حالات اور

خصائل پر نظر کیجئے

"مومن" طبعاً نہایت غیور اور خود دار تھے ان کا دوش احسان کے معمولی بوجھ سے بھی کبھی آشنا نہ ہوا قناعت اور توکل انکی گھٹی مین تھے، وطن پرستی ان کے ایمان کا جز تھا انہین وجوہ سے اپنے ہی آستانے پر پڑے رہے دہلی سے باہر کبھی نہیں گئے

راجہ کپور تھلہ نے ان کو دہلی سے طلب کیا ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی، خرچ سفر بھی بھیجا، مومن کو راجہ صاحب کی قدردانی کا پورا علم تھا، جانے پر آمادہ ہو گئے لیکن جب معلوم ہوا کہ ریاست مین ایک گانیوالے کی بھی یہی تنخواہ ہے تو اپنا ارادہ فسخ کردیا

۱۸۴۲ء مین ان کو کالج کی پروفیسری پیش کی گئی اس سے بھی انکار کیا

مومن کے پیر بھائی والئی ٹونک نے ان کو بلانے اور اپنے ساتھ قیام کرنے کی کوشش کی، مگر معذرت کردی ورنہ گئے چار یا پانچ باران کو وطن چھوڑ کر رام پور، بدایون، سہسوان سہارنپور، جہانگیر آباد جانا پڑا اور ان کے مذاق اور طبیعت کے مطابق آرام بھی تھا عزت بھی تھی لیکن قبلۂ وطن دہلی ان کے دل کا ہمیشہ قبلہ نما بنا رہا

"حب الوطن من الایمان" کو اپنے عمل سے صحیح ثابت کردیا، مسٹر رام بابو سکسینہ اس خصوصیت کو اپنے الفاظ مین اس طرح ادا کرتے ہین "انھوں نے پانچ بار دہلی کو چھوڑا، لیکن محبت کی وطن نے ہمیشہ ان کو اپنی طرف کھینچ لیا . . . . راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ دہلی مین رہتے تھے، سخاوت مین مشہور تھے، مومن خان کو قیمتی ہودج کے ساتھ ہتھنی دی، خانصاحب نے اظہار شکریہ مین قصیدہ کہا جسکا مطلع یہ ہے

صبح ہوی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری   کثرت دود سے سیاہ شعلہ شمع خاوری

پورے قصیدے کو دیکھئے اس مین مومن خان کی شان کہین کم نہین ہوی ہے اور ممدوح کو غلط اوصاف سے متصف کرکے، نامناسب اور ناجائز مبالغے سے متہم نہین بنایا ہے

آزاد کی رائے ہے کہ سوا اس قصیدے کے کوئی اور مدح کسی دنیادار کی صلہ کے توقع پر نہین لکھی

"مومن نے اس قصیدے کو قصیدہ کے پورے معیار پر لکھا ہے اس کی تفصیل موقع پر آتی ہے

"مومن" مین خدانے ذہانت اور ذکاوت کے ساتھ غیر معمولی قوتِ حافظہ عطا کی تھی، دنیا مین ایسے لوگ غیر معمولی کہے جاتے ہین جن مین یہ دونون قوتین ہوتی ہین

ان دونون قوتون سے مالامال ہستیون نے جو کچھ کیا ہے وہی "مومن" نے بھی کیا

شیخ ابن سینا نے فلسفہ اور دوسرے علوم کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہی مومن نے، شاعری میں جوہر دکھائے ہیں اگر ان کی شاعری کی حقیقت سمجھی نہ گئی تو مومن کا کیا قصور ہے

"مومن" خود دار ضرور تھے لیکن مغرور و متکبر نہ تھے، وہ کسی کی مدح یا ذم اپنی طبیعت کے خلاف کبھی گوارا نہ کرتے تھے لیکن اظہار حقیقت مین ان کو کبھی عار نہ تھا

جن تذکرہ نویسون نے یہ لکھا ہے کہ "وہ کسی کے کمال کا اعتراف نہ کرتے تھے" مومن پر بہتان اور ان کے وصف "اعتراف حقیقت" کی پردہ پوشی ہے

رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۲۷ء کے صفحہ ۵۹۲ پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون کی یہ عبارت دیکھئے "مومن نے غالب کے متعلق یہ الفاظ کہے ہین

"غالب کے رنگ مین شعر کہنا تو کیا وہ یا ان کے استاد پہلے مرزا نوشہ کے شعرون کو سمجھ تو لین"

یہ الفاظ مومن نے ہدہد الشعرا اور ان کے استاد کے متعلق کہے تھے، "مومن نے پیشہ طبابت پر رزق کا انحصار نہین کیا تو شاعری نجوم، رمل و جفر سے کیا کسب زر کرتے

حاصل کلام یہ ہے کہ "مومن" خود دار، وطن پرست، متوکل، انصاف پسند، ذہین و زکی، قوی الحافظہ، سوز و گداز اور دردِ عشق کی تصویر تھے

خصوصیاتِ کلام

"مومن" کے تمام اصنافِ سخن پر بحث اور تبصرہ کرنے سے پہلے "غزل" پر اظہار خیال ضروری ہے کیونکہ "غزل" ہی کے میدان مین "مومن" آفتاب بنکر چمکے اور اصناف اس آفتاب کی کرنین ہین، مومن اپنے کمال اور خداداد مہارت کے اعتبار سے جو مشہور نہ ہوے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھون نے عام روش سے علیحدہ اپنا راستہ بنا یا تھا اس راستے کو کسی نے "بدعت"، کسی نے "تماشا" کسی نے "چیستان" کسی نے "معما" کہا، حالانکہ وہ اپنی شاعری با لخصوص تغزل کے اعتبار سے جتنی بلندی پر ہین وہان تک نظر پہونچنا بھی مشکل ہے، اس لئے جو لوگ یہ سب کچھ کہتے ہین انکی خطاے نظر ہے "ہسٹری آف اُردو لٹریچر" صفحہ ۱۵۰ مین رام بابو سکسینہ نے بلیغ الفاظ مین "مومن" کے امتیاز کو نمایان کیا ہے لکھتے ہین کہ:-

"مومن اپنے خیالات کی بلندی اور بلند پردازی کی ندرت مین سب سے الگ اور ممتاز نظر آتے ہین، ان کے تشبیہات اور استعارے معمولی سطح سے اسقدر بلند ہین کہ ان کے اشعار ان خصوصیات مین بالکل نمایان ہین

"مومن نے خیالات بلند اور الفاظ شاندار کو اپنی شاعری مین یکجا کر دیا ہے۔ وہ "عاشق تن" شاعر ہین لیکن ان کے عشق کا ذریعہ اظہار غزل ان کے کمالات کی وجہ سے غیر معمولی ہے"

تعجب ہے کہ جس فرض کو مدعیان اُردو تذکرہ نویسون نے ادا نہین کیا اس کو رام بابو نے چند الفاظ مین ادا کر دیا۔ مومن کے اوصافِ شاعری کی تفصیل کیجائے تو بھی الفاظ ہونگے جو رام بابو نے اختیار کئے ہین

یہ کیسی بوالعجبی اور افسوسناک حیرت ہے کہ "مومن" کا کمال بعض غلط بین نگاہون مین عیب اور نقص ہے

مین نے اپنے ماہانہ رسالہ "تعلیم" اور "سحبان" مین ایک لطیفہ درج کیا تھا ایک صاحب ادعا، مدعی سخن فہمی نے

مجھسے بھی شاعرون کے تذکرے پر کہا کہ "مومن" کا کلام بیشتر مہمل ہوتا ہے، مین نے تعجب سے پوچھا کہ کوئی مہمل شعر پڑہیے، حضرت نے یہ شعر پڑہا ؎

کر علاج دردِ وحشت چارہ گر — لادے اک جنگل مجھے بازار سے

مین نے پوچھا اس شعر پر کیا اعتراض ہے؟ جواب ملا کہ جنگل کہین بازار مین ملا کرتا ہے؟

مین نے کہا اس شعر مین "مومن" نے کمال بیان کی قدرت دکھائی ہے، اس شعر مین ایک طرف فصاحت دوسری طرف بلاغت ہے شاعر کہتا ہے کہ جس طرح بازار مین جنگل نہین ملتا (کیونکہ یہ کوئی سودا نہین) اسی طرح دردِ وحشت کا علاج ناممکن ہے طریقۂ بیان نے مضمون کے سونے کو سکہ بنا کر اقلیم سخن مین جاری کیا ہے

اہلِ فن جانتے ہین کہ بلاغت کا یہ انداز "اعجاز" کا مرتبہ رکھتا ہے جو "مومن" کے سوا کسی کو نصیب نہین لفظی شکوہ مین معنوی طلسم کا انتظام جادو بن گیا ہے، اگر مہمل گوئی کا یہی معیار ہے تو "موضوع گوئی" کو کیا کہا جاے۔ اس کی مثال بالکل اس اعتراض سے ملتی جلتی ہے کہ "عربی، فارسی، اُردو اس لئے بہتر زبان نہیں ہیں کہ سیدھی طرف سے لکھی جاتی ہین؟

یوروپ کے ایک فلسفی نے اپنی ایک تقریر میں یہی درفشانی کی تھی جب دعویٰ اور دلیل کی یہ صورتین ہون تو اہلِ تحقیق کو قلم رکھدینے کے سوا چارہ نہین

اس ضمنی بحث کے بعد اصل موضوع سے پہلے حقیقت شعر اور تغزل پر نقد و بحث کی حاجت ہے

ایک شاعر جب شعر کہتا ہے تو فضا، آب وہوا، زمانہ، اپنے علم وفضل، واقعات، وحالات سے متاثر ہوتا ہے، بلکہ یون کہنا چاہئے کہ شاعر کی طبیعت اثرات مذکورہ بالا سے متاثر ہوتی ہے اور شعر اس کی طبیعت کا خاکہ ہوتا ہے دونون بیانون کا حاصل ایک ہے شاعر کا یہ کمال ہے کہ وہ جس قسم کے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی اعتبار سے "الفاظ" "ترکیب" "بندش" کو پیش نظر رکھتا ہے نہ یہ کہ ہر قسم کے خیالات، مسائل فلسفہ وطبعیات، علوم وفنون کو مقررہ زبان یا ترکیب مین ادا کر سکتا ہے، کیونکہ یہ امر بغیر کسی دلیل کے مسلم ہے کہ تمام خیالات ایک زبان اور ایک لہجہ مین ادا نہین ہو سکتے

اصنافِ سخن پر نظر کیجئے قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، واسوخت، ہجو، رباعی، بند علیحدہ علیحدہ اسلوب سے بیان کئے جاتے ہین غور سے دیکھئے تو انکی زبان اور الفاظ مین بھی بیّن فرق ہوتا ہے۔

اس پر یہ دلیل قائم ہوتی ہے کہ "اثر معنی کے تابع ہے، معنی الفاظ کے تابع"

جب مرثیہ کا اثر قصیدے سے علیحدہ تسلیم کیا جا سکتا ہے تو اسی دلیل سے مرثیہ کے الفاظ وطرز ادا کا قصیدے سے علیحدہ ہونا مسلم ہے، ایس جانسن، لائیوز آف دی پوئیٹس مین لکھتے ہین:-

"الفاظ وتراکیب کے اُس انتخاب پر بہت کم توجہ کیجاتی ہے جو نظم کو نثر سے علیحدہ کر دیتے ہیں"
اسی سلسلہ میں آگے لکھتے ہیں:-

نہ تو گل خار سے علحدہ کئے گئے اور نہ مختلف رنگ باہم گر
. . . .
اس طرح ملائے گئے کہ ہر رنگ میں جان پڑ جاتی
. . . .
. . . .
. . . .
. . . .

ای۔ ایس ڈیلاس کی رائے ہے کہ:۔

"الفاظ، خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہین اور ہر فن کے لئے مخصوص زبان ہوتی ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ "اگر داستان غم اور مضمون رنج بیان کرنا ہے تو اسی مناسبت سے الفاظ لانا چاہئے، خوشی اور مسرت کے اظہار مین اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے جائین، یہی شاعر کا کمال ہے، جو شاعر اس اعتبار سے جس قدر کامیاب ہے اسی قدر باکمال سمجھا جاتا ہے

"شکسپیر" اپنے اسی کمال کی وجہ سے مشہور ہے، وہ فطرت نگار" ہے طبائع پر اس کو عبور ہے، جس کا کیریکٹر بیان کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر وہ حالت خود طاری ہو رہی ہے، فارسی مین فردوسی، کا شاہنامہ اُردو مین مراثی انیس و دبیر، اُردو ڈرامون مین آغا حشر کے ڈرامے ان خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہین

خاقانی اور ذوق نے فارسی اور اُردو مین قصیدہ گوئی کا معیار قائم کیا اور اس کے مطابق الفاظ لائے، اس لئے ان کا درجہ بہت بلند ہے عربی مین یہی خصوصیات اس مرتبہ کمال پر پہونچ جاتی ہین کہ بالآخر معجزہ بن جاتی ہین، انسان کو اس کے مثل کہنے کا یارا نہین رہ جاتا ہے۔

اس کا نام قرآن ہے

ہندی (بھاشا) شاعری مین اصطلاح معین کے بموجب، رس، خاص چیز ہے، اس کے اصلی معنی ذائقہ کے ہین، اصطلاح مین اظہار جذبات کا نام ہے،

اس کی نو قسمین ہین

۱۔ شرنگار۔ اس کے ذریعہ سے خواہش نفسانی کا اظہار ہوتا ہے اس کے مطابق الفاظ لاتے ہین

۲۔ ہاسی۔ آواز یا حرکت کی وجہ سے تاثر

۳۔ کرونٹرا۔ ہجو وغیرہ کے جذبات

۴۔ راود۔ غصہ کے جذبات

۵۔ ویررس۔ اس مین خوشی کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے

۶۔ بھیانک رس ۔ خوف کے جذبات ظاہر کئے جاتے ہین
۷۔ وی بھتس ۔ اظہار توہین کے جذبات
۸۔ ادبھت ۔ حیرت اور استعجاب کا اظہار ہوتا ہے
۹۔ شانت ۔ خدا کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجانا یا اس قسم کی تاثیر کا اظہار

ہندی شاعری مین الفاظ، کے اعتبار سے ترنم بھی ہوتا ہے اس ترنم کے لحاظ سے راگ اور راگنی وسیع علم بن گیا ہے جس کا جواب ہندوستان کے باہر نہین ملتا۔

ہندی مین ایک ایک رس کی متعدد قسمین ہین ان سب کو یکجا کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رس کی شاعری نے انسانی جذبات کو کس طرح سمجھا ہے؟

موضوع بحث کو مسلسل کرنے اور ترتیب مقدمات کے بعد نتیجہ نکالنے کے لئے فصاحت اور بلاغت کا ذکر بھی ضروری ہے

یوروپ مین ایسا کریس علم معانی و بیان کا معلم اول ہے اس نے فصاحت کی تعریف ان الفاظ مین کی کہ "وہ فن ترغیب و تحریص ہے"

ابن سنان کے نزدیک فصاحت کا مدار ذیل کے اصولون پر ہے :۔

۱۔ لفظ مانوس ہو، یعنی اہل زبان استعمال کرتے ہون، زبانون پر روان ہو، اسی کی بناوٹ مین کوئی غرابت نہ ہو اوضاع لغوی سے خارج نہ ہو (یعنی دریا کہہ کر پہاڑ، زمین کہکر آسمان مراد نہ لین)۔

۲۔ لفظ آسانی سے زبان پر جاری ہوسکے، سننے مین دلکش ہو

۳۔ بحیثیت استعمال لفظ سہل ہو، اور معنا دل نشین ہو

۴۔ سختی اور نرمی مین حسب موقع کارآمد ہو، غصہ کے موقع پر اظہار غصہ ہوسکے، صبر اور حلم کی جگہ اس کا اظہار ہوتا ہو

معنوی خصوصیات یا مفہوم اور مطلب کا اظہار اس طرح ہو کہ ادراک اور احساس کو اس سے لذت ہو ایک لفظ کثیر معانی پر دال ہو

مومن کا ایک شعر ہے :۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ۔۔۔ جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

لفظ "گویا" اس جگہ اسقدر بلیغ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا کرنے والا مشکل سے ملیگا

آئمہ فن نے اس پر مبسوط بحثین کی ہین اس جگہ ان کا ذکر موضوع اور مضمون کو ناگوار وطویل بنا دیگا

یہان ضمنی طور پر یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ خوبی عبارت کو لفظ سے تعلق ہے یا معنی سے

ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ اس کا تعلق الفاظ سے ہے دوسرا فریق معنی کو کہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تنہا نہ تو لفظ ہی مقصد کو پورا کرتا ہے اور نہ تنہا معنی بلکہ دونون سے معانی مطلوب پیدا ہوتے ہیں

تنہا نہ تو کوئی لفظ فصیح ہے اور نہ بلیغ۔ بعض وقت غیر فصیح الفاظ ترتیب سے آکر فصیح ہو جاتے ہین۔ مثلاً عربی مین ضیزیٰ "کا لفظ ہے، ایک لفظ مین "ض" اور "ز" کا اس طرح جمع ہونا فصاحت کے خلاف ہے لیکن قرآن مین جہان یہ لفظ استعمال ہوا ہے نہایت فصیح ہے "تلک اذاً قسمۃ ضیزیٰ"!

لفظ بمبوق، بنچو نچون، "ڈگڈمبر" بظاہر غیر فصیح ہین لیکن ان سے اگر مذاق مراد ہو اور ترتیب مین یہ معنی پیدا ہون تو اپنی جگہ بہت فصیح ہین

مومن نے اپنے اشعار مین الفاظ کی فصاحت، معانی کی بلاغت، ترتیب کی خوبی زبان کی سلاست، بندش کی بیساختگی کا یکجا اس طرح اہتمام کیا ہے کہ کہین دوسری جگہ نظر نہین ملتی۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ شاعری مین مومن کا مرتبہ مجتہد اور امام کا ہے ہمارے دعاوی کی دلائل بھی اس جگہ دیکھ لیجئے ؂

۱۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

لفظ "گویا" کی "فصاحت" پر ایک طرف نظر کیجئے اور اسکی معنوی بلاغت پر دوسری طرف نگاہ رکھئے، ترکیب مین "گویا" جہان واقع ہے اس پر بھی نظر کیجئے پھر پورے شعر کی بندش اور سلاست پیش نظر رکھئے، کیا یہ مثال دوسری جگہ مل سکتی ہے؟

لفظ "گویا" اگر دوسری جگہ رکھدیا جائے یا شعر کے الفاظ مین کچھ تغیر کر دیا جائے تو یہ تناسب اور یہ لطافت قائم نہین رہ سکتی یہ مومن کے کمال اور ہمارے دعوی کی کھلی ہوی دلیل ہے۔

فصاحت الفاظ:۔ ؂

۲۔ پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موے پر خلل گیا جب ٹھیس سانس کی لگی دم بھی نکل گیا

اس شعر مین الفاظ ٹھیس، پھوڑا، سانس، دم کی فصاحت لفظی دیکھئے۔

مومن نے چونکہ پہلے مصرعہ مین لفظ پھوڑا، استعمال کیا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ مین "ٹھیس"، لگنا کہا ہے، پھوڑے " مین ٹھیس لگتی ہے اس کے لئے اس جگہ دوسرا لفظ موزون نہین ہوسکتا، اس طرح "ٹھیس" کے لئے پھوڑا لازم تھا، ٹھیس لگنا نازک سے نازک تر چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس جگہ اس لفظ نے بتا دیا ہے کہ پھوڑے کی حالت نازک سے نازک تر تھی

"سانس" کا لفظ چونکہ آچکا تھا اس لئے "دم" سے زیادہ کوئی لفظ موزون اور مناسب نہ تھا

اب معنوی بلاغت دیکھئے:۔

دل کو پھوڑا، کہا اس لئے کہ اس کی صورت اس سے ملتی ہوی ہوتی ہے پھوڑا مواد سے بھرا ہوتا ہے، دل کا بھرنا اور بھرا آنا بھرا ہوا ہونا وہ صفتین یا محاورے مین جو مستعمل ہین۔ لہذا معنوی حیثیت سے اس کے تناسب کا اعجاز ملاحظہ فرمائیے

"دم" کے دوسرے معنی "خون" کے ہین، اب دم نکل جانے کی خوبی بلاغت دیکھئے جس طرح پھوڑے سے مواد و خون اور ریم نکلتا ہے، اسی طرح سانس کی ٹھیس لگنے سے دم یا جان یا خونِ دل نکل گیا، خونِ دل بھی جان ہی ہے، اس جگہ "مومن" نے

اپنی حکمت و طبابت کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیا۔

پھوڑے مین ہر چیز سے ٹھیس لگتی ہے لیکن دل کی ایسی نازک چیز مین سانس کی ٹھیس کافی نہین ضروری ہے

پھر دل۔ سانس۔ دم۔ کی مناسبت نے معنوی خوبیون کے نگینے شعر کی انگشتری مین مناسب اور موزون ترین مقامات پر جڑدئے ہین۔ نزاکت، اور تلاش نے ایک طرف سلاست، زبان اور بندش نے دوسری طرف اس شعر کو بیمثال کر دیا ہے

اس شعر کا کمال دیکھئے کہ اس کا کوئی لفظ بدل دیجئے یا ترکیب اور ترتیب مین ردوبدل کیجئے تو شعر بدل جائے گا اور یہ خوبی باقی نہ رہیگی "مومن" کے اعتراف کمال کے لئے یہ کافی ہے

دوسرا شعر حمد کے سلسلے مین مناجات کا ہے

۳۔ خدایا ہاتھ اُٹھاؤن عرضِ مطلب سے بھلا کیونکر کہ ہے دستِ دعا مین گوشہ دامانِ اجابت کا

اس شعر کے اجزائے ضروری ہاتھ اُٹھانا۔ دستِ دعا۔ دامانِ اجابت ہین "مومن" چونکہ دعا کر رہا ہے (مومن کی مناسبت معنوی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے) اس لئے ہاتھ نہین اُٹھا سکتا یعنی ناامید نہین ہو سکتا۔

ہاتھ اُٹھانے کے دوسرے معنی بھی ہوتے ہین اس کو اس مضمون سے مقید کر لیا ہے کہ دست دعا مین چونکہ دامانِ اجابت کا گوشہ ہے اس لئے نہین اُٹھا سکتا مبادا وہ چھوٹ جائے جو عین مدعا ہے

پہلے مصرعہ مین ہاتھ اُٹھانا دوسرے مین دست دعا ہے بظاہر لفظاً تکرار ہے لیکن معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے مقصود دعا اور اجابت کے لئے ان الفاظ سے زیادہ اگر کوئی موزون الفاظ ہو سکتے ہین تو ان کو لاکر دیکھئے کہ شعر کی یہ خوبی باقی رہتی ہے؟

۴۔ درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے مین ساری چارہ گر ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا

یہ شعر لفظی خصوصیات کے اعتبار سے زیادہ معنوی خصوصیات کی شان رکھتا ہے۔ الفاظ درد۔ جان۔ چارہ گر۔ درمان اس انگشتری کے نگینے ہین جو اپنی جگہ پر موزون ترین

معنوی بلاغت دیکھئے کہ "مومن" کہتا ہے کہ اب "درد" طبیعت اور خون بن گیا ہے جو جسم کے ہر حصہ مین موجود ہے جس طرح جان جسم مین ہر جگہ موجود ہے (یہ مسئلہ بھی مومن کے فلسفہ طب کو آشکار کرتا ہے) لہذا اس کا علاج نہین ہو سکتا علاج کے معنی یہ ہین کہ "درد" دفع ہو، اور وہ جان بن گیا ہے، لہذا درمان سے درد کی جگہ "جان" کا دفعیہ ہوگا، جب جان جسم مین باقی نہ رہی تو انسان زندہ نہ رہا، اس زندہ نہ رہنے کو ان الفاظ مین بیان کیا ہے کہ ہم نہین ہونے کے، اس سے بہتر طرز بیان ہونا خیال مین نہین آتا۔

اس ترکیب کی دوسری خوبی ملاحظہ فرمائیے، متکلمین اور علمائے فلسفہ کے نزدیک "انسان" مجموعہ جسم و جان کا نام ہے، یعنی ائین سے اک کوئی جزو نہ ہو تو انسان مکمل نہین۔ "مومن" نے اس مسئلہ کو سامنے رکھ کے بلیغ الفاظ استعمال کئے ہین "ہم نہین ہونگے"

"مومن" نے "جان کے عوض" کہکر درد ہی کو جان بنا دیا ہے "جان کی طرح" اگر کہتے تو دوسرے مصرعہ مین یہ خوبیان پیدا نہ ہو سکتی تھین

معنوی اعجاز کے علاوہ "زبان" کی کرامت کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیا ہے۔ "ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا" یعنے اگر درمان ہوگا تو ہم نہ ہونگے دوسرے الفاظ مین یا تو درمان ہو، یا ہم ہون، کیسا محاورہ اور کیسی زبان ہے

۵۔ چارہ گر جنت مین اس کے آستان سے لے گئے ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا

اس شعر کے اجزاے ضروری جنت۔ آستان۔ سر پٹکا کیا۔ لیگئے۔ میری نہ مانی ہین

لفظی تناسب اور اعتبار سے پہلے مصرعہ مین چونکہ "آستان" کہا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ مین "پٹکنا" استعمال کیا ہے، آستان معشوق پر عاشق سر پٹکتا ہے یہ مضمون عام ہے قریب قریب اکثر شاعرون نے لکھا ہے "مومن" کی تلاش اور انداز اس کا پابند کیونکر رہتا! وہ کہتا ہے کہ:۔

"چارہ گر آستانِ یار سے جنت مین علاج عشق کے لئے لیگئے، لیکن عاشق کو جنت سے کیا کام اس لئے آستانِ یار کا چھوڑنا گوارا کیونکر ہوتا اس ناگواری کو سر پٹکنے سے ظاہر کیا ہے، ایک بھی میری نہ مانی، محاورہ اور زبان کی بیساختگی ہے اس سے اور چار چاند لگا دیئے ہین۔ "لاکھ سر پٹکا کیا؟ بلاغت کی روح ہے"

۶۔ لاش کس کی ہے یہ عدو سے نہ پوچھ مین ہون کشتہ ترے تجاہل کا

اجزاے شعر لاش۔ کشتہ ہین لفظی اعتبار سے لاش کے ساتھ کشتہ، کا ذکر ضروری تھا معنوی خوبی دیکھئے کہ:۔

"معشوق، رقیب سے عاشق کی لاش کو دیکھ کر پوچھتا ہے کہ یہ کس کی لاش ہے، (حالانکہ وہ جانتا پہچانتا ہے) عاشق زبانِ حال سے کہتا ہے کہ یہ عدو یا رقیب سے پوچھنے کی بات نہین، یہ تو مجھسے پوچھو کہ مین کون ہون؟ مین تمھارے ناز تجاہل کا مارا ہوا ہون۔ یہ "تجاہل" چاہے معشوق کا عام انداز ہو یا اس وقت وقتِ خاص کا مین ہون کشتہ ترے تجاہل کا" کیسا دلپذیر لہجہ ہے زبان نے اس کو چمکا کر آفتاب بنا دیا ہے"

حاصل کلام

"مومن" کے دیوان مین شروع سے آخر تک یہ کمالات اور کرامات شاعری موجود ہین، جنکا وجود ابتداے اب تک کہین نہین ملتا یہ ہے کہ "مومن" نے اپنے تمام کلام بالخصوص غزلیات مین، الفاظ کی فصاحت معانی کی بلاغت، ترکیب کی خوبی ترتیب کی موزونی، زبان کی سلاست جذبات کے نشتر، بندش کی بیساختگی مضمون کی بلندی۔ تلاش۔ طرز ادا یکجا کردیئے ہین پھر کمال یہ ہے کہ اس اہتمام سے ان کا تمام دیوان شروع سے آخر تک بھرا پڑا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب اور غریب خصوصیت "مومن" کی یہ ہے کہ آورد کے اہتمام مین اندازِ بیان سے "آمد" کی بیخودی اور دلیری پیدا ہو گئی ہے، مومن اپنی اس صفت مین دنیاے شاعری مین منفرد اور اکیلے ہین

یوروپ کے اہلِ قلم "شکسپیر" کی تعریف کرتے ہوے لکھتے ہین کہ " اس نے اپنی گرامر، اور زبان علٰحدہ کر لی ہے

ان لوگون کو یہ معلوم نہین کہ یہ کسی کے کمال کی تعریف نہین ہو سکتی، عام راستہ سے الگ راہ طیار کر کے ہر شخص چلنے کی مقدرت رکھتا ہے، کمال اس کا نام ہے کہ اس راہ پر اس طرح چلے کہ نظرون کے ساتھ انگلیان بھی اُٹھنے لگین

"مومن" نے اپنے اسی کمال کا اظہار کیا ہے، وہ قواعد مقررہ، عام زبان یا لغات و محاورات بعینہٖ مین اسی انداز سے کہتا ہے کہ نئی بات معلوم ہوتی ہے۔

(باقی) کیفی چریاکوٹی

جنوری سنہ ۳۰ء سے

دارالاشاعت نگار سے ایک نئے رسالہ کا اجراء

اس رسالہ کا نام جن ہوگا۔ جن کے لغوی معنی ہین ہر اُس چیز کے جو حواس ظاہری سے پوشیدہ ہو، اس لیے اس رسالہ مین تمام اُن امور و واقعات سے بحث ہوگی جن کا تعلق "ماورائے عالم حواس" سے ہے اور جس مین جنات ارواح خبیثہ، مابعد الطبیعیات، روحانیات، وغیرہ سب شامل ہین۔ اس مین نہ صرف جنات وغیرہ کے معتبر واقعات و حکایات ہونگے، بلکہ ان پر تنقید بھی ہوگی، عالم ارواح و روحانیت کے متعلق جدید ترین تحقیقات و معلومات بھی ہونگی، اور "حیات بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک جو کچھ دریافت ہو چکا ہے اور ہوتا جا رہا ہے وہ بھی درج ہوتا رہیگا۔

اس رسالہ کی تقطیع ۲۰×۲۶ ہوگی اور ۲۵ سطر کے مسطر پر دو کالم مین باریک خط سے لکھا جائیگا۔ حجم فی الحال دو جزء ہوگا جسمین ۸ صفحات مستقلاً علمی تحقیقات کے لئے وقف ہونگے۔ اس رسالے مین ارواح خبیثہ اور جنات کے جتنے واقعات درج ہونگے ان سب کو مصور پیش کیا جائیگا جس کے لئے ایک آرٹسٹ کی خدمات مستقلاً حاصل کی گئی ہین۔ رسالہ کی سالانہ قیمت عہ/ تجویز کی گئی ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے چندہ قبول نہ کیا جائیگا

جن حضرات کو اس دنیا سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم اپنا پتہ بھیجدین تاکہ بعد اشاعت رسالہ کا نمونہ اُن کے پاس روانہ کیا جائے اس کے ساتھ یہ استدعا بھی ہے کہ اگر کسی شخص پر اُس کی زندگی مین کوئی واقعہ ایسا گزرا ہے جسے وہ جنات یا بھوت پریت سے منسوب کرتا ہے تو براہ کرم اس کو قلمبند کر کے روانہ کر دے زبان و تحریر کی پرواہ نہ کیجائے یہان اس کو درست کر لیا جائے گا اور واقعہ کے مطابق تصاویر طیار کر لی جائین گی۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ صرف اپنا تجربہ و مشاہدہ پیش کیا جائے، دوسرون سے نقل کی ہوئی روایت نہ ہو۔

پہلا پرچہ جنوری سنہ ۳۰ء کے نگار کے ساتھ ہی ساتھ شایع ہو جائیگا

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

جھوٹ

"تم جھوٹی ہو، خدا کی قسم بالکل جھوٹی ہو!!"

"پھر اتنا کیون چیخ رہے ہو، کیا محلہ والون کو بھی اپنے قول کا گواہ بنانا چاہتے ہو؟"

یہ بات بھی جھوٹ تھی، اس لئے کہ مین چیخ ہی نہین رہا تھا، بالکل آہستہ آہستہ باتین ہو رہی تھین، اُسکی کلائی میری گرفت مین تھی اور مین بالکل عاشقانہ لہجہ مین اُس سے مخاطب تھا۔ ہان یہ بات مینے بھی محسوس کی کہ "جھوٹ"، کا لفظ بار بار سانپ کی پھنکار کی طرح میری زبان سے نکل رہا تھا

"آہ! مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟!" اُسنے دردآمیز لہجہ مین کہا "تمھین اسکا بالکل یقین نہین آتا۔ آخر مین کس طرح باور کراؤن"

مگر جب مینے اُسے قریب کھینچ کر اپنی آغوش مین لینا چاہا تو وہ تیتری کی طرح اُڑ گئی۔ مین نے برآمدہ کے اندھیرے سے نکلکر اُس کمرے تک اُسکا تعاقب کیا جہان ابھی تک رقص و سرود کی محفل گرم تھی، مگر دروازے کے پاس پہونچکر مین ٹھٹک گیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر بلا لیا

کئی جوڑے مصروف رقص تھے، مجھسے نہ کوئی مخاطب ہوا، نہ مجھے رقص کی دعوت دیگئی، سب کی نگاہون مین شاید ایک مین ہی ایسا شخص تھا جو اجنبی خیال کیا جا رہا تھا اس لئے مینے بھی سب سے علیحدہ ایک گوشے مین سازندون کے قریب بیٹھنا مناسب سمجھا۔ تانبے کی سماعت آزما نفیری کا مُنہ بالکل میرے سر کے قریب تھا۔ اُسکی آواز سے کانون کے پردے پھٹے جاتے تھے، مگر پھر بھی مین اس طرح خاموش بیٹھا رہا گویا موسیقی سے مجھے انتہائی رغبت ہے

ہر دس پانچ منٹ کے بعد ایک سفید، معطر، سایہ میرے پاس ہو کر گذرتا تھا ——— یہ وہی تھی ——— مجھے معلوم نہین کہ آیا وہ کس ترکیب سے دوسرون کی نگاہین بچا کر پروانہ وار آتی تھی اور مجھسے اظہار محبت کر جاتی تھی۔ البتہ اتنا احساس ہے کہ ایک لمحہ کے لئے، محض چشم زدن کیلئے اُسکے سڈول شانے میرے شانون سے مس ہوئے، ایک لمحہ ہی کیلئے میری نگاہین اُٹھین، اور مجھے ایک بلورین گردن، چمکدار لباس کا سا دھوکہ ہوا، پھر ایک بلورین چہرے کا خیال ہے ایسا بلورین چہرہ جس مین وفا و محبت بیک وقت موجود تھین اور جسے حور شمایل سمجھکر بھی خیال مطمئن نہ تھا ——— یقین کیجئے بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے زہرہ رقص کرتے کرتے تھک کر آ گری ہے

مینے اُسکی آنکھین دیکھین، وہ ہرنی کی آنکھون کی طرح بیقرار، شوخ اور کسی روشنی کی متمنی تھین۔ خوبصورتی کا مفہوم یقیناً اُنکی دلکشی کی تشریح نہین کر سکتا

دراز پلکون کے سایہ مین اُسکی گہری گہری سیاہ اور سراپا محبت پتلیان تھین ——— جسوقت میری نگاہ ملی اُنکی گہرائی سمندرون کی طرح اتھاہ ہو گئی، جب مینے اُن پر غور کیا میرا قلب ساکن ہو گیا۔ اس مین مطلق مبالغہ نہین، ممکن ہے کہ یہ وقفہ لمحہ بھر یا اس سے بھی کچھ کم رہا ہو مگر وہ زندگی کا یہی لمحہ ہے جس مین مینے کائنات کی گردش کا تعلق حسین پتلیون کی لرزش سے محسوس کیا ہے صرف محسوس ہی نہین بلکہ اچھی طرح اپنی آنکھون سے دیکھا ہے!

ہراس و مجبوری کی ایک مسلسل کشمکش لئے ہوئے میری روح کشان کشان اُسکی نگاہون مین جذب ہو رہی تھی۔ یہانتک کہ مین اپنی ہستی سے بھی بیگانہ ہو گیا، ——— بے بس، بے یار و مددگار، قریب قریب مُردہ۔ زندہ تو یقیناً نہ تھا

دیکھتے دیکھتے وہ پھر فاختہ کی طرح اُڑ گئی، اس مرتبہ میری روح بھی اُسی کے ساتھ تھی

ہال مین ایک کشیدہ قامت، خوشرو نوجوان کے ساتھ وہ مصروفِ رقص تھی، خدا معلوم وہ کون تھا؟ مین اُسکی ایک ایک چیز کو گہری نظرون سے مطالعہ کر رہا تھا۔ اُسکے جوتون کی ساخت، شانون کی بناوٹ، بالون کے لچھے، خوفناک تبسم خوش رنگ رومال غرض ہر چیز میری نگاہون مین کھٹک رہی تھی۔ لیکن وہ ایک شانِ استغنا کے ساتھ، لاپرواہی سے ادھر اُدھر نگاہین ڈالکر مجھے پامال کئے جا رہا تھا۔ اُسکی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ ارادۃً یا دلچسپی سے اُسنے کسی چیز کو بھی نہین دیکھا

مجھے اُسکی یہ آسودہ نگاہی دیوار مین پیوست کئے دیتی تھی، مین تباہ ہو رہا تھا۔ یہانتک کہ جس دیوار کے سہارے سے بیٹھا تھا، رفتہ رفتہ مجھ مین اور اُس مین کوئی فرق نہ رہا

محفل مین روشنیان گل ہونے لگین، ساز کی آوازین آخری گونج کے بعد خاموشی کے اتھاہ سمندر مین کھو گئین، مین چپکے سے اُٹھکر اُسکے پاس گیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:۔

”چلو جلسہ ختم ہو گیا، مین تمھین گھر تک پہونچا دون“

مگر اُس نے بالکل معصومانہ انداز مین جواب دیا:۔

”اور میرا چچازاد بھائی کس کے ساتھ جائیگا؟“

یہ کہکر وہ مجھے خالی کمرے مین لیگئی اور مسلسل بوسون سے میرے لب بند کر دیئے۔ جب وہ رخصت ہونے لگی تو مینے چپکے سے کہا:۔

”تم جھوٹی ہو؟“

”پھر وہی“ اُسنے مسکرا کر کہا ”کل آؤنگی تم وہین ملنا“

یہ کہا اور اجنبی کے ساتھ چل دی

جسوقت مین گھر کی طرف روانہ ہوا، اچھا خاصہ صبح کا وقت ہو گیا تھا۔ بازار بند تھے اور سڑک پر صرف دو آدمیون کے علاوہ کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی ——— ایک مین دوسرا میرا کوچبان

سرد ہوا سے بچنے کے لئے کوچبان کسی قدر پیچھے جھک گیا تھا اور اُسکے لمبے برساتی کوٹ کا دامن میری پیشانی پر لٹک رہا تھا۔ وہ علٰحدہ کچھ

سوچتا جا رہا تھا میں علیحدہ اپنے خیال مین منہمک تھا۔ اور بلند دیوارون کے پیچھے تمام شہر سکون و اطمینان کی میٹھی نیند لیتے ہوئے علیحدہ اپنے خواب و خیال مین مدہوش تھا۔ اسوقت میری آنکھون مین اُسکی بھولی بھولی صورت تھی اور خیال مین اُسکا —— جھوٹ، حیات و ممات کا فلسفہ بھی بعض اوقات اس خیال مین جگہ نکال لیتا اور نگاہون مین پھر اسقدر غلبہ پالیتا کہ مکانون کی بلند اور کشیدہ قامت دیوارین جو صبح کی دھندلی روشنی مین بتدریج نمایان ہو رہی تھین۔ موت کی مختلف ڈرونی صورتین معلوم ہونے لگتین جس طرح لاش ٹھنڈی ہو کر اینٹھ جاتی ہے اسی طرح وہ بھی صرف ایک حالت مین ساکت و صامت ہو کر رہ گئین تھین

مجھے کو جیسا ان کے خیالات کا اندازہ نہین ہو سکا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ بھاری دیوارون کے پیچھے سونے والے کیا خواب دیکھ رہے تھے مگر پھر انھین کو میرے خواب و خیالات کا کیا اندازہ تھا

اس حالت مین میری گاڑی خالی سڑک پر برابر راستہ طے کرتی جا رہی تھی۔ سورج کی ابتدائی شفقی شعاعین، مکانون کی چھتون اور درختون کی بلند چوٹیون کو رفتہ رفتہ نمایان کر رہی تھین۔ اور ماحول کی ہر شے مین ایک ایسی زندگی پیدا ہو رہی تھی جو احساس و حرکات سے مطلقاً بے نیاز ہو کوئی معطر سفید چیز سایہ کی طرح میرے برابر سے گذر گئی جسوقت وہ میرے برابر سے گذری، کسی کے بے محابہ مردانہ قہقہہ کی آواز میرے کانون مین آئی: —— ہا۔ ہا۔ ہا ہا۔ ہا!

(۲)

اُسنے مجھسے جھوٹا وعدہ کیا تھا، مینے صبح سے شام تک انتظار کیا مگر اُسے نہ آنا تھا نہ آئی

ایک دھندلی، کہر نما تاریکی۔ رفتہ رفتہ فضا پر غالب آگئی۔ مین نہین بتا سکتا کہ دن کی روشنی شام کی سنہری شفق مین اور شفق رات کے تاریک دھندلکے مین کب اور کس طرح تبدیل ہو گئی۔ امیرے لئے تو انتظار کی تمام گھڑیان ایک طویل رات سے مشابہ تھین ایسی طویل رات جسمین تارے کی روشنی کا بھی نشان نہو

مین نے تمام دن متاہلانہ جہل قدمی مین گذار دیا، مین نہ اُس مکان کے قریب گیا جہان وہ رہا کرتی تھی۔ نہ اُس خوشنما دروازے سے گذرا جو زرد بارجے کے سایہ مین میری نگاہون کو خوش آمدید کہا کرتا تھا۔ دن بھر اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر جہان سے اُسکا دروازہ اور بارجہ دونون نظر آتے تھے ایک معینہ رفتار اور یکسان قدمون سے ٹہلتا رہا۔ اس طرح کہ جب آگے بڑھتا دروازہ پر بلا کسی خاص ارادے کے نگاہین جمی رہتین اور جب واپس ہوتا تو اکثر راستہ مین ٹھہر کر مُڑ مُڑ کر دروازے کو دیکھ لیتا —— یہانتک کہ برف گرنے لگی، اور اُسکی تیز خنکی جابجا نشترون کی طرح میرے چہرے پر چبھنے لگی

نشتر! —— ہان ایسے خطرناک، ایسے تیز، ایسے سرد ایسے جان خراش نشتر جو رفتہ رفتہ میرے دل مین پیوست ہو گئے۔ اور اُسے چھید چھید کر اتنا مجروح کر دیا کہ سوائے افسردگی، انتقام اور غم و غصہ کے اُسمین کچھ نہ رہا

انتظار کی گھڑیان قیامت بنکر گذر رہی تھین، مگر اُسکا کہین پتہ نہ تھا۔ مین برابر سرکاری لالٹین کی روشنی مین کچھ ڈھونڈھ رہا تھا کچھ عرصہ کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا گویا میرے جسم مین بھی کوئی شے چراغ کی لو کی طرح جل رہی ہے —— !

جس راستہ پر مین ٹہل رہا تھا اُسپر آمدرفت بہت کم تھی بعض اوقات میرے سامنے دور سڑک پر کوئی انسانی صورت نظر آتی اور جون جون قریب ہوتی جاتی اسکا قد بڑھتا ہوا معلوم ہوتا۔ یہانتک کہ وہ خاموشی سے ایک تاریک سایہ کی طرح میرے برابر سے گزر کر بتدریج گھٹنا شروع ہوتی اور سفید عمارت کی دیوارون کے نیچے پہونچ کر رفتہ رفتہ نگاہون سے غائب ہو جاتی

پھر جب مین واپس ہوتا، تو انھیں دیوارون کے پاس سے کوئی شخص برآمد ہوتا، میرے قریب سے گذرتا اور اُسی طرح گھٹتے گھٹتے کہر آلود فضا مین نگاہون سے غائب ہو جاتا

لمبے لمبے لبادون مین لپٹے ہوئے یہ غیر متشکل مجسمے ایک دوسرے سے اسقدر مشابہ تھے اور سڑک پر جابجا ٹہلتے ہوئے اس طرح نظر آتے تھے گویا کسی مخصوص گروہ کے صدہا آدمیون نے راستہ پر پہرہ لگا لیا ہے

مین اب بھی اُسکا انتظار کر رہا تھا مگر بے سود۔ انتہائے غم و افسوس سے میری آنکھون مین آنسو ڈبڈبانے لگے اور بے تحاشہ رونے کو جی چاہنے لگا۔ اُنگلیان از خود کسی درندے کے پنجون کی طرح اینٹھنے لگین اور یہ محسوس ہونے لگا گویا وہ کسی زہریلے سانپ کو جسکی پھنکار سے جھوٹ کے شعلے نکل رہے ہون اپنی گرفت سے کچل دینا چاہتی ہین

اُدھر یہ خیالی سانپ میرے ہاتھون پر لپیٹ رہا تھا اور رسّے کی طرح اُنھین جکڑ کر بار بار دل پر ڈنک مار رہا تھا۔ تاآنکہ اُسکے زہریلے اثر سے میرا سر ڈھلکنے لگا ——— دُنیا کی ہر چیز جھوٹ تھی

میرے عدم و وجود کی حد فاصل جوش خیال مین نابید ہو گئی، بعض اوقات یہ محسوس ہونے لگتا گویا مجھے کبھی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہین رہا، اور بعض مرتبہ یہ خیال ہوتا کہ زندگی دراصل نام ہی اُس کیفیت کا ہے جو مجھے حاصل ہے

اُسوقت یہ معلوم کرنا کہ درحقیقت مین معدوم تھا یا موجود میری قوت فیصلہ کے لئے ناممکن تھا ——— البتہ یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ "وہ" میرے عدم و وجود کی دونون حالتون مین ہمیشہ اور ہمہ وقت شریک رہی ہے۔ اُسے مجھپر حکومت کرنے کے لئے اور مجھے اُس کا محکوم بننے کے لئے من و توکی بحث چھیڑی گئی ہے

اکثر مجھے اس خیال پر تعجب ہونے لگتا کہ اُسکا بھی مجھسے علیحدہ کوئی نام مجھ سے جُدا کوئی جسم ہے۔ اُسکی ہستی بھی کسی مخصوص ابتدا یا انتہا کی رہین منت ہے - - - - - - - - - - - اُسکا کوئی نام نہ تھا، وہ ہرگز مجھسے علیحدہ کوئی خاص شخصیت نہ تھی۔ میرے خیال مین تو وہ میری ہی شخصیت کا ایک ایسا فریب تھی جسے صرف جھوٹ بولنے تڑپانے اور کشمکش انتظار مین ڈالکر کبھی نہ آنے کے لئے قدرت نے تخلیق کیا تھا

مجھے معلوم نہین کیون اور کس بنا پر مجھے ہنسی آئی ——— مینے ایک طویل قہقہہ لگایا، کھٹکنے والے نشتر دل مین اور پیوست ہو گئے، کچھ دیر بعد کانون مین یا تو میرے ہی قہقہہ کی بازگشت، یا کسی دوسرے کے خیالی قہقہہ کی آواز آئی ——— ہا۔ہا۔ہا۔ ہاہاہا

مینے آنکھ اُٹھاکر سفید عبارت کی اُن کھڑکیون کو بغور دیکھا جنکے رنگین شیشون سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی - - - -

وہ بھی اپنی سرخ سبز زبان مین مجھ ہی سے مخاطب تھین۔ اور صاف کہہ رہی تھین: ——— "بیوقوف! وہ تجھے دھوکا دے رہی ہے"

مچھلی کی طرح کھلا رہی ہے، تو گھنٹوں سے اُسکے انتظار مین ٹہل رہا ہے، برف اور طوفانی ہوا کی مصیبتین جھیل رہا ہے مگر وہ، خوبصورت، حسین، جفا جو عربدہ جو، سفید ناگن اپنے عاشق کے ساتھ مصروفِ عیش ونشاط ہے۔ ایسے مین اگر تو بہادرانہ جذبۂ انتقام کے ساتھ یکایک اندر داخل ہوجائے اور اُس بے مروت ہستی کو جسے غلطی سے تونے راحتِ روح سمجھ لیا ہے، قتل کردے تو دُنیا جھوٹ سے پاک ہوجائے۔

مینے سختی سے اُس مُٹھی کو بند کرلیا جس مین چاقو تھا اور قہقہہ لگا کر زیر لب کہا۔

"ہان، ٹھیک ہے۔ مین اُسے ضرور مارونگا، جھوٹ کا دُنیا سے خاتمہ کردینا ہی بہتر ہے"

لیکن کھڑکیون نے مجھے غمگین نگاہون سے دیکھتے ہوئے کہا:۔

"تو اُسے کیا مار سکتا ہے؟ تیرے ہاتھ مین جو چاقو ہے وہ خود ایک فریب ہے اُسکے بوسون سے زیادہ بے معنی فریب"

سڑک پر آمدرفت بند ہوچکی تھی اور برف کے طوفان مین صرف ایک مین ہی ایسا شخص تھا جسے خانہ بدوش کہا جا سکتا تھا ورنہ ہر جاندار کو کہین نہ کہین پناہ مل گئی تھی

مین اور شاہراہ کی لالٹین کا بیکس شعلہ ——— بظاہر کائنات مین یہ دو چیزین سردی کھانے اور غم و آلام اُٹھانے کیلئے بنائی گئی تھین

قریب کے گرجا مین گھنٹہ بجا۔ اور اُسکی تیز، سماعت شکن آواز، ماحول کے اثر سے مضمحل ہوکر کانپتی ہوئی برف کی طوفانی فضا مین کھو گئی ——— ٹھیک اس طرح جس طرح کوئی بیمار آخری ہچکیاں لیکر دم توڑ دیتا ہے

مینے گھنٹے گننا شروع کئے، اور گِن کر ایک قہقہہ لگایا ——— پندرہ بجے تھے —!

گرجا اور اُسکا گھنٹہ دونون پُرانے تھے، ہرچند کہ گھڑی ٹھیک وقت دیتی تھی لیکن گھنٹہ ہمیشہ بے تکا بجاتا تھا، بعض اوقات تو اتنا بے تکا کہ پادری صاحب کو مینار پر چڑھ کر اپنے ہاتھ سے اُسے روکنا پڑتا تھا۔

مگر اسوقت گرجا کے گھنٹہ کی آواز کسی کے لئے جھوٹ بول رہی تھی ——— یقیناً میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔

گھنٹہ کی آخری آواز کے ساتھ سامنے والے سفید مکان کا دروازہ کھلا اور ایک کشیدہ قامت آدمی زینہ سے اُترتا معلوم ہوا۔

مین صرف پُشت دیکھ سکا مگر فوراً پہچان گیا، اس لئے کہ مینے یہی مغرور، سراپا لعنت صورت گذشتہ شام کو دیکھی تھی۔ اُسکی مطمئن چال سے قلبی مسرت جھلک رہی تھی، وہ کل شام کی بہ نسبت یقیناً اسوقت زیادہ مسرور تھا ——— مین بھی اسی دروازہ سے اکثر اسی قسم کی مستانہ روی کے ساتھ نکلا کرتا تھا ——— اُسکے ایک ایک قدم سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ کسی نوجوان عورت کے جھوٹے بوسون کے نشہ آور خیال مین مدہوش ہے

(۳)

مینے اُسے دھمکایا، ڈرایا، پھر خوشامد کی ہاتھ جوڑے اور کہا:— "خدا کیلئے مجھسے دورنگی نہ برتو، مجھے فریب نہ دو، جتنی بات ہو سچ سچ بتادو!"

مگر وہ ایک بے لوث اور معصومانہ انداز سے اپنی بھوین چڑہاتے ہوئے مسکرائی اور حسین پتلیوں کی اتھاہ گہرائی سے وفا و محبت کا یقین دلاتے ہوئے مجھسے کہنے لگی :-

"بھلا تمسے اور جھوٹ !"

وہ جانتی تھی کہ میرے پاس اُسکے جھوٹ کا کوئی باقاعدہ ثبوت نہین ہے اور میرے تمام شبہات ساری روح فرسا بدگمانیون کیلئے اسکا صرف ایک لفظ، ایک جھوٹا فقرہ کافی ہے

مین اُسی فقرہ کا منتظر تھا۔ وہ اُسکی زبان سے بظاہر وفا و محبت کے رنگ مین رنگا ہوا لیکن درحقیقت اپنے مفہوم مین جھوٹ ادا ہوا :-

"آہ! مجھے تمسے کتنی محبت ہے ؟! کیا مین تمھاری . . . . . نہین ہون۔ مگر تمھین یقین ہی نہین آتا۔ خدا جانے کیا ہو گیا ؟"

ہم قصبہ کی آبادی کے آخری کنارے پر رہتے تھے، اور برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چوٹیان کھڑکیون سے دکھائی دیا کرتی تھین، مگر اسوقت اندھیرے مین چھپی ہوئی تھین، ماحول کی ہر چیز پر رات نے ایک سیاہ غلاف ڈال دیا تھا۔ مگر جھیل چمک رہی تھی ——— بالکل اس طرح جس طرح گہری تاریکی مین کسی مردے کی کفنائی لاش

کمرے مین صرف ایک دھیمی لیمپ کی روشنی پڑ رہی تھی، مگر اُسمین بھی مردہ جھیل کا عکس نمایان تھا

"بتا دو، خدا کیلئے مجھے سچ سچ بتا دو، اسکی پرواہ مت کرو کہ مجھے صدمہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ مین اُسے سنکر مر ہی جاؤنگا۔ کوئی ہرج نہین جھوٹی اور فریب کار زندگی سے سچی موت بہتر! مجھے صرف ایک مرتبہ تم اپنے دل کی بات بتا دو، پھر مین ہمیشہ کیلئے تمھارا چھوڑ دونگا"

مین جذبات کے طوفان مین اُس سے مخاطب تھا، لیکن وہ خاموش تھی، اور اُسکی بھولی بھالی مغموم نگاہین نشتر کی طرح میرے دلمین اُتری جارہی تھین، میری روح تڑپ رہی تھی اور مین درد و کرب کی مجسم تصویر بنا ہوا اُسکے سامنے کھڑا تھا . . . . . بالآخر مینے پھر کہا :-

"بتا دو! ——— دیکھو خدا کا واسطہ! ورنہ . . . . . مین . . . تمھین قتل کر دو . . . . گا"

"کر دو" اُسنے اطمینان سے جواب دیا "بعض اوقات زندگی واقعی بار ہو جاتی ہے، اور آدمی عاجز آ کر موت کے بہانے ہی ڈھونڈا کرتا ہے . . . . . تمھارے ہاتھ سے، زہے نصیب! ——— مگر . . . . اُس نے ذرا رُک کر کہا

"جس خیالی حقیقت کی تمھین تلاش ہے، جو سچ تم معلوم کرنا چاہتے ہو وہ بھی تمھین معلوم ہو جائیگا، یا میری موت بھی تمھین مطمئن نہ کر سکے گی ؟" ——— مین بلاارادہ اُسکے قدمون مین گر پڑا، اور انتہائے عاجزی سے گڑگڑا کر کہنے لگا :-

"خدا کیلئے! . . . . !" اپنی جوانی کا صدقہ، مجھپر رحم کرو اور اپنے دلکی بات بتا دو، صاف صاف کہدو کہ مجھے تمسے محبت نہین ہے"

اُس نے ازراہِ محبت میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگی

"اللہ رحم کرے! آج تھیں ہو کیا رہا ہے؟"

"رحم!" مینے ہاتھ جوڑ کر کہا "اب تو بتا دو!"

میری نگاہیں اُسکی شفاف پیشانی پر پڑین اور معاً خیال آیا کہ صرف اس نازک سے پردے مین اصل حقیقت چھپی ہوئی ہے، کسی دیوانہ خواہش کے ماتحت دل نے کہا ــــــــــ "اسے توڑ کر حقیقت معلوم کر لینا کتنا آسان ہے؟"

پھر خیال سینہ کی طرف منتقل ہو گیا، اُسکے نظر فریب اُبھار کے پیچھے، صاف دل دھڑکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا، وہی جھوٹا، فریبی مکار اور دغا باز دل جسنے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا، مینے چاہا کہ اپنے تیز ناخنون سے اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کر دون تاکہ اُس مین چھپی ہوئی حقیقت، وہ چیز جسے مین دل کی بات سمجھتا تھا جون کی تون معلوم ہو جائے ــــــــ مگر نہین"

لیمپ کا ہلالی شعلہ رفتہ رفتہ بے نور ہو رہا تھا، اُسمین بھی کوئی حرکت نہ تھی، حقیقت کو وہ بھی چھپا رہا تھا۔

دیوارین بتدریج بڑھنے والی دھندلی دھندلی تاریکی مین مٹی جا رہی تھین مگر مجھ سے اُنھین بھی کوئی ہمدردی نہ تھی،

ہر چیز پر ایک قسم کی ویرانی، خوف، دہشت اور سوگ برس رہا تھا۔

"اللہ رحم کر! میرے اچھے"........ "کی حالت پر رحم کر" اُسنے زیرِ لب کہا۔ لیمپ کے زرد شعلہ مین ایک قسم کی تھرتھری پیدا ہوئی، لمحہ بھر کیلئے نیلی سی چمک نمودار ہوئی ــــــ اور گُل ہو گیا۔

گہری تاریکی نے ہمین چھپا لیا

اب مجھے نہ اُسکا چہرہ نظر آ رہا تھا، نہ آنکھین، صرف ایک ہاتھ میرے سر پر رکھا ہوا تھا اور اُس سے محبت کی ایسی قوی سی لہر جسم مین سرایت کر رہی تھی کہ مین مدہوش تھا اور جھوٹ کا خیال خواب کی طرح دماغ سے محو ہو رہا تھا۔ مینے آنکھین بند کر لین اور اور خیال کو غور و فکر، احساس و عمل سے آزاد کر کے صرف اُس روح افزا لمس کی طرف منتقل کر دیا

وہ سچی تھی!...... مین دیکھ رہا تھا کہ اسکی محبت حقیقی اور بے داغ ہے ــــ!!

اندھیرے مین ہلکی ہوئی سی آواز مین کسی نے آہستہ آہستہ کہا:۔

"ذرا اور پاس آ جاؤ.......... مجھے ڈر لگ رہا ہے!"

پھر خاموشی.......... وہی بے معنی خاموشی، اور پھر....... وہی ہلکی ہلکی زیرِ لب گفتگو!

"تم کونسی سچی بات پوچھتے ہو؟"........ مجھے خود معلوم نہین میرے دل مین سوائے تمھارے خیال کے اور کونسی سچی بات ہے؟ ــــــــ آہ! خدا کرے مین پہلے سے جانتی کہ تم اتنے سخت دل نکلو گے............ بس نہین رہو ــــــ دیکھو تو کتنی ڈراونی رات ہے؟!"

یہ کہکر اُسنے میرے سینہ مین اپنی آنکھین چھپا لین۔

مینے نگاہ اُٹھائی تو تاریکی کھڑکیون سے دور ہوکر آہستہ آہستہ دیوار کے گوشون مین مجتمع ہورہی تھی۔ اور رنگین شیشون کے پیچھے کوئی نہایت ہی طویل خوفناک سفید سفید چیز کفنائے ہوئے مُردے کا سا جسم اختیار کر رہی تھی ——!

یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کی بے نور، پتلیان ہمین تک رہی ہین

خوف کیوجہ سے بیساختہ ہمارے جسم مین تھرتھری دوڑ گئی ہم اور زیادہ ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ اُسکے ہلکے ہلکے الفاظ نغمہ کی طرح میرے دل و دماغ مین گونج رہے تھے:۔

"دیکھو تو، کتنی ڈروانی رات ہے؟!"

(۴)

مینے اُسے قتل کر دیا!

جب وہ کھڑکی کے قریب، ایک بے حس اور بے جان مجسمہ کی صورت مین پڑی تھی مینے اُسکی لاش پر اپنا پاؤن رکھ دیا اور خوب ہنسا ——— یہ دیوانگی کی ہنسی نہ تھی ——— جی نہین! مین صرف اسلئے ہنس رہا تھا کہ اب میرا دل قرار پر تھا، اُسے پورا اطمینان وسکون حاصل ہو چکا تھا اور سینہ کی وہ مستقل خلش جسنے مجھے کرب مجسم بنا دیا تھا، اب کافور تھی۔

مینے ذرا جُھک کر اُسکی بے نور آنکھون کو دیکھا:۔

اُف وہ دلکش، روشنی کی تمنی، نیم وا آنکھین —! وہ نرگسی سرشار پُر اسرار آنکھین ——!

یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی موم کی گڑیا سے مستعار لیلی گئین ہین

مین اُنھین اُنگلیون سے چھو سکتا تھا، حسب مرضی کھول سکتا تھا، بند کر سکتا تھا، مطلق خوف محسوس نہ ہوتا تھا اسلئے کہ اُنکی اتھاہ گہرائیون مین اب مکر وفریب، اشتباہ و بدگمانی کا وہ جن موجود نتھا جو ایک زمانہ سے میرے سر پر سوار تھا اور جو مدتون سے میرا خون چوس کر پرورش پا رہا تھا

مین جسوقت گرفتار ہوا اُسوقت بھی ہنسا اور یہ بات اُن لوگون کیلئے جنھون نے مجھے گرفتار کرایا تھا قطعًا ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ وہ مجھے درندہ کہہ رہے تھے اور نفرت وحقارت کے ساتھ میری طرف سے منہ پھیر پھیر کر گالیان دے رہے تھے، شاید کوس بھی رہے ہون

دوسرے لوگ جو ذرا اجنبی تھے میری بدقسمتی سے متاثر ہو کر ازراہ ہمدردی میری طرف بڑھ رہے تھے اور میرے استقلال و اطمینان پر حیرت سے انگشت بدندان تھے

"کوئی دیوانہ ہے" ان الفاظ مین وہ اپنے دلکو تسلی دے رہے تھے۔ اور فی الواقع صرف یہی الفاظ اس بے معنی صورت حال کی تشریح ہو بھی سکتے تھے۔ سب متحیر تھے کہ اسقدر وفا کیش عاشق ہو کر مینے کیون اپنے معصوم و بیگناہ معشوق کو قتل کر دیا۔ پھر یہی نہین اُسے قتل کرنیکے بعد تعجب ایسی کونسی مسرت ہے کہ کسی طرح ہنسی نہین رُکتی۔ صرف ایک خوش مزاج، آزاد منش شخص نے مجھے دوسرے الفاظ مین مخاطب کیا اور وہی الفاظ میری مسرت کو پامال کر گئے، مین مبہوت ہو کر رہ گیا

وہ آہستہ آہستہ ہمدردانہ لہجہ مین کہہ رہا تھا:-

"آہ! اس غریب کی حالت کسقدر قابلِ رحم ہے!"

"بس خبردار! یہی الفاظ زبان سے نہ نکالنا" مینے اُسے ڈانٹ کر کہا نہین کہہ سکتا کہ کن جذبات سے متاثر ہو کر مینے ایک جست کی اور اُس شخص کے سامنے جا کھڑا ہوا

مین یقیناً نہ اُسے مارنا چاہتا تھا، نہ سزا دینا چاہتا تھا مگر پھر بھی تمام مجمع جو مجھے دیوانہ اور مجرم سمجھ رہا تھا خوف و دہشت سے کانپ اُٹھا اور چیخین مار کر اس طرح پیچھے ہٹنے لگا کہ مجھے پھر ہنسی آگئی اور مین نے خوب قہقہے لگائے

اسکے بعد جب لوگ مجھے اُس کمرے سے باہر لے گئے جس مین لاش پڑی تھی مینے بآواز بلند سب سے مخاطب ہو کر کہا:-

"دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی مسرور نہین ہو سکتا، میں بیحد مطمئن ہون" اور یہ واقعہ تھا

(۵)

بچپن مین مینے عجائب گھر مین ایک چیتا دیکھا تھا - اُسے دیکھکر مین اتنا متاثر ہوا تھا کہ مدتون خیال مین اسکی صورت قائم رہی وہ اُن درندون کے مانند نہین تھا جو تماشائیون کو بے معنی اور مبہم نگاہون سے تکا کرتے ہین - وہ ہمیشہ اُقلیدس کے اُصولون کے ماتحت ایک کونے سے دوسرے کونے تک خطِ مستقیم بناتا ہوا ٹہلا کرتا اور ہر مرتبہ ٹھیک اُسی نقطہ پر مڑا کرتا جہان سے چلتا تھا - صرف اُسی آہنی سلاخ سے جسم رگڑتا جو پانچوان قدم اُٹھانے کے بعد اُسکے شانے کے پاس ہوتی سر ایک فلسفیانہ انداز سے جھکا ہوتا اور آنکھین ٹھیک خطِ مستقیم پر سامنے دیکھا کرتین - ایک مرتبہ بھی ایسا اتفاق نہین ہوا کہ اُسنے کسی برابر کی چیز کو دیکھا ہو

دن بھر تماشائیون کا ہجوم اُسکے پنجرے کے سامنے لگا رہتا مگر اُسے اسکی پرواہ بھی نہ ہوتی تھی، وہ بدستور اپنی مقررہ رفتار سے پنجرے مین چہل قدمی کرتا رہتا اور تماشائیون کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا

آنے جانے والون مین سے اکثر اسکی حالت پر اظہار افسوس کرتے اور اکثر مسکرا کر چلے جاتے - لیکن جسوقت وہ تمام جانورون کو دیکھ کر عجائب گھر سے نکلتے تو بالعموم مڑ کر چیتے کے پنجرے کو ایک دو مرتبہ ضرور دیکھ لیتے - خدا معلوم یہ کونسی کشش تھی، بہت ممکن ہے اُنمین اور اس مقید درندے مین کوئی جنسی مناسبت یا صفت مشترک موجود ہو

اسکے بعد جب مین بڑا ہوا تو کتابون مین انسان کو "حیوانِ ناطق" لکھا دیکھا - مینے جسقدر اس مین تحقیق کی چیتے کی مثال میرے سامنے آتی رہی - انسان واقعی حیوان ہے جسے حیوانیت کا جزء چیتے کے ساتھ تقسیم کیا گیا ہے - مگر جنگلی چیتون کے ساتھ نہین بلکہ اُن چیتون کے ساتھ جنھین "مقید رہنے اور کڑھنے" کیلئے تخلیق کیا گیا ہے

مین بھی اسوقت جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری مین بالکل اُسی چیتے کی طرح مقید تھا، مین بھی اُسی طرح کوٹھری کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک خطِ مستقیم پر ٹہلا کرتا اس دوران مین خیالات کے ہجوم سے دماغ اتنا بھاری ہو جاتا کہ

تمام دنیا کے مصائب کا بار مجھے اپنے سر پر معلوم ہونے لگتا

یہ تمام خیالات، ایک نقطہ، صرف ایک خوفناک نقطہ پر قائم تھے اور وہ لفظ "جھوٹ" تھا۔

جیل کی ہر کوٹھری سے، کوٹھری کی ہر دیوار سے، دیوار کی ہر انیٹ سے "جھوٹ" کی آواز میرے کانون مین سانپ کی پھنکار کی طرح آرہی تھی اور میری روح پر ایک تاریک بادل کی طرح چھائی جارہی تھی اب وہ معمولی سانپ کی پھنکار نہین معلوم ہوتی تھی، بلکہ کسی بڑے بھاری خونخوار اژدہے کی پھنکار تھی جو ہر طرف سے میری روح کو اپنی آہنی گرفت مین کس رہا تھا۔ اور جب مین درد کی شدت سے، ایک ایسا احساس لئے ہوئے گویا میرے تمام جسم پر سانپ رینگ رہے ہین، چیخ اُٹھتا تو زبان سے صرف "جھوٹ" پھنکار بنکر نکلتا، جس سے مجھے خود پر بھی یہ شبہ ہوتے لگتا کہ کہین مین سانپ تو نہین ہوگیا ہون

مین ان ہی خیالات مین منہمک صبح سے شام تک ٹہلا کرتا، یہانتک کہ سُرخ پتھرون کا فرش میری نگاہ مین ایک دھندلی اور بے رنگ سی تاریک خندق معلوم ہونے لگتا، پیرون سے فرش کے لمس کا احساس جاتا رہتا اور اکثر یہ محسوس ہونے لگتا گویا مین کسی کہر آلود فضا مین نہایت بلندی سے گرایا جارہا ہوں۔

پھر میرا دل خوف سے اُچھلنے لگتا، اور اُس سے کراہنے کے لہجہ مین وہی پھنکار نکلتی جو اوپر سے، نیچے سے، آسمان سے، زمین سے، درختون سے، انیٹوں سے، غرض کائنات کی ہر چیز سے بازگشت ہوتی ——— اس طرح گویا وہ کسی دوسری دُنیا سے ہزار ہا منزلیں طے کرکے کہر اور برف مین لڑکھڑاتی ہوئی مجھ تک پہونچ رہی ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اسی مدہم پھنکار کے پردے مین ایک ایسا تیز طوفانی جھونکا ہے جو درختون کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک سکتا ہے لیکن مجھ تک پہونچنے مین وہ صرف اس زیر لب کہے ہوئے آہستہ لفظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے

"جھوٹ"

اس ذلیل لفظ نے مجھے برافروختہ کردیا، اور مین نے زور سے فرش پر اپنا پاؤن مارتے ہوئے کہا ———

"کوئی جھوٹ نہین ہے! .... مینے جھوٹ کا خاتمہ کردیا ہے!"

یہ کہکر مین قصداً دوسری طرف مخاطب ہوگیا مگر بیکار، جس جواب سے ڈرتا تھا وہی جواب خاموشی کے ساتھ فرش کی خوفناک خندق سے برآمد ہوا:۔

"جھوٹ!"

آہ! ...... اب مجھے احساس ہوتا ہے مینے بڑی سخت غلطی کی کہ جھوٹی عورت کو قتل کردیا لیکن اُسکے جھوٹ کو بنا دیا۔!

پس عوام کو میری یہ نصیحت ہے کہ ہرگز کسی جھوٹ یا فریب کار عورت کو قتل نہ کیا جائے تاوقتیکہ استدعا و التجا سے جبر و تشدد سے جس طرح بن پڑے اُسکی دلی کیفیت نہ معلوم کرلیجائے۔

کوٹھری مین مسلسل ۲۷ گھنٹہ چہل قدمی کرنے کے بعد مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون

(۶)

وہ جگہ جہان اُسنے سچی بات کے ساتھ اپنا جھوٹ بھی چھپالیا ہے نہایت اندھیری، اور خوفناک ہے ــــــ مگر مینے ارادہ کرلیا ہے کہ وہان بھی اُسکا پیچھا نہ چھوڑون، خدا کے سامنے اُسے پیش کرونگا اور اُسکے قدمون پر گر کر رو دونگا، وہان تو کوئی بات نہین چھپ سکتی۔

خدا میرا انصاف کریگا!

لیکن خدا!؟ اوہو .... خدا ــــ یہ بھی جھوٹ، محض فریب، وہان بھی صرف یہی بے پایان تاریکی ہے اور صد ہا صدیون، ہزار ہا قرنون کا ایک لامحدود خلا! لیکن "وہ" وہان بھی نہین ہے ــــــ کہین بھی نہین ہے!

صرف جھوٹ اُسکی یادگار رہ گیا ہے، بالکل غیر فانی یادگار!!

فضا کے ذرات مین، دُنیا کی گردش مین، عقبیٰ کی تاریکی مین، وقت کی رفتار مین ہر جگہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے فریب ہی فریب بھرا ہوا ہے۔ اور جب مین سانس لیتا ہون وہ ہوا کے ساتھ میرے پھیپھڑے مین داخل ہو کر سانپ کی طرح پھنکارتا ہے اور دلکو ڈس کر سارے جسم مین زہر ہی زہر پھیلائے دیتا ہے ــــــ نہایت ہی قاتل زہر!

آہ! حقیقت کی تلاش بھی انسان کی کتنی زبردست دیوانگی ہے؟ انسان کیون مجبور ہے؟!

کوئی نہین بتاتا ــــــ!!

"سب فریب .... خدا کیلئے ــــ مین مرا ــــــ لوگو مجھے بچاؤ!!"

طالب باغپتی

بنگالی ناولون کے ترجمے

بنگالی دلھن۔ ایک نئی دلھن کے پُرحسرت ارمان شوہر سے جدائی کی تکالیف نیک نیتی سے استقلال اور وفاداری کی تصویرین اسکی سلاست زبان دانی عبارت وغیرہ قابل دید و داد ہے۔ قیمت ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ۱۰ر

پرتاب ایک تاریخی ناول غدر ۱۸۵۷ء کا سنسنی خیز واقعہ نہایت پُرجوش طریقہ سے لکھا گیا ہے جس مین درد عشق کوٹ کوٹ کر بھرا ہے طرز بیان دنیا سے نرالا ہے عشق حقیقی و مجازی کے ایسے دلکش و روشن پہلو دکھائے ہین کہ دیکھکر دل پر ایک گہرا اثر پڑتا ہے قیمت ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ۱۰ر

مرنالنی۔ عورتون کی وفاداری پر بحث۔ عبرت و نصیحت کا خزانہ قیمت ــ ــ ــ ــ ۸ر "مینجر نگار"

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(سلسلۂ سابق)

حصول علم کے دو طریقے
وحی اور الہام کے امتیازی پہلو

امام غزالی فرماتے ہین، حصول علم کے دو طریقے ہین، ایک وہ جو مطالعہ اور غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ علما کا طریقہ ہے، دوسرا وہ ہے، جو اچانک قلب مین داخل ہوتا ہے، مخلوق کو خبر بھی نہین ہوتی کہ یہ علم اسے کیونکر حاصل ہوا، کہان سے آیا، اور اسے کیون موقوف ہوا، یہ صرف عالم ملکوت کا تصور ہوتا ہے، جسے وہ اپنے قلب مین پاتا ہے، جب اس قسم کا علم اولیا، اللہ کو عطا کیا جاتا ہے، تو اسے "الہام" کہتے ہین، الہام کے لفظی معنی ہین "جذب کرنا" میکڈونلڈ کہتا ہے یہ لفظ صرف ایک جگہ قرآن مین، استعمال ہوا ہے، فالھمھا فجورھا وتقوٰیھا (والشمس) لیکن نہین کہا جا سکتا ہے کہ اسکا استعمال قدیم معنی مین ہوا ہے، یا دینی اصطلاحی معنی مین، وحی اس علم اعلی کو کہتے ہین جو انبیا کو عطا ہوتا ہے، وحی کے لفظی معنی "ترسیل" اور "ترقیم پیام" کے ہین الہام اور وحی مین فرق یہ ہے، کہ جو فرشتہ پیام علم لیکر آتا ہے، ملہم کی نظرون کے سامنے ظاہر نہین ہوتا، اسکے برخلاف وحی جب انبیا پر آتی ہے تو وہ فرشتہ کو دیکھتے ہین

قلب و نفس کے اسرار

میکڈونلڈ نے "رہروطریق کی تربیت" کے عنوان سے ایک مفصل باب ہی لکھا ہے، اس مین ایک جگہ لکھتا ہے، "اب مین امام غزالی کی تعلیم قلب کو پیش کرنا چاہتا ہون، مینے قلب کا ترجمہ انگریزی مین "دل" (Heart) کیا ہے، حالانکہ قلب و دل کے معانی مین خاص فرق ہے، انگریزی لفظ Heart کہنے سے معاً جذبات، تاثرات، خواہشات اور وجدان کے خیالات سامنے آجاتے ہین، اسمین بنیادی حیثیت سے عموماً جذبی خصوصیت پائی جاتی ہے، ذہنی یا عقلی خصوصیت کا اسمین کم حصہ ہوتا ہے، لیکن عربی لفظ قلب کے یہ معنی نہین، یہ زیادہ تر دماغ کا مستقر ہے، ایک مسلم شارح اسے "لطیفہ ربانیہ" سے نامزد کرتا ہے" ۔۔۔۔۔۔ جو ایک غیر مادی عنصر ہے اور عالم غائب سے متعلق ہے، امام غزالی ماہیت قلب کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہین کہ اب قلب کے متعلق مزید مباحث نہین پیش کئے جا سکتے قلب کے متعلق مزید سوالات عملی سائنس کے بجائے تخئیلی سائنس سے علاقہ رکھتے ہین، حیات عملی کا مقصد صفات قلب کا جان لینا ہے، اسکی ذاتی اور طبعی ماہیت کی شرح، غیر متعلق بحث ہے، اسمین بھی روح کا سا سوال پایا جاتا ہے، جس پر آنحضرت نے سکوت کیا ہے، تاہم شارح لکھتا ہے، کہ قلب ایک "روح عقلیہ" ہے روح اسکا داخلی حصہ ہے، اور روح حیوانیہ اسکا مرکب ہے، صرفی حیثیت سے "نفس" کے معنی سانس کے ہین، اور عبرانی مین لفظ "نفش" اسکا مترادف ہے، جسکا ترجمہ بائبل مین روح اور بعض اوقات

سانس، زندگی اور خواہش (ϵπιθυμία) کیا گیا ہے، میکڈونلڈ کے نظریہ "نفس" کے متعلق میڈیم بلاوٹسکی کی بھی یہی تحقیق ہے، جو اسکی قابل قدر کتاب (Isis unveiled) "خدائے مکشوف" مین پائی جاتی ہے، اسکے بعد میکڈونلڈ نے امام غزالی کے وہ مباحث پیش کئے ہین، جو انہون نے قرآن کے مختلف مقامات مین لفظ نفس کے مختلف استعمال کے متعلق لکھا ہے قرآن مجید مین اسکے تین خصوصیات بتائے گئے ہین، مطمئنہ، لوامہ اور امارہ (فجر، قیامہ، یوسف)

"صوفی کی وجہ تسمیہ اور تاریخ تصوف پر مشرقی و مغربی علما کے نظریات

قبل اسکے کہ شریعت اسلامیہ کے صوفیانہ عناصر پر روشنی ڈالی جائے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے متعلق اس عالمانہ اور محققانہ بحث کی تلخیص کر لیجائے جو لفظ "صوفی" کے ماتحت انسائیکلوپیڈیا[۵۱] آف رلجن اینڈ اتھکس مین پائی جاتی ہے، ہر چند تاریخ تصوف کے متعلق گزشتہ اوراق مین ایک حد تک بحث ہو چکی ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا کے مفصلہ ذیل مقالہ مین بعض اہم معلومات پائے جاتے ہین

بعضون کا خیال ہے، کہ یہ صف سے مشتق ہے، جسکا مفہوم یہ ہے کہ صوفیہ تعلقات الٰہیہ مین شریک اول صف ہین، بعضون نے اسے "اہل صفہ[۵۲]" سے منسوب کیا ہے، القشیری اور دوسرے صوفیہ ان تمام تعبیرات مین کسی کو تسلیم نہین کرتے، ابو نصر السراج نے تسلیم کیا ہے کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے (بحوالہ کتاب اللمع مرتبہ نکلسن) جاسف وان ہیمر کی تحقیق ہے کہ صوفیہ ہندوستان کے (Gymnosophists)[۵۳] سے متعلق ہین اور یہ کہ "صوفی" اور "صفا" دو نو یونانی الفاظ (σοφός اور σοφης) کی طرح ایک ہی مادہ سے ہین تھالک نے اسکی تردید کی ہے لیکن عہد جدید کے ایک عالم اڈبسرٹ مرکس نے وان ہیمر کے نظریہ کی تائید کی ہے، نالڈک نے جو اسٹرسبرگ یونیورسٹی …… مین عربی کا پروفیسر تھا، ۱۸۹۴ء مین مسئلہ کو حل کر دیا، اسنے دکھایا کہ لفظ σοφός ارمی Aramaic

۵۱ انسائیکلوپیڈیا مین جو طویل مقالہ ہے، وہ مشرق اور مغرب کے مشاہیر کی علمی تصنیفات سے مستفاد ہے، چنانچہ مقالہ نگار نے ماخذ کا تذکرہ کرتے ہوئے، عبد القادر جیلانی، حلاج، ابن طفیل، رومی، ابن عربی، الشعرانی اور سہروردی کے اسمائے گرامی لکھے ہین، مقالہ نگار نے جرمنی، انگلستان، فرانس کے مشہور مستشرقین کی تصنیفات سے بھی استفادہ کیا ہے، اس سلسلہ مین اسنے پروفیسر گولڈزیہر، ڈی ایس مارگولیتھ، ایچ فرنیک، آر ہارٹمین وغیرہ کی کتابونکا بھی گہرا مطالعہ کیا،

۵۲ اہل صفہ عہد نبوت کی وہ جماعت صحابہ تھی جو غربت اور افلاس کے باعث مسجد نبوی کے نزدیک ایک چبوترہ پر اقامت گزین رہتی، امور دنیوی سے انہین کوئی تعلق نہ تھا وہ ہمیشہ تلاوت قرآن، اور عبادت مین مشغول رہتے

۵۳ "انسائیکلوپیڈیا آف رلجن اینڈ اتھکس" مین لفظ تھیاسفی کے ماتحت مقالہ نگار نے عالمانہ اور محققانہ بحث کرتے ہوئے ہندوستانی تصوف کے چار ماخذ قرار دیئے ہین، اپنشد، ویدانت، سانکھیہ (فلسفہ) یوگا، (فلسفہ) اور اسکے بعد جین اور بدھ مذہب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کس طرح تھیاسفی (ہندی) مذہب کی شکل مین رونما ہوئی،

مین بھی نہین پایا جاتا، اسلئے عربی زبان مین پایا جانا قرین قیاس نہین، دوسری بات یہ ہے کہ ارمی اور عربی دونو زبان مین (ΤΜ'S ، ωσοφ اور φος Τσσ ، Φ) پائے جاتے ہین، عربی مین یونانی حرف "σ" کی جگہ پر حرف سین استعمال ہوتا ہے اگر وان ہیمر کا نظریہ صحیح ہوتا تو لفظ صوفی مین پہلا حرف "صاد" کی بجائے "سین" ہوتا، نالڈک نے یہ بھی دکھایا کہ لباس الصوف ادب کی ابتدائی کتابون مین پایا جاتا ہے، جسکے متعلق یہ بھی ہے، کہ اسے وہ شخص پہنتا تھا، جو تارک الدنیا ہوتا، فارسی زبان مین تارک الدنیا درویشونکے متعلق "پشمینہ پوش" کا لقب پایا جاتا ہے، یہ مسیحی راہبون سے لیا گیا، جب حماد بن سلمی (۷۸۲ء) بصرہ مین آئے تو انھون نے فرقد السنجی سے جو پشمینہ (صوف) کا لباس پہنے ہوئے تھا کہا کہ یہ لباس اتار دو، چونکہ اسے نصاری پہنتے ہین، قشیری کا بیان ہے، کہ اسکا رواج سنہ ۲۰۰ھ (۸۱۵ء) مین ہوا السراج کا خیال ہے، کہ اہل بغداد نے اسے ایجاد کیا، ہر چند "صوفی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ موجود نہین، لیکن یہ بھی محض فضول گوئی ہے، کہ یہ اصطلاح آن حضرت کے زمانہ سے متعلق ہے، یا بعثت اسلام سے قبل پائی جاتی تھی لیکن اسکا رواج دوسری صدی ہجری کے اخیر مین ہوا، جبکہ زاہدانہ زندگی سے صوفیانہ زندگی کی طرف رجحان ہو رہا تھا، تیسری اور چوتھی صدی کے صوفیہ خود کو آن حضرت صلعم کے سچے متبعین مین شمار کرتے تھے، سب سے پہلا مصنف جس نے عربی زبان مین لفظ "صوفی" استعمال کیا جاحظ بصری (۸۶۹ء) ہے

اسلام مین تصوف کی ابتدا، ہملوگونکے سامنے اس عہد کی یاد تازہ کر دیتی ہے، جبکہ زہد کی تحریک شروع ہوئی، جو عموماً ساتوین صدی مین مسیحی اثرات کے ماتحت تھی، اس تحریک مین بہتیرے زاہدون کا نام پایا جاتا ہے، یہ تحریک مذہبی (اسلامی) پہلو رکھتی تھی اس مین مذہبی عنصر کا گہرا رنگ غالب ہے، جسکی بنا مفصلہ ذیل افکار و عقاید پر تھی، ضعف انسانی لیے انتہا خوف خدا، اور اسکے ارادہ کی تسلیم کامل اس زمانہ مین صوفیہ کا کوئی منظم شیرازہ نہ تھا، اہل بصرہ نے تصوف کے تعلیمی عقاید کی بنیاد ڈالی، اہل شام نے اسکے ظاہری رنگ وروپ مین حصہ لیا، حسن بصری فرماتے تھے کہ تصوف عاجزی کا نام ہے، نہ کہ لباس و غذا کا، دوسری صدی کے صوفیہ پر مذہبی رنگ کا غلبہ تھا، اور وہ مذہبی قانون کے پابند تھے، انہین لوگون نے غربت و افلاس فروتنی و انکساری اور ترک تلذذات کا رواج دیا، اگر وہ خدا کی محبت رکھتے تھے تو اس سے زیادہ انہین اسکا خوف تھا، وہ زہد یا تھیاسفی کے درمیانی مقام مین تھے، ان پر صحیح معنی مین رضا (Quietism) کی اصطلاح منطبق ہوتی ہے، اس ضمن مین مفصلہ ذیل اشخاص کا تذکرہ خاص اہمیت رکھتا ہے

"ابراہیم ابن ادہم جو بلخ کے شہزادہ تھے، جنکے واقعات زندگی گوتم بدھ سے ملتے ہوئے ہین شفیق بلخی جنھون نے عقیدہ توکل کو ترقی دی، رابعہ جو بصرہ مین پیدا ہوئین اور بیت المقدس مین وفات کی، معروف الکرخی بغدادی، وہ شخص ہین جنکی پہلی تاریخی تعریف تصوف یہ ہے، کہ تغیرات قبول کرنا، اور جو خدا کے مخلوقات کے ہاتھ مین ہے، اسے ترک کر دینا"

تیسری صدی ہجری مین تصوف قطعی طور پر ایک عہد جدید سے روشناس ہوتا ہے، ہر چند رضا (Quietism) اور زہد (Asceticism) کے عقاید اب بھی محکم طور سے متداول تھے، لیکن انکے مقابلہ مین تخیل اور وحدت فی الکثرت کی فکر و احساس

زیادہ زور پکڑ رہی تھی، لیکن موخر الذکر عقاید کو جو تصوف کی روح رواں ہین اس فتح کے باعث زہد و رضا کے ابتدائی صوفیانہ عقاید کو تفوق زمانی دینا یا انھین کو تصوف کا سبب آفرینش بتانا تاریخی غلطی ہے، لیکن اسکا پتہ لگانے مین کہ صوفیہ نے رضا سے وحدت فی الکثرت کا عقیدہ کیون اختیار کیا، ہم لوگ نہین کہہ سکتے کہ صوفیہ نے غیر اسلامی عقاید سے جلب منفعت نہین کیا مسیحیت فلاطونیت جدید اور بدھ مذہب کی اثر آفرینی، ناقابل انکار حقیقت ہے، ہر چند اس مسئلہ پر موضحانہ بحث کرنیکا موقعہ نہین لیکن اس نظریہ کو ثابت کرنے کیلئے کافی مواد موجود ہے، تیسری صدی کا تصوف تاریخ کے تمام صوفیانہ مسالک کی طرح مختلف اثرات کی پیداوار تھا، مثلاً، مسلمانون کے مسلۂ توحید کی تخئیلی ترقی، مسیحی زہد و تصوف، عارفیہ، یونانی اور ہندی فلسفہ، بعضون نے غلطی کی ہے، کہ انھون نے تصوف کو صرف ایک مسلک ویدانت یا فلسفہ اشراقی کا نتیجہ تصور کیا، انکا خیال ہے کہ تصوف، ایک سامی مذہب کے مقابلہ مین جو زبردستی منوایا گیا تھا آریہ قوم کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے

موجودہ دور کے علمانے کسی ایک مسلک کو ماخذ تصوف قرار دینے کے بجائے، مختلف اثرات کا مطالعہ کیا اور تشریح کی کہ کس مسلک نے کونسا عقیدہ تصوف مین داخل کیا، یہ اس ماحول کے اثرات ہین جسمین تصوف نے نشو و نما پائی، اور اسمین وہ تمام سیاسی تمدنی، اور ذہنی حالات شامل ہین جو ارتقائے تصوف کی مدد ہوئین، مثلاً عہد امویہ کی تباہ کن خانہ جنگیان، ابتدائے عہد عباسیہ کی ملحدانہ اور عقلی امواج، علماکی فرقہ دارانہ، اور فقیہانہ شورش پسندیان، تیسری صدی مین ارتقاء تصوف کے مفصلہ ذیل اسباب تھے۔

قدیم صوفیہ اپنی زندگی کا ہر قول، ہر فعل، اور ہر خیال مرضی الہیہ کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے تھے اس اصول نے فطرتاً محبت الٰہی (جو رضا کی سب سے بڑی صورت ہے) اور "حال" (جو بالقصد یا بلا قصد زاہدانہ ریاضت کا نتیجہ ہے) کے عقاید پیدا کئے، ہر چند قدیم صوفیہ متشرع تھے، اسلام سے انکا تعلق ایسا ہی تھا جس طرح دور وسطی مین ہسپانوی صوفیہ کا تعلق رومن کیتھلک چرچ سے، جلد یا بدیر عشق و حال کے ایک مذہب کا مذہب اسلام کے مخالف ہونا ناگزیر تھا، حضرت رابعہ بصریہؒ نے ظاہر کیا کہ مجھے نہ تو جہنم کا خوف باقی ہے نہ بہشت کی طلب وامید میرے دل مین محبت نبویؐ بھی نہین چونکہ مین خدا کی محبت مین اسقدر جذب ہون کہ کسی دوسری ذات سے محبت یا نفرت کیلئے میرے دل مین جگہ ہی نہین[لہ] بتدریج خالق و مخلوق کے حجابات دور کر دئے گئے، توحید کی تعریف وحدت فی الکثرت قرار پائی، خدا کی ذات یکتا و بے مثل جو انسانی رسائی سے بالاتر تھی، "الحق" کی صورت مین مبدل ہو گئی جسکی شان تجلی ہر مخلوق مین موجود ہے، یہانتک کہ صوفیہ کی وہ ہستی جو عالم حال مین "خودی" کے فنا اور شعور انفرادی کے اضمحلال کا نتیجہ ہے، ذات حق کا پرتو قرار پا گئی اس تعلیم کو جسقدر بھی دوسرے معانی اور مجازی رنگ مین کیون نہ پیش کیا جائے ـــ

لہ اسی طرح کا ایک واقعہ تاریخ فرشتہ مین حضرت ابو الحسن خرقانیؒ کے متعلق بھی پایا جاتا ہے، محمود غزنوی نے آپ کو لکھ بھیجا تھا اطیعو اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (قرآن) اور اپنے حضور مین طلب کیا تھا، حضرت ابو الحسن خرقانیؒ نے جواب دیا کہ ـ اطیعو اللہ مین ایسا مستغرق ہون، کو اطیعوا الرسول سے شرم آتی ہے، (یعنی حق اطاعت رسول ادا نہ کر سکنے کے باعث شرمندہ ہون) اولی الامر مین کیون کر مشغول ہو سکتا ہون

لیکن یہ تصوف کی روح رواں ہے، اور خصوصیت کیساتھ غیر اسلامی مبادی سے حاصل کی گئی ہے، مرکس نے یقیناً زیادتی کی کہ اسنے اسے بالکل یونانی کہدیا، اور تخصیص بھی کردی کہ یہ تعلیم دیا نیسیوس کی تحریرون سے لیگئی ہے، ہرچند ممکن ہے، کہ یہ تعلیم دیا نیسیوس کی تحریرون اور ارسطو کی الہیات سے بھی اثر پذیر ہوئی ہو

ذوالنون مصری فرماتے تھے کہ سچا مرید وہ ہے، جو خدا سے بھی بڑھکر اپنے شیخ کی اطاعت کرے، (تذکرۃ الاولیا) امام غزالی وحدت فی الکثرت کا عقیدہ نہین رکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ خدا کی ذات جداگانہ ہے، وہ یکتا ہے بے نظیر ہے، صوفیہ نے قطب، نقبا اوتاد، ابرار ابدال کا عقیدہ اسمعیلیہ فرقے سے لیا ہے

صوفیانہ شاعری صوفیہ نے مذہبی جذبہ پیدا کرنیکا جو ظاہری عمل وضع کیا، اسمین سب سے زیادہ قوی اور اثر آفرین سماع ہے یعنی موسیقی اور غنا کی سماعت، بہت سی روایتین ایسی پائی جاتی ہین کہ کسی لڑکی نے یا صوفیہ ہی مین سے کسی نے ایک نظم کے چند اشعار پڑھ دئے، اور صوفیہ بیخود ہوگئے، انھین وجد آگیا، ایسے اشعار ظاہری معنی پر مبنی ہوتے تھے، صوفیانہ نشاط کا نتیجہ نہ تھے، شاعر خود اشعار کو تاویلات پر مبنی نہین رکھتا تھا بلکہ صوفیہ اپنے ذوق مین اشعار کی صوفیانہ تاویلین کرتے تھے، "صوفیانہ شاعری" کا یہ حال نہین یہان شاعر اپنے کلام مین خود صوفیانہ رنگ پیدا کر دیتا ہے، ہرچند ظاہری معنی کے اعتبار سے اشعار سرمایۂ تشبیب ہی کیون نہون؟ اور اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ مجاز و حقیقت مین امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے، اور جب تک ہم لوگ شاعر کے رجحان اور ارادہ سے واقف نہون، یہ بتانا دقت طلب امر ہے کہ عشق و محبت کے جو جذبات اسنے ادا کئے ہین وہ کسی انسانی محبت کا نتیجہ ہین، یا حب الٰہی کا اگر یہ سوال کیا جائے کہ شعرا نے ایسا انداز کلام کیون اختیار کیا تو کہا جا سکتا ہے کہ انھون نے ولولہ اور وجد پیدا کرنیکی اس سے بہتر صورت نہین دیکھی کہ باطنی محبت کے انوار اطراف کو ظاہری محبت کے رنگ مین ادا کیا جائے

اس قسم کی صوفیانہ شاعری فارسی ادب کی شان مخصوص ہے، یہ رنگ سخن ابوسعید بن ابی الخیر کی رباعیات فریدالدین عطار، جلال الدین رومی، جامی کی شاعری اور گلشن راز محمود شبستانی مین پایا جاتا ہے، مغربی علما کیلیے عربی شاعری کا ایسا مذاق دلکش نہین، لیکن ابن الفرید کا کلام بہت عمدہ ہے، اور ابن عربی کے کلام مین ہرچند گہرے معانی پنہان ہوتے ہین لیکن بعض نظمین نفاست ادا کے اعتبار سے بہت اچھی ہین، ترکی شعرا مین صوفیانہ رنگ سخن کے اعتبار سے نسیمی بہت اچھا شاعر ہے، ہرچند صوفیانہ شاعری مین نفاست بیان اور طرز اعلی پایا جاتا ہے لیکن اسے علمی صنعت کی پیداوار نہین کہہ سکتے، جلال الدین رومی، ابن الفرید اور ابن عربی کی بہترین غزلین عالم بیخودی مین کہی ہوئی ہین، جنھین ہم لوگ (Automatic writing) تحریر غیر اختیاری" سے تعبیر کرسکتے ہین، ابن عربی کی شرح ترجمان الاشواق سے پتہ چلتا ہے کہ خود شاعر اپنے بعض کلام کے معنی نہین بتا سکتا،

---

(۱) موجودہ علم روحانیات (Spiritualism) کی استقراء و ترقی مین یہ ایک نہایت حیرت انگیز مشاہدہ ہے۔

شریعت اسلامیہ کے صوفیانہ عناصر اور طریقت کی افراط و تفریط

ابھی تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ تصوف کے خارجی و داخلی مباحث سے متعلق تھا، اب یہان دو بحثین پیدا ہوتی ہین، ایک یہ کہ آیا قرآن مجید مین مبادی تصوف کے متعلق سواد پائے جاتے ہین یا نہین؟ سرور کائنات اور صحابہ کی زندگی مین صوفیانہ ذوق کا پتہ ملتا ہے یا نہین؟ علمائے مغرب کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے، کہ لفظ صوفی اسلام کی پیداوار نہین، انسائیکلوپیڈیا مین "صوفی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق ایک رائے یہ بھی پائی جاتی ہے، کہ یہ "صفہ" سے لیا گیا ہے، یہ ایک قرین قیاس امر تھا کیونکہ ترک دنیا، غربت، رضائے آلہی، عبادت، تعلقات ازدواجی سے انقطاع، یہ تمام باتین عہد نبوت کے اصحاب صفہ مین پائی جاتی ہین، لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی نظرانداز نہین کیجا سکتی، کہ ابتدائے اسلام کی پریشان حالی کے باعث صحابہ کی ایسی جماعت تھی، وہ اسلامی قانون سمجھکر یا باوجود وسعت ایسی زندگی نہین گزارتے تھے علاوہ برین علامہ قشیری وغیرہ صوفی کی نسبت صفہ کو تسلیم نہین کرتے، الغرض صوفیانہ ادبیات کا مطالعہ کرنیکے بعد قول راجح یہی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ دوسری صدی کی پیداوار ہے، عہد نبوت وصحابہ مین اسکا وجود نہ تھا، اور پر لطف یہ ہے کہ مسیحی راہبونکی دیکھا دیکھی اسلام مین اس بدعت نے رواج پایا، جیسا کہ میکڈونلڈ، نکلسن اور ابن خلدون وغیرہ نے لکھا ہے، خود قرآن مجید مین نہ کہین صوف کا لفظ آیا ہے، نہ صوفی کا البتہ امام بخاریؒ نے القارعہ کی تفسیر مین حضرت عبداللہ ابن مسعود کی یہ قرآۃ بھی نقل کی ہے کہ وہ کالعھن المنفوش کو کالصوف المنفوش پڑھا کرتے تھے، مگر صحیفہ مین یہ لفظ نہین، صف اور صفا کا لفظ قرآن مجید مین پایا جاتا ہے، لیکن علمانے انکی طرف صوفی کی نسبت ہی نہین دی، لہذا ایک متشرع لفظ "صوفی" ہی پر اعتراض رکھتا ہے، اور ایک غیر جانبدار محقق کے سامنے تو اسے اسلام کی طرف منسوب کرنا ایک تاویل بیجا سے زیادہ نہین۔

اب مین اپنے عنوان بحث کو دو حیثیت سے واضح کرنا چاہتا ہون، قرآن کی تعلیم، اور آن حضرت وصحابہؓ کے واقعات زندگی، موخرالذکر بحث کیلئے مینے صرف احادیث کو ماخذ قرار دیا ہے، ورنہ تاریخی اور کلامیہ مباحث سے جو اوپر گزر چکے یہ بات ثابت ہوچکی ہے، کہ صوفیانہ تخیلات محض اسلام ہی سے نہین لئے گئے، ہرچند میکڈونلڈ کی کتاب "ریلجس اٹیچیوڈ اینڈ لائف ان اسلام"، مین صحابہ کرام کے زاہدانہ رجحان، (Asceticism) اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن مین قرون اولیٰ مین مسلمانون کے مسلک رضا (Quietism) کے متعلق فلسفیانہ مباحث پائے جاتے ہین

نکلسن نے تو "صوفیائے اسلام" مین یہ بھی لکھا ہے، کہ اگر پیروان اسلام دنیا کے اور مسالک بدھ، مسیحی اشراقی وغیرہ سے الگ بھی رہتے، تو بھی اسلام کے اندر قرآنی تعلیم کی بناپر تصوف کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور رونما ہوتی، لہذا جب ایک محقق قرآن مجید پر اس نقطہ نظر سے غور کرتا ہے، تو وہ مفصلہ ذیل آیات کی اہمیت نظرانداز نہین کرسکتا۔

(۱) زندگی کی بے ثباتی، موت کا ناگزیر ہونا، دنیا مین انہماک سے پرہیز،

کل نفس ذائقة الموت وانما توفون اجورکم یوم القیامه فمن زحزح عن النار وادخل الجنته

فقد فاز ط وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور (آل عمران)

ہر نفس کیلیے موت ناگزیر ہے، اور تمھین قیامت کے دن تمہاری مزدوری ملیگی، اور وہ جو آتش دوزخ سے کنارے رہیگا اور جنت مین داخل ہوگا، خوش ہوگا، اور دنیا کی زندگی ایک دھوکا کی ٹٹی ہے

وانفقوا مما رزقنکم من قبل ان یاتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصالحین ○ ولن یؤخر اللہ نفسًا اذا جاء اجلھا (منافقون)

اور جو کچھ مینے تمھین روزی دی ہے، اس مین سے خرچ کرو، اسکے قبل کہ تم مین سے کسی ایک کو موت آئے اور کہے خدا، اگر مجھے ایک مختصر میعاد (زندگی) عطا کرے، تو مین صدقہ دون، اور مین نکوکارون مین سے ہوجاؤن، اور جسوقت جس نفس کی قضا آگئی اسمین تاخیر نہ ہوگی

ان اجل اللہ اذا جاء لا یؤخر (نوح)

جب خدا کی میعاد مقررہ آتی ہے، تو اسمین فرق نہین ہوتا

وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منہا ومن یرد ثواب الآخرۃ نؤتہ منہا وسنجزی الشاکرین (آل عمران)

کوئی نفس خدا کی اجازت کے بغیر نہین مرسکتا، جسکی تعین ہو چکی ہے اور جو اجر دنیوی کا خواہشمند ہے، اسے وہی ملیگا، اور اور جو اجر آخرت کا طالب ہے، اسے ثواب اخروی نصیب ہوگا اور قریب ہے کہ ہم شکر کرنے والونکو بدلہ دین،

یا ایہا الذین امنوا لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ (منافقون)

اے ایمان والو ایسا نہو کہ تمھاری دولت، اور تمھاری اولاد تمھین ذکر الٰہی سے اپنی طرف پھنسالیں

یا ایہا الذین امنوا ان من ازواجکم واولادکم عدوا لکم فاحذروھم وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور الرحیم - انما اموالکم واولادکم فتنۃ ط واللہ عندہ اجر عظیم (تغابن)

اے ایمان والو! تمھاری بیویان اور تمھاری اولاد تمھارے دشمن ہین، ان سے واقف رہو اور اگر تم ان سے درگزر کرو اور انکے قصور معاف کردو، پس اسے بخشش کرنے والا، رحم کرنے والا ہے، تمھاری دولت اور تمھاری اولاد فتنہ ہین، اور اللہ کے پاس اجر عظیم ہے

زین للذین کفروا الحیوٰۃ الدنیا (بقرہ)

کافرون کو حیات دنیوی کی زینت ملی

زین للناس حب الشہوٰت من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ط ذلک متاع الحیوٰۃ الدنیا واللہ عندہ حسن الماٰب ○ قل اؤنبئکم

بخیر من ذلکم (آل عمران)

(۲) ذکر و تسبیح کے متعلق قرآن مجید مین کثرت سے آیات پائی جاتی ہین، مثلاً

والذاکر واللہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبھم (آل عمران)

اور کھڑے بیٹھے، اور پہلو پر اللہ کا ذکر کرتے ہین

فاذکرونی اذکرکم (بقرہ)

پس تم میرا ذکر کرو مین تمھین یاد کرونگا

قرآن نے ذکر و تسبیح کی تعلیم دی ہے، لیکن اصطلاحات صوفیہ مین ذکر و تسبیح کے یہ معنی نہین، جو قرآن سے ثابت ہوتا ہے، اور جس پر خود سرور کائنات اور صحابہؓ کا عمل رہا، صوفیانہ "ذکر" کے متعلق خلوت، خاص تعداد وغیرہ ضروری ہین، جس کی ایک مثال اس سے قبل لین کی کتاب سے لکھی جا چکی ہے، ایسی جفاکشی نہ قرآن کی تعلیم تھی، نہ صحابہ کا دستور العمل، غالباً اسی غلو عبادت سے قرآن مین سرور کائنات کو منع کیا گیا ہے،

قم اللیل الا قلیلاً نصفہ او انقص منہ قلیلا۔ "مراقبہ ذات" ہندوستان کی چیز ہے، جو "دھیانہ" کے نام سے ہندی فلسفہ مین پائی جاتی ہے، دانہ تسبیح کا استعمال بدھ مذہب کے راہبون سے لیا گیا ہے، اسلام کو ان سے تعلق نہین، صوفیا مراقبہ ذات تو ایک قسم کی بت پرستی ہے، اور اگر صوفیائے کرام نے اسے جائز رکھا ہے تو پھر "پرستاران صنم" سے گلہ کیسا؟ اور "رد کفر" کے کیا معنی؟ بدھ مذہب کے بعض صوفیانہ پہلوؤن کے متعلق میڈیم بلیوٹسکی نے اپنی کتاب "تعلیم باطنی Secret doctrine") مین روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتی ہین

> "بودھی"، ایک قسم کی وجد انگیزانہ کیفیت کا نام ہے، جس مین صوفی علم روحانیہ کے بلند نشیمن پر پہونچ جاتا ہے (غالباً صوفیانہ "معرفت" کا تخیل بھی ہندی فلسفہ کا منت کش ہے) گوتم بدھ کی تعلیم کے دو پہلو تھے، ظاہری اور باطنی بدھ، باطنی تعلیم اپنے مسترشدین کو ایک غار مین بہ مقام راجگیر دیا کرتا، جو گلدھ کا قدیم پایہ تخت تھا، اور بعض علمائے آثار کا بیان ہے کہ فاہین (چینی سیاح) اسی کو "چیتا غار" لکھا ہے بدھ اس خاک اوڑھا تھا، جو آریہ قوم کا مسکن تھی، وہ وہ ایک ہندو اور قومیت کے اعتبار سے چھتری تھا، اسلئے اسکی باطنی تعلیم یقیناً قدیم برہمنون سے مختلف نہ تھی، اسکا مذہب ایسے ممالک چین، جاپان، سیام برما وغیرہ مین پہونچا جو ہندوستان کی مابعد الطبعی تخیلات قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، اسلئے بدھ کی تعلیم کے متعلق ان ممالک مین غلط فہمیان پائی جاتی ہین،

اسی طرح اتحاد، وصل وغیرہ کی جو صوفیانہ تعبیرات ہین وہ بھی بڑی حد تک دنیا کے دوسرے ممالک سے اسلام مین داخل ہوئی ہین، میڈیم بلیوٹسکی جو عہد جدید مین صوفیانہ معلومات، بالخصوص ہندوستانی فلسفہ و تصوف کی ایک مستند محققہ مانی جاتی ہین اپنی دوسری کتاب "خدائے مکشوف" (Isis Unveiled) مین لکھتی ہین

"مذاہب عالم، مسیحی، یہودی، بت پرست اور بدھ مذہب کے پیرؤن مین ایک مستقل جنگ علم حقیقت کے فقدان کا نتیجہ ہے، حقیقت کا علم کم افراد کو ہے، بقیہ حضرات خواہش ہی نہین کرتے کہ قلب سے حجاب دور کرین، ہر ظاہری مذہب کا کردگار ایک بت ہے، ایک افسانہ ہے، اسکے سوا دوسری چیز ہو ہی نہین سکتا، کپیلہ برہمن یوگیون کو صرف اس بنا پر نشانہ طعن وتشنیع بناتا ہے کہ وہ اپنے "شہود صوفیانہ" مین واحد واعلی کی دیدار کے مدعی تھے اسی اظہار خیال نے گوتم بدھ کو آیندہ نسلون سے ایک دہریہ کا خطاب دلادیا، فیثاغورث اپنے تصوف تاویلی اور مسئلہ تناسخ کی بدولت ایک چالباز کاذب متصور ہوا دوسرے فلاسفرا پلونیوس، اور فلاطینوس کا بھی یہی حال ہوا، جنھین لوگون نے "محویان خواب"، کے نام سے یاد کیا، افلاطون پر اسکے مترجمین نے بھی بیوقوفی کا الزام لگایا، اور یہانتک کہہ ڈالا کہ وہ اپنی زبان سے بھی ناواقف تھا، یہ کیون؟ اسلئے کہ اسنے "قوی العزیز" کے متعلق یہ کہا کہ اسکا علم دوسرے علوم کی طرف الفاظ کے ذریعہ حاصل نہین ہوسکتا، مین ایک جلد ان حضرات کے نام سے بھر سکتی ہون، جنکی تحریرون کو لوگون نے اس "حجاب" کو دور نہ کرنیکے عدم استعداد مین صوفیانہ احماقت سے تعبیر کیا"

تعلیم تصوف جہانتک حب الہی، اخلاق حسنہ، اعمال صالحہ، تزکیہ نفس، اور تصفیہ قلب سے متعلق ہے قرآن مجید سے کی گئی ہے، بقیہ اصول وقواعد، رہبانیت، اعتزال، فنا وغیرہ اسلام کی چیزین نہین، اور نہ قرآن مین انکی تعلیم ہے،

صحابہ کرامؓ مین ایسے لوگ تھے، جو تیسری صدی کے صوفیہ کی طرح تارک الدنیا اور فانی ہونیکی تمنا رکھتے تھے، چنانچہ بخاری کی کتاب النکاح مین کثرت سے ایسے واقعات ملتے ہین، حضرت ابوہریرہؓ تعلق ازدواجی کو ہمیشہ کیلیے خیرباد کہنے کیلیے خصی ہونا چاہتے تھے، حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص تمام دن روزے رکھتے اور ساری رات عبادت کرتے بیوی سے بھی کنارہ کش تھے جسکی شکایت دربار رسالت تک پہونچی، حضرت ابوذر غفاریؓ شام سے اس بنا پر بگڑ کر چلے آئے کہ انکے عقیدہ مین مال رکھنا جائز نہین تھا، اور امیر معاویہ اس عقیدہ کے مخالف تھے، حضرت ابوذر غفاریؓ قرآن کی آیت سے استدلال کرتے تھے، مدینہ مین بھی آتے تو آبادی سے جدا رہے، بخاری کی کتاب النکاح مین پہلی طویل حدیث ہے، جسمین مذکور ہے، کہ چند اشخاص آپس مین آن حضرتؐ کی عبادت وغیرہ کا تذکرہ کر رہے تھے ایک نے کہا مین مدت العمر روزے رکھونگا، دوسرے نے کہا نمازین پڑھتا رہونگا، تیسرے نے کہا شادی نہین کرونگا آن حضرتؐ یہ تمام باتین سن رہے تھے، باہر تشریف لائے اور انہین ایسی راہبانہ زندگی سے منع کیا اور فرمایا **فمن رغب عن سنتی فلیس منی**، البتہ کتاب الرقاق مین ایسی حدیثین پائی جاتی ہین جنھین دیکھکر ایک سطحی معلومات رکھنے والا شخص صوفیانہ عقاید کو سراپا اسلام کے مطابق سمجھ لیگا، لیکن جب اسکی نظر کتاب البیوع اور کتاب النکاح کی حدیثون پر جاویگی تو اسے معلوم ہوگا کہ دنیا اور آخرت کے متعلق اسلام کا صحیح معیار کیا ہے؟

معزز ناظرین: - یہ مضمون جب مین روانہ کرچکا تو اثنائے تلاوت مین سورۂ نحل کی اس آیت پر غور وفکر کا موقعہ ملا"

واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا وجعل لکم من جلود الانعام بیوتا تستخفونها یوم ظعنکم ویوم اقامتکم ومن اصوافها واوبارها واشعارها اثاثا ومتاعا الی حین ۝

ترجمہ - اور اللہ نے تمھارے واسطے تمھارے گھرون مین رہنے کی جگہ بنائی اور تمھارے واسطے تمھارے جانورون کی کھال کے گھر بنائے، جنکو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام کے دن ہلکا پاتے ہو اور انکے اون اور انکے رؤن اور انکے بالون سے گھر کا سامان اور فائدہ کی چیزین ایک مدت تک کیلیے بنائین۔

اس آیت سے صرف یہی نہین کہ عہد نبوت مین تمدن عرب کے متعلق لطائف تاریخی پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ اس سے میرے اس سرسری تحقیق کا بھی رد ہوجاتا ہے جسمین مین نے لکھدیا ہے، کہ قرآن مجید مین کہین "صوف" کا لفظ استعمال نہین ہوا، اس سے بھی بڑھکر لطف یہ ہے کہ اکثر محققین یورپ کے اس بیان پر بھی تنقیدی روشنی پڑتی ہے جنھون نے لکھا ہے، کہ لباس "صوف" کا استعمال شام کے مسیحی راہبون سے لیا گیا ہے، حالانکہ استشہاد قرآنی سے یہ ثابت ہے، کہ لباس صوف کا استعمال نزول قرآن کے وقت بھی عربون مین مروج تھا مبادی تصوف پر تاریخی روشنی ڈالنے مین علمائے مغرب نے "لباس الصوف" کو بڑی اہمیت دی ہے، چنانچہ تصوف کے متعلق پروفیسر نالڈک کی تاریخی تحقیقات کا مدار زیادہ تر اس نظریہ پر بحث وتحیص سے متعلق ہے، کہ لباس صوف کا استعمال شام کے مسیحی راہبون سے لیا گیا ہے، (انسائیکلو آف ریجن اینڈ اتھکس) غضب تو یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون نے بھی یہی لکھا ہے، اور غالبًا ابن خلدون ہی سے پروفیسر نالڈک نے استفادہ کیا، (ریجس ایٹیچیوڈ اینڈ لائف ان اسلام) نکلسن نے مقدمہ "صوفیائے اسلام" مین اپنی نظریہ پر زور دیا ہے، کہ صوفی کا لقب مسیحیت کا منت کش ہے، اور یہ کہ قدیم زہاد اسلام ترک دنیا کے خیال مین مسیحی راہبون کی دیکھا دیکھی موٹا بدنما اُونی لباس پہنا کرتے تھے، (مسٹکس آف اسلام) ابھی تک میرے پاس ایسے مواد تاریخی موجود نہین جنکی بنا پر علمائے مغرب کے اس نظریہ کی تردید کیجائے کہ لفظ صوفی کا وجود عہد نبوت مین نہ تھا، یا یہ کہ یہ اسلام کی پیداوار نہین ہے، لیکن محققین مغرب کے طوفان تحقیق پر قرآن مجید کی اس آیت سے تو کم از کم تنقیحی روشنی پڑتی ہے کہ صوفیہ نے لباس الصوف کا استعمال مسیحی راہبون کی دیکھا دیکھی نہین شروع کیا، بلکہ اس مشابہت لباس کی جو تاریخی تعیین کی جاتی ہے اس سے قبل بھی عرب مین اسکا رواج تھا، ممکن ہے، اپنے ملکی لباس ہی کے دائمی استعمال کے باعث ایک جماعت زہاد "صوفیہ" کے لقب سے موسوم کردیگئی ہو، بہرحال قرآنی آیت کی بنا پر مغربی علما کی وہ تحقیق جو لفظ صوفی کی وجہ تسمیہ کے متعلق ہے، ایک تاریخی، نقص، اور ایک ظن لاطائل ہے، جسے ایک جویائے حق صحیح تسلیم کرنے کیلئے تیار نہین مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر ناظرین نگار مین سے کوئی صاحب جنھون نے "واقعۃً" تصوف کے متعلق تحقیق و کاوش کی ہو، میرے مضمون کے "صوفیانہ حصہ" پر تنقیدی روشنی ڈالینگے، تاکہ عوام کے معلومات مین اضافہ ہو، اور مجھے تصوف کے متعلق اپنے خیالات مین ایک معتدل راہ اختیار کرنی پڑے۔

عبد المالک آروی۔

علم فراست الید:- اگر آپنے ابتک نہین ملاحظہ کی تو اب طلب فرمایئے - قیمت علاوہ محصول ۱۲ (مینجر نگار)

سیاح کی ڈائری

(تیسری قسط)

لکھنوی شاعری اور اس کا ہیولیٰ

قبل اس کے کہ مین لکھنؤ کے موجودہ شاعرون کی شاعری اور ان کے حالات سے بحث کرون، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً یہان کی شاعری کی ہیئت وضعی، وضع ترکیبی، اور ترکیب عنصری پر اپنے خیالات کا اظہار کر دون۔

اس وقت تک عام طور پر دہلی لکھنؤ کی شاعری کے متعلق بحث کا جو پہلو اختیار کیا گیا ہے، وہ بہت سطحی ہے اور سوائے اس کے کہ چند بیش پا افتادہ باتین دونون جگہ کی شاعری کی تمیز و تفریق کے لئے بیان کر دیجائین، کوئی ایسی عمیق اور اصولی بحث اختیار نہین کی گئی جو اس تفریق و امتیاز کے اسباب کو بھی سامنے لے آئے اور ہر شخص ان کو دیکھ کر از خود فیصلہ کر سکے کہ ان دونون مین حقیقتاً وجہ امتیاز کیا ہے اور کن وجوہ کی بنا پر ایک کو دوسرے سے مرجح قرار دیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ لکھنؤ کوئی قدیم آبادی نہین ہے بلکہ لکھنؤ کا وجود اپنی تمام لکھنویت" کے ساتھ ایک استعارہ ہے، فیض آباد سے، جو نوابان اودھ کا اولین مہبط تھا۔ اب اسی کے ساتھ آپ حکومت اودھ کی تاریخ پر بھی غور کیجئے کہ اس کی بنیاد کیونکر قائم ہوئی، یہ امر شاید کسی سے مخفی نہین کہ، شاہان دہلی سے بغاوت و انحراف کا نام حکومت اودھ ہے اور برطانیہ کی بساط سیاست پر ایک شاطرانہ چال بنیاد ہے شاہان اودھ کے وجود کی۔ جس طرح سلطنت مغلیہ کے دوسرے وفادار اور نمک حلال عمال دیگر اکناف ہند مین اپنی اپنی حکومتین قائم کر کے داد وفا دیچکے تھے، اسی طرح نواب سعادت علی خان بانی حکومت اودھ نے اپنی قابل ستایش ذہنیت کا ثبوت دیا اور چونکہ حکومت برطانیہ کلیۃً دہلی کا اقتدار مٹا دینا چاہتی تھی اس لئے آخر کار" غازی الدین حیدر" کو شاہ کا لقب دیکر گویا یہ خصوصیت بھی دہلی کی چھین لی۔ اس لئے اگر فرمانروایان اودھ کے دلون مین شروع ہی سے دہلی اور دہلویت سے تنفر رہا ہو اور یہان کی فضا مین اس جذبہ کے ماتحت لوگون نے پرورش پائی ہو تو جائے حیرت نہین پھر اگر آپ دونون جگہ کے اخلاق و معاشرت تہذیب و تمدن، وضع و ملبوس، خیال و زبان پر غایر نگاہ ڈالین گے تو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ نے قصد کر کے دہلی کی ہر بات کو محو کرنا چاہا حتی کہ اگر دہلی والے کسی لفظ کو مذکر بولتے تھے تو اہل لکھنؤ نے اسے مونث بنا کر چھوڑا اس مغایرت کا ایک سبب تو یہ تھا اور دوسرا بڑا سبب مذہب تھا جو حقیقتاً تاریخ اودھ کی داستان کا نہایت ہی دردناک ٹکڑا ہے مین اس کی تفصیل سے لطیف طبائع کو منغص کرنا نہین چاہتا، جن حضرات کو اس کے جزئیات کا علم حاصل کرنا مقصود ہو وہ تاریخ کی کتابون مین جستجو کرین۔ لیکن مختصراً یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ حکومت اودھ کی ساری تاریخ گویا ایران کے عہد صفوی کی

تاریخ ہے۔ اور مذہبی تنگ نظری کی وہ تمام صورتین جو ایک انسان کو مذہب کا بھی دشمن بنادیتی ہین پوری قوت کے ساتھ لکھنؤ مین ہر جگہ پائی جاتی تھین۔ ایران کے دور صفوی مین توصرف اسیقدر ہوا کہ شاعری صرف مرثیہ گوئی ہو کر رہگئی، لیکن لکھنؤ کی شاعری نام تھا ان عفونتون اور گندگیون کا جو اوباشانہ اخلاق کا جزو لازم ہین اور تمام اُن رکیک، وشنیع اور رذیل ودنی جذبات کا جو صرف ایک گناہگار اور سیاہ کار دل ہی سے پیدا ہوسکتے ہین۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ماحول کا اثر شاعری پر ہونا لازم ہے، تو ایک ملک و قوم کی شاعری کو دیکھ کر اس کے ماحول کا اندازہ کرنا بھی لازم منطقی نتیجہ ہے۔ پھر خواہ آپ سلطنت اودھ کے سیاسی، اخلاقی، مذہبی، معاشری حالات کے ساتھ ساتھ اُس وقت کی شاعری کا مطالعہ کیجئے یا اُس عہد کی شاعری سے آپ اُس زمانہ کے اخلاق پر حکم لگائیے نتیجہ ایک ہے اور اس یقین تک پاہونچنا لازم کہ لکھنؤ کا وہ دور جسے یہان کا عہد زرین کہا جاتا ہے اپنے ذہنی ودماغی، انحطاط، اخلاقی ومعاشری زوال، مذہبی گندگی و تنگ نظری، بلکہ مین تو یہ کہونگا کہ اپنی حیوانیت ودرندگی اور وحشت وسبعیت کے لحاظ سے ایک ایسا عبرتناک دورِ حضیض تھا کہ شاید ہی اس کی کوئی دوسری مثال دنیا کی تاریخ مین پیش کیجاسکے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت خواہ کتنی ہی حسرت کے ساتھ قیصر باغ کی رنگ رلیون کا ذکر کیون نہ کرین، عیدین کے موقعہ پر شاہانہ جلوس اور اس کے تزک و احتشام کا افسانہ خواہ کسی زبان دانشا، مین کیون نہ تحریر فرمائین، لیکن دنیا اس واقعہ کو کبھی فراموش نہین کرسکتی کہ اسی قیصر باغ مین شہر کے اکابر وامرا کی حسین حسین لڑکیان محرم کی روضہ خوانیون، عزاداریون اور تمثیل سازیون مین ائمہ اطہار کی بیویان بنا بنا کر پیش کیجاتی تھین اور واجد علی شاہ وہ عظیم المرتبت الشان وہ شوکت وجبروت والا بادشاہ، اچھوتیون کے ساتھ خود بھی دردِ زہ مین مبتلا رہنے کے بعد کسی نہ کسی امام زادہ کو (مومی شبیہ، چینی کی مورت، یا گڑیا کی صورت مین) جنا کرتا تھا، اور جب "مبارک سلامت" کے ترانے گائے جاتے تھے تو وہ ایک نوعروس کی طرح گھونگٹ کرکے بیٹھ جاتا تھا اور جب عالم نشاط کی فراوانی سے مجبور ہوجاتا تو خود بھی کنچنیون، پاترون اور کسبیون کے ساتھ ملکر اپنی بھدی کمرین "لرزش رقصانہ" اور عفریتی جسم مین جنبش رامشگرانہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا

ظاہر ہے کہ جس ملک کا فرمانروا اس رنگ کا رہا ہو، جس کی نفس پرست زندگی نے حلال وحرام کا پردۂ تمیز اٹھا دیا ہو، جس نے اپنی زندگی کا "اسوۂ حسنہ" یہ پیش کیا ہو، وہان کی رعایا کی اخلاقی حالت کا کیا عالم ہوگا اور ان کی حیوانیت "ارتقا" کے کس دور مین رہی ہوگی۔ پھر یہ برکات صرف واجد علی شاہ کے عہد سے مخصوص نہ تھے بلکہ اودھ کا ہر حکمران کم وبیش یہی ذہنیت لیکر آیا تھا اور کسی نہ کسی اخلاقی پستی کا مظہر اتم ہونے کی خصوصیت کبریٰ اسے حاصل تھی

اگر شاعری نام ہے جذبات کے اظہار کا اور جذبات پیدا ہوتے ہین خود اپنے اور ماحول کے معاشری واخلاقی حالات سے تو ہر شخص بہ آسانی حکم لگا سکتا ہے کہ لکھنوی شاعری کو کیسا ہونا چاہئے اور اس کی حقیقت کیا ہوسکتی ہے۔ مثلاً ناسخ کے ایک مشہور شاگرد شیخ امان علی سحر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

انتخارہ جو سحر وصل پہ واجب آیا مسکرا کر وہی کنٹھا مرے منہ پہ مارا

استخارہ ایک مذہبی عمل ہے لیکن اس کو اخلاق کی پستی کہئے یا مذہبی زندگی کا علو کہ معشوق خود "بے اختیاری شوق" کے عالم مین وصل کے لئے استخارہ کرتا ہے (گویا وہ بڑا عمل خیر ہے) اور شاعر "واجب آیا" کہکر اُسے ایک اور درجۂ ترقی پر پہونچا دیتا ہے البتہ دوسرے مصرعہ مین جس معشوقانہ ادا کا اظہار ہے، وہ بجائے خود ایسی چیز ہے کہ کنٹھا کہے یا نہ کہے، وصل کا واجب کیا، فریضۂ سحر کی صورت اختیار کرلینا یقینی ہے

میرے نزدیک شاعری کے تمام اصناف مین "غزلگوئی" جسقدر بلند چیز ہے کوئی نہین، روح کی گہرائیون، اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر کوئی ہوسکتی ہے تو صرف غزل ہے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غزل کا ارتقا، تصوف ہے (تصوف سے مراد عہد حاضر کی قبر پرست، مرید ساز خرقۂ کد، سالوس والی درویشی نہین ہے، بلکہ میری مراد وہ علوئے فطرت وہ عروج روح، اور وہ استعلاء تصور ہے جہان انسان مادیت سے گزر کر اپنے چیز اصلی، نور ربانی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہوجاتا ہے اور تمام امتیازات دنیاوی کو جن مین امتیاز مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے) - پھر جو شخص فطرتاً شاعر ہوتا ہے وہ اپنی اول منزل مین بھی جو یقیناً "منزل لب بام" ہی ہوا کرتی ہے، شاہد اصلی کے جلوہ کو سامنے رکھتا ہے، انتہائی منزل کے حصول سے غافل نہین ہوتا اور دنیاوی زیر و بم مین بھی اس نغمۂ سرمدی کو سنتا رہتا ہے جو ہر ساعت، ہر لحظہ، ہر دم اس کو اپنی لذت سے بیخود رکھتا ہے،

یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر اختلاف استعداد کے لحاظ سے ایک مخصوص درجہ سے آگے نہین بڑھتا، اور بہت کم ایسے ہوتے ہین جو بیدل کے مرتبہ تک پہونچنے مین کامیاب ہون - لیکن ایک فطری و وہبی شاعری خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی منزل مین کیون نہ ہو، اُس سوز و گداز، اُس درد و تاثیر، اُس عذوبت بیان، اس حلاوت زبان، اور اُس حقیقت و صداقت سے خالی نہین ہوسکتی جو فطرت کی طرف سے صرف ودیعت ہوتی ہے اور کوشش سے حاصل نہین کیجا سکتی

پھر غور کیجئے کہ اُس دور حکومت کی شاعری جو غداری کورنمکی، اور جذبۂ نفرت و استکراہ پر قایم ہوئی ہو اور اُس عہد معصیت کی شاعری جس مین ادنیٰ و ذلیل درجہ کے حیوانی جذبات کے سوا کسی جذبۂ عالی کی پرورش کی فضا نہ پیدا ہوئی ہو اور اُس زمانۂ فسق و فجور، کی شاعری جب مذہبی استخفاف اور بے حیائی و بے غیرتی اس حد تک پہونچ جائے کہ وصل کیلئے استخارہ کا کنٹھا سبنھالنا بھی معیوب نہ رہے، یعنی انیسوین صدی کے نصف اول کی وہ لکھنوی شاعری جس نے اسی ماحول، اسی ذہنی پستی، اسی اخلاقی فرومایگی، اسی مذہبی تنگ نظری اور اسی ہیجان بدمستی مین آنکھ کھولی ہو، وہ ناسخ و وزیر ہی پیدا کرسکتی تھی نہ کہ مومن و میر، اس مین سحر و صبا ہی کے تخلیق کی اہلیت تھی نہ کہ درد و قایم کے

لکھنؤ کی شاعری مین الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی چوٹی انگیا، آنچل، آرسی سرمہ، بے معنی صنائع و بدائع اور اسی قسم کے بہت سی سطحی و غیر سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے کا سبب یہی تھا کہ اُس وقت کی زندگی ہی ایک جھوٹی زندگی تھی اک غیر حقیقی ہستی تھی اور رات دن ان کو انھین چیزون سے واسطہ تھا اور انھین پر اُن کے نشاط کی بنیاد

قائم تھی۔ ان کی شاعری کا موضوع عہد وحشت کی وہ عورت تھی جب اس سے صرف ہوس رانی کا کام لیا جاتا تھا اور جس کو اسباب آرائش و زیبائش کی دوسری کم مایہ جنسوں کی طرح قابل بیع و شری جنس قرار دیدیا گیا تھا۔ لکھنؤ کی سرزمین میں قصر شاہی سے لیکر فقیر کے جھونپڑے تک یکساں طور پر جذبۂ شہوت پرستی کارفرما تھا نہ فرمانروا کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہگیا تھا اور نہ رعایا کو تحسین تمدن کا، ہر شخص اپنی اپنی جگہ عیش کوشی و نشاط اندوزی میں مصروف و منہمک تھا اور نسائیت جو پُر معصیت زندگی کا لازمی نتیجہ ہے بلا تفریق ہر طبقہ کے مردوں میں پیدا ہوتی جا رہی تھی سرکار انگریزی نے عملاً تمام اقتدار شاہانہ سے محروم کرکے شاہ و رعایا سب سے عسکری روح چھین لی تھی اور ان کے جذبات حماست و شجاعت کو صرف بٹیر بازی، کنکوے بازی اور تیتر بازی میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ بالکل غیر معلوم و غیر محسوس طور پر انسانیت کی اس نیچی سطح پر آ رہے تھے جو حیوانیت تک پہونچنے کے لئے حد فاصل درمیاں نہیں رکھتی۔ اسی لئے لکھنؤ کا شاعر کبھی ایک یادہ گو ناظم، ایک ہرزہ سرا متشاعر ایک بوالہوس حسن پرست ایک بازاری فقرہ باز، ایک عامی پھبتی گو، ایک سوقی عیاش کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھا اور نہ بڑھ سکتا تھا کیونکہ ماحول اور فضا کا اقتضا یہی تھا

اہل لکھنؤ کا دعویٰ ہے کہ زبان کو جو ترقی یہاں ہوئی کسی جگہ نہیں ہوئی یہانتک کہ شعراء دہلی نے بھی یہیں آکر یا یہاں کی زبان کو سامنے رکھ کر اپنی زبان کی موچ نکالی۔ اول تو مجھے اسی میں گفتگو ہے کہ یہاں زبان کو ترقی ہوئی۔ کیونکہ زبان کی ترقی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ بلند سے بلند جذبہ و خیال کے اظہار پر قادر ہو جائے اور اس کی ایک مثال بھی یہاں کے بڑے سے بڑے شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ البتہ عیاشانہ اور بازاری زبان نے یہاں ضرور ترقی کی اور عامیانہ خیالات کے اظہار کے لئے بیشک بہت سے جدید اسلوب پیدا کر دئے، چنانچہ آج بھی یہاں کا سنجیدہ سے سنجیدہ نقاد ایک شعر کی داد دیتے وقت کبھی اس کو زہریلا بنا دیتا ہے، کبھی، اس کے دھوئیں کو ماورا، سرحد تخیل بل کھاتا ہوا پاتا ہے، کہیں اس کے "کس بل" کو نمایاں کرتا ہے اور کہیں "اے توبہ، اُوئی اللہ" کہکر خدا معلوم اپنی یا شاعر کی نسائیت کو ظاہر کرتا ہے —— اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ لکھنؤ نے زبان اور محاوروں کو درست کیا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعری اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ غزل کو اس سے کیا فایدہ پہونچا جو قطعاً ان دونوں چیزوں سے بے نیاز ہے، غزل کی زبان کبھی پہلے نہیں بنتی، بلکہ غزلگو کے خیال کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہے وہ زبان کا پابند نہیں ہے بلکہ خود زبان اس کی محتاج ہے۔ اگر ناسخ نے جو لکھنوی شاعری کی دنیا کا ابوالآباد سمجھا جاتا ہے، بہت سے محاورات اپنے دیوان میں نظم کر دئے، صحت الفاظ کا بہت خیال رکھا، تو نتیجہ کیا ہوا یہی نا کہ وقت ضرورت اس سے ایک لغت یا فرہنگ کا کام لے لیں۔ غزلگوئی کو اس سے کیا فائدہ پہونچا محاورے اس نے جتنے بھی لکھے ہوں لیکن غزل اس کی ان حدود سے آگے نہیں بڑھتی کہ

سخت دل جو ہیں انھیں محروم رکھتا ہے فلک بیضۂ فولاد سے بچہ کہاں پیدا ہوا

نہین آتا نظر مرہم لگائے کس جگہ کوئی
وہان یار گویا منہ ہے میرے زخم پنہان کا

جب وہ مسجد مین ادا کرتے ہین
سب نماز اپنی قضا کرتے ہین

میرے نزدیک لکھنوی شاعری عبارت ہے۔ ناسخ، آتش، مصحفی اور ان کے شاگردونکے کلام سے۔ ناسخ کے کلام کی بے نمکی اور اس کا "شعر" کی تعریف سے یکسر علٰحدہ ہونا کسی سے مخفی نہین ناسخ کے جتنے مشہور شاگرد ہوئے وہ بھی اس باب مین اپنے استاد سے کسی طرح کم نہ تھے، چنانچہ امداد علی بحر، شیخ امانعلی سحر خواجہ وزیر کا کلام اٹھا کر دیکھئے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان غریبون مین کبھی جھوٹی محبت کا بھی جذبہ پیدا نہین ہوا

بحر کے بعض اشعار ملاحظہ ہون:۔

خوشبو مین کیا ہین داغ مودت کے اجزے
سر ہے کہ دوش پر ہے قرابہ گلاب کا
افسوس ہم نے خط غلامی دیا اُسے
لکھوا لیا نہ اس سے مچلکا رقیب کا
اے بحر نہ لے عارض محبوب کا بوسہ
شبہہ ہے مجھے کان کی بجلی پہ مگر کا
بیمار ہون خوبصورتون کا
حُسن یوسف مری دوا ہے

سحر کی شاعری مین ایک تو یہی کنٹھے والا شعر ہے، دو چار نوادر اور ملاحظہ ہوں

طایر روح کو دانے پہ لگا یا قاتل
دل پہ ہم نے تری بندوق کا چھرا کھایا
دوڑ کر ابرو قاتل کی بلائین لے لین
بیٹھے بٹھلائے اوبھے ہات مین چرکا کھایا
مسکرا کر وصل مین جب دانت پیسے یار نے
موج خندہ بن گئی زنجیر موتی چور کی

وزیر کی لفظ پیمائیاں بھی عجیب و غریب ہین:۔

گرمیان کیں اسقدر ہر عضو شعلہ ہوگیا
شب کو روشن یار کے بازو کا اکا ہوگیا
بدن مین میرے جتنے زخم ہین آنکھین حرا ہین
نہ پوچھو کسقدر پیاسا ہون آب تیغ قاتل کا
گردم مشق خیال خط جانان ہوگا
پھر تو جو خط مین لکھونگا خطِ ریحان ہوگا

شاعری کا جہان تک تعلق ہے آتش یقیناً ناسخ سے بدرجہا بہتر ہے لیکن "لکھنوی خصوصیت" اس کے کلام مین بھی کثرت سے پائی جاتی ہے:۔

دیدۂ یار کہین کیا اسے کیفِ مے مین
بھونکر روز گزک کرتے ہین بادام کو ہم
چلے تو سیر کو ہین آپ مستی ملکے گلشن مین
اشارے کیسے کیسے ہونگے نافرمان وسوسن مین
یادِ رخسار کتابی جو رہا کرتی ہے
دل سمجھتا ہے مرا حافظ قرآن مجھ کو

ان کے شاگردون مین رند و صبا کا خاص مرتبہ سمجھا جاتا ہے، لیکن ان کی یہ خصوصیت بھی صرف اسی رنگ کی بنا پر ہے، رند کے چند شعر ملاحظہ ہون

بادۂ گلگون مین افیون کا اثر ہو جائے گا ۔۔۔ دورِ مے یار بن دوران سر ہو جائے گا
خالِ رُخ کے عشق مین مرتے ہین عاشق سیکڑون ۔۔۔ سنکھیا کا عالم اس حب شفا کا ہو گیا
تلوار دکھاؤ مجھے گولی سے نہ مارو ۔۔۔ تل ڈھانک لو اور ابرو خمدار دکھاؤ

صبا کا مرتبۂ شاعری یہ ہے:-

سرکشی پر جو وہ سردِ ستم ایجاد آیا ۔۔۔ پاس اڑے کے گھسٹتا ہوا شمشاد آیا
یار گل اندام سے پہلو جو خالی ہو گیا ۔۔۔ سوکھ کر مین شکل تصویر نہالی ہو گیا

مصحفی چونکہ لکھنؤ کے نہ تھے اس لئے ان کے سلسلہ سے یہان بحث کرنا فضول ہے، لیکن اسقدر اظہار ضروری ہے کہ دور ناسخ کی لغو و مہمل شاعری سے انحراف کرکے سہل و شُستہ زبان مین کچھ کچھ جذبات کو لئے ہوئے غزل کہنے کی بنیاد ڈالنے والے دو ہی شخص تھے ایک ضامن علی جلال جو رشک کے شاگرد تھے اور دوسرے منشی امیر احمد مینائی جو اپنے علم و فضل، اخلاق و عادات کے لحاظ سے بہت زیادہ بلند انسان تھے اور جنکو شاعر کہنا میرے نزدیک ان کی توہین ہے، چونکہ اُس وقت کی فضا مین سوائے شاعری کے کوئی دوسرا نغمہ مقبول ہی نہ تھا، اس لئے منشی امیر احمد مینائی پر بھی اس کا اثر ہوا اور شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے ورنہ قدرت نے انکو اس سے بہت زیادہ اہم خدمات کیلئے پیدا کیا تھا، مگر چونکہ فطرت مین لوچ تھا جو ہر کمال کے حصول کا ان مین موجود تھا، اس لئے اساتذۂ شعر مین بھی انکا شعار ہونے لگا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ امتیاز ان سے کبھی نہین چھینا جا سکتا کہ انھون نے باوجود لکھنؤ مین رہنے کے جہان ناسخ کی شاعری کے جراثیم ایک مرض متعدی کی طرح پھیلے ہوئے تھے ایک الگ راہ شاعری کی قایم کی اور اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر وہ وہ شعر کہگئے کہ ہمین کسی ایک لکھنوی شاعر کے کلام مین نہین ملسکتے، لیکن دنیا شاید یہ سنکر تعجب کریگی کہ اہل لکھنؤ، امیر مینائی سے کچھ خوش نہین ہین اور ان کے مستند استاد ہونے سے بھی انکار کرتے ہیں

امیر مینائی کے دو دیوان مرآۃ الغیب اور صنم خانہ دو علحدہ رنگ کے دیوان ہین اور اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ ان دونون مین کثیر اشعار اُس رنگ کے ہین جن پر صحیح تغزل کا اطلاق نہین ہو سکتا، لیکن ناسخ کی شاعری کو دیکھتے ہوئے امیر کا برے سے برا شعر بھی ایک درجہ رکھتا ہے اور اگر پور اتفحص کیا جائے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذہنیت یکسر تغزل ہوی تھی لیکن ماحول کے اثر سے مجبور ہو کر انھون نے لکھنوی شاعری کو اختیار کیا

ان کے چند اشعار جن سے ان کا صحیح ذوق شعری نمایان ہوتا ہے ذیل مین درج کئے جاتے ہیں:-

کہتے تھے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیر ۔۔۔ دیکھو تو چار روز مین کیا حال ہو گیا
وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا ۔۔۔ امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا
کچھ آج نہین رنگ یہ افسردہ دلی کا ۔۔۔ مدت سے یہی حال ہے یارو مرے جی کا

لیا پھر تو نے اس کا نام اے دل ۔۔۔ ارے ظالم ابھی سمجھا چکا ہون
کرتے ہین جو لوگ ذکر اُن کا ۔۔۔ ایک ایک کا منہ مین دیکھتا ہون
دم لے نہ ابھی پوچھ مرے درد کو ہمدم ۔۔۔ رونے سے جو دل ٹھیرے تو کچھ بات کرون
کھاتے ہو قسم نہین مین عاشق ۔۔۔ صورت تو امیر اپنی دیکھو
اک ذرا پردۂ محمل کو اُٹھادے لیلی ۔۔۔ پھر کوئی حالت بیتابی مجنون دیکھے
تم دُکھاتے تو ہو امیر کا دل ۔۔۔ اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے
ہات ڈالا مین نے دامن پر تو بولے ناز سے ۔۔۔ میرا دامن چھوڑیے اپنا گریبان پھاڑیے
اک کنارے پڑا ہوا ہے امیر ۔۔۔ کچھ تمھارا غریب لیتا ہے
کوئی امیر ترا درد دل سنے کیونکر ۔۔۔ تو ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار کسی لکھنوی شاعر کے ہین؟ مین تو سمجھتا ہون کہ یہ تصرف ہے ان کے دادا استاد مُصحفی کا جو غیر لکھنوی تھے اور خود اُن کی فطری صلاحیت کا جس مین دہلویت بڑی حدتک مرکوز تھی

امیراللہ تسلیم بھی لکھنؤ سے نسبت رکھتے ہین لیکن یہ نسبت ہر لحاظ سے غلط ہے، کیونکہ نہ انکا اصلی وطن لکھنؤ تھا اور نہ وہ لکھنوی ذوق کے متبع تھے۔ چنانچہ خود وہ ایک جگہ لکھتے ہین

مین ہون اے تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی ۔۔۔ مجھکو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

متاخرین مین مرزا تعشق کا وجود بیشک ایسا ہوا ہے جو خاندان ناسخ کی شاعری مین علیحدہ رنگ رکھتا تھا اور ان کے مختصر دیوان مین تلاش کرنے سے بعض ایسے شعر ملسکتے ہین جن کو شعر کہا جا سکتا ہے، لیکن چونکہ خالص لکھنوی لوگ تھے اور تلمذ بھی ناسخ سے تھا اس لئے مہملات کی بھی کمی نہین ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

سوئے دریا خندہ زن وہ یار جانی پھر گیا ۔۔۔ موتیون کی آبرو پر آج پانی پھر گیا
کیا معاذاللہ مری وحشت نے پھیلائے ہین پانون ۔۔۔ راہ برسون کی مرا چاک گریبان ہو گیا
عشق دندان کی رعایت مرجان لازم ہے ۔۔۔ آبروے دل بے تاب و توان لازم ہے
کیا کنوین مجھ کو جھنکائیگی مری کاہید گی ۔۔۔ چاہ میرے واسطے ہر نقش پا ہو جائے گا
کیون کبوتر کے عوض ہدہد نہ لایا خط شوق ۔۔۔ اس خطا پر مجھ سے وہ بلقیس[1] ثانی پھر گیا

ہر چند لکھنوی شاعری کا یہ رنگ برابر انحطاط پذیر ہے اور اب شاید ہی کوئی صحیح مقلد و متبع اس شاعری کا ہو، لیکن وہ سمیت جو فضا مین اس طرح پھیل گئی ہو دفعۃً دور بھی نہین ہو سکتی اور "زمانۂ قریب" مین بھی بعض خدا کے بندے ایسے گزرے ہین

---

[1] اگر تعشق کو کسی عورت سے محبت نہ تھی، تو پھر بلقیس کا مرد ہونا یقینی ہے۔

جو استاد ناسخ کی رُوح کو خوش کرنے کے لئے کافی سامان اپنے بعد چھوڑ گئے ہین، چنانچہ زیادہ زمانہ نہیں گزرا جب فرنگی محل کی علم خیز سرزمین سے مولانا حافظ محمد برکت اللہ رضا کا ایک دیوان مطبع یوسفی سے شایع ہوا تھا جس مین یقیناً تمام وہ خصوصیات پائی جاتی ہین جو ایک "اعجوبۂ ادب" مین ہونا چاہئے۔ مولانا رضا فرنگی محلی یون تو امیر کے شاگرد تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی رُوح روزِ الست ہی مین ناسخ کے سامنے زانوے ادب تہ کر چکی تھی ملاحظہ ہو:۔

خیال سبزۂ خط مین زمرد کا پیا پانی تصور مین ترے دانتون کے ہیرا کوٹ کر کھاتا

مولانا نے یہ شعر نعت مین فرمایا ہے، رسول کے سبزۂ خط اور حسن دندان کا ذکر ان الفاظ مین کرنا حقیقت یہ ہے کہ فرنگی محلی ہی ذہنیت کا کام ہو سکتا ہے کسی اور کے بس کی بات نہین ہے، مولانا نے ایک بار محبوب کا بوسہ مانگا تھا اس کا حال ان الفاظ مین بیان ہوتا ہے:۔

بوسہ مانگا کالیان کھائین رضا زہر پایا ہم نے شکر کا جواب

مولانا کی بوالہوسی ملاحظہ ہو:۔

حیرت سے ہم نہ ہوتے جو مبہوت وصل مین نیند آتی اے رضا انھین کیونکر تمام رات

دوسرے مصرعہ کو پڑھکر غور فرمایئے کہ "اُن" کے رات بھر نہ سو سکنے کا کیا سبب ہو سکتا تھا اور مولانا کے "تہیۂ پریشانی" کی داد دیجئے۔ ایک صاحب نے یہ شعر سنکر فرمایا کہ ممکن ہے مولانا نے کوئی جائز و حلال صورت پیدا کر کے یہ اشعار کہے ہون مین نے کہا بالکل درست ہے کیونکہ مولانا نے یہ شعر کہکر اس حسن ظن کی بھی گنجائش نہیں رکھی

لپٹا یا رضا ہم نے تو جھنجھلا کے وہ بولے اب آپ کے گھر ہم کبھی آیا نہ کرینگے

یہ ہے شاعری ایک عالم متبحر، ایک فقیہ مستند، ایک محدث جید کی جس کے خاندان مین ہمیشہ سے تورع و تقدس چلا آرہا ہے اور جس کے اخلاق و سیرت کو لوگ نمونہ و مثال کی صورت سے پیش کرتے ہین

اس سے آپ کو اندازہ ہو سکیگا کہ لکھنوی شاعری کے مذموم اثرات کن کن صورتون سے کن کن طبقون مین سرایت کر چکے ہین اور جن کے دور ہونے کے لئے میری رائے مین کم از کم ابھی نصف صدی کی ضرورت اور ہے

الغرض لکھنؤ مین تغزل کی جتنی مٹی پلید ہوئی وہ ناقابل عفو حد تک عفونت و گندگی سے لبریز ہے یہ ماننا پڑیگا کہ شاعری کی اُس صنف نے جسے مرثیہ کہتے ہین، یہان غیر معمولی ترقی کی اور شاہان اودھ کے اخلاقی مظالم کی تلافی اگر فطرت کی طرف سے کوئی ہوئی تو صرف یہ کہ اسنے انیس و دبیر کو یہان پیدا کر دیا، مرثیہ گوئی کم و بیش ہر زبان اور ملک مین پائی جاتی ہے، لیکن مذہبی و قومی اہمیت کے لحاظ سے جو مرثیہ لکھنؤ کے مرثیہ گوئی کا ہے اس کی نظیر دنیا مین کہین نہین ملسکتی

لکھنؤ کے موجودہ شعراء کی شاعری کا کیا رنگ ہے، اس کے متعلق میرا سرسری فیصلہ یہی ہے کہ فی الحال زندہ دہلی اسکول کی ایک ناکام تقلید سے زیادہ حیثیت نہین رکھتی اور رہنوز وہ غلو پیدا نہین ہوا جو شاعری کو الہام کے حدود سے ملا دیتا ہے

آیندہ قسط مین، اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا موقعہ ہے اگر کوئی اور بحث نہ چھڑ گئی ——

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

(بہ سلسلۂ سابق)

انگلینڈ اور ہندوستان کا باہمی اثر

گذشتہ دو لکچروں میں تمھیں بتلایا گیا تھا کہ ہندوستان کی فتح، اور اسپر انگریزوں کی حکومت میں ایک خاص مفہوم تک کوئی امر قابل حیرت نہیں ہے۔ ہمکو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہم قوموں نے ہندوستان میں بہت بڑے بڑے کارہائے نمایاں کئے، ہمکو اُن انگریزوں پر ناز ہو سکتا ہے جنھوں نے حکمرانی کی عدیم المثال استعداد و لیاقت دکھلائی۔ لیکن یہ سمجھنا سراسر غلط ہے کہ سلطنت ہذا بذات خود ایک زندہ ثبوت ہے ہندوستانی اقوام کے مقابلہ مین انگریزی اقوام کی بے پایان برتری کا۔ اس برتری کا خیال اپنے دماغ سے نکالنے کے بعد ہم اپنی سلطنت کے ارتقا اور قیام کے اسباب دریافت کر سکتے ہیں اور اگر حیرت انگیز سے محض، معجز نما، مراد ہے یا یہ کہ معمولی اسباب پر اسکے وجود کو معلول کرنا مشکل ہے تو یہ سلطنت قطعی حیرت انگیز نہیں ہے

تاہم ایک مفہوم میں یہ سلطنت اُن تمام عام مفہوموں سے بہت زیادہ حیرت انگیز ہے۔ یعنی یہ اپنے اسباب کی بہ نسبت اپنے انجام میں زیادہ حیرت انگیز ہے۔ بالفاظ دیگر اسکی عظمت مخصوص تاریخی مفہوم مین ہے۔ کیونکہ بقول میرے واقعات کی نتیجہ خیزی ہی نے اِسکو تاریخ کا درجہ دیا۔ اسی معیار سے ہم نے تاریخ انگلینڈ کے بہت سے واقعات کا درجہ بلند کر دیا خصوصاً انقلاب امریکہ کا جو بوجہ غیر دلچسپ اور بے چاشنی ہونے کے بہت کم مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اس لئے میں کہونگا کہ سلطنت ہند اگرچہ نظر غائر کو کتنی ہی کم حیرت انگیز معلوم ہو لیکن جون جون بحیثیت افسانہ اسکا لطف کم ہوتا جائیگا، اسکی تاریخی دلچسپی بڑھتی جائیگی

یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ایک بڑی مشرقی سلطنت خاص طور سے اہم ہو۔ ایشیا میں بہت سی ایسی بڑی بڑی سلطنتیں گزری ہیں جو تاریخی اعتبار سے یونانی اور ٹسکن (Tuscan) شہری جمہوریتوں سے بھی کم اہم تھیں، صرف اسوجہ سے کہ اُنکے حدود بہت زیادہ اور مدت قیام طویل تھی ایسی سلطنتیں لائق دلچسپی نہیں ہو سکتیں۔ جب ہم انکی جزئیات کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انکا نظام اوفی تھا، اسکے بارے تمام افراد دب کر چور چور ہو رہے تھے، نہ تو انکو اطمینان و خوش نصیبی حاصل تھی نہ وہ ترقی کر سکتے تھے اور نہ کوئی قابل یادگار ایجاد کر سکتے تھے۔ پہلی نظر میں بظاہر ہماری سلطنت ہند بھی اس درجہ لائق توجہ نہیں نظر آتی جس قدر عام خود رَو ایشیائی مستبد حکومتین معلوم ہوتی ہیں۔ ہم انگریزی رائے عامہ کے مرہون منت ہیں جس کے ہاتھ میں ہندوستانی معاملات کا انصرام ہے، کیونکہ صرف اسی کی بدولت آج ہندوستان دماغی، اخلاقی اور انسانی ہمدردی کے اوصاف میں سلطنت مغلیہ کے زمانہ سے ارفع مقام پر کھڑا ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ اس سلطنت کو ہم خراب سیاسی نظام کا ایک بہتر نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ ہم کو اسکا فخر نہیں ہے کہ ہم شاہان مغلیہ کے جانشین ہیں۔ ہمیں شبہہ ہے کہ آیا باوجود ہماری تمام انتظامی

خوبیوں کے رعایا خوش ہے یا نہیں۔ ہمیں اسمیں بھی شبہ ہے کہ آیا ہماری سلطنت ہندوستانیوں کو بہتر حالت کیلئے تیار کر رہی ہے یا اور زیادہ مصیبت کی طرف ڈھکیلتی جا رہی ہے، ہمیں اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ شاید وہاں صحیح معنوں میں کوئی ایشیائی حکومت یا خود ہندؤں کی ایک قومی حکومت قائم ہو جائے۔ اور انجام کار ہماری سلطنت سے زیادہ مفید ہو۔ اگرچہ یہ حکومت ہماری اجنبی اور غیر ہمدرد حکومت سے کم متمدن بھی ہو لیکن بوجہ باشندگان کی طبائع کے موافق ہونے کے اس سے زیادہ مفید ہوگی

لیکن ان وجوہ سے ہر سلطنت میرے نزدیک غیر لائق توجہ نہیں ہو سکتی۔ مثلاً سلطنت رومہ کو لے لو۔ مجھے یہ خیال ظاہر کرنے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے کیونکہ حال میں تاریخ کے متعلق ہمارے خیالات میں بہت زیادہ تبدیلی ہو گئی ہے۔ یقیناً ایک زمانہ تھا جب رومن سلطنت بھی غیر قابل توجہ سمجھی جاتی تھی کیونکہ مستبد اور بعض اوقات باعث تکلیف اور نیم وحشی تھی۔ ایک نسل پہلے عام خیال یہی تھا کہ سیاست میں سوائے آزادی کے کوئی اچھائی نہیں ہے اس لئے تاریخ کے ان تمام عہدوں کو نظر انداز بلکہ منسوخ کر دینا چاہئے جنمیں آزادی معدوم ہو۔ اسی خیال کے ساتھ ساتھ مطالعہ تاریخ کی عادت بھی بالکل نظم کے مطالعہ کی سی تھی یعنی تاریخ کا مطالعہ صرف بخیال انبساط کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس عادت کی وجہ سے جب ہم ایسے عہد کی تاریخ پر پہونچتے تھے جو شاندار اور قابل تحسین واقعات سے معرا ہو تو ہم کتاب بند کر کے رکھ دیتے تھے۔ بلاشبہ اس زمانہ میں رومن سلطنت کی بھی مذمت کی جاتی تھی۔ جمہوریت رومہ کو صرف اس لئے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ اوسمیں آزادی تھی۔ اور رومن سلطنت کا ابتدائی عہد بھی محض اس خیال سے مطالعہ کیا جاتا تھا کہ اسکے اندر حریت کے نشانات ملتے ہیں۔ لیکن جہاں دوسری صدی عیسوی شروع ہوئی ہمنے کتاب بند کر دی، گویا دسوین صدی تک جو کچھ ہوا، تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ تھا اور پھر کتاب اسوقت تک ہمارے ہاتھ میں نہ ہوتی جب تک انگلینڈ اور اطالوی جمہوریت میں حریت کا نشان پھر نہ ملنے لگتا۔ میرے خیال میں تاریخ کیساتھ یہ سلوک اب متروک ہو گیا اب تاریخ محض تفریح کی خاطر نہیں پڑھی جاتی بلکہ سیاسی نشو و نما اور انقلابات کے اصول دریافت کرنے کے لئے۔ نظر بران ہمکو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ فلاں عہد شاندار ہے یا تاریک اگر وہ عہد بصیرت افروز ہے اور اس سے ایسے سبق حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے عہدوں سے حاصل نہیں ہوتے تو بس کافی ہے۔ ہم نے سیکھا ہے کہ علاوہ حریت و آزادی کے سیاست میں اور بھی خوبیاں ہیں۔ مثلاً قومیت اور تمدن۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک سلطنت میں آزادی تو نہیں ہے لیکن جہاں تک ان دو مقاصد کے حصول کا تعلق ہے وہ بڑی رحمت ہے۔ اس لئے رومن سلطنت نہ صرف اپنے ابتدائی عہد میں بلکہ تیرھویں صدی تک باوجود اپنی غیر شائستگی، اوہام پرستی اور تکالیف کے تمام تاریخی واقعات سے دلچسپ ہے کیونکہ محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ سلطنت ہرگز اندرونی ترقی، ابداعی قابلیت یا قابل یادگار نتائج سے معرا نہیں تھی۔ اسلئے کہ اسی کے بطن سے وہ بچہ پیدا ہوا جو موجودہ ' اخوت ' اور متمدن اقوام کے ' باہمی رشتہ ' کی شکل میں آج دکھائی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ سلطنت اگرچہ مستبد تھی لیکن اسکی تاریخ کا مطالعہ نہایت توجہ اور کمال شوق سے کیا جاتا ہے

سلطنت رومہ اور ان دیگر سلطنتوں میں جنکا قیام فتح پر تھا یہ فرق اسوجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ فاتح قومیں مفتوح

قوموں سے تہذیب میں فائق تھیں۔ ایک بڑی جنگجو اور فتحمند قوم کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ متمدن بھی ہو۔ چنگیز خاں حقیقی معنوں میں فاتح تھا لیکن وہ کون تھا؟ ایک ایسے جفاکش قبیلہ کا سردار جو افلاس سے عاجز آکر قتل و غارتگری پر اتر آیا تھا۔ ایسے حملہ آوروں کے سامنے یقینی طور پر تمدن مغلوب ہو جائیگا۔ چنانچہ تاریخ میں ہم اکثر تمدن کو مفتوح دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات اگر کسی وجہ سے تمدن اپنی جگہ قائم بھی رہ گیا تو ترقی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ موجودہ زمانہ میں ایجادات کی ترقی نے تمدن کے ہاتھ کو قوی کر دیا ہے۔ تاریخ کی سب سے بڑی فاتح اقوام میں ترکمانوں کی قوم تھی لیکن باعتبار ترقی سب سے پیچھے تھی۔ ایشیا کے تقریباً تمام اولوالعزم بادشاہوں کو زیادہ تر اسی قوم سے کرایہ کی فوجیں دستیاب ہوئیں بابر اور اکبر نے بھی اسی قبیلہ کی امداد سے ہندوستان فتح کیا، یہ تو عام اصول تھا لیکن جب کوئی خاص صورت پیدا ہو جائے اور ایک اعلی درجہ کی متمدن قوم کسی ادنی درجہ کی ترقی یافتہ آبادی میں بذریعہ فتح تہذیب کی نشر و اشاعت کرے تو ایسی سلطنت نہایت ہی مخصوص دلچسپی رکھتی ہے۔ اس قسم کی مثال سکندر اعظم کی فتح مشرق میں ملتی ہے۔ چونکہ اہل مقدونیہ یونانیوں سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے اس لئے وہ اپنے ساتھ تمام یونانی روایات و عادات مشرق میں لیتے آئے۔ چنانچہ ڈایاڈوچی (Diadochi) حکومتیں، اگرچہ محض ادنی درجہ کی فوجی طاقتیں تھیں لیکن یونانی اور مشرقی خیالات کے اختلاط نے نہایت ہی عجیب اور قابل یادگار نتائج پیدا کئے۔ اس سے زیادہ قابل ذکر اثر سلطنت رومہ نے اقوام یورپ میں پیدا کیا کیونکہ اسکی مدت حیات طویل تھی اور سب اسکو اچھی طرح جانتے تھے۔ درحقیقت یہ واقعہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں بہت نمایاں اور مرکزی خصوصیت رکھتا ہے، اگر اسکو موجودہ انسانی تہذیب کا سنگ بنیاد کہا جائے تو عین مناسب ہوگا

اب اگر انگریزوں کی فتح ہندوستان کا مقابلہ بجائے ترکوں اور مغلوں کی فتوحات سے اہل یونان کی فتح مشرق اور اہل رومہ کی فتح ([illegible]) گال اور اسپین سے کیا جائے تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ اگر اسکا شمار اول الذکر فتوحات میں کیا جائے تو بغیر اسکی عظمت سے فریب کھائے ہوئے ہم اسے عہد جاہلیت کی تاریخ کا ایک معمولی ثانوی حیثیت کا واقعہ قرار دینگے۔ لیکن اگر اس فتح کا موازنہ آخر الذکر فتوحات سے کیا جائے تو پھر ہم اسکو دنیا کے افضل ترین واقعات کی صف اول میں جگہ دینگے، ایسے واقعات ہیں جو تمدن اقوام کی تاریخ میں اُسی قدر عالی مرتبت ہیں جسقدر ادنی درجہ مشرق کی معمولی فتوحات ہیں

یہاں پر اس عام حقیقت سے بحث کرنیکی ضرورت نہیں ہے کہ برطانوی ہند کی حکمران قوم کا تمدن دیسی اقوام سے زیادہ قوی اور اعلی ہے۔ ایسا دعوی کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دماغی اور ذہنی خصوصیات کے لحاظ سے یونانی قوم نہیں ہے، لیکن جس تمدن کی وہ وارث ہے وہ اسکا ذاتی نہیں ہے، بلکہ یورپ کا تمدن ہے جو یورپ کی تمام اقوام کی متحدہ کوشش سے پیدا ہوا جس میں دنیائے قدیم کی زندہ دلی نے روح پھونکی۔ اب ہم ہندوستانی تہذیب کے متعلق کیا اندازہ قائم کریں

میں نے بار بار کہا ہے کہ ہندوستان ایک ملک نہیں ہے، اسلیئے اسکا تمدن بھی ایک نہیں ہے۔ اس تمدن میں اتنی بھی یگانگت نہیں ہے جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے کیونکہ برہمنیت نے اپنے مخصوص انداز جذب و ہضم سے اپنے اندر ایسے تمدنوں کو جمع کر لیا ہے جو داتعی متضاد ہیں۔ اگر ہم سطح کے نیچے بغور دیکھیں تو یہاں پر دو صاف مختلف قسم کی آبادیاں نظر آئینگی۔ ایک سفید فام اور دوسری سیاہ فام۔ دونوں قسمیں قریب قریب ہر جگہ نمایاں ہیں۔ سیاہ فام آبادی جنوب میں غالب ہے۔ بنگال میں اگرچہ اسکی تعداد سفید فام آبادی سے کم ہے لیکن تاہم اسکی ہستی نمایاں ہے۔ گنگا کی بالائی وادی میں البتہ یہ آبادی بالکل غائب ہوجاتی ہے۔ یہ امر کہ دونوں آبادیاں قریب قریب تمام ہندوستان میں آپس میں مل جل گئی ہیں اس سے ثابت ہے کہ وہاں کی کوئی مروجہ زبان سنسکرت کی بگڑی ہوئی صورت نہیں ہے۔ جسطرح کہ فرانسیسی اور اطالوی زبانیں لاطینی کی شاخیں ہیں۔ ہر ہندی زبان اگرچہ اُسکے لغات بیشتر سنسکرت ہی ہوں، اشتقاق و شکل میں غیر آرین ہے۔ لہذا ہندوستانی تمدن کے متعلق اندازہ قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہاں کے نسلی امتیاز کو بنیاد قرار دیا جائے سیاہ فام قومیں اکثر حصوں میں متمدن نہیں ہیں بلکہ وحشی ہیں۔ مسٹر بی۔ ایچ۔ ہڈسن کہتا ہے "ہندوستان کے وسیع براعظم میں تقریباً ہر جنگلی اور کوہستانی علاقہ میں لاکھوں انسان بستے ہیں جنکی حالت مادی طور پر ان جرمنوں سے مختلف نہیں ہے جنکا حال ٹیسی ٹس (Tacitus) نے بیان کیا ہے"

اب پھر ہمکو خالص ہندو اقوام اور مسلمان تارکان وطن میں امتیاز کرنا ہے۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ سے کم مسلمان نہیں ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر افغانی ہیں یا پٹھان، عربی، ایرانی اور ترکمان یا تاتاری جو مختلف اوقات ہندوستان میں داخل ہوئے یا مسلمان فاتحین کیساتھ اُنکی فوجوں میں آئے۔ یہاں بھی مثل دیگر اسلامی ممالک کے انمیں ایک قسم کا نیم تمدن اور خاص خاص منتخب خوبیاں پائی جاتی ہیں، لیکن ان سے قدامت کی بو آتی ہے، الغرض انکے خیالات وعقائد سوسائٹی کی موجودہ حالت کے مناسب نہیں ہیں

اب ہم آخر میں ہندوستان کی مخصوص آبادی کی طرف آتے ہیں۔ یہ آرین قوم ہے جو پنجاب سے سنسکرت بولتی ہوئی آئی اور خاصکر گنگا کی وادی میں پھیلی۔ لیکن سارے ہندوستان میں اپنا مخصوص ویدیانی آئین جاری کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ شاید کسی دوسری قوم نے اس سے زیادہ تمدن کی اہلیت نہیں ظاہر کی، اسکے عہد جاہلیت سے بھی جیسا کہ ویدک لٹریچر سے منعکس ہوتا ہے، رحمدلی اور فراست ظاہر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں آباد ہو چکنے کے بعد بتدریج اس نے تمدن میں ترقی کی۔ اسکے عادات و رسوم قانون بن گئے اور پھر ان قوانین کو ایک جگہ منضبط کر دیا گیا۔ اسنے تقسیم کار کا اصول منضبط کیا، اسنے نظم، فلسفہ اور مبادیات سائنس ایجاد کیئے۔ اسی کے سینہ سے وہ عظیم مذہبی اصلاح پیدا ہوئی جو بدھ مت کے نام سے موسوم ہوئی اور جو آج بھی دنیا کے ممتاز مذاہب میں شمار ہوتی ہے۔ اس حد تک یہ قوم اُن برگزیدہ اقوام سے مشابہ ہے جنکی پیدا کردہ ہماری تہذیب ہے

لیکن آرین قوم نے جتنی ترقی یورپ میں کی اتنی ہندوستان میں نہیں کی۔ ہندوستان میں اُسنے تاریخ نگاری میں حد درجہ اپنی نااہلی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ اسکے تمام حالات بالکل گمنامی میں ہیں بجز ان مواقع کے جب یونانی اور مسلمان حملہ آوروں سے اسکا مقابلہ ہوا۔ محض قیاسات کی بنا پر ہم اُن اسباب کو دریافت کر سکتے ہیں جو اسکی ترقی میں حارج ہوے۔ وہ مذہبی اصلاح چند صدیوں کے بعد نامعلوم اسباب کی بنا پر ناکام رہی، بدھ مذہب ملک سے خارج کر دیا گیا۔ اور پجاری قوم (برہمنوں) کا ظلم استوار بنیادوں پر قائم ہو گیا کوئی بڑا اور ٹھوس سیاسی نظام نہیں پیدا ہوا اور نہ شہری تمدن کا کہیں برائے نام وجود تھا۔ یہاں تک کہ غیر ملکی فتوحات کا تازیانہ لگ گیا

عرصہ تک غیر ملکی محکومیت میں رہنا قومیت کی بربادی کے نہایت زبردست اسباب میں سے ہے۔ جو کچھ تھوڑے بہت واقعات ہمیں قدیم ہندوؤں کی بابتہ معلوم ہیں اُن سے ہمارے اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے کہ کیا اثرات اُنکی شومی قسمت نے اُنکے اخلاق پر پیدا کئے۔ یونانی مصنف ارین (Arrian) ہندوستانیوں کی عادات کے متعلق لکھتا ہے " وہ نہایت بہادر ہیں شجاعت میں تمام ایشیا والوں سے بڑھے ہیں، وہ اپنی سادگی اور دیانت کیلئے مشہور ہیں، اسقدر معقول پسند ہیں کہ کبھی مقدمہ بازی کی نوبت نہیں آتی۔ وہ اتنے ایماندار ہیں کہ نہ تو اپنے دروازوں میں قفل بند کرتے ہیں اور نہ باہمی معاہدات کو دربطہ تحریر میں لاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اس تعریف میں مبالغہ کی بو آتی ہے لیکن بقول الفنسٹن اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ سے ہندوؤں کے خصائل میں غیر معمولی تبدیلی ہو گئی ہے۔ حقیقی خصائص کو واقعیت سے بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنے کا نام مبالغہ ہے۔ لیکن آج ٹھیک یہی خصائص ہندوؤں میں غیر فطری پیمانہ پر مفقود ہیں۔ چنانچہ زمانہ حال کے سیاح ٹھیک ان کے متضاد خصائص کے بیان کرنے میں مبالغہ کرتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کو جھوٹا، بزدل اور انتہا درجہ کا مقدمہ باز بتاتے ہیں۔ لیکن یہ اختلاف واقعی ایسا ہی ہے جو عرصہ تک غیر ملکیوں کی محکومی میں رہنے کے باعث قدرتاً پیدا ہوتا ہے

فی الجملہ ہندوستان میں ہم تہذیب کے تین دور پاتے ہیں۔ پہلا کوہستانی قبائل کا دور جسے عہد جاہلیت کہہ سکتے ہیں اسکے بعد اسلامی تہذیب کا دور آیا۔ تیسرا دور اس برگزیدہ قوم کی نیم مردہ اور مغلوب تہذیب کا دور تھا جو ابتدا سے دنیا کے حکمران اور ترقی کرنے والے تمدن سے حیرت انگیز طریقہ پر علیحدہ رہی۔ جو کچھ اس قوم نے حاصل کیا مدت ہوی کہ حاصل کیا، اُسکی رفیع الشان رزمیہ نظمیں جنکا مقابلہ مغرب کی سب سے بڑی نظموں سے کیا جا سکتا ہے، قدیم ہیں، اگرچہ جتنا خیال کیا جاتا ہے اس سے بہت ہی کم قدیم ہیں۔ یہی حال اُسکے فلسفہ اور قواعد کا ہے۔ ملک نے زمانہ حال میں کچھ نہیں حاصل کیا اس کا مقابلہ یورپ سے کیا جا سکتا تھا اگر یورپ بھی وحشی اقوام کی یورش اور تمدن قدیم کے زوال کے بعد نشاۃ ثانیہ سے محروم رہتا اور دسویں اور تیرھویں صدی میں تاتاری حملوں سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکا ہوتا، بالفرض یورپ بھی آج تک اُسی حالت میں رہتا جو دسویں صدی میں تھی، ہر وقت ایشیای حملوں کی آماجگاہ بنا رہتا، زبردست قوموں اور طاقتور ریاستوں سے محروم رہتا، اُسکی زبانیں محض روزمرہ (ورناکیولر) ہوتیں جو ادبیات کے لئے غیر مفید ہوتین، اُسکی تمام عقل و دانش ایک مردہ زبان میں محفوظ ہوتی، جسکو صرف ایک مغرور مذہبی اجارہ دار

طبقہ بقیہ لوگوں میں تقسیم کرتا، اُسکے تمام علوم صدیوں کے پُرانے ارسطو، ولگیٹ (Vulgate) اور فادرس (Fathers) کے مقدس صحیفے ہوتے جن میں کچھ اضافہ کرنا بغیر توضیح وتشریح ناممکن ہوتا، یہ ہے حالت ہندوستان کے آرین کی۔ عہد جاہلیت سے تو اسکو کوئی مشابہت نہیں ہے البتہ مغرب کی تہذیب کے دور وسطی سے اسے حیرت انگیز مشابہت ہے

مغربی اقوام پر رومہ کی حکومت کی مثال ایسی تھی جیسے جاہلیت پر تمدن کی حکومت ہو، اہل گال اور عبرانیوں کے درمیان رومہ کی حیثیت ایک چراغ ہدایت کی تھی، جسکی درخشندگی کو وہ تسلیم کرتے اور اس سے اکتساب نور کرکے ممنون ہوتے۔ ہندوستان پر انگلینڈ کی حکومت گویا عہد وسطی پر عہد حاضر کی حکومت ہے۔ وہ تنویر جو ہم لاتے ہیں کم حقیقی نہیں ہے البتہ شاید کم کشش رکھتی ہے اور کم احسانمندی کے ساتھ لی جاتی ہے۔ یہ روشنی تاریکی میں چمکنے والی درخشاں روشنی نہیں ہے بلکہ اسکی مثال ایسی ہے جیسے شام کی گرم اور پرشکوہ روشنی شفق میں دن کی قدرے ٹھنڈی روشنی داخل ہوجاے

بہت سے سیاحوں کا بیان ہے کہ ایک تعلیمیافتہ ہندو باوجودیکہ وہ ہماری طاقت کو تسلیم کرتا ہے، ہماری بنائی ہوی ریلوں کو استعمال بھی کرتا ہے پھر بھی ہماری عزت وتعظیم کرنا تو درکنار ہم سے نہایت ہی سچے دل سے نفرت کرتا ہے یہ بالکل قدرتی ہے ہم ہندوں سے زیادہ عقلمند نہیں ہیں، ہمارا دماغ اُن سے زیادہ گران بہا اور اعلی نہیں ہے۔ ہم اُسکے سامنے، وحشیوں کی مانند، ایسے خیالات پیش کرکے جسکا اُسے وہم وگمان نہ ہو، اسکو حیرت زدہ نہیں کرسکتے۔ وہ اپنی نظموں میں سے ایسے خیالات پیش کرسکتا ہے جو ہمارے اعلی ترین خیالات کی ہمسری کرسکتے ہیں۔ ہمارے علوم میں بھی شاید بہت کم ایسے خیالات ہونگے جو اُسکے لئے بالکل جدید ہوں۔ ہم اسبات پر فخر نہیں کرسکتے کہ ہمارے پاس خیالات کا کافی ذخیرہ ہے یا ہمارے خیالات زیادہ اعلی ہیں البتہ ہمکو فخر ہے کہ ہمارے خیالات زیادہ پختہ اور کسوٹی پر کسے ہوے ہیں۔ زمانہ وسطی یا زمانہ قدیم کے تمدن کے مقابلہ میں موجودہ تمدن کو اس وجہ سے فوقیت حاصل ہے کہ اسمیں صداقت مبرہن کا زیادہ ذخیرہ ہے اور اس لئے اسکی عملی طاقت بہت ہی زیادہ ہے۔ لیکن ایک شاعر مزاج یا معرفت کوش فلسفی ہرگز صداقت مبرہن کی عظمت کا قائل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ اسکو سطحی تصور کریگا، اسکی عملی کامیابیوں پر ناک بھوں چڑہائیگا اور اپنے غیر محدود دور از کار قیاسات وتخیلات کی فراوانی پر وجد کریگا

ہم اہل یورپ اس امر پر بالکل متفق ہیں کہ وہ گنجینۂ صداقت جس پر مغربی تہذیب کی بنیاد ہے نہ صرف برہمنی تصوف سے بلکہ اُس روشن خیالی سے بھی جسکو قدیم سلطنت رومہ نے یورپین اقوام میں منتقل کیا، بہت زیادہ قیمتی ہے۔ لہذا ہمارا فیصلہ ہے کہ وہ صورت حالات جو اس وقت ہندوستان میں ایک فاتح قوم کے تمدن کی اشاعت سے پیدا ہے اپنی اہمیت اور دلچسپی میں اُس صورت حالات کے مساوی ہے جو رومن ایمپائر نے پیدا کی تھی۔ علاوہ ازیں یہ تجربہ مساوی طور پر وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ بالعموم ایسی سلطنت کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا ہے کہ باشندوں کی بہبودی پر اسکے فوری اثرات کیا ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ اس نے قدیم الایام کی خرابیاں رفع کردی ہیں، دوسرا کہتا ہے اسنے نئی نئی خرابیاں پیدا کردی ہیں اس تمام بحث سے اُس مخصوص نوعیت کے کام کا پتہ چلتا ہے جو ہماری سلطنت کو کرنا پڑا ہے یعنی برہمنیت کے اندر یورپ کے تخیلات متعلق بہ کائنات کا

انحلال۔ اسوقت اتنا دلچسپ تجربہ کرۂ ارض کے کسی حصہ میں نہیں ہو رہا ہوگا۔ جب ہم خیال کرینگے کہ کسی قوم کو کوئی قابل یادگار کام انجام دینے کا موقع بہت شاذ ملتا ہے تو اس تجربہ کی ترقی سے ہماری دلچسپی بہت زیادہ بڑھ جائیگی اور ہم اُس مایوسی پر غالب آجائینگے جو قدرتاً ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس تمامی بڑے ملک ہیں، کھلے ہوئے سورج کے نیچے اس قدر محنت و شفقت سے ہمکو کیا نفع ملتا ہے

یہاں پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہمکو اس کام میں ایک بڑی سہولت کا فائدہ حاصل ہے۔ یہ اُسوقت واضح ہوتی ہے جب ہم اپنی سلطنت کا مقابلہ سلطنت رومہ سے کرتے ہیں۔ رومہ اپنی سلطنت کے قلب میں واقع تھا اسلئے ہر وقت اسکو چاروں طرف سے ردِ فعل کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ علاوہ بریں رومہ جملہ خطرات کیلئے کھلا ہوا تھا۔ برخلاف اسکے انگلینڈ اپنی سلطنت سے بالکل الگ تھلگ ہے اُسے ردِ فعل کا مطلق اندیشہ نہیں ہے

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ وہ سلطنت ہی کا بھوت تھا جس نے رومہ کی آزادی کو تباہ کیا۔ وہ تمام شہری جمعیتیں جنھوں نے رومہ کی عظمت کی آبیاری کی تھی اور جنکا مرہون منت رومہ اپنی اُس ساری تہذیب کیلئے تھا جسے اُسنے بلاد مغرب کو منتقل کیا، چھوڑ دینا پڑیں اور رومہ کو اپنے لئے نسبتہً ایک ادنیٰ نظام اختیار کرنا پڑا جب اُسنے اپنی تہذیب منتقل کی تو یہ انحطاط پذیر تھی۔ سلطنت کے ایک بڑے حصہ میں خود رومہ کی زبان یونانی سے مغلوب تھی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ ایم اوری لیس نے (M. Aurelius) خود اپنا meditations (تخیلات) یونانی زبان میں تصنیف کیا۔ رومن مذہب بجائے اپنے متبعین پیدا کرنے کے آخر میں ایک دوسرے مذہب سے مغلوب ہو گیا جو سلطنت رومہ کے ایک دور افتادہ صوبہ میں پیدا ہوا تھا۔ ایک زمانہ ایسا آیا جب تمام رومن خیالات و جذبات مردہ ہوگئے اور شہنشاہان رومہ شاہان مشرق کی طرح صرف تاج شاہی پہننے کے لئے رہ گئے۔ ہمکو اب علم ہوا ہے کہ درحقیقت یہ صورت نہیں تھی بلکہ رومن روایات و اثرات صدیوں تک یورپ کے دماغ پر مستولی رہے۔ لیکن یہ استیلا کچھ عرصہ تک پوشیدہ طریقہ سے قانون اور کیتھولک اصول کی شکل میں کارفرما رہا اور پھر آگے چلکر ادب و فنون کی تعمیر میں۔ خیال کرو وہ شہر جو یورپین تہذیب کی ماں ہے اگر بجائے اپنی شاگرد اقوام کے درمیان واقع ہونے اُنکی باہمی نزاع و ہنگامہ آرائیوں سے پریشان ہونے اور انکو تہذیب سکھا کر انکے ہاتھوں غیر شائستگی مول لینے کے بالکل الگ تھلگ واقع ہوتا، آزادی کے ساتھ اپنی خوشحالی سے بہرہ ور ہوتا اور خود اپنی تہذیب کو زیادہ انہماک و مستعدی سے ترقی دیتا، اپنی محکوم اقوام کی ہدایت میں پھنس نہ جاتا، تو آج یورپ کی تاریخ جدید کس قدر مختلف ہوتی

اس لحاظ سے رومن سلطنت ایک مخصوص حیثیت رکھتی تھی کیونکہ بمقابلہ مفتوحہ سلطنت کے فاتح قوت نہایت ہی حقیر تھی۔ گویا روشنی بجائے ایک ملک سے خارج ہونے کے ایک شہر سے خارج ہوتی تھی جو ایسی روشن قندیل نہیں تھی جس میں کافی مقدار میں روشنی جمع ہو۔ جمہوریت رومہ کے اندر خاصکر شہری جمعیتیں تھیں چنانچہ جب اٹلی ہی کے اندر اس جمہوریت کو وسعت دیگئی تو اسکی شکست شروع ہوگئی۔ لیکن جہاں فاتح قوت وسیع بنیاد پر ہوتی ہے تو فتح کی کشمکش سے اسکی صورت

عام طور سے بدل جاتی ہے۔ فتح کیلئے جنگ لازمی ہوتی ہے اور پھر اُسکے قیام کیلئے انتظام کی۔ اور ان دونوں باتوں کے لئے جدید طرز حکومت اور مستحکم مالی حالت لازمی ہیں۔ ہندوستان میں سلطنت انگلینڈ کی سب سے بے نظیر خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان اور انگلینڈ کا رشتہ اتحاد بالکل ہی بے حقیقت ہے۔ بالفاظ دیگر انگلینڈ ہندوستان کے ردعمل کی زد سے باہر ہے۔ میں بیان کر چکا ہوں یہ صورت کیونکر پیدا ہوئی۔ میں نے واضح کیا ہے کہ ہم نے ہندوستان کو اس طرح حاصل کیا کہ ہمکو کوئی قیمت اسکی نہیں دینا پڑی۔ انگلینڈ اگر ایک ریاست کی حیثیت سے سلطنت مغلیہ کو تہ و بالا کرنے پر کمربستہ ہوتا تو خود اسکا نظام اسی طرح تباہ ہوجاتا جسطرح رومہ کا فتح یورپ کی سعی میں ہوگیا۔ کیونکہ اس صورت میں انگلینڈ کیلئے ازبس ضروری ہوتا کہ وہ اپنے کو ایک اعلیٰ درجہ کی فوجی سلطنت میں تبدیل کرے لیکن چونکہ سلطنت ہند چند انگریزوں نے بدامنی کے زمانہ میں وہاں کے حالات پر قابو حاصل کرکے قائم کی اور اُنسے انگلینڈ کو ورثہ میں ملی اسوجہ سے اُس کے خانگی معاملات میں زیادہ گڑبڑی نہیں ہوی۔ اسمیں شک نہیں کہ اسکی بدولت انگلینڈ کی خارجی حکمت عملی میں ایک حد تک تبدیلی پیدا ہوگئی ہے لیکن خود انگلینڈ کی اندرونی حالت میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوا۔ اس سمتی میں ہندوستان، انگلینڈ پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا وہ نئی سلطنتیں جنکا حال ہی میں الحاق ہوا ہے۔ مثلاً ہنوور (Hanover) اور ہالینڈ (Holland) اس مثال میں تمدن اعلیٰ کا اثر تمدن ادنیٰ پر زوردار اور مسلسل پڑتا ہے لیکن یہ بات رومن یا یونانی سلطنت کو مشرق میں نہیں حاصل تھی۔ اُن صورتوں میں تمدن ادنیٰ نے تمدن اعلیٰ کو جوں ہی اسنے اول الذکر کو اپنی سطح پر لانا چاہا فنا کر دیا۔ یونانیت نے مشرق کو ڈھک لیا لیکن خود یونان کی عظمت ہمیشہ کیلئے رخصت ہوگئی۔ تمام قومیں رومن شہریت میں جوق درجوق شامل ہوئیں لیکن اصلی رومنوں کا کیا حشر ہوا۔ برخلاف اسکے انگلینڈ اس جوہر کی کمی سے جو اس سے نکل جاتا ہے مطلق ضعیف نہیں ہوتا۔ وہ ہندوستان کو عہد وسطیٰ سے نکال کر عہد جدید میں لانا چاہتا ہے۔ اس کام میں اُسکو دقتوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن انگلینڈ کو اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں ہے کہ ہندوستان اسکو نیچی سطح پر کھینچ لائیگا یا ایک لمحہ کیلئے اُسکی ذاتی ترقی میں حارج ہوگا۔

یہ ہے انجام لیکن ایک عرصہ تک کسی کو یقین نہیں تھا کہ اس انجام کی نوعیت یہ ہوگی۔ برطانوی ہند کی تاریخ میں دو باب نہایت دلچسپ ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ساری دنیا کی تاریخ میں ان سے زیادہ سبق آموز کوئی باب نہیں ہوگا۔ پہلا باب ہمکو بتاتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی طرف سے انگلینڈ کو منفرت رساں ردعمل سے محفوظ رکھا گیا اور دوسرا یہ کہ کس طرح بہت پس و پیش کے بعد قصداً یورپین تہذیب کا بار ہندوستان کے سینہ پر ڈالا گیا۔ پہلا باب جارج سوم کے عہد نصف اول پر حاوی ہے۔ یہ زمانہ تاریخ انگلینڈ میں نہایت ہی پرآشوب اور غیر مستقل تھا کیونکہ اُسی وقت ایک طرف امریکہ ہاتھ سے گیا اور دوسری طرف ہندوستان ہاتھ آیا۔ اسمیں کلایو اور ہسٹنگز کا عہد داخل ہے اسکے آخر میں لارڈ کارنوالس کا عہد حکومت ممتاز ہے جو ۱۷۸۵ء سے شروع ہوا۔ دوسرا باب موجودہ صدی کے ابتدائی چالیس سالوں پر حاوی ہے اور

اس عہد کا ممتاز اور آخری نقطہ لارڈ ولیم بنٹنگ کی گورنر جنرلی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں لارڈ کارنوالس اور لارڈ ولیم بنٹنگ دو ہی اعلی درجہ کی قانون ساز ہستیاں گذری ہیں جس طرح کہ کلایو کے بعد لارڈ ولزلی۔ لارڈ ہسٹنگز۔ اور لارڈ ڈلہوزی تین بڑے بڑے فاتح گذرے۔ چونکہ ہندوستان میں ہم تمدن کی رفتار ترقی پر غور کرتے ہیں یہ دو بڑی قانون ساز ہستیاں ہماری کمال توجہ کی مستحق ہیں

پہلے ہمکو دیکھنا چاہئے کہ شروع میں کس طرح ہندوستان کی جانب سے رد عمل کا خطرہ پیدا ہوا اور پھر کس طرح اسکا دفعیہ کیا گیا۔ اٹھارھویں صدی کے نشہ و نشہ کی تمام تحریروں میں وہ خوف نہایت ہی دہشتناک ہے جسکا اظہار برک نے وارن ہسٹنگز نے کے خلاف اپنی تقریروں میں کیا تھا۔ اسوقت انگلینڈ ہند وسیاست کے غار عمیق میں کود پڑا تھا۔ اُسوقت انگریز مسلمان نوابوں کے وزیر مال یا نوابی فوجوں کے سپہ سالار مقرر ہوتے تھے اور انگلینڈ میں سلطنت مغلیہ کا مال غنیمت لالاکر بھر رہے تھے۔ اُسوقت ہمارے لئے دو خطرات تھے ایک تو یہ کہ مبادا انگریزی عادات خراب ہو جائیں کیونکہ وہ لوگ بھی جو ہند وعادات کے مداح ہیں یہ تسلیم کرینگے کہ گذشتہ صدی میں ہند وسیاست نہایت ہی ناگفتہ بہ اور مذموم تھی۔ اور دوسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ مالدار اولو العزم اشخاص جو ہندوستان سے لوٹ کر ایشیائی خیالات ساتھ لیکر انگریزی سیاسی زندگی میں داخل ہوتے تھے، مبادا اُسکے نظام ترکیبی کو درہم برہم کردیں۔ یہ خطرہ اسوقت خاص طور سے تھا کیونکہ اس زمانہ میں پارلیمنٹ کی بہت سی نشستیں ایک طور سے فروخت ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس وقت حکومت کی سب سے بڑی طاقت کا ذریعہ سیادت تھی۔ لہذا یہ اندیشہ رہتا تھا کہ ممکن ہے کوئی فریق ہندوستان کی سیادت پر نہ چھاپا مار بیٹھے اور یہ دولت ایسی تھی کہ چاہے بادشاہ کو ملتی یا وِگ پارٹی (Whig) کو اسکا پانے والا قوت اعلی کا مالک ہو جاتا

اس خطرہ کا ایک نمونہ دینے کے خیال سے جو اُسوقت کے سربرآوردہ اشخاص کو لاحق تھا میں تمہارے سامنے ایک بارہ ولیم پٹ (W. Pitt) کی اس تحریک سے بڑھکر سناؤنگا جو اُسنے اصلاح پارلیمنٹ کی غرض سے سنہ ۱۷۸۲ء میں پیش کی تھی۔ وہ کہتا ہے "ہمارے قوانین میں بخیال رقابت یہ قاعدہ ہے کہ کوئی غیر ملکی شخص پارلیمنٹ کے نمایندہ کو ایک ووٹ نہ دے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ملکی والیان ریاست نہ صرف ووٹ دیتے ہیں بلکہ پارلیمنٹ کی نشستیں خریدتے ہیں، اور اپنے ایجنٹوں کو بحیثیت نمائندہ قوم ہمارے برابر بیٹھنے کیلئے بھیجتے ہیں۔ میں جس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اُسکے سمجھنے میں کسی کو دقت نہیں ہوگی۔ ہمارے درمیان راجہ تنجور اور نواب ارکاٹ کے ممبران بیٹھے ہوئے ہیں جو چھوٹے چھوٹے مشرقی مستبد حکمرانوں کے نمائندے ہیں۔ یہ بات اب عام طور سے مشہور ہے لوگ کھلے میدان اسکا تذکرہ کرتے ہیں لیکن لاپرواہی سے کوئی انکی طرف توجہ نہیں کرتا۔ ہماری بے عزتی روز روشن کی طرح نمایاں ہے۔ اب تو یہ اسقدر عام بات ہو گئی ہے کہ کسی کو اسپر مطلق حیرت نہیں ہوتی۔ اب یہ ایک معمولی بات سمجھی جاتی ہے کہ چند بد خانوی رائے دہندگان نے اپنے ووٹ بے ایمانی سے رشوت لیکر غیر ملکی حکومتوں کے ہاتھ فروخت کردئے یا یہ کہ ہمارے سینٹ کے بعض ممبران کسی غیر ملکی مستبد کے اختیار میں ہیں، اور یہ کہ ہمارے مبعوثین طانوی

اوصاف حمیدہ کے نہیں بلکہ مشرق کے ذمائم اور بدکاریوں کے نمائندے ہیں

اس کشاکش کے قابل ذکر واقعات یہ ہیں، فاکس (Fox) کے انڈیا بل پر کولیشن منسٹری (coalition ministry) کی شکست، اور پٹ (Pitt) کے انڈیا بل کا منظور ہونا، وارن ہسٹنگز پر مقدمہ چلایا جانا۔ لارڈ کارنوالس کا اسکی جگہ گورنر جنرل ہونا اور ہندوستان میں اسکا انتظامی اصلاح جاری کرنا۔ میں صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں تاکہ انکی اہمیت کا اندازہ ہوجائے اور معلوم ہوجائے کہ اُن سے کیسے کیسے نتائج رونما ہوئے۔ اگر میں تفصیل میں جاتا تو تمکو دکھا سکتا تھا کہ فاکس کے انڈیا بل پر جو اسقدر شور شغب مچایا گیا اور ہسٹنگز کے خلاف جو اسقدر شدید حملے کئے گئے ان میں کس حد تک نامعقولیت تھی۔ میں اُس دوگانہ حکمت عملی پر بھی اعتراض کر سکتا تھا جو پٹ کے انڈیا بل نے ہندوستان میں جاری کی لیکن اگر وسعت نظر سے دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ خاص خاص خطرات سے کامیابی کیساتھ نجات مل گئی اور لارڈ کارنوالس نے خراج احسانمندی اور اڈمنڈ برک نے عزت و آرام حاصل کیا۔ کیونکہ لارڈ کارنوالس کے عہد حکومت میں کمپنی کے دامن سے بداخلاقی کا دھبہ جادو کی طرح دور ہوگیا، گورنر جنرلوں کو ایک کبھی نہ فراموش کرنے والا سبق سکھا دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے تعلق سے جو سیاسی خطرہ تھا وہ گذر گیا

انگلینڈ نے ان زنجیروں کو جن سے اُسے مقید ہونے کا خطرہ تھا توڑ دیا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگلینڈ جس نے اس سختی کیساتھ ہندوستان کا اثر قبول کرنے سے انکار کردیا، ہندوستان پر اپنا اثر ڈالنے میں کہاں تک حق بجانب تھا۔ ہم اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے کہ ہماری اور ہندوستان کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق تھا، ہماری تہذیب کو بحیثیت مجموعی ترجیح حاصل تھی، لیکن کیا ہمکو ہندوستانیوں سے اپنے خیالات منوانے کا کوئی حق تھا۔ ہمارا مذہب، فلسفہ، تاریخ اور سب کچھ مختلف تھا۔ کیا۔ کیا ہندوستانیوں کے ساتھ ہمارا صریح معاہدہ نہیں تھا کہ یہ تمام چیزیں ہم سرکاری طور سے اُن سے علٰحدہ رکھینگے۔ شروع شروع میں لوگوں کا یہی خیال تھا۔ یہ عام طور سے مسلمہ تھا کہ انگلینڈ اپنی سلطنت کیساتھ وہ کھیل نہیں کھیلیگا جو رومہ نے کھیلا تھا۔ نہیں بلکہ اسے اپنی تہذیب ایک طرف رکھکر ہندوستان پر ہندوستانی نقطہ خیال ہی سے حکومت کرنا چاہئے تھا۔ جوں جوں پہلی نسل کے اینگلو انڈینوں پر علم سنسکرت کی جدید اور موہوم دنیا کھلتی جاتی تھی ان کے اندر یہ خیال تقویت حاصل کرتا جاتا تھا۔ وہ ایک قدیم فلسفہ اور خیالی تاریخ سے مسحور ہوگئے تھے، گویا ایک طرح وہ برہمنیت میں داخل ہوگئے تھے، اور نہیں چاہتے تھے کہ اپنی مسحور مشرقی چہاردیواری کے اندر عیسائیت یا کسی اور مغربی علوم کو داخل ہونے دیں

اس لکچر میں اب اتنی گنجائش نہیں کہ اجمال سے بڑھکر میں تفصیل میں پڑوں۔ صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ کیونکر بتدریج ہم اُس خیال کو چھوڑتے گئے اور بلا خوف اپنے کو بحیثیت اوستادان تہذیب" اور "متمدن گر" پیش کردیا یہ تبدیلی ۱۸۱۳ء میں شروع ہوئی جب کمپنی کے عہدنامہ کی تجدید کیوقت ایک رقم قدیم علوم کے احیاء اور کارآمد فنون و علوم جدید کے اجراء کے لئے منظور ہوئی۔ اس قانون پر ایک تعلیمی کمیٹی ۲۰ برس تک بحث کرتی رہی کہ آیا علوم و فنون کو مشرقی نقطہ خیال سے ہمیں سمجھنا چاہیے تھا یا اپنے معتقدات کی روشنی میں

آیا ہمکو سنسکرت اور عربی کی تعلیم دینا چاہیے تھی یا انگریزی کی

روے زمین پر اس سے زیادہ اہم مسئلہ پر کبھی بحث نہیں ہوی ہوگی۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد حکومت میں یہ بحث زوروں پر تھی۔ اُسوقت حسن اتفاق سے ایک ایسا مشہور شخص موجود تھا جسکی وجہ سے اس قابل یادگار بحث کو بڑی آب وتاب حاصل ہوی۔ یہ لارڈ میکولے کی رائے تھی جس نے کہ اس بحث کا انگریزی کے حق میں فیصلہ کیا۔ میکولے کی اس یادداشت میں یا مسٹر۔ آرتھر ولبن ([illegible]) کی کتاب "ہندوستان میں مسئلہ تعلیم" میں تم اس بحث کو بخوبی دیکھ سکتے ہو۔ تم دیکھوگے کہ اس بحث میں ایک عجیب غلطی سرزد ہوی۔ اس مسئلہ پر اس نقطہ نظر سے بحث ہوئی گویا ایک طرف عربی اور سنسکرت اور دوسری طرف انگریزی میں انتخاب کرنا تھا یہ تمام زبانین عام آبادی کیلئے یکسان غیر مانوس ہیں۔ عربی اور انگریزی تو غیر ملکی ہی تھین لیکن سنسکرت بھی ہندؤن کیلئے وہی حیثیت رکھتی تھی جو یورپ کے باشندون کے لئے لاطینی۔ اسی سے تمام خاص خاص مروجہ زبانین نکلی ہیں لیکن خود یہ مردہ ہے، اور لاطینی سے زیادہ عرصہ سے مردہ ہے کیونکہ تیسری صدی قبل مسیح میں اسکا شمار مستعمل زبانوں میں نہیں تھا۔ سنسکرت کی نظمون، فلسفیانہ اور مذہبی کتب کے بیشتر حصہ سے بڑی تصنع اور آورد کی بو آتی ہے۔ ٹھیک اس طرح لاطینی زبان کی ([illegible]) اور ([illegible]) کی منظومات ہے۔ میکولے کو سنسکرت پر آسانی سے فتح حاصل ہوگئی کیونکہ یہان پر اسکو محض یہ ثابت کرنا تھا کہ انگریزی کی نظمین سنسکرت کی نظمون سے کسی طرح ادنی نہیں ہیں اور اول الذکر کا فلسفہ، تاریخ اور سائنس تو سنسکرت سے کہیں ترقی یافتہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ انتخاب صرف مردہ زبانون سے کیوں کیا گیا۔ کیا لارڈ میکولے کا خیال تھا کہ ۲۵ کروڑ اہل ایشیا کو انگریزی سکھانا آسان کام ہے؟ غالباً نہیں بلکہ قوی گمان یہ ہے کہ اُسنے سوچا کہ محض ایک مختصر سی تعلیم یافتہ جماعت پیدا کیجاے۔ میرا بھی خیال ہے کہ میکولے کی کلاسکل زبانون کی تعلیم نے اُسکے اندر یقین پیدا کر دیا تھا کہ مردہ زبان تعلیم کے لئے ضروری ہے لیکن واقعی اگر ہندوستان کو روشن دماغ بنانا ہے تو یہ مقصد نہ تو سنسکرت سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ انگریزی سے، بلکہ اُسکی دیسی زبانوں سے جیسے ہندستانی ہندی، بنگالی وغیرہ۔ میکولے نے کسی مبہم خیال کی وجہ سے ان زبانون کو اس قدر نا ملائم سمجھا کہ اُنکو فلسفہ اور علوم کا ذریعہ بنانا مناسب نہیں سمجھا، اگر وہ انگریزی کے مقابلہ میں ان زبانوں کے خلاف اپنے دلائل پیش کرتا تو یقیناً ناکام رہتا اگرچہ یہ عظیم غلطی ہوگی۔ البتہ ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وُڈ کی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے بعد سے قدرے اسکی تلافی ہو چکی ہے، لیکن جس فیصلہ کی طرف لارڈ میکولے کی یادداشت نے رہنمائی کی وہ ہماری سلطنت کی تاریخ کا ایک درخشان واقعہ ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ ہماری سلطنت ایک انجمن تہذیب ہے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کی یاد دلاتا ہے جب ہم نے قصداً اپنے تئین مکلف کر لیا کہ ایشیا میں ہمارے اوپر ایک ایسا فرض عائد ہو گیا جیسا روم نے یورپ میں اپنے ذمہ لیا تھا، اور یہ فرض ان تمام فرائض سے جنکی انجام دہی کسی حکومت کے سر پڑ سکتی ہے زیادہ اہم ہے

(ترجمہ)

عبدالقیوم رسا

ازدواج مکرر

(افسانہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۴)

صفیہ کو آئے ہوئے تقریبًا ایک ماہ کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں کوئی ایسا واقعہ ذکی اور صفیہ کی زندگی میں پیش نہیں آیا، جسے کوئی خاص اہمیت دیجائے۔ صفیہ کو گھر کے انتظام، اور اُن نسوانی مصروفیتوں سے جو شادی کے بعد ایک عورت کا محبوب ترین مشغلہ ہو جاتے ہیں، اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ ذکی کے ادبی و علمی انہماک پر غور کرکے اپنے آپ کو اس میں حصہ لینے کے قابل بنائے اور نہ ذکی کو تحریر و مطالعہ اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ بیوی سے اس موضوع پر کوئی گفتگو کر سکے

گھر کی فضا اس وقت یہ ہے کہ ذکی بظاہر اپنی جگہ مطمئن ہے کہ صفیہ تعلیم یافتہ ہو یا نہ ہو لیکن بیوی ضرور ہے اور صفیہ بھی اپنی جگہ اس خیال سے خوش ہے کہ ذکی لاکھ آزاد خیال سہی لیکن صحیح معنی میں شوہر و انسان ہے

جب صفیہ میکہ سے واپس آئی تو اُسے خیال تھا کہ شاید ذکی پھر اُس بحث کو چھیڑے گا اور ممکن ہے کہ اس کا جہل یا غیر تعلیم یافتہ ہونا پھر کس وقت ذکی کی کبیدگی کا باعث ہو، لیکن اس ایک مہینے میں ایک بار بھی ذکی نے اس کا ذکر نہیں کیا اور تمام وہ التفات جسکی توقع ایک مرد کی طرف سے عورت کو ہو سکتی ہے اسپر صرف کئے گئے، ہر چند وہ اس کو ضرور محسوس کرتی تھی کہ ذکی جب گھر میں آتا ہے تو کوئی خاص موضوع گفتگو کا اُسکے پاس نہیں ہوتا اور زیادہ حصہ یا تو خاموشی میں بسر ہوتا ہے یا پھر کتابوں کے مطالعہ میں لیکن چونکہ اس انداز میں وہ کسی نوع کی نفرت نہیں پاتی تھی اس لئے اُسے کوئی شکایت بھی نہ تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ اس امر کی کوشش کرتی تھی کہ اپنے اندر ادبی ذوق پیدا کرے، لیکن جہاں اُسے کسی نظم کی کتاب یا کوئی دیوان اُٹھا کر دیکھا اور اس کو وحشت ہوئی وہ ایک مصرعہ بھی موزون نہ پڑھ سکتی تھی اور قطعًا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک شریف مرد یا عورت ایک غزل کا مطالعہ کیونکر کر سکتا ہے جبکہ اس میں اسقدر بے حجابانہ اور شرم انگیز طور پر محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسنے بارہا الماری سے داغ وغیرہ کا دیوان نکال کر دیکھنے کی کوشش کی اور باوجود تنافر کے اسنے جبر کرکے اس کو سمجھنا بھی چاہا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسنے کسی شعر پر غور کیا ہو اور آخر کار اسنے منفعلانہ انداز سے اُسے بند کرکے نہ رکھ دیا ہو۔ اس لئے بظاہر اس کو کوئی امید نہ تھی کہ وہ اب یہ کسی وقت اپنے ادیب و شاعر شوہر کے ذوق ادب کی ہم آہنگ ہو سکے گی بلکہ بعض اوقات وہ ذکی کے جانب سے بھی یکسر استفسار و استفہام ہو جاتی تھی کہ وہ شخص جو شاعری کا اسقدر دلدادہ ہو کیونکر اس کے چال چلن کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے

ذکی کی زندگی ہر چند گھر کے اندر نہایت ہی سادہ معلوم ہوتی تھی لیکن اس کی یہی سادگی باہر جاکر "پرُکاری" میں تبدیل ہوجاتی اور اس کے وقت کا اکثر حصہ اپنے احباب کو اس امر کے یقین دلانے میں بسر ہوجاتا تھا کہ اس کی بیوی بے مثل ادیب و شاعرہ ہے۔ وہ پہلے ہی فیصلہ کرچکا تھا کہ اگر وہ خود براہ راست اپنی بیوی کی تعلیم یافتہ ہونے کے برکات و نعایم حاصل نہیں کرسکتا تو کم از کم وہ دنیا کو ضرور اس کا یقین دلا کر اپنی زندگی کو دوسروں کے نزدیک قابل رشک ثابت کریگا۔ چنانچہ وہ اب اپنے مضامین سے زیادہ اپنی بیوی ہی کے افکار نظم و نثر لوگوں کو سنایا کرتا تھا اور جس وقت داد ملتی تھی تو وہ پھولا نہیں سماتا تھا۔ انسان جب اول اول اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کرتا ہے تو کچھ عرصہ تک اس کو اس فریب کا احساس رہتا ہے، لیکن جب طبیعت اس کے عادی ہوجاتی ہے تو پھر یہ احساس بھی محو ہوجاتا ہے اور اس کو جھوٹی مسرت و لذت بھی اصلی و واقعی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔

بالکل یہی حال ذکی کا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے نام سے مضامین لکھ کر لوگوں کو سناتا، رسایل میں شایع کراتا اور اُن کی داد ملتی تو وہ خود بھی یہ سمجھکر کہ واقعی اس کی بیوی کے یہ کارنامے ہیں، بہت خوش ہوتا اور ایسا محسوس کرتا کہ اس وقت ساری دنیا اس کے خوش بختی پر رشک کررہی ہے۔

صفیہ ان حالات سے ابتک بالکل بے خبر تھی کیونکہ ڈاک باہر ہی آتی تھی اور ذکی نے انتظام کردیا تھا کہ کوئی رسالہ خط یا اخبار اندر نہ جانے پائے۔ وہ چاہتا تھا کہ خود کسی وقت بیوی سے ذکر کرکے اس خلش کو بھی دور کردے لیکن چونکہ اس کا ضمیر اس باب میں گناہگار تھا اور صفیہ کے مزاج سے وہ خایف تھا کہ مبادا اس کو پسند نہ کرے اسلئے اس کو ہمت نہ ہوتی تھی

ایک دن صبح اسنے آرٹ پر ایک مضمون صفیہ کی طرف سے لکھا اور اس کو تمام اُن نزاکتوں اور لطافتوں سے بھر دیا جنکی اس موضوع پر ایک عورت کی طرف سے توقع کیجاتی ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ بے اختیارانہ اس کو لئے ہوئے اندر چلا آیا اور اس عزم کے ساتھ کہ آج وہ صفیہ سے ذکر کرکے اس پردہ کو بھی اوٹھا دیگا۔ صفیہ تمام کاموں سے فارغ ہوکر ایک رسالہ کے مطالعہ میں مصروف تھی اور ایک غزل کو موزوں پڑھنے کی کوشش کررہی تھی۔ ذکی کو آتا دیکھ کر اسنے رسالہ الٹ کر رکھدیا، لیکن ذکی نے آتے ہی فوراً رسالہ اُٹھا لیا اور اپنی بیوی کے ذوق میں یہ تبدیلی دیکھ کر اس کے ارادہ میں اور تقویت پیدا ہوگئی اسنے بیٹھتے ہی پورے لطف و انبساط کے ساتھ مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ "کہئے اس رسالہ میں آپ کو کوئی مضمون پسند آیا یا نہیں؟"

صفیہ نے جو بہت زیادہ بے تکلف ہوگئی تھی ہنستے ہوئے جواب دیا کہ "میں تو ایک غزل کو پڑھ رہی تھی اور غور کررہی تھی کہ شاعری میں وہ کیا بات ہے جس پر آپ لوگ اس قدر سر دھنتے ہیں، میں تو اس مشغلہ کو نہایت ہی شرمناک بات سمجھتی ہوں"

اس عجیب و غریب تنقید کو سنکر ذکی ہنس پڑا اور بولا کہ "بتائیے وہ کونسی غزل ہے اور اسمیں کیا شرمناک بات ہے"

صفیہ۔ کسی ایک غزل پر کیا موقوف ہے، میں تو جب کسی شعر کو پڑھتی ہوں، یا تو وہ بالکل جھوٹ نظر آتا ہے یا بالکل فحش۔ کل میں نے کسی کتاب میں یہ شعر پڑھا:۔

چھوڑ دونگا میں نہ ہات چلے آؤ ساتھ ساتھ نازک کلائی دُکھتی ہے تو آستین سہی

میں سچ کہتی ہوں کہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ آپ لوگ کیونکر ایسی بیہودہ باتوں کو پسند کرتے ہیں"
ذکی بے اختیار ہنس پڑا اور بولا کہ "بالکل صحیح ہے، میں خود بھی اس شاعری کو پسند نہیں کرتا، لیکن سب شعر ایسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں"۔ اور صفیہ نے رسالہ لیکر ورق گردانی کی اور کہا کہ اچھا بتاؤ اس شعر میں کیا خرابی ہے:۔

مرے صیاد سر گرداں سے اتنا کوئی کہدیتا جہاں رُک جائے بجلی ہے وہ شاخ آشیاں میری

صفیہ "ماشاءاللہ، کیا کہنا ہے۔ بجلی بھی کہیں کسی سے رُک سکی ہے اور فرض کرو اگر وہ چٹیل میدان میں کسی جگہ رُک جائے تو وہاں شاخ آشیاں کہاں سے آئے گی۔ اس کے علاوہ صیاد سے کہنے کا کیا سبب ہے کیا شاعر کوئی چڑیا ہے جس کو صیاد گرفتار کرنا چاہتا ہے اور ایسا ہو بھی تو چڑیا کہیں خود اپنا پتہ بتا سکتی ہے۔ الغرض مجھے تو اس میں جھوٹ ہی جھوٹ نظر آتا ہے۔ آپ بتائے اگر کوئی خاص بات اس میں ہو"
ذکی "میں خود تو کچھ نہیں بتا سکتا، مگر کوشش کرونگا کہ تم کو خود ایسی جگہ لے آؤں جہاں تم اس قسم کا کوئی اعتراض نہ کر سکو۔ اچھا یہ شعر کیسا ہے:۔

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی اور ہمیں آجتک خبر نہ ہوئی

صفیہ "اس شعر کا پہلا حصہ بالکل جھوٹ ہے۔ دل کوئی نئی دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس دنیا کے اندر جو دنیا بن سکتی ہے وہ اسی دُنیا کی ہوگی"
ذکی "اچھا یہ شعر کیسا ہے:۔

ہے کوئی بات آج ہونے کو جی بہت چاہتا ہے رونے کو

یہ شعر سنکر صفیہ کے جسم میں بے اختیار اک جھرجھری سی پیدا ہو گئی اور خاموش سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ چونکہ اس کے پہلے مصرعہ میں ایک نسائی اعتقاد کی جھلک موجود ہے اور دوسرے مصرعہ کی کیفیت اسپر ایک آدھ مرتبہ گزر چکی تھی اس لئے اسپر بہت اثر ہوا اور تھوڑی دیر بعد بولی کہ "وہ شعر جو انساں کو افسردہ کردے کس کام کا۔ رونے کے لئے آدمی کے پاس یونہی کیا کم اسباب موجود ہیں کہ اس میں شعر کا اضافہ کیا جائے۔ مہربانی کرکے اب کوئی شعر میرے سامنے اس طرح کا نہ پڑھیے۔ خدا جانے مجھے کیا کیا وہم پیدا ہونے لگتے ہیں" اُس کی آنکھوں میں تری جھلک آئی تھی اور اس کا چہرہ مضمحل سا معلوم ہوتا تھا"
ذکی دیر تک غور کرتا رہا اور اندر ہی اندر اس تجربہ سے بہت مسرور رہا کیونکہ آج اسنے صفیہ کے حقیقی ذوق شعری کو معلوم کر لیا تھا اور اس کی مُردہ امیدوں میں از سر نو آثار حیات پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہا تھا کہ صفیہ بالکل بے حس ہے، لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ اس کے اندر شاعری کی نہایت لطیف و پاکیزہ حس موجود ہے اور اگر اس میں کوئی تحریک پیدا ہو جائے تو پوری قوت کے ساتھ بروئے کار آسکتی ہے اسنے جرأت کرکے پھر اس مسئلہ کو اٹھایا اور بولا "میں نے آجتک

تم سے ایک بات چھپائی ہے، لیکن اب اس کا پوشیدہ رکھنا بیکار ہے۔ خفا نہ ہو تو کہوں "

صفیہ ۔ یہ آپ نے کیا کہا میں آپ سے خفا ہو سکتی ہوں، عورت خفا ہونے کے لئے نہیں پیدا ہوئی بلکہ منانے کے لئے دنیا میں آئی ہے؟ ذکی اُس کے اس عاشقانہ کیفیت رکھنے والے فقرہ سے بیتاب ہو گیا اور بولا " تم کو غالباً وہ وقت یاد ہو گا جب تم نے مجھے خط لکھا تھا اور میں نے تمھیں تار دیکر فوراً طلب کیا تھا۔ تمھیں حیرت ہو گی کہ میں نے پھر کوئی ذکر تم سے نہیں کیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ اتنا زمانہ بسر کر دیا

واقعہ یہ ہے کہ میری انتہائی مسرت کی صورت صرف یہی ہو سکتی تھی کہ تم شاعر ہوتیں، ادیب ہوتیں، تمھارے مضامین رسایل میں شایع ہوتے اور میں ان کی تعریف دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا، لیکن جب میں اس طرف سے مایوس ہوا تو میں نے ایک نمایشی اور غیر حقیقی مسرت پر قناعت کرنا مناسب سمجھا اور تمھاری طرف سے میں نے غزلیں، نظمیں، مضامین اور فسانے وغیرہ لکھ کر شایع کرائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستان کے ہر گوشہ میں تمھاری قابلیت و ذہانت کا ذکر ہو رہا ہے اور اس کثرت سے تمھارے نام تعریف کے خطوط آ رہے ہیں کہ ایک بکس اُن سے بھر گیا ہے، تمھارا ادبی نام اپنے نام کی رعایت سے میں نے صفیہ ذکی رکھا ہے اور تمھیں نہیں معلوم کہ آج صفیہ ذکی کتنی شہرت و عزت کی مالک ہے "

صفیہ یہ سنکر سکتہ میں رہگئی اور ذکی کو اس طرح دیکھنے لگی گویا وہ کوئی اجنبی شخص ہے، غصہ و انفعال سے اس کا چہرہ پرنم آلود سرخی دوڑ گئی تھی اور وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ کسی بازار میں برہنہ کھڑی ہے اور لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ فرط تاثر سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ ایسے غم و غصہ کے عالم میں جو کبھی انتہائی مایوسی کے عالم میں پیدا ہو جاتا ہے اس سے زیادہ نہ کہہ سکی کہ " آپ نے بڑا غضب کیا "

اب اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ذکی جو کبھی اس نتیجہ کی توقع نہ کر سکتا تھا، حیرت و افسوس سے صفیہ کی اس حالت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب کچھ دیر کے بعد صفیہ کا وہ اضطراب کم ہوا تو ذکی نے کہا کہ " یہ بات ایسی اہم تو نہ تھی کہ تمھیں اسقدر تکلیف ہوتی "

صفیہ ۔ " میں پوچھتی ہوں کہ آپ کو اس سے کیا فایدہ ہوا۔ اگر واقعی میں ویسی ہوتی جیسی آپ چاہتے ہیں تو بھی اسکا اعلان بیکار سی بات تھی چہ جائیکہ بالکل خلاف واقعہ و حقیقت لوگوں کو اس کا یقین دلائیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس سے زیادہ توہین میری اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے زیادہ رسوائی میری اور کیا ہو گی

میں حیران ہوں کہ وہ لوگ جو اپنی بیویوں کی قابلیت و ذہانت، خوش سلیقگی و تہذیب کا اعلان کرنا پسند کرتے ہیں وہ کس نتیجہ کو سامنے رکھ کر خوش ہونا چاہتے ہیں۔ اس جذبہ کا مدعا سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ دنیا اُن کی بیویوں کی طرف سے ایک خیال پسندیدگی و ستایش پیدا کر کے غائبانہ ان سے محبت کرے بے تکلف صحبتوں میں انکا ذکر کر کے غیر مہذب و ناشایستہ الفاظ سے یاد کرے اور موقعہ ہو تو خط و کتابت سے ان پر اپنی محبت کا اظہار کر کے اپنی طرف مایل کرے آپ اگر اپنی

کسی چیز پر دنیا کو مبتلائے رشک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ جانتے ہیں دنیا اس کے حصول کی خواہش کریگی یا کر سکتی ہے۔ پھر جو آپ نے مجھ کو اس صورت سے دنیا پر ظاہر کیا تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ مجھ سے محبت کریں اظہار عشق کریں، میرے حصول کی خواہش اُن کے دلوں میں پیدا ہو اور آپ اُن کی ناکامی، نامرادی اور مایوسی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں۔ اگر یہ واقعی ایسی ہوتی تو بھی ایک صورت تاویل کی پیدا ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ حالت میں، آپ کا یہ جذبہ میرے نزدیک ایک غیر شریفانہ حرکت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (صفیہ کا غصہ بڑھتا جاتا تھا) - میں صرف اس وقت تک آپ کی بیوی رہسکتی ہوں جب تک آپ اس تعلق کا احترام کریں، لیکن جب آپ مجھ سے کسی ایسے امر کی توقع کرینگے جو میرے اس تعلق کی توہین کرنے والا ہے تو میں انتہائی افسوس کے ساتھ آپ سے نافرمانی کرنے کی معصیت کو توگوارا کر لونگی، لیکن آپ کو خوش کرنے کا ثواب حاصل کرنے کی ہمت مجھ میں کبھی نہ ہو گی۔ جسوقت میں اپنی اس رسوائی کا خیال کرتی ہوں تو شرم و غیرت سے زمین میں گڑھ جانا چاہتی ہوں۔ خدا جانے لوگ کیا سمجھے ہونگے میری غزلوں کو دیکھ کر جن میں یقیناً آپ نے نہایت ناروا جذبات کا اظہار کیا ہوگا، میرے چال چلن کی طرف سے کسقدر مشتبہ ہو گئے ہونگے اور یقیناً ایسے خطوط بھی آپ کو ملے ہونگے جو کبھی آپ مجھے نہیں دکھا سکتے اور کسے خبر ہے کہ آپ نے میری طرف سے اُن کو کیا جواب دیا ہوگا اور ان کی جسارتیں کس حد تک بڑھ گئی ہونگی

میں نے آپ کو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ میں قطعاً آپ کے ادبی ذوق کو پورا نہیں کر سکتی اور میں آج کہتی ہوں کہ وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کے اس ذوق کو پورا کرنے والی ہیں وہ سب کچھ ہو سکتی ہیں لیکن بیوی نہیں بن سکتیں اور اس لئے مجھے ایک لمحہ کے لئے اس امر کے اعتراف میں شرم نہ کرنا چاہئے کہ میں جاہل ہوں، غیر تعلیم یافتہ ہوں اور جس تہذیب و تعلیم کی جستجو آپ لوگ عورتوں میں کرتے ہیں اس کو میں اپنی انتہائی توہین خیال کرتی ہوں

خدا کے لئے بتائے کہ اب آپ نے کیا سوچا ہے اور مجھے اس عذاب سے کیونکر نجات دلا سکتے ہیں" ذکی اس میں شک نہیں کہ نہایت سنجیدہ انسان تھا اور مشکل ہی سے اس کو غصہ آتا تھا، لیکن اس وقت صفیہ کی اس برہمی اور سخت تنقید سے وہ اس حد تک نادم ہو گیا تھا کہ چارۂ کار بغیر اس کے نہ رہگیا تھا کہ وہ اپنی شوہریت کے اقتدار سے کام لے اور غصہ کا جواب غصہ سے دے اس نے صفیہ کی گفتگو کو دفعتہً روک دیا اور بولا کہ " مہربانی کر کے مجھے درس نہ دیجئے اور خاموش رہئے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کی تلافی امکان میں نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت، آیندہ بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا۔ آپ کی اگر اس میں توہین ہے تو ہو مجھے پرواہ نہیں کیونکہ صفیہ ذکی جس کے مضامین شایع ہو رہے ہیں وہ میری دوسری بیوی کا نام ہے اور اس کے متعلق آپ کو بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے

....

....

گزشتہ واقعہ کو پندرہ روز ہو چکے ہیں اور اس دوران میں ذکی ایک مرتبہ بھی اندر نہیں آیا۔ سولھویں دن دوپہر کی

ڈاک سے بعض اخبار ورسایل آئے تو اِن سب میں یہ اعلان اس کو نظر پڑا:-

"نہ میں شاعر ہون نہ ادیب"

مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ عرصہ سے بعض مضامین نظم ونثر میرے نام سے نکل رہے ہیں، اور دنیا کو غلط طور پر یہ یقین دلایا جارہا ہے کہ میں بڑی قابل وفاضل عورت ہوں۔ حالانکہ اس میں مطلق صحت کا شایبہ نہیں ہے۔ میں اس کو اپنی سخت توہین جانتی ہوں کہ کسی قسم کی کوئی تحریر میرے نام سے منسوب کیجائے اس حال میں کہ وہ میری نہیں ہے۔ نہ میں نے اس وقت تک کبھی کچھ لکھا اور نہ آیندہ اس کی توقع ہوسکتی ہے۔ میں بہت کم سواد معمولی پڑھی لکھی عورت ہوں اور شعر موزوں بھی نہیں پڑھ سکتی چہ جائیکہ خود تصنیف کروں۔ اس لئے میں اس تحریر کے ذریعہ سے پبلک کو آگاہ کرتی ہوں کہ آیندہ اس نام سے شایع ہونے والی تحریروں کو نہ مجھ سے منسوب کرے اور نہ مجھ سے خط وکتابت کرے۔ صفیہ (اہلیہ مسٹر ذکی......)

اس کے بعد ذکی اور صفیہ کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل بیکار ہے، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ صفیہ کو اپنے گھر آجانا پڑا اور ذکی مجبور ہوگیا کہ اپنا غم وغصہ دور کرنے کے لئے کہیں باہر چلا جائے۔ ہرچند اس نے صفیہ کو طلاق نہیں دی تھی، لیکن جدائی بظاہر ہمیشہ کے لئے ہوگئی تھی اور دونوں اپنے مستقبل سے بے خبر حد درجہ غمزدہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

(باقی)

نیاز

تذکرۂ خندۂ گل
یا
ظریف شاعروں کا تذکرہ

جسمیں ۳۰۰ سو سے زاید اردو، فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطایف وظرایف اور انتخابات کلام درج ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری میں اس کا رہنا ضروری ہے تنہائی میں اس سے بہتر مونس، غمگینی میں اس سے زیادہ کامیاب ذریعہ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات۔

قیمت مع محصولڈاک للعہ (چار روپیہ)

منیجر "نگار" لکھنو

آرٹ

روح کی پرواز ترقی کی طرف ہے لہذا اپنے تجربات کو کبھی دُہراتی نہیں بلکہ ہمیشہ کوشاں رہتی ہے کہ نئے اور زیادہ حسین وجمیل نقوش پیدا کرے۔ اگر عامۃ الناس کی طرح کاموں کی تقسیم اُنکے مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مفید اور خوش آیند میں کیجائے تو اس قول کا اطلاق دونوں اقسام پر ہوگا۔ فنون لطیفہ کا منشا تخلیق ہے نہ کہ نقالی۔ کسی منظر کی مصوری میں صناع کی یہ کوشش ہونا چاہئے کہ اُس سے خوبصورت مرقع کھینچے جسکا ہمکو علم ہے۔ تفصیل یعنی فطرت کے تلوّن کو دبانا اور صرف روح اور اُسکی رعنائیاں دکھانا چاہئے

ہر صناع کو یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی خاص منظر اُسکی نگاہ کے لئے ساماں نشاط اس لئے مہیا کرتا ہے کہ ایسے خیال کا ترجمان ہے جسکی وہ صناع قدر کرتا ہے۔ اور قدر اس لئے کرتا ہے کہ وہی طاقت جو اُسکی آنکھوں کے ذریعہ سے دیکھ رہی ہے اُس منظر میں بھی کارفرما ہے۔ ایسا ملکہ پیدا ہوجانے پر وہ بجائے فطرت کے فطرت کے انکشافات کا دلدادہ ہوجائیگا اور اپنی تیار کردہ فرد میں صرف وہی خیال وخط نمایاں اور مرتفع کریگا جنھوں نے اُسکے دل میں خوشی کی لہر دوڑائی۔ ایک یہی صورت ہے کہ وہ نور سے کسب نور اور ظلمت سے اُسکے راز چھین سکتا ہے۔ کسی شخص کی تصویر بنانے میں اُسکے ناک نقشہ سے زیادہ اُسکی سیرت کی طرف توجہ کرنا چاہئے کیونکہ جو شخص سامنے بیٹھا ہے ایک ناقص تمثال اور دور کی شبیہ ہے اُس حوصلہ مند اصل کی جو پس پردہ ہے

تمام روحانی مصروفیت میں جو شانِ اختصاص وانتخاب پائی جاتی ہے وہ اسی جذبۂ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ ایک پرتو ہے اُس الہام کا جو گہرے معانی کو سادہ الفاظ میں بیان کرنا سکھاتا ہے

انساں کیا ہے؟ خود نمائی میں فطرت کی شاندار کامیابی! انسان کیا ہے؟ ایک منظر جو زیادہ خوشنما اور زیادہ بلیغ ہے اُن مظاہر سے جو افق کی زینت ہیں۔ وہ فطرت کا نقطۂ انتخاب ہے! اُسکی تقریر، اُسکا جذبۂ مصوری، اُسکی شیفتگی، فطرت کیا ہے؟ ایک بلند تر کامیابی!

تھکانے والے کالے کوس، فاصلہ اور ابعاد ثلثہ کا بارگراں دور ہوگیا اور اُنکا جو ہر پارکی موسیقی سے لبریز ایک لفظ یا ایک پُرکار جنبش میں مقید کرلیا گیا!

لیکن صناع مجبور ہے کہ وہی نشانیاں استعمال کرے جو اُسکے عہد اور اُسکی قوم میں رائج ہیں تاکہ اُسکے ہم جنس اُسکا منشا سمجھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ میں جو کچھ جدید ہے اُسکا ماخذ قدیم ہے البتہ دور حاضر کی فطانت اپنی کبھی نہ مٹنے والی مُہر کردیتی ہے اور ایسی دلکشی بھرتی ہے جو ناقابل اظہار ہے اور جس سے صرف متخیلہ لذت اندوز ہوتا ہے۔ صناع جسقدر اپنے عصر کے روحانی خصوصیات سے مغلوب ہوگا اور اُنھیں اپنے مخلوقات میں نمایاں کریگا اُسی قدر اُسکے کارناموں کی عظمت دیرپا ہوگی اور آنے والے نقاد دیکھ

سامنے نامعلوم وناگزیر وربانی قوتوں کے مظاہر پیش کریگا۔ کوئی شخص اس عنصر احتیاج کو اپنی محنت سے علیحدہ نہیں کرسکتا۔ اپنے دور اور اپنے ملک کے قیود سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی ایسا نمونہ پیش کرسکتا ہے جس میں اُس عہد کی تعلیم، مذہب، اقتصادیات، روایات اور علوم وفنون کا حصہ نہو۔ چاہے اُس میں کتنی ہی اُپج ہو، چاہے کتنا ہی خود مختار وآزادہ رَو ہو اُن خیالات کے نقش ونگار نہیں مٹھ سکتا جن میں نشو ونما پائی۔ ایسا احتراز ہی اُس رواج کی چغلی کھائیگا جس سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف اور بلا ارادہ اُس فضا سے مجبور ہے جس میں سانس لیتا ہے اُن تخیلات سے متاثر ہونا لابد ہے جو اُسکے اور اُسکے معاصرین کے مایۂ حیات وحاصل سعی ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے خصوصیات کا علمبردار ہوتا ہے اگرچہ واقف نہیں ہوتا کہ وہ خصوصیات کیا ہیں۔ کسی عمل کا وہ حصہ جو فطرتاً ترتیب پاتا ہے ہمیشہ اور بہرحال میں اُس حصہ سے زیادہ دلکش ہوتا ہے جس میں انفرادی ذہانت گُل کھلا رہی ہو کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیو کا ہاتھ صناع کے قلم یا چھینی کو تاریخ نسل انسانی میں ایک سطر کے اضافہ کی رہبری کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصری وہندی وچینی مورتیں خواہ کیسی ہی بھدی اور بدشکل ہوں اہمیت رکھتی ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُس دور خاص میں روح انسانی کی اعلیٰ ترین تحریک کیا تھی۔ وہ خیالی تصویریں نہیں ہیں بلکہ وہی گہری ضرورت جو تکوین عالم کا موجب ہوئی اُنکی بھی موجد ہے

شاید اسکے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام فنون لطیفہ کی اہمیت کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ مکمل تاریخیں اور خوبصورت یادگاریں ہیں نقاش ازل کے ساختہ مرقع قضا وقدر کی جس کے اشارہ پر ہر شئے اپنی قسمت کی تکمیل کو منزل کی طرف قدم بڑھا رہی ہے

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فنون لطیفہ کا منصب ادراک حسن ہے۔ ہم بحر حسن میں غرق ہیں لیکن آنکھوں کو اُسکا جلوہ صاف نظر نہیں آتا۔ ضرورت ہے کہ اُسکے خصوصیات کو فرداً فرداً نمایاں کیا جائے تاکہ ہمارا سویا ہوا وجدان جاگ اُٹھے اور صحیح راستے پر لگایا جائے۔ جب ہم بت تراشی یا مصوری کرتے یا ان فنون کے نمونے دیکھتے ہیں تو ہماری حالت ایسے طالبعلم کی ہوتی ہے جو محض ترتیب وساخت کی لطافتوں کا مطالعہ کرتا ہو۔ حالانکہ کمال فن تحلیل میں ہے، کسی شئی کو اُسکے پریشان کُن لحوقات سے علیحدہ کرنا۔ جب تک ایک چیز دوسری چیزوں کے استعمال سے پاک نہ کیجائے ہم اُس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں اُسکا تصور کرسکتے ہیں لیکن اُسکا صحیح اندازہ نہیں ہوتا نہ اس نہج سے ہماری شادمانی والم کا کچھ ماحصل ہوتا ہے۔ شیر خوار بچہ اطمینان سے خاموش پڑا رہتا ہے لیکن اُسکے ذاتی کردار اور اُسکی عملی قوت کا انحصار اس طرح روزانہ ترقی کرنے میں ہے کہ ایک شئی کو دوسری شئی سے جدا کرے اور ایک وقت میں ایک ہی شئی سے سروکار رکھے۔ محبت اور دیگر جذبات کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمام زندگی ایک ہی ذات سے وابستہ کردیجائے۔ بعض طبائع کا خاصہ ہے کہ اپنی پوری توجہ بغیر کسی استثنا کے ایک وقت میں ایک ہی شئی یا ایک ہی خیال یا ایک ہی نقطہ کے لئے وقف کرکے اُسی کو دنیا بھر کا وکیل یا مشیر بنا دیتے ہیں۔ یہی لوگ صناع یا مقرر یا سوسائٹی کے پیشوا ہیں علیحدہ کرنا اور علیحدہ کرکے توسیع کی قدرت اُس طاقت لسانی کا جوہر ہے مقرر یا شاعر جسکا مالک ہوتا ہے۔ یہی طاقت یا کسی شئی کی

عارضی شوکت کو قائم کر دینے کی مہارت مصور یا بت تراش رنگ یا پتھر میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس قدرت کا دارومدار اس امر پر ہے کہ صناع نے زیر غور شئی کو کتنی گہری نظر سے دیکھا۔ ہر شئی کا سلسلہ فطرت مرکزی پر مختتم ہوتا ہے اور اسکی شرح اس طرح کیجا سکتی ہے کہ وہی دنیا بن جائے لہذا طباعی کا ہر عمل ایک خاص وقت میں تنہا بلا شرکت غیرے حکمران ہوتا اور پوری توجہ اپنی طرف پھیر لیتا ہے۔ اسوقت وہی ایک کام ہے جو قابل ذکر ہے غزل ہو یا راگ، یا کسی منظر کی تصویر یا کوئی مجسمہ، یا خطبہ، یا کسی مندر یا میدان جنگ کا نقشہ، یا کسی نئے خطۂ ارض کی تلاش میں بحری سفر۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ پہلی شئی کی طرح ایک دوسری شئی پیش پیش ہو کر مطمح نظر بنتی اور جاذب توجہ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک باغ جو خوش سلیقگی سے لگایا گیا ہو۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باغ کے سوا کوئی اور کام کرنے ہی کا نہیں۔ میں آگ کو دنیا کی بہترین چیز سمجھوں اگر آب، خاک، باد سے واقف نہوں۔ ہر قدرتی شئی، حقیقی ذہانت، اور ودیعت شدہ اوصاف کو یہ حق حاصل ہے اور اُنکی سرشت ایسی ہے کہ ایک خاص وقت میں وہی دنیا کی چوٹی پر ہوں۔ ایک گلہری جو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر کودتی اور پورے جنگل کو اپنی اُمنگ میں درخت واحد سمجھتی ہے ایک شیر سے کم جاذب نظر نہیں ہوتی۔ وہ بھی خوبصورت مکمل اور فطرت کی نائب ہے۔ ایک اچھا گیت سامعہ نواز ہو کر میرے دل کو اُسی طرح کھینچتا ہے جس طرح ایک رزمیہ نظم۔ کسی کامل فن کی بنائی ہوئی کتے کی تصویر اُسی طرح میرے ذوق کی تشنگی بجھاتی ہے جس طرح انجلو کے تیار کردہ مرقع۔ دلپذیر اشیا کے اسی تواتر سے آخرکار دنیا کی عظمت اور فطرت انسانی کے مالامال ہونے کا سبق ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ علم بھی ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھے پہلی چیز میں متحیر کیا اور دل کو موہ لیا وہی کیفیت دوسری چیز کے مشاہدہ سے بھی پیدا ہوئی لہذا خوبی تمام اشیا میں مشترک ہے

مصوری اور بت تراشی کا درجہ محض ابتدائی ہے۔ بہترین تصویریں اپنا آخری راز بتا دیتی ہیں۔ وہ بھدے نمونے ہیں انہین سے معدودے چند نقطوں لکیروں اور رنگوں کے جو مجتمع ہو کر ہمیشہ متغیر ہونے والے منظر حیات کا سماں دکھاتے رہتے ہیں اور جن کے درمیان ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ مصوری آنکھ کے لئے وہی کرتی ہے جو رقص اعضا کے لئے۔ جہاں بدن کا سادھنا آگیا، جسم میں پھُرتی اور حرکات میں تناسب پیدا ہوا رقاص جانچ جانچ کر قدم رکھنا بھول جاتا ہے۔ اسی طرح مصوری رنگوں کی خوشنمائی اور خال و خط کی مناسبت کی تعلیم دیتی ہے۔ جتنی زیادہ تصویریں اور کمال فن کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں اُس نامتناہی ذخیرہ کا اندازہ ہوتا جاتا ہے جو مصور کے موقلم میں پنہاں ہے۔ اُسے اختیار ہے کہ بیشمار تمثالوں میں جسے چاہے اپنا موضوع بنائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ ہر شئی کی شبیہ بنا سکتا ہے تو پھر کسی شئی کی شبیہ کیوں بنائے؟ اب میری آنکھیں کھلتی ہیں اور آنکھوں میں وہ تصویریں پھرنے لگتی ہیں جو نقاش فطرت ہر رہگزر میں بنایا کرتا ہے۔ مرد اور بچے فقیر اپنی گدڑی میں اور خوبصورت عورتیں زرق برق لباس پہنے ہوئے متحرک نظر آتے ہیں۔ کسی کے بال لمبے ہیں کسی کے گھونگھر والے کوئی سرخ و سفید ہے کوئی سیاہ فام، کسی کے چہرہ پر جھریاں ہیں کوئی بلند بالا ہے، کوئی پست قد کسی کا سینہ فراخ ہے، کسی کا تنگ، کوئی فربہ ہے کوئی لاغر، کوئی متین کوئی شوخ...

پتھری مورتیں بھی یہی تعلیم دیتی ہیں مگر ذرا سادگی کے ساتھ۔ تصویر سے رنگوں کا پتہ چلتا ہے اور مجسمہ سے اوضاع

واطوار کا۔ جب میں کوئی عمدہ مجسمہ دیکھکر کسی مجمع عام میں داخل ہوتا ہوں تو اُس شخص کے قول کی تصدیق ہوتی ہے جو کہتا تھا کہ ہومر کی مزاولت کے بعد ہر فرد بشر دیو معلوم ہوتا ہے۔ میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ تصویر کشی و بت سازی تختہائے عشق ہیں تاکہ آنکھ اپنے فرائض کی باریکیاں اور سحر کاریاں دیکھے

کوئی مجسمہ چلتی پھرتی تصویروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا، انکو پے بہ پے تغیر کی وجہ سے اصنام خیالی پر بدرجہا شرف حاصل ہے۔ کیسا عمدہ مجموعہ فن کے شاہکاروں کا ہے! کس جدت پسند صناع نے اتنی مختلف جماعتیں اور ایسی نئی نویلی تمثالیں بنائی ہیں! اے لو! صناع اپنے دل سے باتیں گڑھتا اور بت نئیں تراش رہا ہے! بہت مصروف ہے اور بہت خوش۔ ابھی ایک خیال آیا، ابھی دوسرا، اور ہر لحظہ پوری فضا، پورا منظر، پورا اسلوب بدلتا رہتا ہے حالانکہ وہی مٹی ہے اور وہی خمیر!

لے جاؤ روغن اور تختۂ قرمز کو، سنگ مرمر اور چھینیوں کو، سب خرافات ہے! اگر اِن سے دائمی آرٹ کی جادوطرازیوں کے مشاہدہ کے لئے ہماری آنکھیں نہیں کھُلتیں تو محض فیلسوفی و شعبدہ بازی ہے!

فن کے ہر نمونے کو آخر کار ایک طاقت اولیٰ سے منسوب کرنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان میں جو مشترکہ خوبی ہے یہ ہے کہ دنیا بھر اُن سے محفوظ ہوتی ہے اور اُن میں یہ استعداد ہے کہ ہماری سادگی ہمکو واپس دیں علاوہ بریں انمیں مذہبی شان پائی جاتی ہے کیونکہ وہ جس کمال کا آئینہ ہیں روح مطلق کا ظہور ثانی ہے۔ اُسی چشمۂ نور کی ایک دھار ہے۔ اُنکے مشاہدہ سے دل پر وہی نقوش مرتسم ہونا چاہئے جو مناظر قدرت کے مشاہدہ سے ہوتے ہیں۔ مبارک اوقات میں فطرت ہمارے سامنے صرف ایک صورت میں ظاہر ہوتی ہے یعنی فن کمال کو پہونچا ہوا۔ یہی شان ایک صناع کے اختراعات فائقہ کی ہوتی ہے۔ وہی شخص آرٹ کا بہترین ناقد ہے جس میں سادہ جذبات اور عظیم حادثات انسانی سے متاثر ہونے کی صلاحیت مقامی واقعات اور مخصوص رجحانات پر جو تربیت کا نتیجہ ہیں فائق رہے۔ حسن دستیاب نہیں ہوسکتا چاہے اُسکی تلاش میں ہم دنیا بھر چھان ڈالیں تاوقتیکہ ہم اُسکو اپنے ساتھ لئے نہ پھریں حقیقی حسن سطح کی دلکشی، خطوط کی ترتیب یا قواعد فن سے ماوراء ہے۔ وہ صناع کی تخلیق میں انسانی کردار کی جلوہ گری ہے، حیرت انگیز اظہار ہے پتھر یا قرمز یا سُریلی آواز کے ذریعہ سے ہماری فطرت کے عمیق و سادہ ترین خصوصیات کا۔ لہذا حسن کو وہی افراد سمجھ سکتے ہیں جنکی روح میں وہ خصوصیات موجود ہیں۔

یونان کے سنگین مجسموں، روما کی عمارتوں اور اُستادان فن کی تیار کردہ تصویروں میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ تمام دنیا اُنکا پیغام سمجھ سکتی ہے۔ تہذیب نفس، خلوص محبت، امید اُنکے پردے میں سانس لیتے ہیں۔ ہم اُنکے پاس جو کچھ لے کر جاتے ہیں وہی واپس لاتے ہیں البتہ حافظہ کے لئے خوبصورت مثالوں کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ جو سیاح ویٹیکن[1] جاتا اور مختلف کمروں سے سلسلہ در سلسلہ گزرتا ہے جن میں مجسمے، ظروف، کتبے، جھاڑ فانوس اور ہر قسم کی حسین و قیمتی اشیا آراستہ ہیں اُسکو یہ خطرہ رہتا ہے کہ اُن اصول کی سادگی کو نہ بھول جائے جن کی بدولت یہ اشیا معرض وجود میں آئیں اور یہ کہ اُنکا سرچشمہ وہی

خیالات و قوانین ہیں جو خود اُسکے سینہ میں جوش زن ہیں۔ وہ اُن یادگاروں میں ترتیبی قواعد کا مطالعہ کرتا ہے یہ نہیں یاد رہتا کہ یہ اشیا متفقہ مساعی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے عطیے ہیں۔ ہر فرد کسی ایک صناع کی تخلیق ہے اور محنت کرتے وقت اُسے کسی دوسرے نمونہ کا شاید علم ہی نہ تھا۔ حیات اور تاہل کی زندگی شیریں و تلخ ذاتی تعلقات، دھڑکتے ہوئے دلوں، لڑتے والی آنکھوں، افلاس و احتیاج و امید و بیم کے علاوہ کوئی شبیہ پیش نظر نہ تھی۔ یہی اُس کے ملہمات ہیں اور وہی تاثرات آپ کے اور میرے دل و دماغ پر طاری کرتا ہے۔ جسقدر شدت کے ساتھ اُسنے کسی جذبہ کو خود محسوس کیا اُسی شدت کے ساتھ اُسکا کردار اُسکے کارنامہ سے ظاہر ہوگا صناع کو ساز و سامان و آلات کی بنا پر مجبور یا محدود نہ ہونا چاہئے بلکہ جہاں یہ نکتہ سمجھا کہ اپنے عمل میں اپنی روح منتقل کر دے سنگ خارا بھی موم ہو جائیگا اور پورے اقتدار و رعنائی کے ساتھ ایک معقول حد تک اُسکے محسوسات کی ترجمانی کریگا۔ اُسکو حاجت نہیں کہ مروجہ و مسلمہ طرز کی پیروی کرے یا یہ دریافت کرے کہ روما و پیرس میں کیا دستور ہے اُسکا مکان، موسم، طرز معاشرت جسکو افلاس اور غیر معروف خاندان میں پیدائش نے بیک وقت ناگوار اور پیارا بنا دیا ہے وہ لکڑی کا میلا اور بے رنگ و روغن کاشانہ جو گمنامی کے ایک گوشہ میں کسی گاؤں یا جنگل کے قریب ہے یا تنگ و تاریک مسکن جو شہر کے مفلوک الحال باشندوں کے لئے مخصوص ہے کسی روشن چراغ کی طرح اُس خیال کی جنبش کو کافی ہیں جو ہر شئی سے بلا امتیاز اُبل پڑتا ہے ؎

اُس روح کو غرض نہیں پست و بلند سے   جو آپ کارساز ہے اور گرم کار ہے
جس جا ہے ایسی روح وہاں ہے سب کچھ   ہر جا ہے ایسی رُوح اُسی کی بہار ہے

فنون لطیفہ کی ثنا و صفت میں جو کچھ بھی کہا جائے یہ ماننا پڑیگا کہ ابھی ابتدائی منزل میں ہیں۔ ہم اُس مقصد کی تعریف کرتے ہیں جو پیش نظر تھا نہ کہ نتیجہ کی وہ شخص انسانی امکانات کی تحقیر کرتا ہے جو سمجھتا ہے کہ فنون لطیفہ کی تخلیق کا بہترین زمانہ ختم ہو گیا حالانکہ جو کچھ ہوا چند لہروں سے زیادہ وقیع نہیں جو دریائے فطرت کے سطح پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گزر گئیں وہ صرف اُس طوفان کا پتہ دیتی ہیں جو قعر دریا میں کروٹیں لے رہا ہے اور جسکا میلان تخلیق کی طرف ہے۔ آرٹ ابھی تکمیل کو نہیں پہونچا، اُسکو چاہئے کہ دنیا کی قوی ترین تحریکات کے دوش بدوش بڑھے اُسکا پہلو عملی و اخلاقی ہو، ضمیر سے وابستہ ہو، غریبوں اور عدم تربیت یافتہ لوگوں کو بآواز بلند دعوت صلح و امن دے۔ آرٹ کا ایک ماحصل اور ہے جو فنون لطیفہ سے بلند تر ہے، یہ فنون تو ایک ناتمام یا ضایع شدہ تحریکِ نفس کے ایسے بچے ہیں جو میعاد معینہ سے قبل پیدا ہوں۔ آرٹ تخلیق کی ضرورت کا نام ہے لیکن اسکی اصل عمیم و عالمگیر ہے۔ اپاہج اور بندھے ہوئے ہاتھوں سے کام کرنا اسکو شاق ہے اور تصویروں اور مجسموں کے مماثل لولے لنگڑے کا داک عفریت پیدا کرنا باعث ننگ سمجھتا ہے۔ اسکا کوئی مقصد ایسا نہیں جو انسان اور فطرت کی تخلیق سے پست ہو، آرٹ کچھ نہیں اگر انسان کے پورے مقدور کا مظہر نہیں، آرٹ کو چاہئے کہ دلوں میں خوشی کی ترنگ پیدا کر دے اور تمام امتیازات و افتراقات کو مٹا دے تاکہ دیکھنے والا کل کائنات میں وہی قدرت و تناسب و ہم آہنگی دیکھ لے

جسکا پتہ کسی صناع کی ذات میں اُسکا صنعتی عمل دیتا ہے۔ اسکا یہ اثر ہوگا کہ ویسے ہی دوسرے صنعت گر پیدا ہونگے۔

اس معنی میں ہر قابل قدر ہستی مع اپنے اقوال و افعال و اوضاع کے ایک مجسمہ ہے۔ ہر خوبصورت عورت جو اہل نظر کو اپنے حسن و جمال سے شریفانہ وغیر ملوثانہ طریقہ پر والہ و دیوانہ کردے ایک تصویر ہے۔ اور زندگی ایک نغمۂ شیریں و افسانۂ رنگیں۔

(ماخوذ) از ایمرسن

اثر لکھنوی

جنوری ۳۰ء کا نگار

جو ظفر شاہ کیلئے مخصوص ہے، مرتب ہو رہا ہے اور مضامین کی کتابت بھی شروع ہوگئی ہے لیکن اس وقت تک بہت کم مضامین موصول ہوئے ہیں اور جو آئے ہیں وہ بھی قابل ذکر نہیں اسلئے ہم نے وصولی مضامین کی تاریخ ۳۰ نومبر ۲۹ء تک بڑھا دی ہے۔ امید ہے کہ ارباب علم و قلم اسطرف توجہ فرماکر تاریخ مقررہ تک اپنے مضامین بھیجدینگے۔

اگر اب بھی کافی مضامین موصول نہ ہوئے تو جو مضمون آجائیں گے انھیں شایع کردیا جائیگا اور انعامی مقابلہ کی میعاد آیندہ ۶ ماہ تک اور بڑھا دیجائیگی لیکن جنوری ۳۰ء کا نگار بہرحال کم از کم ۱۶۰ صفحات پر شایع ہوگا خواہ سب کا سب ظفر کیلئے مخصوص نہ ہو۔ مینیجر نگار

رسالہ جن کا نمونہ نمبر

اخیر نومبر ۲۹ء تک طیار ہوجائیگا۔ اسلئے جن حضرات نے ابھی تک نمونہ کی درخواست نہیں بھیجی وہ فوراً روانہ کردیں۔ **ورنہ پرچہ ختم ہونیکے بعد پھر نمونہ مفت نہیں ملیگا۔**

رسالہ جن اردو زبان میں بالکل نئی چیز ہوگا اور عالم ارواح، **عالم خواب، مابعد الطبیعیات، قرأت افکار، مقناطیسیت** حاضرات، مسمریزم، اور تمام اُن امور و مباحث پر جو انسانی رُوح و دماغی ارتقا سے تعلق رکھتے ہیں، تاریخی، علمی، تحقیقی بحث کریگا اور اُن تجربات و واقعات کو بھی درج کریگا جو عالم رُوح کی عجوبہ زار دنیا سے واسطہ رکھتے ہیں۔ ضخامت فی الحال ڈھائی جزو ہوگی اور قیمت عہ سالانہ۔ ۶ ماہ کیلئے خریداری منظور نہ کیجائیگی۔ مینیجر رسالہ نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرہ

مکرمی۔ السلام علیکم۔ آپکا والانامہ لکھنؤ سے میرے پاس آیا۔ آپکی یاد آوری کا ممنون۔ آپ کا نگار میں عرصہ دو سال سے دیکھتا ہوں۔ آپکے ادبی مقالات کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ آپکی مذہبی تحقیقات میری سمجھ سے باہر ہیں۔ شروع میں تاویلات کر لیا کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ تاویلات کا دائرہ تنگ ہوتا گیا اور اب باوجود کوشش میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ پچھلے دو مہینہ کے پرچہ دیکھنے سے مجھے اطمینان ہوگیا کہ میری طرح اور اصحاب کو بھی آپکی مذہبی تحقیقات میں اعتراض ہے۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو یقیناً آپکی تصریحات مذہبی ایمانیات کی جڑونکو مضبوط کرنیکے بجائے متزلزل کر دینگی۔ اسلئے میں مجبور ہو گیا کہ آپکی توجہ دلاؤں امید ہے کہ آپ میری جسارت کو معاف فرما دینگے اور اپنی تحریرات کو پھر ایک مرتبہ نظر غور سے ملاحظہ فرما دینگے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں ایسی ہستیوں کی امید رکھنا جو اپنی غلطیوں پر مطلع ہو کر تسلیم کریں بیسود ہے۔ جبکہ تاویلات کا دروازہ کھلا ہوا ہے ہر معاملہ کی تاویل کیجا سکتی ہے۔ بلکہ جو لوگ اہل قلم ہیں وہ الفاظ اور لغات کا پردہ ڈال دیا کرتے ہیں آپ نے اپنے خط میں پرچہ ماہ اگست کے مطالعہ کی طرف ہدایت فرمائی ہے۔ میں نے اوسکو دیکھا لیکن افسوس ہے کہ اسکی تصریحات اب بھی تشفی بخش نہیں ہیں اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپکے مقالات مذہبی پر ایک سرسری تبصرہ کرکے میں نے جو نتیجہ نکالا ہے پیش کردوں "تو خواہ از سخنم پند گیر یا کہ ملال"

قرآن۔ قرآن کے نسبت آپکا نظریہ یہ ہے کہ "قرآن کو اصول فطرت ہی کے مطابق سمجھنے دیجئے اور غیر متعلق باتوں کو اوس میں شامل کرکے مذہب کی سادگی کو تباہ نکیجئے"

اصول فطرت سے آپکا کیا مطلب ہے اسکی تصریح کرنا چاہئے۔ غیر متعلق باتوں سے آپ نے کون باتیں مراد لیں ہیں وضاحت کی ضرورت ہے۔ کیا اصول فطرت وہی ہیں جنکے پابند ہو کر آپنے قرآنی آیتوں کی تفسیر کی ہے۔ جسکے چند نظائر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

مثلاً حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

مثل عیسی کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون۔ آپ یوسف نجار کو اونکا باپ بتاتے ہیں۔ کیونکہ آپکے اصول فطرت میں بغیر باپ کے لڑکا پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن معلوم نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں جناب کیا ارشاد فرما دینگے۔ پھر افسوس ہے کہ الفاظ قرآنی اور سیاق عبارت بھی آپکا ساتھ نہیں دیتے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تمثیل اور لفظ کن فیکون کا ہونا۔ جگہ جگہ حضرت عیسی علیہ السلام کے نام کے ساتھ ابن مریم فرمانا سب بیکار ہو جاتا ہے۔ پھر انھیں حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں بطور خرق عادت کے استحساناً ارشاد ہوتا ہے۔

واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فیکون طیراً باذن اللہ وتبری الاکمہ والابرص باذنی

واذ تخرج الموتی باذنی ۔ لیکن جناب کے نزدیک یہ خرق عادت نہیں ہے ۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا یا ید بیضا صرف ایک تعبیر کامیابی تھی ۔ اس موقع کے الفاظ قرآنی ملاحظہ فرمائیے

فالقیٰ عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین ۔ ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین ۔ دوسری جگہ بجای ثعبان مبین کے حیتہ تسعیٰ ارشاد ہوا ہے اور واضمم یدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء اٰیتہ اخریٰ اب ثعبان اور حیتہ تسعیٰ کے کیا معنی ہیں ۔ تخرج بیضاء من غیر سوء سے کیا مراد ہے یہ سب نظربندی ہے یا تعبیر کامیابی ۔ اسی طرح دریا کا پھٹ جانا اور پانی کا مثل دیوار کے قائم ہو جانا ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہ میں قرآن زنان مصر کی زبان سے جو رعب حسن سے مرعوب ہو گئیں تھیں ۔ ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم فرماتا ہے لیکن آپ اوسکو افسانہ سمجھتے ہیں ۔ یہ وہی افسانہ ہے جسکو خدا احسن القصص فرماتا ہے

نماز کے بارے میں خدا اکثر جگہ سے زیادہ قرآن میں مختلف عنوان سے ہدایت فرماتا ہے اور اوسکو مسلمانوں پر ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا سے فرض عین کرتا ہے ۔ حتیٰ کہ خوف جان کی حالت میں بھی وقت سے بیوقت پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ نماز پڑھنے کا جنگ کی حالت میں طریقہ بتاتا ہے اسی آیت سے پہلی آیتین قرآن کھول کر پڑھیے ۔ اور آپکا یہ فرمانا کہ خدا کی بتائی ہوئی عبادت ، رسم ورواج یا ظاہری نقوش وحرکات کی پابند نہیں ہو سکتی ، اب آپ فرماتے ہیں کہ عبادت کی غرض انقیاد امر اور اجتناب از معاصی ہے صرف الفاظ کا پردہ ڈالنا ہے ۔ اس سے کس کو انکار ہے لیکن یہی ظاہری حرکات وارکان مقصود تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں ۔ اور ذریعہ مقصود سے مقدم ہوتا ہے ۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ طہارت سے مراد ظاہری پانی بہا کر اعضا کو صاف کرنا نہیں ہے ۔ بلکہ اعضا کو گناہوں اور دل کو خیالات فاسدہ سے پاک کرنا مراد ہے ۔ قرآن نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا ہے ۔ قد افلح من ذکہا لیکن باوجود اسکے ارشاد ہوتا ہے ۔ اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا بروسکم وارجلکم الی الکعبین ۔ یہ صرف پانی بہا کر اعضا کو پاک کرنا ہی ہے ۔ چونکہ وسیلہ مقصد تک پہونچنے کا اسلئے ہدایت فرمائی ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آپسے زیادہ جانتے تھے کہ کعبہ سے مقصود توجہ الی اللہ ہے لیکن پھر بھی خود خدا سے ارکان حج کی تعلیم چاہتے ہیں ۔ وارنا مناسکنا ۔ اسپر احرام باندھنا ۔ طواف کرنا ۔ سعی کرنا وغیرہ وغیرہ تعلیم فرمایا جاتا ہے جو بجنسہ ابتک رائج ہے ، اب آپکا یہ فرمانا کہ قرآن مین نماز موجودہ کی تصریح نہیں ہے یہ بھی تائید لفظی ہے ۔ اور بے معنی ہے ۔ بلکہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن ایک متن متین ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا آپنے قرآن کو ایک ضابطہ کی شکل میں پیش کیا ۔ اجمال کی تفصیل کی ۔ یا خدا کی طرف سے خود تفصیل بتائی گئی ۔ چنانچہ نماز کے بارے میں بھی حضرت جبرئیل کا آنا اور نماز کا طریقہ تعلیم فرمانا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے ۔ لیکن چونکہ آپ کے نزدیک کوئی صحیح حدیث موجود نہین ہے ہم استدلال میں پیش نہیں کرتے صرف معقولات سے جو آپ کے نزدیک ذریعہ رشد وہدایت کا ہے ، گفتگو کرتے ہیں ۔ ہر صورت میں نماز کی فرضیت نہین جاتی ۔ مثلاً وضو کے بارہ مین صرف آیت سے

اذا قمتم الی الصلوٰۃ الخ۔ لیکن کس طریقہ سے عمل کیا جاوے قرآن ساکت ہے نماز میں صرف اوقات نماز اور ارکان کے الفاظ مثلاً رکوع و سجود قیام وقعود کو بتایا ہے لیکن نہ کوئی خاص تعین وقت کی ہے نہ تعداد رکعت کی نہ طریقہ ادا کی۔ اسی طرح حج کو فرض کرتے ہوئے کوئی خاص طریقہ حج کا بیان نہیں کیا صرف ارکان مثلاً احرام۔ طواف۔ سعی وغیرہ بتائیں ہیں روزہ میں صرف ایک ماہ کا روزہ اور تعین وقت ہے زکوٰۃ میں صرف مصرف زکوٰۃ۔ کیا اس مجمل بیان کی وجہ سے آپ ان سب باتوں کی فرضیت سے انکار کرینگے۔ اور اسکو نظام قومی اور سوسائٹی کا فرض بتاکے ختم کر دینگے، ظاہر ہے کہ اگر قرآن میں ہر ایک بات کی تصریح اور تفصیل کیجاتی تو معلوم نہیں کتنے دفتر طیار ہو جاتے۔ اسلئے کہیں تفصیل کر دی کہیں اشارہ کر دیا۔ اسکے ساتھ مسلمانوں کو رسول کی اطاعت فرض کر دی۔ چنانچہ ملاحظہ ہو آیات قرآنی۔ وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا و من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ و قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ اس صورت میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے جو قرآن کے اجمال کی تفصیل کی ہے وہ بھی دراصل قرآنی ہے۔ کیا اس صورت میں آپ احادیث میں جو قرآنی تفسیر یا تشریح ہے اوسکو غیر متعلق باتوں میں شامل کر کے اوسکی اہمیت کو کم کر دینگے میرے نزدیک قرآن کی تفسیر کے بارے میں یہ نظریہ ہونا چاہئے کہ

۱۔ قرآن کے مطالعہ و فہم کا وہ طریقہ ہو جو تمام تر قرآن پر مبنی ہو ۲۔ قرآن میں باہر کے اثرات کو دخل نہو مثلاً منطق فلسفہ سائنس۔ بنی اسرائیلیات ۳۔ عربی لغۃ کے صاف اور معروف معانی ۔ ۴۔ عربی بول چال کے بے تکلف اور سادہ محاورات ۵۔ صدر اول کا بے لاگ ذوق فہم ۔ ۶۔ اور رسول اللہ کا فطری اور غیر صناعی اسلوب بیان کیونکہ انبیا کرام کی تعلیم کا مقصود بحث و نظر نہیں ہوتا بلکہ تلقین اور یقین پیدا کرنا ہوتا ہے۔ قرآن نے خود جا بجا اپنے نام گنائے ہیں وہ کہتا ہے کہ میں موعظۃ ہوں۔ ذی الذکر ہوں۔ تبیانا لکل شئے ہوں۔ تذکرہ ہوں ۔ ھدی و رحمۃ ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ جو بات موعظت ہو تذکیر ہو۔ نصیحت ہو ہدایت ہو۔ روح و دل کے روگوں کی شفا ہو وہ تاویلات کا بے پایاں دفتر نہیں ہو سکتا۔ نہ منطق و فلسفہ کا اکھاڑہ۔ خود امام رازی جنھوں نے تفسیر اسی رنگ میں لکھی تسلیم کرتے ہیں کہ لقد تاملت الطریق الکلامیہ و المناھج الفلسفیہ فما رایتھا تشفی علیلا۔ ورایت اقرب الطریق طریقۃ القرآن کیا مصیبت ہے کہ قرآن عربی زبان میں عرب میں نازل ہوتا ہے۔ تمام فصحا، قریش اوسکی فصاحت کے آگے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن آج تیرہ سو برس کے بعد ایک شخص فتحپور میں پیدا ہوتے ہیں جو قرآن کو مجموعہ تاویلات اور معقولات کا ظاہر کرتے ہیں۔

حدیث۔ کے متعلق آپکا نظریہ یہ ہے کہ بخاری جو اصح کتاب بعد قرآن ہے گیارہ سو برس سے مانی جاتی ہے آپ اوسکو ترک اسلام کا مرادف بتلاتے ہیں استدلال یہ پیش کرتے ہیں کہ دو سو برس کے بعد حدیث کی کتابیں تصنیف ہوئیں جب تحقیق کے دروازہ مسدود ہو چکے تھے اسلئے ناقابل اعتبار ہیں۔ گویا امام بخاری کی سولہ برس کی جانکاہی آپنے نوک قلم سے عبث اور بیکار ثابت کر دی۔ بلکہ جناب علامہ سید مقبول احمد صاحب تو کسی حدیث کی کتاب کو ہضم نکر سکے مجبوراً اونکو تے کرنا پڑی۔ شاید

انکو معلوم نہیں کہ غذا معدہ کی قوت، صلاحیت اور مناسبت سے ہضم ہوتی ہے۔ قرآن کا تو خود دعوی ہے کہ بعض قلوب جن کی دلمیں روگ ہے اس سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ کا کلمہ تو لوگ ہضم نکر سکے قتل اور جلا وطن ہونا منظور کیا۔ آفتاب کی روشنی بھی کمزور آنکھوں کو پسند نہیں آتی۔ پانی کی خاصیت طبعی سبزہ کو اوگاتی ہے لیکن بعض زمینوں مین روئیدگی بھی پیدا نہیں ہوتی پھر اونکو اگر حدیث کی کتابیں ہضم نہ ہو سکیں تو کیا تعجب ہے معلوم نہیں کہ امام ابو حنیفہ رح جو پہلی صدی میں ہوئے تھے اونکے مسانید کیوں نا قابل قبول ہیں۔ اکثر احادیث مختلف طریق سے روایت کی گئیں ہیں تو کیا قدر مشترک بھی صحیح نہیں ہو سکتا اب جبکہ تمام احادیث کی کتابیں بقول سید مقبول احمد صاحب مجموعہ اکاذیب اور بقول آپکے ترک اسلام کے مرادف ثابت ہوگئیں اور اوسپر جناب نے ایک کلیہ بھی ارشاد فرمادیا کہ یہ کہنا "حدیث میں یہ آیا ہے بے معنی طریقہ رشد و ہدایت کا ہے"، پھر اگست کے پرچہ میں ارشاد فرمانا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک متلو دوسری غیر متلو ایک بے معنی جملہ ہے یا مغالطہ اسواسطے کہ جب غیر متلو کا وجود ہی نہیں ہے تو اوسپر بحث کرنا بیفایدہ یا حوالہ دیا ہوتا کہ فلاں کتاب کی حدیث یا کم از کم فلاں فلاں حدیث قابل استدلال اور صحیح ہے۔ معلوم نہیں کہ خدا کے اس حکم کی تعمیل کہ لکم فی رسول اللہ اسوۃ الحسنہ کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اسوہ حسنہ کا پتا نہیں۔

فقہ - فقہ کے نسبت آپ فرماتے ہیں کہ دفتر بے پایاں ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے عرب میں بیٹھکر تمام دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کر دیا گیا کیسے ممکن ہے کہ تمام دنیا کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کافی ہو جبکہ تمام دنیا کا تمدن اور تہذیب طرز معاشرت رسم و رواج میں مختلف ہونا یقینی ہے۔ یہ نظریہ ہے جناب کا معلوم نہیں کہ قرآن کو اس کلیہ سے کیوں مستثنیٰ فرماتے ہیں۔ حالانکہ اوسکے بارے میں جناب ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ کافر و مومن ہر شخص کے لئے ہر ملک کے لئے قیامت تک کے لئے کافی ہے آپ جانتے ہیں کہ ان محدثین اور فقہائے اخلاص اور محبت کے ساتھ نہایت جانفشانی سے اپنی تمام عمر صرف اسکے لئے وقف کر دی تھی۔ محض حدیث کی صحت کے لئے ایک خاص فن معرفت الرجال کا نکالا۔ ہر راوی کی تحقیق نہایت غیر طرفداری سے کی۔ کھرے کھوٹے کو علیحدہ کر دیا۔ اسی اعتبار سے احادیث کی قسمیں کیں ان قسموں کے اعتبار سے احکام کی تفریق کی۔ یہ ممکن او۔ بہت ممکن ہے کے باوجود ان کوششوں کے کہیں غلطی واقع ہوگئی ہو۔ پھر اگر باقتضا ابشریت کہیں غلطی واقع ہوگئی ہو اور میں کہتا ہوں کہ ضرور ہوگئی پھر بھی وہ اصحاب اور اونکے کارنامے موجب تحسین ہیں نہ سبب نفریں لیکن اگر یہ کوششین بھی جناب کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہیں تو پھر دنیا کی تاریخ سب بیکار ہو جائیگی جس نے محض خیالی بنیاد قائم کی ہے۔ پھر تمام دنیا جانتی ہے کہ ایک معمولی گھر کا انتظام بھی بغیر قاعدہ اور قانون اور اجتماعی حالت کے چل نہیں سکتا۔ سلطنت کے کاروبار چلانے کیلئے بھی ایک قانون اور اوسپر اجتماعی طور سے پابند ہونیکی ضرورت ہے لیکن آپ تمام دنیا کے مسلمانونکو دعوت دیتے ہیں کہ انفرادی حالت میں ہر شخص کو چاہئے کہ جسکی جو سمجھ میں آوے کرے۔ حالانکہ جب تمام دفتر فقہا کا بیکار ہو گیا تو انفرادی حالت میں سب کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا کیسے ممکن ہے۔ بہر حال جنکی تعداد فی ہزار نو سو ننانوے ہے کس قانون کے مطابق چلیں

کیا آپ بتا سکتے ہیں کے ہندوستان میں آپ جیسے علامہ کتنے ہیں جنھوں نے چھ برس کی عمر میں فارسی درسیات سے فراغت حاصل کی ہو۔ کتنے ہیں جو چودہ برس کی عمر میں فضیلت کی دستار کے مالک بنگئے ہوں۔ ان بیچاروں کے لئے کیا ہدایت ہے۔

تقلید۔ اسکو آپ لعنت فرماتے ہیں۔ اسواسطے کہ ہر شخص کا پیدایشی حق آزادی ہے کوئی وجہ نہیں کے اوسکو پابند بنایا جاوے بیشک ہر شخص محکوم ہونا لعنت سمجھتا ہے۔ غلامی کی زندگی کو موت سے بدتر سب سمجھتے ہیں ذلیل رہنا کس کو گوارا ہے۔ لیکن مجبوراً سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جوان عقل وسمجھ کا انسان ایک طفل صغیر ناسمجھ کی تقلید پر مجبور ہے۔ مریض ایک غیر مہذب ڈاکٹر کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ محض اسوجہ سے کے نابینا یہ سمجھتا ہے کہ راستہ کا علم اسکو ہے اسی طرح مریض سمجھتا ہے کے اسنے پانچ سال اس فن کو لاہور یا لکھنؤ کالج میں حاصل کیا ہے۔ اعلی ادنی کو جذب کر لیتا ہے۔

گر تو سلطاں نہ رعیت باش　　چو نبی نیستی زامت باش

جو جواب اسکے بارے میں آپ دیں وہی ہماری طرف سے قبول فرمائیے۔ اور پھر جاہلونکے بارہین آپ کیا ہدایت فرماوینگے۔ کیا اونکو بھی اجازت ہے کہ ہر کہ آید در دلت بے خوف کن۔ ضیاءالدین احمد خانصاحب کی طرح کسکو کسکو نگار کے مطالعہ کی ہدایت فرماوینگے

ہم بھی چاہتے ہیں کے یہ قلادہ گردن سے اوتار کے پھیکدیں لیکن ہماری سمجھ میں ابتک کوئی صورت نہیں آئی۔ میں آپکا بڑا ممنون ہونگا اگر آپ تقلید سے میری گردن چھوڑادیں۔ سب سے پہلی بات جو اسمیں سنگ راہ ہے وہ حدیثوں کی تحقیق اور اوسکے رواۃ کی جانچ ہے۔ فقہا اور محدثین کے اجتہاد کو علحدہ کرکے کوئی صورت بتائیے۔ جبتک براہ راست حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثین نہ ملیں تقلید کرنا پڑیگی۔ آج تیرہ سو برس کے بعد اسبات کے یقین کرنیکی کون صورت ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یہ حسن ہے۔ یہ مرفوع ہے یہ مرسل ہے

آپ فرماتے ہیں کہ یہ ایسا زبردست ترقی کا زمانہ آیا ہے کہ اب منقولات کی سپر کام نہیں دیسکتی اور حفاظت کی صورت اگر کوئی ہے

تصرف معقولات

اسکے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زبردست ترقی کے زمانہ سے آپکی کیا مراد ہے۔ کس چیز میں زبردست ترقی ہے۔ علم وحکمت میں۔ الحاد وزندقہ میں دولت وثروت میں بے دینی اور لامذہبی میں۔ اگر علم وحکمت مقصود ہے تو کس علم کی طرف جنابنے اشارہ فرمایا ہے۔ فلسفہ۔ حکمت سائنس۔ منطق۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی۔ ظاہر ہے کہ چونکہ قرآن فصیح زبان عربی میں نازل ہوا ہے اس لئے قرآن کا سمجھنا بغیر عربی کے ممکن نہیں اور ابتک کوئی آلہ ایسا ایجاد نہیں ہوا جسکے ذریعہ سے ایک علم کے پڑھنے سے تمام دوسرے علوم پر دستگاہ اور عبور ہو جاے، کیا آپ اسبات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر شخص طب کی کتابونکا ترجمہ دیکھکر ایک طبیب حاذق ہو سکتا ہے۔ یا قانونی کتابونکے ترجمہ سے دفعات کے مطالب حل کر سکتا ہے اگر نہیں ہو سکتا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ بغیر عربی کی دستگاہ کامل رکھے ہوے قرآن کے مطالب حل کر سکے۔ اور قرآن کے مطالب حل کرنیکے لئے کن کن علوم کی ضرورت ہے اور اون علوم سے ہندوستانکے کالجوں میں کتنے طالب علم ماہر ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس زبردست ترقی کے زمانہ میں کتنے ابوحنیفہ ہیں کتنے شافعی ہیں کتنے بخاری

یا مسلم ہیں کتنے بایزید اور جنید و شبلی ہیں کتنے غزالی اور رازی ہیں۔ بریلی اور دیوبند کی بارگاہیں تو بند ہوگئیں کسی کالج ہی کی بارگاہ کا پتہ بتا دیجئے جہاں ان علوم کی تعلیم ہوتی ہو۔ اگر انمیں سے کچھ نہیں ہے تو بے معنی الفاظ سے جملہ مرکب کرنا سوائے مغالطہ دینے کے اور کیا فائدہ ہے

اب رہی سائنس سو اسکا تمام تر مدار تجربہ اور مشاہدہ پر ہونیکے باوجود کیا آپکو معلوم نہیں کہ روزانہ اسکے اصول بدلتے رہتے ہیں کیا سائنس کی مطابقت قرآن سے کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ جب سائنس کا اصول بدلجائے تو قرآن کے احکام پھر غلط ہو جائیں۔ افسوس طوالت مانع ہے ورنہ علمائے سائنس کے اصول ہم آپکے سامنے رکھتے اور دریافت کرتے کہ اب اُنکی کیا حالت ہے۔ رہگیا فلسفہ و حکمت اسکے اصول خود ظنی ہیں پھر ظن کو یقین سے بدلنا آپ جیسے علامہ کا نظریہ ہو سکتا ہے علاوہ اسکے کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء کرام فلسفہ اور حکمت کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے۔ اگر انبیاء کرام اپنے طریق تعلیم میں فلسفہ اور حکمت کا طریقہ اختیار کرتے تو ظاہر ہے کہ انکا خطاب عام نوع بشر سے نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ بجز چند افراد کے جنھوں نے علوم وضعیہ کا طریقہ سیکھا ہے نہ سمجھ سکتے ہیں نہ مکلف ہو سکتے ہیں، یا دہ ایمان کی براہ راست دعوت دینے کے بجائے مدرسوں میں تعلیم دلواتے پھر اون سے بحث و جدل کرکے قایل کرکے ماننے کے لئے مجبور کرتے۔ لیکن پھر بھی اس نام نہاد فتح و شکست سے سچائی کا فیصلہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ قرآن اور سنت پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے تمام طریق حصول مقصد کے لئے سود مند نہیں ہیں بلکہ ہدایت اور یقین کی راہوں سے دور کر دینے والے ہیں۔

اب یہ بات کہ خلاف عقل باتوں کو اس طرح باور کرانا کہ حدیث میں ایسا آیا ہے بے معنی صورت رشد و ہدایت کی ہے، معلوم نہیں کہ جناب نے عقل کا معیار کیا قرار دیا ہے علم کی کمی بیشی کا اثر عقل پر پڑ سکتا ہے یا نہیں اگر پڑ سکتا ہے تو سب لوگونکا ایک مرکز پر جمع ہو جانا کیسے ممکن ہے ہیئت اجتماعی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ بڑے بڑے عقلمندوں نے عقل دوڑائی اور عجائب و غرائب قدرت کے کارخانونکو دیکھ دیکھ کر اور سوچ سوچ کر جان لڑائی اور کچھ نہ جانا اور جو جانا غلط جانا کیونکہ اگر عقل کی رو سے جاننا چاہیے تو ہزارہا امور ایسے ہیں جو دھوکا دیتے ہیں اور صحیح راستہ اور منزل حق تک نہیں پہونچنے دیتے۔ جب مشاہدہ اور تجربہ ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں تو عقل کیسے رہنمائی کر سکتی ہے۔ جو صرف ایک ظنی علم ہے۔ مجبوراً بڑے بڑے سائنس دانونکو ماننا پڑا کہ وہ دھوکہ میں ہیں چنانچہ اڈورڈ کلاڈ کہتا ہے کہ " بیسویں صدی کے انکشافات گزشتہ صدی کی تحقیقات سے بازی لیجائینگے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم جسقدر عقل میں ترقی کر رہے ہیں اوسیقدر اسرار کائنات پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں "۔ مسٹر براٹ اسپنسر جسکو مسائل سائنس کو فلسفیانہ رنگ میں بیان کرنے میں یدطولی حاصل تھا اپنی مشہور کتاب اصول اولیہ میں بیان کرتا ہے کہ " عقل انسانی علم حقیقی کے حصول سے عاجز ہے " یوشین صاحب لکھتے ہیں کہ " خدا تعالی نے بے شک اس بات کے دکھانیکو کہ انسان اگر مطلق اپنی عقل پر چھوڑ دیا جاوے تو اوسکا کیا ہی لوب ہو جاتا ہے جو اہل مصر کا تھا جنھوں نے عقل انسانی کو اعلی درجہ پر پہونچا دیا تھا اور پھر ایسی نفرت انگیز بیہودہ بت پرستی میں پھنسے کہ لوگونکا تماشہ گاہ بنے۔ یونان کی بھی یہی حالت ہوی۔ افلاطون

جسنے صحیفہ قدرت سے بعد غور کامل چند اصول لکھے تھے افسوس ہے کہ وہ خود بھی انپر قائم نہ رہ سکا۔ اسلئے ایسی فطرت عالیہ کا وجود ہدایت کے لئے ضرور ہے جو حق کو باطل سے تمیز کر کے بتا سکے اور تمام خلق کو اصلی راہ دکھا سکے جو آیندہ نسلوں کے لئے مشعل ہدایت ہو" یورو پین علماء کے نتائج تحقیقات ہمنے اسلئے پیش کئے کہ آپنے انھیں سے مرعوب ہو کر عقل کو معیار الٰہیات کے حاصل کرنے کا قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ وہی آواز بازگشت ہے جسکو معمولی درجہ کے اسلامی شعرانے کئی سو برس پہلے ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ چنانچہ حافظ شیرازی اپنی مستانہ ادا میں فرماتے ہیں کہ

حدیث مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو　　　کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

نظامی گنجوی فرماتے ہیں

مہندس بسے جوید از راز شاں　　　نداند کہ چوں کرد آغاز شاں
خرد تا بدو مرزتا بد ترا　　　کہ تا ب خرد برنتا بد ترا

وغیرہ وغیرہ حیرت اور سخت حیرت ہے کہ جو لوگ علم الادیان میں دریدہ دہن نظر آتے ہیں وہی علم الابدان میں دہن بستہ ہو جاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ایک بزرگ کا کہنا جسنے اوس علم کے حاصل کرنے میں اپنی تمام عمر صرف کی ہو۔ بدترین صورت رشد و ہدایت کی سمجھی جاے اور دوسرا شخص جسنے صرف چار پانچ سال ایک فن کو حاصل کیا ہو بڑے بڑے عقلا کی زبان بند کر دے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مذہب کی باتیں عقل و سمجھ سے باہر ہیں لیکن ہر شخص کی سمجھ ایک مرکز پر جمع ہو جاے اور ایک ہی قسم کا نتیجہ نکالے اصولاً غلط ہے۔ یہ سچ ہے کہ قانون قدرت پر غور و فکر کرنے سے ایسی باتوں کو جو انسان کی طبیعت کو دھوکا دیں دریافت کر سکتے ہیں مگر کب جبکہ انسان کے معلومات کو ایک کافی ترقی اور قوانین قدرت پر اور اُن مختلف قوی کے اسرار پر جو ادسکے بانی نے اوسمیں رکھیں ہیں ایک معتد بہ آگاہی بھی حاصل ہو پھر تمام انسان اون دقایق پر نہیں پہونچ سکتے اور بالفرض جو پہونچ بھی سکتے ہیں وہ معدودے چند کے سوا نہیں ہو سکتے اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں در صدیوں میں۔ پس اسلئے کہ اوس قادر مطلق کی حکمت بیکار نہ رہے ضرور ہوا کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانہ کے لحاظ سے ایسے ہادی پیدا کئے جائیں جو باعتبار اپنی فطرت کے سچے اخلاق کے بیان کا مخزن ہوں اور لوگوں کو دہوکا کھانے سے بچا دیں اور اس راہ کی تکمیل فرما دیں۔ انھیں کو اصطلاح شرع میں نبی رسول اور پیغمبر کہتے ہیں اور چونکہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں ایسے ہادی نہیں رہ سکتے اسلئے یہ بھی ضرور ہوا کہ وہ اصول زریں اور سچے اخلاق جو نبی اور رسول نے بتائے ہیں اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں اور ایک ایسی قوم انکی جانشین ہو جو دوسروں کو پہونچا دے۔ نبی کی کامیابی اور اوس کی سرگرمی صرف اسبات میں ہے کہ اوسکے افعال اور احکام ممد بقا ہوں نہ ممد فنا۔ اور اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں۔ لیکن اگر آپکے نظریہ کے مطابق دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی سے جو سنا اوسکو غلط کر کے دوسرونکو پہونچایا اور جنکو پہونچایا انھوں نے غلط نتیجہ نکالکر ایک مجموعہ اغلاط ملک کے سامنے پیش کیا۔

کیف یجوز لاحد من المسلمین ان یتکلم بمثل ھذا و یبدل کلام اللہ من تلقاء نفسہ و یحی فہ عن مواضعہ سبحانک ھذا بہتان عظیم۔ کیا حضرت امام ابو حنیفہ یا امام شافعی رحمہ اس قسم کے لوگ تھے۔ ذرا مولانا شبلی کی

سیرۃ النعمان اوٹھا کر دیکھئے تو آپکو معلوم ہوگا کہ حدیث میں انکی نظر کسقدر وسیع تھی اصول و روایت جسپر آپ بہت زور دیتے ہیں وہ انھیں کی ایجاد ہیں پھر تدوین فقہ کے لئے انھوں نے اپنے خاص شاگردوں میں چالیس آدمی منتخب کئے تھے مسائل کا استنباط زیادہ تر قرآن سے کرتے تھے بمجبوری صحیح حدیثوں سے مدد لیتے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تمام خلق امام ابوحنیفہ کی فقہ میں عیال ہیں۔ تقلید کو آپ لعنت کہتے ہیں۔ حالانکہ اجلہ علما مثلاً امام غزالی جنکے آگے آج بھی مشاہیر یورپ سر جھکانے کو تیار ہیں امام شافعی کی تقلید پر فخر کرتے تھے۔ صوفیائے کرام بھی تقلید کرنیکے لئے مجبور ہوے خود حضرت سیدنا و مولانا عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ حضرت امام حنبلؒ کے مقلد تھے۔ علما کے نسبت جناب کا نظریہ یہ ہے کہ اس جماعت کے اکثر افراد اپنے علم کے لحاظ سے اس قدر جاہل۔ مذہب کی حیثیت سے اس درجہ نامسلمان اور اخلاق کے لحاظ سے اتنے منافق ہوتے ہیں کہ اگر اسلام کا معیار صرف انکی ذات کو قرار دیا جاوے تو پھر معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنے کیلئے کوئی اور ہستی نہیں مل سکتی"۔ جزاک اللہ اسکے بارے میں ہمکو زیادہ لکھنا نہیں کیونکہ ہم علما کی طرف سے وکالت کرنا نہیں چاہتے اسکے متعلق صرف اسقدر عرض کرنا ہے کہ چونکہ آپنے اکثر کا لفظ استعمال کیا ہے اوس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب بھی کچھ علما ہیں جنکو صحیح معنوں میں عالم اور اونکی ذات کو معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنیکے لئے پیش کیا جا سکتا ہے کیا براہ مہربانی جناب مطلع فرما دینگے کہ یہ کس علم کے حاصل کرنے سے آپکے نزدیک بھی مسلم الثبوت مانے گئے۔ وہی بخاری کی حدیث جو ترک۔ اسلام کے مرادف ہے اور وہی فقہا کا دفتر پایا جو غلط اصول پر مرتب کیا گیا ہے یا کوئی نئی کتاب حدیث کی جمع کی ہے اور اوس سے نیا دفتر فقہ کا مرتب کیا گیا ہے

اب آخر میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ شکست و ریخت بہت آسان ہے لیکن تعمیر مشکل ہے۔ نکتہ چینی سہل ہے لیکن انتظامی قابلیت کی جلوہ آرائی مشکل ہنگامہ آفرینی سب کر سکتے ہیں مگر سکون اور امن قائم کرنیکے واسطے تدبر کی ضرورت ہے۔ آگرہ کا تاج محل یا آصف الدولہ کا امام باڑہ گرانیکے لئے ہر جگہ مزدور مل سکتے ہیں لیکن شاہجہاں کی معجز نما عمارت بنانیوالا کوئی ایک کاریگر نہیں مل سکتا۔ زبان سے جو چاہنا بک دینا قلم سے جو چاہنا لکھدینا ہر شخص کر سکتا ہے۔ آپکو اوسوقت تک فقہا یا محدثین کے کارناموں پر پانی پھیرنیکا حق حاصل نہیں ہے جبتک اوسکی جگہ دوسرا مجموعہ نہ طیار کر لیں۔ نصاب نظامیہ کو آپ بدترین نصاب فرماتے ہیں براہ مہربانی بہترین نصاب سے مطلع فرمائیے

من انچہ شرط بلاغ است با تو میگویم — تو خواہ از سخنم پند گیر یا کہ ملال
اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم — کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف الرحیم۔

بدیع الزمان از فتحپور

نگار:- میرے محترم دوست جناب مولوی بدیع الزماں صاحب فتحپوری نے (جن کے ہم وطن ہونے اور ایک ہی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا فخر مجھے بھی حاصل ہے) اپنے مکتوب میں جس محبت و خلوص اور جس تاثر و دردمندی کے ساتھ میری کجروی

بیدینی، ناحق کوشی، اور زندقہ والحاد کا ذکر فرمایا ہے، اس کے اعتراف میں جی تو یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح میں بھی وہی "چیز" بنجاؤں جو ان کے نزدیک قابل عزت ہے اور اپنے اندر وہی تغیر پیدا کروں جس کے دیکھنے کے وہ متمنی ہیں۔ لیکن

گریباں عالمے وارد کہ در دامن نمی گنجد

اور باوجود سعی و کوشش کے بھی میں ایک لمحہ کے لئے بقول عرفی اس میں کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا کہ

محبت تو کنم جمع با مسلمانی

یہ اور بات ہے کہ آپ میری اس کیفیت کو جسے میں مسلمانی یا اسلام سے تعبیر کرتا ہوں کفر و بیدینی کا مترادف قرار دیں اور میں آپ کے اسلام کو صرف "بہ جوے نمی ارزد" کہکر ٹال جاؤں۔ بہر حال میں اپنے فاضل دوست کے تمام جذبات خلوص کی قدر کرتے ہوئے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو دلایل انھوں نے میرے خلاف ضبط فرمائے ہیں وہ جدید نہیں اور اس سے قبل بارہا میرے سامنے پیش ہو چکے ہیں اور میں نے کبھی اُن کو "نسیج عنکبوت" سے زیادہ نہیں سمجھا

آپ ضمناً بعض ایسے مسایل کا بھی ذکر کر گئے ہیں کہ اگر میں ہر ایک پر تفصیل کے ساتھ بحث کروں تو دفتر کے دفتر طیار ہو جائیں، لیکن اجمال کے ساتھ بھی ان پر بحث نہیں کرونگا۔ اس لئے نہیں کہ نتیجہ معلوم ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ یہ طریق بحث اُس طریق کار سے بالکل جدا ہے جس کو میں نے اسلام کا مفہوم جاننے کے لئے متعین کیا ہے۔ آپ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں شافعی و ابوحنیفہ کو سمجھنے کے بعد اور میں اسلام سمجھنے کے بعد شافعی و ابوحنیفہ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ تو از آتش دُخاں بینی من آتش از دخاں بینم ــــ آپ کا اصول سفر یہ ہے کہ آنکھ پر پٹی باندھ کر رہبر کے ہات میں ہات دیدینا چاہئے اور میں اپنی بصارت کو زایل کرنے کے بعد کسی بصیرت کے حاصل کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ آپ منزل تک پہونچ جائیں اور میں ایک قدم بھی آگے نہ چل سکوں مگر جس حد تک اطمینان ضمیر کا تعلق ہے، میں کبھی آپ کے "قطع منازل" اور اپنی "لغزش پا" کو متوازی نہیں سمجھ سکتا۔

آپ نے سلسلۂ گفتگو میں "حضرت آدم علیہ السلام" کے متعلق بھی اپنے پندار میں نہایت ہی مُسکت دلیل کے طور پر اک طعن آمیز استفسار کیا ہے حالانکہ آپ جن کو حضرت آدم علیہ السلام کہتے ہیں وہ کوئی مخصوص شخص نہ تھے اور نہ کلام مجید سے اس کو ثابت کیا جا سکتا ہے، موسیٰ کے عصا اور ید بیضا کا بھی ذکر کر کے مجھے مرعوب و مغلوب کرنے کی سعی فرمائی ہے، دریا کے پھٹ جانے اور دیوار کی طرح اس کے قایم ہو جانے کی روایت کو بھی اک حتمی و اذغانی دلیل کی صورت میں پیش کیا ہے دراں حالیکہ یہ سب ایک طرف ادب و انشاء کے استعارات و تشبیہات ہیں اور دوسری طرف تعبیرات اخلاقی جن سے ہر زمانہ کے نبی کا کلام لبریز نظر آتا ہے۔ اسی طرح آپ نے نماز، روزہ، حج وغیرہ کے متعلق بعض آیات قرآنی کے اشارہ سے میرے دعاوی کو باطل کرنا چاہا ہے، لیکن اس انداز سے کہ شاید آپ نے میرے مدعا کو بھی اس وقت تک نہیں سمجھا، بہر حال میں ان کے جواب میں اسوقت بغیر کسی ادنیٰ تفصیل کے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ میرا مذہب ان "اصنامی خرافیات" سے بہت بلند ہے اور اگر اسلام کے نزدیک

بفرض محال ان تمام مسایل کو اسی روشنی میں دیکھنا ضروری ہے، جس میں آپ مطالعہ کر رہے ہیں تو معاف فرمائیے اس سے آپ کا مقصود سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ شافعی و ابوحنیفہ سے ہٹ کر خود بانی اسلام کے مقصد کو مشتبہ قرار دیں اور فقہ و حدیث سے ہٹ کر خود قرآن کو ریب و شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں، ممکن ہے آپ اس کے جواب میں فی قلوبہم مرض کہکر اپنی تسکین کرلیں، لیکن آپ کی تسکین دوسروں کے اضطراب کا علاج نہیں اور اسلام کا دعوائے حقیقت و حقانیت غالبًا مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں سے کیا گیا ہے

مجملاً آپ نے احادیث کا بھی ذکر کیا ہے اور مجھ پر تعریض کی ہے کہ جب میں احادیث کی صحت کا قایل نہیں تو ان کو "وحی غیر متلو" کیوں کہتا ہوں۔ معاف فرمائیگا۔ اس باب میں بھی آپ نے میرے مقصود و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں یقینًا اقوال رسول اور افعال رسول کو سب سے زیادہ قابل تقلید و تمسک چیز قرار دیتا ہوں، لیکن آج صحیح احادیث کہاں ہیں اور کتنی۔ بعد ام الکتاب سب سے زیادہ معتبر بخاری کو سمجھا جاتا ہے حالانکہ تضاد و تناقض، رکاکت و سخافت، بے عقلی و اوہام پرستی اجن سے ایک نبی کے افعال و اقوال کو آپ بھی منزہ مانتے ہیں، بخاری کے حجم و ضخامت کے خاص عناصر ہیں۔ اسی پنجوقتہ نماز کے باب میں دیکھئے کہ کتنی حدیثیں بخاری میں ایسی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے تین وقت کی نماز کو کافی بتایا ہے اس لئے میں یہ کہتا ہوں کہ جب کتب احادیث کی یہ حالت ہو تو ان کی تصحیح و تنقید کی طرف توجہ کرنا بیکار ہے کیونکہ اس میں ہمیشہ اختلاف رہیگا اور کسی ایک مرکز پر ہم کافہ انام کو نہ لاسکیں گے، چنانچہ آج حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی تفریق انہیں کتب احادیث کی بدولت ہے اور وہ مذہب جس سے زیادہ وحدت فی الاعتقاد، وحدت فی العمل اور وحدت فی الحیات کا درس کسی نے نہیں دیا، اس وقت احادیث کے اسی تناقض و تخالف کی وجہ سے ایک طرفہ تماشہ نظر آرہا ہے۔ اور شخص ثالث ان تمام مسالک کے انبوہ دلایل میں گم ہو کر رہجاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس جماعت کو واقعی مسلمان سمجھے اور کس کو غیر مسلم۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ اختلاف حقیقتًا رحمت ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ایک شخص ہات چھوڑ کر یا ہات باندھ کر نماز پڑھنے، آمین بالجہر و آمین بالخفا کے جھگڑے کو دیکھنے کے بعد کیوں نہ تیسری صورت اختیار کرے، جو ان دونوں سے مختلف ہو۔ علے الخصوص اسوقت جبکہ "اذا تعارضا تساقطا" کے منطقی استدلال سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔

اسلام کے تمام منازل عروج و انحطاط کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے والا شخص اس نتیجہ تک پہونچنے پر مجبور ہے کہ اسلام میں تشتت و افتراق پیدا کرنے والا صرف احادیث کا عنصر ہے حتی کہ فقہ میں اختلاف کا سبب بھی اختلاف احادیث ہے اور اس سے زیادہ شرمناک بات ایک مذہب کے لئے کیا ہوسکتی ہے کہ وہ مختلف خیال کی مختلف جماعتوں کا مجموعہ ہو اور جن کے قانون میں بھی، رات دن، سیاہ و سپید اور ہاں، نہیں کا سا فرق پایا جائے۔

اس حال میں ظاہر ہے کہ آپ ایک غیر مسلم کو جب اسلام کی دعوت دینگے تو فروع سے ہٹا کر سب سے پہلے اصول ہی کی طرف لائیں گے اور اصول سمجھنے کا ذریعہ غالبًا سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں۔ پھر ایک شخص جب اصولًا مسلمان ہوجائے

تو کوئی وجہ نہیں کہ فروع کے انتخاب یا اجتہاد میں اسے آزاد نہ چھوڑ دیا جائے جب کہ آپ کے یہاں پہلے ہی سے اس میں کبھی نہ ختم ہونے والی نزاع قایم ہے۔ آپ ایک شخص کو تعلیم قرآنی کے تسلیم کرنے پر تو مجبور کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی صداقت خود کسی دلیل کی محتاج نہیں لیکن امام بخاری اور امام ابوحنیفہ کی تقلید کو تو اصل مذہب قرار نہیں دے سکتے۔ آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ ایک شخص کی آزادی تنقید کو اس سے چھین لیں۔ فرض کیجئے ایک شخص توحید و رسالت کو ماننے کے بعد مسلمان ہو جاتا ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ فروع کے باب میں مجھے آزاد چھوڑ دیجئے میں خود تحقیق و مطالعہ کے بعد فیصلہ کرونگا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا، تو کیا آپ اسے اپنی جماعت سے اس بنا پر نکالدینگے، کیا آپ اس سے یہ کہیئے کہ نہیں اسلام کی ضروری شرط یہ بھی ہے کہ ابوحنیفہ اور امام شافعی کی تحقیقات پر آنکھ بند کر کے عمل کیا جائے۔ یقیناً کوئی ذی عقل انسان ایسا نہیں کہہ سکتا اور ہمارے یہاں کے علماء کرام کا یہی ظلم تھا اور ہے جس نے اسلام کو سخت نقصان پہونچایا

یہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن کی تعلیمات حکمت و فلسفہ سے بالکل علیحدہ ہیں، کیونکہ اخلاق کی تعلیم دیگر دنیاوی علوم و فنون سے بالکل متمایز چیز ہے، لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ مذہب کی تعلیمات عقول انسانی کو سلب کر لیتی ہیں۔ جب تک کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئے گی، کیونکر اطمینان نفس اس کو پیدا ہوگا اور یقین و اعتقاد کی صورت کیونکر رونما ہوگی۔ آپ مجھے تو یہ کہکر ساکت کر سکتے ہیں کہ تو جاہل ہے، بیوقوف ہے تیرے دماغ میں قبول صلاح کی اہلیت نہیں ہے کیونکہ میں واقعی ایسا ہوں، لیکن ہر شخص سے تو آپ ایسا نہیں کہہ سکتے اور اگر ایسا کہہ سکتے ہیں تو اس کے یہی معنی ہیں کہ آپ اسلام کو حد درجہ تنگ نظر اور مستبد مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں جو بالکل حقیقت و واقعہ کے خلاف ہے۔

اب فرض کیجئے کہ ایک شخص قرآن کو کلام الٰہی اور نبی کو خدا کا پیامبر سمجھ کر مسلمان ہوتا ہے اور کلام مجید پر غور کرنے کے بعد کہتا ہے کہ۔ ید بیضا، عصائے موسوی، خرق دریائے نیل، قصۂ آدم، ولادت عیسیٰ وغیرہ کے متعلق جو باتیں عام مفسرین بتاتے ہیں ان کو میری عقل قبول نہیں کرتی، اس لئے میں خود کلام مجید سے اُن کو سمجھنا چاہتا ہوں، تو کیا آپ اس کو رد کردینگے، کیا کلام مجید پر غور کرنے اور کسی نتیجہ تک پہونچنے سے اُسے باز رکھیں گے۔ کیا آپ یہ کہدینگے کہ کلام مجید کو صرف ایک عرب ہی سمجھ سکتا ہے اور چونکہ تم عرب نہیں ہو اس لئے اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر اسلام واقعی اس تحدید و امتناع کا نام ہے تو پھر عہد وحشت کی لامذہبیت کیا بُری چیز تھی جب کم از کم معصیت کی آزادی تو انسان سے سلب نہ ہوئی تھی

مذہب کو دلایل منطقی، استنتاج فلسفہ، اصول حدیث و فقہ وغیرہ کی الجھنوں سے آزاد کر کے محض اخلاق کے سادہ اصول سے دیکھنا چاہیے اور ان سے تجاوز کر کے فضول مباحث میں نہ پڑنا چاہیے، کیونکہ جب تک یہ نہ کیا جائے گا ایک مذہب کبھی وسیع نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی تبلیغ کیجا سکتی ہے۔ صرف اخلاق ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہر ملک و عہد کا انسان متحد الخیال ہو سکتا ہے اور جس کو نوع انسانی مرتبہ مرکزیت دے سکتی ہے، لیکن ایک مولوی یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے مولوی مانو، اس کے بعد ابوحنیفہ کو امام سمجھو، اور پھر قرآن پر غور کرو یا نہ کرو مسلمان ہو۔

میرا عقیدہ ہے کہ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس پر تمام نوع بشری کا اجتماع ہو سکتا ہے اور اس خیال کو بنیاد قرار دیکر میں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ میں اسلام کو جس صورت میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ ایک ایسی حقیقی صورت ہے جس کی وسیع آغوش سے دنیا کا کوئی ذی فہم انسان باہر نہیں نکل سکتا اور آپ حضرات یہ چاہتے ہیں کہ جو چند افراد مسلمانوں کے پائے جاتے ہیں وہ بھی اسلام سے خارج کر دئے جائیں اور اسلام کو ایک لایعنی معمہ، اک مہمل چیستاں، ایک عجوبہ زار بناکر پیش کیا جائے جس میں سوائے خرافیات کے کچھ نہ نظر آئے اور جس کو ایک سنجیدہ انسان دیکھتے ہی ہماری عقلوں کے انحطاط پر بلا پس و پیش حکم لگا دے۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان معتقدات سے اخلاق کو کیا فایدہ پہونچتا ہے اور انسان کی کس ترقی کا راز اس میں مضمر ہے

آپ فرماتے ہیں کہ شکست و ریخت آسان ہے، تعمیر مشکل ہے، بالکل میرا بھی یہی جواب ہے اور انصاف ہر ذی فہم کے ہات میں کہ علماء دین مذہب کی تعمیر کو مسمار کر رہے ہیں یا مستحکم

نیاز

نوٹس

ہندوستانی ایکاڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے مطبوعات

ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات

از علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ ایم۔ سی۔ جی۔ ای

مجلد	عہ ۱۲؍
غیر مجلد	عہ؍

زیر طبع

(۱) مغلوں سے پہلے عرب و ہندوستان کے تعلقات (از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانوں کے تمدن پر ہندؤں کا اثر (از مولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنۂ وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن (از رائے بہادر مہامہو پادھیا گوری شنکر ہیرا چند صاحب دجھا)

(۴) ہندی شاعری (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سیکرٹری ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد

باب الاستفسار

ہندو مسلم اتحاد

(جناب عبدالباقی صاحب - نوتنواں بازار - گورکھپور)

۲۴ تاریخ ماہ گزشتہ کی مختصر صحبت میں منجملہ دیگر تذکار کے ایک "ہندو مسلم اتحاد" بھی تھا جو موجودہ صورت میں "غیر تسلی بخش اور لایعنی" ثابت ہونے تک گفتگو ختم ہو چکی تھی

سوال یہ ہے کہ ہمیں من حیث القوم سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے اب کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے - میرے خیال میں یہی ایک سوال ہے جس کے حل ہونے پر ہندوستان کی نجات کا انحصار ہے -

---

(نگار) آپ کے استفسار میں دو باتیں درج ہیں "ہندو مسلم اتحاد" اور "من حیث القوم" سیاسی حقوق کا حاصل کرنا میں ان دونوں میں ایک نوع کا تضاد محسوس کرتا ہوں - خیال و منطق کا تضاد نہیں بلکہ "روداد عمل" کا تضاد - جس وقت تک کسی مخصوص قوم یعنی مخصوص مذہب کی حیثیت سے کوئی مطالبہ ہوتا رہیگا، اس وقت تک اتحاد کا خیال اک واہمہ و خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، لیکن اگر تفریق قومی یا تمیز مذہب سے قطع نظر کر کے صرف وطنیت کو پیش نظر رکھا جائیگا تو پھر ہندو مسلم اتحاد بھی حاصل ہو جائیگا اور "من حیث القوم" کا بھی سوال نہ پیدا ہوگا

چونکہ اس وقت تک ہمارے ہاں کے قایدین نے (خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان) مذہبیت کو علیحدہ رکھ کر اس مسئلہ پر غور نہیں کیا اس لئے تمام موجودہ دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں اور اس وقت تک رونما ہوتی رہینگی جب تک ایک دوسرے کو عملاً فنا نہ کردے - اس باب میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے مجرم ہیں اور مذہبی تنگ نظری دونوں فریق میں ایک ہی انداز کی پائی جاتی ہے نہ اُن کی سمجھ میں آئیگا کہ چھوت چھات اور گائے کے عنصر کو کس طرح ہندو دھرم سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ قربانی اور باجہ وغیرہ کو جزو ایمان سمجھنے سے باز آئیں گے - اگر آج ہندو و مسلمان دونوں اپنے اپنے مذہب سے حشو و زواید کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں یعنی دونوں بجائے مذہب کے صرف فلسفۂ مذہب کو سامنے رکھیں تو آج عصبیت دور ہو سکتی ہے اور عصبیت کا دُور ہو جانا ہی اصل اتحاد و اتفاق ہے - لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ ممکن العمل نہیں ہے اور اس لئے یہ پیشین گوئی کرنا نہایت آسان ہے کہ ہندو مسلمان کبھی آپس میں نہیں ملسکتے اور ان کی جنگ اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ان میں موجودہ مذہبیت قایم ہے - یہ تو ہو گیا نظریہ - اب واقعات و حالات کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اب سوال ہندوستان کے سوراج ملنے یا نہ ملنے کا نہیں ہے بلکہ انتظار ہے صرف وقت کا

یہ امر روز روشن کی طرح متحقق ہو چکا ہے کہ ہندوستان آزاد ہوئے بغیر نہیں ہو سکتا، لیکن کب؟ اس کی تعیین بھی چنداں دشوار نہیں اور اگر لوگ میری پیشین گوئی پر خندہ زن نہ ہوں، تو میں کہونگا کہ دس سال کی مدت بھی اس کے لئے بہت زیادہ ہے

پھر ہندوستان کا آزاد ہونا چونکہ صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ ہندو جماعت اپنی کثرت آبادی، فراوانی دولت اور اشاعت علم کی مدد سے تمام دوسری قوموں پر حاوی ہو جائے اس لئے مسلمانوں کا قلت آبادی، کثرت افلاس، اور جہل کے اعتبار سے اک عنصر ضعیف کی حیثیت اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ یہ بالکل ریاضی کی طرح کھلا ہوا نتیجہ ہے جس پر نہ شور و واویلا کی ضرورت ہے، نہ نالۂ و شیون کی۔ ہندوستان ہندو قوم کا ملک ہے، انھیں کی سرزمین ہے، اک وقت غیر معلوم سے لیکر اس وقت تک خدا جانے کیسے کیسے دورِ حیات اِن پر یہاں گزر چکے ہیں، اس لئے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ اُن سے اُن کے ملک کو چھین لے یا اُن کے مقابلہ میں اپنے تفوق و برتری کو ثابت کرے، ترکی، ایران، افغانستان، مصر و حجاز میں مسلم حکومتیں موجود ہیں اس لئے اگر ہندوؤں کے دل میں بھی یہ ولولہ پیدا ہو کہ وہ ہندوستان میں اپنی اکثریت سے فایدہ اُٹھا کر اقتدار حکومت قایم کریں تو بالکل فطری امر ہے اور اس پر کسی کو بُرا ماننا میرے نزدیک سخت ناانصافی ہے

تاریخ کا یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ بارہا اس سے قبل تجربہ ہو چکا ہے کہ جب کسی ملک کی قومیں بیدار ہوئیں تو غیر ملکیوں کو وہاں سے نکلنا پڑا یا محکومیت اختیار کرنا پڑی۔ اگر مسلمان اس کو اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ وہ ہندی کہلائیں تو پھر غیر ملکیوں کے ساتھ انکا بھی حشر ہونے والا ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو یہیں کا فرزند جانتے ہیں تو پھر ان کو اپنی موجودہ مذہبیت کی تنگ نظری چھوڑنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ جس چیز کو آج وہ ایثار و قربانی کے نام سے ترک کر سکتے ہیں، کل اُن کو بہ جبر چھوڑنا پڑیگی اور پھر اُس وقت کسی معاوضہ کا سوال بھی نہیں اُٹھایا جا سکیگا۔

نہرو رپورٹ سے مخالفت کرنے والے وہی لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ برطانیہ کا اقتدار ہندوستان میں ہمیشہ قایم رہیگا لیکن جن کی نگاہیں زیادہ دُور رس ہیں وہ جانتے ہیں کہ نہرو رپورٹ کے نظام کو بھی ایک دن بدلجانا ہے اور وہ نظامِ حکومت جو اس کے بعد آنے والا ہے، مسلمانوں کے لئے اور زیادہ سخت ثابت ہوگا اگر اس وقت انھوں نے رواداری سے کام لیکر ہندوؤں کا ساتھ نہ دیا

میں اس منطق کا قایل نہیں ہوں کہ اگر ہندو رواداری سے کام نہیں لیتے تو ہم کیوں لیں۔ رواداری خود آپ اپنی جگہ پیدا کر لیتی ہے اور اگر ہم پہلے سے سیلاب کے گزر جانے کے لئے جگہ بنا دیں تو دیوار کے گرنے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ اس لئے میرے نزدیک ہندو مسلم اتحاد سے زیادہ یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ مسلمان کس حد تک ایثار سے کام لے سکتے ہیں اور اپنی اقلیت کو اہم بنانے کے لئے وہ کس حد تک تعلیم و اقتصاد میں ترقی کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی سوال اس وقت غور طلب نہیں ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جب تک یہ کم سواد علماء اور کوتہ اندیش لیڈروں کا گروہ موجود ہے وہ اذان باجہ، ناقوس، قربانی، تبلیغ، شدھی وغیرہ کے جھگڑوں ہی میں مبتلا رکھیگا اور کبھی اس کا موقعہ نہ دیگا کہ مسلمان سنجیدگی سے اپنے مستقبل پر غور کرکے

ان مہملات کو ترک کریں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے نہیں بلکہ بہ لحاظ انسان ہونے کے دوسروں سے اتحاد کرنا سیکھیں حقیقت یہ ہے کہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے مسلمانوں کا مستقبل بہت تاریک سا نظر آتا ہے اور یہ سیاسی یا مذہبی حقوق طلبی بالکل بے نتیجہ سی بات ہے۔ جس وقت تک اسپین کی قومیں بیدار نہ ہوئی تھیں مسلمانوں نے پوری داد حکومت دی، لیکن جب ان کو ہوش آیا اور انھوں نے آزادی حاصل کی تو مسلمانوں کو آخر کار ہسپانیہ کی سرزمین کو خیرباد کہنا ہی پڑا۔ بالکل یہی حال ہندوستان کا ہے کہ جب تک یہاں کی قوموں میں احساس ذلت و محکومیت پیدا نہ ہوا تھا مسلمانوں نے بھی حکومت کی، انگریزوں نے بھی شاہنشاہی کر لی، لیکن اب جبکہ سارے ملک میں بیداری پیدا ہو گئی ہے نہ انگریزوں کی حکومت یہاں رہ سکتی ہے اور نہ مسلمانوں کو کوئی ایسا خاص حق مل سکتا ہے جس کے وہ کسی طرح سے مستحق نہیں ہیں

نیاز

کایا پلٹ ہیر آئل

یہ اکسیر کیمیا ہے یا حیرت انگیز معجزہ

کہنے کو صرف یہ تیل ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہے یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود نباتاتی و کیمیاوی اجزاء سے جدید اصول پر طیار کیا گیا ہے جسکی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانوں نے کی ہے اسکے فواید کی تفصیل مختصر اشتہار میں ناممکن ہے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ گھر میں اسکی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کرتا ہے

اگر۔ سر یا چندیا کے بال گر گئے ہیں یا گر رہے ہیں۔ یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہے

اگر۔ نزلہ درد سر یا شقیقہ، دوران سر، ضعف دماغ و ضعف بصر، بے خوابی یا نسیان کی شکایت ہے

اگر۔ سر اور جسم کی پھوڑیاں، پھنسیاں، گرمی دانے، خارش یا دیگر امراض جلدی کا دفع کرنا مقصود ہے

اگر۔ گنٹھ مالا۔ سل اور دق وغیرہ سے محفوظ رہنا ہے

تو

ان سب کا واحد علاج کایا پلٹ ہیر آئل ہے

جو نہ صرف خوشبو بلکہ اپنی مقدار و وزن کے لحاظ سے بھی بازار کے تمام خوشبودار تیلوں سے اچھا اور ارزاں ہے۔

ڈاکٹر تیج بہادر لکھنؤ سے اپنی تحریر میں تصدیق فرماتے ہیں کہ اس تیل کے فواید اشتہار کے مطابق پائے گئے ہیں اور مرزا جعفر علی خانصاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی نے دوامی آرڈر ہر ماہ ایک شیشی کا دیدیا ہے۔ اور بھی متعدد سرٹیفکٹ موجود ہیں۔

جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضروری ہے

قیمت مع محصول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۱؎ ہے)

مینجر کایا پلٹ ہیر آئل لکھنؤ

مرغ شب آہنگ

گرچہ میں ظاہر میں ہوں اک طائر یک مشت پر
قدر میری جانتے ہیں کچھ مگر، اہل نظر
ہوں نوا سنج فغاں بھی زمزمہ پرداز بھی
میرے نغموں کی صدا میں سوز بھی ہے ساز بھی
غیرت صحن چمن ہے تنگ دامانی، مری
نغمہ پردازی بھی ہے، گویا گل افشانی مری
کھینچ لیتی ہے دلوں کو، زمزمہ سازی مری
وجد میں لاتی ہے طرز نغمہ پردازی مری
سحر پنہاں ہے مری آواز میں ڈوبا ہوا
میری طرز نغمہ میں جادو ہے اک چلتا ہوا
ہے مرا حسن ترنم جلوہ آرائے چمن
میرے ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے سورج کی کرن
میں نے پرتوے ادھر اور اُس طرف آئی بہار
ہے مری جنبش میں راز گردش لیل و نہار
میرے نغمے اور بہار جلوۂ حسن چمن
تازہ کر دیتے ہیں دل میں یاد ایام کہن

"عشرت دیرینہ" کا خواب پریشان، دیکھنا
اس طرف بھی اک ذرا او چشم گریان دیکھنا

شب کو جب ہوتی ہے ہر سو خامشی چھائی ہوی
صحن گلشن میں صبا پھرتی ہے اترائی ہوی
ذرہ ذرہ خواب سے لبریز ہو جاتا ہے جب
جلوۂ انجم، تبسم ریز ہو جاتا ہے جب
وسعت عالم پہ چھا جاتا ہے ہر جانب سکوت
ہر نفس دیتا ہے ذوق استراحت کا ثبوت
جب ترنم آفریں ہوتی ہے، موج آبشار
ہر طرف ہوتی ہے، عطر افشاں ہوائے خوشگوار
نخل جھک جاتے ہیں، ذوق خواہش آرام سے
روح ہو جاتی ہے غافل تلخی ایام سے

ہلکی ہلکی ابر کے ٹکڑوں سے، پڑتی ہے پھوار
بھینی بھینی بوئے گل دیتی ہے پیغام بہار

شوق پنہاں چٹکیاں لیکر جگاتا ہے مجھے
چپکے چپکے داستان گل سناتا ہے مجھے
بیخودی میں آشیانے سے نکل آتا ہوں میں
ساز گلشن میں نئی اک روح دوڑاتا ہوں میں
پھول کھل جاتے ہیں پھر میرے ہنسانے کے لئے
باد نرم آتی ہے مجھکو گدگدانے کے لئے
جھومتے ہیں غنچۂ نورس، مری آواز پر
رقص یا کرتی ہیں، کچھ پریاں صدائے ساز پر
وجد کرتے ہیں شجر، چلتی ہے رک رک کر ہوا
بربط موج رواں سے اب نہیں آتی صدا

محفل انجم میں رُک جاتا ہے سازِ سرمدی — میرے نغمے ہیں نواپرداز رازِ سرمدی

چاندلینا چاہتا ہے مجھ کو، پھر آغوش میں
میں سراپا شوق ہوتا ہوں دُ نورِ جوش میں

میں اسی عالم میں ہوتا ہوں نواپرداز شوق — نغمۂ الفت سے پرُ ہوتا ہے میرا سازِ شوق
یک بیک برباد ہو جاتا ہے، سامان طرب — آہ، وہ کیفیت سرشار، وہ شان طرب

وہ شباب آرزو آشوب پیری بن گیا — میرا نغمہ ہی مری وجہ اسیری بن گیا
کیا خبر تھی قصر دل ہو جائے گا برباد بھی — دام پھیلائے ہوے ہے تاک میں صیاد بھی
اب نہ وہ میں ہوں، نہ وہ عیشِ بہار فصل گل — میری آنکھیں ہیں مگر نوحہ گزار فصل گل
اب نہ وہ جوش ترنم ہے نہ وہ آزادیان — بن گیا ہوں میں سراپا ساز آہنگ فغان
ماتم حسرت ہے، میرا شغل بیکاری مجھے — بند رکھتی ہے قفس کی چار دیواری مجھے
ہون سراپا غم قفس میں آشیانے کے لیئے — فکر ہوتی ہے مجھے کب آب و دانے کے لیئے

اضطراب زندگی سے برسر بیکار ہوں
گنج ہستی سے نکلنے کے لیئے تیار ہوں

ہم اگر سمجھین تو ہے ایسا ہی اس دنیا کا حال — ابتدا سے چاہئے انسان کو احساس مآل
کام زائد، وقت کم، سرگرم، بیدادِ اجل — تاک مین آٹھوں پھر رہتا ہے، صیادِ اجل

جسم پابند فنا ہے، اور لازم ہے فنا — یاد رکھ ہے روح کو حاصل مگر دائم بقا
"روح بھی، لیکن وہ مُردہ ہے جو بے احساس ہے" — تجھ کو اس آئینِ فطرت کا اگر کچھ پاس ہے

یادگاریں چھوڑ جا، اس دار فانی کے لئے
کام کچھ کرجا، حیات جاودانی کے لئے

علی اختر۔ اختر

اگر آپ کو } ہندوستان بھر سے عمدہ اور نفیس تنبا کو خوردنی و گولی و قوام وغیرہ خریدنا ہو تو
اے ۔ کے بھجن برادرس احاطہ کمال جمال لکھنؤ سے خرید فرمائیے

اسرار

(۱)

روح خوابیدۂ الفت ہے تو بیدار نہ کر
قلب سرشارِ محبت ہے تو ہشیار نہ کر
لذت درد کو ——— ہم معنیٔ آزار نہ کر
عشق رکھتا ہے اگر دل میں تو ——— اظہار نہ کر

(۲)

نغمۂ عشق نہیں ——— دہر میں گانے کے لئے
یہ فسانہ نہیں ——— دنیا کو سنانے کے لئے
نہ جلانے کے لئے ہے ——— نہ بجھانے کے لئے
عشق کی آگ ہے سینے میں دبانے کے لئے

(۳)

"حسن" تو لاکھ حجابوں میں رہے یوں مستور
اور یہ پردگیٔ عشق ہو تجھ کو ——— منظور
کیا ملے گا تجھے ——— ؟ یہ راز ہو اگر مشہور
سامنے ہے ترے افسانۂ "دار و منصور"!

(۴)

اشک بنکر بھی نہ عریاں ہو ترا ذوق گداز
ترے جذبات کا گہوارہ ہو ——— خلوتکدۂ راز
آرزوؤں کو نہ دینا کبھی ——— اذن پرواز
ورنہ ہستی تری ہو جائیگی مجبورِ نیاز

(۵)

جس طرح نکہت گل ہو گل رنگیں میں نہاں
جس طرح نشۂ مے ہو مئے زریں میں نہاں
جیسے ——— گوہر ہو تہ چشمۂ سیمیں میں نہاں
یوں ہی الفت بھی ہو تیرے دلِ غمگیں میں نہاں

(۶)

شام میں ہو کوئی دھندلا سا ستارہ ——— روپوش
قلب صحرا میں ہو کوئی گل صحرا ——— روپوش
جیسے ——— فانوس میں ہو شمع تجلی روپوش
ترے دل میں ہو یونہی داغِ تمنا روپوش

(۷)

مشتعل شمع اگر ہو تو ——— بجھانا اچھا!
درد بنجائے اذیت تو ——— مٹانا اچھا!
جس طرح خواب پریشاں کا بھلانا اچھا!
ہے یونہی جوش محبت کا دبانا اچھا!

(۸)

مصحفِ عشق کی ——— تفسیر نہیں کرتے ہیں
معنیٔ عشق کو ——— "تصویر" نہیں کرتے ہیں
عصمتِ عشق کی ——— تشہیر نہیں کرتے ہیں
یعنی اس خواب کی ——— تعبیر نہیں کرتے ہیں

(۹)

جو سراپردۂ الفت کے مکیں ——— ہوتے ہیں
خاتمِ رازِ محبت کے نگیں ——— ہوتے ہیں
جو کبھی عشق میں ——— "بیصبر" نہیں ہوتے ہیں
وہ خداوندِ محبت کے "امیں" ہوتے ہیں

روش صدیقی

غزلیات

باسط بسوانی

کونسا جور و ستم تم نے اٹھا رکھا ہے
یاد سب کچھ ہے مگر دل نے بھلا رکھا ہے

گر یہی رنگ جفا ہے تو خدا خیر کرے
آج تک دل کو تو پابندِ وفا رکھا ہے

سر جھکا لیتے ہیں وہ سن کے ہماری باتیں
اس تغافل کا مگر نام حیا رکھا ہے

آپ ہی در پہ ترے کرتا ہوں بھر دن فریاد
آپ ہی کہتا ہوں فریاد میں کیا رکھا ہے

بزمِ عشاق میں منہ پھیر کے ہنسنے والے
یہ بھی تو دیکھ لے کس کس کو رولا رکھا ہے

وہ سنیں یا نہ سنیں آہِ سحر اے باسط
ہم نے تو اپنا یہی وقتِ دعا رکھا ہے

ثاقب جالندھری

کوئی نہ جب اٹھا سکا بارِ گرانِ زندگی
خاک میں ساری مل گئی عزت و شانِ زندگی

دل کی مرے اک آرزو آپ جب مٹا چکے
تھی وہی روحِ زندگی تھی وہی جانِ زندگی

زیست ہے آجکل مگر فتنہ و شر کی زیست ہے
دورِ فلک سے مٹ گیا امن و امانِ زندگی

دشت نورد دشت کے ذروں کو خوب چھان لے
شاید انھیں میں مل سکے کوئی نشانِ زندگی

برسوں سے زندگی پہ ہے ہم کو گمان موت کا
برسوں رہے گا موت پر ہم کو گمانِ زندگی

....

وہ کہ نہیں اٹھا سکے ہاتھ میں اپنے تیغ بھی
ہم کہ اٹھائے پھرتے ہیں بارِ گرانِ زندگی

....

....

....

ثاقبِ زار تھا کہاں زندہ دلی سے آشنا
دل کی تڑپ نے کر دیا سحر بیانِ زندگی

ادبی خطوطِ غالب
مرتبہ
از مرزا محمد عسکری صاحب بی اے لکھنوی
نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے کتب مذکورہ
بالالتزام انتخاب کر کے بانداز ایک بسیط اور مفید
مقدمہ و مرزا غالب کے اکثر مکتوب
الیہم کے مختصر حالات اور نمونۂ کلام ہے
اس کتاب کا حجم ۳۴۶ صفحات تقطیع ۱۸×۲۲
قیمت مع تصویر غالب ...... (عہ)
منیجر نگار، نظیر آباد، لکھنؤ

حافظ غازی پوری

کھُل گیا جب حسن کے رخسار سے بندِ نقاب
عشق کے مطلع پہ چمکا پھر نیا اک آفتاب

جب نگاہِ "شوخ" اُسکی بنگئی برقِ سحاب
حسن کی دنیا ہوئی "آسودۂ" "عہدِ شباب"

عشق کی کیفیتوں میں لغزشِ مستانہ ہے
حسن کی تاثیر میں ہے نشۂ جامِ شراب

عشق اپنی سادگی میں فطرت آسودہ تھا
کر دیا اُس میں بھی پیدا حسن نے اک انقلاب

ہر شکست "آرزو" میں ہے نمودِ امید کی
قطرہ قطرہ بحرِ ہستی کا بنا رشکِ حباب

ذرہ ذرہ زندگی کا ہے تلاطم آشنا
ہے یہ "احساسِ" سکون بھی ایک کیفِ اضطراب

جلوہ گر ہونے کو ہے اب آفتابِ روزِ حشر
لو اُٹھو حافظ بہت تم رہ چکے مصروفِ خواب

فرخ بنارسی

وجد آفریں جو نغمۂ سازِ الست تھا
ایک ایک ذرہ کیفِ ترنم سے مست تھا

کم روزِ حشر بھی نہوا کیفِ بیخودی
دل سرخوشِ سرورِ شرابِ الست تھا

حدِ تعینات سے جب مین گزر گیا
یکساں مری نگاہ مین بالا و پست تھا

روزِ ازل تھا دونوں طرف رنگِ اتحاد
بیخود ادہر تھا عشق اُدہر حسن مست تھا

آزاد ہو کے اور بھی مجبور ہو گئے
پوشیدہ فتحِ نفس مین رازِ شکست تھا

وحشت میں بھی رہا وہی سودائے جستجو
دیوانۂ مجاز حقیقت پرست تھا

کیفیتِ بہار کی اللہ رے مستیاں
جو پھول تھا چمن مین وہ ساغر بدست تھا

مجموعۂ حوادثِ پیہم تھی زندگی
تھا جو نفس وہ نغمۂ سازِ شکست تھا

فرخ کا سر جھکا نہ کسی کی جناب مین
وہ بندگی کے جوش میں بھی حق پرست تھا

سائنس کے عجائب

مفت یا **مفت**

سائنس کا علم

چھپ کر طیار ہے۔ لیکن وہ قیمتاً نہیں دیجائیگی بلکہ خریداران نگار کو مفت دیجائیگی، جن کو ضرورت ہو ہر رجسٹری کے بھیجکر طلب کر لیں، ہر جدید و قدیم خریدار اس سے فایدہ اُٹھا سکتا ہے۔ منیجر نگار لکھنؤ

نظیر لودھیانوی

ترستا ہے تماشائی کو جلوہ اے خدا میرا — عدم میں کب تلک پنہاں رہیگا آشنا میرا
دیارِ عاشقی میں تذکرہ ہے جا بجا میرا — مگر منکر ہے میری دوستی سے بیوفا میرا
چمن والوں نے اندازِ ترنم مجھ سے سیکھا ہے — تعجب ہے کہ نامحرم ہے اب تک ہم نوا میرا
یہی عالم ہے گر احباب کی بے التفاتی کا — در و دیوار سے پوچھیں گے اکدن مدعا میرا
سکوتِ صبح ہستی میں ابھی مثلِ نوا گم ہوں — ابھی حرف و زباں سے بے خبر ہے ماجرا میرا
سمجھتے ہیں مجھے ادنیٰ مسافر ہم سفر میرے — چراغِ رہگذر آخر بنے گا نقشِ پا میرا
تحیر عشق کی قوت سے ہوگا ایک دنیا کو — شبِ فرقت ابھی اُٹھا نہیں دستِ دعا میرا
سنا ہوگا فسانہ قیس کی صحرا نوردی کا — محبت کے جنوں میں وہ بھی اک اندازتھا میرا
وفورِ دردِ فرقت سے سراپا سازِ حسرت ہوں — زباں ہے غم فزا میری سخن ہے جانگزا میرا
ملے گر بادشاہی بے مشقت میں نہ لوں ہرگز — مجھے اورنگِ کسریٰ سے ہے بہتر بوریا میرا
کسی نااہل کے اعزاز سے مجھکو حسد کیوں ہو — مجھے آخر دلا ہی دیگا میرا حق خدا میرا
کہا واعظ کے ارشادات سن کر زاہدِ دنیا نے — ابھی نکلا ہے میخانہ سے چھپ کر پارسا میرا
نظیر اقبال کے اس قول پر ایمان رکھتا ہوں — میں وہ بندہ ہوں جس پر ناز کرتا ہے خدا میرا

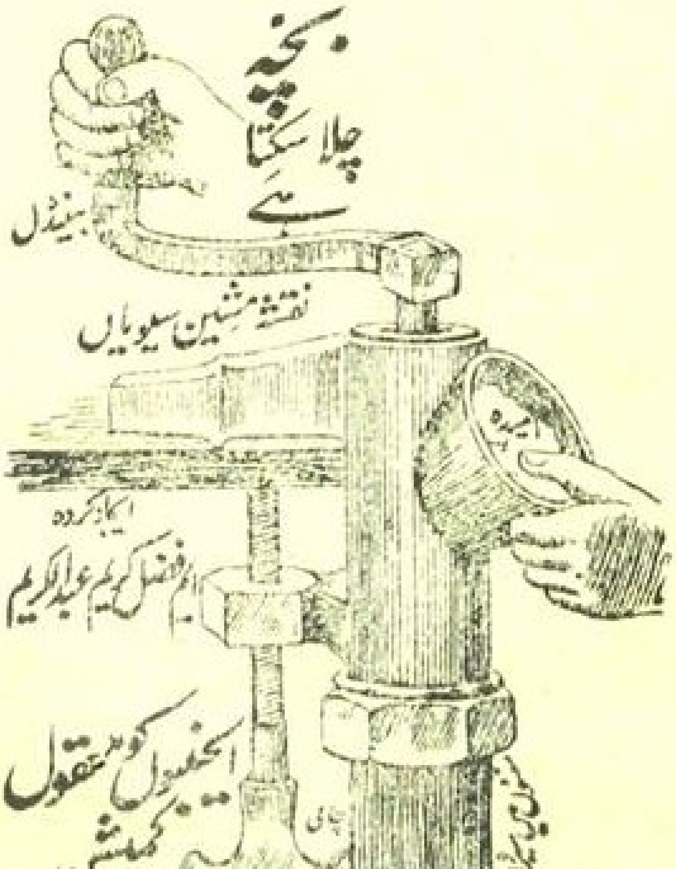

خلاف تحریر ہو تو قیمت واپس

ہمارے کارخانہ قائم شدہ ۱۹۱۴ء کی تیار کردہ مقبول عام پیتل کی خوبصورت پالش شدہ منٹوں میں سیروں نفیس و لذیذ رومالی سویاں تیار کرنے والی

نو ایجاد مشین سوّیاں

وزن معمولی
حجم کم
پرزے مختصر و مضبوط

قیمت فی مشین پیتل پالش شدہ چھلنی دو عدد (سوراخ ۱و۲) للعہ علاوہ محصولڈاک وغیرہ

ملنے کا پتہ :- ھندوستانی ایجاد گھر دھلی

معلومات

نشو ونما مین جگہ کا اثر!

الوانِ حیوان کی علمی تعلیل

جنگل اور میدان، باغ اور گلشن میں ہمیشہ رہنے والے قادر اعظم کی اس حکیمانہ اور بصیرت افروز قدرت کا علانیہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ درندے اور چرندے بہایم اور وحوش، پرندے اور طیور، ہوام اور حشرات سب کے اجسام کا رنگ مقام مسکونہ کے مانند ہوتا ہے چنانچہ شمالی شہروںمین جہاں کثرت سے برف باری ہوتی ہے۔ حیوانات اکثر سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور جن جنگلوں اور میدانوں میں ریت زیادہ ہوتی ہے، وہاں کے حیوانات کا رنگ بیشتر ریتیلا ہوتا ہے۔ جن چمنوں میں کلیاں زیادہ کھلتی ہیں۔ وہاں کے حشرات اور طیور رنگین ہوتے ہیں۔ جن نیستانوںمیں نے کے سائے مستوی خط میں زمین پر پڑتے ہیں۔ وہاں اکثر مخطط (چیتا) رہتا ہے بہتیرے پتنگے جن کلیوں پر رہتے ہیں، انھی کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اکثر چھوٹے چھوٹے کیڑے جن شاخوں پر رینگا کرتے ہیں انہی کے مانند ہوتے ہیں۔ الغرض حشرات وحیوان کی جتنی قسمین ہیں خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی ان تمام کا رنگ اپنے مکان مسکونہ کے رنگ سے ملتا جلتا ہوتا ہے، حتی کہ موسم کے بدلنے پر جب کبھی جگہ کا رنگ بدل جاتا ہے تو اس تبدیلی سے بھی حیوانات کے رنگ متغیر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تمام باتیں وہ عینی مشاہدے ہیں جن میں شاید دنیا کے دو انسان کبھی مختلف نہ ہونگے

لیکن پھر اس تلون کے کیا اسباب ہیں؟ ماہرین فن نے پہلے پہل اس مسئلہ کی یہ تعلیل بیان کی کہ عنایت الٰہیہ حیوانات کو ان الوان کے ساتھ محض انکی حفاظت کیلئے رنگتی ہے تاکہ دشمن کی متجسس نگاہیں انپر نہ پڑ سکیں، اور وہ ان کی زندگی کا فیصلہ کردینے والے حملوں سے محفوظ رہیں۔ لیکن حقیقت میں مسئلہ کا یہ حل کوئی شافی حل نہیں ہے

اسپر اعتراضاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس سے عنایت الٰہی کا منشا حیوانات کی محض حفاظت اور نگہداشت ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے سہل اور عمدہ اسلوب پر انکی حفاظت کرتی یعنی ایسا ہوتا کہ وہ تمام حیوانات کو نبات خور بنا دیتی اور خود ان درندوں میں شکار کا کوئی طبعی میلان ہی پیدا نہ کرتی، اس لئے کہ مثلاً شیر کو طبعاً شکار حیوان کی طرف مائل کرنا اور شیر کی خوراک صرف حیوانات کا گوشت بنانا پھر شیر کے حملوں سے حیوانات کی حمایت کرکے شیر کو بھوکوں مارنے کی سعی کرنی یہ کوئی حکیمانہ بات نہیں ہے۔ اور مشاہدہ بھی اس حمایت کی تائید نہین کرتا ہم دیکھتے ہیں کہ شیر ہمیشہ حیوانات کا شکار کرتا ہے اور اسکی خوراک انھی حیوانات کا لذیذ گوشت ہوتی ہے

علماء فن نے الوان حیوان میں پھر مزید غور وفکر کے بعد ایک دوسری عقل سے زیادہ قریب یہ تعلیل بیان کی کہ:-

اگر کسی ہرنی کے دو بچے پیدا ہوں اور ایک کا رنگ مکان پیدائش کے ہمرنگ ہو اور دوسرے کا اس کے خلاف، تو راجح یہی ہے کہ شیر اسی بچے کو دیکھ سکیگا اور اس پر حملہ بھی کرے گا جس کا رنگ اس زمین کے رنگ کے خلاف ہوگا، دوسرا بچہ اس قسم کے خطرات سے بالکل محفوظ رہیگا۔ یہیں سے اس قول کی تصدیق کیجاتی ہے کہ حیوان کا رنگ جو مکان کے مشابہ ہوتا ہے وہ دراصل اسکی حفاظت کا ایک طبیعی سلاح ہے لیکن اسکا یہ منشا نہیں ہے کہ جو حیوانات اون مکان کے ہمرنگ ہوتے ہیں وہ کلیتہً اپنے اعداء کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ اس قسم کے حیوانات ان حیوانات کے مقابلہ میں جن کا رنگ مکان کے مخالف ہوتا ہے البتہ خطرات سے مامون ہوتے ہیں، ماہرین فن کے نزدیک اس سلاح کو انتخاب طبیعی سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

مگر حقیقت میں یہ تعلیل بھی مسئلہ کے تمام حقایق و معارف کی پردہ کشائی نہیں کرتی، ابھی تک نفس مسئلہ کی یہ پہلی گرہ بھی نہ کھل سکی کہ حیوانات کا رنگ شروع میں کیونکر متغیر ہوتا ہے؟ اور پھر کن کن تبدیلیوں کے بعد کیونکر وہ مکان کے ہمرنگ ہوجاتا ہے؟ اگر اصل میں اسکی کوئی طبیعی علت ہے تو ضروری ہے کہ وہ علت اس کے نسل میں بھی کارفرما ہو،

علامہ ولس ماہر طبیعیات نے اس موضوع پر ایک استقرائی بحث کی تو انکو معلوم ہوا کہ جن پرندوں میں اوقات معلومہ کے اندر قوۃ حیاۃ بڑھتی رہتی ہے وہ دوسرے پرندوں کے مقابلہ میں زیادہ رنگین اور خوبصورت ہوتے ہیں، عرصہ دراز سے ہمکو یہ معلوم ہے کہ بعض حیوانات کے رنگ جاڑوں میں زائل ہوجاتے ہیں تو اسکی بھی بڑی وجہ ان حیوانات میں قوۃ حیات کا ضعف ہے

بعض محققین خرگوش کو ایسے پہاڑوں پر لیگئے جو ساحل بحر سے تقریباً ۹۵۰۰ قدم اونچے تھے۔ اور وہاں ان کے بچوں کی سات سال تک مسلسل پرورش کی تو انکو ثابت ہوا کہ ان بچوں کے اجسام کچھ چھوٹے ہوگئے اور ان کا رنگ سفید اور خون میں ایک کیمیاوی تغیر پیدا ہوگیا یعنی خون میں لوہے کا عنصر زیادہ بڑھ گیا، اور جذب آکسیجن کی طاقت بھی زیادہ ہوگئی اگر ان خرگوشوں کی یہ نسل زیادہ دنوں تک وہاں رہتی تو یہ تغیر اور زیادہ نمایاں ہوجاتا اور خرگوش کی ایک نئی صنف پیدا ہوجاتی لیکن یہ عظیم الشان انقلاب محض فعل مکان کیوجہ سے ہوتا کسی دوسرے سبب سے نہیں، مختصر یہ کہ قوۃ حیاۃ کی زیادتی الوان کو زیادہ اور اس کا نقص الوان کو کم کردیتا ہے۔ اور شاید مرغ کی رنگینی و خوبصورتی کا اصلی راز بھی قوۃ حیاۃ کی فراوانی ہے

بعض لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ حیوان کا رنگ، غذا کے رنگ پر موقوف ہوتا ہے وہ اپنے دعوی پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بعض دریاؤنیں جو گھاس مینڈک اور گھونگھے کثرت سے کھاتے ہیں، وہ قرمزی رنگ کے ہوتے ہیں، اور بعض لوگ جو کیڑوں کو رنگین غذائیں کھلاتے ہیں اس کا منشا صرف انکو رنگین بنانا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ انہی رنگوں میں رنگ بھی اٹھتے ہیں، لیکن اس ترکیب کا اثر صرف حیوانات صغیرہ تک محدود ہے۔ حیوانات کبیرہ میں اس کا کوئی اثر نہیں ظاہر ہوتا یا بڑے حیوانات میں اسکی تاثیر دوسرے موثرات کے فعل کے ساتھ مختلط ہوجاتی ہے، اس لئے اس کا نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا

بہتیروں نے اس حقیقت کا بھی سراغ لگایا کہ جو مچھلیاں کچھ دنوں کسی دریا میں رہی ہوں اور کچھ دنوں کسی نہر میں تو ان کا رنگ محض اختلاف نور کیوجہ سے بدلجاتا ہے۔ جب پانی کم اور صاف ہوتا ہے اور اسمیں روشنی بخوبی پہونچتی ہے تو مچھلی کا رنگ سفید

ہوتا ہے پھر جب وہ زیادہ گہرے اور سیاہ پانی میں چلی جاتی ہے تو اسکا رنگ مکدر ہوجاتا ہے، اس مقام پر دیکھو انتخاب طبیعی کا کوئی محل نہیں ہے، بلکہ مچھلی کے رنگ میں محض اختلاف نور کی وجہ سے تبدیلی آگئی ہے

ماہرین فن کو یہ حقیقت معلوم ہو چکی ہے کہ جو چھوٹی مینڈک نبات اور اشجار کی ڈالیوں پر رہتی ہے، وہ سبز پتیوں میں سبز ہوتی ہے۔ اور جب اسکو زمین پر یا گندم گوں پتیوں پر رکھدیا جائے تو اس کا رنگ گندمی ہوجاتا ہے۔ نیز اس قسم کا تغیر گرگٹ وغیرہ میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ بعض علماء نے مینڈک کے رنگ کے تغیر کے اسباب سے بحث کی تو انکو معلوم ہوا کہ مینڈک کے جسم میں جو بصلات کے تین طبقے ہیں۔ طبقہ اسفل میں سیاہ، طبقۂ متوسط میں اصفر اور طبقہ اعلیٰ میں ازرق رنگ ہوتا ہے اور ان تینوں طبقات سے اوپر ایک رقیق اور شفاف پردہ منڈھا ہوتا ہے۔ جب مینڈک اشجار و نبات کی پتیوں پر ہوتا ہے تو اصفر اور ازرق کے امتزاج سے اخضر رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اور جب وہ زمین یا کسی تاریک چیز پر رکھدیا جاتا ہے تو طبقۂ اسفل کا سیاہ رنگ ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح گرگٹ کے جسم میں بھی مختلف بصلات ہوتے ہیں وہ بھی جب نبات سبز پر ہوتا ہے تو اس کا رنگ سبز ہوجاتا ہے۔ اور جب سرخ رنگ کی شاخوں پر چلتا ہے تو اس کا رنگ سرخ ہوجاتا ہے اور جب اسکو کسی برتن کے نیچے اسطرح بند کردیا جائے کہ وہاں کسی ذریعہ سے روشنی نہ پہونچ سکے تو اس کا رنگ سیاہ ہوجاتا ہے، اس تغیر کا سبب یا تو کوئی عصبی فعل ہے جو مختلف رنگ کے حویصلات پر موثر ہوتا ہے یا اس کا سبب محض نور ہے۔ ماہرین فن کے نزدیک دوسرا سبب زیادہ مرجح ہے

بعضوں نے ثابت کیا ہے کہ جس مچھلی کا رنگ پانی کے تغیر کے ساتھ متغیر ہوگیا ہو اگر وہ اندھی ہوجائے تو پھر پانی کا رنگ بدلتے پر بھی کبھی اس مچھلی کا رنگ نہ بدلے گا، یہ حقیقت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نور، پہلے عصب بصر پر موثر ہوتا ہے، پھر اسکی تاثیر ان اعصاب کی طرف منتقل ہوتی ہے جن کے ذریعہ حویصلات ملونہ میں انبساط یا انقباض پیدا ہوتا ہے۔ بعض محققین کی یہ تحقیقات ہے کہ نور بلا کسی واسطہ کے مباشرۃً بھی حویصلات پر موثر ہوتا ہے، چنانچہ انھوں نے تجربتاً ایک مینڈک کو تاریکی میں رکھا اور جب وہ سیاہ ہوگئی تو اس کے بدن پر مختلف جگہوں میں سیاہ کاغذ کے ٹکڑے لپٹادئے اور روشنی میں انکو رکھا تو کاغذ کی جگہوں کے سوا پوری جلد سبز ہوگئی، بعض علماء نے مزید تجربہ کیلئے سبز مینڈکوں کی آنکھیں نکال لیں، اور انکو ایک تاریک مکان میں رکھا تو ان کا رنگ فوراً سیاہ ہوگیا پھر جب سبز شاخیں ان کے پاس لائی گئیں تو ان کا رنگ سبز ہوگیا۔ اس تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ جو اخضر نور اوراق سبز سے منعکس ہوتا ہے وہ ایک مخصوص تاثیر کے ساتھ اعصاب جلد میں موثر ہوتا ہے، چاہے اسکو مینڈک دیکھے یا نہ دیکھے

اس کے علاوہ علماء کے اور بہت سے مباحث ہیں جو اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ طعام و مکان یہ دونوں حیوانات کے رنگوں میں بہت زیادہ موثر ہیں، نیز مزید تحقیقات کا سلسلہ ابتک برابر جاری ہے۔ امید ہے کہ عنقریب وہ اس مسئلہ کے بہت سے غوامض و مشکلات اسرار و رموز کا انکشاف کریں گے۔

بدر اصلاحی

بسم اللہ

(صفحہ ۸۰ کا اعلان ملاحظہ فرمایئے)

نگار

(صفحہ ۸۰ کا اعلان ملاحظہ فرمایئے)

فہرست مضامین ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء

ملاحظات		۲
مومن و کلام مومن	کیفی چریاکوٹی	۹
گناہ کی گٹھری	(ڈاکٹر) اعظم کریوی	۱۷
مسلمانان ہند کے پستی کے اسباب	سید مقبول احمد بی۔اے	۲۲
خلیق اورنگ آبادی	سید تمکین کاظمی	۲۸
مصحفی کا مرتبہ شاعری	افسر امروہی	۳۳
سیاح کی ڈائری		۵۰
ازدواج مکرر		۵۷
ارہر کا کھیت	رشید احمد صدیقی ایم۔اے	۶۵
جلوۂ کرشن	ہوش بلگرامی	۷۰
زندگی	مجنوں گورکھپوری	۷۵
باب الاستفسار		۸۱
منظومات:-		
محمود شیرانی		۸۹
اختر شیرانی		۹۱
شمیمی بی۔اے		۹۲
فراق گورکھپوری		۹۴
سید علی اختر، اختر		۹۵

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ (۶)	دسمبر ۱۹۲۹ء	جلد (۱۶)

ملاحظات

کون کہتا ہے انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ کیا اس لئے کہ وہ اپنی مقابل جنس سے محبت کرتا ہے، مگر یہ فطرت کی مجبوری ہے یا ایک خواہش کی تکمیل کا اقتضاء۔ کیا اس لئے کہ وہ اپنی اولاد پر شفقت و رافت صرف کرتا ہے، لیکن وحشی سے وحشی درندہ بھی اس جذبہ سے خالی نہیں کیا اس لئے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کے ساتھ نرمی و تلطف سے کام لیتا ہے مگر شاید صرف اس لئے کہ وہ اپنے ساتھ کسی سلوک کی توقع رکھتا ہے۔ تم فطرت انسانی کا مطالعہ خواہ کسی پہلو سے کرو، اس کی خود غرضی، اس کی ناحق کوشی، اور اس کی حرص و ہوا پرستی اس کی زندگی کے ہر ہر لمحہ اور اسکے اعضاء کی ہر ہر جنبش سے وابستہ پاؤگے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کی عبادت بھی کرتا ہے تو صرف اس طمع سے کہ وہاں اس کو حوریں ملیں گی، کوثر و تسنیم ملینگے اور ہر وہ چیز ملیگی جو اس دنیا میں اُسکو میتسر نہیں آسکتی۔

عالم طفلی سے لیکر عہد انحطاط تک کوئی دور زندگی کا ایسا نہیں ہے، جس میں انسان کی اس فطری خصوصیت کی جھلک نمایاں طور پر پائی جائے اور اس قدیم حیوانیت کے علامات اسمیں نظر نہ آئیں جس کا ثبوت ماہرین علم تشریح بعض آثری اعضاء سے دیتے ہیں اور ڈارون، قانون ارتقاء سے۔

یقیناً انسان نام نہ اس کے اعضاء کا ہے، اور نہ اُن خصوصیات کا جو اس کے محض ایک جاندار چیز ہونے کے ثبوت میں پیش کیجا سکتی ہیں

بلکہ انسان کا بہترین تشخص اساسی وہ ہے جو کائنات کی سب سے زیادہ روشن و مکمل الہامی کتاب نے بتایا ہے۔

"انی جاعل فی الارض خلیفۃ"۔ "وعلم آدم الاسماء کلہا" اس لئے آیئے آج کی صحبت میں اجمالاً استخلاف فی الارض اور حقیقت علم پر ایک نگاہ ڈال لیں، کیونکہ میرے نزدیک تمام اخلاق کی اساس اور فلسفۂ مذہب کی بنیاد اسی پر قایم ہے۔

خلافت سے مقصود ربانی کیا ہے، اور اس خلافت کی غایت کیا ہے؟ بظاہر یہ بحث بہت طویل الذیل گفتگو کا مقتضی معلوم ہوتا ہے، لیکن خدا نے جس طرح تمام فلسفۂ حیات کو نہایت آسان و مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے، اسی طرح خلافت انسانی کے مسئلہ کو بھی بہت واضح و صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔

(یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے ان کو زمین میں اپنا قایم مقام بنائے گا جیسا کہ اس سے قبل کے لوگوں کو عطا فرمایا گیا)، نہ صرف اس آیت میں بلکہ اکثر مقام پر جہاں استخلاف کا ذکر کلام مجید میں آیا ہے اسی کے ساتھ ارض کا بھی ذکر کیا گیا ہے:۔

(۱) قال عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون۔

(۲) ولو نشاء لجعلنا منکم ملٰئکۃ فی الارض یخلفون

(۳) ثم جعلنٰکم خلٰئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ استخلاف، یہ خلافت اسی زمین سے متعلق ہے، اسی دنیاوی حیات سے تعلق رکھتی ہے اور اسی عالم کے کاروبار سے متعلق ہے جس کو دوسرے مقامات پر وراثت ارضی سے تعبیر کیا گیا ہے:۔

(۱) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔

(۲) ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔

(۳) وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء. فنعم اجر العاملین۔

پھر کسی جگہ وراثت ارض کے ساتھ عبادی الصالحون کا ذکر ہے، کسی جگہ متقین کا بیان ہے اور کہیں عاملین کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی خلافت خداوندی، نیابت الٰہی یا وراثت ارضی کے حصول کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ انسان اچھے کام کرے، ترقی کے لئے جدوجہد کرے، دنیا میں امن و سکون کو رواج دے اور اپنے استقلال و استقامت سے شیطانی قوتوں، طاغوتی لشکروں اور اخلاقی بغاوتوں کا مقابلہ کرے۔

پھر اسی کے ساتھ سورۂ احقاف کی اس آیت کو ملاحظہ فرمایئے:۔

فھل یھلک الا القوم الفاسقون (کیا سوائے فاسق قوم کے کوئی اور قوم ہلاک ہو سکتی ہے) اور غور کیجئے کہ ان تمام آیات کے مفہوم کو مربوط کرنے سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

پہلے ارشاد ہوا کہ "میں زمین میں اپنا قایم مقام، اپنا نائب پیدا کرنا چاہتا ہوں جس کا نام انسان ہے"۔ پھر بتایا گیا کہ خلافت سے مراد یہ ہے کہ "وہ زمین کا وارث ہو، وہاں حکومت کرے، امن و سکون پھیلائے، ترقی کی راہیں نکال کے خدا کی پیدا کی ہوئی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھائے،

رات دن محنت و عمل میں لگا رہے اور حیات دوام حاصل کرے۔ اس کے بعد فیصلہ کن الفاظ میں بتا دیا گیا کہ جب تک انسان ان باتوں پر کاربند رہے گا وہ برابر ترقی کرتا رہیگا، کیونکہ خدا کا دستور یہی ہے کہ وہ صرف ان قوموں کو ہلاک کرتا ہے جو فاسق ہیں، باغی ہیں، اور خدا کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے کام نہ لیکر کفران نعمت کا ارتکاب کرتی ہیں۔

یقیناً ترقی سے مراد صرف مادی ترقی نہیں ہے، محض صنعت و حرفت، دولت و تجارت، جاہ و ثروت کی ترقی مقصود نہیں ہے، لیکن اسی کے ساتھ کلام مجید سے یہ بھی ثابت نہیں کہ وراثت ارضی سے مراد نکبت و ذلت اور عسرت و افلاس ہے۔ اس لئے وہ قومیں جو اس وقت دنیاوی حیثیت سے ترقی یافتہ نظر آتی ہیں باوجود انتہائی انحطاط اخلاق کے بھی، ایک لحاظ سے اپنے آپ کو یرثہا عبادی الصالحون کے تحت میں لا سکتی ہیں، لیکن وہ جن کے پاس نہ دولت ظاہری ہے نہ دولت اخلاق اور ہلاک ہو رہی ہیں آپ نے آپ کو فہل یہلک الا القوم الفاسقون سے کیونکر علیحدہ کر سکتے ہیں۔

کیا کوئی بڑے سے بڑا مولوی، یعنے خدا کا کوئی بڑے سے بڑا خلیفہ اس کا جواب دے سکتا ہے۔

علم کی تعریف خدا نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:۔ ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان علیہ مسئولا۔

یعنی ہر اس چیز کو نہ مان لیا کرو جس کا تمہیں علم نہ ہو اور علم کی حقیقت اس طرح سمجھ لو کہ تمہارے کان، تمہاری آنکھ اور تمہارا قلب ان میں ہر ایک جوابدہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ تم کرتے ہو وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر اطمینان نفس و قلب کے ساتھ کرتے ہو یا محض دوسروں کے کہنے سننے سے۔

یہ ہے تفسیر و تشریح علم آدم الاسماء کلہا کی۔ علم اسماء سے مراد حقائق اشیاء کا علم ہے اور علم بھی وہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا، پھر اب انسان کے مسئلہ خلافت فی الارض اور حقیقت علم دونوں کو ملا کر غور کرو کہ اسلام کی صحیح تعلیم کیا ہے اور اسی کو معیار قرار دے کر فیصلہ کرو کہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ہمکو کیا کرنا چاہئے کہ کھوئی ہوئی وراثت ارض حاصل ہو سکے۔

میں نے ہمیشہ اس امر کی تبلیغ کی ہے کہ اسلام سے زیادہ وسیع النظر، قریب الفہم، آزاد خیال اور وسیع آغوش رکھنے والا مذہب کوئی نہیں ہو سکتا، اس نے کوئی چیز ایسی پیش نہیں کی جو مذہب کے دائرہ کو تنگ و محدود کر دینے والی ہے، بلکہ اس نے دوسرے مسالک والوں کے ساتھ اس رواداری کا اظہار کیا ہے جس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اس نے دوسرے مذہب کے انبیاء و اکابر کی عزت کرنے کا درس دیا، اس نے دیگر اقوام کی کتب مقدسہ کا احترام کیا ہے۔ اس نے لکل اجل کتاب کا سبق دیا ہے، اس نے لکل قوم ہاد کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، وہ علی الاعلان معترف ہے اس امر کا کہ وان من امة الا خلا فیہا نذیر اور اس نے صاف صاف یہ بھی بتا دیا ہے کہ لکل امة رسول پھر جب حقیقت یہ ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام جو اس فراخدلی کے ساتھ تمام دنیا کو دعوت دے رہا ہے اور جو اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا کہ

تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا۔

کیوں نہیں سارے عالم پر چھا جاتا اور کیوں نہیں دنیا اس مرکز پر آ جاتی جسے اسلام نے صرف انسانیت اور اخوت عامہ سے تعبیر کیا ہے۔

اگر اس راز کی حقیقت معلوم کرنا ہے تو اسلام کی تعلیمات کو نہ دیکھو کہ وہ تو ہمیشہ سے بے لاگ ہیں، کلام مجید پر غور نہ کرو کہ اس میں بھی کوئی تبدیلی

پیدا نہیں ہوئی، بلکہ صرف اس جماعت کی تاریخ کا مطالعہ کرو جو اپنے آپ کو عالم دین، ہادی طریقت، اور مرشد و رہبر کہتی ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنے اغراض نفسانی کے لئے تعلیمات مذہب کو مسخ کرکے پیش کیا اور آج بھی عالم انسانی اس طاغوتی قوت کا مجروح نظر آتا ہے۔ وہ تمکو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کلام مجید پر غور کرو، حالانکہ خدا نے علم و یقین کے باب میں تمہارے قلب کو بھی ذمہ دار بنا دیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ منشاء ایزدی کو صرف اسی نے سمجھا ہے حالانکہ علم آدم اسماء کلہا میں تمام افراد نوع انسانی شامل ہیں۔ وہ تعلیم دیتا ہے کہ مسلمان بننے کے لئے صورت بدلو، لباس بدلو، خاص وضع اختیار کرو، مخصوص طریق حیات کے پابند ہو، درانحالیکہ خدا نے یہ شرط کہیں عاید نہیں کی۔ خدا مسلمانوں کو انتم الاعلون کے لقب سے یاد کرتا ہے، لیکن ان کا تقاضہ یہ ہے کہ محکوم رہو، غلام بنو، دوسروں کے دستگر بنے رہو، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مذہب کا تعلق صرف درستی اخلاق سے ہے، لیکن یہ گروہ کہتا ہے کہ مذہب نام ہے قومیت کا، ریاست کا، اور ہر اس چیز کا جس سے حقیقتاً مذہب کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر آج جبکہ اس جماعت نے ہمارے تمام نظام مذہبی کو درہم برہم کر رکھا ہے، سب سے پہلے سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کب تک آنکھ بند کرکے انکے مواعظ و ہدایات کو وحی آسمانی سمجھتے رہیں گے اور کس حد تک وہ بانی اسلام اور اسکی توہین کو گوارا کریں گے۔ وقت آگیا ہے کہ لوگ ہوشیار ہو جائیں اور ان کے اقتدار کے ارگراں سے اپنی گردنوں کو آزاد کرلیں کیونکہ جب تک یہ "حجاب کثیف" درمیان باقی ہے، امت مسلمہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتی۔

گذشتہ ماہ کی ڈائری پر لکھنؤ کے ایک شیعی اخبار سرفراز نے ۱۲ر نومبر ۲۹ء کی اشاعت میں پورے تین کالم کا مقالۂ افتتاحیہ آخرکار سپرد قلم کر ہی دیا

چشم من روشن کہ رویش بامداداں دیدہ ام

ڈائری میں صرف لکھنوی شاعری کے حقیقی عناصر سے بحث کرکے بتایا گیا تھا کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے اس کو ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیا تھا اور اسی سلسلہ میں تاریخ اودھ کے اس المناک حصہ کا بھی ذکر آگیا تھا، جس کا حوالہ بسلسلۂ تنقید ضروری تھا، لیکن ہمارے محترم معاصر نے اسے جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا وہ کم از کم میرے لئے ضرور حیرتناک ہے۔

اگر وہ اس کے جواب میں لکھنوی شاعری کے عناصر ترکیبی سے بحث کرکے اختلاف کرتے یا تاریخی حیثیت سے تردید فرماتے تو یقیناً وہ علم و زبان کی ایک اہم خدمت ہوتی، لیکن انھوں نے شروع سے لیکر آخر تک سارے مضمون کو فرقہ دارانہ جذبہ کا نتیجہ بتایا ہے، اور اس قدر بے اختیاری و بے صبری کے ساتھ کہ اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ

چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر؟

میں دنیا کے ہر الزام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہوں، لیکن عصبیت، نفاق انگیزی یا دل آزاری کا الزام میرے اوپر قائم کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے میں اڈیٹر سرفراز کو سنی کہدوں کہ وہ یہ سنکر سوائے ہنسنے کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

جو حضرات نگار کا مطالعہ کرتے رہے ہیں وہ آگاہ ہیں کہ مذہب کے باب میں میرا نظریہ اس قدر وسیع ہے کہ وہاں کا ذو مسلم کے سوال کی بھی گنجایش نہیں ہے

چہ جائیکہ شیعہ سنی اور اس لئے اگر میری کسی ادبی یا تاریخی تنقید میں کوئی شخص عصبیت کی بو پاتا ہے تو میں بلا تامل کہدوں گا کہ یہ اس کے مشام کی گمراہی ہے، جس کا نقص ہے۔

اسی نگار میں خود میں نے اپنے قلم سے مذہب اہل سنت کے بہت سے مروجہ عقاید و مسایل پر نہایت سخت تنقیدیں کی ہیں اور کرتا رہتا ہوں، جہانتک مراسم مذہب کا تعلق ہے یا رواجی دنیا سے اسے واسطہ ہے، میں اس وقت تشیع و تسنن کیا ہر مذہب کو مجموعۂ خرافات پاتا ہوں اور یقیناً میں اس کے اظہار میں تامل نہیں کرتا، اور کوئی صاحب ادراک انسان انکار نہیں کرسکتا کہ اسوقت دنیا مذہب کے صحیح اصول سے کس قدر ہٹی ہوئی ہے، مثلاً میں خود سرفراز کے قابل اڈیٹر سے دریافت کرتا ہوں کہ تو ابان اودھ کے دربار میں مذہب کے نام سے جو جو بدعتیں روا رکھی جاتی تھیں کیا واقعی مذہب تشیع انہیں جایز سمجھتا ہے۔ وہ تو وہ مجھے معلوم ہے کہ سنجیدہ علماء شیعہ عزاداری کی اس صورت کو بھی جو فی الحال عام طور پر رایج ہے کبھی پسند نہیں کرتے۔ سلطنت اودھ میں جو کچھ ہوا وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یقیناً "گندگی و عفونت ہی کہلائے گا، اور اگر بجائے شیعہ سلطنت کے کوئی سنی حکومت ہوتی تو میں اسوقت بھی اسے انہیں لفاظ سے یاد کرتا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ منصور کے باب میں اور نگزیب پر میں نے ایسی سخت تنقید کی ہے کہ شاید ہی آپ کو کسی دوسری جگہ ملے۔ یا جہانتک انصاف کا تعلق ہے میں نے معاویہ و حسین کے کردار کا فرق دکھانے میں جس صفائی سے کام لیا ہے وہ غالباً آپ کے لئے بھی حیرتناک ہو۔ میں اس معاملہ میں اپنے آپ کو اسقدر بے لاگ پاتا ہوں کہ اگر آج میں شیعہ عقاید کا متبع ہو جاؤں تو بھی میری تنقید کا لب و لہجہ یہی ہوگا، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ سخت۔ میں جماعتی تفریق یا مذہبی امتیاز کو سامنے رکھکر کبھی کچھ نہیں لکھتا بلکہ اصول اخلاق و انسانیت کو سامنے رکھکر تنقید کرتا ہوں، خواہ وہ مسئلہ حضرات شیعہ کا ہو یا اہل سنت کا۔

اب رہا لکھنوی شاعری، یا سلطنت اودھ کی بنیاد کا سوال، سو میں بہت ممنون ہونگا اگر اڈیٹر سرفراز کوئی تفصیلی جواب اسکا پیش کریں گے، کیونکہ ممکن ہے خود انہیں کی طرف سے بہت سے ثبوت ایسے فراہم ہو جائیں، جنکو میں نے قصداً نظر انداز کر دیا تھا، اسی سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ "دربار خلافت کی ان رنگ رلیوں کا بھی ایک ہلکا سا فوٹو دکھانے کے لئے مجبور ہوں جو تقدس کے پردہ میں جایز رکھی گئی تھیں"۔ اہلاً و سہلاً ضرور ایسا کیجئے بلکہ اگر آپ دربار رسالت میں کوئی نقص محسوس کرتے ہیں تو اس کا بھی اظہار کیجئے۔ آپ کی اس تنقید پر سب سے پہلا مبارکباد دینے والا شخص اڈیٹر نگار ہوگا اگر واقعی وہ کوئی تاریخی خدمت ہوئی۔

ہمارے عزیز دوست اور ملک کے نہایت کمسن سال صحافی جناب جالب نے، میرے اس مضمون سے اختلاف کرتے ہوئے جو گذشتہ ماہ نگار میں بسلسلۂ استفسار "ہندو مسلم اتحاد" پر لکھا گیا تھا، ایک مقالۂ افتتاحیہ تحریر فرمایا ہے جو ہمدم ۲۶ اور ۲۷ نومبر کے ہمت میں شایع ہوا ہے۔

جناب جالب کے اس ناقدانہ مضمون پر چند در چند پہلوؤں سے بحث کی جاسکتی ہے اور بعض نہایت اہم اصولی مسائل معرض گفتگو میں آسکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ملاحظات میں بالتفصیل اس بحث کو نہیں چھیڑ سکتا اور نہ غالباً اس امر کی ضرورت ہے کہ اب جبکہ ہندوستان کے سیاسیات "نظریہ" کی دنیا سے ہٹ کر "عملی" پہلو اختیار کر رہے ہیں خواہ مخواہ ان مباحث میں بیکار وقت ضایع کیا جائے، لیکن میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ نہ جناب جالب صاحب میرے مدعا کو سمجھے اور نہ میں ان کی تنقید کو، جالب صاحب

فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں وطنی جذبہ کام کر رہا ہے اور میں یہی چیز مسلمانوں میں نہیں پاتا۔ ان کے یہاں اگر کوئی صحیح یا نادرست جذبہ ہے تو وہ صرف مذہبی جذبہ ہے اور وہ اسی کے ماتحت اپنی قومیت و وطنیت کو قائم کرنا چاہتے ہیں، جو میرے نزدیک بدترین سیاسی گمراہی ہے۔ جب تک کسی قوم کے سیاسیات اس کے مذہب سے علیحدہ نہ ہوں گے نہ اس میں وطنیت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ وہ حکومت میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اسی خیال کی بنا پر میں نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل مجھے بہت تاریک نظر آتا ہے لیکن اگر جالب صاحب کے نزدیک حقیقت یہ نہیں ہے (جسے وہ کبھی ثابت نہیں کر سکتے) تو میں کیا ساری دنیا ان کی ہمنوا ہو سکتی ہے۔

دوسری سب سے بڑی غلطی جالب صاحب نے یہ کی ہے کہ وہ ہندوستان کو ہر عسکری قوت کے سامنے جھکنے پر مجبور پاتے ہیں اور ثبوت میں انگریزوں کو پیش کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے مٹھی بھر جماعت سے ہندوستان کو فتح کیا اور اب تک اس پر حکومت کر رہے ہیں۔ جناب جالب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان انگریزوں نے کبھی فتح نہیں کیا بلکہ خود ہندوستانیوں نے انگریزوں کے لئے کیا۔ یعنی جس وقت تک ہندوستانیوں میں جذبۂ وطنیت پیدا نہیں ہوا تھا وہ دوسرے کے لئے آلۂ کار بنکر خود اپنا نقصان کرنے میں جری تھے۔ لیکن اب جبکہ یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے جالب صاحب اس امید موہوم پر کوئی ایسی تعمیر قائم نہیں کر سکتے جسے وہ مسلمانوں کا قبلۂ مقصود یا کعبۂ امن و امان قرار دیں۔ کیونکہ اگر مسلمانوں نے ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر محض انگریزوں کی تتبع میں "جس کی تیغ اس کی دیگ" پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ سوائے ناکامی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اب زمانہ وہ نہیں ہے جو کلایو کو ملا تھا، بلکہ وہ ہے جب ایک نہرو رپورٹ کے مطالبہ کی تردید بھی حکومت کے بس کی بات نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ جالب صاحب نے حکومت کی تقسیم یونانی و اسلامی تو سمجھ لی لیکن اس طرف خیال منتقل نہ ہوا کہ آج ہندوستان میں جس حکومت کا مطالبہ ہے وہ نہ یونانی ہو گی نہ اسلامی بلکہ خالص ہندوستانی اور وہ جو اپنے آپ کو ہندوستانی نہ سمجھے گا اس کی برکات سے یقیناً محروم رہیگا۔

آپ اپنے لئے جداگانہ انتخاب چاہتے ہیں، آپ اپنے لئے علیحدہ قانون طلب کرتے ہیں، آپ چاہتے ہیں کہ آپکی اقلیت اکثر کی حیثیت قبول کر لے، لیکن اہلیت و قابلیت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ سب کچھ دیدیا جائے تو بھی ایک مست کی پگڑی کی طرح اس کا سنبھالنا دشوار ہے۔ پہلے مسلمانوں سے اس ذہنیت کو دور کر دیجئے جو باجہ اور رام لیلا پر آمادۂ جنگ ہو جاتی ہے اور علم الدین کو (جو یقیناً قتل کا مجرم تھا اور جس کو بالکل بجا طور پر پھانسی دی گئی) شہید قوم سمجھ کر اس کی قبر کو زیارت گاہ بنا لیتی ہے، اس کے بعد آپ مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق کوئی امید افزا پیشین گوئی فرمائے گا، اور پھر یوں بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر آپ کو مسلمانوں کا مستقبل موجودہ حالات کے ماتحت بھی بہت درخشاں نظر آتا ہے، تو پھر آپ نہرو رپورٹ سے کس اندیشہ کی بنا پر اختلاف فرما رہے ہیں۔ کیا بقول آپ کے مسلمانوں کی اقلیت دو لاکھ مسلح افراد بھی نہیں نکال سکتی کہ ہندوؤں کو مفتوح کر کے حکومت برطانیہ کی سنّت کو پھر از سر نو زندہ کرے۔

بر تمنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا

یہ رسالہ سولھویں جلد کا آخری پرچہ ہے اور جنوری سنہ ۲۹ء کے رسالہ سے سترھویں جلد شروع ہو گی، سنہ ۲۸ء کے پروگرام کا جزو غالب تنقیدی مضامین تھے اور تنقید سے جو ہیجان پیدا ہو سکتا ہے، وہ ملک میں پیدا ہوا اور بالکل بجا لیکن الحمدللہ نگار و صاحب نگار دونوں کا

ضمیر مطمئن ہے کہ اس نے ذاتیات یا عصبیت کو کہیں دخل نہیں پانے دیا اور اگر کسی نے اس کے خلاف رائے قایم کی تو اس کی ذمہ دار خود اس کی قوت فیصلہ ہے۔

سنہ ۳۰ء کا پروگرام کیا ہوگا؟ اس کے متعلق قبل سے کوئی بیان دینا مناسب نہیں۔ مستقبل خود بتائے گا کہ ہمارا لائحہ عمل کیا تھا اور ہم کس حد تک اسمیں کامیاب ہوئے۔ و افوض امری الی اللہ۔

اس رسالہ کے ساتھ اکثر حضرات کا چندہ ختم ہوتا ہے۔ اس لئے مینجر کی طرف سے جو اعلان صفحہ ۸۰ پر شایع ہوا ہے اس کو ایک بار ضرور دیکھ لیجئے۔ میں ان حضرات کو جو ہمیشہ شروع سال سے جدید خریدار پیدا کرکے مجھ پر کرم فرمانے کے عادی ہیں، ان کو بھی خصوصیت سے توجہ دلاتا ہوں۔ **ایک مطبوعہ کارڈ** اس رسالہ کے اندر آپ حضرات کو ملیگا، براہ کرم اس کی خانہ پری کرکے **اخیر دسمبر ۲۹ء تک دفتر نگار میں** بھیجدیجئے۔ یہ التجا مینجر کی نہیں ہے بلکہ **میری درخواست** ہے جس کو اگر آپ مطالبہ بھی سمجھیں تو نادرست نہیں ہو سکتا۔ اگر نگار کی خدمت کو کسی قابل سمجھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں حصہ نہ لیں **جبکہ آپ کو اپنے حلقہ احباب میں صرف دو خریدار جدید فراہم کر دینا چنداں دشوار نہیں ہے۔**

گذشتہ ماہ کے رسالہ میں ایک فسانہ جناب طالب باغپتی کا جھوٹ کے عنوان سے شایع ہوا ہے، یہ فسانہ لیونارڈ اینڈریو کے فسانہ کا ترجمہ ہے۔ کاتب کی غلطی سے اس کا اظہار اختتام مضمون پر نہ ہو سکا۔

ماہ جنوری سنہ ۳۰ء کا رسالہ ظفر اور اس کی شاعری کے لئے مخصوص ہے، اس وقت تک جتنے مضامین موصول ہوئے ہیں انمیں اس کی شاعری سے بحث نہیں کی گئی۔ لیکن اس عہد کے بعض تاریخی و معاشری حالات سے متعلق دو مضمون (ایک جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اور دوسرا سید وزیر حسین صاحب دہلوی کا) ایسے پاکیزہ موصول ہوئے ہیں کہ اگر ظفر نمبر میں سوائے ان دو مقالوں کے اور کوئی تیسرا مضمون نہ ہوتا تو بھی کافی سے زیادہ سامان دلچسپی فراہم ہو جاتا۔ لیکن آپ دیکھینگے کہ ۱۶۰ صفحات میں علاوہ ان دو مضامین کے اور بھی جو کچھ درج ہوگا وہ آپ اپنی نظیر ہوگا۔

ہمارے پاس انڈین میڈیکل اسٹور نظیر آباد لکھنؤ سے ایک شیشی سرمہ کی آئی تھی جس کو ہم نے خود بھی استعمال کیا اور اپنے بعض احباب کو بھی دیا۔ تجربہ سے یہ سرمہ بہت مفید ثابت ہوا ہے اور آنکھوں کے بہت سے امراض کیلئے کارآمد چیز ہے۔ اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ سفید ہے ممکن ہے جدید خیال کے حضرات اس کو بھی خوبی میں شمار کریں۔

نیاز

مومن وکلام مومن

(بہ سلسلہ سابق)

خصوصیات شعر

ابو الہلال عسکری امام بلاغت اپنی مشہور کتاب "صناعتین" میں لکھتے ہیں کہ "کلام نثر ہو یا نظم اس میں سہولت - سلاست - بہتر الفاظ، عمدہ معانی اچھی ترکیب - موزون نشست الفاظ ہونا ضروری ہے"

شعر کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو معانی کثیرہ پر حاوی ہوں، جن کو سنکر سننے والا خود بخود لطف حاصل کرے، سہل ہو، قلیل النظیر ہو۔

امام یحییٰ بن علی یمنی نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناظم اور ناثر کو علوم ضرور یہ پیش نظر رکھ کر کلام کو مرتب کرنا چاہئے یعنی کہاں مبتدا کو ہونا چاہیئے کہاں خبر کو، کہاں مقدم ہونا ضروری ہے کہاں موخر، اسی طرح جملہ فعلیہ میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ فاعل کہاں ہونا چاہئے اور مفعول کی کون جگہ ہے، کس قسم کا فعل لانا مناسب ہے ضمائر میں بھی مناسبت اور عدم مناسبت کا پیش نظر رکھنا لازم ہے، منشائے بیان یہ ہے کہ اگر اشعار قواعد مقررہ (نحویہ و صرفیہ) کے مطابق ہیں تو اس قابل ہیں کہ سندیں پیش کئے جائیں، ان کی صحت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

جہاں یہ امر مسلم ہے وہیں یہ بھی مان لینا پڑے گا کہ اس قسم کے اشعار آمد کے درد اور بیساختگی کے نشتر بن نہیں سکتے۔ یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص ان قیود کے ساتھ آمد کا رنگ پیدا کرے۔ اگر ایسا کوئی شاعر نظر آئے تو اس کے اشعار زور تخیل کا نتیجہ نہونگے بلکہ کرامت کی دلیل۔

حکیم مومن، اسی قسم کے شاعر ہیں کہ پابندیوں کے اندر وہ اس طرح آزاد ہیں کہ نظر کو دھوکا ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں لیکن ان کو اس کی صحت اور عدم صحت کا احساس کبھی نہیں ہوتا۔

علامہ قلقشندی صبح الاعشیٰ کی جلد دوم میں صفحہ ۲۰۲ پر خصوصیات شعر کے متعلق نہایت محقق اور دلچسپ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

شعر کی خوبی کے سات مدارج ہیں:-

۱- کسی شعر کا ہر مصرعہ بجائے خود مستقل ہو، مثلاً امرئ القیس کا شعر ہے:-

افاطم مهلاً بعض هذا التدلل
وان كنت قد ازمعت هجري فاجملي

اس شعر کا ہر مصرعہ اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ شعر کا یہ درجہ اعلیٰ ہے۔

۲۔ دونوں مصرعے مستقل بھی ہوں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی ہوں، مثلاً امرئ القیس کا یہ شعر۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل
بسقط اللوی بین الدخول فحومل

اس شعر کا پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے، لیکن جب دوسرا مصرعہ ملا دیا گیا تو اسکا درجہ بڑھ گیا۔

۳۔ شاعر اپنے کسی شعر کے دونوں مصرعوں کو جس جگہ چاہے رکھدے، لیکن معنی میں فرق نہ آئے۔ اس کا نام تصریع موجہ ہے مثلاً ابن حجاج کا یہ شعر:۔

من شروط الصبوح فی المرجان
خفة الشرب مع خلو المکان

۴۔ پہلا مصرعہ غیر مستقل ہو لیکن جب دوسرا مصرعہ ملا یا جائے تو شعر پورا ہو جائے، اسکا نام تصریع ناقص ہے متنبی کا شعر ہے:۔

مغانی الشعب طیباً فی المغانی
بمنزلة الربیع من الزمان

۵۔ شعر میں کوئی لفظ وسط اور قافیہ میں بہ طریق حقیقت واقع ہو جیسے:۔

وکل ذی غیبة یؤب
وغائب الموت لا یؤب

اس میں لفظ یوب تصریع مکرر ہے۔
کبھی یہ طریق مجاز ہوتی ہے، مثلاً:۔

فتیً کان شرباً للعفاة و مرتعاً
فاصبح للهندیة البیض مرتعاً

اس شعر میں لفظ "مرتعا" مجاز ہے۔

۶۔ پہلا مصرعہ اسوقت تک معلق رہے جب تک دوسرے مصرعہ کا پہلا لفظ اسکی صفت بنا کر نہ ملا یا جائے۔ مثلاً:۔

الا ایها اللیل الطویل الا انجلی
بصبح وما الاصباح فیک بامثل

پہلا مصرعہ لفظ "بصبح" کا محتاج ہے، اسکو تصریع معلق کہتے ہیں۔

۷۔ مختلف القافیہ مصرعوں کے نام کو تصریع مشطور کہتے ہیں، مثلاً:۔

اقلنی قد ندمت علی الذنوب
وبالاقرار غدت من الجحود

اس شعر میں ذنوب کا قافیہ جحود لایا گیا ہے جو معیوب ہے۔

مومن اور خصوصیات شعر

اسی کسوٹی پر "مومن" کے اشعار دیکھنا چاہیئے، مومن کے تمام دیوان میں زیادہ تر اول و دوم مدارج کے اشعار ہیں، سوم و چہارم کے کم۔ پنجم و ششم کے اس سے کم۔ ہفتم کا نشان نہیں۔

(مثال اول و دوم)

(۱)

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے لیکن دوسرا ملا دیا گیا تو ارتباط بڑھ گیا۔

(۲)

اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث
میں نے کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث

اس شعر کا پہلا مصرعہ اس قدر مستقل ہے کہ دوسرا نہ بھی ملایا جائے تب بھی مضمون میں کوئی نقص نہیں رہتا۔

(۳)

تصریع ناقص کی مثال:۔

خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر
نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

(۴)

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

اس شعر میں تصریع موجہ ہے یعنی پہلا مصرعہ دوسرے کی جگہ اور دوسرا پہلے کی جگہ رکھ دیا جائے تو مقصود میں فرق نہ ہو۔ مرتبہ پنجم محتاط اور قادر الکلام شعرا کے نزدیک عیب سمجھا جاتا ہے، اس لئے "مومن" نے اس سے حتی الوسع احتراز کیا ہے۔

الفاظ اور شعرا

ناظم اور ناثر کی قدرت اور فضیلت نظم اور نثر میں الفاظ اور معانی کی موزونیت سے معلوم ہوتی ہے۔
ابن رشیق قیروانی العمدہ صفحہ ۸۰ جلد اول میں لکھتے ہیں کہ:۔

"لفظ جسم اور معنی روح ہے ان دونوں میں باہم ارتباط ایسا ہوتا ہے جیسا جسم اور روح میں، جس طرح جسم کی قوت سے روح قوی اور ضعف سے ضعیف ہوتی ہے، یہی حال الفاظ کا ہے، معنے اگر درست ہوتے ہیں اور لفظ میں نقص ہوتا ہے تو شعر میں نقص پیدا ہو جاتا ہے، اگر معنے میں خرابی ہے تو لفظ بیکار معلوم ہوتا ہے"

اسی کتاب میں آگے چلکر معانی اور الفاظ کے موازنے میں "الفاظ" کی خوبی و صحت زیادہ زور دیا ہے:۔

"اکثر ائمہ لغت خوبی الفاظ کو معانی پر ترجیح دیتے ہیں، بعض علمار کا قول ہے کہ الفاظ، معانی سے زیادہ ضروری اور قیمتی ہوتے ہیں ابو ہلال عسکری اس فن کے جید امام کا قول ہے کہ "معانی کی تمام خوبیاں الفاظ پر موقوف ہیں، یہی وجہ ہے کہ شعرا اور خطبار اپنے کلام میں اثر پیدا کرنے کے لئے مناسب الفاظ کی ترتیب دیتے ہیں"، (صفحہ ۴۹ کتاب صناعتین)

علامہ قلقشندی کی رائے ہے کہ:۔

"شیریں الفاظ کی طرف طبیعت خود بخود مائل ہوتی ہے نہ کہ معانی کی طرف"

کلام فصیح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"فصاحت کا انحصار الفاظ پر ہے، یعنے لفظ فصیح وہ ہے جس کے فوراً سمجھنے میں کسی قسم کے اہتمام کی ضرورت نہ ہو۔

پھر لکھتے ہیں کہ:۔

الفاظ میں خاص قسم کی کشش ہوتی ہے جس کی طرف قوت سامعہ کا خود بخود میلان ہوتا ہے، اگر الفاظ میں سختی ہوتی ہے تو اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے اول الذکر کی مثال آواز بلبل اور دوسرے کی مثال گدھے کی آواز ہے"

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے اس قسم کی نفرت یا رغبت کا انحصار الفاظ پر نہیں بلکہ آواز پر ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آواز الفاظ کی تابع ہوتی ہے، یعنے کوئی آواز لفظ یا الفاظ سے خالی نہیں ہوتی۔

ہماری رائے میں الفاظ صرف سامعہ نوازہی نہیں ہوتے بلکہ ان سے قوت باصرہ، دل و دماغ سب کو کیفیت و لذت حاصل ہوتی ہے۔

(مثال الفاظ فصیح)

مومن نے اپنے اشعار میں اس کا کہاں تک اہتمام کیا ہے، ذیل کے شعروں سے معلوم ہو سکتا ہے:۔

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

اس شعر میں الفاظ دیدۂ حیراں۔ تماشا۔ دیکھا کیا کی فصاحت قابل ذکر ہے، اس شعر میں ان سے زیادہ موزوں الفاظ کا اجماع مشکل ہے۔ یا اس مضمون یا ان معانی کو دوسرے الفاظ میں ڈھالنے سے یہ خوبی ساقط ہو جاتی ہے۔

(۲)

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

اس شعر کے الفاظ خط کشیدہ کو معیار مذکورہ پر جانچ کر دیکھئے۔

(۳)

تلخ کامی پر مجھے، تجکو لب شیریں پہ ناز
آمرے جادو سے اعجاز مسیحائی ملا

اس شعر میں الفاظ تلخ کامی - لب شیریں - جادو - اعجاز مسیحائی کے کرشمے دیکھئے۔

(۴)

ہلجاتے ہی اغیار نکل آتے ہیں باہر
زنجیر در یار ہے یار سلسلہ اپنا

اس شعر میں لفظ سلسلہ نے شعر کو شعر بنا دیا ہے۔

معانی اور شعر صبح الاعشیٰ میں ہے کہ "معانی" کا وجود الفاظ کے لئے ایسا ہے جیسا کہ جسم کے لئے لباس ہوتا ہے جس طرح جسم کپڑے کا تابع ہوتا ہے اسی طرح الفاظ معانی کے تابع ہوتے ہیں۔ صاحب بلاغت کو الفاظ سے زیادہ معانی کے اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔

معانی کی چند صورتیں ہوتی ہیں:-

۱- مستقیم حسن ـــــ یہ صورت وہ ہوتی ہے کہ اپنی صحت پر خود دلالت کرتی ہے۔ اسکی مثال عربی میں رایت زیداً ہے اور اردو میں "مینے زید کو دیکھا" ہے، اس قسم کے اہتمام کا نام "سحر حلال" ہے

۲- مستقیم قبیح ہے، اس کی مثال عربی میں "زیداً رایت" "زید کو دیکھا میں نے" اس کا دوسرا نام تعقید ہے ابن اثیر نے مثل السائر میں اس کا نام مغالطۂ معنویہ رکھا ہے۔

۳- مستقیم کاذب ـــــ اس کی مثال "حملت الجبل" "مینے پہاڑ اٹھالیا حقیقتاً غلط ہے لیکن اپنے موقع پر مبالغہ موزوں ہے۔

۴- مستقیم محال ـــــ ان باتوں کا ذکر جو عقلاً اور عادۃً محال ہوں۔ اس کا دوسرا نام غلو ہے۔ یہ بھی اپنے موقع پر مستحسن اور موزوں ہے۔ بشرطیکہ شاعر کا دماغ صحیح ہو اور اس میں کافی تمیز ہو، ورنہ معیوب ہے مثلاً اردو کا یہ شعر:- ؎

ایک دن رونے جو بیٹھا میں برائے امتحاں
سو سمندر، ساٹھ نالے، کتنے دریا بہہ گئے

۵۔ مستقیم غلط۔ اس کی مثال عربی میں یہ ہے کہ کوئی کہے "ضربنی زیدٌ" مجھ کو زید نے مارا، لیکن منشا ہو "ضربت زیداً" میں نے زید کو مارا، یہ بھی اپنے موقع پر درست ہوتا ہے بشرطیکہ شاعر اس موقعہ کو سمجھے۔

"مومن" نے ان اقسام کو جس طرح پیش نظر رکھا ہے انکی مثالیں دیکھ لیجئے:۔

مثال اول:۔ ؎

اس کوچہ کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آہ پر نکھا سا جھل گیا

اس شعر میں "سلاست" کی خوبی جہانتک ہے ارباب نظر پر مخفی نہیں۔

مثال دوم:۔ ؎

ایسی لذّت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینہ میں اسکا کوئی پیکاں ہوگا

اس شعر میں تعقید ضرور ہے لیکن "معیوب" نہیں، اہل فن سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار بہت کم بلکہ الشاذ کالمعدوم ہیں لیکن ان کا "عیب" "مومن" نے اپنی حکمت سے نکال دیا ہے۔

مثال سوم:۔ ؎

مر گئے اس کے لب جاں بخش پر
ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

اس شعر کا کذب "صدق" استعارہ و تشبیہ کے انداز رکھتا ہے، شاعر کا یہ کمال قابل ذکر ہے۔

مثال چہارم:۔ ؎

یہ مشتِ پرِ سوختہ پھونکیں گے قفس کو
تو ساتھ کسی کے ہمیں صیّاد نہ کر بند

"مومن" کے اس محال میں امکان کی بیساختگی دیکھئے۔

مثال پنجم:۔ ؎

نام وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب
کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں

لفظ "وصال" سے کذب میں صدق کا جلوہ موجود ہے، مومن نے اس قسم کا کمال اپنے دیوان میں اکثر جگہ دکھایا ہے۔

ترتیب اور شعر

اہتمام الفاظ و معانی سے زیادہ "ترتیب" کا خیال شعر کو بہتر اور شاعر کے کمال کو ظاہر کرتا ہے، جو شاعر جس قدر صاحب کمال ہوتا ہے، اسی قدر اس کے اشعار کی ترتیب بہتر ہوتی ہے۔

فصیح اور بلیغ الفاظ استعمال بھی کئے جائیں لیکن انکی ترتیب درست نہو تو ان کی فصاحت اور بلاغت بیکار ہوتی ہے۔ مفرد الفاظ عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن الفاظ ترتیب اور ترکیب سے دلکش اور دلگداز بن جاتے ہیں۔

ائمہ معانی و بیان کی رائے ہے کہ قرآن حکیم اپنی ترتیب الفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے۔

آیات:۔ وقیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر واستوت علی الجودی سنکر ایک عرب نے اس کی فصاحت و بلاغت پر سجدہ کیا تھا، حالانکہ الفاظ ارض۔ سماء۔ امر۔ ماء وہی ہیں جو روزانہ بولے جاتے ہیں۔ لیکن ترتیب میں آکر معجزہ بن گئے۔

ترتیب میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ضعفِ تالیف نہو، مثلاً "ضرب غلامہ زیداً" (مارا اس کے غلام نے زید کو) اسمیں ضعفِ تالیف ہے۔

۲۔ تعقید نہ ہو۔ (اسکی مثال بیان ہو چکی ہے)

۳۔ تنافر کلمات نہ ہو مثلاً (ولیس قرب قبر حرب قبر) اسکی دوسری مثال آ چکی ہے۔

شمس الدین محمد بن قیس رازی نے ان خصوصیات پر ایک فیصلہ کن محقق مضمون لکھا ہے، اسکا خلاصہ دیکھئے اور اس معیار پر "مومن" کو جانچئے۔

"کوئی شخص اس وقت تک شاعر کہے جانے کا مستحق نہیں جب تک ادوات شعر سے واقف نہو۔ کلمات صحیح، الفاظ شیریں، عبارات بلیغ، معانی لطیف سے اپنے شعر کو آراستہ کرنا نہ جانتا ہو، وزن مناسب، ردیف اور قافیہ کی خوبی اور موزونیت سے آگاہ نہ ہو"

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ :۔

شاعر کو اس جوہری کے مانند ہونا چاہئے، جو جذب نظر خریدار ان کے لئے اپنے جواہرات کو مناسب اور موزوں مواقع پر رکھتا ہے، شاعر کو بھی شعر میں مناسب لفاظ کو موزوں جگہ رکھکر اپنے صحت مذاق کا ثبوت دینا چاہئے۔

اس موضوع پر نہایت شرح و بسط کیساتھ جمیع اصناف پر اس کتاب میں لطیف بحث ہے، اس جگہ صرف اسی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا گیا۔

"مومن" دنیائے شاعری میں میر، کے بعد پہلے شخص ہیں جو الفاظ کو شعر میں نگینے کی طرح جڑتے ہیں اور اس فن میں موزونیت اور مناسبت کا ایسا کمال دکھاتے ہیں جو نظروں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

اگر اس خصوصیت کا اضافہ کر لیجئے کہ تمام اصناف معانی و بیان سے اپنے پورے دیوان کو سجایا ہے تو ان کی اس قدرت میں ان کا شریک کوئی شاعر نہیں۔

پہلے بتایا گیا ہے، کہ "شاعر" اپنے فضل وکمال، طبیعت، وقت، فضا، گرد وپیش، رنگِ زمانہ سے متاثر ہوتا ہے، اور وقت و زمانہ شاعر کو متاثر کر کے اپنی زبان بنالیتا ہے۔ اس لئے شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ اس کی زبان نہیں ہوتی بلکہ زمانے کی۔ ہومر اپنے وقت کے یونانیوں کی زبان تھا اور "ڈینٹے" اور "ملٹن" کا بھی یہی حال تھا

حکیم "مومن" بھی اپنے وقت اور زمانے کے واقعات اور فضا سے متاثر ہوئے ہیں، لیکن اپنی خودداری کے حدود سے آگے نہیں بڑھے، اور شعراء کی طرح زمانے نے ان سے بھی موافقت نہیں کی ہے لیکن وہ اس سے پریشان اور مضطرب ہوکر متانت سے کبھی آگے نہیں بڑھے، ضروریات نے ان کو بھی مجبور کیا ہے، لیکن کبھی اپنے اشعار کے موتیوں کو بازار میں لے کر نہیں گئے۔

باقی ———— باقی

"کیفی چریاکوٹی"

نوٹس

ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے مطبوعات

ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی و اقتصادی حالات

از علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ایم۔ سی۔ جی۔ ای

مجلد	۴ عہ
غیر مجلد	عہ

زیر طبع

(۱) مغلوں سے پہلے عرب ہند کے تعلقات (از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر (از مولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنہ وسطےٰ کا ہندوستانی تمدن (از رائے بہادر مہامہوپادھیا گوری شنکر ہیراچند صاحب اوجھا)

(۴) ہندی شاعری (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سکریٹری ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد

گناہ کی گٹھری

(فسانہ)

اسکا پورا نام بسنت رام تھا، لیکن گاؤں کے سب لوگ اس کو بسنتا کہتے تھے۔ چچا۔ چچی کے سوا اس دنیا میں بسنتا کا کوئی عزیز اور نہ تھا۔ پھر بھی گاؤں والوں نے اس کو اپنا بنا لیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بسنتا گاؤں والوں کا تو کام کر دیتا تھا لیکن اپنے گھر کی وہ کوئی پرواہ بھی نہ کرتا تھا۔ گاؤں بھر کے بیگار کرنے میں بسنتا کا خوب جی لگتا تھا وہ کھیتی باڑی کے کام میں خوب ہوشیار تھا لیکن اس سے اس کے چچا کو کوئی مدد نہ ملتی تھی، بسنتا کو گھر کے کام میں لگانے کے لئے اس کے چچا کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ ادھر ادھر کی بیگار کر کے جب بسنتا اپنے گھر میں گھستا اور ہنس ہنس کر اپنی چچی سے کھانا مانگتا تو وہ بہت خفا ہوتی۔

بسنتا کے سرپرست صرف بسنتا ہی پر نہیں خفا ہوتے بلکہ وہ اپنے پڑوسیوں کو بھی دو چار الٹی سیدھی سنانے سے باز نہ آتے تھے، خصوصاً جگوا کو تو وہ اٹھتے بیٹھتے گالیاں دیتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جگوا ہی نے بسنتا کو کچھ "دوا دارو" کھلا کر اپنے بس میں کر لیا ہے۔

بوڑھا جگنتا تھ (جگوا) ذات کا مالی تھا اس کے پاس دو چار بیگھے موروثی کاشتکاری تھی، اسی میں اس کی بخوبی بسر اوقات ہو جاتی تھی گھر میں وہ اور اس کی نواسی "سکھیا" کے سوا اور کوئی نہ رہتا تھا، اس کا ایک ناتی "چنوا" جوان ہوتے ہوئے بھی اپنے بوڑھے نانا کی کوئی مدد نہ کرتا تھا، بلکہ وہ ادھر ادھر آوارہ مزاج لڑکوں کے ساتھ مارا مارا پھرا کرتا، جب کبھی اس کو خرچ کی ضرورت ہوتی تو وہ دو چار دن کے لئے گھر آکر اپنے نانا کو تنگ کیا کرتا۔

(۲)

برکھا رت اور دوپہر کا وقت تھا، رم جھم رم جھم پانی برس رہا تھا، بوڑھا جگوا اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا ہوا دھان کوٹ رہا تھا اور اس کے قریب ہی سکھیا کوٹے ہوئے دھان کو پھٹک رہی تھی۔ سکھیا کی عمر زیادہ سے زیادہ بارہ برس کی رہی ہوگی پھر بھی وہ گھر کے کام کاج میں بڑی ہوشیار تھی۔ پانی برستے ہی میں بسنتا نے جگوا کو آکر پرنام کیا اور سکھیا سے کہا۔ "سکھیا! "کلی" کہاں ہے، ذرا اٹھا تو لا میں نانا کو تمبا کو پلا دوں"

بسنت، جگو کو نانا کہتا تھا، دونوں حقہ پینے کے بڑے شوقین تھے۔ بسنتا چلم پر چلم بھرے جاتا اور اس کے بدلے میں بوڑھا جگو اپنی جوانی کے واقعات اور غدر کے قصے سنایا کرتا، اس وجہ سے ان دونوں میں بڑی دوستی تھی۔

سکھیا نے "کلی" لا کر بسنتا کو دیدی، چلم میں تمبا کو جما اور آگ رکھ کر بسنتا نے "کلی" جگو کی طرف بڑھا کر کہا "لو نانا تم

ذرا دم لگالو میں دھان کوٹے دیتا ہوں "

سکھیا نے بسنتا کی طرف غور سے دیکھا اور کہا " بھیا کیا آج تم نے روٹی نہیں کھائی ؟"

سکھیا کے اس سوال سے بسنتا سٹ پٹا گیا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا لیکن اس کے پژمردہ چہرہ سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سکھیا کا خیال درست ہے۔ جگو نے حقہ کا ایک کش لیکر کہا " ارے !! اب تک نہیں کھایا۔ سکھیا تو کیسے جان گئی میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں اب مجھے کچھ نہیں سوجھتا " بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے

سکھیا اسی وقت بسنتا کے لئے کھانا لائی، بسنتا نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ " سکھیا تو نے ہی یہ کھانا پکایا ہے "

سکھیا نے لجا کر جواب دیا۔ " ہاں "

" واہ ! واہ !! تو تو بڑا مزیدار کھانا پکاتی ہے "

" معلوم ہو گیا تم ہنسی میں ایسا کہہ رہے ہو۔ ترکاری خراب ہوگی "

" تیری قسم ترکاری تو بہت اچھی ہے۔ میری " چاچی " بھی اس سے اچھا نہیں پکا سکتی "

" کیا " چاچی " بہت اچھا کھانا پکاتی ہے ؟ "

" لیکن تجھ سے اچھا نہیں "

" چاچی " کا ذکر ہوتے ہی سکھیا نے پوچھا۔ " بھیا یہ تو بتاؤ آج تم نے گھر میں کھانا کیوں نہیں کھایا، کیا چاچی کچھ خفا تھیں ؟ "

بسنتا نے اداس ہو کر جواب دیا۔ " چاچا " نے کھیت پر جانے کو کہا تھا، میں نہیں گیا اسی سے " چاچی " بہت خفا ہو گئیں "

" تم نے " چاچی " اور " چاچا " کا کہنا کیوں نہیں مانا ؟ "

" میں کھیت پر جانے کے لئے تیار تھا لیکن اسی وقت مودا کے گھر سے ایک آدمی مجھے بلانے آیا اور میں کھیت پر نہ جا سکا "

" چاچا " کا کام چھوڑ کر تم مودا، کے یہاں کیوں گئے "

" مودا کے یہاں میرا جانا بہت ضروری تھا کیونکہ اس کے یہاں کے سب لوگ بخار میں پڑے ہیں، کوئی پانی دینے والا بھی نہیں " چاچا " کا کام کرنے والے بہت ہیں، میرے نہ جانے سے ان کا کچھ حرج نہیں ہو سکتا "

سکھیا اور بسنتا کی یہ باتیں جگو بھی بڑے دھیان سے سن رہا تھا، اس نے دل میں کچھ سوچکر ایک ٹھنڈی سانس لی وہ بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا اور جب بسنتا کھانا کھا کر اس کے پاس پہونچا تو اس نے کہا۔ " بیٹا ایک بات کہوں مانو گے "

" بابا تمہاری بات نہ مانوں گا تو پھر کس کی مانوں گا "

بوڑھے نے کلی بسنتا کی طرف بڑھا کر کہا۔ " اچھا سن۔" بوڑھے کو کھانسی آ گئی، اس نے کھنکھار کر پھر کہا۔ " بسنتا تو اپنا دل نہ چھوٹا کر میرے ہی گھر میں رہا کر۔ میں اپنی سکھیا سے تیرا بیاہ کر دوں گا اور میرے پاس جو دو چار بیگھے زمین ہے وہ بھی تیرے نام لکھ دوں گا مٹھی بھر اناج کے لئے چچا کی گالیاں کیوں سنتا ہے "

بسنتا نے دانتوں سے اپنی زبان دبا کر کہا:- "نانا یہ تم کیسی بات کہہ رہے ہو، تمہارا جو کچھ ہے وہ سب "چنوا" کا ہے کھیت مکان سب پر اسی کا حق ہے، میں اس کا حق چھین کر نرک میں نہ جاؤں گا۔ رام! رام!! یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا بیاہ کا معاملہ تو میں اس سے دور بھاگتا ہوں، میں بیاہ کروں گا ہی نہیں"۔

بوڑھے نے مایوس ہو کر کہا۔ "یہ کیوں؟"

بسنتا نے دھان کوٹتے ہوئے جواب دیا۔ "نانا تم بوڑھے ہو کر بھی اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے، بات یہ ہے کہ بیاہ ہوتے ہی میں تم کو پرایا سمجھنے لگوں گا۔ یہی میرے چچا پہلے مجھ کو بہت پیار کرتے تھے، لیکن جب سے ان کا بیاہ ہوا، اور "چاچی" آئیں تب سے ——— اور کیا کہوں ——— کچھ ڈر نہ ہو تو مجھے کچا ہی کھا جائیں۔"

(۳)

اسی دن شام کو "چنوا" اپنے نانا کے یہاں آیا، وہ گانجہ پیئے ہوئے تھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، کرپارام بنیا پتہ لگا کر "چنوا" سے اپنے روپیوں کا تقاضا کرنے آیا، پانچ برس ہوئے "چنوا" نے اس سے کچھ روپئے ادھار لئے تھے، لیکن ابتک دینے کا نام نہ لیتا تھا۔ کرپارام آج ذرا تیز ہو کر آیا تھا، اُدھر "چنوا" بھی گانجہ کے نشہ میں خوب گرم ہو رہا تھا، کرپارام نے سختی کی تو چنوا نے بگڑ کر کہا:-

"ابے! بجّو کی سی آنکھیں کیوں نکالتا ہے، تیرے ایسے بنیوں کو میں سمجھتا ہی کیا ہوں، یہاں سے اپنا منھ کالا کر، میں روپئے نہیں دوں گا، جا نالش کر دے۔"

کرپارام نے چنوا کو یونہی روپئے دیدیئے تھے، کچھ "لکھا پڑھی" نہ کی تھی نالش کرنے سے اس کو کچھ فائدہ حاصل ہونے کی امید نہ تھی۔ اس نے کہا:- "سارا غنڈہ پن نکال دوں گا، دے گا کیسے نہیں، کیا مفت کے روپئے تھے۔ تو کیا میں تو تیرے باپ سے لیلوں گا۔"

نشہ میں چور "چنوا" نے اس زور کی لات کرپارام کے جگر پر ماری کہ وہ دھم سے زمین پر بے سُدھ ہو کر گر پڑا، اس کے گرتے ہی چنوا کا نشہ ہرن ہو گیا، دوڑ کر پانی لایا اور کرپارام کے منھ پر چھڑکنے لگا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، اس کے قریب ہی سُکھیا کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔ اور بوڑھا جگوا بخار میں کراہ رہا تھا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی جب کرپارام کو ہوش نہ آیا تو چنوا کا ڈر کے مارے برا حال ہو گیا، اس نے بہت آہستہ سے سکھیا سے کہا:- "ہائے اب کیا ہوگا؟ یہ تو مر گیا" خوش قسمتی سے چنوا کا مکان بستی کے ایک سرے پر تھا اس کے قریب اور کوئی مکان نہ تھا، ورنہ چنوا اور کرپارام کی گالی گلوج پر بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ بہن اور بھائی جب دونوں ناامید ہو کر دعائیں مانگ رہے تھے تو انہیں کچھ آہٹ معلوم ہوئی، آواز پہچانی ہوئی معلوم ہوئی، کسی نے کہا:- "اری سُکھیا کیا اب تک گھر میں دیا نہیں جلا، نانا کو بخار چڑھ آیا کیا؟" سُکھیا نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر کہا۔ "بھیا شور نہ مچاؤ آہستہ آہستہ بولو بہت بڑی مصیبت آگئی۔ بسنتا نے گھبرا کے کہا:- "کیسی مصیبت؟ باہر کون لمبا لمبا پڑا ہے"۔

سُکھیا نے بسنتا کے منھ پر ہاتھ رکھکر کہا:- "چپ! چپ!!" یہ کہکر سکھیا نے چپکے چپکے سب حال کہدیا۔ چنوا نے بسنتا کے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور کہا:- "بسنتا اب تو ہی بچا"

سکھیا نے بھی سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "بھیا جس طرح سے بھی ہو میرے بھائی کی جان بچالو"
بسنتا نے کچھ دیر سوچ کر کہا: "ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں سب ٹھیک کرلوں گا، اچھا یہ تو بتاؤ کہ گھر میں کوئی بوری یا تھیلا ہے؟"
سکھیا نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا: "ہاں ہے"
"اچھا تو جلدی لے آ"

بسنتا اور چنوا نے مل کر کرپارام کی لاش کو بوری میں بند کیا اور یہ طے پایا کہ جب سب لوگ سو جائیں اور گاؤں میں سناٹا ہو جائے تو بسنتا اس بوری کو ندی میں ڈال آئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آدھی رات کے وقت بسنتا کرپارام کی لاش کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ندی کی طرف چل پڑا، اس کے جاتے ہی چنوا خود کو اپنے دل میں پاپی سمجھنے لگا۔

بسنتا کہہ گیا تھا کہ وہ لاش کو ندی میں ڈال کر رات ہی کو "چنوا" کے گھر آجائے گا، مگر دن نکل آیا اور وہ واپس نہ ہوا۔ "چنوا" کو بسنتا سے زیادہ اپنی فکر تھی کہ اگر کہیں بسنتا گرفتار ہوا تو "چنوا" کی خیر نہیں۔ دس بجے دن کے جب اس کو پتہ چلا کہ پولیس نے بسنتا کو کرپارام کے قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا تو "چنوا" کا منھ فق ہو گیا، وہ سوچنے لگا: "ایک دن مرنا تو ہے ہی پھر اپنی جان کے لئے بسنتا کو کیوں پھنساؤں ـــــ تھانہ میں چلکر سچی بات کہہ دوں ـــــ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟" یہ سوچکر چنوا کانپ اٹھا۔ بوڑھے جگو کو تو یقین نہ آتا تھا کہ بسنتا نے کرپارام کا خون کیا ہوگا، سکھیا کی عجیب حالت تھی۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، بھائی کی محبت میں وہ اپنے نانا سے بھی سچی بات نہ کہہ سکی۔ ادھر جب اُسے ناکردہ گناہ بسنتا کا دھیان آتا تو وہ کلیجہ تھام کر رہ جاتی۔ "چنوا" اب گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا، وہ دن بھر ایک گوشہ میں چپ چاپ پڑا کچھ سوچا کرتا۔ جس دن بسنتا کا مقدمہ عدالت میں پیش ہونے والا تھا، اس دن "چنوا" کی حالت غیر ہو گئی۔ سکھیا نے اس کا حال پریشان دیکھ کر کہا "آج تمہارا منھ کیوں اترا ہوا ہے خیریت تو ہے؟"
چنوا نے بہن کی طرف مجرمانہ نظر سے دیکھ کر کہا۔ "مجھے کیا ہو گیا ہے؟ ـــــ تو کیا سمجھ سکتی ہے سکھیا!"

(۴)

جس دن بسنتا کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو "چنوا" بھی وہاں موجود تھا، اس کو دیکھ کر بسنتا کا دل دھڑکنے لگا، ابھی مقدمہ کی کارروائی شروع نہ ہوئی تھی کہ چنوا ایک بارگی مجسٹریٹ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: "حضور! بسنتا بڑا ایڈ ھب آدمی ہے یہ میرے گناہ کی گٹھڑی چرا لایا ہے۔ اصلی مجرم میں ہوں، کرپارام مجھ سے اپنے روپیوں کا تقاضا کرنے آیا تھا اس نے مجھے گالی گلوچ کی میں گانجہ پئے بیٹھا تھا مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے پیٹ پر ایک لات جمادی اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، میں نے اس کے منھ پر پانی چھڑکا کہ اسے ہوش آجائے لیکن اسکو تو مجھے سزا دلانا تھا جان بوجھ کر مر گیا، اس کے بعد یہ چور بسنتا میرے گھر آیا اور اس نے کہا کہ میں لاش کو ندی میں پھینک آؤں گا، میں راضی ہو گیا، اور میں نے لاش کو بوری میں بند کر کے اس کی پیٹھ پر باندھ دی۔ حضور اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا یہ بسنتا بڑا ایڈ ھب آدمی ہے مجھ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ کیوں بسنتا ٹھیک ہے نا؟" یہ کہکر چنوا نے بسنتا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

مقدمہ پھر نئے سرے سے شروع ہوا "چنوا" سشن سپرد کیا گیا اور بسنتا کو اخفائے جرم کی پاداش میں ۱½ سال قید سخت کی سزا ملی
سشن میں مقدمہ خراب ہو گیا اور چنوا سزائے موت سے بچ گیا۔

۱½ سال کی سزا کاٹ کر جب بسنتا رہا ہوا تو وہ سیدھا اپنے جگوا نانا کے پاس پہونچا، چنوا کے متعلق اس نے اس سے کچھ نہ دریافت کیا، کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ چنوا کو ضرور پھانسی ہو گئی ہوگی۔

بسنتا نے منہ لٹکا کر غمگین لہجہ میں جگوا سے کہا: "نانا! اس کی تقدیر!!"

بوڑھے نے جواب دیا: "ہاں اس نے جوانمردوں کا سا کام کیا ہے، مگر تو تو بتا کر تو نے مفت میں کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تجھے اتنی تکلیف اٹھانے کی بالکل ضرورت نہ تھی"

بسنتا نے روتے ہوئے کہا: "نہ میری ماں ہے نہ باپ۔ مر جاؤں تو کوئی رونے والا بھی نہیں ہے، اگر مجھے پھانسی ہو جاتی تو بہت اچھا ہوتا ——"

بوڑھے نے بسنتا کو جھڑک کر کہا: — "جب تیرا ایسا خیال ہے تو آج سے مجھے "نانا" مت کہنا۔ کیا ہم لوگ تیرے کوئی نہیں کیوں رے بسنتا؟"

سکھیا چلم بھر رہی تھی، اس نے ہنس کی طرح گردن موڑی اور بسنتا پر تیز نگاہ سے حملہ کر کے بولی "اب چپ چاپ کیوں کھڑے ہو جواب کیوں نہیں دیتے کیا ہم تمہارے کوئی نہیں ہیں؟"

بسنتا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں وہ نانا کے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ بوڑھے نے بسنتا کو اپنے کلیجہ سے لگا لیا، ایک ہفتہ کے اندر ہی اچھی ساعت میں بوڑھے جگوا نے سکھیا کے ساتھ بسنتا کا بیاہ کر دیا، بسنتا پھر شادی کرنے سے انکار نہ کر سکا۔

(ماخوذ از بنگالی)

اعظم کریوی

تصویر زیب النساء بیگم

جو دربار عالمگیری کی ایک بے مثل مصورہ کی قلمکاری ہے، اور بعد تنقید و تحقیق بسیار اس کی صحت کی توثیق ہو چکی ہے، یہ تصویر تین خوشنما رنگ سے تیار کی گئی ہے اور ۲۸ء کے نگار میں شایع ہو چکی ہے قیمت مع محصول .... (۸؍)

تصویر رقاصہ

بنگال کے مشہور نقاش و مصور مزمدار کی ایک بہترین تصویر جو حضرت نیاز کے مشہور مضمون رقاصہ کے گجراتی ترجمہ کے ساتھ کلکتہ کے مشہور گجراتی رسالہ نوجیون میں شایع ہوئی تھی
قیمت .... (۴؍)

"منیجر نگار لکھنؤ"

مسلمانانِ ہند کے پستی کے اسباب

اور

مذہب و قوم کی غلط تعبیر

حکومت ہند کی ایجوکیشنل کمشنر کی رپورٹ سنہ ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۷ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانان ہند میں تعلیم کی پستی کے خاص اسباب مندرجہ ذیل ہیں:۔

"دیگر اقوام کے لڑکوں کی نسبت مسلمان مذہبی قیود کے باعث تعلیم میں اکثر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انکو نہ صرف، برس کے عرصہ تک محض قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے بلکہ اس کے بعد چند سال انکو اپنے صوبجات کی مروجہ زبانیں سیکھنے میں صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح ان کو چھوٹی عمر میں تین زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ مذہبی زبان یعنی عربی یا فارسی اور بعض اوقات دونوں، اردو زبان اور اس کے بعد ضلع کی مروجہ زبان جو کچھ بھی ہو۔ اور اگر وہ آگے تعلیم جاری رکھتے ہیں تو انکو زبان انگریزی بھی پڑھنی ہوتی ہے۔ گویا چار بلکہ پانچ زبانوں کیطرف پوری توجہ کرنی پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں کو کافی سہولتیں حاصل ہیں۔ اول تو انکو اپنی آبائی زبان یعنے سنسکرت سیکھنی نہیں پڑتی۔ دوم ضلع کی زبان وہ آغوش مادری میں سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہوش سنبھالنے پر انکو صرف دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں، ایک ورنیکولر دوسری انگریزی۔ ان زبانوں کو بھی یہ ہندو لڑکے اس وجہ سے نہیں سیکھتے کہ یہ ان کی زندگی میں کارآمد ثابت ہو، بلکہ وہ دماغ اور حافظہ کی تربیت کیلئے سیکھتے ہیں غالباً ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابیں سنسکرت ہی میں ہیں، لیکن ان کے لئے سنسکرت پڑھنا لازمی امر نہیں ہے۔ انکے مذہبی کتب کا زیادہ حصہ ورنیکولر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہندو زیادہ تر انہی ترجموں سے ضروری واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ پھر کیوں نہ مسلمان طلبہ کو بھی، مذہبی تعلیم عام فہم زبان میں دی جائے۔ اب مسلمانان ہند کو اپنی تعلیمی کانفرنسوں میں اس سوال پر ضرور غور کرنا چاہیئے۔ لیکن جس قدر توجہ اس اہم سوال کی جانب کرنی چاہیئے اس قدر ابتک نہیں کی گئی۔ لیکن باوجود ان تمام رکاوٹوں اور پابندیوں کے مسلم طلبہ کی تعداد میں سنہ ۱۹۱۷ء و سنہ ۱۹۲۲ء کے درمیان پیشتر کی بہ نسبت ۱۴۲۰۰۰ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور سنہ ۱۹۲۲ء و سنہ ۱۹۲۷ء کے درمیان ان کی تعداد میں ۸۵۰۰۰ کی زیادتی ہوئی۔ اگرچہ مسلمان لڑکوں کو قرآن شریف کی تعلیم دینا از حد مفید ہے۔ لیکن بلا مطلب و معانی سمجھائے ہوئے رٹانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ انکو مذہبی باتیں عام فہم زبان میں سمجھا دی جائیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کل اضافہ شدہ طلبہ کی تعداد میں ۳۰ فیصدی تعداد مسلمان لڑکوں کی ہے۔ صوبجات متحدہ میں پرائمری و سکنڈری اسکولوں میں تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کی تعداد میں صرف ۵۲۰۰۰ کا اضافہ ہوا ہے"۔۔۔۔۔۔

قابل غور امر یہ ہے کہ یہ مذہبی قیود "از ماست کہ بر ماست" تو نہیں۔ غالباً اس بات سے کسی ذی فہم کو انکار نہ ہوگا کہ اگر عموماً

ہندوستان وخصوصاً بنگال میں ہندو مسلمانوں کا تناسب سوائے جیل خانوں، قحبہ خانوں، غریب خانوں کے کہیں بھی آبادی کے لحاظ سے نہیں یا ہندوستان میں کسی علمی و سیاسی و تمدنی زندگی میں ہمارا کما ینبغی حصہ نہیں تو اس کی اصل وجہ ہماری تعلیمی پستی ہے۔ اور در حقیقت تعلیم کا فقدان ہی قومی زوال کی انتہا ہے۔ جس کا مظاہرہ افغانستان کے واقعات میں ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ پس تعلیمی پستی کا سبب بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہم دنیا میں یا تو ایک ایسے نرالے مذہب کے پابند ہیں جو ہمکو ترقی کے میدان میں جانے نہیں دیتا یا خود ہم نے اس مذہب کو نرالے طریقہ سے اختیار کیا ہے۔ اور وہی ہماری پستی کا سبب ہے۔

جنہوں نے فلسفہ مذہب کا مطالعہ [illegible] میں کیا ہے۔ ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ میرا مقصد اس کتاب کے لکھنے سے نہ یہ تھا کہ اصحابِ تقویٰ سے مبارز طلبی کی جائے۔ اور نہ یہ کہ اربابِ نظر و فلسفہ سے داد حاصل کی جائے۔ میرا مقصد سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا کہ میں اپنے ہم مذہب لوگوں کو ایکبار پھر اپنی موجودہ حالت پر جائزہ لینے کے لئے آمادہ کر سکوں۔ اور اس کے بعد ان سے اجازت اس بات کی لوں کہ اپنے مذہبی مطامحِ نظر میں زمانہ کے موافق ترمیم کر لیں۔ چونکہ دل مجروح و بے قرار تھا، اور میں نے اسلامی بدبختی کے شیطان کو پکڑ لیا تھا اس لئے گرما گرم الفاظ قلم سے نکلتے چلے گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک شخص اندھیری رات میں اپنے مکان کو جلتا ہوا دیکھ لے یا کسی نقب زن کو پکڑ لے تو اس وقت وہ اصطلاحی الفاظ کا دھیان نہیں کرتا اور حالت اضطراب میں نہ جانے کیا کیا زبان سے نکل جاتا ہے۔ تو مذہب و تمدن کا وہ شیطان کون ہے جو مسلمانوں کا رہزن ہے۔ کیا اس کی ضرورت ہے کہ قارئین کرام کو اپنی کتاب کے "مذہب اور قومیت" والے حصہ پر توجہ دلاؤں۔ یا میں پھر اس مضمون میں اس کا لب لباب پیش کروں، یا اب عملی کارروائی پر متوجہ ہوں۔ بہر حال ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے اس بات کو طے کر لیں کہ مسلمان کوئی قوم ہے یا ایک مذہب۔ اگر کوئی قوم ہے تو پھر ہندوستان و چین و جزائر بحر ہند و افریقہ وغیرہ میں ہماری درماندگی کا علاج بقراط کے بھی سمجھ میں نہ آ سکے گا۔ یہودی قوم ایک مختصر سی قوم ہے۔ مگر وہ بھی جب تک اپنی ہمسایہ قوموں سے گھل مل کر ایک نہ ہو گئی، ترقی کے زینے پر قدم نہ رکھ سکی۔ ہماری قوم تو ماشاء اللہ ایک خمس ربع مسکون کی آبادی کے لگ بھگ ہے۔ اور وہ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، انکو علیحدہ قومی حیثیت دے کر ترقی پر لگانا صرف انہیں ممالک میں ممکن ہو سکتا ہے، جہاں ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہوں، مگر جن ممالک میں ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہیں وہ قوم کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ باقی ۹/۱۰ حصہ دوسروں کے اختیار میں ہے۔ جہاں ہماری بے دست و پائی عیاں ہے۔ اور جہاں ہمارے پاس کوئی ایسے ذرائع نہیں جن سے ہم اپنی قوم کو مدارج ترقی پر پہونچا سکیں۔ پھر آئیے سب سے پہلے قومیت کو سمجھ لیں۔

قوم کی تعریف یہ ہے کہ انسان کی ایک جماعت۔ ایک زبان۔ ایک معاشرت۔ ایک قانون و شریعت۔ ایک روایت کی متبع ہو۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ وہ ایک مذہب بھی رکھے۔ قومیں عموماً اپنے ملکوں سے نسبت رکھتی ہیں۔ مگر بعض قومیں جن کا کوئی ملک نہیں ہوتا وہ بجائے ملک کے مذہب سے اپنی نسبت کرتی ہیں۔ جیسے یہود و پارسی۔ سکھ۔ جین۔ ہندو وغیرہ۔ اور جب مذہب کو قوم سے نسبت دیجاتی ہے تو اس کے معنے ظاہر ہیں کہ اپنے مذہب کے اندر وہ تمام خصوصیتیں پیدا کر لیتی ہے۔ جو قوم کے شرائط میں داخل ہے۔ مثلاً ایک ہی لباس۔ معاشرت۔ تمدن۔ زبان۔ روایت اور رفتہ رفتہ مذہب ان ساری باتوں پر حاوی ہو جاتا ہے، اگر ایسی قوم کسی ملک کی مالک ہوئی تو مذہب

کے اندر سیاست بھی داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اس قوم کا کوئی ملک نہیں تو سیاست کا جزو معطل ہو جاتا ہے۔ قومی مذاہب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس پر عمومیت کا اطلاق قائم نہیں رہتا۔ اور چونکہ قوم صرف ایک ہی قانون سے گھٹتی بڑھتی ہے۔ یعنی توالد و تناسل سے اس لئے مذہبی جماعت کا بڑھنا بھی موقوف ہو جاتا ہے الا توالد و تناسل کے اصول سے یا ایک غیر معمولی قوت جاذبہ سے یعنی وہ دوسری ہمسایہ قوموں کی روایت و زبان کو مٹانے پر قادر ہو اور اس کو اپنے میں جذب کرلے۔ اب مذہب اسلام کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے۔ سب سے پہلے مسلمانان عالم کا ایک مختصر خاکہ یہاں دے دینا چاہئے کہ وہ کس طرح دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور کتنی مختلف قوموں سے اس کی جماعت بنی ہے۔

۱۔ قوم عرب یا مستعرب۔ ۵۹ ملین ہ

یمنی ۲ ملین — حجازی ۱ ملین — شامی ۴ ملین — عراقی ۵ ملین — نجدی ۳ ملین — عمانی ۲ ملین۔ مصری ۱۵ ملین — بربری ۲۰ ملین — حضرمی ۲ ملین — عرب ماورائے ممالک عربیہ (افریقہ و امریکہ و جزائر) ۵ ملین

۲۔ قوم ترک۔ ۷۴ ملین

عثمانی ۱۴ ملین — ترکمان ۲ ملین — اوزبک ۶ ملین — تاجیک ۳ ملین — کرخیز ۵ ملین — باشکر ۴ ملین تاتار روس و قریم و قفقاس ۱۰ ملین — ۸۔ ترکان چین و یارقند ۲ ملین۔ ۹۔ ترک ماورائے ممالک بلقان مصر و شام وغیرہ ۱ ملین

۳۔ قوم عجم۔ ۴۲ ملین

ایرانی ۱۲ ملین — افغان ۷ ملین۔ کیرد ۴ ملین — بلوچ ۱ ملین — عجم ماورائے ممالک مثل قفقاس ہندوستان افریقہ وغیرہ ۱۷ ملین۔

۴۔ قوم ہند۔ ۶۹ ملین

پنجابی ۱۲ ملین — سندھی ۳ ملین — کشمیری ۲ ملین — بنگالی ۲۵ ملین — ہندوستانی ۱۷ ملین — دکنی ۱۷ ملین اورائے ہند (افریقہ و جزائر) ۱ ملین۔

۵۔ قوم چین۔ ۵۰ ملین

تنگان ۳۰ ملین — پانتھے دھونی ھونی ۱۸ ملین — ماورائے چین (ملایا۔ امریکہ) ۲ ملین

۶۔ قوم سلاو۔ ۱۰ ملین

۱۔ روس و پولینڈ ۴ ملین — بلقان ۶ ملین۔

۷۔ قوم یونان ۷½ ملین

البانوی ۱ ملین — اہل کریٹ و یونان و سمرنا ۶ ملین۔

۸۔ قوم ملایا ۴۲ ملین — سماترا ۱۰ ملین — جاوا ۲۸ ملین — ملکس و سیلبز ۲ ملین — ملاکا ۱ ملین — فلپائن ۱

دیاپوا، ۱ملین - بورنیو - ۲ملین ، ماورائے ملایا (جنوبی افریقہ - میڈگاسکر وغیرہ) ½ ملین -

۹- اقوام یورپ و امریکہ و اسٹریا، ۱ملین -

۱۰- اقوام افریقہ، ۵۰ ملین :-

حبشی ۳ ملین ــ سوڈانی ۴۵ ملین ـــ سواحلی ۲ ملین

تو اسلام اس وقت ۱۰، اقوام عظیم میں شایع ہے - کیا یہ سب ایک ہی قوم ہیں - اگر نہیں ہیں اور یقیناً نہیں ہیں تو ہم ہندوستانیوں میں کون طرۂ امتیاز ہے کہ وہ یہاں آکر ایک مسلمان کی قوم بن جائے - جتنے کہ بڑے سے بڑا جوشیلا مسلمان ہائے قوم وائے قوم کرتا ہے، تو اسکی اس کی مراد صرف اپنے ہم مذہب والوں سے ہوتی ہے - سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اسلام کو ہندوستان میں قوم بنانے کی بدعت کہاں سے نکلی - اور اس کے بعد ہم یہ دیکھینگے کہ قوم بننے کی رفتار کیسی ہے، آیا یہ قوم تیار ہو چکی ہے یا ابھی تیاری پر ہے - اور قوم بن کر وہ کہانتک قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئی - پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ اس قومیت نے کتنے موانع مذہب و معاشرت کے متعلق ہم میں پیدا کر دیئے ہیں - اور پھر اس غلط عقیدہ کے ازالہ کی صورت کیا ہے -

اسلام کو قومیت کا رنگ دینے کے جراثیم قرآن سے باہر فقہ اور حدیث میں ملتے ہیں - اور چونکہ مسلمانوں میں قرآن ایک ہوّا بنکر رہگیا ہے - جس کا چھونا تک مشکل ہے - نہ کہ اسکا پڑھنا اور سمجھنا، اس لئے ہمارے مذہب کا سارا دارومدار فقہ و حدیث پر ہے اور یہیں سے ہماری ساری خرابیوں کی ابتدا ہوتی ہے - بات یہ ہے کہ عرب کا قومی عروج ایک عرصہ تک اشاعت اسلام کا مرادف سمجھا جاتا رہا - عربوں کے مفتوحہ ممالک کے باہر اسلام کی اشاعت کا کبھی خیال پیدا نہیں ہوا - اور مفتوحہ ممالک میں غیر عربی قوم میں اسلام محض معاشرتی سیاسی جاذبیت کا نتیجہ رہا - فقہائے اسلام کے نزدیک دنیا دو حصوں میں منقسم ہے - ایک دار الاسلام، اور دوسری دار الحرب - اور جب فقہا کا یہ قول ہے کہ دار الحرب میں اشاعت اسلام کی سعی یہانتک جائز نہیں تو ہمکو خواہ مخواہ اس بات کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ مذہب اسلام واقعی ایک عربی پولٹیکل مذہب تھا - اور اسپر عمومیت کا اطلاق کبھی نہیں ہوا - اور اس لئے اس کی اشاعت اسلامی سلطنت سے باہر نہیں کی گئی اور نہ ہونا چاہئے - دار الاسلام کے اندر قومی خصوصیت کے سارے اجزا طبعی طور سے مذہب کے اندر ہی رہے، اور جس کو ہم معاشرت، شریعت، سیاست سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کو مذہب سے علیحدہ جگہ دیتے ہیں وہ محض مذہب کی شاخیں ہیں مگر یہ حالت دیر تک قایم نہ رہی اس لئے کہ یہ صورتیں قرآن کی عمومیت اور تبلیغ کے منشا کے خلاف تھیں - اور اس کو سوائے خدائی مصلحت کے اور کیا کہا جائے، کہ عربوں سے سلطنت چھین لیگئی یہ ایک ایسا تازیانہ غیبی تھا کہ اب مسلمان اگر ہوش سنبھالتے تو قرآن کے مبلغ بنکر دنیا کی قوموں میں نکل جاتے اور پیغام الٰہی کو دنیا کے کونے کونے میں پہونچا دیتے - مغلوں کا زمانہ شروع ہوتا تھا کہ گویا عربوں کو یہ پرانا عہد یاد پڑ گیا اور یا کم سے کم ان کے موالی تبلیغ اسلام کیطرف متوجہ ہوئے - اور اس زمانے سے لیکر ابتک اور خصوصاً چودھویں صدی عیسوی میں تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی جماعت خود فاتح تاتاریوں میں جزائر اوقیانوس - افریقہ - روس و چین کے اندر پیدا ہو گئی - حسن اتفاق یا سوئے اتفاق سے غیر عربی جماعتیں جو اسلام لائیں وہ حکمراں سے لیکر رعایا تک سب کی سب ایمان لائیں - ایسا نہوا کہ کسی ملک میں تھوڑے سے اصلی باشندے مسلمان ہو گئے ہوں - اور باقی غیر مسلم

اور جہاں ایسی حالت پیدا ہوئی، جیسے ساحل چین و ملیبار میں وہاں وہ غیر ملکی اور علیحدہ قومی حیثیت رکھتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی ضرورت ابھی تک محسوس نہ ہوئی کہ مذہب کو معاشرت و معالات سیاست سے جدا کیا جائے۔ یعنی مختصر یہ کہ فقہ و اجتہاد کا عروج باقی رہا، اور مذہب و قوم میں کوئی مابہ الامتیاز بات پیدا نہ ہوئی۔ انیسویں صدی شروع ہوتے ہی مسلمانوں کی سلطنت پر زوال آنا شروع ہوا، ہندوستان اور ملایا اور افریقہ میں اہل فرنگ نے قبضہ کیا۔ تاتاریوں کی سلطنت پر روس کا قبضہ ہوگیا۔ ایک طرف اگر یہ ہوا تو دوسری طرف چین کے آبادی میں اسلام نے معتد بہ اضافہ کرلیا۔ یہ غالباً ایسی خدائی مصلحت کے ماتحت شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت غیر مذہب والوں کی حکومت میں آگئی۔ اس حالت کو ڈیڑھ سے برس سے زیادہ نہیں ہوا اور یقیناً یہ بہت تھوڑا زمانہ ہے کہ مسلمان غور کرسکیں کہ ایسی حالت میں انکو کیا کرنا چاہئے۔ وہ ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھوئے بیٹھے ہوئے ہیں اور چونکہ ابھی تک ان پر دیسی حکومت کا خمار باقی ہے جو مذہب اور سیاست کو یکساں سمجھ رہا تھا وہ اپنی قوم اپنے مذہب ہی کو سمجھ رہے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ شاید یہ محسوس کر رہے ہیں کہ سیاست پر ان کا قابو نہیں رہا۔ اس کا حصہ مذہب سے نکالنا ہی پڑے گا۔ معاشرت کے بعض قوانین کو جس میں غیر ملکی حکومت دخل دینا نہیں چاہتی، مذہبی جیسند سمجھ لیا گیا۔ یعنی وراثت، شادی طلاق کے معاملات میں جسکو پرسنل لا یعنی شخصی قانون کے نام سے قایم رکھا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت جب اسلام نام ہے صرف عمومی مذہب کا تو یہ شخصی قانون "مہمل" سی بات ہے۔ اور وہی مثل ہے کہ "سارا ہاتھی نکل گیا اور دم پھنس گئی ہے"۔ یعنی اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آج ایک جرمن۔ یا فرانسیسی یا انگریز یا ایک ہندو اسلام قبول کرے تو وہ اپنی قومی قوانین کے بعض حصے کے لئے نوٹس دے کہ ان کا عمل اسپر موقوف کیا جائے۔ صرف اس لئے کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھ لیا ہے۔ نہیں۔ درحقیقت قرآن کو قومی و شخصی قانون سے کوئی تعرض نہیں وہ صرف ذریعہ اصلاح اخلاق کے جو ذرائع ہیں۔ اگر ان کے لئے ملکی سیاست جگہ نہیں رکھتی۔ تو قرآن نے مختصراً اسکو بھی سمجھا دیا ہے یا اس کی ایسی اصلاح کردی ہے جس سے اخلاق پر بدا ثر نہ پڑے۔ اس نکتہ کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ قرآن کے اوامر و نواہی موقع کے لحاظ سے فرض و واجب و مستحسن وغیرہ ہیں۔ اور قرآن کے ہر حکم کو فرض عین خیال نہ کرلیا جائے۔ مگر قرآن کا دراصل منشا اشاعت توحید اور اصلاح اخلاق ہے اور باقی سب فروع اور ذرائع ہیں جس میں طریقۂ عبادت بھی شامل ہے۔

اگر آج ہندوستان کے مسلمان اس بات کو قطعی بھول جائیں کہ وہ ایک جدا قوم ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان کی قوم کے مختلف اجزاء جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اپنی قومی معاشرت و زبان و تمدن کی طرف واپس جاکر اپنے اسلامی خمیر کو جو قرآن سے ان کو ملا ہے۔ ساری قوم میں سرایت کردیں گے۔ لیکن ان سے جدا رہ کر ان کو ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہوگی جو سلطنت کی تعبیر محال ہے۔ اور ہندوستان میں قرآن مختلف زبانوں میں پڑھا اور سمجھا جائے گا۔ کوئی خدا کی عبادت اُس طرح کرے گا جیسے رسول اکرم کے وقت مسلمان کرتے تھے۔ کوئی اس طرح جو ہر طرح رقت انگیز اور قابل قبول خدا ہے۔ اپنی زبان ہوگی اپنی رسم اور اپنے طریقے اپنی شرع۔

لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ۔ کے ماتحت قومی رنگ جدا ہوگا البتہ ان کے اتفاق کے لئے قرآن و کعبہ باقی رہیگا اس وقت ہم یہ نہ کہیں گے کہ قوم مسلمان ترقی نہیں کرتی۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ قوم ہند برسراوج ہے۔ اور ماشاء اللہ وہ مسلمان ہے۔ مگر اس کے خلاف

کیسی کیسی احمقانہ حرکتیں ہم سے ظہور میں آرہی ہیں۔ صرف اس لئے کہ شمالی ہندوستان میں مغلوں نے سلطنت کی۔ ہماری بڑی کوشش یہ ہے کہ ہندوستانی زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھیں۔ اس میں فارسی الفاظ ٹھونسیں اور پھر غضب یہ کریں کہ قرآن و مذہب کو اسی سے باہر نہ جانے دیں۔ اور اسی زبان کو اس کا زینہ بنائیں۔ بنگالی مسلمانوں کو مجبور کریں کہ وہ اردو سیکھیں۔ اردو اس کا نام رکھیں اور اس کو قومی روایت سے عاری کر دیں اور اس میں عربی اور عجمی روایات کو بھرتی کریں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر تم اپنے گرد ایک ایسا حصار کھینچ رہے ہو، جو ہندو کو نہ تم سے ملنے دے گا نہ تمہارے مذہب کی طرف آنے دے گا۔ سب سے طرفہ بات یہ ہے کہ فارسی جو یقیناً غیر اسلامی زبان ہے، اس کو تو اسلامی زبان سمجھی جائے لیکن بھاشا و سنسکرت کو غیر ملکی اور غیر مذہبی حتیٰ کہ اس میں قرآن کا ترجمہ بھی روا نہ ہو۔

پس مسلمانان ہند کی پستی کا علاج ہے تو صرف یہ کہ وہ اس غیر فطری حصار کو جو قوم اسلامی کے نام سے وضع کیا گیا ہے، توڑ کر پھینک دیں اور جہاں جہاں سے اس کے اجزا لے کر جمع کئے ہیں وہ واپس کر دیں۔ کسی شخص کو محض اس قصور پر کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، عرب بنانے کی سزا نہ دیں، بلکہ اس کو صرف ایک قرآن اُسی کی زبان میں دیں اور پھر دیکھیں کہ قرآن کس قدر جلد پھیلتا ہے۔ مسیح نے جو آسمانی بادشاہت کی تشبیہ ضمیر سے دی ہے، وہ درحقیقت اسلام و قرآن کی بہترین تشبیہ ہے۔ اور اگر ہم اس نکتہ کو از خود نہیں سمجھتے ہیں تو خدا ہم کو سمجھا کر رہیگا۔

سید مقبول احمد بی اے

جرمن سائنس کا معجزہ

کایا پلٹ ہیر آئل

علم کیمیا کا کرشمہ

کہنے کو صرف یہ تیل ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اکسیر کو بھی مات کرتا ہے۔ یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود نباتاتی و کیمیاوی اجزا سے جدید اصول پر تیار کیا گیا ہے، جس کی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانوں نے کی ہے۔ اس کے فوائد کی تفصیل مختصر اشتہار میں ناممکن ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ گھر میں اسکی ایک شیشی رکھنا گویا بہت سے امراض کو دفع کر دیتا ہے۔

اگر۔ سر یا چندیا کے بال گر گئے ہوں یا گر رہے ہیں۔ یا بالخورہ اور گنج ہو گیا ہے۔

اگر نزلہ، درد سر یا شقیقہ، دوران سر، ضعف دماغ و بصر، بے خوابی یا نسیان کی شکایت ہے۔

اگر سر اور جسم کی پھوڑیاں، پھنسیاں، گرمی دانے، خارش یا دیگر امراض جلدی کا دفع کرنا مقصود ہے۔

اگر کنٹھ مالا۔ سل اور دق وغیرہ سے محفوظ رہنا ہے ——— تو

ان سب کا واحد علاج کایا پلٹ ہیر آئل ہے

جو نہ صرف خوشبو بلکہ اپنی مقدار و وزن کے لحاظ سے بھی بازار کے تمام خوشبودار تیلوں سے اچھا اور ارزاں ہے۔ جناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو لکھنؤ سے اپنی تحریر میں تصدیق فرماتے ہیں کہ اس تیل کے فوائد اشتہار کے مطابق پائے گئے ہیں اور مرزا جعفر علی خاں صاحب بی۔ اے ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی نے دوامی آرڈر ہر ماہ ایک شیشی کا دیدیا ہے۔ اور بھی متعدد سرٹیفکٹ موجود ہیں۔ قیمت معہ محصول......

(نوٹ) جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضروری ہے۔ "منیجر کایا پلٹ ہیر آئل۔ لکھنؤ"

"خلیقِ اورنگ آبادی"

کتب خانہ آصفیہ کی ورق گردانی کے دوران میں گلزار معاصرین (نمبر ۴۸۴ دواوین فارسی) کے آخر میں ریختہ کے دس صفحات بھی نظر آئے، جن پر خلیق کے اردو شعر لکھے ہوئے ہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد :-

"ریختہ جات وغیرہ من تصنیف رائے روپ نرائن خلیق تخلص اورنگ آبادی" لکھا ہوا ہے

اس میں نہ کہیں سنہ درج ہے اور نہ کاتب کا نام افسوس ہے کہ خلیق کا حال بھی نہیں ملتا صرف "مجلہ عثمانیہ" جلد ا نمبر ۴ صفحہ ۱۱ پر شیخ چاند صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ نے "اورنگ آباد اور اردو شاعری" پر اظہار خیال کرتے ہوئے، اپنے مضمون کے "پانچویں دور ۱۲۶۰ھ تا ۱۳۰۰ھ" میں خلیق کا نام بھی گنا دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :-

"اس دور میں اورنگ آباد کی تباہی کے پورے سامان ہو چکے تھے، مشاعروں کی محفلیں گرم تھیں، لیکن کوئی لائق ذکر شاعر نہیں، البتہ بعض نام مل جاتے ہیں جنہوں نے بزرگوں کی تقلید میں شاعری کی، ان میں خلیق کا نام لینا ضروری ہے، ان کی بعض غزلیں دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا، بہت صاف اشعار ہیں اور کوئی خاص بات نہیں"

موصوف نے خلیق کی غزل کے تین شعر بھی نقل کئے ہیں نہ جانے ان کے پاس خلیق کو (۱۲۶۰ھ تا ۱۳۰۰ھ) کا شاعر ماننے کے کیا اسباب ہیں، چونکہ ہمارے سامنے اس وقت کچھ اور مواد نہیں ہے اس لئے ہم سردست یہی فرض کرتے ہیں کہ خلیق کی شاعری کی ابتدا ۱۲۶۰ھ یا اسکے درمیان میں ۱۳۰۰ھ تک ہوئی ہے۔

نام سے پتہ چلتا ہے کہ خلیق کایستہ یا کھتری تھے اور جیسا کہ اس زمانہ کے ہندوؤں کے عقائد تھے حضرت علی علیہ السلام کے مداح تھے، ہر غزل میں "محبت مولا" کا ثبوت دیتی ہے، وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے عقاید مشترک تھے مسلمان جنکی مدح کرتے تھے ہندو بھی ان کے ثنا خواں تھے اور ایک زمانہ یہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے پیشواؤں کو برا بھلا کہتے ہیں تو ہندو مسلمانوں کی قابل تعظیم ہستیوں کی ہجو کرتے ہیں۔ خلیق کے اس مختصر دیوان کی پہلی غزل ملاحظہ ہو، حمد، نعت، منقبت سے مملو، معلوم ہوتا ہے کہ کسی مذہبی مسلمان کی غزل ہے :-

مجال کیا ہے زباں کو کہے جو حمد خدا — سبھی طرح سیتی ہو لال کیا کرے وہ ثنا
اسی طرح سیتی ناقص ہے نعتِ حضرت میں — ازل سوں احمد احد ایک ہیں نہیں ہیں جدا
خلاف اسکے جو بوجھے سو بے شبہ کافر — اگر جو صدق ہے دلمیں تو مان میری صدا
چہار چیز سے پیدا کیا ہے انساں کو — مثال اس کی تو ہیں چار یار، رہ نما
خلیق یارِ علی کا غلام ہو دل سے — ہیں دستگیر ترے بے شبہ وہ روزِ جزا

اس غزل کو دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ خلیق پر اسلام کا رنگ اس قدر چھا گیا تھا کہ انھوں نے اس کی تقلید شروع کردی تھی، خلیق ہندو تھے اور انکو اس امر کا اعتراف بھی تھا کہ وہ ہندو ہیں۔ ذیل کی غزل کا چوتھا شعر دیکھئے:۔

یا الٰہی مجھے اپنا نہ طلب گار کیا — کاہے کو عشق مجازی میں گرفتار کیا
ہے مجھے یقیں میری شرم سے تجھ کو[1] — مری بخشش کے لئے اپنے کو غفار کیا
بے طلب مجھ کو دیا جو کہ مجھے تھا درکار — دستگیری کو میری احمد مختار کیا
گرچہ ہندو ہوں گنہگار سراپا یارب — پن گنہگاروں میں مجکو بھی تو سردار کیا
جس کو سرشار کیا اس کو نوازا بے شک — جس کو سرشار کیا اس کو بھر ہشیار کیا
مجھ کو لازم ہے یہی سجدہ کروں ہر دم — ورنہ میں آن کے دنیا میں نہ کچھ کار کیا
ہیں ترے طالع بڑے تجھ کو میں کہتا ہوں خلیق — سرفرازی کی نظر حیدر کرار کیا

[1] یہ مصرع اسطرح لکھا ہوا ہے

اس منقبت کو دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ''نصیری'' ہے جو فنافی علی ہو چکا ہے

جھکا رہا ہے بر حق خلیق سر کو نیوا — ہمارے دین میں چاروں طرف ہی سجدہ روا
مگر وہ قبلۂ مومن کے مولد عالی — زبانِ خلق میں مشہور ہے گا بیت اللہ
بس آگے وصف کروں کیا کہ یہ مکان مکیں — جو شرک لائے سو ہے کافر جناب اللہ
علی ہے شیر خدا اور رسول کا داماد — یہ وہ رسول ہے جو نہیں خدا سے کچھ بھی جدا
احد کے لفظ میں جو میم ہو گیا ساکن — وہی ہے میم جو مشکل کشا پسند کیا
دلیل میرے سخن پر حدیث قدسی ہے — خدا نے ناد علی کا حوالہ آپ دیا
گئے تھے قصد جو معراج کا رسولِ کریم — خراماں ہو کے ہوا سامنے وہ شیر خدا
پیام حق کا کئے عرض جبرئیل امیں — کہ دیو خاتم کے تئیں ہاتھ سے اے راہ نما
ہوئے جو محرم اسرار حق بحق محق — ہزار بار ادب سے کہوں میں صلی اللہ
جو دیکھی دست مبارک میں اپنی انگشتر — طعام فضل کو کھا کے کئے خدا کی ثنا
تمام آگے ملائک ادب سے کئے تسلیم — درود پڑھ کے کہے سب نبی رسول اللہ
ادب سے نام لے حضرت نبی علی کا خلیق — کہ تجھ کو ذات انھوں کی شفیع ہے روز جزا

مبارکباد خدا نے کہا علی داماد
یہ وہ علی ہے کہ ہے نام جسکا اسد اللہ

ایسی ہی ایک اور نعت آمیز منقبت کہی ہے:۔

کون کہوے مصطفےٰ تئیں ذات اللہ سے جدا   واسطے بخشش کے میری صورت انساں کیا
بھید پایا ہوں خدا کیو اسطے سو نا ضرور   خود علم ہو تجھ پر مشکلشا ظاہر کیا
یہ معمہ گر تو سمجھے ہو یقیں عاقل پسند   تھا احد اول سے آخر میم ہو احمد ہوا
عین میں تیرے علی والے نے بخشی روشنی   کامیابی دو جہاں کی عین میں ہے مدعا

کمترین کمتراں ہے روپ نادانِ خلیق
یا علی مشکلشا یا ابوالحسن ناعلیا

اس کے علاوہ اور بھی متفرق شعر نعت و منقبت میں کہے ہیں، خصوصاً مقطع اسی رنگ کا کہتے گئے ہیں:۔

میم احمد میں جو کہ ظاہر ہے   وہی ہے میم میرے مطلب کا
مظہرِ حق علیٔ مظہر ہیں   فدوی مظہر العجائب کا
حق تعالیٰ سے یہی عرض کرے رنگا خلیق   دستگیری کو میری حیدر کرار مرا
ہو دل سے فدا علی ولی کا تو خلیق   اس رمز کو خوب تو نے جانا جانا
خلیق اب یاد ہے مولیٰ علیٔ کی   میرے دل کو علی بھایا سو بھایا
خلیق اب فضل ہے مولیٰ علی کا بے شبہ تجھ پر   وگرنہ کاہے کو جگ میں نمایاں دلربا کرتا
عاجز خلیق عرض کرے یا علی ولی   جز ذاتِ پاک والا میرے کون ہما—

یہی نہیں کہ وہ "نصیری شیعی" تھے بلکہ ایک "قبر پرست سنی" بھی تھے چنانچہ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مدح بھی کی ہے:۔

قادر قدرت نما وہ شاہ گیلانی ہوا   قادر مطلق نے بر حق قطب ربانی کیا
دستگیر دو جہاں میراں محی الدین شاہ   نام حق نے حق تمہیں محبوب سبحانی کیا
شکر حق جو اس زباں تئیں کہوں پیران پیر   یازدہ سجدہ ادا کر غوث صمدانی کہا
گرچہ ہوں میں سر سے لے پاؤں تلک غرقِ گناہ   دستگیری کو میری وہ شاہ جیلانی ملا
اے خلیق لازم ہے تجکو دمبدم سجدہ کرے   خوف کیا ہے غوث اعظم ہے تری حارس جنت

کسی کو "مرشد کامل" بھی بنالیا تھا چنانچہ کہتے ہیں:۔

بھول مت حکم مرشدِ کامل   رب ارنی ہے دیکھنا اپنا

عید میں بھی قربانی کرتے تھے اور جیسے جی نذر لیجانا نہیں چاہتے، مقصد یہ ہے کہ زندہ رہکر نذر کیا لیجائیں قربان ہی کیوں نہوں!

یہ عید جو آج آئی ہے قربانی کی   کیا جی کے نذر تیری لے آنا جانا

بعض اشعار نہایت ہی عمدہ اور صاف کہے ہیں اور "مرشد کامل" کے تذکرے میں جو شعر نقل ہوا ہے اسکے ساتھ دو شعر اور لکھکر قطعہ بند کیا ہے:۔

بھول مت حکمِ مرشدِ کامل — ربِ ارنی ہے دیکھنا اپنا
ماورا اس کے لن ترانی ہو — مشعل کوہِ طور آپ میں کھینا
نہ کر مانندِ مہر ہر ذرہ گرد — جس جگہ جانا اس جگہہ دھینا

دیکھئے یہ غزل مسلسل کہی ہے اور کس قدر اچھی کہی ہے، خاص کر مطلع آج کل کے لئے کوئی نئی بات نہیں مگر اس زمانہ کے تخیل کے لحاظ سے ایک عمدہ چیز ہے۔

نہ ہوتا کوئی تیرا عاشق تو اے معشوق کیا کرتا — تو اپنی خوبصورت کو لئے خالی پھرا کرتا
ہمارے عشق نے مغرور تجکو کردیا ظالم — وگرنہ سانس ٹھنڈی رات دن ہردم بھرا کرتا
اگر اس باغِ الفت کا نہ ہوتا باغباں میں تو — چمن کے حسن کو تو کس طرح سیتی ہرا کرتا
نگاہِ عشق نے میرے ، — نہیں تو حسن کو اپنے جلا کر کیا طلا کرتا

ذیل کے اشعار کتنے اچھے ہیں اور خاص کر مطلع کا یہ مصرع "یہ دل ہے جس طرف آیا سو آیا" کس غضب کا ہے!

مزہ جو عشق کا پایا سو پایا — یہ دل ہے جس طرف آیا سو آیا
اے زاہد عبث بکوا کرے ہے — ہمارے دل کو جو بھایا سو بھایا
شہادت کا مزہ اس کو ہے معلوم — جو زخمِ عشق کو کھایا سو کھایا
خدا کے واسطے منظور کریو — یہ سر دل کی نذر لایا سو لایا

دکن کے اساتذہ نے اس زمین میں خوب طبع آزمائی کی ہے، خلیق نے بھی اچھی غزل کہی ہے، ملاحظہ ہو،

عجب گھڑی تھی کہ جو دل گیا سو پھر نہ پھرا — پتنگ کے طور پہ جو جل گیا سو پھر نہ پھرا
ارے یہ زخم کو دل کے دکھاؤں میں کسکو — کہ قتل کرکے جو قاتل گیا سو پھر نہ پھرا
کیا تھا وعدہ کہ میں شام کو پھر آؤں گا — مثال مہر کے جو ڈھل گیا سو پھر نہ پھرا
تری نگاہ کے کیا تیر ہیں اے کافر! — یہاں سے آج جو گھایل گیا سو پھر نہ پھرا
ارے خلیق عجب ہے فنا کا ملکِ خموش — زمانہ سیتی جو کامل گیا سو پھر نہ پھرا

اسی بحر میں قافیہ بدل کر ایک اور غزل کہی ہے۔

جہاں کے خواب میں جو دم گیا سو پھر نہ پھرا — مثال آہو کے جو رم گیا سو پھر نہ پھرا
عجب بلا ہے قیامت یہ عشق کی منزل — کہ اس کی راہ میں جو گم گیا سو پھر نہ پھرا
یہ زخم دل کا تو ناسور ہو گیا ہے آہ! — جگر کا میرے جو مرہم گیا سو پھر نہ پھرا
ہوئی ہے شام مجھے اسکی انتظاری میں — الٰہی آج جو برہم گیا سو پھر نہ پھرا

دنیا اور زندگی کو لوگوں نے خواب سے تشبیہ دی ہے اور اسی طرح خلیق نے بھی مگر کس قدر سادگی ہے ۔

یہ جہاں تو مثال ہے سپنا آپ میں آپ سوچنا جینا

رباعی اور غزل کا دکن میں بہت کم فرق تھا خلیق کے زمانہ میں رباعی کی طرح غزل بھی اسی بحر میں کہی جاتی تھی، دیکھئے بعض شعر کتنے اچھے ہیں

دل دل سے ملا کے آج جانا جانا مئے ہم کو پلا کے آج جانا جانا!

چھوٹے ہو جہاں میں اُس رہم سے سپے قسمان کھا نا اور پھر نہ آنا جانا!

دلدار اگرچہ جگ میں لاکھوں ہیں گے دل میرا ہوا ترا دیوانا جانا!

محبت کی چاٹ بری ہوتی ہے کس مزے سے کہتے ہیں :-

جس کو لاگا ہے چسکا تجھ لب کا بھولتا ہے وہ ذائقہ سب کا

ذیل کے متفرق شعر دیکھئے کتنے صاف ہیں :-

جان من جان تجھ کو کہتا ہوں! دیکھ تو آشنا ہوں میں کب کا!

عشق سے آن پڑا ہیگا خدا کا رمیرا ذات تیری کے سوا کوئی نہیں غمخوار میرا

رشتہ ہی دانۂ تسبیح کو زنار کے ساتھ اس سبب رشتۂ الفت ہے ہار میرا

لازم ہے تجھ کو ورد کرے نام پنجتن دافع تیری بلا کے ہیں وہ شاہ کربلا

سب کو قضا قضا ہی رضا کو نہیں قضا جسمیں رضا قضا کی ہو وہ ہے قضا رضا

سب سے بہتر ہے اے خلیق مرے شمع سا گھل کے آپ میں کھپنا

گو خلیق کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں اور نہ ان کے کلام سے حالات ہی معلوم ہو سکے مگر ایک سو سال پہلے کی شاعری کا نمونہ ضرور ہے اور اسی لئے ہم نے خلیق کو روشناس کرانے کی کوشش کی، ممکن ہے کہ کبھی مکمل دیوان مل جائے اور کسی جگہ حالات بھی نظر آئیں ۔ ایسے سینکڑوں گمنام شعرائے دکن کا کلام ہمارے پاس محفوظ ہے جن کے حالات وغیرہ نہیں ملتے، انشاء اللہ کے بعد دیگرے ان سب کا کلام پیش کیا جائے گا ۔

سید تمکین کاظمی

کتاب علم فراستُ الیدُ

اگر آپ نے ابتک نہیں ملاحظہ کی تو اب طلب فرمایئے ۔ قیمت علاوہ محصول عمر ، (مینیجر نگار لکھنؤ)

مُصحفی کا مرتبۂ شاعری

آزاد کی تنقید - میر و مصحفی کا تقابل

(۱)

اسلوب شاعری اور انداز بیان کے لحاظ سے قدیم اردو شاعری کو تین صورتون مین تقسیم کیا جاسکتا ہے

۱- سادہ و بے تکلف زبان مین نرم مزم محبت کی باتین وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی کہ میر تقی - درد - سوز - یقین - بیان - ہدایت اور بیدار نے کی کسی سے بن نہ آئی ان شعرا کی غزلین پڑھو اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کہ کہان تک صحیح کہتے ہین

۲- جوش و خروش کلام کی گرمی، دلاویزی سنگلاخ زمینون اور مشکل ردیف قافیون مین شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو میرزا رفیع سودا - قائم اور بقا کا کلام دیکھو

۳- اگر روزمرہ و محاورہ مین بیان کی بے تکلفی اور سادگی دیکھنا چاہو تو میر تقی اور میر سوز کی غزلین پڑھو جن پر ہزار بناوٹین قربان ہین

زمانۂ مابعد مین جسقدر شعرا مشہور ہوئے ان مین سے ہر ایک نے انھین اساتذہ متقدمین مین سے کسی نہ کسی کے اسلوب بیان کو شمع راہ بنایا - مثلاً جعفر علی حسرت نے سوز و گداز کی آمیزش کرکے میر سوز کے سادہ و سلیس انداز بیان کو رونق دی - میر حسن نے تمام و کمال میر تقی کی تقلید کی - جرأت نے معاملات عاشقانہ کے اضافہ کے ساتھ اپنے استاد کے رنگ کو قایم رکھا - انشا نے ترکیب الفاظ اور انداز کلام مین اور شاہ نصیر نے مشکل ردیف اور قوافی کو اختیار کرنے مین مرزا سودا کو اپنا امام بنایا - مرزا غالب اور حکیم مومن خان مومن نے فارسی کی لطیف اور نادر ترکیبون کے ساتھ میر تقی کے رنگ کو زمین سے آسمان پر پہونچایا - اور سب سے اخیر مین مرزا داغ نے سلاست و روانی، برجستگی اور بیساختگی کے موتیون سے میر سوز کے سادہ انداز بیان کو ایسا سجایا کہ سارے ہندوستان مین دھوم ہو گئی - لیکن شیخ مصحفی کی ہمہ گیر و ہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہ کرکے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین مین سے تقریباً ہر ایک کے انداز سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے - چنانچہ ان کی غزلون مین کہین میر کا درد ہے تو کہین سودا کا دبدبہ، کسی مقام پر فغان کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی - کہین واقعات مین جرأت کی سلاست و حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے تو کہین ترکیب الفاظ اور انداز بیان مین انشا کا طنطنہ و جبروت صرف ہوا ہے - کہین پر غزلون کو واقعات مسلسل پر ختم کرنے مین مرزا جعفر علی حسرت کا رنگ کلام پیش نظر ہوتا ہے - تو کہین مشکل ردیف قافیئے

شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے اور جن غزلون اور بیتون مین ان اساتذہ کی خوبیون کو ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی یکجا کردیتی ہے ان کا شمار لاریب اردو شاعری کے بہترین نمونون مین کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ مین تو یہانتک کہنے لئے طیار ہون کہ دورِ آخر کے اساتذہ غالب و مومن بلکہ داغ کی ساحرانہ خصوصیات کلام کا بھی بیشتر حصہ ان کے کلام مین موجود ہے - اور جس طرح خواجہ حافظ شیرازی اپنی ہمہ گیری اور اپنی ہمہ رنگی کے باعث شعرائے فارسی مین بلبلِ شیراز کے بامعنی خطاب سے مخاطب ہین اسی طرح شیخ مرحوم کو اُردو شعرا کے گروہ مین عندلیب ہزار داستان کا درجہ حاصل ہے

اس دعوے کو پایۂ ثبوت تک پہونچانیکے لیے یہ ضروری نہین کہ شیخ مرحوم کے کلام کو تمام شعرائے مذکورہ کے کلام کے بالمقابل رکھا جائے - کیونکہ انشا - شاہ نصیر اور ذوق کی شاعری مین مرزا سودا کی شاعری کا عکس ہے - اور میر حسن، جرأت، و حسرت کا کلام میر تقی اور میر سوز کے رنگ کلام کا منت پذیر - پس جس شخص کی شاعری مین میر و میرزا دونون اُستادون کے کلام کی خصوصیات موجود ہونگی - لامحالہ ان تمام شعرا سے مماثل ہوگا - البتہ مومن و غالب اور داغ سے تقابل کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ ابواب کی ضرورت ہے - کیونکہ ان حضرات نے اپنی جدت پسند طبائع سے کام لیکر کچھ ایسی بات پیدا کرلی ہے کہ شعرائے متقدمین کے مقلد ہوتے ہوئے بھی ان کی شاہ راہ جدا اور ان کا پیرایہ بیان بالکل علیحدہ نظر آتا ہے - اور اسی پیرایۂ بیان کا طفیل ہے کہ مرزا غالب و مرزا داغ ایک طرز خاص کے موجد و مخترع تصور کئے جاتے ہین سب سے پہلے میر تقی اور شیخ مصحفی کے کلام کا موازنہ کیا جاتا ہے

میر تقی کا انداز - میر صاحب کے کلام کی خصوصیتین آزاد نے ان لفظون مین بیان کی ہین

> "غزل کے لئے عاشق و معشوق کے خیالات عشقیہ، ذکر وصل، شکایت فراق، درد انگیز اور المناک حالت گفتگو ایسی بے تکلف، صاف اور نرم نرم گویا وہی دونون بیٹھے ہوئے باتین کر رہے ہین اس کے ادائے مطلب کے لئے الفاظ بھی اور ہین اور اُسکی بحرین بھی خاص ہین میر صاحب کی طبیعت قدرتی درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا - کہ غزل کی جان ہے اسلئے اُن کی غزلین ہی ہین اور خاص خاص بحور و قوافی مین ہین" (آبِ حیات صفحہ ۱۶۴)

میر کی طرح شیخ مصحفی کے کلام مین بھی ایک خاص قسم کی خوشگواری و روانی پائی جاتی ہے اور اسکے چند اسباب ہین - اول تو انھون نے شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحرین اختیار کی ہین جن مین خواہ مخواہ بات کو صفائی سادگی اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے - اور چونکہ سادہ و مفرد خیالات کے لئے اس قسم کی بحرین خاص مناسبت رکھتی ہین - اس لئے جن مضامین کے اظہار کے لئے انھین انتخاب کیا گیا ہے - سوادِ الفاظ سے چودھوین رات کے چاند کی طرح ہر جگہ نمایان و درخشان ہین - یہی وجہ ہے کہ جن غزلون یا بیتون مین پُر درد مضامین ہین اُن کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام دیتا ہے - اور جہان پُرجوش خیالات ہین دو چار شعر پڑھنے کے بعد جوش و خروش پیدا نہ ہونا ناممکن ہے اس سلسلے مین بعض ایسی بحرین بھی ہین - جن کی تخلیق مین فطرتاً ترنم اور موسیقیت کا

عنصر بہت زیادہ ہے اس لئے جب ان مین شعر کہا جاتا ہے تو لامحالہ طبیعت کو ایک قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ پھر ان مین شعر کے اجزا بلکہ مصرعون کے ارکان بھی ایسے فراہم کئے ہین۔ جو تال اور سم کا کام دیتے ہین۔ اور جہان جہان یہ حصے ختم ہوتے ہین صاف معلوم ہوتا ہے کہ گانے کی تان ٹوٹ رہی ہے۔ سب سے زیادہ یہ بات ہے کہ الفاظ زیادہ تر اس قسم کے جمع کئے ہین جن کی آوازین ایک دوسرے سے موافقت و توازن رکھنے کے باعث خوش آیند معلوم ہوتی ہین۔ دوسرے یہ کہ ردیف کی تلاش مین بڑی کوشش و کاوش سے کام لیا ہے۔ ردیف جیسا کہ بعض اہل فن کا خیال ہے حسن و زیبائش کے علاوہ اردو شاعری مین خیالات کی وسعت رنگینی اور تنوع کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کیونکہ ردیف بدلنے کے ساتھ ہی قافیے کی حیثیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور ردیف کو بدل بدل کر ایک ہی قافیہ کو سیکڑون طرح سے موزون کیا جا سکتا ہے علاوہ برین ردیف بذات خود شعر کا ایک زیور ہے۔ اور ترنم و موسیقیت پر اسکا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسی تلاش کا یہ اثر ہے کہ معانیٔ ردیف کے تنوع نے شیخ مصحفی کے کلام مین رنگینی و وسعت کی وہ دنیا پیدا کر دی ہے جسکے ایک ایک کونے مین سیکڑون گلہائے رنگارنگ اپنی بوقلمونی کی بہار دکھا رہے ہین۔ اور یہ بات متقدمین و متاخرین مین سے شاید کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ مشاعرون کی طرحی غزلیات اور دوست احباب کے فرمائشی کلام کو چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ دوسرون کی پاسداری اور اپنی میلانِ خاطر و رنگ طبیعت کی مخالفت دو ایسے داغ ہین جو حسنِ کلام اور خوبی بیان کے چہرے کو ذرا بدنما بنا دیتے ہین۔ (حسب روایت صاحب آب حیات یہ بات میر صاحب مین بھی موجود تھی) باقی جسقدر غزلین ہین سب کی سب اچھوتی اور خوشگوار ردیفون مین لکھی گئی ہین۔ جن کو مضامین تغزل کی مناسبت نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے تیسرے یہ کہ قوافی کے استعمال مین خصوصیت کے ساتھ اس خیال کو مدنظر رکھا ہے، کہ حروف قافیہ مین کیفیت آمیز توازن قائم رہے۔ اور ایسے قوافی سے پرہیز کیا ہے۔ جن کے حروف مین سخت بیگانگی یا آواز مین حد سے زیادہ کراہت و ثقالت پائی جاتی ہے۔ انہین مرزا سودا خصوصاً سید انشا کی طرح یہ خبط کبھی نہین پیدا ہوا کہ دماغ مین سمائے ہوئے ہر ایک مضمون کو خواہ مخواہ لفظون مین ادا کر دین چاہے اس مین شعر کی لطافت قافیے کی خوبی بیان کی روانی حتی کہ شعر کے مقصود اصلی کا خون کیون نہ ہو جائے بلکہ وہ قافیہ کی شگفتگی الفاظ کی موسیقیت اور سب سے زیادہ مضمون کی سلاست کو تلاش مضمون پر ترجیح دیتے تھے۔ اور یہی ناقابل عفو بلکہ قابل سزا قصور ہے جسکی پاداش مین بعض کوتاہ اندیش و کم سواد حاسدین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ ان کے یہان صرف باتین ہی باتین ہین تازگیٔ خیال و بلندیٔ فکر نظر نہین آتی۔ گویا ان لوگون کے نزدیک وہی باتین شیخ مصحفی مرحوم کے معائب کلام مین داخل ہین جنھین غزل کی جان کہنا چاہئے غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات و معاملاتِ عشق عجز و نیاز اسکے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ جذبات و معاملات جس زبان مین ادا کئے جائین وہ ہی زبان ہو جسمین عاشق اپنے معشوق سے راز و نیاز کی باتین کرتا ہے۔ یعنی سادہ ہو بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو اسکے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحرین ہون۔ جملون کی ترکیب مین نام کو الجھاؤ نہ ہو قریب الفہم خیالات ہون۔

اور یہ تمام باتین ایک ایک کرکے ہمارے فطرت نگار شاعر کے عاشقانہ کلام مین رونما ہین۔ سنئے

رہنے دو میرے سینے مین پیکاں کو نہ چھیڑو
از بہرِ خدا ناوکِ جاناں کو نہ چھیڑو

یہ وہ نہین ناسور کہ ہو بند کسی سے
بہنے دو میرے دیدۂ گریاں کو نہ چھیڑو

ٹک رحم کرو چاکِ گریبان پہ ہمارے
یارو کوئی اُس شوخ کے دامان کو نہ چھیڑو

اے ناصحو کچھ فکر کرو چاکِ جگر کی
بیکار مرے چاکِ گریبان کو نہ چھیڑو

دکھتا ہے یہ دل اور بھی فریاد کرے ہے
مت ہاتھ لگاؤ دلِ نالان کو نہ چھیڑو

رہنے دو پڑا مصحفی خاک بسر کو
اس غمزدۂ بے سروسامان کو نہ چھیڑو

تمام غزل مین سوز و گداز کے خیالات اس طرح ادا کئے ہین جس طرح آگ سے دھوان اُٹھتا ہے، ایک اور غزل ہے:۔

مین وہ نہین ہون کہ اُس بت سے دل مرا پھر جائے
پھرون مین اُس سے تو مجھسے مرا خدا پھر جائے

اگر مین رونے پہ آؤن برنگِ ابرِ بہار
ابھی زمانے کی اے دوستو ہوا پھر جائے

شبِ فراق مین بچنا بشر کا مشکل ہے
یہ بات اور ہے آئی ہوئی قضا پھر جائے

خدا کرے نہ ملے اُسکو آشنا کوئی
اگر کسی سے کوئی ہوکے آشنا پھر جائے

جو دے سکے نہ رہِ عشق مین ہمارا ساتھ
ہمارے ساتھ نہ آئے وہ آشنا پھر جائے

عجب نہین کہ تری خو کے ڈر سے اے ظالم
زبان پہ آکے مرے حرفِ مدعا پھر جائے

پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے
کھڑا رہے یہ ترے آستان پہ یا پھر جائے

یہ رنگِ تغزل جرات کے یہان اور سید انشا کے یہان نہ ہونے کے برابر پایا جاتا ہے۔

باندھ آیا تھا کمر وہ دشمنِ جان کھینچکر
کتنا پچھتائے ہین ہم کل اُسکا دامان کھینچکر

آج اس وحشی نے لی پھر راہِ صحرا ہم جسے
کل بہ مشکل لے گئے تھے تا بہ زندان کھینچکر

ساتھ پیکان کے نکل آیا جو دل لپٹا ہوا
کتنے پچھتائے مرے سینے سے پیکان کھینچکر

کچھ نہین معلوم ہوتا ہمکو جرم مصحفی
لیجئے ہین یار کیون اسکا گریبان کھینچکر

زمین ایسی کہ طبیعت اُلجھن اور ذہن کشاکش مین پڑ جائے لیکن قافیون کی تلاش اور ردیف کے ساتھ اُن کی پیوستگی نے اسی کو شگفتہ بنا دیا ان دونون باتون کے ساتھ مضامین کی عمدگی زمین سے آسمان پرلے اُڑی

ساقی شراب، لایا مطرب رباب لایا
مجھپر تو اک قیامت عہدِ شباب لایا

دل درد و غم کی اُسکے آخر نہ تاب لایا
یہ ہر گھڑی کا رونا اور اک عذاب لایا

کیا دور ہے جو پردہ رُخ سے ترے اُٹھا دے
دنیا مین مہر و مہ کو جو بے نقاب لایا

کہتا نہ تھا مین اے دل جانا نہ اس گلی مین
آخر تو مجھپر آفت خانہ خراب لایا

نامے کے مرے ٹکڑے لا ڈالے مرے آگے　　نامہ کا میرے قاصد یہ کیسا جواب لایا
آئینہ کیا کہ اُسنے پتھر پہ جب نظر کی　　چہرہ پر اپنے وہ بھی اک آب و تاب لایا
اے مصحفی تو اب منہ کیا دیکھتا ہے بے بھی　　ہاتھون سے اپنے ساقی جام شراب لایا

اول سے آخر تک بندش چست، الفاظ صحیح، ترکیب مناسب اور مضامین متین و سنجیدہ ہین خصوصاً پانچوان شعر اپنی جگہ پر ایک چیز ہے۔ جیسے نواب مصطفےٰ خان شیفتہ جیسا عالی دماغ خیال نقاد بھی بغیر انتخاب کئے نہ رہ سکا، ہر مصرع کے ارکان اس خوبصورتی سے جمع کئے گئے ہین کہ شاعری اور موسیقیت یکجا معلوم ہوتی ہین

میر صاحب کی دوسری خصوصیت کا تذکرہ ان لفظون مین کیا گیا ہے

"میر صاحب کی زبان شُستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتین کرتے ہین دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتون کے موافق ہین محاورہ کا رنگ دیکر باتون باتون مین ادا کر دیتے ہین اور زبان مین خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتین ایک مضمون بن جاتی ہین اسی واسطے ان مین بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہین۔ یہی سبب ہے کہ دلون پر اثر بھی زیادہ کرتی ہین۔ وہ گویا اُردو کے شیخ سعدی ہین　　(آب حیات صفحہ ۱۶۴)

"میر تقی کہین کہین میر سوز کے قریب آجاتے ہین پھر بھی بہت فرق ہے وہ بھی (میر تقی) محاورہ خوب باندھتے تھے۔ مگر فارسی کو بہت نبھاتے تھے۔ اور مضامین بلند لاتے تھے　　(آب حیات صفحہ ۲۱۳)

شیخ مصحفی مرحوم کی زبان مین بھی صفائی و سلاست حد سے زیادہ ہے اگرچہ اسوقت کی ترکیبین فارسی سے مستعار تھین۔ اور کچھ الفاظ متروک ہو جانے کے باعث اب کانون کو غیر مانوس معلوم ہونگے۔ نیز بعض اسماء کی تذکیر و تانیث بھی جھگڑے کی بات ہے۔ تاہم مجموعی حیثیت سے شیخ مرحوم کی زبان نہایت صاف و شستہ ہے۔ اور یہ صفتین دونون باکمالون کے یہان اس مناسبت کے ساتھ موجود ہین کہ آج بھی کسی کی زبان کو میر و مصحفی کی زبان سے تشبیہ دیکر اُس کی خوبی کا اعتراف زباندانی کی سند دینے کے برابر ہے۔ مشابہت زبان کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ لوگ مصحفی مرحوم کے کلام کو بعض اوقات میر تقی کا کلام سمجھنے لگتے ہین

شیخ صاحب کا کلام دور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغہ اور غیر فطری بیان سے قطعی خالی ہے۔ انھون نے قلبی واردات و کیفیات کو نہایت سادہ۔ صاف اور شستہ زبان مین ادا کیا ہے۔ جنمین اسلوب بیان کی دلکشی نے وہ بات پیدا کر دی ہے کہ بعض بعض غزلون کا ایک ایک شعر سوز و گداز کی تصویر نظر آتا ہے۔ ان مین الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی ترتیب و ترکیب خاص کیفیت رکھتی ہے۔ اور ان سب باتون نے یکجا ہو کر شیخ مصحفی مرحوم کی زبان کو بھی اسی طرح سہل ممتنع بنا دیا ہے جس طرح میر کی زبان کو، مثلاً:۔

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا
تجھے کس نے روک رکھا تیرے جی مین کیا یہ آئی کہ گیا تو بھول ظالم ادھر التفات کرنا
یہ دعا ہے مصحفی کی جو اجل بھی اسکی آئے شبِ وصل کو تو یارب نہ شب وفات کرنا

جو ہم سے وعدۂ دیدار یار ٹھہرے گا تو کچھ نہ کچھ یہ دل بیقرار ٹھہرے گا
چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم کہین تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا
یہی ہے دل کا دھڑکنا مرے اگر تہِ خاک تو کیا مزار پہ سنگِ مزار ٹھہرے گا
جو سیر کرنی ہے کرلے کہ جب خزان آئی نہ گل رہیگا چمن مین نہ خار ٹھہرے گا
یہی ہے لوٹ تو دست جنون کے ہاتھون سے نہ ایک میرے گریبان کا تار ٹھہرے گا
شتاب آئیو ٹھہرا رکھین گے ہم اسکو جو دم لبو نپہ شب انتظار ٹھہرے گا
اسے نہ دفن کرو ہمدمو یہ سمجھو تو لحد مین مصحفیؔ بے قرار ٹھہرے گا؟

معانی ردیف کے اختلاف سے محاورات کی وسعت پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے ہر شعر مین "ٹھہریگا" اپنے مفہوم کیلئے خاص ہے چھٹے شعر کو دیکھئے انتظار معشوق مین عاشق کا دم لبون پر آجانا ایک بے اختیاری کیفیت ہے۔ لیکن "ٹھہرا رکھین گے ہم اسکو" خاص صبر و تحمل کی صورت ہے۔ "شتاب آئیو" کہنے کا موقع اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے تیسرے شعر مین۔ "مزار ٹھہریگا" کی مشکل ترکیب کو کس خوبی سے ایک لفظ سنگ نے اپنی جگہ بٹھا دیا ہے مقطع کے محاسن ظاہر ہین۔

ہے طرفہ ماجرا مرے قاتل کے سامنے بسمل پڑا تڑپتا ہے بسمل کے سامنے
حسرت پر اُس مسافرِ بیکس کی روئیے جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
افسوس کی جگہ ہے کہ دریائے عشق مین کیا کیا غریب ڈوبے ہیں ساحل کے سامنے
جا رہئے اس جگہ کہ جہان اچھی صورتین بے پردہ ہو کے آتی ہین سائل کے سامنے
اے مصحفی طلسمِ جہان سے نہ دل لگا قدر اسکی کچھ نہین کسی عاقل کے سامنے

تمام شعرون سے قطع نظر دوسرے شعر مین مسافر بیکس کی حسرت کا خاکہ ایسا کھینچا ہے کہ شہرت و قبولیت کے سبب سے زبان زد خاص و عام ہو گیا ہے

اسی سلسلے مین وہ کہین فارسی کی اچھوتی اور مزیدار ترکیبین بھی استعمال کر جاتے ہین اور اس صفت نے اُنھین میر سوز کے رنگ سے کسی قدر ممتاز اور میر تقی کے رنگ سے مماثل کر دیا ہے

ہجران مین بسکہ مجھ پہ عذاب الیم تھا ہر شعلہ آہ کا مری نار جحیم تھا

کرتے تھے گل مزار سے میرے شگفتگی | یعنی کبھی ادھر بھی گذارِ نسیم تھا
افشائے عشق بعد خدا جانے کیا بنے | جب تک حجاب تھا یہی امید و بیم تھا
کس زلف مشکفام کی بو تھی کہ باغ مین | ہر ایک غنچہ نافۂ عنبر شمیم تھا
چلتی تھی تیغ وان سرِ دشمن پہ مصحفی | اور میرا مارے اشک کے یان دل دو نیم تھا

تیری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے | مست و مدہوش کوئی جیسے پری نکلے ہے
اک فریبندہ ہے تیری روشِ طرزِ خرام | اسکے عہد بیچ کوئی کبکِ دری نکلے ہے
گل کو نسبت ہے اسی واسطے با اہل جنون | وضع مین اسکے جو اک جامہ دری نکلے ہے
اپنے رونے کو کوئی سمجھے تو آئینہ مثال | دیدۂ خشک سے آنسو کی تری نکلے ہے
کھول دیتا ہے تو جب جاکے چمن مین زلفین | پا بہ زنجیر نسیمِ سحری نکلے ہے
مصحفی کس کے کھُلے بال تو دیکھ آیا ہے | کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

نکلے ہے تو میر و مصحفی کی زبان تھی لیکن فریبندہ - طرزِ خرام - اہل جنون - دیدۂ خشک اور پا بہ زنجیر کی فارسی ترکیبین جس خوبصورتی سے استعمال ہوئین وہ اس بات کا ثبوت ہین کہ شیخ مصحفی مرحوم اس رنگ مین بھی میر صاحب کے ہم پلہ ہین - بلکہ جن لوگون کو خدا نے فہم کامل دی ہے وہ تو یہانتک کہہ گئے ہین کہ اگرچہ شیخ مصحفی کی زبان میر و مرزا سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے لیکن اس درجہ سبک اور شیرین واقع ہوئی ہے کہ اکثر اسکی حلاوت اس زمانے مین بھی ناظرین کے دلون مین اُسکے متروک الاستعمال ہونے کا گمان نہ پیدا ہونے دیگی۔ (حسرت موہانی)
مثلاً

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم | سچ ہے کہ عجب خانہ برانداز ہوئے تم
مین تم سے نہ بولونگا کبھی اے لب بستہ | اُس بن پہ تبسم بھی اگر باز ہوئے تم
پہنی جو قبا جامۂ گل دوز کی تم نے | طاؤس صفت اور بھی طناز ہوئے تم
پھوٹینگے تھین تازہ نہالانِ چمن کیا | اب نام خدا سروِ سرافراز ہوئے تم
اے مصحفی مرغانِ چمن رہ گئے خاموش | گلشن مین اگر زمزمہ پرداز ہوئے تم

تمام الفاظ قوافی فارسی ہین لیکن اجنبیت اور غرابت کا کہین پتہ نہین گویا میر صاحب کی طرح شیخ مصحفی نے بھی غزل کی ایک جداگانہ زبان قائم کرلی تھی۔ جیسا کہ ایک جگہ خود فرماتے ہین

یون تو کہنے کو بھی شعر و سخن کہتے ہین | مصحفی ریختہ گوئی کی زبان اور ہی ہے

رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا
شعلہ سمجھا تھا اُسے مین پہ بھبو کا نکلا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل مین تو بہت کام رفو کا نکلا

ترسا نہ مجھکو کھینچ کے تلوار مار ڈال
گر مار ڈالنا ہے تو اک بار مار ڈال

صیاد تجھکو کس نے کہا تھا کہ فصل گل
مجھکو قفس مین کرکے گرفتار مار ڈال

"تجھ سے کہا تھا" کی جگہ "تجھکو کہا تھا" قدیم زبان ہے

اس نازنین کی باتین کیا پیاری پیاریان ہین
پلکین ہین جس کی چھڑیان آنکھین کٹاریان ہین

دل کی طپش کا اپنے عالم ہی کچھ جدا ہے
سیماب و برق مین کب یہ بیقراریان ہین

نومید ہین بظاہر گو وصل سے ہم اُس کے
دل مین تو سو طرح کی امیدواریان ہین

کیا پوچھتے ہو ہمدم احوال مصحفی کا
راتین اندھیریان اور اختر شماریان ہین

میر صاحب کی تیسری خصوصیت کی تفصیل یہ ہے

> ہمارے عاشق مزاج شعرا کی رنگینیان اور خیالات کی بلند پروازیان ان کے مبالغون کے جوش وخروش سب کچے معلوم ہین ۔ مگر اسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ ان مین سے بھی میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش و نشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اسکا دکھڑا سناتے چلے گئے ، جو آج تک دلون مین اثر اور سینون مین درد پیدا کرتے ہین کیونکہ ایسے مضامین اور شعرا کے خیالی تھے اور ان کے حالی تھے ۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی زارنالے، حسرت و مایوسی ہجر کے لباس مین خرچ ہوتے ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے ۔ کہ جس دل سے نکلکر آیا ہون ۔ وہ غم و درد کا پتلا نہین حسرت و اندوہ کا جنازہ تھا ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے ۔ بس جو دل پر گذرتے تھے وہی زبان سے کہہ دیتے تھے ۔ کہ سننے والون کے لئے نشتر کا کام کر جاتے تھے ۔ (آب حیات)

شیخ مصحفی مرحوم کا اصلی میدان بھی حسرت و ناکامی کا اظہار اور حرمان و مایوسی کا بیان ہے کلام کو دیکھئے بدقسمتی کا شکوہ آسمان کی گردش کا رونا ، احباب و اعزہ کی مفارقت ، کوشش و سعی مین ناکامی اور اپنی بیکسی و بے بسی غرض اس قبیل کا کوئی مضمون نہین جسے انھون نے نظر انداز کر دیا ہو ۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ غم و الم کا ایک سیاہ بادل ان پر چھایا ہوا ہے جس سے خوشی و خرمی کے سورج کی ایک کرن بھی چھنکر ادھر نہین پڑتی ۔ یا ایک حرمان نصیب قیدی ہے جو اپنی مصیبت خیز زندگی گزارنے مین مصروف ہے یہانتک کہ زار نالی کے مضامین کی بہتات اور مایوسانہ مضامین کی اکثریت نے ان کے کلام کو مرثیہ اور انھین

غزل گو کے درجہ سے نکال کر مرثیہ گو بنا دیا ہے ۔ جیسا کہ خود بھی ایک جگہ فرماتے ہین ۔

مجھکو شاعر نہ کہو مصحفی ہون مرثیہ خوان سوز پڑھ پڑھ کے محبون کو رُلا جاتا ہون

ان تمام باتون نے جمع ہوکر جذب و تاثیر کی وہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ شعر ادھر زبان سے نکلتا ہے اور اُدھر دل کی گہرائی مین پیوست ہو جاتا ہے ۔ گویا شیخ اور اُن کا کلام ملکر ایک ہو گئے ہین ۔ اور کلام کو دیکھنے والا کبھی نہین کہہ سکتا کہ اُن کی عمر دکھ درد اور رنج و تکلیف کی سخت ترین منازل سے نہین گزری

اس مین وہ موقع سب سے زیادہ موثر، دلشکن اور طبیعت مین ہیجان پیدا کرنے والا ہوتا ہے کہ جہان خوشی و خرمی تو در کنار درد و غم بھی اس بہتات کے ساتھ نصیب نہین ہوتے کہ طبیعت سیر ہو سکے ۔ اور طالب غم دل مسوس کر رہ جاتا ہے ۔ مثلاً

درد و غم کو بھی ہے مقدر شرط یہ بھی قسمت سوا نہین ملتا

واقعہ یہ ہے کہ یہی مضامین غزل گوئی کی جان ہین ۔ اور جس شخص مین یہ مضامین جسقدر کثرت کے ساتھ پائے جائین اسیقدر کامیاب غزل گو خیال کیا جاتا ہے ۔ یہی صفت ہے کہ جس نے میر تقی کو سرتاج شعرائے اُردو بنایا اور جسکی بنا پر خود شیخ مصحفی مرحوم صرف اپنے دور کے نہین بلکہ ہر دور کے شعرا مین ممتاز درجہ رکھتے ہین ۔ اب ہم چند غزلین پیش کرتے ہین ۔

نظرون مین تیری پیارے گو بیوقار تھے ہم
اس پر بھی جان و دل سے خدمت گذار تھے ہم

دامان و جیب اپنا گریہ سے سب چمن تھا
تو سیر کو نہ آیا ابر بہار تھے ہم

آتے تھے پاس تیرے جو دوڑ دوڑ ہمدم
کمبخت دل کے ہاتھون بے اختیار تھے ہم

صید زبون سے اپنے کیون تو نے منہ کو موڑا
اس پر بھی کام کے تھے لاغر ہزار تھے ہم

اے مصحفی تصور اُس کا جو بندھ گیا تھا
با صد ہزار حسرت شب ہم کنار تھے ہم

دیکھ اُسکو اک آہ نے ہم نے کر لی
حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی

کیا جانے کوئی کہ گھر مین بیٹھے
اس شوخ سے راہ ہم نے کر لی

جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر
ہاتھون کی پناہ ہمنے کر لی

نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

دی ضبط مین جب کہ مصحفی جان
شرم اُس کی گواہ ہمنے کر لی

مری حالت سے جا کر یون کرے اُسکو خبر کوئی
کہ روتا ہے کھڑا تیرے لئے بیرون در کوئی

گیا مین اُسکی محفل مین تو وہ دربان سے یون بولا
یہ مجلس ہے کہ میلا، جو چلا آتا ہے ہر کوئی

خدایا صبر دے دل کو کہان تک راہ مین اُسکی
دھرے زانو پہ سر بیٹھا رہے دو دوپھر کوئی

صبا گر جائے تو خلوت مین اس سے اتنا کہدینا
ترے کوچہ سے غافل کر گیا شب کو سفر کوئی

مرا مرنا ہی بہتر ہے صنم تا تو بھی یہ جانے
کہ دو دن کی جدائی مین گیا جی سے گذر کوئی

ہوا تو مصحفی بے جان مگر اے وائے تنہائی
سر بالین نہ آیا اُسکی شب بھر نوحہ گر کوئی

شب ہجران تھی مین تھا اور تنہائی کا عالم تھا
غرض اس شب عجب اک بے سر و پائی کا عالم تھا

شمع پر پروانہ شب جس وقت جل کر رہ گیا
دیکھ کر مین اُسکو اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا

بن دیکھے جس کے پل مین آنکھین بھر آئیان ہون
کیا قہر ہے کہ اُس سے برسون جدائیان ہون

اے شب ہجر کہین تیری سحر ہے کہ نہین
نالۂ نیم شبی تجھ مین اثر ہے کہ نہین

گھر کا دروازہ جو ہم صبح کو وا کرتے ہین
شام تک تیری ہی بس راہ تکا کرتے ہین

ہے غریبی مین خبر کس کو وطن والون کی
کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والون کی

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے مین جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

لوگ کہتے ہین محبت مین اثر ہوتا ہے
کون سے شہر مین ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

کس نے رکھے تھے قفس اُن پہ گرفتارون کے
کانٹے کیون سُرخ ہین سب باغ کی دیوارونکے

نہ کہین صبح ہی ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے
رات کیا آتی ہے اک سر پہ عذاب آتا ہے

کب اس طرف وہ بت کج کلاہ آتا ہے — گدا کے گھر بھی کہین بادشاہ آتا ہے

میر صاحب کی چوتھی خصوصیت کے بارے مین آزاد کہتے ہین کہ

"ان کی غزلین ہر بحر مین کہین شربت اور کہین شیر و شکر ہین مگر چھوٹی چھوٹی بحرون مین فقط آب حیات بہاتے ہین - جو لفظ منہ سے نکلتا ہے تاثیر مین ڈوبا ہوا نکلتا ہے - مگر یہ بھی بعض بزرگون سے معلوم ہوا کہ مشاعرے یا فرمائش کی غزلین ایسی نہ ہوتی تھین - جیسی کہ طبع زاد طرح مین ہوتی تھین - (آب حیات صفحہ ۲۱۳)

شیخ مصحفی مرحوم کی بھی جو غزلین بحر خفیف مین ہین ان کے رنگ شاعری کو اور زیادہ واضح کرتی ہین - اُن کا ایک ایک لفظ آئینہ ہے اور یہ تمام آئینے اس حسن ترکیب و ترتیب سے رکھے گئے ہین - کہ ذراسی ٹھیس لگ جانے سے ٹوٹ جانے کا احتمال ہوتا ہے - اگر میر تقی مرحوم کی غزلون کو صرف آب حیات کی نہرین کہا جا سکتا ہے تو شیخ مصحفی مرحوم کی چھوٹی چھوٹی غزلین اپنی تازگی اور صفائی مین سلسبیل و کوثر سے جا ملتی ہین

صاحب آب حیات نے اپنی تصنیف مین شیخ مرحوم کی ان بیش بہا اور قیمتی غزلون کے متعلق ایک حرف بھی نہین لکھا تو ہمین اسکا افسوس نہین کیونکہ جیسا کہ ابتک ثابت کیا جا چکا ہے - آب حیات مین جسقدر تعریف یا تعریض کی ہے وہ کسی واقفیت فن کا نتیجہ نہین ہے - بلکہ یون ہی ایک کی محبت اور دوسرے کی عداوت کے جوش و خروش مین جو الفاظ زبان قلم پر آگئے ہین بے تکلف ادا کر گئے ہین

ان کی خاموشی سکوت سخن شناس نہین ہے البتہ ان کی تعریف تحسین ناشناس ضرور ہے - اسلئے ہم خوش ہین کہ شیخ مصحفی کے چند پارہائے جگر ایک ناشناس کی تحسین کے تیرون سے محفوظ رہ گئے ورنہ ان کی قیمت کم ہو جاتی

آب حیات مین جو مسلک تمام جذبات گو شعرا کے لئے جائز رکھا گیا ہے اس سے یہ اُمید نہین پڑتی - کہ آزاد ان خوبیون کو عمداً نظرانداز کر گئے اگر ان کی نظر پہنچ جاتی تو اپنی مسلمہ فطرت کی بنا پر بگاڑ سنوار کرتے اور جا بجا جلی کٹی سنانے مین کوتاہی نہ کرتے اور نہین معلوم کن الفاظ مین با کمال مگر غریب الوطن مصحفی پر پھبتیان اُڑائی جاتین - البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا تیر نشانہ پر نہ بیٹھا - اور نگاہ غلط انداز سے ایک ایسی غلطی ہو گئی - جو حلقۂ احباب مین عرصے تک سرگوشیون کا سبب بنی رہیگی - چند غزلین اور ملاحظہ ہون :-

مین خستہ تمام ہو چکا اب — جا درد کہ کام ہو چکا اب
زلفون مین پھر اُس نے منہ چھپایا — بس وعدۂ شام ہو چکا اب
سیر شب ماہ یار تک تھی — لطف لب بام ہو چکا اب
دربار ہو یا نہ ہو عرض کیا — اپنا تو سلام ہو چکا اب

رکھا تہ خاک مصحفی کو　　آرام تمام ہو چکا اب

یون چلتے ہین لوگ راہ ظالم　　یہ چال ہے کون آہ ظالم
غیرون کو تو روز دیکھتا ہے　　مجھ پر بھی کوئی نگاہ ظالم
کس کس کو ملے گی حشر مین داد　　اک خلق ہے داد خواہ ظالم
کہدے کوئی جا کے مصحفی سے　　ہوتی ہے بُری یہ چاہ ظالم

کیا کرین جا کے گلستان مین ہم　　آگ رکھ آئے آشیان مین ہم
مر کے نکلے قفس سے خوب ہوا　　تنگ آئے تھے اس مکان مین ہم
شاخِ گل کے گلے سے مل مل کر　　روتے ہین موسم خزان مین ہم
مصحفی عشق کر کے آخر کار　　خوب رسوا ہوئے جہان مین ہم

ایک ایک شعر بے مثل ہے

اپنے مژگانِ رخنہ گر کو دیکھ　　آن کر پھر مرے جگر کو دیکھ
میرے آگے نہ دیکھ آئینہ　　میری حسرت بھری نظر کو دیکھ
دیکھنا کیا ہے عقد پروین کا　　اپنے آویزۂ گہر کو دیکھ
تھی شبِ وصل کھل گئی جب آنکھ　　رنگ فق ہو گیا سحر کو دیکھ
مصحفی یہ ستم نکر نادان　　خط نہ دے اپنے نامہ بر کو دیکھ

بیٹھ کر وہ جہان سے اُٹھتا ہے　　ایک فتنہ دہان سے اُٹھتا ہے
نالہ کرتی ہے جس گھڑی بلبل　　شعلہ اک آشیان سے اُٹھتا ہے
جم کے جو سنگ کی طرح بیٹھا　　کب ترے آستان سے اُٹھتا ہے
مصحفی ضبط آہ کر ورنہ　　پردہ رازِ نہان سے اُٹھتا ہے

غمِ دل کا بیان چھوڑ گئے　　ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے
چلتے چلتے بھی یہ جفا کیشان　　ہاتھ مجھ پر ندان چھوڑ گئے

صفحۂ روزگار پر لکھ کر عشق کی داستان چھوڑ گئے
راہ مین مجھ کو میرے ہمراہی جان کر ناتوان چھوڑ گئے
لے گئے سب بدن زمین مین ہم مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

الغرض زبان کی سلاست بیان کی دلآویزی اور خیالات کی واقعیت مین میر صاحب اور شیخ صاحب مین صرف یہی امتیاز ہے کہ میر صاحب متقدم ہونے کے سبب سے افضل سمجھے جاتے ہین اور شیخ صاحب مقلدین کے گروہ مین آکر آگے بڑھنے سے رہ گئے ہین۔ اسی بنا پر مولانا حسرت موہانی نے فیصلہ کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی مصحفی کا کلام میر سے دوسرے درجے پر ہے

آزاد صاحب کی منطق یہان بھی دنیا سے نرالی ہے کہتے ہین

"اسی کوچے مین اکثر شعر میر صاحب کے بھی جھلک دکھاتے ہین مگر جو اُن کے جوہر ہین وہ اُن ہی کے ساتھ ہین یہ اس ڈھنگ مین کہتے ہین۔ تو بھسنڈے ہو جاتے ہین (آب حیات صفحہ ۳۱۲)

ہم پوچھتے ہین کہ آخر میر صاحب کے جوہر کیا ہین زبان کے متعلق تو یہ ہے کہ خود آزاد نے اسی آب حیات مین اُن کو میر و سودا کا ایک آخری ہمزبان قرار دیا ہے۔ نیز ہم نے صفحات بالا مین مماثلت میر و مصحفی کی بنیاد جن اصول پر رکھی ہے وہ ان ہی کے بیان کردہ ہین اسکے بعد محاسن زبان کا قضیہ تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اب رہے مضامین۔ پس اگر یہ فقرہ مضامین سے تعلق رکھتا ہے۔ تو اسقدر تشریح کے بعد بھی جس مین الفاظ و معنی اور زبان و بیان دونون کا لحاظ مساوی طور پر قایم رہا ہے ہم دس پانچ مثالیں مہیا کرنے مین بخل نہین برت سکتے ہمین تو دروغ گو را تا بخانہ رسانید۔ پر عمل کرنا ہے۔ اور محض یہ دکھانا ہے کہ میر تقی کے انداز مین کوشش کرتے ہوئے شیخ مصحفی بھسینڈے ہو کر رہ گئے ہین یا آزاد نے محض تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی مین اور اضافہ کر لیا ہے

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر[1] نکلا (میر)
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم تیرے دل مین تو بہت کام رفو کا نکلا (مصحفی)

شیخ مصحفی مرحوم کے دونون مصرعے جسقدر برجستگی کے ساتھ زبان مین ڈوب کر نکلے ہین اسکا لطف بے تعصب اہل زبان اُٹھا سکتے ہین

اس بیکسی سے کون جہان مین موا کہ مین جز داغ سینہ آج چراغ لحد نہین (میر)
داغ حسرت لے گئے دنیا سے بعد مرگ ہم کون لاتا ہے غریبون کے سر مدفن چراغ (مصحفی)

میر صاحب کے شعر سے اوّل تو داغ کی توجیہ نہین ہوتی۔ دوسرے بادی النظر مین یہ معلوم ہوتا ہے کہ چراغ لحد اُس چراغ کا نام ہے جو لحد کے اندر جلے کیونکہ سینے کا داغ جو اُسکی نیابت کا حق ادا کر رہا ہے لحد سے باہر نہین ہو سکتا لیکن مصحفی مرحوم نے چراغ کو چراغ مدفن اور داغ کو داغ حسرت کہہ کر مضمون کو دونون لغزشون سے بچا دیا شیخ مرحوم کے شعر مین ایک مخفی پہلو اور لطیف کنایہ

---

[1] میرے نزدیک ان دون شعرون کا تقابل اصولاً درست نہین۔ (اڈیٹر)

بھی ہے کہ جب زندگی مین کسی نے توجہ نہ کی اور ہمین داغ حسرت لیجانا پڑا تو مدفن پر چراغ جلانیکی توفیق کیسے ہو سکتی ہے۔ گور غریبان کی رعایت سے مرنے والون کو غریب کہنا لطف سے خالی نہین کاش آزاد انصاف سے کام لیتے اور شیخ مصحفی مرحوم کے حسن کلام کو جو مرنیوالے کی تربت کا چراغ ہو کر تحفظ نام و نشان کا سبب واحد تھا۔ اس طرح ناحق شناسی کے دامن کے سپرد کرنے سے پرہیز کرتے

امید وار وعدۂ دیدار مر چلے — آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا (میر)

مدت ہوئی کہ بیٹھے ہین ہم انتظار مین — کیا جانے آتے آتے قیامت کہان رہی (مصحفی)

میر صاحب کے دوسرے مصرعہ مین "یارو" ایک زائد لفظ[1] معلوم ہوتا ہے۔ نیز امیدوار وعدۂ دیدار کا مر جانا یا مرنے کے قریب پہونچ جانا جذبۂ محبت و مودت کے بالکل منافی ہے اسکے خلاف شیخ مصحفی کا پورا شعر روانی اور برجستگی کے قالب مین ڈھل کر نکلا ہے اور میر کے شعر سے زیادہ کیفیات کا حامل ہے

ہم فقیرون سے بے ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا (میر)

امیدِ کرم پر تری آتے ہین یہان تک — جسروز نہ دیکھینگے کرم بیٹھ رہینگے (مصحفی)

میر صاحب کے شعر مین بے ادائی ایک ایسا لفظ ہے جسکے معنی شعر کے لئے کچھ زیادہ مفید نہین کیونکہ ادا بمعنی کرم[2] جمہور کے خلاف ہے۔ نیز پیار[3] کرنا شان معشوق کے خلاف ہونیکی وجہ سے نامناسبت کا پہلو رکھتا ہے۔ البتہ شیخ مصحفی مرحوم کا شعر ہر لحاظ سے بلند تر ہے۔

وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن — سُنکر جسے خضر نے سفر سے حضر کیا (میر)

جس بیابان خطرناک مین ہے اپنا گذر — مصحفی قافلے اُس راہ سے کم نکلے ہین (مصحفی)

میر صاحب کا دوسرا مصرعہ خضر سفر حضر تین متفق الحرکات کے الفاظ کے اجتماع سے ثقیل ہو گیا ہے۔ اور پہلے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشت خوفناک کسی وقت وطن کی حیثیت رکھتا تھا۔ بحالت موجودہ اس سے کوئی تعلق نہین۔ لیکن شیخ مصحفی مرحوم کے شعر پر ایسا کوئی اعتراض وارد نہین ہوتا۔ بلکہ ایک اور لطیف پہلو یہ نکلتا ہے کہ مین جس خطرناک بیابان مین سرگرم سعی ہون اس راستے سے یکہ و تنہا آدمی تو کیا قافلون کو بھی قدم رکھنے کی ہمت نہین پڑتی

آزاد صاحب نظر ہوتے تو اندھیرے اُجالے کا جو فرق شیخ مصحفی اور خواجہ آتش کے کلام مین نظر آیا میر صاحب و شیخ صاحب کے کلام مین زیادہ آسانی کے ساتھ نظر آسکتا تھا

جون صبح اب کہان ہے طول سخن سے فرصت — قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا (میر)

شمع سحری ہین نہین کچھ عمر کو وقفہ — یان کام ہے اپنا تو تمام ایک نفس مین (مصحفی)

میر صاحب کا شعر طول و مختصر کی صنعتِ تضاد کے سوا کوئی خاص خوبی نہین رکھتا۔ بلکہ انسان فانی کو صرف سحر کے ساتھ

---

[1] ہرگز زاید نہین (اڈیٹر) [2] میر نے ادا بمعنے کرم کب استعمال کیا ہے۔ بے ادائی یہ معنے بے رخی آیا ہے۔ (اڈیٹر)

[3] پیار کرنا اس معنی مین نہین ہے جو صاحب مضمون نے سمجھا ہے (اڈیٹر)۔

تشبیہ دیئے جانے کی وجہ سے ایک حد تک قابل اعتراض بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ مضمون بھی شیخ مصحفی مرحوم کے حصے کا ہو گیا شمع سحری کہکر ایک نفس مین کام تمام کرنا کس قدر لطف آمیز ندرت ہے

سعیِ طوفِ حرم نہ کی ہم نے — آستان پر ترے مقام کیا (میر)

کیا غرض تھی طرف دیر و حرم کیون جاتے — اسکے کوچہ مین ہمین عمر بسر کرنا تھا (مصحفی)

شاعرانہ طور پر طلب حق کے دو راستے مانے جاتے ہین ایک دیر دوسرا حرم لیکن عاشقان صادق ان جھگڑون مین پڑنا پسند نہین کرتے بلکہ براہ راست اپنے مطلوب کے آستانِ ناز پر زندگی بسر کرنے کو عین طاعت و عبادت خیال کرتے ہین یہی مضمون ہے جو دونون کے یہان بیان ہوا ہے لیکن شیخ مصحفی کا طرز بیان زیادہ مدلل۔ زیادہ واضح اور زیادہ محیط ہے "کیا غرض تھی" اس جملے مین دیر و حرم سے بے تعلقی ظاہر کرنے کا جو زور ہے وہ "سعیِ طوفِ حرم نہ کی" سے پیدا نہین ہو سکتا۔ اور "اس کوچہ مین ہمین عمر بسر کرنا تھا" اس مصرع نے عاشق کے جس طور زندگی کی قید کر دی۔ وہ میر صاحب کے دوسرے مصرعہ کے مقابلے مین کہین بڑھ چڑھکر ہے نیز صرف حرم پر اکتفا نہ کرکے دیر و حرم دونون کو نظر انداز کر دینے کا مسئلہ بھی خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے قابل ہے۔ غرض ہر جہت سے شیخ مصحفی کا شعر بلند ہے۔ مگر افسوس یہ بلندی آزاد کی نگاہ مین پستی کی ہم معنی ہے

طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب — سر پہ مرے کرور برس تک ہما پھرا (میر)

دیا ہے مجھ کو یہ برگشتہ طالعی نے اثر — کہ آکے سر پہ میرے سایۂ ہما پھر جائے (مصحفی)

میر صاحب کے شعر مین "طالع جو خوب تھے" ثقیل انداز بیان ہے۔ "کرور برس تک" مبالغہ ہے اور مبالغہ بھی کرجس سے طوالت وقت کے سوا کچھ منظور نہین "ہما پھرا" ایسے برے پہلو سے نظم کیا گیا ہے کہ اصلی معنی بھی خاک مین مل گئے۔ برخلاف اس کے شیخ مصحفی کا شعر ہر لحاظ سے بلند ہے۔

کیا رکھا کرتے ہو آئینہ سے صحبت ہر دم — ٹک کبھو بیٹھو کسی طالب دیدار کے پاس (میر)

میرے آگے نہ دیکھ آئینہ — مری حسرت بھری نظر کو دیکھ (مصحفی)

میر صاحب کا شعر زبان کے لحاظ سے کچھ زیادہ صاف اور ترکیب کے لحاظ سے کچھ زیادہ برجستہ نہین پھر اسمین وہ بیتابی اور بیقراری بھی نہین پائی جاتی جو شیخ مصحفی مرحوم کے شعر کا اصلی جوہر ہے۔ معشوق نہین معلوم کس خیال سے عاشق کے سامنے آئینہ بینی مین مصروف ہو جاتا ہے۔ عاشق اس بات کو گوارا نہین کر سکتا کہ اسکی موجودگی مین کوئی دوسری ہستی دیدار یار سے فیض یاب ہو۔ اور نہایت بیتابی کے ساتھ محو آرائش معشوق سے کہتا ہے کہ او ظالم تو میرے سامنے آئینہ کیون دیکھتا ہے اس وقت تو میری حسرت بھری نظر کو دیکھ۔ تیرا مطلب اسی سے پورا ہو سکتا ہے۔ حسرت بھری نظر کو دیکھنے کے دو مقصود ہین۔ ایک تو یہ کہ حسُن کی قدر کرنا اہل نظر کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ صاحب حسُن اپنے حسُن کے اوصاف آئینہ دیکھکر معلوم نہین کر سکتا اس کے لئے پھر کسی حسرت بھری نظر کی ضرورت ہے۔

ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہونچا نہ میر　　مدتون سے ہم حرم مین تھے پہ نامحرم گئے　　(میر)

ابتک حرم وصل سے محرم نہ ہوئے ہم　　کعبہ مین حجاب در و دیوار غضب ہے　　(مصحفی)

دونون کے یہان تصوف کا ایک مسئلہ نظم ہوا ہے - میر صاحب کہتے ہین کہ ہم ایک مدت سے حرم مین تھے - لیکن صاحب خانہ سے مطلق ربط پیدا نہ ہوسکا - آخرکار نامحرم ہی جانا پڑا اول تو یہان ربط پیدا نہ ہونیکی کوئی وجہ ظاہر نہین کی گئی - دوسرے حصول مقصد سے پہلے منزل کوشش و سعی سے قدم اُٹھا لینا حقیقی جذبۂ محبت کے منافی ہے اس کے خلاف شیخ مصحفی کے الفاظ و معنی بجائے خود مستقل ہین صاحب خانہ کے بجائے حرم سے محرم نہ ہونا کسی دوسری دنیا مین پہونچا دینے والا جملہ ہے - دوسرا مصرعہ جس تیور سے ادا ہوا ہے - اُس نے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہین رکھی - اور صاف ثابت کردیا کہ مجردات تک رسائی حاصل کرنے کیلئے مادیات کا سہارا لینا خوفناک غلطی ہے - حجاب در و دیوار ایک ترکیب ہے - منجملہ ان خوشگوار ترکیبون کے جو شیخ مصحفی کے کلام مین اکثر پائی جاتی ہین

یہ چند مثالین اس بات کا ثبوت دینے کے لئے کافی ہین - کہ میر صاحب اور شیخ صاحب کے میدان شاعری اور حدپرداز تخیل مین ذرہ بھر تفاوت نہین حالانکہ آزاد حب الوطنی کے جوش یا خدمت بزرگانِ خاص کے شوق مین غریب الوطن اور بیکس مصحفی کو میر تقی کے مقابلہ ہین نہین بلکہ بعض چھوٹے درجے کے شعرا کے سامنے بھی ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے حیرت ہے

شاید آزاد کا یہ خیال ہو کہ میر صاحب کے کلام کی بندشین چست اور ترکیبین درست ہین اور شیخ مصحفی مرحوم کا کلام ان اوصاف سے خالی ہے تو ہم چند ہم قافیہ اشعار درج کرکے حسن و قبح کا فیصلہ اہل نظر پہ چھوڑتے ہین

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیوانین　　سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا　　(میر)

ہوش اڑ جائینگے او زلف پریشان تیرے　　لب پر آیا جو مرے ذکر پریشانی کا　　(مصحفی)

وہ بھی جانے کہ لہو رو کے لکھا ہے مکتوب　　ہم نے سرنامہ کیا کاغذ افشانی کا　　(میر)

ہم اسیرون کو قفس مین نہ ملا لطف فراغ　　شوق جی ہی مین رہا بال و پرافشانی کا　　(مصحفی)

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رخسار پری کا　　چلتا نہین کچھ آگے ترے کبک دری کا　　(میر)

مردون کو جلاتی ہے ترے پاؤن کی ٹھوکر　　اس چال پہ مرتا ہے بجا کبکِ دری کا　　(مصحفی)

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت　　اسباب لُٹا راہ مین یان ہر سفری کا　　(میر)

کیا لطف مقام اُن کو جو مشتاق عدم ہین — دل کوچ مین رہتا ہے ہمیشہ سفری کا (مصحفی)

گیا گئے آہ جی کو قیامت ہے انتظار — آتا نہ کاش وعدۂ دیدار درمیان (میر)
ہم روئے عیش دیکھ چکے روز حشر بھی — یون ہی رہا جو وعدۂ دیدار درمیان (مصحفی)

دفتر نہین کہانی نہین مثنوی نہین — کیا شرح سوز عشق کرون مین زبان نہین (میر)
اسکا یہی سبب ہے جو گرم فغان نہین — اپنا تو اس چمن مین کوئی ہمزبان نہین (مصحفی)

عبارت خوب لکھی شاعری انشا طرازی کی — وے مطلب ہی کم دیکھین تو کب ہووے مدعا حاصل (میر)
کسی نے کر لیا معلوم رازِ دل تو کیا حاصل — مزا جب ہے کہ ہو چکیے ہی چُپکے مدعا حاصل (مصحفی)

زمین پر مین جو پھینکا خط کو کر بند — بہت تڑپا کیا جون مرغِ پر بند (میر)
مرے سینے مین دل بیتا بیون سے — پھڑکتا ہے مثالِ مرغ پر بند (مصحفی)

افسر امروہوی

تذکرۂ خندۂ گل

ظریف شاعرون کا تذکرہ

جس مین ۳۰۰ سو سے زاید اردو، فارسی کے ظریف شاعرون کے حالات، انکے لطایف وظرایف اور انتخابات کلام درج ہین ـ یہ کتاب اردو مین اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری مین اسکا رہنا ضروری ہے ـ تنہائی مین اس سے بہتر مونس، حالت غم مین اس سے زیادہ کامیاب ذریعۂ تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہین نہین مل سکتا.

حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات (قیمت مع محصول ڈاک للعہ) مینجر «نگار» لکھنؤ

سیّاح کی ڈائری

(موجودہ اکابر لکھنؤ)

اس سے قبل میں جب کسی کا شعر سنتا تھا، تو اپنے تاثر یا شعر کے اثر کے لحاظ سے شاعر کی ایک ذہنی تصویر قایم کر لیتا تھا اور جب تک اسکو دیکھ نہ لیتا، اسی خیالی صورت کے ساتھ ساتھ اس کے کلام کا مطالعہ کرتا تھا، لیکن جب بعد کے تجربات نے ثابت کیا کہ ہندوستان کا شاعر اپنے "عالم شعر" سے بالکل علحدہ چیز ہوتا ہے اور اس کے اقوال سے کبھی اس کے حال و اعمال پر صحیح حکم نہیں لگایا جاسکتا، تو میں نے اس اصول پر کاربند ہونا ترک کر دیا اور دوسرا اصول بالکل اس کے خلاف یہ قائم کیا کہ "سب سے اچھا شاعر سب سے بڑا انسان ہے" ہر چند اس اصول کی بھی صحت پر مجھے وثوق تام نہیں ہے، لیکن یہ اتنا غلط بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر سب سے اچھا شاعر سب سے بڑا انسان نہیں ہوتا تو کچھ ایسا زیادہ دلکش و پسندیدہ چیز بھی نہیں ہوتا کہ اس اصول کو کلیۃً غلط قرار دے دیا جائے۔

اول اول جب میں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا تو ان کے خیال کی رفعت اور جذبات کی اثیریت کو سامنے رکھ کر جو صورت میں نے اُن کی قایم کی، یہ تھی:-

"ایک نحیف الجثہ انسان (دماغی ترقی اور صحت جسمانی دونوں کا اجتماع کبھی میرے ذہن میں نہیں آتا) بڑی چمکیلی آنکھیں، داڑھی اگر ہوئی تو بالکل "مترسل الشعر" قسم کی ورنہ چار ابرو کا صفایا۔ ہنستے کم ہوں گے لیکن باریک جلد کے نیچے ایک خاص قسم کا نورانی خندہ ہر وقت جھلکتا ہوگا، معاشرت نہایت سادہ مگر پاکیزہ ہوگی، بہ لحاظ اخلاق کے یکسر عجز و فروتنی ہوں گے، بات بات پر آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہوں گی اور بہ حیثیت مجموعی ان میں ایک ایسی کشش ہوگی کہ انسان خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہوگا، لباس بالکل مشرقی وضع کا ہوگا اور نمائش سے بالکل دور"

لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھے کس قدر تکلیف ہوئی کہ وہاں ایک بات بھی میرے مزعومات کے مطابق نہ تھی۔ میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ شلوار پہنتے ہوں گے جو مردوں کے لئے سدرجہ غیر شاعرانہ ملبوس ہے اور اونچا کوٹ جو پنجابی یونیفارم کا جزو غیر منفک ہے، استعمال کرتے ہوں گے، جسے کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کر سکتا، ہر چند یہ ضروری نہیں کہ معمولی گفتگو بھی ایک شاعر کی شاعرانہ دلکشی رکھتی ہو، لیکن اس کا تو وہم بھی کبھی نہ گذرا تھا کہ وہ قیام کو کیام اور قہقہہ کو کہکہہ بولتے ہوں گے۔

وہ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے اور میں حیران تھا کہ خدایا یہ اقبال دفعۃً اکبال کیسے بن گیا۔ آنکھیں چھوٹی اور بہت چھوٹی، جسم پہلوانی کے لگ بھگ فربہ و تربیت یافتہ، حقہ (حُکّہ) کے غیر لطیف و کثیف استعمال کی کثرت سے کمرے کی ساری فضا بدبو سے لبریز، چہرہ کی ساخت نقشہ کی قطع و برید یکسر غیر دلچسپ اور عواید میں کوئی دلکشی نہیں ——

اس کے بعد بھی جب میں کسی شاعر یا بڑے انسان سے ملا تو سوائے ایک ٹیگور کے کہ وہ تو بیشک وہی نظر آیا جیسا میں نے سمجھا تھا، ورنہ سب کو

ہمیشہ اپنی ذاتی تصویر سے اس کو بالکل مختلف پایا، اور آخرکار میں نے تصدکرکے اپنی ذہنی مصوری کے اصول کو بدل دیا۔ اور آئندہ کے لئے یہ عہد کیا کہ جب کبھی کسی کا شعر سنوں گا، تو کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کروں گا کہ اس کا کہنے والا کون ہے، اور اگر یہ جاننے کے بعد میں، کوئی تصویر قائم کرونگا بھی تو بالکل اپنے تاثرات کے خلاف۔

لکھنؤ آنے سے قبل میں یہاں کے مشہور شعرا کا کلام دیکھ چکا تھا اور ان کی شکل و صورت، عادات و اخلاق کے متعلق بھی ایک حکم لگا چکا تھا، اس لئے میں بے چین تھا کہ کسی طرح ان سے ملوں، ان کی زبان سے ان کا کلام سنوں اور پھر اس کے مطابق اپنے "ذہنی مرقع" کی صحت کروں۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں ایک خیالی فہرست مرتب کر چکا تھا کہ مجھے کیا کیا دیکھنا ہے اور کس کس سے ملنا ہے، چنانچہ میں اپنے ذہن کی رفتار کے لحاظ سے جس کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا، بغیر رعایت حروف تہجی کے حسب ذیل اسمار کی فہرست تیار کر چکا تھا

چھتر منزل۔ صفی۔ بٹیروں کی پالی۔ عزیز۔ محشر۔ آرزو۔ قیصر باغ۔ جالب۔ رحم علی ہاشمی۔ ممتاز حسین۔ عروج۔ آصف الدولہ کا امام باڑہ ناطق۔ احسن۔ بیلی گارد۔ ثاقب۔ نولکشور پریس۔ آسی۔ افسر۔ خان بہادر عین الدین کی ٹی مجسٹریٹ۔ فرنگی محل کا پل، کپتان کے کنویں کی برفی، اور تحسین کی مسجد۔ جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا، اس فہرست میں بعد کو بہت کچھ حذف و اضافہ ہوا، لیکن میرے خیال کی جولانگاہ اول اول یہی تھی جو فہرست بالا سے ظاہر ہوتی ہے۔

صبح اول وقت میں اس ارادہ کی تکمیل کے لئے نکلنے ہی والا تھا کہ وہی پارک والے "لقیط"[1]، قسم کے دوست آگئے اور انہوں نے حدیقۃ الحیوانات کا ذکر کرکے جسے یہاں بنارسی باغ کہتے ہیں میری فہرست میں ایک نام کا اضافہ اور کر دیا۔ صبح کا وقت تھا، موسم بھی خوشگوار تھا، اس لئے انہی کی رہبری میں حضرت گنج کی مغربی معاشرت کی آبادی سے گزرتا ہوا اس وسیع مقام پر پہونچ گیا، جو بیک وقت مرغزار بھی ہے اور صحرا بھی، باغ بھی ہے اور خشک میدان بھی۔ وحوش و طیور کو ان کی طبعی حالت پر دیکھنے کا مجھے بہت شوق ہے، اور ہر چند انسانی گرفت میں آنے کے بعد ان کی حقیقی وحشت درمیدگی باقی نہیں رہتی، لیکن یہاں بڑی حد تک آزادی کے اسباب فراہم کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شیروں کے لئے بھی تنگ کٹہرے کے ایک وسیع حصہ کو آہنی سلاخوں کے حصار سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ جہاں ان کے لئے نیستان، کوہستان اور پانی کے حوض بنا دئے گئے ہیں۔ یہاں کا سب سے زیادہ رومانی حصہ وہ قطعۂ زمین ہے جہاں یوکلپٹس کے سرو آسا کلاہ افگن بلندی کی حد تک پہونچنے والے درختوں کا مختصر سا جنگل تھوڑی دیر کے لئے انسان کو تہذیب و تمدن کے تمام دل و دماغ تھکا دینے والے جذبات سے علحدہ کرکے ایک ایسی معصوم دنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں بغیر کسی معشوق کی موجودگی کے عشق کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

جب دھوپ تیز ہونے لگی اور واپس آنے کا خیال کیا تو میرے رہبر مجھے سنگ مرمر کی اس خوبصورت و خنک بارہ دری میں لے گئے، جہاں کسی وقت یہاں کے فرمانروا بیٹھتے ہوں گے لیکن اب صرف باغ کے مالی رونق افروز رہتے ہیں۔ یہیں ان کے دو دوست اور ملگئے جو اتفاق سے دونوں میرے یہاں درج رجسٹر تھے۔ ان کو میں اس وقت تک صرف آسی اور افسر کے نام سے جانتا تھا، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انکا اصلی نام مجھ کو بتایا جائے، لیکن آرزو سے تقدیر نہیں پھرتی اور آخرکار ان دونوں کے نام (عبدالباری، اور حامد اللہ) جو غیر معمولی طور پر غیر شاعرانہ

[1] لقیط عربی میں اس بچہ کو کہتے ہیں جو کہیں اتفاق سے پڑا ہوا ملجائے۔

واقع ہوئے ہیں مجھے بتا ہی دیئے گئے۔ یہ گویا پہلا شگون بد تھا جو جانوروں کے مطالعہ سے فارغ ہونے کے بعد ان دو ثقیل اور سامعہ شکن نام رکھنے والے شاعروں کی صورت میں ظاہر ہوا ــــ جناب آسی دوہرے بدن کے آدمی ہیں لیکن ادائیں ان کی سب اکہری ہیں (اکہری کا لفظ میں نے سادہ اور غیر مصنوعی کے معنے میں استعمال کیا ہے) خندہ رُد[۵۱]، تبسم لب، قہقہہ پیشانی (گھوڑے کا ستارہ پیشانی ہونا اور بات ہے) انسان ہیں، آنکھوں میں شرارت آمیز حیا، چتون میں ہلکی سی متانت آغشتہ شوخی، رفتار میں خفیف سی لٹک آسامیکی، اور گفتار میں ہلکی سی شکریں حلاوت، سبھی کچھ ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی دیکھنے والے پر جو اثر پیدا ہوتا ہے اُسے ہم صرف "حلز دیت[۵۲]" سے تعبیر کر سکتے ہیں، جو ممکن ہے ان کی انتہائی سادگی و نیکی کا انعکاس ہو۔ قیافۃً فی الجملہ ذہین ہے، لیکن نگاہیں دور رس نہیں معلوم ہوتیں۔ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور سولہ سترہ سال سے لکھنؤ میں بسلسلہ ملازمت مقیم ہیں۔ باوجودیکہ تقریباً ربع صدی سے لکھنوی شعرا کے ہجوم میں اور لکھنوی شاعری کی محافل میں زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن ان کی شاعری کسی طرح یہاں کی آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوئی اور ان کی غزلیں ان جذبات بلند کی حامل ہوتی ہیں جو یقیناً ان کو کاروبار زندگی و مشاغل حیات کو دیکھتے ہوئے حیرت میں ڈال دینے والی ہیں۔ لکھنؤ کے عام رواج کے مطابق یہ بھی غزل گا کر فرماتے ہیں، ہر چند اپنے پندار میں وہ بہت زبردست موسیقی پیدا کرتے ہیں اور آواز میں بھی وہ نزاکت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو "دشنام یار" کو بھی "طبع حزیں" پر گراں نہ گذرنے دے، لیکن قدرتی محرومی کا کیا علاج کہ نہ مردانہ لب و لہجہ باقی رہتا ہے نہ نسائی غنا پیدا ہوتا ہے اور اس لئے جس حد تک پڑھنے کا تعلق ہے غزل بالکل مخنّث ہو کر رہ جاتی ہے۔ عام شعراء کی طرح انہیں اپنا کلام سنانے کی ہوس نہیں ہے، اس لئے میرے اصرار پر چند مختلف اشعار انہوں نے سنائے جن میں سے بعض مجھے اب بھی یاد ہیں۔

افسر میرٹھی ایک پستہ قد انسان ہیں اور غالباً فطرت کے مقصود کو شرمندہ کرنے والے نہیں ہیں۔ ایک قیافہ شناس کے لئے ان کے چہرہ کی ساخت اور اس کے خطوط میں کافی سامان مطالعہ مل سکتا ہے ــ میں صرف اس قدر سمجھ سکا کہ سرسری ملاقات میں ان کو سمجھ کر مطمئن ہو جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ ان کی شگفتہ روئی اگر وہ واقعی عوائد رسمیہ کی بنا پر ہو تو صحرا کے سراب سے زیادہ نہیں، لیکن ان کا وہ خندۂ بے اختیار بھی نہیں چھپتا، جب ان کا دل صداقت کے ساتھ اس پر مجبور کرے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کی آنکھیں فریدی قسم کی ہیں، یعنے ایک چھوٹی اور دوسری بڑی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ رقبہ کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں، البتہ ایک کی ساخت مدور ہے اور دوسری کی مستطیل، اور اس طرح گویا اہرمن و یزداں دونوں ہر وقت ان کھڑکیوں سے جھانکتے رہتے ہیں۔ چونکہ میں ان کی بائیں جانب یعنے ان کے یزدانی حصۂ دماغ کی طرف تھا اس لئے مجھے ان کی اہرمنی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ آدمی بہت سلجھے ہوئے ہیں، اور کافی غور کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے کے عادی ہیں۔ ان کی شاعری بڑی حد تک "شب پرستانہ" قسم کی ہے مگر "شب رو" نہیں، آسمان، ستارے، کہکشاں، چاند، ان کے ذرائع پیام رسانی ہیں، اور مقصود شاعری "درس حیات" ــ ٹیڑھی میڑھی بحروں میں، ٹوٹے ٹوٹے شعر لکھنا ان کا خاص ذوق ہے، جس سے

---

[۵۱] اصل میں یہ لفظ خنداں رُو ہے لیکن اکثر خندہ رُو لکھتے ہیں اور اسی کو سامنے رکھ کر باقی دو لفظ اختراع کئے گئے ہیں۔

[۵۲] میں نے قصداً عربی کا نہایت ثقیل لفظ استعمال کیا ہے اگر کوئی شخص اس کا مفہوم جاننا چاہتا ہے تو لغت سے مدد لے

بعض جگہ "انجیلی" (Biblical) کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ تغزل میں ان کی جذبات نگاری کے بعض شعر میں کبھی نہیں بھول سکتا

واپسی کے وقت نولکشور پریس میں مرزا محمد عسکری بی۔ اے اور پریم چند کی زیارت ہوئی۔ مرزا صاحب یہاں کے شعبۂ اردو کے مہتمم ہیں اور باوجود ضعف و پیرانہ سالی کے پوری جوانانہ سرگرمی کے ساتھ تحریر و مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کا آخری علمی کارنامہ "تاریخ ادب اردو" ہے جو تقریباً ... صفحات کو محیط ہے۔ لکھنؤ میں مسلم اکاڈیمی کا وجود آپ ہی کی ذات سے قائم ہے، کیونکہ نہ آپ ہر ماہ اپنے مکان پر ممبروں کو پر تکلف دعوت دیں اور نہ کوئی شرکت کے لئے مجبور ہو۔ ارادہ ہے کہ محض لطف دعوت کے لئے میں بھی عارضی ممبر بن جاؤں، کیونکہ یوں بظاہر ان سے امید نہیں کہ "مسافر نوازی" سے کام لیں، اکاڈیمی میں اس وقت تک بعض اچھے اچھے مضامین پڑھے جا چکے ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے مرزا صاحب ہی کے شغف علمی کا۔ مرزا صاحب سرخ و سپید رنگ، باریک کترے ہوئے نقشہ کے انسان ہیں اور اس حد تک "صنادید عجم" کے آثار آپ میں نمایاں ہیں کہ بے اختیار جی چاہا کہ ایام خزاں میں ان کے "افسانہائے بہار" سنوں، لیکن ہم لوگوں میں جرأت اخلاق کا اس قدر فقدان ہے کہ ایام شباب کی معصیت کوشیوں کا بھی ذکر کرتے ہوئے شرماتے ہیں، حالانکہ جوانی نام ہے اسی "بے راہ روی" کا جو ہر قدم پر نشان لغزش چھوڑ جائے اور اس "شب روی" کا جو ہر رات کو ایک کہانی بنا جائے

پریم چند گورے رنگ کے شریف ہندو ہیں اور ایسی نورانی شکل رکھتے ہیں کہ اگر ان کی مونچھیں خالص ہندو قسم کی نہ ہوتیں تو میں انہیں مشورہ دیتا کہ وہ وارثی بن جائیں اور دین و دنیا دونوں سے "مرفوع القلم" زندگی بسر کریں، ہندی شعبہ کا انتظام ان کے سپرد ہے اور رسالہ "مادھری" کی ترقی انہیں کے مساعی کی ممنون ہے۔ پریم چند کی فسانہ نگاری ملک میں کافی شہرت و قبول حاصل کر چکی ہے، لیکن جب سے انہوں نے ہندی زبان میں لکھنا شروع کیا ہے، ان کی ذہنیت میں کافی تغیر ہو گیا ہے چنانچہ "چوگان ہستی" (ہندی ناول کا ترجمہ) دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس تطویل بے جا کو اردو برداشت نہ کر سکتی تھی وہ ہندی میں کس آسانی سے مقبول ہو گئی اور وہ عصبیت جو انکی اردو فسانہ نگاری میں کبھی ایک افسردہ چنگاری سے زیادہ نمودار نہیں ہوتی تھی وہ ہندی میں کس طرح "شعلۂ ملتہب" بن گئی

ہر چند پریم چند فارسی عربی سے بقدر ضرورت بھی آگاہ نہیں ہیں اس لئے اردو زبان پر ان کو وہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جو سادہ فسانہ نگاری کو چھوڑ کر، کسی عمیق غور و فکر یا علمی و تحقیقی تحریر کے لئے درکار ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انکا سادہ اسلوب ادا کافی دلکش ہے جس میں پلاٹ کا مقامی رنگ اور زیادہ دلچسپی پیدا کر دیتا ہے، تاہم مجھے حیرت اس امر پر ہے کہ وہ شخص جو اردو اس قدر صاف لکھنے کا عادی ہو ہندی میں پہونچکر اس قدر ثقیل ہو جاتا ہے کہ اور نہ صرف یہ بلکہ نصاب کی جو اردو کتابیں نولکشور پریس سے شائع ہوتی ہیں ان میں بھی سنسکرت کا عنصر غالب کر دیتا ہے۔ اردو کو عربی فارسی کی مشکل الفاظ سے پاک کرنے کا یہ مدعا تو نہ ہونا چاہئے کہ سنسکرت کے ثقیل الفاظ ان کے بجائے استعمال کئے جانے لگیں۔ ارادہ ہے کہ نولکشور پریس سے جو اردو کی نصابی کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر آئندہ تفصیل سے بحث کروں اور بتاؤں کہ وہ کس قدر اغلاط سے لبریز ہیں اور فرقہ دارانہ جذبات نے انہیں کس حد تک مسخ کر دیا ہے

یہاں اسوقت تین روزانہ اخبار جاری ہیں، ان میں سب سے قدیم ہمدم ہے جو پہلے جناب جالب دہلوی کی اڈیٹری میں نکلتا تھا اور اب چودھری رحم علی ہاشمی اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ جالب صاحب کا ہمدم سے علحدہ ہونا شعبۂ انتظام کے اختلاف کی بنار پر ہوا ورنہ جالب صاحب کی پالیسی کبھی کوئی نہ تھی اور ہمیشہ اپنے آقا کی مرضی کے مطابق وہ اخبار چلانے کے عادی رہے ہیں۔ ہمدم سے علحدہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنا ذاتی اخبار ہمت کے نام سے نکالا ہے لیکن چونکہ اس کی پالیسی وہی ہے جو نہرو رپورٹ کے مخالفین کی ہے اس لئے پبلک میں .... زیادہ مقبول ہونے کی توقع نہیں کی جاتی۔ جہانتک فن صحافت کا تعلق ہے جالب صاحب اپنی وسیع معلومات کی بنا پر اس وقت ایک بے مثل و بے نظیر صحافی ہیں، لیکن چونکہ ان کا طرز تحریر جوش و شوخی سے معرا ہے اس لئے ایک تنگ و محدود حلقہ کے علاوہ ان کا اخبار اور کہیں مقبول نہیں ہو سکتا۔ جالب صاحب کی ایک خصوصیت اور بھی عجیب و غریب ہے کہ باوجود عدم ادعائے شاعری کے وہ صرف اپنے تخلص ہی سے مشہور ہیں اور اس حد تک کہ اگر دفعتہً ان سے سوال کیا جائے تو شاید بغیر سوچے ہوئے وہ خود بھی اپنا نام نہیں بتا سکتے۔

ہمدم کے دوسرے اڈیٹر چودھری رحم علی ہاشمی ایک جوان العمر انسان ہیں، لیکن جوانی کی حرارت سے بالکل خالی۔ ان کی سنجیدگی، نیکی، دھیما پن، اس کہولت کا پتہ دیتا ہے جو لکھنؤ میں بچوں کی شرارت دور کرنے کے بعد افیون کے استعمال سے پیدا کی جاتی ہے۔ ہاشمی صاحب کے زمانہ میں ہمدم نے ترقی کی ہے جس کا سب سے بڑا سبب پالیسی کا تغیر ہے۔ ترتیب، حجم، دلچسپی اور طباعت کے لحاظ سے بھی قدیم روش میں کچھ تغیر ہوا ہے لیکن ایسا نہیں کہ دیکھتے ہی کوئی شخص

"گھبرا کے یہ کہدے کہ لو وہ آئے"

ذوق جدید و رواج حال کے مطابق دو کالم اس میں مزاح کے بھی ہوتے ہیں جو "دو باتیں" کے عنوان سے پہلے صفحہ میں درج ہوتے ہیں۔ "دو دو باتیں" لکھنے والے اک نوجوان شاعر ہیں، جو اس کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہیں۔ یہ شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ آنکھیں بھی سرمگیں ہیں اور جسم بھی چھریرا۔ ۲۰ و ۲۶ تقطیع کا رکھتے ہیں، صورت سنجیدہ ہے لیکن طبیعت شوخ، دہانہ کی ساخت سے ظاہر ہے کہ کسی راز کے چھپانے کے اہل نہیں اور اس لئے دل کا معاملہ ان کے ساتھ کرنا خطرہ سے خالی نہیں، معلوم نہیں ان سے محبت کرنے والے کیونکر زندہ ہیں۔

تیسرا روزانہ اخبار حقیقت ہے، اس کے اڈیٹر اس قسم کے لوگوں میں ہیں جو غلطی سے ایک صدی قبل پیدا نہ ہو سکے تھے اور اب قدرت اپنی فروگزاشت کی تلافی اس طرح کر رہی ہے کہ ان کو زمانہ حال میں پیدا کر کے اڈیٹر بنا دیا۔ سعی و انہماک، صدق و خلوص کے ساتھ کسب معاش کرنا اور کسی کی محکومی اختیار نہ کرنا، یہ ہے نصب العین اس اخبار کا۔

ماہانہ رسائل میں صرف الناظر کے اڈیٹر جناب ظفر الملک سے ملنے کا اتفاق ہوا، یہ بیک وقت لیڈر بھی ہیں اور اڈیٹر بھی، مولانا بھی ہیں اور شہر کے قاضی بھی لیکن ڈبلاپن بالکل فطری ودیعت ہے، کسی اندیشہ و غم سے اس کا تعلق نہیں۔ بظاہر بہت متواضع و منکسر معلوم ہوتے ہیں "پس پشت" اور "باطن" کا حال خدا جانے۔ نگاہ نقد و نظر اس قدر بلند ہے کہ دنیا میں مشکل ہی سے کوئی چیز انہیں پسند آتی ہے۔ لیکن خود اپنی ذات کو اصول تبصرہ سے مستثنیٰ جانتے ہیں۔ سچ بھی انہیں کے اہتمام سے نکلتا ہے اور عبدالماجد صاحب دریاآبادی اس کے اڈیٹر ہیں۔ ان سے ملنے کا موقع نہیں ملا، مگر سنا ہے کہ ان کا دماغ کسی خاص کیفیت سے متاثر ہے اور مضایقہ سود۔ یہیں سے جناب مولوی صبغۃ اللہ صاحب اڈیٹر خادم الحرمین سے

ملاقات ہوئی۔ آپ خیر سے شاعر بھی ہیں اور شہید تخلص فرماتے ہیں۔ خصایل کے لحاظ سے صبغۃ اللہ کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے، جبکہ ومن احسن من اللہ صبغۃ کی نص قطعی موجود ہے، اللہ ان کو ہندوستان میں بیٹھکر حرمین کی خدمت کی ہمت عطا کرے اور مسلمانوں کو غور کرنے کی توفیق لطف فرمائے۔

لکھنؤ کے شعرار حال میں سے صرف چند کا نام خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے:۔ عزیز، صفی، محشر، ثاقب۔ جناب عزیز سے ملنے میں بہت دقت ہوئی کیونکہ آجکل محمود آباد میں قیام رہتا ہے۔ اتفاق سے چند گھنٹے کے لئے لکھنؤ آئے تھے کہ مجھے خبر مل گئی اور میں مکان پر جاکر قدمبوس ہوا۔ میں نے انہیں بھی ایک نحیف الجثہ انسان سمجھ رکھا تھا لیکن یہ بھی "ماشاءاللہ" نکلے۔ چہرہ کے گوشت نے خدوخال چشم و بینی کا بدنمائی کی حد تک احاطہ کر رکھا ہے اور نقشہ کی ذہانت معدوم ہوگئی ہے۔ چہرہ کی خشونت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی خلش ہر وقت ایذا دیتی رہتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ گفتگو میں نہ کوئی دلکشی ہے نہ کوئی عمق و ذہانت، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا دماغ شاعرانہ ہے، شعر اچھا کہتے ہیں اور تمام اصناف سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں، مضمون کی جستجو، الفاظ کی تلاش، ترکیب کی چستی، خیال کی حلاوت اور جذبات کی اثرانگیزی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، شاگردوں کی بڑی جماعت رکھتے ہیں۔ جن میں سے رواں اور اثر کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جو خود اپنی اپنی جگہ استادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

صفی، معمر شخص ہیں اور غیر "شاعرانہ" حد تک زار و نحیف۔ عجیب بات ہے کہ میں نے ان کی شاعری سے ان کے "عظیم الجثہ" ہونے پر حکم لگایا تھا، لیکن "یہ" بالکل "وہ" نکلے۔ نہ طبیعت میں شگفتگی، نہ چہرہ پر رونق، نہ اداؤں میں دلبستگی، نہ گفتگو میں جاذبیت، الغرض دنیاوی انسان ہونے کے لحاظ سے وہ صفر کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک ایسی غیر جمالیاتی فضا ان کے چاروں طرف محسوس ہوتی ہے کہ اگر قدرت نے شعر گوئی کا ملکہ نہ دیا ہوتا تو شاید ہی کوئی شخص ۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر سنا ہے کہ آدمی نیک ہیں اور اخلاق و اطوار بھی غیر پسندیدہ نہیں رکھتے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کو مرتبۂ استادی حاصل ہے اور لکھنؤ کے جدید دور کے شعرا میں وہ خاصی قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے، ان کے کلام کی سادگی، شگفتگی، یقیناً قابل ستایش ہے، لیکن انہوں نے قومی شاعر بننے کی کوشش میں اس خصوصیت کو ایک حد تک مجروح کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ ان کے قومیات شعری کسی طبقہ میں کچھ چیز سمجھے جاتے ہوں، لیکن میں ان کو اس جوش سے بالکل معرّا پاتا ہوں جو قومی نظموں کو غزلوں سے متمایز کر دیتا ہے۔ ان کی بڑی معرکۃ الآرا قومی نظم "وقت آنے دو وقت آنے" دانی ہے، لیکن اسمیں ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں جس کے اندر شعلہ تو کیا کوئی چنگاری ہی راکھ میں دبی ہوئی مل جائے۔ مثنوی کہنے کا بیشک انہیں خاص سلیقہ حاصل ہے اور اسی میں ترقی کرنا انکی کامیابی ہے اگر وہ سمجھیں۔

اب محشر کا وہ ہنگامہ نہیں ہے جو پہلے کسی وقت تھا، لیکن خیر بعض بعض شعر اب بھی کہہ جاتے ہیں اور سنا ہے کہ آدمی بُرے نہیں۔ مجھ سے صرف ایکبار چوک میں سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہاں کے کوئی عطر فروش ہوں گے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ جناب محشر آپ ہی ہیں، خود ان کی زبان سے ان کے کلام سننے کا فخر مجھے حاصل نہیں ہوا، اور نہ اس کے لئے میں زیادہ بیتاب تھا۔

جناب ثاقب آج کل مہاراجہ صاحب محمود آباد کے بعض صاحبزادگان کے اتالیق ہیں۔ اور اپنی خدمات کی انہماک کیوجہ سے شعر و شاعری

کی جانب زیادہ توجہ نہیں کر سکتے، آدمی بہت نیک، خوش اخلاق، متواضع و منکسر مزاج معلوم ہوتے ہیں، اور چہرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام شعرا کی طرح ان کا باطن بھی ناقابل ذکر نہیں ہے۔ ان کے شعروں کی خصوصیت یہی ہے کہ ابتذال کہیں نہیں ہوتا اور خیال بھی عام سطح سے بلند ہوکر اچھوتی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عروج جو یہاں دولھا صاحب کے نام سے مشہور ہیں، خاندان انیس کے باقیات الصالحات میں سے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ خوب کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ ہر چند ضعیفی سے کمر جھک گئی ہے اور تمام وہ علامات شیب جو انسان کو آدمی سے خدا جانے کیا بنا دیتے ہیں انہیں پوری طرح نمایاں ہیں، لیکن جب وہ منبر پر پہونچتے ہیں تو دفعۃً ایسا تغیر ان میں پیدا ہوتا ہے جیسے کوئی اچانک نشہ سے چونک پڑے اور عطالت کے تمام حرکات پوری قوت کیساتھ رونما ہونے لگتے ہیں۔

جناب احسن لکھنوی جو اپنی ڈرامہ نگاری کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں، غزلگوئی کے لحاظ سے کوئی مرتبہ رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن بہ حیثیت انسان ہونے کے وہ ضرور خاص چیز ہیں۔ طبیعت بہت غیور پائی ہے، اور سب سے الگ بے لاگ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں، باوجود عمر رسیدہ ہونے کے اب بھی ان کی جوانی کا بانکپن ان کے اعضا سے ظاہر ہے اور مخصوص حلقۂ احباب میں اب بھی ان کی شگفتگی و زندہ دلی دیکھنے کی چیز ہوتی ہے، موسیقی سے خاص لگاؤ ہے اور ہارمونیم اچھا بجاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی جس لطف سے بسر کی ہے، وہ شاید یہاں کے کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہو، اور اب بھی جس نفاست و پاکیزگی اور جس سلیقہ کے ساتھ وہ رہتے ہیں اس کا نشان بھی دوسرے شاعروں میں نہیں پایا جاتا۔

یہاں کے شیعی طبقہ کے صحافیوں میں صرف ایک سید ممتاز حسین صاحب عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ قابل ذکر ہیں۔ ہر چند موجودہ اودھ پنچ کا موازنہ سجاد حسین کے اودھ پنچ سے کرنا مضحکہ سی بات ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ میں سوائے ممتاز حسین صاحب کے اودھ پنچ کی روایات قدیمہ کی یاد کو تازہ رکھنے والا کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا۔ آدمی پڑھے لکھے ہیں، وسیع المطالعہ ہیں، اور ہر چند انکی وضع و صورت اور گفتگو سے کبھی کسی کو یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ بیچارے زنگ کے انسان ہوں گے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ایسے ہی ہیں اور بعض اوقات ان کا قلم ایسے نقوش چھوڑ جاتا ہے کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ میں اس سلسلہ میں ان واقعات کو بیان کرنا پسند نہیں کرتا جو انکی عصبیت کے ثبوت میں مجھ سے بیان کئے گئے، کیونکہ اگر وہ صحیح ہوں تو بھی جہاں تک پنچ اور پنچین (کوئی صاحب اسے کچھ اور نہ پڑھ لیں) کا تعلق ہے ان کی تعریف ہی کی جائے گی۔

میں ان سے ملنے کے بعد جائے قیام پر واپس آیا ہی تھا کہ میرے ایک دوست کا تار آیا جسمیں انہوں نے مجھے ایک ضروری مسئلہ طے کرنے کیلئے دہلی طلب کیا تھا، اس لئے میں بغیر تکمیل پروگرام کے لکھنؤ چھوڑ رہا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو پھر کسی وقت حاضر ہونگا، لیکن محرم کا زمانہ بچا کے تاہم دہلی پہونچکر مجھے یہاں کے اس مشاعرہ کا حال ضرور لکھنا ہے جس میں شرکت کا فخر مجھے حاصل ہوا تھا اور اسی سلسلہ میں لکھنوی شاعری کی موجودہ ذہنیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرونگا، خواہ اس کے بعد مجھے "نادِ علیاً" کا حصار ہی کیوں نہ اپنے گرد کھینچنا پڑے

ازدواج مکرر

(بہ سلسلۂ سابق)

(۵)

ہر وہ شخص جو ذکی کی جگہ اپنے آپ کو فرض کرے، بہ آسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ صفیہ کی اس انتہائی صفائی اخلاق سے اس کو کس قدر صدمہ پہونچا ہوگا اور صفیہ کے اعلان کے بعد دنیا نے ذکی کو کیا سمجھا ہوگا۔ ذکی کو صدمہ اس امر کا نہ تھا کہ اس کی بیوی کی وہ ہستی جو اس نے انتہائی سعی اور انہماک کے بعد خود اپنے ادیب دماغ سے پیدا کی تھی صفیہ کی تحریر سے فنا ہو گئی، بلکہ اس کو برہمی اس امر کی تھی کہ دنیا نے اس جذبہ کو بالکل عریاں دیکھ لیا۔ انسان غلطی کرنے کے بعد دنیا کو فریب میں مبتلا رکھنا پسند کرتا ہے، لیکن یہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ دنیا پر اس کی غلطی ظاہر ہو جائے۔ اگر ذکی غور کرتا تو اس کو صفیہ کا ممنون ہونا چاہئے تھا کہ اس کی کارگاہ فریب جس کا نتیجہ یقیناً اچھا نہ ہوتا جلد درہم برہم ہو گئی۔ لیکن اس نے صفیہ کی اس پاکبازی اور علوئے اخلاق کو حد درجہ خیرہ وفا شعاری بلکہ غداری سے تعبیر کیا اور انتہائی غم و غصہ کے عالم میں اس سے علیحدہ ہو گیا۔

وہ جس وقت کلکتہ پہونچا تو اس کا مقصود صرف یہ تھا کہ چند دن رہنے کے بعد یہاں سے کسی اور جگہ چلا جائے گا، لیکن بدبختی کہئے یا خوش بختی کہ اس نے قیام کیا وہاں کے ایک ایرانی خاندان میں اور ان لوگوں کی خاطر مدارات نے ایسا گھر کا سا سکون پیدا کر دیا کہ وہ اپنے اضطراب میں کچھ کمی محسوس کرنے لگا اور جس وقت شمسہ (جو حقیقتاً اس خاندان کی مہر نیمروز تھی) انتہائی بے تکلفی کے ساتھ صبح کو اپنی نرم و شیریں آواز میں "آفندم، آفندم ذکی" یا "آقایم" یا "آغا ذکی" کہکر اس کے کمرہ کے دروازہ پر دستک دیتی تو اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے برفباری کے زمانہ میں کوئی گرم شعاع سینہ سے گذر کر دل تک پہونچ رہی ہے اور وہ زندگی کی کسی نئی لذت سے آشنا ہو رہا ہے۔

شمسہ اپنی تعلیم کے لحاظ معمولی چیز تھی، لیکن چونکہ ہندوستان کے ہر شخص کو فارسی بولنے والی عورت خواہ وہ کتنی ہی جاہل کیوں نہو زردشت کی بیٹی ہی معلوم ہوتی ہے، اس لئے جب کبھی ایرانی تہذیب کے مطابق وہ "جانم فدایت یا قربانت شوم" کے فقرے استعمال کرتی تو ذکی ہمہ تن عالم شعر و موسیقی میں غرق ہو جاتا اور ایسا محسوس کرتا کہ وہ اس سے بہت کمتر درجہ کا انسان ہے۔ اس دوران میں بارہا ذکی نے روانگی کا خیال ظاہر کیا، لیکن جس وقت وہ اس کے جواب میں شمسہ کے میگوں لبوں سے "اجازت مستدام، سرکار ایں چہ می فرمائید" سن لیتا تو اس کے اعصاب میں استرخائی کیفیت پیدا ہو جاتی اور وہ پھر اسے "فدویانہ" نگاہوں سے دیکھ کر اس طرح خاموش ہو جاتا، گویا قوت گویائی اس سے چھین لی گئی ہے۔

ذکی فارسی اچھی جانتا تھا، بے تکلفی سے بول سکتا تھا اور ذوق شعری کے لحاظ سے وہ یقیناً بہت بلند چیز تھا، لیکن شمسہ کو دیکھتے ہی اس کی طلاقت لسانی اور اس کی ادبیت سب کافور ہو جاتی تھی اور وہ حقیقی معنے میں بالکل عجمی (گونگا) بنکر رہ جاتا تھا۔ ہرچند کسی قسم کا لگاؤ اسے شمسہ سے نہیں پیدا ہوا تھا، لیکن اس کی معیت میں وہ اپنے آپ کو بالکل نئی دنیا میں پاتا تھا اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی گذشتہ معصوم زندگی کو

یاد کر کے کشیدہ خاطر ہو جاتا۔ ثمسہ کا اصلی وطن تو طہران تھا لیکن اس کا باپ بہ سلسلۂ تجارت کلکتہ آیا تھا اور پھر اس کو ایران واپس جانے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے یہیں ایک ایرانی خاندان میں شادی کی جس سے ثمسہ پیدا ہوئی۔ تجارت میں جب وہ کامیاب نہ ہوا تو اس نے ریلوے کے دفتر میں ملازمت کر لی، اور اپنے مکان کا ایک حصہ لوگوں کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا۔ وہ قیام و طعام وغیرہ کے جملہ مصارف دس روپیہ روز کے حساب سے لیتا تھا اور چونکہ ثمسہ کی ماں ضعیف ہو گئی تھی اس لئے گھر کا سارا انتظام مہمانوں کی نگہداشت، خاطر مدارات، سب ثمسہ ہی کے سپرد تھی جسے وہ ایک یہودی خادمہ کی مدد سے پوری ذہانت کے ساتھ انجام دیتی تھی۔ یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ثمسہ تعلیم کے لحاظ غیر معمولی چیز نہ تھی لیکن اپنی ذہانت کے اعتبار سے یقیناً وہ بلا کی زبان دان تھی۔ فارسی تو خیر اس کی مادری زبان ہی تھی۔ لیکن اردو میں بھی اسے ایک ادیبانہ ذوق حاصل تھا اور فارسی کی طرح اردو کے بھی اسے اچھے اچھے شعر یاد تھے، جنہیں وہ برجستگی کے ساتھ استعمال کرتی تھی اور یہی ایک چیز ایسی تھی جس نے اس کی تہذیب و شائستگی، اس کی خوش ادائی، اس کی شیریں گفتگو اور سب سے زیادہ "بادۂ سرجوش" کی طرح اس کے بھرپور شباب کے ساتھ مل کر ذکی کے لئے کافی اسباب تباہی پیدا کر دئے تھے اور اگر اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ اس قدر محتاط و سنجیدہ نہ ہوتا اور کبھی کبھی صفیہ کا خیال اس کے کرب و ملال میں اضافہ نہ کر دیا کرتا تو غالباً وہ ثمسہ کی دعوت شگفتگی کو اس سے بہت پہلے قبول کر لیتا۔ لیکن اس کی چوٹ سخت تھی اور تازہ اس لئے ابھی تک اس کی متشائم کیفیت دور نہیں ہوئی تھی اور اگر کہیں وہ شگفتگی کی طرف مائل ہوتا بھی تو دفعتہً اس کو ماضی کا خیال آ جاتا اور مضمحل ہو کر رہ جاتا۔

اول اول جب ذکی نے یہاں آ کر قیام کیا تو ثمسہ کی طرف سے سوائے معمولی اور رسمی مدارات کے کوئی خاص توجہ صرف نہیں کی گئی، لیکن جب اس کو معلوم ہو گیا کہ دولت کے لحاظ سے وہ ایک رئیس کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر ثمسہ کی تمام تابناکیوں کا مرکز سوائے ذکی کے اور کوئی نہ رہ گیا۔ اس نے اپنی خلوت و جلوت، اپنی صبح و شام اپنی زیبائش و آرائش، ذکی کی تالیف کے لئے وقف کر دی اور غلط بیانی ہو گی اگر کہا جائے کہ ذکی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ لیکن پورے استحکام کے ساتھ اپنے مرکز سے ہٹتا جا رہا تھا اور جس وقت رات کو وہ خیر باد یا شب بخیر کہہ کر رخصت ہونا چاہتی تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لے اور کچھ دیر اور اس کی باتیں سنتا رہے۔ لیکن اس کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ مسکراتی ہوئی، اپنے لچکیلے بدن میں ناگن کے سے بل ڈالتی ہوئی، آخری مرتبہ دروازہ کھول کر انتہائی شوخی کے ساتھ اسے جھانکتی اور غائب ہو جاتی۔

یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ اگر ذکی کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کبھی کا دفتر تدبیر و مصلحت کو "غرق مے ناب" کر چکا ہوتا، لیکن گذشتہ ایک ربع صدی کی راسخ صلاحیت جو ذکی کو وراثت و تربیت کے ذریعہ سے حاصل ہوئی تھی یوں دفعتہً نہیں ٹوٹ جا سکتی تھی۔ رات رات بھر اسکو یہی سوچتے گزر جاتی تھی کہ آخر یہ بے معنی زندگی کب تک بسر ہو سکے گی، اور اس رہبانیت کا نتیجہ کیا ہے، لیکن آخر میں کامیابی اس کے اخلاق ہی کو ہوتی تھی، یہاں تک کہ جب ثمسہ صبح کو اس کے لئے چائے کا سامان لاتی تو کبھی کبھی اس کے تیور بالکل اجنبی سے محسوس کرنے لگتی لیکن اس نے بھی ایک عزم کر لیا تھا اور وہ پھر اس کو اسی نقطہ پر کھینچ کر لے آتی جہاں روزانہ اسے چھوڑ کر جاتی تھی

ایک دن، موسم بہت خوشگوار تھا، سامنے دریچہ سے نارنج کی خوشبو کمرہ کو معطر کئے ہوئے تھی اور شاما کا جوڑا صحن باغ کے گلاب پر آ آ کر اپنی مست و شیریں آواز سے ذکی کے دل میں ہر مرتبہ ایک نیا ولولہ پیدا کر جاتا تھا۔ وہ دیر سے فلسفۂ حیات پر غور کر رہا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچ رہا تھا کہ کہیں

حیات و نشاط ایک ہی چیز کے دو نام تو نہیں ہاں، مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ "در توبہ ابھی بند نہیں ہوا" اگر ایک طرف دعوت و تبلیغ کا نہایت اعلیٰ فلسفہ اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے، تو دوسری طرف اس میں نوید معصیت بھی شامل ہے اور ایک انسان اپنے ذوق و میلان کے لحاظ سے حسب ضرورت جس پہلو کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اس وقت ذکی کی رفتار خیال دوسرے پہلو کی طرف مائل تھی اور صرف "تجربہ و جستجو" کے بہانہ سے وہ ایک بار اپنے آپ کو ماحول کے سپرد کر دینا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت شمسہ آ گئی، اور ایسے غیر معمولی بانکپن کے ساتھ کہ غریب ذکی کی وہی حالت ہو گئی جیسے کوئی شخص ساحل سے پھسل رہا ہو اور پشت سے کوئی دھکا دیدے۔ آج شمسہ کی اٹھارویں سالگرہ تھی اور اہتمام کے لحاظ سے بھی واقعی اٹھارویں تھی، سر سے لیکر پاؤں تک رنگ و ریشم، عطر و خوشبو میں لپٹی ہوئی تھی، معلوم ہوتا تھا وہ کوئی تیتری ہے جو رات بھر پھولوں میں بسا کر صبح کو چھوڑ دی گئی ہے۔ وہ مذہباً گبر تھی اور آتش پرست، لیکن آج تو وہ اپنے مذہب کی خدا یکسر شعلۂ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھلاتی ہوئی اندر آئی اور بے اختیار ذکی کے منہ سے نکل گیا :۔

بہ آتشے ست کہ برجان ما نہادی باز

اس نے بڑھ کر ذکی کے دامن کو بوسہ دیا اور بولی :۔

"مگر نشنیدہ ---

اگر بہ سوزدت اے دل ز درد نالہ مکن

دم از محبت او میزن و بدرد بساز"

ساحل چھوٹ گیا تھا، ذکی کے قدم اکھڑ چکے تھے، سیلاب نے اسے گھیر لیا تھا، اور وہ ایک ایسے عالم میں جسے مدہوشی سے زیادہ بیہوشی کہنا زیادہ موزوں ہے شمسہ کے قدموں کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے شمسہ کا دامن تھام لیا اور انتہائی شیفتگی و ربودگی کے عالم میں کہہ اٹھا :۔

"بہر کمند کہ خواہی بگیر و باز م بند"

شمسہ نے شوخی سے فوراً دوسرا مصرعہ پڑھ دیا کہ :۔

"بشرط آنکہ ز کارم نظر نہ گیری باز"

اس سوال جواب سے ذکی اس وقت اپنے آپ کو جہانگیر اور شمسہ کو نورجہاں سمجھ رہا تھا، اور شام ہونے سے قبل حقیقی معنی میں وہ جہانگیر ہو گیا تھا اور شمسہ نورجہاں

(۶)

گذشتہ واقعہ کو ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گذر گیا ہے اور ذکی نے ایک علحدہ کوٹھی شمسہ کے قیام کے لئے لے لی ہے۔ باپ کی جمع کی ہوئی دولت بیدردی کے ساتھ صرف ہو رہی ہے اور سوسائٹی میں شمسہ خانم کا وجود جذب مرکزی پیدا کرتا جا رہا ہے، رولس کار سواری کے لئے، زرنگار پردوں اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ مکان رہنے کے لئے، متعدد خادموں کی جماعت خدمت کے لئے۔ اسکاٹ لینڈ کی بہترین شراب لطف زندگی کے لئے اور بنک کی چیک بک ہر اس آرزو کی تکمیل کے لئے جس کا خیال کبھی شمسہ کے دل میں نہ آ سکتا تھا، اس کے پاس موجود تھی اور ذکی جس کو اپنی زندگی

ہیں اول مرتبہ یہ معلوم ہوا تھا کہ دولت اپنے اندر کیسے کیسے اسباب لذت و تفریح پنہاں رکھتی ہے، پانی کی طرح شمسہ کے قدموں پر بہا رہا تھا، اور سمجھتا تھا کہ شاید ابھی تک وہ اس نیم نگاہ کی بھی قیمت نہیں ادا کر سکا جو شمسہ اس پر کبھی کبھی صرف کر دیتی ہے۔ وہ خود بھی تمام اصول اخلاق و احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کے ساتھ ہر اس عشرت میں شریک تھا جس کی طرف کبھی اسکا ذہن بھی منتقل نہ ہوا تھا۔ اور جس وقت وہ نشۂ شراب میں شمسہ کے التفات پر نگاہ کرتا تو اس کے اندر جذبۂ ایثار اور زیادہ قوی ہو جاتا اور بے اختیار ہو کر پوچھ بیٹھتا کہ "میں کیونکر تمہارے اس احسان سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں"۔ شمسہ نہایت ہوشیاری سے اس کے ان جذبات کا مطالعہ کر رہی تھی اور آخر کار ایک دن جب کہ وہ پوری طرح اثر حسن و شراب سے متاثر ہو رہا تھا اس نے پوری لگاوٹ کے ساتھ اپنا وہ آخری حربہ استعمال کیا جس سے آسمان و زمین میں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ عورت جب تک عالم عشق و محبت میں ہے، خواہ وہ ہنسے یا روئے، یکساں طور پر دل ڈبو دینے والی ہے، لیکن اگر وہ صرف محبت کی تمثیل کر رہی ہے تو غنیمت سمجھو جب تک وہ ہنستے کھیلتے تمہاری زندگی کو پر لطف بنا رہی ہے، ورنہ عورت کا وہ آنسو جو مکر و فریب کا نتیجہ ہوتے ہیں، ایک زبردست سیلاب اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی شخص ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ اس وقت تک ذکی کی زندگی شمسہ کے ساتھ یکسر باغ و بہار کی طرح بسر ہوئی تھی اور وہ بالکل بھول گیا تھا کہ دنیا میں رنج و ملال کس کو کہتے ہیں، طرب و نشاط کا وہ دلفریب منظر جو تھوڑی دیر کے لئے انسان کو خدا بنا دیتا ہے، ذکی کے دل و دماغ پر اس طرح چھا گیا تھا کہ اس کا ردّ عمل حد درجہ خطرناک ثابت ہوتا۔

رات کا وقت تھا، دریچوں سے ہلکی ہلکی خنک و معطر ہوا وہسکی کی ایک پوری بوتل سے چکر کھانے والے دماغ کو اور آسمان پر اڑائے لئے جا رہی تھی، ذکی پر ایسی مستی و سرخوشی کا عالم طاری تھا کہ اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا اور شمسہ زیبائش و آرائش کے اس بانکپن کے ساتھ جو کبھی اس میں پیدا نہ ہوا تھا، اپنی تمام نسائی لطافتیں و عنایتیں اس پر صرف کر رہی تھی کامیاب محبت کی باتیں مزے مزے سے ہو رہی تھیں کہ دفعۃً شمسہ ذکی کی آغوش سے علحدہ ہو کر کچھ سوچنے لگی اور پھر صوفا کے ایک جانب گردن ڈال کر رونے لگی۔ ذکی جس کی جدید حیات نشاط میں یہ بالکل پہلا تلخ منظر تھا، گھبرا گیا، پہلے تو چند منٹ تک شمسہ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا لیکن جب ادھر سے اصرار و اضطراب کی حد ہو گئی تو آنسو پونچھتے ہوئے یا یوں کہئے کہ رومال میں "عطر فتنہ" جذب کرتے ہوئے اٹھی اور بولی:۔ "حیران ہوں کہ آپ کی ان غیر معمولی عنایتوں کو شکریہ کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔ آپ نے جو عزت مجھے دی، وہ میرے خواب و خیال سے زیادہ ہے، اور میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اب آپ کو زیادہ تکلیف دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، جب تک میں اپنے آپ کو بھی خدمتگذاری کی اہل نہ ثابت کر دوں"۔

ذکی خواہ کتنا ہی آلودۂ عصیاں ہو لیکن چونکہ اس کی فطرت صالح تھی اس لئے شمسہ کے اخلاق کا اس نے یہ زبردست ثبوت دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا، اور بولا:۔

"شمسہ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ اگر تمہیں خدمت کرنے پر آ جاؤ گی تو پھر دنیا میں مخدوم بنکر کون رہیگا، اور پھر یوں بھی جو تمہارے فرائض ہیں ان کو اس قدر تکمیل کے ساتھ انجام دے رہی ہو کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں"۔

شمسہ:۔ "مگر دیکھو میری آمدنی کہ چند دن ہیں بہت بیکار روپیہ میرے، اور پر ضائع ہوا اور میں چاہتی ہوں کہ اس کی تلافی کی جائے۔ پہلی صورت تو

یہ ہے کہ غیر ضروری مصارف کم کر دیئے جائیں اور جو اس وقت تک صرف ہو چکا ہے اسکو کسی نئے طریقہ سے حاصل کیا جائے "

ذکی:۔ "اس کی کیا صورت ہے"

شمسہ:۔ "آپ کو معلوم ہے کہ تجارت میرا خاندانی (آبائی) پیشہ ہے اور اسی میں ترقی کرنا میرا نصب العین رہا ہے، مجھے اس میں کافی تجربہ حاصل ہے اور کلکتہ کے بازار کا جس قدر غائر مطالعہ میں نے کیا ہے کوئی نہیں کر سکتا۔ کل ہی جو خبر مجھے معلوم ہوئی ہے، وہ اسقدر کامیابی کی ہے کہ اگر دو لاکھ روپئے میرے پاس ہوتے تو چند دن میں آپ کو یہاں کا "ملک التجار" بنا دیتی ۔۔۔ اور ۔۔۔"

ذکی:۔ "دو لاکھ روپیہ نقد تو موجود نہیں ہے، لیکن اس کی فراہمی زیادہ دشوار بھی نہیں۔ اگر تم ایک ہفتہ کی مہلت دو، تو میں جائداد مکفول کر کے لا سکتا ہوں "

شمسہ:۔ یہ سنکر کچھ خاموش ہوئی اور بولی کہ "نہیں یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا، اچھا اس خیال کو جانے دیجئے۔ میری ہزاروں آرزوئیں پوری ہو چکی ہیں، ایک پوری نہ ہوئی تو کیا ۔۔"

یہ کہکر اس نے افسردگی کے ساتھ ٹھنڈی سانس لی اور ایک طرف گردن ڈالکر خاموش ہو گئی۔

ذکی جس نے اس وقت تک شمسہ کو ملول و حزین دیکھنے کی تکلیف برداشت نہیں کی تھی، بیتاب ہو گیا اور اس خیال سے نہیں کہ وہ ملک التجار ہو جائے گا، بلکہ صرف اس بنا پر کہ اس طرح شمسہ کی تمنا پوری ہو گی، وہاں سے اٹھا اور جلدی جلدی اسباب سفر درست کر کے اسٹیشن پہونچا اور دوسرے دن ایک ہندو مہاجن سے گفتگو کر کے چوتھے دن دو لاکھ کی رقم شمسہ کے نام سے بنک میں جمع کر دی اور بنک کی کتاب مع چک بک کے اس کے آغوش میں جاکر ڈالدی۔

(ھ)

اس واقعہ کو پندرہ دن گزر چکے ہیں اور ذکی نے شمسہ کے طرز عمل میں بظاہر اس سے زیادہ کوئی تغیر محسوس نہیں کیا کہ وہ بہ نسبت پہلے کے گھر سے زیادہ غیر حاضر رہنے لگی ہے۔ ایک آدھ بار اس کا ذکر آیا بھی تو اس نے تجارتی تدابیر کا بہانہ کر کے ٹالدیا اور یہ بھی خاموش ہو رہا لیکن اس کے ساتھ یہ امر ضرور ذکی کے لئے باعث تکلیف ہوتا جارہا تھا کہ اس کے احباب کا حلقہ وسیع ہوتا جارہا ہے اور بہ نسبت پہلے کے تحائف و ہدایا کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ نظر آتا ہے ذکی فطرتاً رشک کرنے والی طبیعت نہ رکھتا تھا یا یوں کہئے کہ جب تک شمسہ نے اپنی تمام دلداریاں صرف اسی کے لئے مخصوص رکھیں، اس نے پرواہ نہیں کی کہ کون آتا ہے اور کون جاتا ہے لیکن جب اس کی توجہ بٹی تو اس کو بھی اس کا احساس شروع ہوا، اور نہایت ہی مخفی قسم کے برہمی کے آثار اس کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگے۔

پہلے شمسہ کو دونوں وقت ذکی کے ساتھ کھانا کھانا لازم تھا، لیکن اب رات کا کھانا وہ مستقلاً باہر کھانے لگی تھی اور اگر کبھی ذکی نے اس کی شکایت کی تو ہنسکر ٹالدیا، یا اپنے افسوں کا اثر قائم رکھنے کے لئے چلتے چلتے ایک آدھ غمزہ صرف کر دیا۔

کامل ایک ماہ تک ذکی شمسہ کی حالت کا مطالعہ کرتا رہا اور اس کی اجنبیت کو جس میں روز بروز کچھ نہ کچھ اضافہ ہو رہا تھا بغور دیکھتا رہا۔ ایک شام جبکہ وہ باہر جانے کے لئے بہترین ملبوس اور اپنے تمام قیمتی زیور نکال رہی تھی، ذکی آہستہ آہستہ اس کے کمرہ میں گیا اور بولا "شمسہ

مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، تھوڑی سی شکایت کرنا ہے، تم کپڑے پہنتی رہو، میں آڑ سے کہتا رہوں گا اور تم جواب دیتی رہنا" شمسہ نے جو کسی زیور کے نہ ملنے سے جھنجھلا رہی تھی، غضب آلود نگاہوں سے ذکی کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

ذکی نے پھر اس کو مخاطب کیا لیکن اس استفسار کے ساتھ کہ "آج کہاں کی تیاری ہے"

شمسہ "عقد پروین کلب میں جلسہ ہے اور مجھے بہترین تقریر پر انعام دینا ہے۔ معاف کیجئے اس وقت بہت مصروف ہوں۔ کل میں آپ کی تمام شکایتیں دور کر دوں گی"

شمسہ کے لب و لہجہ میں کچھ ایسی برودت تھی کہ ذکی کو سخت صدمہ پہونچا اور اس نے ارادہ کیا کہ آج اس کی تحقیق ضروری ہے کہ یہ عقد پروین کلب جا رہی ہے یا کہیں اور۔ یہ سوچکر وہ واپس آیا اور پہلے سے کپڑے پہن کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ موٹر پر سوار ہو کر بنگلہ سے باہر آئی، اور ذکی بھی ایک ٹیکسی پر بیٹھ کر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ لیکن ذکی کے غم و غصہ و حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی جب اس نے شمسہ کو بجائے عقد پروین کلب کے گرانڈ ہوٹل میں جاتے دیکھا اور وہاں سے وہ ایک نوجوان شخص کو لیکر جسے وہ بالکل نہیں پہچانتا تھا، ایڈن گارڈن کی طرف چلدی۔

ذکی لاکھ متین و سنجیدہ سہی، لیکن پھر بھی اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگا اور کامل دو گھنٹے جبتک وہ اپنے محبوب کو لیکر باغ کے کنجوں سے باہر نہیں آئی یہ ہزاروں تجویز بنا بنا کر بگاڑتا رہا، حتے کہ یہ ایک عزم راسخ کر کے اس طرف بڑھا جہاں شمسہ کا موٹر کھڑا ہوا تھا اور ٹھیک اس وقت جبکہ یہ دونوں دروازہ کھولکر اندر بیٹھنے والے تھے یہ بھی پہونچ گیا۔ شمسہ اس کو دیکھ کر سہم گئی اور اس کا محبوب تھر تھر کانپنے لگا۔ ذکی نے جیب سے بجلی کا لمپ نکالکر ان دونوں کے چہرہ پر روشنی ڈالی اور پھر اسے گل کر کے نہایت ادب سے سر جھکا کر شمسہ سے پوچھا "کیا عقد پروین کلب میں آپ نے اسی نوجوان کو بہترین تقریر پر انعام دیا ہے جس سے زیادہ قیمتی چیز آپ اور کچھ نہ دے سکتی تھیں۔ افسوس ہے کہ میرے پاس آئینہ نہیں ورنہ میں آپ کو دکھاتا کہ میں آپ کو کیا دیکھ رہا ہوں۔ (نوجوان سے مخاطب ہو کر) کیا آپ خود اپنی تعریف کر سکتے ہیں (شمسہ سے) کچھ آپ ہی فرمائیے۔"

شمسہ اپنا اضطراب دور کر چکی تھی اور یہ معلوم کر کے کہ اب پردہ اٹھ گیا، اور تاویل سے تلافی ممکن نہیں، اس نے اپنے بطون کو دفعۃً بے نقاب کر دیا اور بپھر کر بولی کہ "آپ کو میری آزادی میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ آپ آج اس بات کو دیکھ رہے ہیں جسکو اس سے قبل دیکھنا چاہئے تھا میرے رستہ میں حایل ہونے کی ضرورت نہیں اور اس وقت سے میرے اور آپ کے درمیان کوئی تعلق نہیں۔" یہ کہکر اس نے ذکی کو اسی جگہ حیران و مبہوت چھوڑ دیا اور اپنے محبوب کا ہاتھ پکڑ کے موٹر میں بیٹھی اور چلدی

(۸)

پندرہ روز سے جو بحرانی تپ کا دورہ ذکی پر پڑا تو کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا۔ اگر کسی وقت کچھ ہوش بھی آجاتا ہے تو اس سے زیادہ نہیں کہ وہ صفیہ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب اس کا واہمہ اسے شمسہ کی صورت میں اسے پیش کرتا ہے تو پھر آنکھیں بند کر کے ایک کراہ کیساتھ منھ پھیر لیتا ہے۔

جس وقت ذکی کا تار ملنے پر عزیز (صفیہ کا بھائی) کلکتہ گیا ہے تو اس کی حالت اس قدر خراب نہ تھی اور کسی نہ کسی طرح وہ اس کو اپنے گھر تک

آیا تھا لیکن یہاں آنے کے بعد دوسرے ہفتہ سے جو شدت مرض کی ہوئی تو بڑھتی ہی رہی۔

عزیز ایک دفتر میں ساٹھ روپیہ ماہوار ملازم تھا اور اپنی بیوہ ماں اور بہن (صفیہ) کی کفالت کا ذمہ دار تھا، اسی خیال سے اس نے شادی بھی نہیں کی تھی کہ وہ اس سے زیادہ بار کا متحمل نہ ہو سکتا تھا، ذکی کی مالی حالت اسقدر سقیم ہو چکی تھی کہ اگر عزیز اسے کلکتہ جا کر نہ لے آتا تو وہ خود کرایہ تک ادا نہ کر سکتا۔

علاج کے مصارف بہت زیادہ تھے مگر عزیز قرض وام سے اور صفیہ اپنے زیور بیچکر (جو دو چار اس کے پاس تھے) ان کو برداشت کر رہے تھے۔ فکرمند ہر شخص تھا، لیکن صفیہ کی حالت بہت دردناک تھی، وہ گذشتہ ۶ ماہ کے اندر جب سے ذکی اس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا شب و روز ہر وقت اسی کی یاد میں محو رہتی تھی اور ایک خاموش پجاری کی طرح دل ہی دل میں اس کی پرستش کر رہی تھی، ہر چند وہ بالکل بے خبر تھی کہ ذکی کہاں اور کس عالم میں ہے، لیکن اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور آئے گا اور گذشتہ عہد الم کی پوری تلافی ہو جائے گی، مگر وہ اس سے آگاہ نہ تھی کہ اب ذکی ملے گا بھی تو اس حال میں کہ اس کی زندگی خطرہ میں ہوگی، عزت خاک میں مل چکی ہوگی اور دولت و جایداد بالکل تباہ و برباد۔ عزیز کے زبانی اسے تمام وہ حالات معلوم ہو گئے تھے جو اس نے کلکتہ میں سنے تھے، لیکن اب نہ اسے ان رسوائیوں کا خیال تھا، نہ عسرت و افلاس کا بلکہ وہ تڑپ رہی تھی اس کے لئے کہ کسی طرح وہ اس مرض سے جانبر ہو جائے اور اسے پھر اس کی خدمت کا موقع ہاتھ آئے۔

ایک ایک کر کے امید و بیم کے چالیس دن گذر گئے ہیں اور ذکی جو بالکل اپنے جسم کا سایہ سا معلوم ہوتا ہے، بے حس و حرکت لیکن تپ میں مبتلا پڑا ہوا ہے۔ صفیہ پاس بیٹھی ہوئی رو رہی ہے اور عزیز بھی مایوسی کی حالت میں باہر کمرہ میں افسردہ و خاموش بیٹھا ہے۔

آج کامل ایک ہفتہ سے صفیہ کی آنکھ سے آنکھ نہیں لگی، سوائے چند گھونٹ پانی کے کھیل تک اس کے منھ میں اڑ کر نہیں گئی، لیکن محبت کی وہ آگ جو تھوڑی دیر کے لئے مردہ میں بھی جان ڈال دیتی ہے، اس کے اندر بھڑک رہی تھی اور وہ بغیر کوئی تکان محسوس کئے ہوئے ذکی کی تیمارداری میں مصروف تھی۔

آدھی رات گذر چکی تھی اور صفیہ تنہا بیٹھی ہوئی گھڑی گھڑی اس کا جسم دیکھتی جاتی تھی کہ دفعۃً ۲ بجے کے قریب اس نے ایسا محسوس کیا کہ بدن اتنا گرم نہیں ہے اور پیاس کی شدت میں بھی کمی ہے۔ دس منٹ کے بعد پھر اس نے دیکھا۔ پانچ منٹ نہ گذرے تھے کہ پھر اس نے نبض پر ہاتھ رکھا، یہاں تک کہ اب وہ ہر منٹ پر اس کا جسم دیکھتی تھی اور جب صبح ہوتے اس کو یقین ہو گیا کہ بخار واقعی کم ہو رہا ہے، تو ایک ایسی مسرت کے ساتھ جو دنیا میں کبھی اس کو حاصل نہ ہوئی تھی دوڑتی ہوئی عزیز کے پاس گئی اور کہا کہ جا کر فوراً ڈاکٹر کو لاؤ۔ ڈاکٹر آیا تو اس نے دیکھکر کہا کہ آج اکتالیسواں دن ہے اور بخار شام تک اتر جائے گا، لیکن کمزوری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ خود مرض بن گئی ہے اس خبر نے صفیہ پر جو اثر کیا وہ بارش خشک کھیتی پر بھی نہیں کرتی۔ اس مژدہ نے اس کے حوصلوں میں جان ڈالدی امیدوں نے پھر خون کو رگوں میں دوڑا دیا، اور گھر کی سوگوارانہ حالت دفعۃً مسرت سے تبدیل ہو گئی۔

. . . .

. . . .

ذکی:۔ "آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کا کوئی نہیں"

صفیہ: "میں جانتی ہوں کہ آپ میرے سب کچھ ہیں اور مجھے آپ کی بیوی ہونے کا فخر حاصل ہے"

ذکی: "غلط ۔ نہ آپ اس وقت تک حقیقی معنی میں میری بیوی تھیں اور نہ میں آپ کا شوہر، لیکن آج رات کی اس تنہائی میں آسمان کے تاروں کو، فضا کے سکوت کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اس وقت آپ سے پھر نکاح کرتا ہوں اور یہی میرا "ازدواج مکرر" حقیقی ازدواج ہے، جس کے ذریعہ سے میں اپنے آپ کو صفیہ کی پرستش کے لئے وقف کرتا ہوں اور ...."

صفیہ نے ہنسکر ذکی کے منہ پر ہات رکھدیا اور بولی کہ دیکھئے آپ پھر اس بیان کے ساتھ شاعری کو ملائے دیتے ہیں اور مجھے پھر ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ...."

اس مرتبہ ذکی نے صفیہ کا منہ بند کر دیا، لیکن ہات سے نہیں ——————— !

نیاز

ان کا مسلک صوفیانہ تھا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ غرق تھا ادائے فرض میں، دھرم پر ایقان رکھنے میں، اوقات کی پابندی میں، ثبات قدمی میں انسانیت کے احترام میں۔ اور رحم و ہمدردی کے انسانی صفات میں!۔

گو امتداد زمانہ نے حقیقت پرستی میں اوہام پرستی کی آمیزش کردی اور اصلیت کو مسخ کرکے رکھدیا، کیونکہ مہاراجہ سری کرشن خود پرست برہمنوں کی طرح نہ اپنے علم و فضل پر ناز کرتے تھے اور نہ اپنی ہستی کو اپنے ہم جنسوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ وہ چھتریوں کی طرح نہ اپنے شجاعانہ کارناموں کا ڈھنڈھورا پیٹتے تھے۔ نہ ویشوں کی طرح دولت سمیٹنے کی دھن میں لگے رہتے تھے، اور نہ شودروں کی طرح اپنی انسانیت کی خود توہین کرتے تھے وہ انسانیت کو خدا کا اولین عطیہ سمجھتے تھے اور خود وہ انسانیت ہی کے حامل بنکر آئے تھے، اور انسانیت ہی پر قایم رہنے کے لئے "انسانوں" کو سبق دیئے تھے۔ مگر افسوس کہ ناقص اور باسی دماغوں کی پیداوار نے اس کو یکسر بھلا دیا اور "ذات پات" کی تفریق اور "چھوت چھات" سے کراہت پیدا کرکے انسانیت کو مجروح کردیا اور اس پر بوالعجبی کہ اس کو اپنے دماغ کا بہترین کارنامہ بھی سمجھا۔ کاش تخلیق کی غایت پر غور کرتے اور انسانیت کا جنازہ اپنے کاندھوں پر نہ اٹھاتے!! آج ہندوستان اسی دماغی مرض میں شدت سے بتلا رہ کر سوراج کیلئے گدایانہ سوال کر رہا ہے۔

بھگوت گیتا کے مصنف کی زندگی ۱۲۰ سال تک جنگ و پیکار ہی میں گذری۔ کنس کو چودھویں سال میں پچھاڑ کر دنیائے ہندوستان کو اس کے ناقابل برداشت مظالم سے نجات دلادی، جراسندہ کا مقابلہ اس نے کیا۔ کرناٹک اور بنارس کی مہمیں اسی نے سر کیں، ششپال سے برسر پیکار رہا۔ مہابھارت کے خونیں مناظر اس کی آنکھوں نے دیکھے اور درد پدی کے سوئمبر میں ارجن کی تیراندازی پر صدائے تحسین اُس نے بلند کی۔

اس کی زندگی کے حالات نظم و نثر میں کثرت سے شایع ہوچکے ہیں۔ جس میں غالیانہ عقائد کی وجہ سے مبالغہ آمیز افسانوں کی بھرمار ہے اور وفور محبت نے حسن و قبح کا امتیاز بھی سلب کرلیا ہے۔ معلوم ہو رہا ہے کہ دماغی جہالت نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بیسویں صدی میں حیدرآباد کے "کرشن" کی شاعرانہ طبیعت کا دریا موجیں مارتا ہے۔ صرف اس عقیدے کو لئے ہوئے کہ یہ بھی اسی کے نام پر ۶۵ سال سے زندہ ہے اگو شاد ہے مگر زمانہ کی رفتار اور اپنی افراط شرافت سے ناشاد۔ گو خاندانی امیر ہے مگر اپنی ذات سے فقیر! نام کی برکت ہزاروں سال کے گذر جانے پر بھی اس حد تک تو باقی رہی کہ واسدیو کا "کرشن" ہند کا بادشاہ تھا۔ چندولال کا "کرشن" دکن کا وزیر ہے۔

مہاراجہ بہادر بالقابہ کی امیرانہ طبیعت کو شاعری کے ساتھ بچپن سے لگاؤ ہے۔ مہاراجہ چندولال شاداں کا شادانی دربار شعراء سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ جس میں نصیر دھلوی سے استاد داد سخن دیا کرتے تھے۔ مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دربار میں بھی سرشار مست رہا کرتے تھے، اور داغ بھی یوں نواسنج رہتے تھے کہ ع

آئے گی اردو زباں آتے آتے

جلیل و اختر بھی برسوں اس خوان کرم کے زلہ ربا رہے ہیں۔ ضیا کی ضیا باریاں بھی مشاعروں کو چمکا دیا کرتی تھیں۔ اور فوقی کی شاعرانہ نحوست اب بھی ہر جمعہ کو نظر آجاتی ہے۔ ثاقب نے بھی اپنی پہلوانی کے شاعرانہ داؤ پیچ دکھائے ہیں اور غبار کی ضعیفی تو ابتک حضرت شاد ہی

کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے اور مشقِ سخن مصروف۔ بیگم کے بوڑھے غمزے اب بھی ناک پر انگلی رکھ کر "طلائی چوڑیوں" کا خیال پیدا کرا دیتے ہیں۔ جہاں کی فضا ایسی شاعرانہ ہو۔ وہاں تو غیر موزوں طبیعتیں بھی موزوں ہو جاتی ہیں۔ نہ کہ مہاراجہ شاد جنہوں نے آنکھیں کھولتے ہی گھر میں شاعری کا چرچا سنا۔ کیونکر چپ رہتے۔ میدانِ شعر میں بے تکان دوڑیں لگانا شروع کر دیں۔ قوالوں کے گلے ان کی غزلوں سے حرکت کرنے لگے، رباعیات و قطعات کے بارے میں انکی جدتیں حیرت کرنے کے قابل ہو گئیں۔ قصائد سے ان کا زورِ بیان ٹپکنے لگا۔ اور مثنوی سے واقعہ نگاری کی قابلیت معلوم ہونے لگی۔

اسی "جلوۂ کرشن" میں اپنا مسلک یوں نظم فرماتے ہیں:۔

ہے میرا طریق صوفیانہ   توحید ہے بس مرا ترانہ

میں کیا کہوں کون ہوں میں کیا ہوں   اک آیت قدرتِ خدا ہوں

صوفی ہوں موحدانہ مسلک   کی میں نے نہ بت پرستی اب تک

مہاراجہ سری کرشن ماں کے پیٹ سے چندر بنسی اور باپ کے نطفہ سے سورج بنسی پیدا ہوئے تھے، اس بیان کے دو شعر اس مقدمہ میں سن لیجئے:۔

یہ قہر کا گرم آشیانہ   وہ مہر کا سرد آستانہ

تریاق بھی اور زہر بھی تھا   تھا مہر بھی اور قہر بھی تھا

سری کرشن کی پیدائش کے وقت مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دماغ کی موزونیت ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے:۔

نقارۂ رعد بج رہا ہے   بادل اٹھ کر گرج رہا ہے

ہشیار کہ شیر کی ہے آمد   عالم کے دلیر کی ہے آمد

بنیادِ ستم کی ڈھانے والا   احکامِ خدا سنانے والا

پیدا ہوا پیشوا مبارک   پورا ہو مدعا مبارک

گلچیں کی کہیں نظر نہ لگ جائے   اس گل کی مہک الگ لگ جائے

کنس کے درباریوں کے حاسدانہ طبائع کو ایک شعر میں کس لطیف استعارہ میں ظاہر کیا ہے:۔

حُسّاد کی دال کمی نہیں تھی   زہریلی ہوا تھمی نہیں تھی

کرشن مرلی کے موسیقیت کا سحر ان اشعار میں دیکھئے:۔

وہ اسکی رسیلی تانیں دلکش   سنکر جسے سننے والے ہوں غش

گوکل کی گوالنیں ہیں بیدم   ہے مستی و بے خودی کا عالم

ہر تان پہ سب پھڑک رہی تھیں   سب شیام سندر کو تک رہی تھیں

تھی معجزہ بانسری کی آواز   فوق العادة تھا سوز میں ساز

کچھ ایسا سماں بندھا ہوا تھا　　سبزہ بھی زمیں پہ لوٹتا تھا
من موہ لیا بجا کے مرلی　　تھی شیام کی تان کیا رسیلی

کنس کے اکھاڑہ کا منظر۔ کرشن و بلرام کی آمد مست ہاتھی سے مقابلہ حاضرین کا خوف وہراس اور کرشن و بلرام کے شجاعانہ کارناموں کی تصویر شعر کے قالب میں دیکھئے:۔

میدان میں پہلواں کھڑے تھے　　دو بچوں کی جان پر اڑے تھے
ہتھیار ہر ایک تولتا تھا　　تلوار کا ڈورا کھولتا تھا
تھا یاں تو دھکڑ پکڑ کا عالم　　ناگاہ کھلا ظفر کا پرچم
وہ گرد اٹھی غبار چھایا　　ہر شخص نے اپنا سر اٹھایا
دامن ہوا چاک گرد کا جب　　دو مہ نکل آئے آخر شب
میداں میں جب آئے شاہزادے　　تکتے تھے سوار اور پیادے
پہلے ہی سے یہ کہی بدی تھی　　اک سمت سے چھوٹا مست ہاتھی
سب جان چرا کے اپنی بھاگے　　بڑھ آئے، کرشن سب سے آگے
تلوار لئے اڑے رہے وہ　　جس جا تھے کھڑے کھڑے رہے وہ
جب آیا قریب مست ہاتھی　　اک وار میں سونڈ کاٹ ڈالی
چنگھاڑ کے فیل مست بھاگا　　پیچھا دیکھا نہ اس نے آگا

کرشن و بلرام کی دیو پیکر پہلوانوں سے کشتی، کرشن کا غلبہ۔ تماشائیوں کا حیرت بدنداں ہونا اسکو نظم فرماتے ہیں کہ:۔

آئے جو مقابلہ کو دشمن　　گردانا کرشن نے بھی دامن
یاں آتے ہی ان کے چھکّے چھوٹے　　لڑکوں کو جو دیکھا دل بھی ٹوٹے
سمجھے تھے کہ ان کی جان لیں گے　　دونوں کو اٹھا کے پھینکا دیں گے
لڑتے رہے دونوں بے ارادے　　کھیلا کئے دونوں شاہزادے
وہ پیچ کیا کرشن جی نے　　لی سانس تلک نہ مدعی نے
سینے پہ اسے گرا کے بیٹھے　　اٹھا نہ وہ یوں دبا کے بیٹھے

کنس کے قتل پر وفادار و جاں نثار حاشیہ نشینوں کا سکوت عبرت کے لئے کافی ہے:۔

نیرنگی دہر کے کرشمے　　عبرت کے سبق کے ہیں معمّے
آلودہ بخوں تڑپ رہا ہے　　سر تن سے کہیں جدا پڑا ہے
بیجا تھا غرور حکمرانی　　عبرت کی ہے جا جہان فانی

تاج اس کا زمین پر پڑا تھا — جو ظلم کو رسم جانتا تھا
جو تاجوروں کا تاج لیتا — راجاؤں سے جو خراج لیتا
بیجان پڑا ہے سر کٹائے — سب دور ہیں پاس کون آئے
آیا نہ کوئی اسے بچانے — وہ قتل ہوا کھلے خزانے
بے گور دکفن پڑا ہے لاشا — دیکھا کئے سب کھڑے تماشا

کنس کی ظالمانہ زندگی کا خاتمہ کر کے سری کرشن جی مہاراجہ شاد کی شاعرانہ زبان سے اپنے پیروؤں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

مجھ کو نہیں خواہش حکومت — جایز نہیں رکھتا میں خصومت
ظالم نہیں میں جو خون بہاؤں — غاصب نہیں ہوں جو ملک پاؤں
ظالم سے کیا ہے ملک خالی — یہ پھانس جگر میں کھٹکی نکالی
میرا بھی فرض منصبی تھا — قصہ کروں پاک فتنہ گر کا
میرا جو ہے راج اور ہی ہے — تخت اور تاج اور ہی ہے

مثنوی کا خاتمہ مہاراجہ شاد نے اس دعا پر فرمایا ہے جس پر آپ بھی آمین کہئے:-

او شان ہر اک بدلنے والے — یکتائی کی راہ چلنے والے
او بانسری کے بجانے والے — ہر ایک کا دل لبھانے والے
او زلف سیاہ والے ہیتم — او مظہر لطف رب اکرم
ہے داس ترا یہ شاد صوفی — کرتا ہے نوا کے سیس بھگتی
نرگن ہو کر سگن بنا دے — پردے مری آنکھ سے اٹھا دے
ہر کیفیت بنا سر یہ میرا — جگ میں مجھے آسرا ہے تیرا
مرلی کی مجھے صدا سنا دے — وہ نغمۂ جانفزا سنا دے
دیکھا نہیں جو سماں دکھا دے — وہ جلوۂ ضوفشاں دکھا دے
درشن دے سکھی رہوں میں — کرپا سے ترے غنی رہوں میں
اس دل کی تڑپ نے مار ڈالا — ارماں نہ مگر کوئی نکالا
سمرن تری جپ رہا ہوں کب سے — دے مجھکو فرد وس مری طلب سے
سنتوش ہو من وہ روپ دکھلا — بھگوان بھگت کے بس میں آ جا
من کی بپتا تو دیکھ میسری — دکھ میں مرے دلکو دے دلیری
میری جو مراد ہے تو یہ ہے — خوش کامی شاد ہے تو یہ ہے

خدا حسن قبول دے اور زور بیان میں قوت، تاکہ آپ کے دماغی افکار سے دنیائے شاعری ہمیشہ لطف اٹھاتی رہے

ہوش بلگرامی

زندگی

زندگی کی ماہیت اور اس کی علت غائی پر از آدم تا ایندم ہر زمانہ اور ملک میں انسان کچھ نہ کچھ غور و فکر کرتا رہا ہے۔ بظاہر ہم لاکھ آسودہ اور مطمئن ہوں لاکھ ہمارے اقتصادی، سیاسی، دماغی اور دیگر حوصلے پورے ہو چکے ہوں پھر بھی ہمارے اندر آسودگی کا ایک عنصر جراثیم سل کی طرح رہ جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری ساری ہستی پر اس طرح چھا جاتا ہے اور ہماری زندگی کو کچھ اس قدر دردناک بنا دیتا ہے کہ شبلی کی طرح عاجز ہو کر چلا اٹھتے ہیں "واہ ری دنیا! واہ ری زندگی! واہ رے زمانہ!" یا بیدل کے ساتھ بیساختہ یہ کہکر سر پیٹنے لگتے ہیں:۔

"چہ بارِ کلفتی اے زندگی کہ ہمچو حباب　　تمام آبلہ بر دوش کردہ ماند ا"

بڑے سے بڑے شہنشاہ سے لیکر معمولی کوچہ گرد بھکاری تک اور بڑے سے بڑے عالم سے لیکر ایک غیر متمدن عامی تک سب کی زندگی میں ایسے لمحے کبھی نہ کبھی ضرور آتے ہیں کہ زندگی ایک بار معلوم ہونے لگتی ہے اور دنیا کا یہ نگار خانہ اپنی تمام دلفریبیوں اور نیرنگیوں کے باوجود ہم کو سکون دینے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

زبردست سے زبردست مادہ پرست فرعون کو زندگی میں ایسی ساعتوں سے سابقہ پڑا ہے اور پڑتا رہتا ہے جبکہ اس کے اموال و مقبوضات اس کے کام نہیں آتے اور وہ اپنی تمام جاہ و ثروت ساری عظمت و شوکت لئے ہوئے بلا کسی ظاہری سبب کے ایک عجیب بیچینی ایک ناقابل اظہار پراگندگی یا ایک غیر واضح افسردگی محسوس کرنے لگتا ہے اور دنیا کی تمام مسرتوں سے بیزار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو اس عالم انتشار میں ہمارا دم اس طرح گھٹنے لگتا ہے کہ ہم دلکش سے دلکش کلاہ سلطانی کو "بدردِ سر نمی ارزد" کہکر اتار پھینکتے ہیں اور ہماری ہستی کی گہرائیوں سے یہ جانگاہ صدا بلند ہوتی ہے:۔

"ہائے کس خواب سے ہستی نے جگایا مجکو"

جاننے والے جانتے ہیں کہ مادیت کے علمبردار استدلالیت کے نبی اور افادیت کے مبلغ جان اسٹورٹ مل کو اپنی زندگی میں کتنی بار ایسے تاب آزما اور جاں گسل تجربے ہوئے ہیں۔ اس پر یکے بعد دیگرے ہیجان اور اضمحلال کے دورے پڑا کرتے تھے اور اس کو کسی پہلو قرار نہ تھا اس نے اپنی "حیات خود نوشتہ" میں ان حالتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ایسی نازک گھڑیوں میں اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی ساری بنیاد متزلزل ہو رہی ہے اور کائنات میں کوئی ایسی دلچسپ چیز نہیں ہے جو جینے کا سہارا بن سکے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کا عقیدہ یہ تھا کہ زندگی کا نصب العین کسب مسرت ہے۔ "بطل پرست" کارلائل بھی ایک عرصہ تک اس روحانی مرض میں مبتلا رہ چکا ہے۔ شب و روز اسکو "دائمی نہیں" کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور مقابلہ میں وہ ایک مدت تک ہارتا رہا یہ "دائمی نہیں" دراصل انسان کے اندر اس شیطانی قوت کا نام ہے جو ایمان و ایقان کو فنا کر کے روح کو تشکیک و لاادریت کے طوفان میں چھوڑ دیتی ہے یہی "دائمی نہیں" ایک عمر تک امام غزالی کا پیچھا کرتی رہی یہاں تک کہ انہوں نے تصوف کی چار دیواری میں پناہ لے لی اور یہاں ان کو قطعاً سکون ملا ہو گا اس لئے کہ نو زندگی۔ کائنات خیر و شر

رنج و راحت کی اصلیت سے بہت بڑی حد تک آگاہ ہو چکے تھے، بہر صورت کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ناآسودگی انسان کا مقدر ہے اور اس سے نجات پانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہیجان و اضطراب انسانی دنیا ہی تک محدود ہے اور دوسری مخلوقات اس غم سے ناآشنا ہیں؟ کون جانتا ہے کہ زمان و مکان کے تماشہ گاہ میں کون سا الم نامہ پیش کیا جا رہا ہے، جسمیں ہر مخلوق کا کوئی نہ کوئی حصہ ہے؟ بہت ممکن ہے کہ شیفتہ کا یہ نادانستہ صحیح ہو:

"آرام سے ہے کون جہان خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں"

یا بقول مومن:-

"شبنم خراب پھرو کتاں سینہ چاک ماہ
لو اور بھی ستم زدہ کار روزگار ہیں"

تو پھر کیا ہماری زندگی واقعی ایک عذاب ہے؟ کیا یہ سارا مایا جال قدرت کا کوئی دل آزارانہ استہزا ہے؟ کیا شوپن ہار کا خیال صحیح ہے کہ جس مشیت نے ایک اشارہ سے کائنات کا اتنا بڑا کارخانہ پھیلا رکھا ہے وہ ایک شریر قوت ہے؟ دنیا میں اکثر لوگ تو ایسے ہیں کہ ان سوالات پر ایک لمحہ کے لئے بھی سر کھپانا نہیں چاہتے۔ لیکن اس بے اعتنائی سے سوالات کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہے اور جو دل و دماغ رکھتے ہیں وہ ان سوالات پر بغیر سر کھپائے ہوئے نہیں رہ سکتے۔

زندگی اگر صرف اندھوں کا کھیل یا کسی جبار ہستی کا ظلم نارو نہیں ہے تو پھر آخر زندگی ہے کیا، اور اسکی غرض و غایت کیا ہے؟ اس سوال کے مختلف زمانوں میں لوگوں نے مختلف جواب دیئے ہیں۔ بیکن نے اپنی مشہور عالم تصنیف "اطلانطس جدید" (New Atlantis) میں زندگی کا نصب العین قوانین قدرت کی تحقیق اور علم و حکمت کی ترقی قرار دیا ہے۔ بیچارہ اپنے زمانہ کی شورشوں سے مغلوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ بہر حال بیکن اور اس کے جانشینوں نے زندگی کے مسئلہ کو ریاضیات کا مسئلہ بنا کر چھوڑ دیا۔ وہ کہتے ہیں "ہم کو نہ یہ معلوم ہے اور نہ یہ معلوم کرنے کی چنداں ضرورت کہ زندگی کی ماہیت کیا ہے، ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ انسان احساسات و جذبات رکھنے والا جانور ہے اب جتنا ہی زیادہ انسانی احساسات و جذبات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اتنی ہی زیادہ زندگی خوشگوار ہوتی جائے گی اور اسیقدر زیادہ دنیا رہنے کے قابل جگہ بنتی جائے گی" اور انبساطی جذبات کو بڑھانے کی یہ صورت بتائی گئی ہے کہ ہم قوانین قدرت پر عبور حاصل کریں اور قدرت کو جہاں تک ممکن ہو اپنے قابو میں لائیں۔

اب آیئے تھوڑی دیر کے لئے آجکل کی مہذب دنیا کی سیر کریں جو بیکن کی "اطلانطس جدید" سے قطعاً منزلوں آگے بڑھ چکی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ طبیعیات اور کیمیا نے ہمارے لئے ہر طرح سامان عیش و تفریح بہم کر رکھا ہے ہر وہ بات جو سو سال پیشتر ناممکن معلوم ہوتی تھی نئی روشنی نے اس کو ہماری زندگی کا ایک کھیل بنا دیا ہے۔ لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان اب زیادہ پُرسکون زندگی بسر کر رہا ہے، ہمارا تجربہ اس سوال کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ مادیت کے قدم بقدم انسان کی ناآسودگی بھی بڑھتی گئی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیکن کے وقت سے کہیں زیادہ آج کل اسپر غور کیا جا رہا ہے کہ انسان کے سکون و اطمینان کی صورت کیا ہو سکتی۔ دنیا کو سیاسی، اقتصادی، علمی اور اخلاقی حیثیتوں سے کیا ہونا چاہئیے؟

یہ سوال ادبیات حاضرہ کا ایک خاص جز بنگیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک ایسا معمہ ہے جس کو حل کرنا مادیت اور ظاہر پرستی کا کام نہیں ہے۔

سائینس اور تمدن سے مایوس ہو کر اب مذہب اور تصوف کی طرف آیئے۔ اسمیں شک نہیں کہ ان دو چیزوں نے انسان کو ایک مہتم بالشان اور جلیل القدر چیز بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ پیغمبروں اور صوفیوں نے ہمکو یہ بتایا کہ ہماری زندگی ایک عکس ہے ذات ذوالجلال کا جو تمام کائنات پر محیط ہے۔ زمان و مکان کے مظاہر و حوادث چند آنی و فانی تنوعات ہیں، ایک لایزال ہمہ گیر ہمہ داں قوت کے۔ انسان ایک نقش ہے اس قادر مطلق کا جس نے ایک "کن" سے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کر ڈالے۔ ہمکو بصد ناز یہ ندا رتبایا جاتا ہے کہ

"من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود   آدم آورد دریں دیر خراب آبادم"

ہم بذریعہ انفراد و انفصال اپنی اصل سے جدا کر دئیے گئے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح "نے" کاٹ کر "نیستان" سے جدا کر دی جاتی ہے اب ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ جس چیز کو ایک بار کھو چکے ہیں اس کو پھر پالیں، جس فردوس سے ہم ایک مرتبہ نکالے جا چکے ہیں اسمیں پھر داخل ہو جائیں یہ کیونکر ممکن ہے؟ تقریباً ہر مذہب اور صوفیوں کے ہر فرقہ نے اس کا ایک جواب دیا ہے۔ سورگ کو جیت لینے کی صرف ایک تدبیر ہے اور وہ عبادت ہے بھگتی ہے۔ معرفت ہے گیان ہے اپنے "روزگار وصل" کو پھر حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم تنوعات سے قطع نظر کر لیں اور "اصل" کا دھیان کریں۔ انسان کل میں اسطرح محو ہو جانا چاہئے کہ جزئیات کا احساس تک باقی نہ رہ جائے دنیا "دار المحن" ہے زندگی "سجن المومنین" ہے اور اس سے پیچھا چھوڑانے کی کوشش کرنا ہر ایمان والے کا منصب دلین ہے، اور اس کی یہی ایک تدبیر کہ ہم دنیا و مافیہا کو ایک نقش بر آب ایک نمود بے بود سمجھ کر خاطر انداز کر دیں۔ مذہب اور تصوف کا فلسفہ اور اصل و غایت جو کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ دونوں آخر میں جلکر انسان میں معزولی اور رہبانیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یعنی زندگی کے مسئلہ کا حل یہ بتایا جاتا ہے کہ زندگی کو تج دو اور یہ کوئی حل نہیں ہوا یہ تو ایک طرح کی بے ہمتی اور نامردی ہوئی۔ زندگی اگر کوئی درد ہے تو اس کا علاج یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی ٹیسوں کی طرف سے بے حس ہو جاؤ۔ اب تک جتنے مبلغین اور متصوفین گذرے ہیں ان سب نے ایک عام غلطی یہ کی ہے کہ عقبیٰ کو دنیا سے الگ سمجھا اور سب نے بلا استثنا یہ کوشش کی کہ انسان کو خدا کی طرف لیجائیں۔ حالانکہ درحقیقت اس کوشش کی ضرورت تھی کہ خدا کو انسان کی طرف لے آیا جائے اور دنیائے انسانیت کا اپنا مرکز قائم رکھتے ہوئے الوہیت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ "قطرہ" میں "دجلہ" اور "جز" میں "کل" دیکھنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ قطرہ کی ہستی کو بھول جاؤ یا "جزو" کو ایک حرف غلط سمجھ لو۔ فنا فی اللہ سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ اللہ کی مخلوقات سے بیگانہ ہو جاؤ، عقبیٰ کی فکر اس کو نہیں کہتے کہ دنیا کو محو کر دو۔ عقبیٰ تو دنیا ہی کی ایک ارتقائی صورت ہے۔

زندگی نام ہے چند تعلقات کا۔ چند اعتبارات کا اور جب آپنے ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور جب آپنے تیاگ کا پرچار شروع کر دیا تو آپ جوگی سہی۔ اللہ والے سہی۔ ولی سہی لیکن کم از کم آپ یہ کہنے کا منھ نہیں رکھتے کہ آپ نے زندگی کے مسئلہ کو حل کر لیا ہے۔ مذہب نے تو خیر دنیا سے کسی حد تک ناتا قائم رکھا۔ لیکن تصوف نے دنیا کو بری طرح مٹانے کی کوشش کی۔ میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ تصوف کی بنیاد تیاگ پر ہے بلکہ برخلاف اس کے میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ تصوف نام ہے عمل اور درس عمل کا۔ لیکن دنیا میں اب تک عملاً ایسے تصوف کا وجود نہیں رہا ہے۔ جس نصب العین اٹھتا ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی کو آخر میں جلکر نظر انداز کر دیتا ہے۔ ایسے صوفیوں کا شمار شاید انگلیوں پر کیا جا سکے جن کو بنی نوع انسان کیساتھ

کوئی عملی ہمدردی رہی ہو۔ رہبانیت اور صوفی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان میں انفرادیت کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔ گرد و پیش کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی صلاحیت اس میں باقی نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ صوفیوں میں ایک طرح کا جمود پیدا ہو جاتا ہے، اور ان کی ہستی کا ایک جزو مفلوج ہو جاتی ہے، یہ سب جانتے ہیں اور یہ سب کہتے ہیں کہ

"بنی آدم، اعضائے یکدیگر اند"

لیکن یہ جانتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے وہ ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ ساری خلقت محبت و ابتلا میں سرگرداں ہے کہیں روٹی کپڑے کا رونا ہے کہیں تندرستی کا۔ کسی کو یار کا غم ہے کسی کو روزگار کا۔ کسی کو کچھ دکھ ہے کسی کو کچھ تو پھر ہم ان سب کی طرف سے آنکھیں کیونکر پھیر سکتے ہیں اور ہم کو اپنی شخصی اشراقیت میں کیا راحت مل سکتی ہے اگر ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ساری کائنات کی اصل نسل ایک ہی۔ ہم سب ایک ہی ابوالبشر کی اولاد ہیں اور ہم سب کو ایک ہی قدرت کاملہ نے پیدا کیا ہے؟ فطرت سلیم رکھنے والوں پر روشن ہے کہ جب تک ہم اپنی مادی زندگی کے کثیف اور پرشور مسائل کو روحانیت میں شامل نہیں کر لیتے جب تک روحانیت کی بنیاد تجرد پر ہے اسوقت تک روحانیت کے ہاتھوں ہم کو سکون ملتا نظر نہیں آتا۔

اب سکون کی تلاش میں صرف دنیائے شاعری کا جائزہ لینا رہ گیا ہے شاعری کا دنیا پر ابتدائے آفرینش سے جو احسان ہے اس کا اعتراف نہ کرنا سچا کفر ہے، اگر آج دنیا میں شاعری نہ ہوتی تو زندگی قطعاً عذاب تھی اور خودکشی ہماری نجات کا ذریعہ۔ شاعری نے ہمکو اس قابل بنایا کہ ہم اس عذاب کو راحت سمجھیں اور اپنی دوزخ کو جنت بنالیں۔ شاعری نے جو سب سے بڑا کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی دنویت کو قائم رکھتے ہوئے اس کو فردوس میں تبدیل کر دیا ہے۔ شاعر جبتک اسپر مذہب اخلاقیات یا تصوف کا غلبہ نہیں ہوتا، انسان کی انسانیت کو قابل ملامت نہیں سمجھتا۔ وہ ان کمزوریوں کا احترام کرتا ہے جن کی بدولت انسان انسان ہوا، اسکو اس بات پر ناز نہیں ہے کہ انسان کبھی فرشتہ تھا۔ اسکے نزدیک قدو مباہات کی اگر کوئی بات ہے تو یہ ہے۔

"آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند"

شاعر کا مذہب محبت ہے اور محبت نام ہے تعلقات میں جکڑے رہنے کا۔ محبت کا تقاضا ہے کہ لاکھ تم کو محرومیوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ لاکھ ہجر کی سختیاں جھیلنا پڑیں۔ لاکھ الٹی سانسیں لینا پڑیں مختصر یہ کہ زمانہ لاکھ تم کو ستائے تم اپنی محبت میں ہنستے کھیلتے ثابت قدم رہو شاعر اسکو شایان شان نہیں سمجھتا کہ محبت کی صعوبتوں سے گھبرا کر محبوب کو ترک کر دے اور "الاماں" کہتا ہوا گوشۂ عافیت اختیار کرلے۔ بلکہ اس کے بالکل برخلاف وہ ہر مصیبت اور ہر غم پر "ہل من مزید" کا ترانہ بلند کرتا ہے۔ وہ اگر روتا بھی ہے تو ہنس ہنس کر اور مزے لے کر۔ وہ ہم کو یہ سبق دیتا ہے کہ زندگی کا راز دھن اور لاگ ہے اور اس کا مقصد حرکت و اضطراب ہے نہ کہ افسردگی اور مجہولیت۔ شاعر جانتا ہے کہ ہمارے "چمن" کی "بہار" نت نئی شکستہ رنگیوں پر منحصر ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت کو کماحقہ سمجھ چکا ہے جو بقول درد بس اسقدر ہے:۔

"مرگ بازیست کارہا دارد زندگی انتظارہا دارد"

یہ مان لیا کہ زندگی ایک بلا ہے اور ہستی کا یہ سارا جنجال کسی شریر قوت کا اندھیر ہے، لیکن ہم اس کو اپنے لئے سرمایۂ راحت بنا سکتے ہیں۔

ہم کو اپنی بے چینیوں میں سکون حاصل کرنا ہے تو ہمکو اپنی کرب کی کروٹوں سے راحت ملے گی۔ راحت یا سکون کوئی خارجی چیز نہیں ہے بلکہ خود اپنے اندر موجود ہے اگر یہ سچ ہے کہ

"تمام کا ہے میرے وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا　　کام کا ہے میرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا"

تو انسان کو اس خیال سے خوش ہونا چاہئے اور اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے۔ ہم میں ایک ذوق۔ ایک جوش۔ ایک حوصلہ کی ضرورت ہے، پھر ہماری زندگی کبھی تلخ اور بدمزہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم میں شغف اور انہماک کا ملکہ ہے۔ اگر ہم دھن کے پورے ہیں۔ اگر ہم خلوص کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ:۔

"اگر قضا و قدر ز آسماں فرود آید　　من خیال تو باخیر و شر چہ کار مرا"

تو پھر یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم نے قضا و قدر پر واقعی فتح پائی ہے۔

شاعر کا پیغام یہ ہے کہ اگر آلام و مصائب ہماری قسمت میں ہیں۔ اگر ہم مجبور ہیں تو یہ کیا کم ہے کہ: "ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر" کم از کم ہم کو اپنی مجبوری کے اندر پورا اختیار حاصل ہے اگر ہم تڑپائے جاتے ہیں تو ہمارا کام یہ ہے کہ اپنی تمام قوت تڑپنے لوٹنے اور سر دھننے میں صرف کر دیں "گرانیٔ محمل" کا جواب صرف یہ ہے کہ اپنی "حدی خوانی" کو تیز کر دیا جائے، زندگی کی تکان کو دور کرنے کی یہی ایک صورت ہے، ہستی کا غم یونہی غلط ہو سکتا ہے یعنی زندگی کے مسئلہ کا حل عمل ہے نہ کہ تیاگ اور بیراگ۔

شاعر سے اگر "ذاتیت" (subjectivism) اور انفرادیت کی خامی دور کر دی جائے اور خدا کا شکر ہے کہ وہ آجکل بہت حد تک دور ہو چکی ہے اور دور ہوتی جا رہی ہے) تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج جبکہ مذہب ایک ڈھکوسلا ثابت ہو چکا جبکہ تصوف کا پردہ فاش ہو چکا ہے جبکہ مادیت کی بے مائگی ظاہر ہو چکی ہے اور جبکہ مجاز اور حقیقت کی لغو تفریق مٹ چکی ہے اور مجاز بجائے خود ایک حقیقت رکھنے لگا ہے۔ انسان کا اگر کوئی نجات دہندہ ہو سکتا ہے تو شاعر جس کا پیغام یہ ہے۔

"عمل کن عمل کن کہ خامی ہنوز"

یہی زندگی ہے اور یہی روحانیت۔

مجنوں گورکھپوری

کتاب سانس کے عجائب میں کیا ہے؟

(۱) سانس کے ذریعہ سے تندرستی و بیماری کا حال معلوم کرنا۔

(۲) سال کی اچھائی برائی پر حکم لگانا۔

(۳) ازالہ مرض کرانا۔

(۴) غالب مغلوب کو پہچاننا۔

(۵) بھاگے ہوئے کا پتہ چلانا

(۶) دل کے حالات معلوم کرنا۔

صرف ۴ر آنہ کا ٹکٹ بھیجنے سے مفت ملسکتی ہے۔

"منیجر نگار۔ لکھنؤ"

جن حضرات کا چندہ اس رسالہ ماہ دسمبر ۲۹ءسنہ کیساتھ ختم ہوتا ہے

ان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جنوری سنہ ۱۹۳۷ء کا پرچہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں تیار ہو جائے گا، اگر اس سے قبل پانچروپیہ ذریعہ منی آرڈر وصول ہوگئے تو خیر ورنہ جنوری کا رسالہ دی۔ پی کے ذریعہ سے روانہ ہوگا۔

دی۔ پی مع محصول ڈاک ﷲ میں ہوگا اور ڈاکخانہ آپ سے دو آنے زاید لے گا، اس طرح گویا ﷲ ادا کرنا پڑیں گے، منی آرڈر روانہ کرنیکی صورت میں ۳ر آنہ کی بچت ہوگی۔

جو حضرات رعایتی قیمت پر کتابیں حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ رعایتی قیمت چندہ کے ساتھ ہی روانہ کردیں تو بہتر ہے۔ کتابیں ذریعہ دی۔ پی طلب کرنے میں، ان کو اس امر کا انتظار کرنا پڑے گا کہ یہاں نگار کا چندہ وصول ہو جائے۔ کیونکہ یہ رعایت نگار کے خریدار رہنے ہی کی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے۔ کتاب سانس کے عجائب۔ بالکل مفت دی جائے گی لیکن اس میں بھی وصول چندہ کی شرط ہے۔ یوں ہر کے ٹکٹ موصول ہونے پر روانہ نہ ہوگی۔

نگار کا آئینہ نمبر

۱۶۰ صفحات کو محیط ہوگا اور بعض نہایت بیش بہا مضامین اسمیں ہوں گے، کوئی مضمون ناقص و نامکمل نہ ہوگا۔

جن حضرات کا چندہ دسمبر میں ختم ہو رہا ہے۔ ان کو ایک مطبوعہ تحریر اسی رسالہ کے اندر ملیگی۔ اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد فیصلہ فرمائیے کہ آئندہ خریدار رہنے کی صورت میں آپ منی آرڈر بھیجنا مناسب سمجھتے ہیں یا دی۔ پی طلب فرمانا۔

ادبی خطوط غالب

جنکو

مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے لکھنوی نے نہایت محنت و عرقریزی سے کتب مذکورہ بالا سے اخذ کرکے باضافہ ایک بسیط اور مفید مقدمہ اور مرزا غالب کے اکثر مکتوب الیہم کے دلچسپ حالات و نمونہ کلام کے مرتب کیا ہے

حجم ۴۶۰ صفحات تقطیع ۱۸×۲۲ قیمت مع تصویر غالب (عہ)

"منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ"

باب الاستفسار

ساردا بل، صغر سنی کی شادی۔ اور ہمارے علما کی غلط فہمیاں

(جناب سید عبدالکبیر صاحب۔ دارجلنگ)

آپ نے اس سے پہلے رسالۂ نگار میں مختصر طور پر اپنی رائے ساردا بل کے موافقت میں ظاہر کی تھی، لیکن وہ رائے غالباً سرسری تھی اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دلائل کے مقابلہ میں جو علما کی طرف سے بیان کئے جاتے ہیں زیادہ شرح و بسط سے کام لیا جائے۔ اس لئے موقعہ و محل کے لحاظ سے اگر اس کو دیگر استفسارات پر مقدم سمجھ کر درج نگار فرمائیں گے تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔

(نگار) اگر آپ کا یہ استفسار میرے سامنے نہ ہوتا تو بھی میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس ماہ کے نگار میں کم از کم بہ سلسلۂ ملاحظات ہی، اس مسئلہ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالوں گا، لیکن اب آپ کے استفسار نے اس ارادہ کو اور زیادہ قوی کر دیا اور میں آج کی صحبت میں اس باب پر اپنی رائے واضح طور پر ظاہر کئے دیتا ہوں:۔

دنیا کی جتنی مذہبی قومیں ہیں، ان کے قانون و شریعت پر دو طرح بحث ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ اصل ماخذ شریعت کو سامنے رکھ کر اس سے کوئی نتیجہ نکالا جائے اور دوسرے یہ کہ تمدنی ضروریات کے لحاظ سے عقل کو رہبر بنا کر تنقید کی جائے۔ چونکہ نکاح کا مسئلہ بھی منجملہ قانون یا شرعی مسائل کے ہے، اس لئے اس پر بھی دونوں پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے اور ہونا چاہئے۔

میں اس جگہ نفس مسئلہ نکاح پر کوئی عقلی یا نقلی بحث نہیں کروں گا اور نہ فلسفۂ ازدواج سے اعتنا کرنا میرا مقصود ہے (اگرچہ اس حد تک کہ ضمناً اس کا ضروری ہو) بلکہ جہاں تک ساردا بل کا تعلق ہے، اسی حد تک اپنی گفتگو کو محدود رکھوں گا۔ اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ساردا بل کا نفاذ، جہاں تک واضع قانون کی نیت کا تعلق ہے۔ حد درجہ نیک نیتی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اور اس سے کوئی مذہبی یا قومی، تمدنی یا سیاسی اختلاف مقصود نہیں ہے، لیکن فریق مخالف اس کے جواب میں کہہ سکتا ہے کہ صرف حکومت کی نیک نیتی اس امر کی کافی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرے اور جن باتوں کو ان کے مذہب نے جائز قرار دیا ہے حرام کر دے۔ اور یہی اصل روح ہے تمام مخالفین ساردا بل کے جواب کی، جسکو مختلف اسلوب بیان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اگر آج واقعی اس کا فیصلہ ہو جائے کہ مذہب اسلام نے صغر سنی کی شادی کو جائز قرار دیا ہے، تو یقیناً اس بل سے اتفاق کرنا مذہب کی مخالفت ہوگی اور اگر یہ ثابت نہ ہو سکے تو پھر ساردا بل کے خلاف احتجاج شاید ہی کوئی ایسا حرج ہوگا جو عقل کے منافی نہ سمجھے

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ جتنے علماء کرام کے بیانات اس باب میں شایع ہوئے ہیں انہوں نے بالاتفاق اس کو تسلیم کیا ہے کہ صغر سنی کی شادی فعل حسن نہیں ہے اور یقیناً بہت سی معاشری خرابیاں اس سے پیدا ہو سکتی ہیں، اس لئے میرا سب سے پہلا اعتراض ان حضرات پر یہ ہے کہ اگر اصول صحت و معاشرت کے لحاظ سے صغر سنی کی شادی فعل حسن نہیں ہے، تو کیوں مذہب اسلام نے اس کو جایز قرار دیا، جبکہ شریعت اسلام کو بہترین شریعت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسکا جواب ان کے پاس صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اگر صغر سنی کی شادی کو ممنوع قرار دیا جاتا تو بعض ایسی صورتوں میں جبکہ مصلحتاً اور ضرورت وقت و زمانہ کے لحاظ سے کسی لڑکی کا قبل بلوغ شادی کرنا مناسب ہوتا ہے، ہم مجبور ہوتے اور اس فتنہ و فساد کا سدباب نہ کر سکتے جس کے دفعیہ کی بہترین تدبیر صغر سنی کی شادی ہی ہو سکتی ہے۔ اور اسی خیال کی بنا پر انہوں نے احتجاج کیا ہے کہ اس مسئلہ کا انحصار صرف علماء یا رہبران قوم پر ہونا چاہئے تھا اور حکومت کو قانون بنا کر یہ ذمہ داری اپنے سر نہ لینا چاہئے تھی کیونکہ یہ مداخلت فی الدین ہے اور وہ فعل جو کسی مصلحت کی بنا پر حلال قرار دیا گیا ہے، اسے حرام ٹھیرانا ہے۔ سب سے پہلے میں ان حضرات کو ساکت کردوں جو یہ کہتے ہیں کہ اس مسئلہ کا فیصلہ عالمان دین پر چھوڑ دینا چاہئے اس کے بعد بحث کے دوسرے پہلوؤں پر غور کروں گا۔

میں ان عالمان دین سے جو اپنے آپ کو حامل شرع متین و ہادی راہ یقین کہتے ہیں اور جو قومی معاشرت کی اصلاح کو اپنا فرض دینی قرار دیتے ہیں، یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ صغر سنی کی شادی کا استکراہ کب سے ان کے علم میں ہے، اگر ان کا یہ علم اسی قدر قدیم ہے جس قدر اُن کا وہ جبہ و دستار جو اعلان فضیلت کے وقت ان کے سر و دوش پر ڈالدیا گیا تھا، تو کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت تک انہوں نے اس رسم قبیح کے مٹانے میں کیا کوششیں کیں اور کتنے مسلمانوں کو اس فعل سے باز رکھا۔ میں ہندوستان کے عرض و طول میں ہر اس شخص سے جو اپنے آپ کو مولوی ہونے کی حیثیت سے نکاح کے عقد و فسخ کا تنہا ذمہ دار سمجھتا ہے دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسکی زندگی میں کوئی ایک واقعہ ایسا ہوا ہے جس میں اس نے صغر سنی کی شادی سے انکار کر دیا ہو، انکار نہ کیا ہو یا تو فریقین کو صرف سمجھا ہی دیا ہو کہ یہ فعل محمود و مستحسن نہیں ہے، غالباً وہ نہیں بتا سکیں گے۔ لیکن برخلاف اس کے ہزاروں لاکھوں ایسی مثالیں موجود ہیں جنمیں انہیں مولویوں نے جو آج سارداابل کی مخالفت میں گردن کی رگیں پھلا پھلا کر اسٹیج پر آتش فشاں و شعلہ ریز تقریریں کر رہے ہیں، صغر سنی کی شادی پر نہ صرف جواز کے فتوے دیئے بلکہ بغیر کسی مصلحت کے بغیر کسی حیلۂ شرعی کے خود خدا جانے کتنی کمسن لڑکیوں کی قربانی اپنے "عشق پیرانہ سر" کے دیوتا پر چڑھا کر ہمیشہ کے لئے ان کو اس جایز فطری نشاط سے محروم کر دیا جو ایک جوان عورت کو جوان مرد ہی کے آغوش میں میسر آسکتا ہے۔

آج اگر ان ہادیان طریقت کے تمام وہ کارنامے ہم پر ظاہر ہو جائیں جو دراز عباؤں کے وسیع دامنوں میں، لمبی چوڑی داڑھیوں کے طویل سایوں میں اور قرآن و حدیث کی اُس اعجوبہ خیز تفسیر و تشریح کی اوٹ میں جو اُن کے لئے ہر حرام کو حلال اور ہمارے لئے ہر حلال کو حرام بنا دینے میں "سحر سامری" سے کم مرتبہ نہیں رکھتی، کئے جاتے ہیں، تو دنیا یہ دیکھ کر حیران ہو جائے کہ ہمارے کتنے وہ "ناکردہ گناہ" جن کی حسرت یہاں سے لے جانے کا ذکر غالب نے کیا ہے ان کے نامۂ اعمال میں کس طرح تو بر تو اور تہ بر تہ پائے جاتے ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ کتنی صورتیں معصیت کی ایسی ہیں جو کبھی ہم غریبوں کے خیال میں بھی نہیں گذرتیں اور یہ ہیں کہ خدا معلوم کتنی بار ان کو "چوم چوم کر" اور "جھوٹا" کر کر کے چھوڑ چکے ہیں اور فسق و فجور کو ایک فن کی حیثیت سے مرتب کر گئے ہیں۔

پھر مجھے حیرت ہے کہ جن کے بطون کا یہ حال ہو انپر کیونکر اصلاح معاشرت کے کسی مسئلہ کا انحصار ہو سکتا ہے، صغر سنی کی شادی پر کس طرح انکا اقتدار مناسب ہے اور بھیڑوں کی چوپانی کیونکر ایک غیر راعی کے سپرد ہو سکتی ہے

اگر کہا جائے کہ ان کو صغر سنی کی شادی کا استکراہ حال ہی میں اس وقت سے محسوس ہوا ہے جب سے یہ تحریک ملک میں شروع ہوئی تو کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ۱۸۹۶ء سے لیکر (جبکہ اول اول یہ مسئلہ ملک کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس وقت تک کتنی بار انہوں نے اس کے استکراہ لوگوں پر ظاہر کیا اور کتنی لڑکیوں کو انہوں نے اس بلا سے بچایا۔ غالباً ایک بار بھی نہیں۔ پھر جو جماعت ۳۲ سال کے عرصہ میں کوئی ایک مبارک مثال بھی منع و احتراز کی اپنی طرف سے پیش نہ کر سکتی ہو، اس کا آج یہ کہنا کہ "اٹھئے آئندہ ہم ضرور ایسا کرتے" ایسی سفیہانہ نہیں، بلکہ مفسدانہ جسارت ہے جس کے جواب کے لئے یقیناً کسی دلیل کی ضرورت نہیں

اسی سلسلہ میں آیئے ان خطرات پر بھی اک نگاہ ڈال لیں جو ساردابل کے نفاذ سے مولویوں کے نزدیک ظہور میں آ سکتے ہیں۔ مولانا عبد الماجد بدایونی نے (جنکی عزت میری نگاہ میں ان کے فضل و کمال سے زیادہ انکی ذہانت کی وجہ سے قایم ہے) اپنے مکتوب میں جو ممبران اسمبلی کو مخاطب کر کے کر کے شایع کیا ہے بہ پندار خود صرف عقلی دلایل پیش کر کے حد درجہ ناصحانہ و مشفقانہ انداز سے نرم لہجہ میں گفتگو کی ہے اور تمام ان خرابیوں کا ذکر کیا ہے جو اس قانون کے نفاذ سے ظاہر ہونے والی ہیں۔ اس لئے میں اس کو سامنے رکھکر بحث کے اس پہلو کو بھی ختم کئے دیتا ہوں۔

سب سے پہلے مولانا نے ممبران اسمبلی کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ صغر سنی کی شادی کے انسداد کی طرف جو قباحت مایل و متوجہ کرنے والی ہوئی وہ صرف یک تھی یعنی "قبل از وقت مباشرت" مگر قابل معافی ہوں اگر برادرانہ اخلاص سے اس غلط فہمی کی طرف جناب کو متوجہ کروں کہ نکاح و مباشرت کو ایک سمجھ لیا گیا۔ شریعت اسلامیہ مباشرت قبل از بلوغ کو ظلم بتاتی ہے اور اسی لئے جتنے مسلمانوں میں کمسنی کی شادی کی مثال شاذ و نادر کہیں مل بھی جائے، مگر مباشرت قبل از بلوغ کے جواز کا ثبوت مشکل ہی سے مل سکیگا اور رواج و عمل کی مثال تو مس میو جیسی ...... بھی مسلمانوں کے متعلق قطعاً پیش نہ کر سکی"

امر اول کو ہر ذی ہوش انسان تسلیم کرے گا اور اس لئے یہ کہنا کہ ممبران اسمبلی نے دونوں کے فرق کو محسوس نہیں کیا، قیاس مع الفارق ہے، لیکن مولانا کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بجائے نکاح کے مباشرت کے لئے وقت کی تعیین کر دی جاتی تو انہیں کچھ عذر نہ ہوتا لیکن غالباً مولانا کو معلوم نہیں کہ ۱۳ سال سے کم عمر کی لڑکی سے مباشرت تو پہلے ہی سے تعزیرات ہند میں ممنوع ہے۔ ضرورت تو اس کی تھی کہ ایسے نکاح ہی کو ناجایز قرار دیا جائے جس سے قبل از بلوغ مباشرت کا نہ صرف امکان بلکہ وقوع ہوا کرتا ہے۔ میں مولانا سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر تیرہ سال کی لڑکی سے کسی کی شادی ہو جائے تو کیا اس کا شوہر اس کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتا اور اگر وہ لیجا سکتا ہے تو پھر اس کا یقین کس کو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ مباشرت نہ کریگا، جبکہ سیکڑوں واقع چھ چھ سات سات سال کی لڑکیوں کے عصمت دری کے موجود ہیں۔ چنانچہ بالکل حال کا واقعہ ہے کہ ایک شخص حمید اللہ نے حیدرآباد میں اپنی کمسن بیوی سے مقاربت کر کے اس کو ہلاک کر ڈالا۔ اگر مولانا کے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ وہ نکاح کے بعد لڑکی کی رخصتی کو روک سکتے ہیں یا رخصت ہونے کے بعد اس کے شوہر کو مقاربت سے باز رکھ سکتے ہیں، تو

براہ کرم پہلے اس کو بتائیے تاکہ اس پر غور کیا جائے ورنہ یوں تو وہ خرابی دور نہیں ہو سکتی جس کو وہ خود بھی ظلم سے تعبیر کرتے ہیں اور شریعت کے نقطۂ نظر سے ناجائز۔

امر دوم کے متعلق بصد ادب یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مولانا نے یا تو قصداً کتمان حقیقت سے کام لیا ہے یا یہ کہ انہیں حقیقت کا علم نہیں۔ جناب نصدق احمد خاں صاحب شروانی نے جو اعداد و شمار کمسنی کی شادی کے مسلمانوں میں پیش کئے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کے قریب قریب ہیں بلکہ کہیں ان سے زیادہ زائد ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولانا کی زبان میں "شاذ و نادر" کا استعمال "کثرت اعداد" کی کس حد تک استعمال ہوتا ہے۔

امر سوم میں مولانا فرماتے ہیں کہ مباشرت کا جواز شریعت اسلامیہ میں "مشکل" ہی سے مل سکتا ہے، اگر "مشکل" کے معنے نفی مطلق کے ہیں تو خیر، اور اگر اس کا مطلب ہو کہ ضرورت کے وقت کوئی مولوی اپنے لئے یا کسی اور کے لئے اس کو جائز قرار دے سکتا ہے۔ تو براہ کرم اس طریق استدلال سے آگاہ فرمائیے۔

امر چہارم میں مولانا نے اسی ذہانت سے کام لیا ہے جس کا میں شیفتہ ہوں۔ یعنی مولانا نے "مباشرت قبل از بلوغ" کے رواج و عمل کے انکار کی ذمہ داری خود اپنے سر نہیں لی ہے، بلکہ اس باب میں اپنے اختیارات مس میو کو دیدیے ہیں۔ یعنی مولانا خود تو انکار نہیں کرتے لیکن جب مس میو نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ خود اس راز کو افشا کریں۔

آگے چلکر مولانا فرماتے ہیں:—

"چونکہ بلوغ مزاج، آب و ہوا کے لحاظ سے ہر ملک و ہر صنف میں مختلف عمر میں ہوتا ہے اس لئے اسلام نے کوئی عمر مقرر نہیں کی بلکہ صرف بلوغ پر مدار رکھا، البتہ نکاح ہر عمر میں جائز ہے۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ بعض اوقات ہر ملک، ہر شہر، ہر خاندان میں ایسے حالات پیش آجاتے ہیں یا آسکتے ہیں، جن کے سبب لڑکی کے متعلق ۱۴ سال سے قبل اور لڑکے کے ۱۸ سال سے قبل تنظیم آل و حفاظت ماحول، و اصلاح آل کی خاطر ایسی ضرورتیں ناگزیر ہو جاتی ہیں کہ اگر ان کا نکاح اس وقت نہ کر دیا جائے تو انکی زندگیاں برباد، خاندانی میراث و املاک ضائع یا ان کے ناموس تباہ ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ انگریزی قانون کے ہمہ گیر جول میں شرع اسلامی کے جو چند درسے باقی رہ گئے ہیں وہ نکاح، مہر، طلاق، وقف وغیرہ کے ہیں۔ ساردا ایکٹ ان سب پر غارتگری کا پہلا حملہ ہے اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد کیا ضمانت ہے کہ اسلامی تعداد ازدواج کے بھی خلاف قانون نہ پاس کرایا جائے گا، اور پھر اس کے بعد خلع و طلاق کا قانون بھی انگریزی یا ہندی مزاج کے مطابق نہ بنایا جائے گا۔"

بالکل صحیح ہے کہ بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے، لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ ہندوستان میں اکثر و بیشتر ۱۴ سال کی عمر میں لڑکی جوان ہو جاتی ہے اس لئے قانون کا نفاذ شاذ مثالوں کے لئے نہیں روکا جا سکتا۔ قانون میں ہمیشہ اکثریت و صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے، یعنی یہ کہ بیشتر صورتیں کیا پیش آتی ہیں، اور بہترین ممکن طریقہ کسی امر کے طے کرنے کا کیا ہے۔ دنیا میں کوئی قانون اس دعوے کے ساتھ پیش نہیں کیا جاتا کہ اس میں

کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، یا یہ کہ اس میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں نکل سکتا، بلکہ مدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ حالات حاضرہ میں بہترین صورت کو اختیار کیا جائے اور اکثریت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس لئے مولانا کی یہ دلیل تو کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اب رہ گیا سوال مصالح کا، سو وہ بھی تجزیہ کرنے کے بعد کچھ نہیں رہتے۔ زیادہ صاف الفاظ میں گویا مولانا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر لڑکی کی شادی کمسنی میں نہ کردی جائے تو جائداد تباہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عصمت نہ کھو بیٹھے۔ اول تو میری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ کمسنی کی شادی اور تحفظ جائداد میں باہم کیا علاقہ ہے۔ اس کی ایک مثال زیادہ سے زیادہ یہ فرض کی جا سکتی ہے کہ ایک شخص بستر مرگ پر ہے اور اس کی کمسن لڑکی غیر منکوحہ ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی سے اس کی شادی کردوں تاکہ جائداد تباہ نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ ایسے شخص کو کوئی شخص شادی کے لئے نہیں ملا تو وہ کیا کرے گا، یا یہ کہ بجائے لڑکی کے کمسن لڑکا ہے تو وہ کیا صورت تحفظ جائداد کی اختیار کرے گا۔ عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ جائداد کسی ولی کے سپرد کردی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ کمسن لڑکی بھی ولی کے سپرد نہ کی جائے اور وہ بعد بلوغ اپنے نکاح کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر ہم اس کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں تو میں یہ سوال کروں گا کہ ہزار میں کتنے مسلمان صاحب جائداد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کو کمسن چھوڑ کر مرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ۲۰ فرض کر لیجئے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا ہزار میں ۲۰ کی رعایت تو ان کی دولتمندی کی وجہ سے کرتے ہیں لیکن ۹۸۰ کا تباہ ہونا گوارا کر لیتے ہیں اس لئے کہ ان کے پاس جائداد نہیں ہے۔ رہا سوال حفاظت عصمت کا، سو یہ اس سے بھی زیادہ مہمل ہے۔ کیونکہ خیال عصمت منحصر ہے زیادہ تر تربیت پر۔ اگر لڑکی کی تربیت اچھی ہے تو اس کا اندیشہ نہیں۔ ورنہ بعد بلوغ و قبل بلوغ دونوں طرح اندیشہ رہتا ہے۔ اگر کوئی لڑکی گیارہ سال میں بالغ ہو گئی تو اس کی طرف سے یہ اندیشہ کرنا کہ ممکن ہے وہ عصمت کی حفاظت نہ کرے، اتنا زیادہ قرین قیاس نہیں ہے جتنا شادی کرنے کے بعد تنہا چھوڑ دینے سے۔ پھر یہ اکثر ہوتا ہے کہ شادی کر کے شوہر اپنی جوان عورت کو گھر پہ چھوڑ جاتا ہے اور خود مہینوں بلکہ برسوں کے لئے باہر بسلسلۂ ملازمت و تجارت غائب رہتا ہے۔ اس لئے مولانا بتائیں کہ شرع میں کہاں اس کی ممانعت ہے۔ اور کیوں نہ ان کے نقطۂ نظر سے ایک اور قانون "تمانع ہجر الزوجہ بعد النکاح" نافذ کیا جائے۔

اسی کے ساتھ مولانا نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ آگے چل کر نکاح، خلع، طلاق، وراثت وغیرہ کی اسلامی شریعت پر حملہ نہ کیا جائے۔ اس کا جواب میرے پاس صرف یہ ہے کہ "خدا وہ دن تو کرے" البتہ "تعدد ازدواج" کے باب میں جو اندیشہ مولانا کو ہے اس سے میں اختلاف نہیں کروں گا، کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر "غریب مولوی" مر جائے گا، اور اس کی وہ تمام کارگاہِ خیال جس کو سامنے رکھ کر فردوس کی موعودہ حوروں کی یاد میں چار چار شادیاں کرنے پر بھی اپنی ہوس کی پوری صیقل نہیں کر سکتا، بالکل درہم برہم ہو جائے گی۔ اور یہ سانحہ اس کے "حیات نشاط" اور "نشاط حیات" دونوں کے لئے کسی طرح قابل برداشت نہ ہوگا۔

یہاں تک تو ہو گئی عقلی بحث، اب آیئے اس سلسلہ میں قرآن مجید کو بھی دیکھ لیں کہ اس مسئلہ میں کیا فرمان ہے۔

کلام مجید میں نکاح کا ذکر چند جگہ آیا ہے اور ان میں کوئی مقام یا کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے صغر سنی کی شادی کی اجازت پیدا ہوتی ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہاں بلوغ سے قبل کی شادی ممنوع قرار دی گئی ہے، اور اس وقت تک جتنے نکاح مولویوں نے قبل از بلوغ کئے ہیں وہ سب ناجائز تھے۔ سورہ الروم میں نکاح کی غرض و غایت کو جن صریح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ

مذہب اسلام نے فلسفۂ نکاح کو کیا سمجھا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ومن آیتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ

یعنی خدا نے تمہارے لئے جوڑے اس لئے پیدا کئے ہیں کہ تم ان سے جی کا سکون پاؤ اور آپس میں خلوص و محبت کا رابطہ پیدا ہو۔

ظاہر ہے کہ اس فلسفہ سے بہتر کوئی فلسفۂ نکاح پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی مسئلہ ازدواج اس اصول سے ہٹ کر مرتب ہو سکتا ہے۔ پھر غور کیجئے کہ آیا کمسنی کی شادی میں یہ کیفیت باہم پیدا ہو سکتی، کیا نابالغ بچے اُس راحتِ قلب اس سکونِ جاں اور اس لذتِ اتحاد کو سمجھ سکتے ہیں جس کا ذکر کلام مجید میں کیا گیا ہے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔ فانکحوا ما طاب لکم من النساء" یعنی ان عورتوں سے جو تمہارے دل کو بھائیں نکاح کرو"

ظاہر ہے کہ ایک مرد کے دل میں عورت کی طرف میلان بلوغ کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور ایک عورت بالغ ہونے کے بعد ہی پسندیدگی کے قابل ہوتی ہے۔

اس صورت میں یتامیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

وابتلوا الیتامیٰ حتیٰ اذا بلغوا النکاح فان آنستم منھم رشداً فادفعوا الیھم اموالھم۔ یعنی یتامیٰ کی نگرانی کرو اس وقت تک کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اگر تم دیکھو کہ وہ ذی شعور ہو گئے ہیں تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔

غالباً یہ معلوم کر کے لوگوں کو حیرت ہوگی کہ ابو حنیفہ نے بلوغ کی عمر اٹھارہ سال قرار دی ہے، جو آج مردوں کے لئے سارداایکٹ میں تجویز کی گئی ہے۔

کلام مجید میں ایک آیۃ اور ہے جس سے نابالغ لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی ممانعت ظاہر ہوتی ہے ملاحظہ ہو:۔

یاایھا الذین آمنوا لایحل لکم ان ترثوا النساء کرھا۔ اے ایمان والو تمہارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ جبر و اکراہ سے عورتوں کے وارث بن جاؤ۔ یعنی مدعا یہ ہے کہ عورتوں سے اجازت حاصل کر کے ان کی مرضی و خوشنودی سے ان کے شوہر و وارث بنو اور ظاہر ہے کہ ایک نابالغ لڑکی اس کی اہل ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی رضامندی کا اظہار کر سکے۔ اس میں اتنی سمجھ ہی نہیں ہوتی کہ وہ اچھے برے میں تمیز کر کے اپنے شوہر یا وارث کا انتخاب کرے۔ اسی لئے اس آیت کے نزول کے بعد اسلام میں کوئی نکاح نابالغ لڑکی سے عمل میں نہیں آیا۔

امام سرخسی نے ذیل کی آیت سے نکاح صغیرہ کا جواز ثابت کیا ہے:۔ والائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر والائی لم یحضن۔

طلاق کے سلسلہ میں عدت کا بیان ہوتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ جو عورتیں کبر سنی کی وجہ سے حائضہ نہیں ہوتی ہیں یا جن کو حیض ہی نہیں آتا ہے انکی عدت تین ماہ ہے۔

اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ والائی لم یحضن سے نابالغ لڑکیاں ہی مراد ہیں اور وہ عورتیں مراد نہیں جن کا کسی بیماری کی وجہ سے

حیض بند ہوجاتا ہے، تو بھی اس آیت سے صغیرہ کے نکاح کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ آیت ان نکاحوں کے متعلق نازل ہوئی تھی جو اس سے قبل کی آیت نازل ہونے سے پہلے عمل میں آچکے تھے اور اس لئے اس سے نکاح صغیرہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

کلام مجید کے ساتھ جب احادیث پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے نکاح کے لئے عورت کی اجازت کو بہت ضروری قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ طلب اجازت صغیرہ سے نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ بالغ لڑکی سے ممکن ہے۔ چونکہ اس قسم کی متعدد روایات تمام مشہور کتب حدیث میں باب النکاح کے تحت پائی جاتی ہیں، اس لئے ان کے اندراج کی ضرورت نہیں۔ من شاء فلیرجع الیہ

نکاحِ صغیرہ کے جواز میں لوگوں نے جناب عائشہ کے واقعہ نکاح کو پیش کیا ہے، حالانکہ اصولاً اس سے استناد صحیح نہیں کیونکہ رسول اللہ کا نکاح جناب عائشہ سے قبل اس آیت کے نزول کے ہوچکا تھا جس میں طلب اذن کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کی صورت بالکل وہی تھی جیسی تعدد ازدواج کی تعیین کی کہ اس کی آیت بھی رسول اللہ کی متعدد شادیاں ہوجانے کے بعد نازل ہوئی۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسئلہ جس کی تصدیق میں قرآن کے احکام صراحۃً موجود ہیں، جس کے باب میں احادیث کی تائید موجود ہے۔ جو طبّاً، تمدناً، اور اخلاقاً ہر طرح مستحسن قرار دیا جاتا ہے، اس سے اختلاف کرنا اور اختلاف بھی ایسا شدید کہ معلوم ہوتا ہے مولویوں کے سر پر کوئی پہاڑ آسمان سے ٹوٹ پڑا ہے، کس عجیب وغریب ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس قانون سے خود مولویوں کی تمناؤں اور آرزوؤں پر پانی پھر جاتا ہے، اور ان کی مخالفت اصلاح معاشرت نہیں، بلکہ خود اپنے جذبات کی رعایت پر مبنی ہے

وائسرائے نے جو جواب ڈیپوٹیشن کو دیا ہے وہ اسقدر عاقلانہ مدبرانہ بلکہ مولویانہ ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر مسکت جواب کوئی ہو سکتا ہے، لیکن مولوی جو قیامت تک نہیں سمجھ سکتا کہ مذہب و شریعت میں کیا فرق ہے، جو مذہب و قوم میں کبھی تمیز نہیں کر سکتا، جس کا ذہن کبھی اس قدر بلند نہیں ہو سکتا کہ وہ سیاسیات کو مذہبیات سے ممتاز کر سکے، اس کی سرگی پیشانیاں بالکل حق بجانب ہیں اور اس کا چراغ پا ہونا اس کا فطری تقاضہ۔

بہر حال اب یہ قانون تو مکمل ہوچکا اور دنیا کی کوئی معمولی قوت اس کو منسوخ نہیں کرا سکتی تاوقتیکہ کوئی غیر معمولی مظاہرہ یا سخت خطرناک احتجاج نہ کیا جائے۔ اس لئے میں تمام مولویوں کو جو اس قانون کے مخالف ہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ محض جلسوں ریزولیوشنوں، تاروں اور ڈیپوٹیشنوں سے کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے قربانیوں کی اور یہی چیز ایسی ہے، جو آپ کے پاس موجود نہیں۔

اگر سارداایکٹ واقعی مداخلت فی الدین ہے تو اس سے زیادہ نازک وقت اور کیا آئے گا، کیوں نہیں علماء کرام انجاجاً فاقے کرنا شروع کر دیتے اور اگر فاقے ممکن نہیں، تو کم از کم تو بہ پلاؤ ترک کر کے "نانِ جویں" ہی پر قناعت کریں کہ کسی طرح تو حکومت کو معلوم ہو جائے کہ جو

گروہ اس قانون کی مخالفت پر آمادہ ہے وہ زیادہ نہ سہی ”باندازۂ سرِ سوزن“ ہی تکلیف اٹھانے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ یہ صورت نفاذ سے قبل اختیار کرنی چاہیئے۔ اور جب اپریل سنہ ۱۹۳۰ء میں اس کا نفاذ ہو جائے تو پھر ”قانون شکنی“ کرنا چاہیئے اور ہر مولوی کو کم کم چار چار شادیاں نابالغ لڑکیوں کے ساتھ کر کے ”قید و بند“ کی تکالیف برداشت کرنا چاہیئے، اسکا نتیجہ جو کچھ ہو لیکن ایک فائدہ تو یقیناً حاصل ہو جائے گا اور وہ یہ کہ جس وقت تمام مولوی قانون شکنی کی پاداش میں جیل بھیجدیئے جائیں گے تو کم از کم اتنی مدت کے لئے ضرور دنیا میں امن و سکون پیدا ہو جائے گا اور عالم انسانیت اس عذاب سے چھٹکارا پاکر چند دن تک تو آزادی کی سانس لے سکے گا

رسالہ جن

جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کا بہ ادارت حضرت نیاز فتحپوری شایع ہو گیا، اگر آپنے ابھی تک مطالعہ نہیں کیا تو اب طلب کیجئے اور دیکھئے کہ کیا چیز ہے قیمت سالانہ دو روپیہ چار آنے حجم ڈھائی جز

رسالہ جن

آپ کو بتائے گا کہ (۱) روح کی حقیقت کیا ہے اور عالم ارواح کس نوع کا عالم ہے (۲) روحوں سے کیونکر گفتگو کیجاتی ہے اور ان کے پیام ہمیں کیونکر حاصل ہوتے ہیں (۳) خواب کی دنیا کیا ہے اور تعبیر خواب کسے کہتے ہیں (۴) اشراقیت جو فلاسفۂ مشائین کی مایۂ ناز چیز تھی کسے کہتے ہیں (۵) مقناطیسی خواب دوسرے پر طاری کر کے کیا کیا کام اس سے لئے جا سکتے ہیں (۶) مسمریزم کے کیا اصول ہیں، اور اس سے ہم کیا کام لے سکتے ہیں (۷) دوسرے دل کے اذکار و خیالات جان لینا، بند تحریروں کے مضامین پڑھ لینا کس طرح ممکن ہے۔ (۸) عمل حاضرات کی کیا حقیقت ہے۔ (۹) تختی پر روحوں کی تحریروں کا ثبت ہو جانا، میز کی جنبش سے روحوں کا پیام حاصل کرنا کیونکر ہوتا ہے۔ (۱۰) معمول کی کیا خصوصیات ہیں اور اس کے ذریعہ سے ہم کس طرح پیشین گوئی کر سکتے ہیں (۱۱) یورپ روحانیات کے باب میں کیا کر رہا ہے اور اس کی جدید ترین معلومات کیا ہیں۔ (۱۲) جنات اور بھوت پریت کے متعلق کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات لوگوں کے تجربہ میں آئے ہیں

”مینیجر نگار لکھنو“

ترانہ

فتح کابل

ساقی! درودے!　بر جام و ساغر!　مطرب! سرودے!　با لحن خوشتر!
آمد نویدے،　چون گل معطر!　کز فضل حق شد،　نادر مظفر!
وز تیغ او گشت　کابل مسخر!　اللہ اکبر!　اللہ اکبر!!

یک چند کابل!　وقف ستم شد!　افغانیان را،　دل صرف غم شد!
ہر قلب حساس،　صید الم شد!　وامروز آخر،　دل شاد ہم شد!
از فتح نادر　شیر دلاور!　اللہ اکبر!　اللہ اکبر!!

یک چند ملت!　مدہوش گشتہ!　در قعر ذلت!　روپوش گشتہ!
با شیر قالین　ہمدوش گشتہ!　بر جور سقا،　خاموش گشتہ!
برداشت آخر!　تیغ دو پیکر!　اللہ اکبر!　اللہ اکبر!!

شیران افغان!　خوابیدہ ماندند!　دلہائے ملت!　ترکیدہ ماندند!
بر خاک پستی،　غلطیدہ ماندند!　در قلب ظلمت،　رنجیدہ ماندند!
آخر، عیان شد،　صبح منور!　اللہ اکبر!　اللہ اکبر!!

از غیب آمد،　یک مرد سنگی!　افرشتہ پیکر،　با روح جنگی!

از سطوت او، دل چاک، زنگی! وز ہیبت او، لرزان فرنگی!
ضرغام پردل، شمشیر دلاور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

بالا بلندے! روئین قبائے! دارا شکوہے! خسرو ادائے!
تیمور تمثال! رستم نمائے! نادر مثیلے! نادر لقائے!
شمشیر درکف! صمصام دربر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

از خاک مغرب! آمد چو طوفان! باچشم پرخون! باروح سوزان!
ازدرد ملت! باقلب بریان! درکف نمایان! شمشیر عریان!
گوئی درخشان! صمصام داور! اللہ اکبر! اللہ اکبر!

غمخوار ملت! اورا چو دیدند! شیران افغان! از جا جہیدند!
چون رعد و باران! یک یک رسیدند! تیغ از نیام، روئین کشیدند!
تیغے! چہ تیغے! یک برق مضطر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!!

بافوج احرار، نادر برون شد! قوم و وطن را، او رہنمون شد!
دلہائے اعدا، درسینہ خون شد! افواج سقا! زار و زبون شد!
وز دست او شد، کابل مسخر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!!

تخت امانی! آباد بادا!! شمشیر نادر! آزاد بادا!!
شاہ ولی خان! دلشاد بادا!! اعدائے محمود، برباد بادا!!
کز تیغ شان گشت ملت مظفر! اللہ اکبر!!! اللہ اکبر!!!

محمود شیرانی

ایک تصویر دیکھکر!

یہ حسنِ نازنین! یہ جلوۂ ناز آفرین تیرا!

یہ معصومانہ چہرہ! غنچۂ شاداب کا عالم!
یہ مستانہ نگاہیں! اک بہشتی خواب کا عالم!

سراپا، اک خیالِ حور! جسمِ نازنین تیرا!
مجسم، خندۂ خوابِ پری، روئے حسین تیرا!

یہ موتی، یہ جبین، یا انجم و مہتاب کا عالم!
پریشان خواب کا سا، گیسوئے شب تاب کا عالم!

سراپا، اک شعاعِ نور، عکسِ دل نشین تیرا!!

تو از سر تا بہ پا، اک نکہت و تنویر ہے سلمیٰ!

شراب و شعر و موسیقی کی، پنہان تجھ مین، رنگت ہے!
مرے خاموش دل مین موجزن تیری محبت ہے!

بہار اور خواب کا ہیکل! تری تصویر ہے سلمیٰ!

ادا، اس طرح، قرضِ "رونمائی" کچھ تو کر جاؤن!!
تری تصویر، سینے سے لگا لون، اور مر جاؤن!!!

اختر شیرانی

کوئل

ابر اپنے حواس کھو چکے ہین
آغوش افق مین سو چکے ہین
چادر سے ذرا سرک گئی ہے
شاخون کی طرف لچک گئی ہے
دن بھر کی چلی ہوئی ہوا مین
خوشبو سے لدی ہوئی ہوا مین
فطرت کے چمن کی شاہزادی
پھولون کے وطن کی شاہزادی
ہے رخ پہ پڑی شفق کی چادر
اور قوس کی ہفت رنگ جھالر
خاموش ہین کوہ و دشت و دریا
سکتے مین ہے جیسے بزم دنیا
بیتاب سی تھک کے ہو گئی ہین
آ کر در گل پہ سو گئی ہین
سوتے ہوئے مسکرا رہی ہے
خاموشی کے گیت گا رہی ہے
گویا ہے سکوت شہر و بن میں
دنیا کی ہر ایک انجمن میں

مغرب کے شفق کدے مین چھپ کے
خورشید اچھالتا ہے ساغر
پہنے ہین نیا سہانے توسین
دامن پہ ٹکے ہین ماہ و پروین
بے نور کہین، کہین سیاہی
افعی ہے کہین، کہین پہ ماہی
اور گود مین لے کے مسکرا کر
پہناتی ہے ابر کو جگا کر
قرطاس فلک پہ کتنے نقشے
بنتے ہین ابھی، ابھی ہین مٹتے
پانی مین لگی ہوئی ہے آتش
پھولون مین بسی ہوئی ہے آتش
شعلے کا ہے شہر اک نمایان
ہے آگ کا ہر طرف گلستان
پی کر مے آتشین کی چھاگل
مدہوش پڑے ہوئے ہین بادل
زردی مین گلاب مل رہا ہے
نارنج سحاب کھل رہا ہے
سبزی سے لپٹ لپٹ کے زردی
بنتی ہے زری کی ایک وردی
سرخی مین سیاہی بس رہی ہے
لالہ کی کلی سی ہنس رہی ہے
ہے بام افق طلسم منظر
دیکھ اے نگہ فلک شناور
شعلے کی ہین ندیان کہین پر
اور آگ کی وادیان کہین پر
کہسار ہو، دشت ہو کہ دریا
سب آگ کے بن گئے ہین گویا
سبزہ پہ میں چپ پڑا ہوا ہون
فطرت کے کرشمے دیکھتا ہون

مین دیکھ رہا تھا یہ نظارے
اتنے مین اس آتشین فضا سے
گم ہو گئی پھر لگا کے چکر
جیسے کہ فضا مین برق مضطر
اڑتی ہوئی نغمہ گا رہی ہے
نغمہ کی ہوا مین جا رہی ہے
ہے آپ تو گم مگر نوا مین
آباد کئے ہین کل فضا مین
اور اس کی شمیم عطر دامن
مستی مین ڈبو رہی ہو گلشن
کیا جانے کہان ہے ساز تیرا
معلوم نہین ہے راز تیرا
کس بزم کا راز ہے تو کوئل
اتنا تو بتا دے ہون مین سائل
پاتا نہین دیکھتا ہون جس دم
شاید ہے تو نغمۂ مجسم
لاتا ہے کہین جو ہو کے لوری
فردوس سے نیند کی کٹوری
جیسے کہ کوئی سیاہ بجلی
یکبارگی تو چمک کے نکلی
ظاہر ہوئی باغ مین پھر اک دم
پھر کھو گئی، گل مین جیسے شبنم
پھر چھپ کے کسی شجر پہ تنہا
نغمون کا بہا رہی ہے دریا
جیسے کوئی پھول اک چمن مین
پوشیدہ ہو پتیون کے بن مین
گلزار مین ٹہنیون کے اوپر
کہسار مین جھاڑیون کے اندر
حیران مین دیکھتا ہون ہر سو
آخر ہے یہ کیا صدائے "کو کو"
جب چونک کے دیکھتا ہون کیا ہے
کچھ بھی نہین تو مگر صدا ہے
جو کونہ رہا ہے دشت و بن مین
بجلی کی طرح ہر انجمن مین
پھولون کو کہین سلا رہا ہے
موجون کو کہین کھلا رہا ہے

حائر ہے تو یا نو اے مضطر
یا ڈال کے بادلوں کے پردے
یا رات کو ئی سمٹ کے، ہر دم
ظاہر مین ہے بے قرار و بے کل
میری ہی طرح ہے تو پریشان

پر کیف ہین کتنے یہ نظارے
یا دامن ابر برق مضمر
فردوس کے خوش نما فرشتے
پہنے ہوئے یہ لباس ماتم
ہو تیز ہوا مین جیسے بادل
آشفتہ مزاج و اشک دامان
تو میری طرح نہیں پریشان

نغمون کے برس رہے ہین تارے
یا دیکھ کے یہ سنہرے بادل
بیٹھے ہوئے مست گا رہے ہین
اڑتی ہے اس آتشین فضا مین
دم بھر بھی نہین قرار تجھکو
کیا سبزہ و گل کی بھی فضا مین
تو دشت و چمن مین ہے غزل خوان

خود نغمہ سرا ہوا ہے جنگل
ہر سمت تجھے پکار رہے ہین
گاتی ہوئی ہر طرف ہوا مین
کس شے کا ہے انتظار تجھکو
ہین شاہدِ غم کی جلوہ گاہین

اے مرغ نوا! تھی ایک غلطی
لب میرے ہنسی کو ہین ترستے
کوئی نہین شاد ہے جہان مین
کہتے ہین سب اپنے اپنے قصے
اب دیکھ کے تجھکو پر ترنم
اور ایسی جگہ پہ مین ہون بیٹھا
حل اپنا ہوا یہ جو تنا ہون
لیکن نہین تیرا راگ غمگین
تو بے خبر جہانِ نیرنگ
اب جبکہ گھرے ہوئے ہین بادل
بجلی کے چمک رہے ہین کوڑے
کہسار کے دامنون پہ کتنے
جنگل مین کبھی، کبھی چمن مین
شاید اسی بیکلی کے اندر

میرے دلِ غم نما کی یہ بھی
آنکھون سے ہین یاس و غم برستے
سب کرتے ہین آہ اس مکان مین
دن رات یہان یہی ہین چرچے
دل مین ہے مرے عجب تلاطم
ہر ذرہ ہے جس کا غم مین ڈوبا
مین نیند مین ہون کہ جاگتا ہون
دل تیرا ہے ایک ساز زرین
ہر رنگ مین ہے نشاط آہنگ
سنسان ہے شہر اور جنگل
بادل کے اڑے ہوئے ہین گھوڑے
پھرتے ہین مچل مچل کے نالے
فارس مین کبھی، کبھی یمن مین
ہے راز نشاط تیرا مضمر
دل تیرا جہانِ آرزو ہے

غم دیکھ رہا ہے جو چمن مین
مجھ سے بھی ہوا کوئی ہے غمگین
کوئی ہے شکار مفلسی کا
کیا سعی کرین کہ پا بہ گل ہین
کہسار مین، دشت مین چمن مین
اے کاش تری طرح چمن مین
اے مرغ طرب، ہو انشیمن
جنت کی ہین جس مین کل نوائین
اُس وقت بھی تھی تو پر ترنم
راتین ہین سیاہ، ہو کا عالم
زورون سے برس رہا ہے پانی
اب بھی تو چہک رہی ہے ہر سو
اک جا پہ نہین قرار تجھکو
کیا رمز ہے تیری زندگی کا
پامال و شہید جستجو ہے

خشکی مین، تری مین، شہر و بن مین
اے دہر کہن، طلسم آئین
شکوہ ہے کسی کو بیکسی کا
مجبور ہین، سخت خستہ دل ہین
بیٹھی تو چہک رہی ہے بن مین
اڑتا پھرون مین بھی دشت و بن مین
ہے گو کہ سیاہ تیرا دامن
اور بزم ازل کی خوش صدائین
جب پھول کھلے تھے مثل انجم
دنیا پہ ہے اک سکوت بہیم
پانی کی ہے ہر طرف روانی
ویسا ہی ہے اب بھی شور "کوکو"
کیسا ہے یہ اضطرار تجھکو
اس نغمے کا اس شگفتگی کا؟

فطرت کو نہین قرار تیرے
معلوم نہین ہے تجھکو کیا ہے
دل مین ہے کہ دیکھئے نکل کر

دل مین ہے بھرا شرار تیرے
کس درد و الم کی یہ دوا ہے
دنیا مین کوئی بہار خوشتر

گلہائے وطن سے دل لگانا
اک خواہش نو بہار تجھکو
اُس باغ و بہار کے مناظر

یا آفتِ آشیان اٹھانا
دیتی ہے کہین قرار تجھکو؟
امید کے یہ نئے عناصر

کر دیتے ہین محو آکے دل مین — بس جاتے ہین راہ پا کے دل مین
یون اڑتی ہے چھو کر ہر چمن کو — پاتی نہین رنج اور محن کو

اور دیکھ کے تو یہ گل طرازی — گاتی ہے نوائین تازی تازی
غم ہے نہ کہین فسردگی ہے — تیرا یہ اصولِ زندگی ہے

شمیمی۔ بی۔ اے

ایک دوست کی موت سے متاثر ہو کر

کوئی روتا ہے سرِ گورِ غریبان ہائے ہائے — رات گویا عالم شہر خموشان ہائے ہائے
ہے کھنچی آنکھون مین تصویر گلستان ہائے ہائے — نو گرفتارون کی پہلی شام زندان ہائے ہائے
پیچھے پیچھے موت ہے آگے خدا کا نام ہے — کاٹتا ہے یون کوئی راہ بیابان ہائے ہائے
رک چلی ہے بادِ صرصر ہو کا عالم ہو چلا — دشت مین وہ آمدِ شام غریبان ہائے ہائے
یاد آتی ہین کسی شوریدہ سر کی وحشتین — دیکھکر گلکاریٔ دیوارِ زندان ہائے ہائے
ایک سناٹے کا عالم تھا در و دیوار پر — میرے مرنے پر وہ پہلی شام زندان ہائے ہائے
اے ہوائے فصلِ گل تیری شرر انگیزیان — باغ مین ہر گل ہے شعلہ در گریبان ہائے ہائے
نور کا عالم تھا جوشِ مے سے میخانے مین رات — وہ چھلکتے جام وہ بزمِ چراغان ہائے ہائے
مرنے والے خاک ویرانون مین اڑتی ہے ترے — بادِ صرصر ہے تری گہوارہ جنبان ہائے ہائے
یہ گھڑی بھی آئی اور جیتا ہون مین فرقت نصیب — چھوٹتا ہے ہاتھ سے دامانِ جانان ہائے ہائے
ہم فریبِ حسن سے بیزار کیون ہون اے فراق — بھول جائین کیا کسی کے عہد و پیمان ہائے ہائے

فراق گورکھپوری

نیند

دامنِ شمشیر مین کس لطف سے آتی ہے نیند — کوئی ٹکڑا خلد کا گویا اٹھا لاتی ہے نیند
کانپ جاتے ہین ستارے عشق کی فریاد سے — حسن کی دنیا مین جب ہر سمت چھا جاتی ہے نیند
کارفرما کس کے جذبِ عشق کی تاثیر ہے — اے خدا مجھ کو کہان ہر روز لے جاتی ہے نیند
آہ جب بیداریون مین بھی سرورِ خواب تھا — یاد آجاتی ہین وہ راتین تو اڑ جاتی ہے نیند
ساری دنیا مین ہے جس بیداد گر کا نام موت — تیرے کوچے مین جو آجائے تو کہلاتی ہے نیند
صبح تک دنیا کا کس کو ہوش رہتا ہے نظیر — رات بھر گویا شرابِ ناب برساتی ہے نیند

اصغر حسین نظیر لودھیانوی

مشاہدات وارادات

اک شاعرِ شہرت یافتہ نے کل بزمِ سخن مین نظم پڑہی
اس طرح کہ پوری محفل مین ہنگامۂ تحسین برپا تھا
ہر لفظ سے پھوٹی پڑتی تھی، تنویر ضیائے حسنِ اثر
شاعر کے لبون پر شہرت کا دلچسپ تبسم پیدا تھا
اس نظم کے بعد اب شمع بڑہی اک اور سخن گو کیجانب
"گمنامی دنا پرسی" جس کی ناشاد جبین پر لکھا تھا
جو اس نے پڑہی اس محفل مین، سرشار لطافت نظم نہ تھی
کہسار کے فردوسی دامن مین، چشمہ شیرین بہتا تھا
کیا تجھسے کہون کیا داد ملی شاعر کو مگر اس کاوش کی
مین دیکھ کے طرز اہلِ سخن ہمراز بس اتنا سمجھا تھا

یہ بزمِ جہانستان حقیقت خود محرمِ حقیقت ہے
معبودِ خداوندانِ سخن دراصل خدائے شہرت ہے

(۲)

عقل کو سمجھا ہے تو اسرارِ عالم پر محیط — مین تجھے پیغام دیتا ہون کہ غافل ہوشیار
تیری منزل ہے فریبستانِ اوہام وقیاس — خود حجابِ چشم ہے جس مین جمالِ آشکار
تو نے یونہی کی ہے موجوداتِ عالم پر نظر — اے رہینِ شبنم و ناواقفِ ابرِ بہار
دیکھتا ہو، خواب سے جس طرح کوئی چونک کر — جسکی آنکھون مین ہو گہری نیند کا باقی خمار

جسکو دہندلے سے نظر آئین مناظر گرد و پیش
اور اس موہوم بینش، پر اُسے ہو اعتبار

سید علی اختر ۔ اختر

ایک شاعر کا انجام

مصنفہ نیاز فتحپوری

اڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن و عشق، جسمیں تخیل کی بلندی، زور تحریر، اسلوب بیان اور ندرت انشار کے ایسے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہیں جو ساحری کی حد تک پہونچتے ہیں۔ جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف میں ظاہر کیے گئے ہیں اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہ افسانہ جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے۔

قیمت مع محصولڈاک ۱۲ار۔ "مینیجر نگار۔ لکھنؤ"

جذبات بھاشا

مصنفہ نیاز فتحپوری

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے، اس کا علم انہیں کو ہوسکتا ہے جنہوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اس کتاب کو دیکھئے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے۔

قیمت فی جلد ۱۲ار

"مینیجر نگار۔ لکھنؤ"

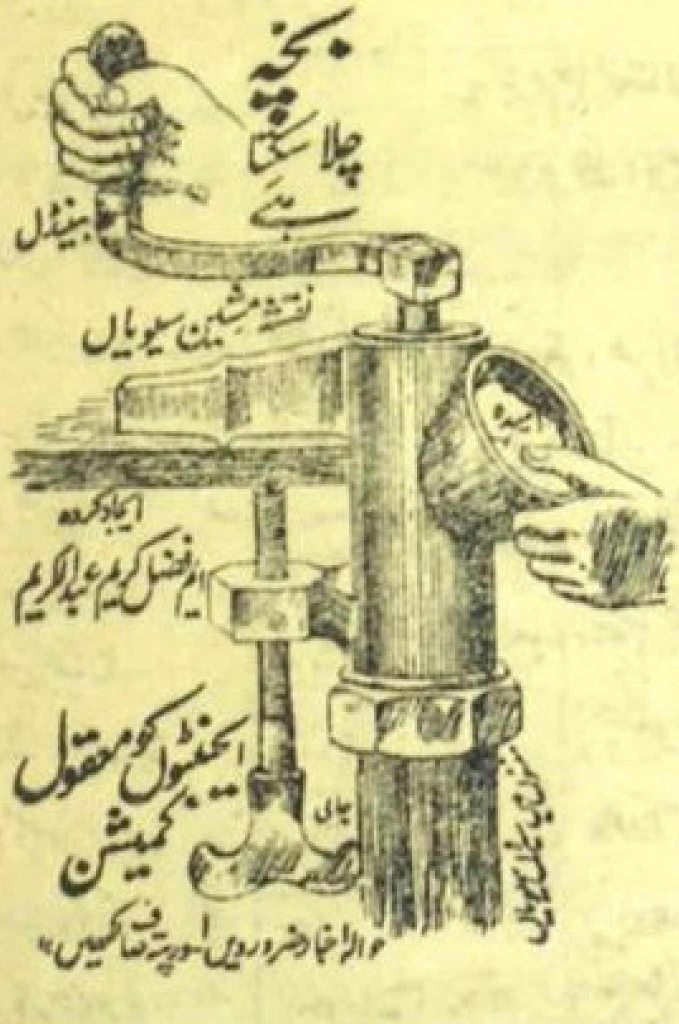

ایجنٹوں کو معقول کمیشن

والا خبار ضرور دیں اور پتہ صاف لکھیں۔

خلاف تحریر ہو تو قیمت واپس

ہمارے کارخانہ قائم شدہ ۱۹۱۴ء کی تیار کردہ مقبول عام پیتل کی خوبصورت پالش شدہ منٹوں میں سیروں نفیس ولذیذ رومالی سویاں تیار کرنے والی

نوایجاد مشین سویاں

وزن معمولی
حجم کم
پرزے مختصر و مضبوط

قیمت فی مشین پیتل پالش شدہ چھلنی دو عدد (سوراخ ۱ و ۲) ملغ ۔/۔ علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ: ہندوستانی ایجاد گھر دھلی

نگار بک ایجنسی
نظیر آباد لکھنؤ

- پرتاب ۱۲/
- روہنی ۱۰/

مولانا شرر مرحوم
- جنید بغدادی
- ملکہ زنوبیہ
- قرۃ العین
- مخدرات
- جویاے حق
- لعبت چین
- فاتح مفتوح
- بابک خرمی
- الفانسو ۱۲/
- ایام عرب
- قیس ولبنیٰ
- یوسف ونجمہ
- زوال بغداد
- مینا بازار
- مقدس نازنین
- رومۃ الکبریٰ
- فلپانا
- شوقین ملکہ
- منصور موہنا ۸/
- حسن انجلینا ۸/
- ملک العزیز ورجنا ۱۲/
- فردوس بریں ۸/
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰/
- غیب دان دلہن
- بدر النسا کی مصیبت

- میوۂ تلخ ۸/
- نیکی کا پھل

شوق قدوائی مرحوم
- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال

میر ولی اللہ بی اے
- بندگی
- کاس الکرام
- لسان الغیب جلد اول
- " دوم
- " سوم
- " چہارم
- نمکدان فصاحت
- بادۂ ناب

ظفر عمر بی اے
- چوروں کا کلب ۹/
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

مولانا نیاز فتحپوری
- گیتان جلی
- گہوارۂ تمدن
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

سید سجاد حیدر بی اے
- زہرا ۱۳/
- جلال الدین خوارزم شاہ
- خیالستان
- ثالث بالخیر ۸/

- حکایات و احتساسات

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول
- سراب فیشن ۸/
- بالشوک شہزادی ۸/
- شہید وفا ۸/
- ممتاز بیگم ۸/
- شعلۂ رنگین ۸/
- محاصرۂ پیرس ۸/
- شیخ چلی
- بہادر ترک ۸/
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- حسن بنارس ۸/
- فطرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا ۸/
- جنگ طرابلس ۸/
- بہرام چور
- زر پرست
- گنجی کا راز
- عبدالرحمن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- کرشمہ
- وفادار دلہن
- طواف زمین

- سیاحت زمین
- سیاحت
- نازنین مراکش ۸/
- سمندر کی سیر
- اسرار بالشوزم
- روح لیلیٰ
- امین بک
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- نیلی چھتری
- بہرام کی آزادی ۱۲/
- بہرام کی گرفتاری
- بہرام کی سرگزشت
- پراسرار قتل

ادبی کتابیں
- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال
- مشاطۂ سخن
- انشاء نسوان ۶/
- مکاتیب محسن الملک
- لیلیٰ مجنون ڈراما ۸/

مراثی
- مراثی دبیر
- مراثی انیس
- مراثی ضمیر

- مراثی مونس
- مراثی دلگیر

تذکرۃ الشعرا
- تذکرۂ حسینی ۱۱/
- گلشن ۱۰/
- سراپاے سخن
- سوانح نظیر اکبرآبادی

دواوین فارسی
- دیوان شمس تبریز
- کلیات عراقی ۱۲/
- دیوان حافظ
- دیوان نعمت خان عالی
- کلیات انوری
- دیوان بیدل ۱۰/
- کلیات سعدی
- دیوان عرفی ۱۲/
- کلیات جامی
- کلیات غالب
- کلیات صائب
- کلیات حزین
- دیوان عنصری
- دیوان ظہیر فاریابی ۶/
- دیوان غنی کشمیری ۶/
- دیوان ناصر علی ۵/
- دیوان ہلالی ۶/
- کلیات جلال اسیر

دواوین اردو
- دیوان حسن دہلوی ۶/
- کلیات ظفر

- کلیات مومن
- دیوان ناسخ
- کلیات میر
- کلیات سودا
- کلیات انشا
- کلیات نظیر اکبرآبادی
- گلزار داغ
- دیوان رند ۹/
- دیوان ذوق ۱۲/
- کلیات اسمٰعیل
- مرآۃ الغیب
- صنمخانۂ عشق
- فریاد داغ
- دیوان قاتل ۸/
- دیوان شہیدی

عجائب و غرائب
- عجائب المخلوقات تصویر رنگین
- " باتصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانۂ عالم

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے
- الہ دین و لیلیٰ
- فریب حسن
- سوزن عشق
- روز الیمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- طلسمی فانوس